لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

کشف المحجوب (اردو)

تصوف کی لازوال شہرہ آفاق کتاب

مصنف

زبدۃ العارفین ابوالحسن سید علی بن عثمان ہجویری

ترجمہ

مولانا عبدالرؤف فاروقی

ناشر: اسلامی کتب خانہ فضل الٰہی مارکیٹ اردو بازار لاہور

اللہ اکبر

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

کشف المحجوب (اردو)

تصوّف کی لازوال و شہرہ آفاق کتاب

مصنّف

زبدۃ العارفین ابو الحسن سیّد علی بن عثمان ہجویری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ

مولانا عبد الرؤف فاروقی

ناشر اسلامی کتب خانہ فضل الٰہی مارکیٹ اردو بازار لاہور ۲

نام کتاب : کشف المحجوب

مصنف : زبدۃ العارفین ابوالحسن
سید علی بن عثمان
ہجویری : رحمۃ اللہ علیہ

مترجم : جناب مولانا عبدالرؤف فاروقی

ناشر : اسلامی کتب خانہ : فضل الٰہی مارکیٹ لاہور

مطبع : زاہد بشیر پرنٹرز

فہرست

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
١	حمد و نعت	٩	١٧	**تیسرا باب**	
٢	استخارہ کی اہمیت	١١	١٨	تصوف کے بیان میں	٥١
٣	نفسانی خواہشات سے اجتناب	١٢	١٩	حضرت ابوبکر صدیق رض	
٤	وجہ تسمیہ	١٣		امام الصوفیاء	٥١
٥	ابواب کی تقسیم	١٦	٢٠	حضرت حارث رض کا ایمان	٥٥
٦	اللہ سے طلب مدد	″	٢١	صوفی کے معنی	٥٨
٧	کشف المحجوب کی ابتداء	١٨		**چوتھا باب**	
٨	**پہلا باب**	٢٣	٢٢	مرقعہ پوشی کے بیان میں	٦٩
٩	علم کی اقسام	٢٥	٢٣	گدڑی پہننے کی شرائط	٧٥
١٠	علم شریعت	٢٧	٢٤	گدڑی علامت فقر نہیں	٧٧
١١	اقوال صوفیا	٣١		**پانچواں باب**	
١٢	**دوسرا باب**	٣٥	٢٥	فقر و صفوت میں اختلاف	٨٥
١٣	فقہ	٣٥		**چھٹا باب**	
١٤	فقہ اور اس کا مقام	″	٢٦	ملامت کا بیان	٨٩
١٥	فضیلت فقر و غنا اور مشائخ کا	١٧	٢٧	حقیقت ملامت	٨٩
	اختلاف	٣٧	٢٨	ملامت کے اسباب	٩١
١٦	مشائخ کے اقوال	٤٢		**ساتواں باب**	

نمبر	مضامین	صفحہ
۲۹	صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے صوفیا کے آئمہ	۹۹
۳۰	حضرت صدیق اکبرؓ	//
۳۱	حضرت فاروق اعظمؓ	۱۰۲
۳۲	حضرت عثمان ذوالنورینؓ	۱۰۴
۳۳	حضرت علی کرم اللہ وجہہ	۱۰۵
	آٹھواں باب	
۳۴	رسول اللہؐ کے خاندان میں سے صوفیاء کے آئمہ	۱۰۷
۳۵	سیدنا حضرت حسنؓ	//
۳۶	سیدنا حضرت حسینؓ	۱۱۱
۳۷	حضرت زین العابدینؓ	۱۱۲
۳۸	قصیدہ	۱۱۴
۳۹	سیدنا حضرت محمد باقرؓ	۱۱۷
۴۰	سیدنا حضرت محمد جعفرؓ	۱۱۹
	نواں باب	
۴۱	اصحاب صفہ کے ذکر میں	۱۲۲
	دسواں باب	
۴۲	تابعین میں تصوف کے امام	۱۲۶
۴۳	حضرت اویس قرنیؒ	//
۴۴	حضرت ہرم بن حیانؒ	۱۲۸
۴۵	حضرت حسن بصریؒ	۱۳۰

نمبر	مضامین	صفحہ
۴۶	حضرت سعید بن المسیبؒ	۱۳۲
	گیارہواں باب	
۴۷	تبع تابعین میں سے آئمہ تصوف	۱۳۴
۴۸	حضرت حبیب عجمیؒ	//
۴۹	حضرت مالک بن دینارؒ	۱۳۵
۵۰	حضرت حبیب بن اسلم الراعیؒ	۱۳۷
۵۱	حضرت ابوحازم مدنیؒ	۱۳۸
۵۲	حضرت محمد بن واسعؒ	۱۳۹
۵۳	حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ	۱۴۰
۵۴	حضرت عبداللہ بن مبارکؒ	۱۴۶
۵۵	حضرت فضیل بن عیاضؒ	۱۴۸
۵۶	حضرت ذوالنون مصریؒ	۱۵۳
۵۷	حضرت ابراہیم بن ادہمؒ	۱۵۷
۵۸	حضرت بشر حافیؒ	۱۵۹
۵۹	حضرت بایزید بسطامیؒ	۱۶۱
۶۰	حضرت حارث بن اسدؒ	۱۶۳
۶۱	حضرت داؤد ابن طائیؒ	۱۶۵
۶۲	حضرت سری سقطیؒ	۱۶۶
۶۳	حضرت شقیق بن ابراہیم الازدیؒ	۱۶۷
۶۴	حضرت عبدالرحمٰن الدارانیؒ	//
۶۵	حضرت معروف بن فیروز الکرخیؒ	۱۷۰

نمبر	مضمون	صفحہ
۶۶	حضرت حاتم اصمؒ	۱۷۲
۶۷	حضرت امام شافعیؒ	۱۷۳
۶۸	حضرت امام احمد بن حنبلؒ	۱۷۵
۶۹	حضرت احمد بن الحواریؒ	۱۷۷
۷۰	حضرت احمد بن خضرویہ البلخیؒ	۱۸۰
۷۱	حضرت عسکر بن الحسینؒ	۱۸۲
۷۲	حضرت یحییٰ بن معاذ الرازیؒ	۱۸۳
۷۳	حضرت عمر بن السالم نیشاپوریؒ	۱۸۵
۷۴	حضرت صمدون بن احمدؒ	۱۸۸
۷۵	حضرت منصور بن عمارؒ	۱۸۹
۷۶	حضرت احمد بن عاصم الطاکیؒ	۱۹۱
۷۷	حضرت عبداللہ بن خفیفؒ	۱۹۲
۷۸	حضرت جنید بغدادیؒ	۱۹۳
۷۹	حضرت احمد بن محمد نوریؒ	۱۹۷
۸۰	حضرت سعید بن اسمٰعیلؒ	۲۰۰
۸۱	حضرت ابوعبداللہ احمد بن یحییٰؒ	۲۰۳
۸۲	حضرت ابومحمد رویم بن احمدؒ	۲۰۴
۸۳	حضرت یوسف بن حسین رازیؒ	۲۰۵
۸۴	حضرت سمنون بن عبداللہؒ	۲۰۶
۸۵	حضرت ابوالفوارس شاہ شجاع کرمانیؒ	۲۰۸
۸۶	حضرت عمرو بن عثمان المکیؒ	۲۰۹
۸۷	حضرت سہل تستریؒ	۲۱۰
۸۸	حضرت محمد بن فضل البلخیؒ	۲۱۱
۸۹	حضرت محمد بن علی الترمذیؒ	۲۱۲
۹۰	حضرت محمد بن عمر الوراقؒ	۲۱۴
۹۱	حضرت ابوسعید احمد بن عیسیٰ الخرازؒ	۲۱۵
۹۲	حضرت علی بن محمد الاصفہانیؒ	۲۱۶
۹۳	حضرت محمد بن اسمٰعیل خیر النساجؒ	۲۱۷
۹۴	حضرت ابوحمزہ خراسانیؒ	۲۱۹
۹۵	حضرت ابوالعباس احمد بن مسروقؒ	۲۲۰
۹۶	حضرت ابوعبداللہ بن احمد اسمٰعیل المغربیؒ	۲۲۱
۹۷	حضرت ابوعلی بن الحسن بن علی الجوزجانیؒ	۲۲۲
۹۸	حضرت ابومحمد بن الحسین الجریریؒ	۲۲۳
۹۹	حضرت ابوالعباس احمد بن محمد بن سہل الآملیؒ	۲۲۴
۱۰۰	حضرت ابوالمغیث الحسین بن منصور الحلاجؒ	۲۲۵
۱۰۱	حضرت ابواسحاق ابراہیم بن احمد الخواصؒ	۲۳۰
۱۰۲	حضرت ابوحمزہ بغدادیؒ	۲۳۱
۱۰۳	حضرت ابوبکر محمد بن موسیٰ الواسطیؒ	۲۳۲
۱۰۴	حضرت ابوبکر بن دلف بن جحدر شبلیؒ	۲۳۳
۱۰۵	حضرت ابومحمد بن جعفر بن نصیر الخاوریؒ	۲۳۵

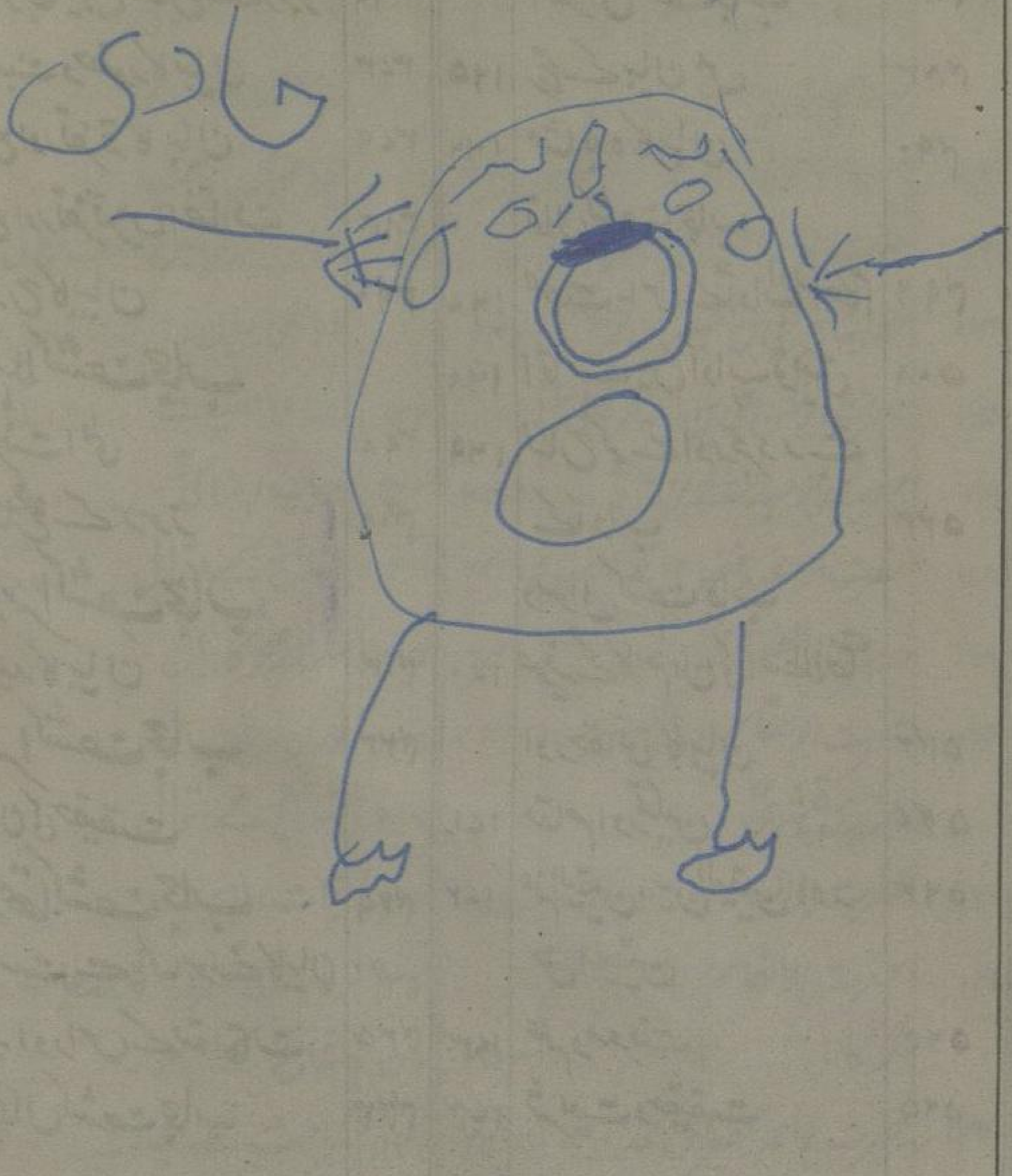
نمبر	مضمون	صفحہ
۱۰۶	حضرت ابوعلی محمد بن قاسم الرودباریؒ	۲۳۶
۱۰۷	حضرت ابوالعباس قاسم بن مہدی	
	السیاریؒ	۲۳۷
۱۰۸	حضرت ابوعبداللہ محمد بن خفیفؒ	۲۳۸
۱۰۹	حضرت ابوعثمان سعید بن المغربیؒ	〃
۱۱۰	حضرت ابوالقاسم محمد بن محمود	
	النصرآبادیؒ	۲۳۹
۱۱۱	حضرت ابوالحسن علی بن ابراہیم الحصریؒ	۲۴۱
	بارہواں باب	
۱۱۲	صوفیا متاخرین کے آئمہ کے ذکر میں	۲۴۲
۱۱۳	حضرت ابوالعباس احمد بن محمد القصابؒ	〃
۱۱۴	حضرت ابوعلی بن الحسین بن محمد الدقاقؒ	۲۴۴
۱۱۵	حضرت ابوالحسن علی بن احمد الخرقانیؒ	〃
۱۱۶	حضرت ابوعبداللہ محمد بن علیؒ	۲۴۵
۱۱۷	حضرت ابوسعید فضل بن محمد المیہنیؒ	۲۴۶
۱۱۸	حضرت ابوالفضل محمد بن الحسن الختلیؒ	۲۴۸
۱۱۹	حضرت ابوالقاسم عبدالکریم ابن	۲۴۹
	ہوازی قیشریؒ	
۱۲۰	حضرت ابوالعباس احمد بن محمدؒ	۲۵۰
۱۲۱	حضرت ابوالقاسم بن علی بن عبداللہ	
	گرگانیؒ	۲۵۲
۱۲۲	حضرت ابواحمد المظفر بن حمدانؒ	۲۵۳

نمبر	مضمون	صفحہ
	تیرھواں باب	
۱۲۳	متاخرین صوفیا کرام کا مختصر تذکرہ	۲۵۶
۱۲۴	متاخرین صوفیا اہل شام وعراق	〃
۱۲۵	صوفیاء اہل فارس	〃
۱۲۶	قہستان آذربیجان اور طبرستان کے صوفیا	۲۵۷
۱۲۷	اہل کرمان کے صوفیاء	〃
۱۲۸	اہل خراسان کے صوفیاء متاخرین	۲۵۸
۱۲۹	صوفیا اہل ماوراء النہر	〃
۱۳۰	اہل غزنی کے صوفیاء	۲۵۹
	چودہواں باب	
۱۳۱	مذاہب صوفیا میں مختلف فرقوں	۲۶۱
	کا باہمی بیان	
۱۳۲	رضا کی حقیقت	۲۶۲
۱۳۳	ارباب رضا کی قسمیں	۲۶۴
۱۳۴	مشائخ کے اقوال	۲۶۶
۱۳۵	سکر اور صحو کا بیان	۲۷۴
۱۳۶	نوری فرقہ	۲۸۲
۱۳۷	مشائخ کے اقوال	۲۹۸
۱۳۸	اثبات ولایت	۳۱۶
۱۳۹	ولایت کی تشریح اور درجات	۳۱۹
۱۴۰	مشائخ کے رموز	۳۲۴
۱۴۱	کرامت کے اثبات	۳۲۸

نمبر	مضمون	صفحہ
۱۴۲	معجزے اور کرامت میں فرق	۳۳۰
۱۴۳	مدعی الوہیت کے ہاتھ پر معجزے جیسے افعال کا ظاہر ہونا	۳۳۵
۱۴۴	کرامات اولیاء کا بیان	۳۴۳
۱۴۵	انبیاء کی اولیاء پر فضیلت	۳۵۶
۱۴۶	انبیاء اور اولیاء کی فرشتوں پر فضیلت	۳۶۰
۱۴۷	بقا اور فنا کا بیان	۳۶۴
۱۴۸	فنا و بقا میں مشائخ کے رموز	۳۶۹
۱۴۹	غیبت و حضور کا بیان	۳۷۳
۱۵۰	جمع اور تفرقہ کا بیان	۳۷۹
۱۵۱	جمع اور تفرقہ میں اختلاف	۳۸۴
۱۵۲	روح کا بیان	۳۹۰
	پہلا کشف حجاب	
۱۵۳	معرفت الٰہی	۳۹۸
۱۵۴	مشائخ کے رموز	۴۰۸
	دوسرا کشف حجاب	
۱۵۵	توحید کا بیان	۴۱۳
	تیسرا کشف حجاب	۴۲۳
۱۵۶	ایمان کی حقیقت	″
	چوتھا کشف حجاب	۴۲۹
۱۵۷	نجاست سے پاک ہونے کا بیان	″
۱۵۸	توبہ اور اس کے متعلقات	۴۳۵
	پانچواں کشف حجاب	۴۴۳

نمبر	مضمون	صفحہ
۱۵۹	نماز کا بیان	۴۴۳
۱۶۰	محبت اور اس کے متعلقات	۴۵۱
	چھٹا کشف حجاب	۴۶۵
۱۶۱	زکوٰۃ کا بیان	″
۱۶۲	جود و سخاوت کا بیان	۴۶۹
	ساتواں کشف حجاب	۴۷۳
۱۶۳	روزے کا بیان	″
۱۶۴	بھوک اور اس کے متعلقات	۴۸۰
	آٹھواں کشف حجاب	۴۸۳
۱۶۵	حج کے بیان میں	۴۸۳
۱۶۶	مشاہدہ کا بیان	۴۹۰
	نواں کشف حجاب	
۱۶۷	صحبت۔ اس کے آداب اور احکام	۴۹۶
۱۶۸	اقامت میں آداب توفیق	۵۰۸
۱۶۹	نکاح کرنے اور مجرد رہنے کے آداب	۵۲۳
	دسواں کشف حجاب	
۱۷۰	صوفیہ کے کلام ان کی اصطلاحات اور حقائق کا بیان	۵۴۲
۱۷۱	مقام اور تمکین	۵۴۷
۱۷۲	علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین	۵۶۳
۱۷۳	علم و معرفت	۵۶۴
۱۷۴	شریعت و حقیقت	۵۶۵

نمبر	مضمون	صفحہ	نمبر	مضمون	صفحہ
	گیارہواں کشف حجاب		۱۵۲	وجد- وجود، تواجد اور اس	
۱۴۸	سماع کا بیان	۵۷۶		کے آداب	۶۰۹
۱۴۹	قرآن کا سماع	۵۷۸	۱۵۳	رقص اور اس کے متعلقات	۶۱۳
۱۵۰	سماع میں صوفیہ کا اختلاف	۵۹۹	۱۵۴	گدڑی کا بیان	۶۱۵
۱۵۱	سماع میں صوفیہ کے مراتب	۶۰۰	۱۵۵	سماع کے آداب	۶۱۸



حمد و نعت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّ هَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ؕ
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ كَشَفَ لِاَوْلِيَآئِهٖ بَوَاطِنَ مَلَكُوْتِهٖ وَقَشَعَ
لِاَصْفِيَآئِهٖ سَرَائِرَ جَبَرُوْتِهٖ وَاَرَاقَ دَمَ الْمُحِبِّيْنَ بِسَيْفِ
جَلَالِهٖ وَاَذَاقَ سِرَّ الْعَارِفِيْنَ بِرُوْحِ وِصَالِهٖ هُوَ الْمُحْيِىْ
لِمَوَاتِ الْقُلُوْبِ بِاَنْوَارِ اِدْرَاكِ صَمَدِيَّتِهٖ وَكِبْرِيَآئِهٖ
وَالْمُنْعِشُ لَهَا بِرَاحَةِ رُوْحِ الْمَعْرِفَةِ بِنَشْرِ اَسْمَآئِهٖ ط
وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ
وَاَزْوَاجِهٖ وَذُرِّيَّتِهٖ اَجْمَعِيْنَ ۝

ترجمہ:۔ اے ہمارے پروردگار! ہم پر اپنی بے پایاں رحمت نازل فرما اور ہمارے ہر کام میں ہماری رہنمائی فرما۔ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے اپنے دوستوں کے لئے عالم ملکوت کے راز آشکارا کر دیئے اور اپنے برگزیدہ بندوں پر عالم جبروت کے بھید کھول دیئے اور اپنے جلال کی تلوار سے اپنے عاشقوں کا خون بہایا اور اپنے عارفوں کے دل کو اپنے وصال کی لذت کا مزہ چکھایا۔ وہی اپنی بے نیازی اور کبریائی کے انوار سے دلوں کی مردہ زمین کو زندگی بخشنے والا اور اسے اپنے مقدس ناموں اور معرفت کی روح پرور خوشبو سے نشوونما دینے والا ہے۔ اور اس کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اُن کی آل اُن کے اصحاب اور اُن کی ازواج مطہرات پر ہمیشہ اُس کی رحمتوں کا نزول ہو۔ شیخ علی بن عثمان بن ابی الحسن علی جلابی، غزنوی، ہجویری اللہ اُس سے راضی ہو، عرض پرداز ہے کہ میں نے استخارہ کیا اور نفس کے گرد منڈلانے والی تمام اغراض و خواہشات کو دل سے دور کرتے ہوئے تمہاری درخواست کے مطابق "اللہ تعالیٰ تمہیں نیک بخت کرے" کام کرنے کے لئے مستعد ہو گیا اور اس کتاب سے تمہاری مراد پوری کرنے کا پختہ عزم کر لیا اور اس کتاب کا نام

"کشف المحجوب" رکھا جس سے تمہارا اصل مقصد واضح ہوگیا۔ اور تمہاری خواہش کے پیشِ نظر اس کتاب کو کئی ابواب میں تقسیم کردیا اور میں اس کتاب کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے اللہ تعالےٰ سے مدد اور توفیق کی درخواست کرتا ہوں کہ اپنے قول اور عمل میں اپنی ذاتی صلاحیت اور قوت پر بھروسہ کرنا میرے نزدیک ہرگز مناسب نہیں کیوں کہ توفیق تو صرف اللہ ہی کی طرف سے حاصل ہوتی ہے۔

پہلی فصل

کتاب پر مصنف کا نام

میں نے کتاب کی ابتدا میں اپنا نام دو چیزوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے لکھا ہے، ان میں سے ایک تو خاص لوگوں کا حصہ ہے اور دوسری کا تعلق عام لوگوں سے ہے، جو عام لوگوں سے متعلق ہے وہ تو یہ ہے کہ جب تصوّف کے علم سے ناآشنا لوگ اس موضوع پر کوئی ایسی نئی کتاب دیکھتے ہیں کہ جس میں متعدد مقامات پر مصنف نے اپنا نام نہ لکھا ہو تو اُس کو اپنی طرف منسوب کر لیتے ہیں جس سے مصنف کا مقصد پورا نہیں ہوتا کیوں کہ تصنیف و تالیف اور کسی مواد کو کتابی صورت میں جمع کرنے سے مصنف کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ مصنف کا نام رہے اور کتاب کو پڑھنے اور اس سے تعلیم پانے والے لوگ اس کے لئے نیک دعا کرتے رہیں۔

ذاتی تلخ تجربہ

میرے ساتھ یہ سانحہ دو دفعہ پہلے پیش آچکا ہے ایک دفعہ تو یوں کہ ایک شخص نے میرے اشعار کا دیوان مجھ سے مانگ کر لیا اور میرے پاس اُس کا وہی ایک نسخہ تھا اُس نے اُس کی ترتیب کو تبدیل کر دیا اور اُس کے شروع سے میرا نام اُڑا دیا اور اس طرح میری ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ اللہ تعالےٰ اس کی توبہ قبول کرے۔

دوسری دفعہ کہ جب میں نے تصوّف کے طریق میں "اللہ تعالےٰ اس کو آباد رکھے" ایک کتاب لکھی اور اُس کا نام "منہاج الدین" رکھا، ایک ذلیل مدعی نے کہ میں اس کا نام لینا پسند نہیں کرتا۔ میرا نام اُس کتاب سے اُڑا دیا اور لوگوں کے سامنے بہ ظاہر کرنے لگا کہ یہ کتاب

اُس نے خود لکھی ہے۔ اگرچہ اُس کی جہالت کو جاننے والے خاص لوگ اُس کے اس دعوے پر ہنستے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ نے اُس کی بے برکتی کو یہاں تک پہنچایا کہ اُس کا نام اپنی بارگاہ کے طالبوں سے ہی خارج کر دیا۔

تاہم جو بات خواص کے ساتھ متعلق ہے اس کا معاملہ مختلف ہے کہ جب وہ ایک کتاب دیکھیں گے اور انہیں معلوم ہو گا کہ اس کتاب کا مصنف اس فن کا ماہر عالم اور محقق ہے تو اس کے حقوق کی اچھی طرح رعایت کریں گے اور اس کے مطالعہ کے بعد اُسے یاد رکھنے کی کوشش کریں گے۔ اس طرح پڑھنے والے اور مصنف دونوں کا مقصود اچھی طرح حاصل ہو جاتا ہے ——— اور اللہ تعالےٰ ہی صحیح علم والے ہیں۔

دوسری فصل

استخارہ کی اہمیت اور یہ جو میں نے کہا کہ میں نے استخارہ کیا تو اس سے میری مراد اللہ تعالےٰ کے اُن آداب کا لحاظ رکھنا ہے کہ جن کا اُس نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کا اتباع کرنے والوں کو حکم دیا ہے چنانچہ ارشاد فرمایا۔ فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۔ (کہ جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو) اور استعاذت (شیطان سے اللہ کی پناہ مانگنا) استخارت (اللہ سے بھلائی طلب کرنا) اور استعانت (ہر معاملہ میں اللہ کی مدد چاہنا) ان سب سے مراد یہی ہے کہ تمام امور میں اللہ تعالےٰ سے ہی مدد طلب کی جائے۔ اپنے تمام کاموں کو اللہ کے ہی سپرد کیا جائے اور یوں طرح طرح کی مصیبتوں سے نجات حاصل کی جائے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح ہمیں قرآن کی تعلیم ارشاد فرمایا کرتے تھے اسی طرح استخارے کی بھی تعلیم دیا کرتے تھے۔

پس جب انسان اس حقیقت سے روشناس ہو جائے کہ کسی کام میں اُس کی کامیابی اُس کے ذاتی کسب اور تدبیر پر موقوف نہیں کیوں کہ انسان کی بہتری کا علم اللہ تعالےٰ کو ہی ہے اور ہر قسم کی بھلائی یا برائی تقدیر الٰہی پر منحصر ہے تو اُس کے لئے اللہ تعالےٰ کے

فیصلوں پر راضی ہونے اور اُس سے مدد مانگنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں رہتا۔ اس طرح وہ نفسِ امارہ کی شرارتوں اور سرکشی سے ہر حالت میں محفوظ ہو جاتا ہے اور اُس کی اصلاح و بہتری کی نعمت حاصل کر لیتا ہے ——— لہٰذا ضروری ہے کہ بندہ اپنے تمام کاموں میں اللہ سے استخارہ کر لیا کرے تاکہ اللہ تعالٰی کا فضل اُسے غلطیوں اور آفتوں سے محفوظ رکھے۔ اور توفیق تو اللہ کی طرف ہی ہے۔

تیسری فصل

نفسانی خواہشات سے اجتناب: اور میں نے یہ جو کہا ہے کہ میں نے نفسانی اغراض کو اپنے دل سے نکال دیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کام کسی نفسانی خواہش کے مطابق کیا جائے اس کی برکت اٹھ جاتی ہے اور دل صراطِ مستقیم سے ہٹ کر غلط راستہ اختیار کر لیتا ہے، اس طرح دو حالتوں میں سے ایک کا ظہور ہوتا ہے یا تو اُس کی خواہش پوری ہو جاتی ہے یا نہیں، اگر پوری ہو گئی تو بھی ہلاکت ہے۔ کیوں کہ دوزخ کے دروازہ کی کنجی یہی ہے کہ نفس کی مراد پوری ہو جائے، اور اگر نفس کی مراد پوری ہی نہ ہو تو اس سے بہتر تو یہ ہے کہ شروع سے ہی نفسانی خواہش کو دل سے نکال باہر کیا جائے کیوں کہ بہشت کی کنجی یہی ہے کہ نفس کی اغراض کو دل میں جگہ ہی نہ دی جائے چنانچہ اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے:- "وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ" (اور جس نے اپنے نفس کو خواہشات سے روکا تو یقیناً اُس کا ٹھکانہ جنت ہے)

اور معاملات میں نفسانی اغراض یہ ہوتی ہیں کہ کسی کام میں اللہ تعالٰی کی خوشنودی کے علاوہ کچھ اور مقصد بندہ کے پیشِ نظر ہو اور اللہ تعالٰی کے عذاب سے اپنے نفس کی نجات طلب نہ کرے۔ اور نفس کے لئے سرکشیوں اور رعونت کی کوئی حد مقرر نہیں اور نہ ہی اس کی فریب کاریاں ظاہر ہوتی ہیں۔ لہٰذا انشاء اللہ اس کتاب میں مناسب جگہ پر اس موضوع کو مستقل باب کی صورت میں بیان کیا جائے گا۔

چوتھی فصل

مقصد و نیتِ تالیف:- اور میں نے جو یہ کہا ہے کہ تمہاری درخواست کے مطابق میں

کمر بستہ ہوا اور اس کتاب کے ذریعہ تمہارا مقصد پورا کرنے کا پختہ عزم کر لیا تو اس کا مقصد یہ ہے کہ جب تم نے مجھے سوال کا اہل سمجھا اپنے (ساتھ پیش آنے والے) واقعہ کے متعلق مجھ سے پوچھا اور فائدہ حاصل کرنے کے لئے اس کتاب کو تالیف کرنے کی مجھ سے درخواست کی تو مجھ پر یہ واجب ہو گیا کہ میں تمہارے حسنِ ظن کا لحاظ رکھتے ہوئے تمہارے سوال کا حق ادا کروں لیکن چونکہ تمہارے سوال کا پورا پورا حق فوراً ادا نہیں ہو سکتا تھا اس لئے عزمِ مصمم اور اخلاص نیت کو اولیں حیثیت حاصل تھی تاکہ اس کتاب کی ابتداء سے ہی سوال کے پورا کرنے کا ارادہ اور جواب کا احترام و احساس ملحوظ خاطر رہے کیوں کہ انسان کا ارادہ جب کام کے شروع میں حسنِ نیت سے وابستہ ہو تو اگر اُس کام میں کوئی کمی بھی باقی رہ جائے تو اللہ تعالےٰ کے ہاں بندہ معذور سمجھا جائے گا۔ اسی لئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نِیَّۃُ الْمُؤْمِنِ خَیْرٌ مِّنْ عَمَلِہٖ (مومن کی نیت اُس کے اُس عمل سے بہتر ہے جو بغیر نیت کے کیا جائے) اور اعمال میں نیت کا بڑا ہی دخل ہے اور اس پر سچی دلیل موجود ہے کہ بندہ ایک ہی نیت سے ایک حکم سے دوسرے حکم میں ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اس کے ظاہر پر اس کا کوئی اثر نمودار نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر کوئی شخص روزہ کی نیت کے بغیر کچھ دن بھوکا رہے تو اسے اس کا کوئی اجر نہیں لگے گا لیکن اگر وہ روزہ کی نیت کرنے کے بعد بھوکا رہے تو مقربانِ الٰہی میں شمار ہو جائے گا باوجودیکہ ظاہری طور پر کوئی فرق محسوس نہیں ہو گا۔ اسی طرح اگر کوئی مسافر کسی شہر میں اقامت کی نیت کے بغیر کچھ مدت تک ٹھہرا رہے تو وہ مقیم شمار نہیں ہو گا البتہ اگر وہ وہاں سکونت کی نیت کر لے تو مقیم سمجھا جائے گا۔ اسی قسم کے اور بھی بہت سے امور ہیں کہ نیت کے بغیر ان کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہر عمل کے شروع میں نیک عمل کی نیت ہونی چاہیئے اور اللہ تعالےٰ کو ہی صحیح علم ہے۔

پانچویں فصل

وجہ تسمیہ:۔ اور میں نے جو یہ کہا ہے کہ میں نے اس کتاب کا نام کشف المحجوب رکھا ہے تو اس سے میری مراد یہ ہے کہ کتاب کے نام سے ہی اس میں موجود مضمون کی گواہی مل جائے،

خصوصاً اہلِ بصیرت جب اس کتاب کا نام سُنیں تو انہیں علم ہو جائے کہ اس کتاب کا موضوع اور مقصد کیا ہے اور تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ اولیاء اللہ اور درگاہِ الٰہی کے مقربین کے سوا باقی تمام اہلِ دنیا امرِ خداوندی کے اسرار و رموز سے پردہ میں رہتے ہیں اور چونکہ یہ کتاب راہِ حق کے بیان، امرِ حق کی شرح اور بشریت کے حجابات کھولنے کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس لئے اس نام کے علاوہ کوئی اور نام اس کے لئے مناسب ہی نہ تھا۔ اور درحقیقت حجاب کا کھولنا اسی طرح محبوب کی ہلاکت کا سبب ہوتا ہے جس طرح حجاب مکشوف کی ہلاکت کا باعث ہوتا ہے یعنی جس طرح قرب و وصال، فرقت و دوری کی طاقت نہیں رکھتا

اسی طرح دوری بھی نزدیکی کی تاب نہیں لا سکتی، جس طرح سرکہ میں پیدا ہونے والا جانور جب دوسری چیز میں گرتا ہے تو مر جاتا ہے اسی طرح دوسری چیزوں میں پیدا ہونے والے جانور کو اگر سرکہ میں ڈال دیا جائے تو وہ بھی زندہ نہیں رہتا چنانچہ حقیقت کی (پُر مشقت) راہ پر چلنا صرف اسی کے لئے آسان ہے جس کی تخلیق ہی اس مقصد کے لئے عمل میں آئی ہو اسی لئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کُلٌّ مُیَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَہٗ (ہر شخص کے لئے وہ کام آسان کر دیا گیا ہے جس کے لئے اُس کی تخلیق ہوئی ہے) اور اللہ تعالےٰ نے جس شخص کو کسی خاص مقصد کے لئے پیدا کیا ہے تو اس کے حصول کا طریقہ اس کے لئے آسان کر دیا ہے۔

لیکن حجاب کی دو قسمیں ہیں، ایک حجابِ رَینی[1] کہ اس کا اٹھنا ہرگز ممکن نہیں (اللہ تعالےٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے) اور دوسرا حجابِ غینی[2]، اور یہ بہت جلد ہی اٹھ جاتا ہے، اس کی وضاحت یہ ہے کہ بعض انسان تو ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کی ذات ہی حق کا حجاب ہوتی ہے حتیٰ کہ ان کے نزدیک حق و باطل میں کوئی فرق نہیں ہوتا اور بعض بندے ایسے

---

[1] طبعی، پیدائشی اور فطری حجاب مراد ہے کہ رَین عربی میں زنگ کو کہتے ہیں۔

[2] عربی میں "غین" اندھیرے کو کہتے ہیں یہاں عارضی حجاب مراد ہے۔

ہوتے ہیں کہ ان کی "صفت" حق کا حجاب ہوتی ہے لیکن اُن کی طبیعت ہمیشہ حق کی متلاشی اور باطل سے گریزاں رہتی ہے، پس ذاتی حجاب جس سے حجاب رہنی مراد ہے وہ کسی صورت میں نہیں اٹھ سکتا۔ اور عربی لغت میں "رین" ختم اور طبع[١] سب ہم معنی الفاظ ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالے ہے " كَلَّا بَلْ ذَاتَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ " (ہرگز ایسا نہیں۔ بلکہ ان کے بُرے اعمال کی وجہ سے اُن کے دلوں پر زنگ لگ گیا ہے) پھر اس کا حکم ظاہر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا" اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (اے نبی! جو لوگ کافر ہیں ان کے لئے برابر ہے کہ آپ انہیں عذاب سے ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ہرگز ایمان نہ لائیں گے) اس کے بعد ان کے اس عمل کی علت بیان فرمائی ہے کہ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (اللہ نے مہر لگا دی ہے اُن کے دلوں پر) اور یہ بھی فرمایا" طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی) اور حجاب صفتی کہ جو غیبی حجاب ہے وہ کبھی کبھی اُٹھ بھی سکتا ہے ذات کی تبدیلی نادرات میں سے ہے اور نادر نا ممکن ہے اور جائز ہے۔

مشائخ اور صوفیاء نے رین اور غین کے معنی کو لطیف اشارہ میں بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ اَلرَّيْنُ مِنْ جُمْلَةِ الْمُوْطِنَاتِ وَالْغَيْنُ مِنْ جُمْلَةِ الْخَطَرَاتِ " (کہ زنگ مستقل اور مضبوط اشیاء میں سے ہے اور تاریکی عارضی اندیشوں میں سے ہے) وطن مستقل اور خطر عارضی ہوتا ہے۔ چنانچہ پوری دنیا کے صیقل گر اور آئینہ ساز اکھٹے ہو کر بھی پتھر سے آئینہ نہیں بنا سکتے لیکن اگر آئینہ زنگ آلود ہو جائے تو صیقل کرنے سے بالکل صاف ہو جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ پتھر میں اصل تاریکی ہے جب کہ آئینہ میں اصل روشنی ہے اور اصلیت پائیدار ہوتی ہے لہٰذا پتھر آئینہ نہیں بن سکتا اور عارضی صفت کو بقا نہیں ہوتا لہٰذا آئینہ کا زنگ ختم ہو سکتا ہے ـــــ پس میں نے یہ کتاب اس لئے لکھی ہے کہ یہ اُن دلوں کے لئے صیقل کا کام دے۔ جو حجاب غین کی تاریکیوں

---

[١] ختم اور طبع (مہر لگانا) استعداد کا سلب کر لینا مراد ہے۔

میں گھرے ہوئے ہیں لیکن نورِ حق اُن کے دلوں میں موجود ہے تاکہ اس کے مطالعہ کی برکت سے تاریکی کا وہ پردہ اُن کے دلوں سے اُٹھ جائے اور حقیقتِ معنی کی طرف راہ پالیں۔ اور وہ لوگ کہ حق کا انکار اور باطل کا ارتکاب جن کے خمیر اور ذات میں داخل ہو وہ حق کے واضح دلائل و شواہد کے باوجود راہ نہیں پاتے لہٰذا اس کتاب سے انہیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور اُس اللہ تعالےٰ کا شکر ہے جس نے عرفان کی نعمت سے سرفراز بایا۔

چھٹی فصل

ابواب کی تقسیم:۔ باقی میں نے جو یہ کہا ہے کہ مجھ پر تمہارا مقصد واضح ہو گیا ہے اور تمہاری غرض سے متعلق تمام باتیں اس کتاب کے کئی اجزاء میں تقسیم ہو گئی ہیں تو اُس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک سوال کرنے والے کا پورا مقصد معلوم نہ ہو اُس کی مراد حاصل نہیں ہوتی کیونکہ سوال ذہن میں پیدا ہونے والے کسی اشکال کی وجہ سے ہی کیا جاتا ہے لہٰذا جب تک جواب سے یہ اشکال حل نہ ہو جائے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اور اشکال کو جب تک اچھی طرح پہچان اور سمجھ نہ لیا جائے اُس کا صحیح حل پیش کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

اور میں نے یہ جو کہا ہے کہ تمہاری مراد سے تعلق رکھنے والے امور کئی اجزاء میں تقسیم ہو گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جب سوال تمام امور پر مشتمل ہو تو جواب بھی اُن تمام امور پر حاوی ہونا چاہیئے تاکہ سوال کرنے والا اپنے سوال کے تمام درجوں اور پہلوؤں اور پھر اُن کے جوابات کو اچھی طرح سمجھ لے۔ اور پھر ایک مبتدی کے سامنے تو اُس کی تمام اقسام اور حدود کی پوری پوری تفصیل بیان کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ خصوصاً تمہاری غرض (اللہ تعالےٰ تمہیں سعادت مند بنائے) کا تو تقاضہ ہی یہ ہے کہ میں اُسے پوری تفصیل کے ساتھ بیان کروں اور تمہارے سوال کے جواب میں ایک مستقل کتاب تصنیف کروں اور توفیق دینے والا تو صرف اللہ ہی ہے۔

ساتویں فصل

اللہ سے طلب مدد۔ اور میں نے یہ جو کہا ہے کہ میں امداد اور توفیق اللہ تعالےٰ سے طلب کرتا

ہوں تو اس سے میری مراد ہے کہ اللہ تعالےٰ کے سوا انسان کا کوئی حامی و مددگار نہیں جو نیکی کے کاموں کو سرانجام دینے کے لئے اس کی نصرت کرے اور مزید توفیق بخشے، اور توفیق کے معنی یہ ہیں کہ بندہ کے نیک اعمال میں اللہ تعالیٰ کی تائید و موافقت شامل حال ہو۔ اور توفیق الٰہی کی صحت پر کتاب و سنت کی گواہی اور دلیل موجود ہے نیز معتزلہ اور قدریہ جماعت کہ جو توفیق کو مہمل اور بے معنی لفظ سمجھتے ہیں کے علاوہ پوری امت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے اور مشائخ طریقت کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ "التَّوْفِیْقُ هُوَ الْقُدْرَةُ عَلَی الطَّاعَةِ عِنْدَ الاستعمال" (یعنی عمل کے وقت فرمانبرداری کی قوت پیدا ہو جانے کا نام "توفیق" ہے) جب انسان خدا کا اطاعت گزار ہو جاتا ہے تو اللہ تعالےٰ کی طرف سے اُسے پہلے سے کہیں زیادہ قوت اور طاقت حاصل کی جاتی ہے اور اس طرح تمام حالات میں ہر قسم کی حرکات و سکنات اللہ تعالےٰ کے افعال اور مخلوق بن جاتے ہیں۔ پس توفیق الٰہی اس قوت کا نام ہوا جس کے ذریعہ انسان اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔ لیکن یہ کتاب اس مسئلہ کے بیان کا محل نہیں کیونکہ اس کتاب میں ایک اور چیز (تصوف) بیان کرنا مقصود ہے۔

اور اب میں اللہ عزوجل کی مشیت و توفیق سے تمہارے اصل مقصود کی طرف توجہ کرتا ہوں لیکن اُس سے متعلق کچھ کہنے سے پہلے تمہارے سوال کو بعینہٖ درج کرتے ہوئے اسی سے کتاب کا آغاز کرتا ہوں (اور توفیق تو اللہ کی جانب سے ہوتی ہے)

صورتِ سوال

- سائل ابوسعید ہجویری نے درخواست کی آپ میرے لئے تحقیق کے ساتھ بیان فرمائیں کہ
- طریقت اور تصوف کی حقیقت کیا ہے ؟
- اہلِ تصوف کو کن کن مقامات سے گزرنا پڑتا ہے اور ہر مقام کی کیفیت کیا ہے ؟
- اہلِ تصوف کے مختلف مذاہب و اقوال اور رموز و اشارات کیا ہیں ؟
- اللہ تعالےٰ کی محبت اور دلوں پر اُس کے ظاہر ہونے کی کیفیت کیا ہے ؟
- اللہ تعالےٰ کی ماہیت کی معرفت سے انسانی عقول کے حجاب کا سبب کیا ہے ؟

• اس کی حقیقت کے ادراک سے نفسِ امارہ کو نفرت و بیزاری کیوں ہوتی ہے؟

• اور اس کی صفات سے واقف ہو جانے والوں کی روح کو اطمینان و آرام کیسے نصیب ہو جاتا ہے؟

نیز ان سوالات سے متعلق دوسرے تمام امور کو بھی وضاحت کے ساتھ بیان فرمائیے؟

کشف المحجوب کی ابتداء

حضرت علی ہجویریؒ کا جواب

مسئول یعنی علی بن عثمان جلابی (اللہ اُس پر رحم کرے) کہتا ہے کہ تم جان لو کہ درحقیقت ہمارے اس دور میں یہ علم مٹ چکا ہے خصوصاً ہمارے اس ملک میں کہ جہاں کے تمام لوگ نفسانی خواہشات میں مستغرق اور اللہ تعالےٰ کی خوشنودی کے راستہ سے منہ موڑے ہوئے ہیں اور دورِ حاضر کے علماء اور وقت کے مدعیوں کے لئے اس راہ طریقت کے خلاف ایک اور صورت پیدا ہو چکی ہے۔ پس اس چیز کو حاصل کرنے کے لئے غیر معمولی ہمت سے کام لو کہ بارگاہ الٰہی کے خواص کے سوا تمام اہل زمانہ کا ہاتھ اُس کے حصول سے محروم ہے تمام اہل ارادت کی مراد اس سے ٹوٹ چکی ہے اس کے وجود سے تمام اہل معرفت کی معرفت معزول ہو گئی ہے سب عوام و خواص نے اس کی حقیقت کی بجائے صرف عبادت کو کافی سمجھ رہی ہے۔ دل وجان سے اُس کے حجاب کے خریدار بن گئے۔

اور یہ کام اب تحقیق کی بجائے تقلید میں پڑ گیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امر حق کی جستجو نے اُن سے اپنا چہرہ چھپا لیا ہے۔ پس عوام تو اسی پر مطمئن ہیں کہ انہیں (کسی محنت کے بغیر) حق کی معرفت حاصل ہو گئی ہے اور خواص اس پر خوش ہیں کہ ان کے دلوں میں اس کی تمنا، نفس میں اس کا شوق اور سینوں میں اس کی طرف رغبت موجود ہے۔ اور شغل کے طور پر کہتے ہیں کہ یہ شوق دیدار (الٰہی) اور سوز محبت ہے اور تصوف کے نام نہاد مدعی اپنے (بلند بانگ) دعوؤں کے باوجود تمام حقائق کی معرفت سے قاصر اور بیگانہ ہیں۔ جب کہ مریدوں نے مجاہدہ و ریاضت سے ہاتھ اٹھا کر اپنے فاسد تصورات کا نام مشاہدہ رکھ لیا ہے

میں نے اس سے پہلے اس علم (تصوف و طریقت) میں جتنی کتابیں لکھی تھیں وہ سب

ضائع ہو گئی ہیں اور تصوف کے جھوٹے مدعیوں نے اُن میں عوام کو پھانسنے کے لئے بعض باتیں چن کر باقی کو دھو کر ضائع کر دیا کیوں کہ جس کے دل پر مہر لگ چکی ہو وہ حسد اور انکار کو ہی نعمت خداوندی سمجھتا ہے۔ اور ایک دوسرے گروہ نے ان عبارات کو دھو کر مٹایا تو نہیں لیکن انہیں پڑھا بھی نہیں اور ایک اور گروہ نے عبارات کو پڑھا تو سہی لیکن جب اُن کا مطلب نہ سمجھا تو عبارتوں پر اکتفا کرتے ہوئے انہیں لکھ لیا تاکہ انہیں یاد کر کے یہ دعویٰ کر سکیں کہ ہم تصوف و معرفت کا علم بیان کرتے ہیں حالانکہ یہ لوگ بالکل اندھیرے میں ہیں۔

یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ علم طریقت کے حقائق و رموز سُرخ گندھک کی طرح ہیں جو بالکل کمیاب اور بیش قیمت ہوتی ہے لیکن اگر وہ میسر آ جائے تو اُس کی چھ رتی کی مقدار کسی وزنی پیتل اور کانسی و تانبے کی بھاری مقدار کو سونا بنا سکتی ہے غرضیکہ ہر انسان اسی دوا کا طلب گار ہوتا ہے جو اس کے درد کا علاج ہو اور اس کے علاوہ اور کسی دواء کی اُسے ضرورت نہیں ہوتی جیسا کہ ایک بزرگ نے کہا ہے شعر ؎

فَکُلٌّ مَنْ فِی فُؤَادِہٖ وَجَعٌ   یَطْلُبُ شَیْئًا یُوَافِقُ الْوَجَعَا

ترجمہ:- پس جس کے دل میں کوئی درد ہو تو وہ ایسی چیز ہی ڈھونڈتا ہے جو اُس کے درد کے موافق ہو۔ جس شخص کی بیماری کا علاج معمولی درجہ کی چیزوں سے ہو سکتا ہو اُسے موتی اور مروارید کی ضرورت نہیں ہوتی کہ اس میں شہد اور دواء المسک ملائیں۔ اور یہ علم طریقت تو اس لئے قیمتی اور کمیاب ہے کہ اس سے ہر شخص کو حصہ نہیں ملتا اور اس سے قبل بھی اس علم سے جاہل لوگوں نے مشائخ کی کتابوں کے ساتھ یہی سلوک کیا ہے کہ جب بھی اسرار خداوندی کے خزانے اُن کے ہاتھ لگے اور انہیں اس کے معانی کی سمجھ نہ آئی تو انہیں جاہل کلاہ سینے والوں اور ناپاک جلد سازوں کے سپرد کر دیا تاکہ وہ انہیں ٹوپیوں کا استر اور ابونواس[۱] جیسے شاعروں کے دیوانوں اور جاحظ[۲] کے خرافات کی طرح اُس کی جلد بندی کریں اور یقیناً اگر شاہی باز کسی بڑھیا کے مکان کی دیوار پر جا بیٹھے

---

[۱] ایک شراب نوش شاعر جس کا دیوان واہیات شعروں کا مجموعہ تھا۔

[۲] ابو عثمان عمر بن بحر الملقب بہ جاحظ مغربی (بہت سی کتابوں کا مصنف)

تو وہ اس کے پر اور بازو کاٹ ہی ڈالے گی --- اور خداوند عزوجل نے ہمیں اس زمانہ میں پیدا فرمایا ہے کہ جس میں لوگوں نے نفسانی خواہشات کا نام شریعت، طلب جاہ، حب دنیا اور تکبر کا نام عزت وعلم، مخلوق کے سامنے ریاکاری کا نام خوفِ خدا، کینہ کو دل میں پوشیدہ رکھنے کا نام بردباری، فضول جھگڑے کو مناظرہ آپس میں جنگ وجدال کا نام بزرگی. منافقت کا نام زہد، جھوٹی آرزو کا نام ارادت، طبعی ہذیان کا نام معرفت، دلی حرکتوں اور نفسانی وسوسہ کا نام محبت الٰہی الحاد کا نام فقر، انکار حق کا نام بزرگی، بے دینی کا نام فنا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے ترک کا نام طریقت --- اور زمانہ والوں کی آفت کا نام مجاہدہ رکھ لیا ہے یہاں تک کہ معانی ومطالب کے جاننے والے ان سے بالکل الگ ہو گئے ہیں اور اہل دنیا نے اسی طرح غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ جیسا کہ اسلام کی پہلی ابتری کے وقت آلِ مروان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ اہل حقائق کے بادشاہ اور طریقت و باریک بینی کے امام ابوبکر واسطی رحمہ اللہ نے کیا خوب کہا ہے۔ "بُلِیْنَا بِزَمَانٍ لَیْسَ فِیْہِ اٰدَابُ الْاِسْلَامِ وَلَا اَخْلَاقُ الْجَاھِلِیَّۃِ وَلَا اَحْکَامُ ذَوِی الْمُرُوَّۃِ" (ہم ایسے دور میں آزمائش میں مبتلا کر دئے گئے ہیں کہ جس میں نہ تو اسلامی آداب ہیں، نہ اخلاقِ جاہلیت اور نہ ہی مروت ومحبت کی باتیں --- اور اسی قول کے موافق شبلیؒ فرماتے ہیں۔

جَعَلَ اللّٰہُ ذَوِی الدُّنْیَا مُنَاخًا لِرَاکِبٍ ، فَکُلُّ بَعِیْدِ الْھَمِّ فِیْھَا مُعَذَّبٌ وَمُتْعَبٌ

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو صرف ایک شتر سوار کے اپنی اونٹنی بٹھانے کی جگہ (عارضی آرام گاہ) بنایا ہے چنانچہ دور دراز (آخرت) کا ارادہ رکھنے والا یہاں تنگی اور مصیبت ہی پائے گا۔

5/28

آٹھویں فصل

اللہ تعالیٰ تمہیں قوت نصیب کرے جان لو! کہ میں نے اس عالم کو "اللہ والوں کے لئے" اسرار الٰہی کا محل، موجودات کو اُس کی امانتوں کی جگہ اور مخلوقات کو اس کے لطیف رموز کا مقام پایا ہے، اور جواہر، اعراض، عناصر، فلکی اجرام، ارضی اجسام اور مختلف طبائع سب کے

سب اُن اسرار کا حجاب ہیں اور مقام توحید میں اُن میں سے ہر ایک کا اثبات شرک ہے۔ پس اللہ تعالےٰ نے اس عالم کو محل حجاب میں رکھا ہے حتی کہ ہر ایک کی طبیعت نے اپنی جگہ پر اُسی کے حکم سے اطمینان پایا ہے اور اپنے وجود کی بنیاد پر توحید الٰہی سے حجاب میں رہ گئی ہے اور تمام ارواح اس عالم میں اس وجود کی آمیزش کی وجہ سے بے نیاز ہو گئی ہیں۔ اور تمام تر قربتوں کے باوجود اپنی نجات کے مقام سے دور رہ گئی ہیں یہی وجہ ہے کہ اسرار الٰہی تک پہنچنا انسانی عقل کے لئے مشکل ہو گیا اور قرب کے لطائف روحوں کے حق میں مخفی ہو گئے یہاں تک کہ انسان سایۂ غفلت میں رہ کر اپنے وجود کی وجہ سے حجاب میں ہو گیا ہے اور اپنے محل میں ظلمانی حجاب کی وجہ سے عیب دار بن گیا۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔ وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ (قسم ہے زمانہ کی بیشک انسان بڑے خسارے میں ہے) اور نیز فرمایا۔ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (بلا شبہ انسان بڑا ظالم اور جاہل ہے) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اِخْلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ فِیْ ظُلْمَةٍ ثُمَّ اَلْقٰی عَلَیْهِ نُوْرًا (اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو تاریکی میں پیدا کیا پھر اپنے نور کا پرتو ڈال کر اُسے روشن کر دیا) پس یہ حجاب ظلماتی عالم ناسوت میں خود اُس کے اپنے مزاج کی وجہ سے واقع ہوا ہے اور یہ اس کی طبیعت اور عقل کی وجہ سے ہے جو اُس سے تعلق رکھتی اور اس میں تصرف کرتی ہے اسی لیے اس نے جہالت پر اکتفا کر لیا اور حق سے اس حجاب کو اپنے لئے دل و جان سے خرید لیا ہے لہٰذا وہ کشف کے جمال سے بے خبر اور اسرار الٰہی سے روگردانی کرتے ہوئے حیوانات کے مقام پر آرام کئے ہوئے اور اپنی نجات کے مقام سے راہِ فرار اختیار کئے ہوئے ہے اس نے نہ تو توحیدِ الٰہی کی بُو سونگھی نہ جمالِ احدیت کا دیدار کیا اور نہ ہی توحید کا مزہ چکھا ہے۔ وہ ترکیبِ عناصر کی وجہ سے مشاہدۂ حق کی تحقیق سے عاجز اور دنیا کے لالچ کی وجہ سے اللہ تعالےٰ کی محبت سے روگرداں ہو گیا ہے اور حیوانی خواہشات نے حیاتِ ربانی کے بغیر اُس کے نفسِ ناطقہ کو اس قدر مغلوب کر دیا ہے کہ اُس کی تمام حرکات اور جستجو حیوانات کی سی ہو گئی ہے یہاں تک کہ وہ اب کھانے، سونے اور نفسانی خواہشات کی تابعداری کے سوا اور کچھ نہیں جانتا حالانکہ اللہ تعالےٰ نے اپنے دوستوں کو ان تمام باتوں سے پرہیز کرنے کا حکم دیتے ہوئے

ارشاد فرمایا ہے" ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ"
(انہیں اس حال میں چھوڑ دیجئے کہ وہ کھائیں اور زندگی کے اسباب سے فائدہ اٹھائیں
اور دُنیا کی خواہش انہیں غفلت میں مبتلا کر دے پھر عنقریب اُن کو سب حقیقت کا
علم ہو جائے گا) اس لیے کہ اُن کی طبیعت کے حکمران (نفس) نے مندالٰہی کو اُن پر مخفی کر دیا
اور اُن کے حصہ میں اللہ تعالےٰ کی توجہ اور توفیق کی بجائے ذلت اور محرومی آگئی تھی کہ وہ
سب سرکش نفس کے تابع ہو گئے جو سب سے بڑا حجاب اور برائی و شرارت کا سرچشمہ ہے
چنانچہ اللہ تعالےٰ نے ارشاد فرمایا۔ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ" (بلاشبہ نفس امارہ
بُرائی کا حکم دینے والا ہے)

اب میں کتاب کا آغاز کرتا ہوں اور مخفی مقامات اور حجابات سے تمہارا مقصود
نکال کر تم پر ظاہر کرتا ہوں اور اسے لطیف انداز بیان سے واضح کر دیتا ہوں اور اہل
صنائع کی عبارتوں کی تشریح کے ساتھ ساتھ مشائخ کا کلام بھی اُس کے ساتھ ملاتا
جاؤں گا۔ اور اس کی تائید میں عمدہ اور دلپذیر حکایات بھی بیان کروں گا تاکہ تمہیں
تمہارا مقصود حاصل ہو اور علماء ظواہر میں سے جو شخص بھی اس کتاب میں غور کرے
اسے معلوم ہو جائے کہ علم تصوف کی بنیاد قوی اور اس کی شاخیں پھل دینے والی ہیں اور
تمام مشائخ اہل علم ہوئے اور اپنے تمام ارادت مندوں کو تصوف کا علم حاصل کرنے پر ابھارتے
اور پھر اس پر مداومت کرنے کی تحریص دلاتے رہے ہیں نہ وہ خود لغو اور بیہودہ باتوں میں مبتلا
اور غلط راہ پر گامزن ہوئے اور نہ ہی اپنے مریدوں کو ایسا کرنے کی ترغیب دی کیونکہ بہت
سے مشائخ طریقت اور علماء تصوف نے اس موضوع پر کتابیں لکھیں اور اس کے معارف پر
بڑی لطیف عبارات میں ربانی علم اور خداداد بصیرت سے مضبوط دلائل قائم کئے۔ اور
اللہ ہی توفیق دینے والا ہے۔

پہلا باب

اثباتِ علم

علماء کی تعریف میں اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے اِنَّمَا یخشی اللہ مِنْ عِبَادِہِ العلماءُ" (بلا شبہ بندوں میں اللہ تعالےٰ کا خوف رکھنے والے وہی لوگ ہیں جو علماء ہیں) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ طَلَبُ العِلم فریضۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَۃٍ" (علم کی جستجو ہر مسلمان مرد عورت پر فرض ہے) نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اطلبوا العِلم وَلَوْ کَانَ بالعین" (علم کو تلاش کرو اگرچہ وہ چین ہی میں ہے۔ اور جان لو کہ علوم بہت ہیں اور انسان کی عمر بہت کم ہے اس لئے تمام علوم وفنون کا حاصل کرنا انسان پر فرض نہیں۔ مثلاً علم نجوم، طب حساب اور علم بدیع کی تمام صنائع بدائع وغیرہ کا حاصل کرنا ضروری نہیں البتہ علم نجوم کا اس قدر سیکھنا ضروری ہے کہ رات کے وقت نماز کے اوقات معلوم ہو سکیں۔ اسی طرح بیماری سے حفاظت کے لئے علم طب، مسائل وراثت کو سمجھنے کے لئے علم میراث اور حیض وعدت وغیرہ کو سمجھنے کے لئے علم فقہ، غرضیکہ علم کا اس قدر سیکھنا ضروری اور فرض ہے جس سے عمل درست ہو جائے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے غیر مفید علم سیکھنے والوں کی مذمت فرمائی ہے ارشاد ہے "یَتَعَلَّمُوْنَ مَا یَضُرُّھُمْ وَلَا یَنْفَعُھُمْ"۔ (اور وہ لوگ ایسا علم سیکھتے ہیں جو انہیں نقصان دیتا اور کوئی فائدہ نہیں دیتا) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسے علم سے اللہ تعالےٰ کی پناہ طلب کی ہے ارشاد فرمایا "اَللّٰھُمَّ اِنِّی اعوذُ بِکَ مِن علمٍ لا ینفعُ"۔ (اے اللہ میں بے فائدہ علم سے تیری پناہ مانگتا ہوں) پس تھوڑے علم سے بہت سا عمل کرنا چاہیئے۔ اور علم کے ساتھ عمل بھی ہونا چاہیئے! کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے" المتعبد بِلاَ فقہٍ کالحمار فی طاحونۃٍ" (علم دین کے حاصل کئے بغیر عبادت کرنے والا بغیر خراس کے گدھے کی طرح ہے) حضور علیہ السلام نے بے علم عبادت گذار کو خراس کے گدھے سے مشابہ قرار دیا ہے جو جتنا بھی گھومے اپنے پہلے قدموں پر ہی رہتا ہے اور آگے فاصلہ طے

نہیں کر سکتا۔

بہں نے عوام میں ایک ایسا طبقہ پایا ہے جو علم کو عمل پر فضیلت دیتا ہے اور دوسرا گروہ عمل کو علم سے برتر سمجھتا ہے حالانکہ یہ دونوں باطل ہیں، کیونکہ عمل بغیر علم کے عمل ہی نہیں ہوتا بلکہ عمل اسی وقت عمل بنتا ہے جب اس کے ساتھ علم شامل ہوتا کہ انسان اس کی وجہ سے مستحق ثواب ہو سکے مثلاً نماز۔ کہ جب تک پہلے ارکان طہارت۔ پاک پانی کی پہچان سمتِ قبلہ کی معرفت، کیفیت، نیت اور ارکان نماز کا علم نہ ہو اس وقت تک وہ نماز ہی نہیں ہوتی ۔ پس جب عمل درحقیقت علم کے بغیر علم ہی نہیں ہوتا تو جاہل کس طرح عمل کو علم سے جدا کر سکتا ہے ۔ اور جو لوگ علم کو عمل سے افضل سمجھتے ہیں وہ بھی صحیح نہیں کیوں کہ عمل کے بغیر علم بھی علم نہیں کہلاتا. جیسا کہ اللہ تعالٰے کا ارشاد ہے. نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ کِتَابَ اللّٰہِ وَرَآءَ ظُھُوْرِھِمْ کَاَنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (پہلی کتاب کے ایک فریق نے اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں) اللہ تعالٰے نے عالم بے عمل کا نام علماء کی فہرست سے نکال دیا ہے کیوں کہ علم کا حصول اور حفظ یہ سب بھی تو عمل ہی میں شامل ہے اس پر انسان مستحق ثواب قرار پاتا ہے اور اگر عالم کے قول و فعل سے اُس کے علم کا تعلق نہ ہو تو اُسے اس میں کچھ بھی ثواب حاصل نہیں ہوتا۔ اور اس میں دو گروہ ہیں. ایک گروہ جو لوگوں کو اُن کے علم کی وجہ سے بلند مرتبہ سمجھتا ہے اور اُن کے اعمال کا کوئی خیال نہیں رکھتا اور علم کی گہرائیوں سے ناواقفیت کی وجہ سے عمل کو اُس سے جدا کرتا ہے ایسے لوگ علم اور عمل دونوں سے عاری ہوتے ہیں یہاں تک کہ جاہل یہی سمجھنے لگتا ہے کہ قال (علم) کی نہیں صرف حال (عمل) کی ضرورت ہے ۔ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ علم ہونا چاہیئے عمل کی ضرورت نہیں۔

حضرت ابراہیم ادھم رحمہ اللہ تعالٰے بیان فرماتے ہیں کہ میں نے راستے میں پڑا ہوا ایک پتھر دیکھا اس پر لکھا تھا "مجھے اُلٹ کر پڑھ" پس میں نے اُسے پلٹا تو اس پر لکھا تھا اَنْتَ لَا تَعْمَلُ بِمَا تَعْلَمُ فَکَیْفَ تَطْلُبُ مَالَا تَعْلَمُ" (تو جانی ہوئی چیز پر تو عمل نہیں کرتا پھر اُس چیز کو کیسے تلاش کرتا ہے جسے نہیں جانتا) یعنی اس چیز پر عمل کر جس کو تو جانتا ہے تاکہ اُس

کی برکت سے نامعلوم کا علم حاصل کرے۔ اور انس رضی اللہ عنہ بن مالک کا فرمان ہے: "ھمۃ العلماء الدرایۃ وھمۃ السفھاء الروایۃ" (علماء کا کام علمی مسائل میں تحقیق و تدبر اور جاہلوں کا کام صرف روایتوں کو نقل کرنا ہے) اس لئے کہ علماء میں جہالت کے لوازم نہیں ہوتے اور جو لوگ علم سے دنیوی مرتبہ اور ظاہری عزت طلب کرتے ہیں وہ عالم نہیں ہوتے کیوں کہ دنیوی مرتبہ و عزت جہالت کے لوازم میں سے ہے اور کوئی مرتبہ علم کے مرتبہ سے اعلیٰ اور بلند نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے اگر علم حاصل نہ ہو تو لطیفہ رحمانی کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور جب علم موجود ہو تو وہ تمام مقامات، مشاہدات اور مراتب کا سزاوار ہو جاتا ہے واللہ اعلم بالصواب۔

دوسری فصل

علم کی اقسام

جان لو! کہ علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک علم الٰہی اور دوسرا علم مخلوق! مخلوق کا علم بذاتِ خود لاشئی محض ہے اور یہ علم الٰہی کی جستجو سے ہی حاصل ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ کا علم اللہ کی صفت ہے جو اللہ کی ذات کے ساتھ قائم ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات قدیم ہے لہٰذا اُس کی صفت علم بھی قدیم ہے اور اُس کے اوصاف کی کوئی حد و انتہا نہیں اور ہمارا علم ہماری صفت ہے جو ہمارے ساتھ قائم ہے اور ہمارے اوصاف کی حد و انتہا متعین ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا (تمہیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے) غرضیکہ علم مدح کی صفات میں سے ہے اس کی حد یہ ہے کہ معلوم چیز کا یہاں تک احاطہ کر لیا جائے کہ اس کو بیان کرنے پر قدرت حاصل ہو جائے اور علم کی عمدہ ترین تعریف یہ ہے۔ "العلمُ صفۃ یصیر الجاھلُ بھا عالمًا" (علم ایک صفت ہے جس سے جاہل انسان عالم بن جاتا ہے) اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے "واللّٰہُ مُحِیْطٌ بِالْکٰفِرِیْنَ" (اللہ تعالیٰ کافروں کو (اپنے علم کے) احاطہ میں لئے ہوئے ہے) یعنی کوئی چیز بھی اُس کے علم سے باہر نہیں۔ نیز اللہ تعالےٰ نے ارشاد فرمایا ہے "واللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝ (اللہ تعالےٰ کو ہر چیز کا علم ہے) اور اس کا علم ایک ہی ہے جس کی وجہ سے تمام معلومات و

موجودات کو وہ جانتا ہے اور مخلوق میں سے کوئی بھی اس کے ساتھ شریک نہیں۔ اور اللہ تعالےٰ کا علم نہ تو تجزیہ اور تقسیم کے قابل ہے اور نہ ہی اس کی ذات سے جدا ہے اور اُس کے فعل کی عمدہ ترتیب اُس کے علم کی دلیل ہے کیونکہ اپنی ترتیب و استحکام میں اپنے فاعل کے علم کا محتاج ہے پس اُس کا علم تمام اسرار پر حاوی اور ظاہری امور پر محیط ہے، طالب کو چاہیے کہ تمام افعال اس طرح سرانجام دے کہ گویا خدا اُس کو اور اس کے اعمال کو دیکھ رہا ہے جیسا کہ وہ جانتا ہے کہ اس کے اعمال اللہ تعالےٰ سے پوشیدہ نہیں۔

حکایت بیان کرتے ہیں کہ بصرہ کا ایک رئیس ایک روز اپنے باغ میں گیا تو اُس کی نگاہ اپنے کسان (باغبان) کی عورت پر پڑ گئی اور اُس کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو گیا، چنانچہ اُس کے خاوند کو کسی کام پر بھیج دیا اور عورت سے کہا کہ تمام دروازے بند کر دو"۔ عورت نے کہا باقی سب دروازے تو بند کر دوں لیکن ایک دروازہ میں بند کرنے کی سکت نہیں رکھتی" اس نے پوچھا "وہ کون سا دروازہ ہے"؟ عورت نے جواباً کہا "وہ دروازہ جو ہمارے اور اللہ تعالےٰ کے درمیان ہے"! یہ سن کر رئیس شرمسار ہوا اور توبہ کی۔

حکایت حاتم اصم (اللہ اُن سے راضی ہو) نے فرمایا کہ "میں نے چار علم حاصل کر کے باقی تمام علوم دنیا سے نجات پائی ہے" لوگوں نے سوال کیا" وہ چار علم کونسے ہیں؟ فرمایا۔ پہلا یہ کہ میں نے جان لیا کہ میرا رزق مقدر ہو چکا ہے اور اس میں کمی یا زیادتی نہیں ہو سکتی لہٰذا میں زیادہ کی جستجو سے بے فکر ہو گیا ہوں"۔ دوسرا یہ کہ میں نے جان لیا کہ مجھے ایک تلاش کرنے والا (یعنی موت) ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔ لہٰذا میں نے اس کی تیاری کر لی ہے۔ (یعنی نیک اعمال کرتا ہوں) اور چوتھا یہ کہ میں نے جان لیا ہے کہ میرا ایک مالک ہے جو میرے تمام احوال سے واقف ہے لہٰذا میں اس سے شرم کرتا ہوں اور ایسے کاموں سے اجتناب کرتا ہوں جن سے اُس نے منع کیا ہے کیونکہ بندہ جب یہ جانتا ہو کہ اللہ تعالےٰ اس کو ہر وقت دیکھ رہا ہے تو وہ کوئی ایسا کام نہ کرے گا جو قیامت کے روز اللہ تعالےٰ کے سامنے اُسے شرمندگی و ندامت سے دوچار کر دے۔

سنت لسی شر ر

تیسری فصل

علمِ شریعت

بندہ کو احکام الٰہی اور اللہ تعالیٰ کی معرفت کا علم ضرور ہونا چاہیئے، اور انسان پر علوم وقت کا حصول بھی فرض ہے۔ اور جو علم بوقتِ ضرورت کام آتا ہے اس کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن! اور اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک علم اصول اور دوسری علم فروع۔ علم اصول کا ظاہر کلمۂ شہادت ہے اور باطن معرفت الٰہی کی تحقیق اور علم فروع کا ظاہر دینی معاملات کو عمل میں لانا اور باطن نیت (عقیدے) کا درست کرنا لیکن یہ لازم و ملزوم ہیں ان میں سے ہر ایک کا وجود دوسرے کے بغیر محال ہے۔ حقیقت کا ظاہر باطن کے بغیر منافقت ہے اور اس کا باطن، ظاہر کے بغیر زندقہ (بے دینی) ہے۔ اور شریعت کا ظاہر، باطن کے بغیر نقصان اور باطن ظاہر کے بغیر محض ہوس ہے۔ ———— پس علم حقیقت تین ارکان پر مشتمل ہے (پہلا) ذات الٰہی اُس کی واحدانیت اور اس سے تشبیہ کی نفی کا علم" (دوسرا) اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کے احکام کا علم (تیسرا) اللہ تعالےٰ کے افعال اور ان کی حکمت کا علم"۔

اور علم شریعت کے بھی تین ارکان ہیں۔ (اوّل) کتاب الٰہی کا علم (دوم) سنت نبوی (علیہ التحیہ والسلام) کا علم (سوم) اجماع امت کا علم۔

اور خدا تعالیٰ کی ذات، صفات اور اُس کے افعال کو ثابت کرنے کا علم ضروری ہونے کی دلیل اللہ تعالےٰ کا یہ ارشاد ہے۔ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (جان لو کہ اللہ تعالےٰ کے سوا کوئی معبود نہیں) نیز یہ ارشاد۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰكُمْ۔ (جان لو کہ اللہ ہی تمہارا آقا اور مالک ہے) نیز یہ فرمان اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ" (کیا آپ نے اپنے پروردگار کی طرف نہیں دیکھا کہ اس نے سائے کو کس طرح پھیلایا ہے) اور یہ ارشاد ربانی اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ" (کیا یہ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ کس طرح (عجیب و غریب) پیدا کیا گیا ہے) اور اسی طرح کی اور بہت سی آئتیں جو افعال الٰہی میں غور و تدبر کرنے کی دعوت دیتی ہیں تاکہ تم اُن سے فاعل (حقیقی) کی صفات کو پہچان سکو ——— اور نیز رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے "مَنْ عَلِمَ اَنَّ اللّٰهَ رَبُّهٗ وَاَنِّیْ نَبِيُّهٗ حَرَّمَ اللّٰهُ لَحْمَهٗ وَدَمَهٗ عَلَى النَّارِ (جس نے یہ جان

یا کہ اللہ اس کا پروردگار اور میں اللہ کا نبی ہوں تو اللہ تعالےٰ نے اُس کا گوشت اور خون دوزخ کی آگ پر حرام کر دیا ہے) لیکن علم ذات الٰہی کے لئے شرط یہ ہے کہ عاقل، بالغ انسان یہ خوب جان لے کہ اللہ تعالےٰ بذات خود موجود ہے قدیم ہے نہ اُس کی ابتدا ہے نہ انتہا، نہ اُس کے سمت ہے نہ مکان، اس کی ذات ہر نقصان سے پاک ہے۔ مخلوق میں اُس جیسا کوئی نہیں۔ نہ اُس کی بیوی ہے نہ بچے اور جو کچھ تمہارے وہم وگمان اور تصور میں آتا ہے اُس کا پیدا کرنے والا قائم رکھنے والا اور مالک صرف وہی ہے۔ جیسا کہ اُس کا فرمان ہے" لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ وَّھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ" (کوئی چیز اُس کی مانند نہیں اور وہ سب کچھ سنتا دیکھتا ہے) لیکن صفات الٰہی کے علم کے لئے شرط یہ ہے کہ تو جان لے کہ اُس کی صفات اُس کی ذات کے ساتھ قائم ہیں اور دائمی وابدی ہیں، جیسا کہ علم قدرت، حیات، ارادہ، سمع، بصر، کلام اور بقا ــــــ چنانچہ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے" اِنَّہٗ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ" (بلا شبہ وہ سینوں کے راز جاننے والا ہے) نیز فرمایا اِفْعَالٌ لِّمَا یُرِیْدُ (وہ جو چاہے کرنے والا ہے) نیز فرمایا وَھُوَ الْحَیُّ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ" وہی ہے جو ہمیشہ سے زندہ ہے اُس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں) نیز ارشاد فرمایا۔ قَوْلُہُ الْحَقُّ وَلَہُ الْمُلْکُ" اُس کا فرمان حق ہے اور اسی کی حکومت ہے)

باقی اس کے افعال کے اثبات کا علم یہ ہے کہ تو جان لے کہ اللہ تعالےٰ ہی تمام مخلوقات کو اور اُس کے افعال کو پیدا کرنے والا ہے۔ چنانچہ اللہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ" وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ" (اور اللہ ہی نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے اعمال کو بھی تمام جہان کو (عدم سے) وجود دینے والا وہی ہے۔ خیر وشر کا اندازہ کرنے اور نفع ونقصان کو پیدا کرنے والا وہی ہے اسی لئے اس نے فرمایا۔ اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ (اللہ ہی ہر شے کا خالق ہے)

اور احکام شریعت کے اثبات کی دلیل یہ ہے کہ تو جان لے کہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہمارے پاس خارق عادت معجزے لے کر آئے، اور ہمارے رسول محمد علیہ السلام حق ہیں اور ان کے معجزے بہت زیادہ ہیں اور جو کچھ ظاہری اور پوشیدہ امور کے متعلق انہوں نے ہمیں خبر دی وہ سب کچھ حق ہے۔

شریعت کا پہلا رکن کتاب (قرآن مجید) ہے جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا۔ فِیْہِ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ

هُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ" (اس قرآن میں محکم آیتیں ہیں (جن کا مطلب ظاہر ہے) وہی کتاب کا اصل ہیں) اور دوسرا رکن سُنت (نبوی) ہے جیسا کہ فرمایا "وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا" (جو کچھ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں دیں وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تمہیں روکیں رک جاؤ!) اور تیسرا رکن اجماع امت ہے، جیسا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔ لَا تَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلَالَۃِ عَلَیْکُمْ بِالسَّوَادِ الْاَعْظَمِ" (میری امت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی تم پر لازم ہے کہ (اہل حق علماء کی) سب سے بڑی جماعت کی پیروی کرو۔) غرضیکہ حقیقت کے احکام بہت زیادہ ہیں اگر کوئی شخص ان سب کو جمع کرنا چاہیئے تو ہر گز نہیں کرسکتا؛ کیوں کہ اللہ عز اسمہٗ کے لطائف کی کوئی انتہاء نہیں۔

چوتھی فصل

سوفسطائیہ کا مذہب

جان لو کہ ملحدوں کا ایک گروہ "اللہ اُن پر لعنت کرے" جنہیں سوفسطائیہ کہا جاتا ہے" ان کا مذہب یہ ہے کہ کسی چیز کا صحیح علم حاصل نہیں ہوسکتا حتیٰ کہ کسی کو اپنی ذات کا بھی علم حاصل نہیں"۔ ہم اُن سے سوال کرتے ہیں کہ یہ علم کہ کسی چیز کا علم صحیح طور پر حاصل نہیں ہوسکتا" صحیح ہے یا نہیں؟ اگر وہ جواب دیں کہ "صحیح ہے" تو گویا انھوں نے علم کو خود ثابت کردیا۔ اور اگر وہ جواب دیں کہ "صحیح نہیں" ۔ تو جو بات صحیح ہی نہ ہو اس کو حق کے معارضہ ومقابلہ میں پیش کرنا محال ہے اور ایسے شخص کے ساتھ گفتگو کرنا عقلمندی نہیں ——— اور ملحدوں کا ایک اور گروہ ہے جو اسی طریق تصوف سے تعلق رکھتا ہے اس کا کہنا ہے کہ ہمارا علم کسی چیز میں درست نہیں لہٰذا اس علم کو ثابت کرنے کی بجائے اس کو ترک کردینا ہمارے لئے زیادہ بہتر ہے لیکن اُن کا یہ قول اُن کی حماقت اور جہالت پر مبنی ہے کیوں کہ عالم کا ترک دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو علم کی وجہ سے ہوگا یا جہالت کی وجہ سے ——— اگر علم کی وجہ سے ہے تو (سمجھ لو کہ) علم نہ تو علم کی نفی کرتا ہے اور نہ ہی اُس کی ضد ہوتا ہے پس علم کے ہوتے ہوئے علم کا ترک نفی ہی نہیں ——— باقی رہ گئی جہالت تو یہ طے شدہ بات ہے

کہ علم کی نفی جہالت ہے اور علم کا ترک بھی جہالت تو جاہل تو بہر حال قابل مذلت ہوگا اور جہالت تو کفر اور باطل کا قرینہ ہے کیونکہ حق کا جہالت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور یہ جہالت و ترک علم تمام صوفیہ و مشائخ کے عقیدہ کے خلاف ہے۔ اور جب تمام لوگوں نے ملحدین کا یہ قول سنا تو اس پر عمل کرتے ہوئے کہنے لگے کہ اہل تصوف کا یہی مذہب اور یہی روش ہے چنانچہ صوفیا کے متعلق اُن کا اعتقاد تشویش کا شکار ہو گیا۔ اور وہ لوگ حق اور باطل میں تمیز نہ کر سکے اس لئے ہم نے اُن کا معاملہ خدا کے سپرد کر دیا۔ تاکہ وہ اپنی گمراہی میں مبتلا رہیں۔ اگر دین اُن کا گریبان پکڑتا تو اس سے بہتر راہ عمل اختیار کرتے۔ اور دین کی رعایت کو یوں ہاتھ سے جانے نہ دیتے اور دوستانِ حق کو اس نگاہ سے نہ دیکھتے اور اپنے اوقات عزیز کو اس سے بہتر طور پر گزارتے اگر ملحدین کے کسی گروہ نے اولیائے کرام کے ساتھ اس طرح کا تعلق قائم کر لیا ہے کہ صوفیا کی نیک سیرتی کی بدولت انہیں اپنی دنیوی مصیبتوں سے نجات مل جائے اور اُن کی عزت کے زیر سایہ (امن و عافیت کی) زندگی بسر کرتے رہیں تو اُن کے لئے یہ ہرگز مناسب نہیں کہ وہ تمام اولیاء کرام کو ملحدوں پر قیاس کریں اور اُن کے معاملہ میں بے فائدہ جھگڑوں میں مبتلا ہو کر اُن کی عزت کو پاؤں تلے روندتے پھریں۔

میرا (یعنی علی ہجویری رحمہ اللہ کا) ایک مرتبہ مدعیان علم میں سے ایک ایسے شخص کے ساتھ مناظرہ ہوا جس نے کلاہِ غرور کا نام عزت، نفسانی خواہشات کی اتباع کا نام سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور شیطان کی موافقت کا نام ائمہ شریعت کی سیرت رکھا ہوا تھا۔ دورانِ مناظرہ اُس نے کہا کہ ملحدین کی بارہ جماعتیں ہیں ان میں سے ایک اہل تصوف کی ہے۔ میں نے کہا کہ اگر ایک جماعت صوفیا کی ہے تو باقی گیارہ گروہ تم لوگوں میں سے ہیں۔ تاہم اہل تصوف صرف ایک جماعت ہو کر بھی جس طرح اپنی حفاظت کر سکتے ہیں کہ تم گیارہ گروہ ہو کر بھی اس طرح اپنی حفاظت نہیں کر سکتے۔ تاہم یہ سب خرابیاں اہل زمانہ کی دین سے غفلت اور اس دور میں پیدا ہونے والے اُن فتنوں کا فطری نتیجہ ہے جو اس وقت برپا ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے دوستوں (اولیاء) کو ہمیشہ ان لوگوں کے درمیان پوشیدہ اور دنیا میں ان لوگوں کو اولیاء سے دور رکھا ہے۔ پیروں کے پیر اور مریدوں کے آفتاب (حضرت) علی بن بندار رحمہ اللہ نے کیا خوب

فرمایا ہے کہ۔ فَسَادُ القُلُوبِ علیٰ حَسَبِ فَسَادِالزَّمَانِ وَاَهْلِہٖ "دلوں کی خرابی زمانہ اور اہل زمانہ کی خرابی کے مطابق ہوتی ہے)

اب ہم اُن صوفیائے کرام کے اقوال پر مشتمل ایک فصل بیان کرتے ہیں تاکہ اس گروہ کے منکرین میں ایسے شخص کو تو تنبیہ ہو جائے جس کے حصہ میں اللہ تعالےٰ کی سچی مہربانیوں کی نعمت آئی ہو — اور توفیق تو اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

پانچویں فصل

اقوال صوفیاء

محمد بن فضل بلخی رحمہ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے" اَلعِلمُ ثَلَاثَةٌ عِلمٌ مِنَ اللّٰہِ وَعِلمٌ مَعَ اللّٰہِ وَعِلمٌ بِاللّٰہِ۔ (علم کی تین قسمیں ہیں (۱) وہ علم جو اللہ کی طرف سے عطا ہو (۲) وہ علم جو اللہ کی معیت میں حاصل ہو (۳) وہ علم جو اللہ تعالےٰ کی ذات و صفات سے متعلق ہو)

علم باللہ وہ معرفت کا علم ہے کہ تمام انبیا و اولیاء نے اللہ تعالےٰ کی ذات وصفات کو اسی کے ذریعہ پہچانا ہے اور جب تک خود ذاتِ خداوندی کی طرف سے انہیں اس معرفت کی توفیق عطا نہیں ہوئی یہ پہچان بھی نصیب نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ علم واکتساب کے تمام اسباب و ذرائع حق تعالےٰ کی ذات وصفات سے منقطع (مختلف) ہیں اور بندے کا علم حق تعالےٰ کی معرفت کا سبب نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ اس کی معرفت کا سبب بھی خود اس کی رہنمائی اور بندہ کو اُس کے آگاہ کرنے کے بغیر ممکن نہیں۔

اور علم من اللہ، شریعت مطہرہ کا علم ہے کہ اس کی طرف سے ہمیں نیک اعمال کا حکم دینا اور اُن کو بجا لانے کی ہمت تاکید کرنا ہے۔

اور علم مع اللہ حق کے مقامات، اُس کے طریق اور اولیاء کرام کے درجات کو بیان کرنے کا علم ہے پس علم شریعت کو قبول کئے بغیر معرفت الٰہی کا حصول نہیں ہو سکتا اور شریعت پر عمل کرنا مقامات حق کے اظہار کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

اور ابو علی ثقفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ اَلعِلمُ حَیَاۃُ القَلبِ مِنَ الجَھلِ وَنُورُ العَینِ مِنَ الظُّلمَۃِ، "جہالت کی موت سے دل کے زندہ ہونے اور ظلمتِ کفر سے ایمان کی آنکھ کے

روشن ہونے کا نام علم ہے) جس شخص کو معرفتِ خداوندی کا علم حاصل نہیں اُس کا دل جہالت کے باعث مردہ ہے اور جس کو شریعت کا علم حاصل نہیں اس کا دل جہالت کی بیماری میں مبتلا ہے، پس کافروں کا دل مردہ ہے کہ وہ اللہ تعالےٰ کی ذات وصفات سے ناواقف ہیں اور اہل غفلت کا دل بیمار ہے کہ وہ اُس کے احکام سے بے خبر ہے۔

اور ابوبکر وراق ترمذی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ "مَنِ اکْتَفٰی مِنَ الْعِلْمِ دُوْنَ الزُّهْدِ قَدْ تَزَنْدَقَ وَمَنِ اکْتَفٰی بِالْفِقْهِ دُوْنَ الْوَرَعِ فَقَدْ تَفَسَّقَ" (جو شخص علم کلام (توحید الٰہی) کی صرف عبارات پر ہی اکتفا کرتا ہے اور زہد و تقویٰ اختیار نہیں کرتا وہ زندیق (بے دین) ہے اور جو شخص پرہیزگاری اپنائے بغیر شریعت اور علم فقہ پر اکتفا کر لیتا ہے وہ فاسق ہو جاتا ہے) اس سے مراد یہ ہے کہ مجاہدہ و عمل کے بغیر توحید الٰہی کا اقرار جبر[1] ہے اور حقیقی موحد وہ ہوتا ہے جو قول میں جبری اور عمل میں قدری[2] ہو تاکہ اس کا طرز عمل جبر و قدر کے درمیان ہو جائے۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جو اُس پیر نے بیان کی ہے (اللہ اس پر رحمت کرے) "اَلتَّوْحِیْدُ دُوْنَ الْجَبْرِ وَفَوْقَ الْقَدَرِ" (توحید کا عقیدہ نظریۂ جبر سے نیچے اور نظریہ قدر سے اوپر ہے یعنی دونوں کے درمیان) پس جو شخص عمل کو اختیار کئے بغیر محض علم توحید کی عبارت پر اکتفا کرتا ہے اور اُس کے مخالف امور سے اجتناب نہیں کرتا وہ ضرور بے دین ہو جاتا ہے لیکن علم فقہ میں ہر بُرائی سے اجتناب شرط ہے اور جو شخص بغیر پرہیزگاری صرف ظاہری علم فقہ و شریعت حاصل کرے، احکام کی تاویلوں میں مصروف رہے اور شکوک و شبہات میں مبتلا ہو اور سہولت حاصل کرنے کے لئے مذہب کی پرواہ کئے بغیر مجتہدین کے اقوال کی تلاش میں لگا رہے۔ وہ بہت جلد فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتا ہے اور یہ سب کچھ غفلت کے باعث سامنے آتا ہے۔

اور شیخ المشائخ حضرت یحییٰ بن معاذ الرازی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا ہے۔ کہ

---

[1] جبریہ اس گروہ کو کہتے ہیں جو یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ انسان کا ہر فعل محض خدا کی تقدیر کے ماتحت ہے۔

[2] قدریہ: وہ گروہ جس کا عقیدہ ہے کہ ہر کام انسان محض اپنی ذاتی قدرت سے انجام دیتا ہے۔

اجتنب صُحبَةَ ثَلَاثَةَ اَصنَافٍ مِنَ النَّاس، العلماءِ الغافلین والفقراءِ المُداھنین وَالمتصوفۃِ الجاھلین "(تین قسم کے لوگوں کی صحبت سے بچو! غافل علماء خوشامدی فقیروں اور جاہل صوفیوں کی صحبت سے)

غافل علماء وہ ہیں جنہوں نے دنیا کو دل کا قبلہ بنالیا ہے اور شریعت کے آسان امور کو اختیار کر کے ظالم بادشاہوں کی پرستش کو اپنا وطیرہ اور اُن کے درباروں کو اپنے لئے طواف گاہ بنالیا ہے۔ لوگوں کی نگاہ التفات حاصل کرنے کو اپنا محراب بنا کر غرور اور اپنی دانائی پر فریفتہ اور اپنے کلام کی باریکیوں میں محو ہو گئے ہیں (نیز) دین کے آئمہ اور اساتذہ کے معاملہ میں لعن وطعن کی زبان دراز کر کے دین کے بزرگوں کی گستاخیاں کرتے ہیں۔ کلام کی زیادتی اور مبالغہ آمیزی میں اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ اگر دونوں جہاں (کی خوبیاں) ترازو کے پلڑے میں رکھ دیئے جائیں تو اُن کی نگاہ میں اُن کی بھی کوئی قدر وقیمت نہ ہوگی کیوں کہ انہوں نے کینہ اور حسد کو ہی اپنا مذہب بنالیا ہے۔ غرضیکہ درحقیقت یہ لوگ علم سے خالی ہیں کیوں کہ علم تو ایک ایسی صفت ہے کہ جس کو حاصل کرنے والا ہر قسم کی جہالت کی باتوں سے پاک وصاف ہو جاتا ہے۔

اور خوشامدی و چاپلوس فقیر وہ ہیں کہ جب کوئی انسان اُن کی خواہش کے مطابق کام کرے تو وہ اس کی تعریف کرتے ہیں اگرچہ وہ کام باطل ہی کیوں نہ ہو اور اگر کوئی شخص اُن کی خواہش کے خلاف کوئی کام کرے تو وہ اُس فعل کی وجہ سے اُس کی مذمت کرتے ہیں خواہ وہ کام حق ہی کیوں نہ ہو۔ اور لوگوں سے اپنے برتاؤ اور اپنے اعمال کی وجہ سے طمع کرتے ہیں کہ انہیں کوئی بلند مرتبہ مل جائے۔ اور خدا کی مخلوق کو باطل امور اور نافرمانی کے کاموں کی تلقین کرتے ہیں۔

اور جاہل صوفی وہ ہیں۔ جو نہ تو کسی مرشد کی صحبت میں رہیں نہ کسی بزرگ سے آداب نہیں سیکھیں اور نہ زمانہ کی مصیبتوں میں مبتلا ہوئے۔ بس اپنی کور باطنی کے باعث نیلا (فقیرانہ) لباس زیب تن کر کے اپنے آپ کو لوگوں میں ڈال دیا ہے اور اپنی بے عزتی پر اظہار مسرت کرتے ہیں اور اپنی حماقت کے باعث سب لوگوں کو اپنے جیسا سمجھتے ہیں لہٰذا حق اور باطل کے درمیان تمیز کرنے کی راہیں ان پر مخفی رہتی ہیں۔ پس یہ تینوں گروہ جن کا اُس تو فقیہ یافتہ مرشد نے ذکر کیا اور

اپنے مریدوں کو ان کی صحبت سے اجتناب کرنے کا حکم دیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تینوں گروہ اپنے دعوائے تصوف میں جھوٹے اور اپنے طریق میں ناپسندیدہ ہیں۔

اور حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں: "عَمِلْتُ فِی المجاهدۃِ ثَلٰثِیْنَ فَمَا وَجَدْتُ شَیْئًا اَشَدَّ عَلَیَّ مِنَ العِلْمِ وَ مُتَابَعَتِہٖ" (میں تیس سال مجاہدے میں مصروف رہا ہوں لیکن علم اور اُس کے مطابق عمل کرنے سے زیادہ کسی چیز کو اپنے لئے مشکل و دشوار نہیں پایا) الغرض طبیعت کے لئے آگ پر پاؤں رکھنا علم کے مطابق چلنے سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ اور جاہل کے لئے علم کا ایک مسئلہ سیکھنے سے پل صراط سے ہزار بار گزرنا زیادہ آسان ہے اور فاسق کے لئے علم کے ایک مسئلہ پر عمل کرنے کی بجائے دوزخ میں رہنا زیادہ پسندیدہ ہے۔ پس تمہارے لئے لازم ہے کہ علم حاصل کرو اور پھر اس کو درجۂ کمال تک پہنچاؤ۔ اور بندہ کے علم کا کمال بھی علم الٰہی کے مقابلہ میں جہالت ہی ہے، لہٰذا اس سے متعلق تمہیں اس قدر جاننا چاہیئے کہ تم کچھ نہیں جانتے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ تو سوائے علم بندگی کے کچھ بھی نہیں جانتا اور بندگی ہی خدا اور بندہ کے درمیان سب سے بڑا حجاب ہے اور اسی مضمون کو یوں بیان کیا گیا ہے شعر

"العِجزُ عَن دَرکِ الاِدراکِ اِدرَاکٌ

وَالوُقُوفُ فِی طَرِیقِ الجَهلِ اِشرَاکٌ"

ترجمہ:۔ اللہ تعالےٰ کی حقیقت معلوم کرنے سے عاجز و درماندہ ہونا ہی اُس کی حقیقت کا ادراک ہے اور جہالت کی راہ میں ٹھہر جانا شرک ہے۔ یعنی جو شخص علم سیکھنے کی بجائے اپنی جہالت پر مصر رہتے وہ مشرک ہے۔ اور جو سیکھتا ہے اور پھر کمال علم کی وجہ سے اُس پر حقیقت کا ظہور ہو جاتا اور علم کا غرور اس سے دُور ہو جاتا ہے وہ جان لیتا ہے کہ معرفت الٰہی میں اس کا علم، عاجزی کے سوا کچھ نہیں کیونکہ حقائق کی معرفت کے سلسلہ میں وہبی معلومات کا قطعاً اعتبار نہیں ہوتا۔ یہ عجز ہی اس کے لئے دریافت اور علم کی حقیقت سے واقفیت ہے۔

دوسرا باب

فقر

فقر اور اُس کا مقام جان لو کہ اللہ تعالےٰ کے ہاں درویشی کو عظیم رتبہ اور درویشوں کو بلند مقام حاصل ہے جیسا کہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں کہ لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ أُحْصِرُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ''(صدقات) اُن فقیروں کا حق ہیں جو اللہ کی راہ میں محصور کر دیئے گئے ہوں کہ زمین میں چل پھر نہیں سکتے، اُن کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے جاہل اُن کو غنی سمجھتا ہے) اور نیز فرمایا ہے'' ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ ''(اللہ نے ایک ایسے عبد مملوک کی مثال بیان کی ہے جو کسی چیز پر قادر نہیں) اور یہ بھی فرمایا ہے'' تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا (اُن کے پہلو خواب گاہوں (بچھونوں) سے الگ رہتے ہیں اور وہ خوف اور امید کی حالت میں اپنے رب کو پکارتے ہیں) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فقر کو پسند کیا اور فرمایا ہے۔ اَللّٰهُمَّ أَحْيِنِيْ مِسْكِيْنًا وَّأَمِتْنِيْ مِسْكِيْنًا وَّاحْشُرْنِيْ فِيْ زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنِ'' (اے اللہ! مجھے مسکینی کی حالت میں زندہ رکھ۔ مسکینی کی حالت میں وفات دے اور قیامت کے روز مجھے مسکینوں کے گروہ میں اٹھا) نیز آپؐ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالےٰ فرمائیں گے۔ اُدْنُوْا مِنِّيْ أَحِبَّائِيْ فَيَقُوْلُ الْمَلٰئِكَةُ مَنْ أَحِبَّاؤُكَ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ الْفُقَرَاءُ وَالْمَسَاكِيْنُ'' (اے میرے دوستو! میرے قریب ہو جاؤ، فرشتے عرض کریں گے۔ اے اللہ آپ کے دوست کون ہیں ؟ تو اللہ فرمائیں گے فقیر اور مسکین لوگ) اور اس مضمون کی آیات اور احادیث بہت سی ہیں اور اس حد تک مشہور ہیں کہ اثباتِ فقر میں بطور دلیل اُن کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ایسے کئی مہاجر درویش موجود تھے جو اللہ تعالےٰ کی عبادت و بندگی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و متابعت کے شوق میں مسجد نبویؐ میں بیٹھے رہتے تھے۔ اور انہوں نے دنیا کے تمام مشاغل کو ترک کر دیا تھا اور اپنی روزی کے لئے اللہ تعالےٰ کی ذات پر توکل کئے ہوئے

تھے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن کی صحبت اور اُن کا حق ادا کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ چنانچہ اللہ عزوجل نے فرمایا۔ اَلَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوۃِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَہٗ ۔ (اے پیغمبر! جو لوگ صبح وشام اپنے رب کو پکارتے اور اُس کی خوشنودی چاہتے ہیں اُنہیں اپنے سے دور نہ کیجئے!) اور نیز فرمایا۔ وَلَا تَعْدُ عَیْنٰکَ عَنْھُمْ تُرِیْدُ زِیْنَۃَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا۔ (اے نبی! آپ ان فقراء سے آنکھیں نہ پھیریئے! کیا آپ دنیاوی زندگی کی شان وشوکت کے طالب ہیں؟) یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے کسی کو جہاں دیکھ لیتے تو فرماتے "میرے ماں باپ ان پر فدا ہوں کہ ان کے واسطے میرے اللہ نے مجھ پر عتاب فرمایا ہے۔" پس اللہ تعالےٰ نے فقر کو بڑا بلند رتبہ اور درجہ عطا کیا ہے اور فقراء کو اس درجہ کے ساتھ مخصوص کیا ہے کیونکہ ان فقراء نے دنیا کے ظاہری و باطنی ہر قسم کے اسباب کو چھوڑ کر پوری طرح اسباب کو پیدا کرنے والے (اللہ تعالےٰ) کی طرف رجوع کر لیا ہے یہاں تک کہ اُن کا فقر اُن کے لئے فخر بن گیا کہ وہ اُس کے چلے جانے پر نالاں و آبدیدہ اور اُس کے آجانے پر مسرور و خوش ہو گئے اور اُس کو اس طرح سینے کے ساتھ لگا لیا کہ اُس کے لوازم کے سوا ہر چیز کو ذلیل و خوار سمجھا۔

تاہم فقر کی ایک رسم ہے اور ایک حقیقت: اُس کی رسم (بظاہر) افلاس اور اضطرار ہے اور حقیقت خوش نصیبی اور اختیار ہے۔ جس کسی نے صرف رسم کو اپنایا اور اُس پر قناعت کر لی اور اُسے مقصود حاصل نہ ہوا تو وہ حقیقت سے دور بھاگنے لگا۔ لیکن جس نے حقیقت کو پالیا اُس نے تمام موجودات سے منہ موڑ لیا اور کُل (ذات خداوندی) کی رویت میں فنا ہو کر بقائے کل کی طرف پیش قدمی کی۔ جیسا کہ کہا گیا ہے مَنْ لَمْ یَعْرِفْ سِوَی رَسْمِہٖ لَمْ یَسْمَعْ سِوَی اِسْمِہٖ (جو شخص فقر کی ظاہری علامت "رسم" کے سوا کچھ نہیں جانتا وہ اس کے اسم (نام) کے علاوہ کچھ نہیں سنتا) پس فقیر وہ ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔ اور نہ اُسے اپنی کسی چیز میں خلل و نقصان کا خدشہ ہو۔ وہ نہ تو دنیوی اسباب کے موجود ہونے سے غنی ہوتا ہے اور نہ اُن کے نہ ہونے سے اُس کا محتاج ہوتا ہے اُس کے فقر کے نزدیک اسباب کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے، بلکہ اگر وہ اُن اسباب کے نہ ہونے پر خوش ہو تو جائز ہے کیونکہ مشائخ نے کہا ہے کہ درویش

جس قدر تنگ دست ہو اُتنا ہی وہ خوش حال ہوتا ہے کہ اسباب کا وجود درویش کے لئے بہت بُرا ہے یہاں تک کہ جس قدر وہ کسی چیز کے لئے اپنے دروازے بند نہیں کرے گا اُسی قدر اس میں گرفتار رہے گا پس اولیاء اللہ کی زندگی مخفی عنایات اور اسرار کے ساتھ، قربِ حق میں زیادہ بہتر ہے نہ کہ بیوفا اسبابِ دنیا کے ساتھ جو فاجروں (بدکاروں) کا گھر ہے' پس دنیا کا ساز و سامان رضاءِ الٰہی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

حکایت بیان کرتے ہیں کہ ایک درویش کی کسی بادشاہ سے ملاقات ہو گئی۔ بادشاہ نے فقیر سے کہا "تمہیں اگر کوئی حاجت درپیش ہے مجھ سے مانگ" فقیر نے جواب دیا کہ "میں اپنے غلاموں کے غلام سے کوئی چیز طلب نہیں کرتا۔ بادشاہ نے کہا یہ کیسے ہے؟ درویش نے کہا حرصِ دنیا اور اس کی آرزو یہ دونوں میرے غلام ہیں۔ لیکن یہ دونوں آپ کے آقا ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ اَلْفَقْرُ عِزٌّ لِاَهْلِهٖ (فقر درویشوں کے لئے عزت ہے) پس جو چیز اپنے مستحق کے لئے باعثِ عزت ہے۔ وہی چیز نااہل کے لئے باعث ذلت ہوتی ہے، اور فقر کی عزت اس میں ہے کہ اُس کے اعضاء لغزشوں سے اور اُس کا حال ہر قسم کے خلل سے محفوظ ہو نہ اس کا جسم لغزش و معصیت سے ملوث ہو اور نہ ہی اُس کے دل و جان آفت زدہ ہوں کیوں کہ اُس کا ظاہری حال ظاہری نعمتوں میں مستغرق ہوتا ہے اور اس کا باطن روحانی نعمتوں کا سرچشمہ ہوتا ہے یہاں تک کہ اس کا جسم روحانی اور اس کا دل ربانی ہو جاتا ہے اور مخلوق کو اُس کے ساتھ کوئی تعلق اور نسلِ آدم کو اس سے کوئی واسطہ نہیں رہتا کیونکہ وہ نہ تو مخلوق سے تعلق اور لگاؤ کی وجہ سے فقیر ہوتا ہے اور نہ ہی اس دنیا کی مال و دولت سے غنی ہوتا ہے بلکہ دونوں جہاں اُس کے فقر کے ترازو کے پلڑے میں مچھر کے پَر کے برابر بھی وزن نہیں رکھتے اور اس کی ایک سانس بھی دونوں جہاں کی وسعتوں میں نہیں سما سکتی۔

دوسری فصل

فضیلت فقر و غنا اور مشائخ کا اختلاف: فقر و غنا کی فضیلت میں مشائخ صوفیاء کا

اختلاف ہے کہ ان دونوں صفات میں سے کون سی صفت زیادہ فضیلت کی حامل ہے چونکہ اللہ تعالےٰ غنی حقیقی ہے اور تمام صفات میں سے اُس کی صفات کو کمال حاصل ہے اس لئے یحییٰ بن معاذ رازی احمد بن ابی الحواری، حارث المحاسبی، ابو العباس ابن عطار رویم بن محمد، ابوالحسن بن شمعون اور متاخرین میں سے شیخ المشائخ، ابوسعید فضل اللہ بن محمد المھینی رحمہم اللہ علیہم اجمعین (سب اس پر متفق ہیں کہ غنا کو فقر پر فضیلت حاصل ہے۔ اور اس کی یہ دلیل بیان کرتے ہیں کہ غنا، صفت الٰہی ہے (جو پاک اور بلند و بالا ہے) اور اس کی ذات پر فقر کا اطلاق کرنا جائز نہیں۔ پس کسی ولی میں ایسی صفت جو خدا اور بندہ کے درمیان مشترک ہو وہ اُس صفت سے اعلیٰ و افضل ہوتی ہے جس کی نسبت ذات حق تعالیٰ کی طرف کرنا جائز نہ ہو۔ ہم کہتے ہیں بندہ اور خدا کے درمیان یہ اشتراک صرف رسمی ہے معنوی نہیں کیونکہ باہمی مماثلت کے بغیر معنوی اشتراک نہیں ہو سکتا لہٰذا چونکہ اللہ تعالےٰ کی صفات قدیم اور مخلوق کی صفات حادث ہیں اس لئے یہ دلیل باطل ہے — اور میں علی بن عثمان جلابی (رحمہ اللہ) یہ کہتا ہوں کہ غناء کا نام صرف ذاتِ خداوندی کے ہی لائق ہے اور مخلوق اس نام کی مستحق نہیں اور مخلوق کے لئے فقر کا نام ہی سزاوار ہے اور حق تعالےٰ پر اس کا اطلاق ناجائز ہے۔ اور یہ جو کسی کو مجازی طور پر غنی کہہ دیا جاتا ہے تو اس طرح وہ حقیقی غنی نہیں بن سکتا۔ نیز اس سے زیادہ واضح دلیل یہ ہے کہ ہمارا غناء تو اسباب کا محتاج ہے اور ہم اُن اسباب کو قبول کرتے ہیں لہٰذا ہم مسبّب ہیں اور حق تعالےٰ اسباب کے پیدا کرنے والے ہیں لہٰذا ان کا غنا حقیقی ہے اور اسباب کا محتاج نہیں۔ پس اللہ تعالےٰ اور بندے کے درمیان اشتراک بالکل باطل ہے۔ اور نیز جب حق تعالےٰ کی ذات میں کسی کی شرکت جائز نہیں، تو صفت میں کسی طرح کسی کا اشتراک جائز ہوگا۔ اور جب صفت میں اشتراک نہیں ہو سکتا تو اسم میں بھی اشتراک جائز نہ ہوگا — باقی رہ گیا صرف نام رکھنا سو نام تو خدا اور مخلوق کے درمیان ایک علامت ہوتا ہے اور اس کی کوئی حد نہیں، پس خدا تعالےٰ کا غنا یہ ہے کہ اُس کو کسی کی ضرورت نہیں، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ کوئی اس کو ارادے کو ٹالنے والا اور اُس کی قدرت کو روکنے والا نہیں وہ موجودات کو بدلنے

اور اُن کی اضداد پیدا کرنے پر قادر ہے وہ ہمیشہ اس صفتِ غنا سے متصف ہے اور ہمیشہ اس سے متصف رہے گا ـــــ لیکن مخلوق کا غناء اسباب زندگی کے حصول یا خوشی حاصل ہونے یا کسی مصیبت سے نجات پانے یا کسی چیز کے مشاہدہ سے آرام پانے کی وجہ سے ہوا کرتا ہے اور یہ سب باتیں حادث اور تغیر پذیر ہیں، جستجو و حیرت کا سرمایہ اور عاجزی و ذلت کا محل ہیں۔ پس غنا کا اسم بندہ کے لئے مجازی اور حق تعالےٰ کے لئے حقیقی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالےٰ ہے یَاَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ اِلَی اللّٰہِ وَاللّٰہُ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ" (اے لوگو! تم اللہ کی طرف محتاج ہو اور اللہ ہی غنی، حمد و ثنا کا سزاوار ہے) نیز اُس نے فرمایا ہے۔ "وَاللّٰہُ الْغَنِیُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ" (اللہ ہی غنی ہے اور تم محتاج ہو) عام لوگوں کے ایک گروہ کا کہنا یہ ہے کہ ہمارے نزدیک ایک دولت مند کو درویش پر فضیلت حاصل ہے کیونکہ اسے اللہ تعالےٰ نے دنیا و آخرت میں خوش بخت پیدا کیا ہے اور اس پر تونگری کا احسان فرمایا ہے ــ اس گروہ کے ہاں غنا سے دنیا کی کثرت ـ انسانی مقصود کا حصول اور شہوت پرستی مراد ہے اور اس پر بطور دلیل یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے غنا پر شکر ادا کرنے کا حکم دیا اور فقر پر صبر کا حکم فرمایا ہے پس صبر مصیبت پر اور شکر نعمت پر ہوتا ہے۔ اور نعمت مصیبت سے افضل ہوتی ہے ـ ہم کہتے ہیں کہ نعمت پر شکر کا حکم نعمت پر اضافے کا موجب بنایا گیا ہے لیکن فقر پر صبر کو قرب الٰہی کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے چنانچہ ارشاد فرمایا۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ (بلا شبہ اللہ تعالےٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے) اور شکر کو نعمت کی زیادتی کا سبب قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ (اگر تم شکر کرو گے تو تمہارے لئے نعمت پر اضافہ کردوں گا) جو شخص کسی نعمت پر کہ جس کی اصل غفلت ہے، شکر کرے گا اُس کی غفلت پر ہم غفلت کا اضافہ کر دیں گے اور جو شخص فقر میں کہ اس کی اصل مصیبت ہے صبر کا مظاہرہ کرے گا ہم اُس کے قرب میں اور اضافہ فرما دیں گے۔ تاہم جن غناء کو صوفیا کرام فقر سے افضل کہتے ہیں وہ غنا نعمتوں کا پانا نہیں جیسا کہ عوام الناس سمجھتے ہیں۔ بلکہ وہ تو منعم حقیقی (خداوند تعالےٰ) کو پالینا ہے۔ پس منعم حقیقی کا پالینا الگ چیز ہے اور غفلت کا پالینا دوسری چیز ہے۔ شیخ ابو سعید (رحمہ اللہ) فرماتے ہیں "اَلْفَقْرُ ھُوَ الْغِنَاءُ بِاللّٰہِ" (اللہ تعالےٰ

کے ساتھ غنی ہونے کا نام فقر ہے) اس سے مراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات کے مشاہدہ سے ہمیشہ کے لئے کشف حاصل ہو جائے۔ ہم کہتے ہیں کہ کشف کے ذریعہ حق کا مشاہدہ کرنے والے پر دوبارہ حجاب آ جانا ممکن ہے۔ یعنی اگر یہ حجاب مشاہدہ کرنے والوں کو مشاہدہ حق سے محجوب کر دے تو کیا وہ مشاہدہ کا ضرورت مند ہو گا یا نہیں؟ اگر وہ کہیں کہ وہ محتاج نہیں ہو گا یہ تو بالکل محال ہے اور اگر کہیں کہ وہ محتاج ہو گا تو ہم کہتے ہیں کہ جب اُسے احتیاج لاحق ہوئی تو غنا جاتا رہا اس لئے فقر کی یہ تعریف درست نہ ہوئی) اور نیز غنا باللہ صرف اسی شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جس کی صفات کو دوام اور مقصد کو بقا حاصل ہو اور اوصاف انسانی پر غنا کا اطلاق درست ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ ذاتی طور پر غنا کے قابل ہی نہیں۔ اس لئے کہ بشریت کا وجود ہی ضرورت و نیاز کا پیکر ہے اور احتیاج حادث ہونے کی علامت ہے لہٰذا غنی وہ ہی ہو سکتا ہے جس کی صفت کو بقا حاصل ہو۔ اور جس کی صفت فنا ہونے والی ہو اس پر اس اسم کا اطلاق صحیح نہیں پس اَلْغَنِیُّ مَنْ اَغْنَاہُ اللّٰہُ (غنی وہی ہے جس کو اللہ غنی کرے)، لہٰذا غنی باللہ کی صورت میں فاعل بندہ ہو گا لیکن مَنْ اَغْنَاہُ اللّٰہُ کی صورت میں بندہ مفعول ہو گا اور فاعل بذات خود قائم ہوتا ہے لیکن مفعول کا وجود فاعل کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے۔

پس اپنی ذات کے ساتھ قائم ہونا صفتِ بشریت کا ثابت کرنا ہے اور قائم بحق ہونا بندہ کی صفت کا محو کرنا ہے (پہلی صورت غلط اور دوسری صحیح ہے) اور میں علی بن عثمان جلابی (اللہ تعالیٰ مجھے توفیق بخشے) کہتا ہوں کہ جب بندگی میں یہ بات درست ہے۔ کہ درحقیقت صفتِ بقا پر غنا کا اطلاق صحیح نہیں کیوں کہ دلائل مذکورہ سے آدمی کی صفت کا بقا محلِ علت اور سبب آفت ہوتا ہے اور صفت کا فنا خود غنا نہیں ہو سکتا کیونکہ جو چیز بذاتِ خود باقی نہ ہو اس کا کوئی نام نہیں رکھا کرتے۔ پس غنا کا نام فنائے صفت رکھنا چاہیئے اور جب صفت فانی ہوئی تو نام کا محل بھی باقی نہ رہا۔ غرض صفتِ غنا ذاتِ حق سے متجاوز نہیں ہو سکتی (اور صفتِ فقر بندہ سے متجاوز نہیں ہو سکتی لہٰذا) بندہ پر نہ تو فقر کے اسم کا اطلاق ہو سکتا ہے نہ غنا کا۔

پھر جملہ مشائخ صوفیہ اور علماء کی اکثریت فقر کو غنا پر ترجیح دیتے ہیں کیوں کہ قرآن و سنت اس کی فضیلت پر ناطق ہیں اور امت کی اکثریت بھی اس پر متفق ہے۔ میں نے حکایات میں پایا ہے کہ حضرت جنیدؒ اور ابن عطاء کے درمیان ایک دن اس مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی۔ ابن عطاءؒ نے اغنیاء کو افضل قرار دیا اور دلیل یہ پیش کی کہ اللہ تعالےٰ ان سے براہ راست حساب لیں گے۔ اور براہ راست حساب میں بلا واسطہ کلام محل عتاب میں ہوتا ہے اور عتاب تو دوست کی طرف سے دوست کو ہی ہوتا ہے (لہٰذا غنی اللہ کے دوست اور فقیر سے افضل ہوئے) حضرت جنیدؒ نے فرمایا "اگر اللہ تعالےٰ غنی لوگوں سے حساب لیں گے تو فقیروں سے عذر چاہیں گے اور عذر حساب سے افضل ہوتا ہے اور یہاں ایک عجیب لطیفہ ہے کہ محبت کے معاملات میں عذر بیگانگی ہوتا ہے اور عتاب کرنا مخالفت۔ اور دوست تو محبت کے اس مقام پر ہوتے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں دوستانہ تعلقات میں ان کے لئے آفت اور مصیبت معلوم ہوتی ہیں۔ کیوں کہ عذر نہ تو دوست کے کسی فرمان میں کوتاہی کے سبب ہوتا ہے اور دوست جب اپنا حق مانگتا ہے تو وہ عذر کرتا ہے اور عتاب، دوست کا حکم بجا لانے میں قصور کی وجہ سے ہوتا ہے اس وقت دوست اُس قصور پر عتاب کرتا ہے اور یہ دونوں امر محال ہیں۔ غرضیکہ مطالبہ دونوں سے ہوتا ہے۔ فقیروں سے صبر کا اور امیروں سے شکر کا۔ لیکن دوستی میں نہ تو دوست دوسرے دوست سے کچھ طلب کرتا ہے اور نہ ہی دوست اپنے دوست کے فرمان سے روگردانی کرتا ہے۔ کہتے ہیں ظَلَمَ مَنْ سَمّٰی ابن آدم امیراً وَمَنْ سَمَّاہُ رَبُّہٗ فقیراً (جس نے ابن آدم کا نام امیر رکھا اس نے ظلم کیا کیونکہ اللہ نے اس کا نام فقیر رکھا ہے) یعنی جس کا نام حق تعالےٰ نے فقیر رکھا ہے وہ فقیر ہی ہے اگرچہ بظاہر وہ امیر ہی کیوں نہ ہو۔ ہلاک ہوا وہ شخص جس نے سمجھا کہ وہ امیر نہیں اگرچہ اُس کی نشست گاہ تخت و سریر ہے۔ کیونکہ اغنیاء صاحب صدقہ ہوتے ہیں اور فقراء صاحب صدق۔ اور صاحب صدق ہرگز (درجہ میں) صاحب صدقہ کی طرح (کم تر) نہیں ہو سکتا۔ پس درحقیقت سلیمان علیہ السلام کا فقر سلیمان علیہ السلام کے غنا کی طرح ہے اس لئے کہ

اللہ تعالےٰ نے جس طرح حضرت ایوب علیہ السلام کو ان کے انتہائی صبر کی وجہ سے انہیں "نعم العبد" (وہ بہت ہی اچھا بندہ ہے) فرمایا ہے اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کو ان کی حکومت کے درست ہونے پر انہیں "نعم العبد" فرمایا ہے۔ پس جب اللہ تعالےٰ کی رضا حاصل ہوگئی تو سلیمان علیہ السلام کے فقر کو ان کے غنا کی طرح کردیا۔

حکایت

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ میں نے استاد ابوالقاسم قشیری رحمہ اللہ سے سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ مردان حق نے فقر اور غنا کے متعلق کلام کیا ہے اور ہر ایک نے ان میں سے ایک بات اپنے لئے اختیار کرلی ہے لیکن میں اپنے لئے اس چیز کو اختیار کرتا ہوں جس کو اللہ تعالےٰ میرے لئے پسند فرمائیں اور مجھے اس میں بحفاظت رکھیں۔ اگر وہ مجھے دولت مند کریں تو میں غفلت شعار نہ ہو جاؤں اور اگر درویش بنادیں تو لالچی اور روگرداں نہ بن جاؤں۔ پس غنا نعمت ہے اور غفلت اس میں آفت ہے اور فقر نعمت ہے اور کفر و حرص اس میں آفت ہے۔ اور فقر و غنا کے بارے میں یہ تمام باتیں اختلافِ روش کے باوجود اچھی ہیں تاہم غور سے دیکھا جائے تو ماسوائے حق سے دل کا فارغ ہونا، فقر ہے اور غیر اللہ میں دل کے مشغول ہونے کا نام غنا ہے۔ جب ماسوی اللہ سے فراغت حاصل ہوگئی تو نہ فقر غنا سے بہتر رہا، اور نہ غنا۔ فقر سے برتر ہوا۔ غنا کثرتِ متاع اور فقر قلتِ مال کا نام نہیں کیونکہ سامان دنیا سب اللہ تعالےٰ کی ہی ملکیت ہے۔ جب طالبِ حق نے ملکیت کو ترک کردیا تو درمیان سے شرکت رفع ہو گئی اور وہ دونوں (فقر اور غنا) ناموں سے فارغ ہوگیا۔

تیسری فصل

مشائخ کے اقوال

مشائخ طریقت میں سے ہر ایک نے فقر اور غنا کے متعلق اپنے اپنے خیال کا اظہار فرمایا ہے اور میں اس کتاب میں انشاء اللہ حتی الامکان ان کے اقوال بیان کروں گا۔

چنانچہ متاخرین میں سے ایک بزرگ کا ارشاد ہے "لَیْسَ الْفَقِیْرُ مَنْ خَلَا مِنَ الزَّادِ

اِنّما الفقرِ مَنْ خلاَ مِنَ المرادِ" (فقیر وہ نہیں جو دنیا کے سازوسامان سے خالی ہاتھ ہو بلکہ وہ ہے جس کی طبیعت مراد سے خالی ہو) چنانچہ اگر اللہ تعالےٰ اُسے مال عطا فرمائیں اور اس کی مراد مال کی حفاظت ہو تب بھی وہ غنی ہے اور اگر اس کی مراد ترک مال ہو تو بھی وہ غنی ہی ہے کیوں کہ یہ دونوں غیر کی ملک میں تصرف کی ہی صورتیں ہیں لیکن فقر تو مال کی حفاظت اور تصرف دونوں کے ترک کر دینے کا نام ہے۔

یحیٰی بن معاذ رازیؒ فرماتے ہیں کہ "علاَمَتُہ الفقرِ خَوْفُ الفقر" (فقر کی علامت یہ ہے کہ بندہ ولایت کے کمال اور قیام مشاہدہ کی صفت زائل ہو جانے اور حق سے دور ہو جانے سے ڈرتا رہے) غرضیکہ اُس کمال تک پہنچ جائے کہ اُس سے جُدا ہونے سے ڈرتا رہے۔ رویم بن محمد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ "نُعْتُ الفقرِ حِفْظُ سِرِّہٖ وَحیانۃُ نفسِہٖ واَدَاءُ فریضتہٖ" (فقر کی تعریف یہ ہے کہ فقیر اپنے باطن کی حفاظت کرے اپنے نفس کو دنیوی اغراض سے بچائے رکھے اور جو احکام اس پر فرض ہیں انہیں ادا کرتا رہے) چنانچہ جو کچھ اُس کے باطن پر گزرے اس کے اظہار میں مشغول نہ ہو اور جو کچھ اُس کے جسم پر گزرے باطن کو اُس میں مشغول نہ کرے اور دل پر ہونے والی واردات کا غلبہ فرض کی ادائیگی سے مانع نہ ہو اور درحقیقت یہ بشریت کے زائل ہونے کی علامت ہے کہ بندہ پوری طرح حق کے موافق ہو جائے۔ اور یہ بات بھی صرف حق تعالیٰ کی توفیق سے ہی حاصل ہوتی ہے

بشر حافی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "اَفْضَلُ المقامَاتِ اعتقَادُ الصبرِ علی الفقر" (سب سے افضل مقام، فقر پر صبر کا اعتقاد کرنا ہے) یہ درویش پر دائمی صبر کا اعتقاد کرنا بندہ کے لئے مقامات قرب میں سے سب سے افضل مقام ہے۔ پس درویشی پر صبر کا اعتقاد کرنا اعمال وافعال کی بربادی اور اوصاف کے فنا ہونے کی علامت ہے۔ تاہم اس قول کے ظاہری معنی ہیں "فقر کو غنا پر فضیلت دینا اور اس بات کا اعتقاد کرنا کہ طریق فقر سے ہرگز روگردانی نہ کروں گا۔ حضرت شبلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ الفَقِیرُ مَنْ لاَ یَسْتَغْنِی بِشَیءٍ دُوْنَ اللہِ (فقیر وہ ہے جو اللہ تعالےٰ کے علاوہ کسی چیز سے بھی مطمئن نہیں ہوتا) یعنی فقیر اللہ تعالےٰ کے بغیر کسی

چیز سے آرام نہیں پاتا کیوں کہ اس کی ذات کے علاوہ اُس کا کوئی مقصود و مطلوب نہیں ہوتا اس لفظ کا ظاہری معنی یہ ہے کہ اُس کی ذات کے علاوہ کسی چیز سے تُو غنا اور تونگری حاصل نہیں کر سکتا۔ جب تُو نے اُس کو پالیا تو غنی ہو گیا۔ پس تیری ہستی حق تعالےٰ کے سوا ہے اور جب تونگری اُس کے سوا (دنیا اور اُس کے اسباب) کو ترک کئے بغیر حاصل نہیں کر سکتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ) تو خود تونگری کا حجاب ہوا اور جب تک تو راہ سے اٹھ نہ جائے تونگر کس طرح ہو سکتا ہے اور اہلِ حقیقت کے نزدیک یہ بات انتہائی باریک اور لطیف ہے۔ اور اس قولِ حقیقی کا مفہوم یہ ہے کہ "اَلْفَقِیْرُ اَنْ لَا یَسْتَغْنِیَ عَنْہُ" (فقیر وہ ہے جو ذاتِ حق سے کبھی مستغنی نہ ہو) یعنی فقیر وہ ہے جسے کبھی غنا حاصل نہ ہو۔ اور یہی وہ بات ہے جو اُس پیر یعنی خواجہ عبداللہ انصاری رحمہ اللہ نے فرمائی ہے کہ "ہمارا غم ابدی ہے نہ ہماری ہمت ہرگز مقصود کو پاتی ہے اور نہ ہماری کلیت (حقیقتِ بشری) دنیا اور آخرت میں فنا ہوتی ہے اس لئے کہ کسی چیز کے حصول کے لئے اس کا ہم جنس ہونا ضروری ہے اور حق تعالےٰ کی ذات بشریت کی ہم جنس نہیں اور اس کے ذکر سے روگردانی غفلت ہے اور درویش غافل نہیں ہوتا۔ پس یہ ایک دائمی آزمائش ہو گئی اور راستہ دشوار گزار ہے کیوں کہ دوستی اُس ذات کے ساتھ ہے جس کے دیدار کے لئے انسانی کوشش کو کوئی راہ نہیں اور اس کا وصال خلقت کی قدرت سے باہر ہے۔ اللہ تعالےٰ کے ماسویٰ کوئی چیز بقا اختیار نہیں کر سکتی اور ذاتِ حق تعالےٰ کی بقا میں کوئی تغیر جائز نہیں ۔ فانی کبھی باقی نہیں ہو سکتا کہ "مجانست کی وجہ سے وصل حاصل ہو جائے اور نہ باقی کبھی فانی ہو سکتا ہے کہ قرب حاصل ہو جائے۔ لہٰذا اولیاء اللہ کا کام سراسر دشوار اور محنت طلب ہے پس لوگوں نے دل کی تسلی کے لئے ایک مضمون بنا سنوار رکھا ہے اور جان کے آرام کے لئے مقامات، منزلیں اور اُن کے راستے بنا رکھے ہیں اور اُن کے حصول کے لئے خود بخود خوبصورت عبارتیں تیار کر لی ہیں اور اُن کے مقامات متعین کر لئے ہیں اور اللہ تعالےٰ تو مخلوق کے اوصاف و احوال سے منزہ ہیں۔

اور ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ نَعْتُ الْفَقِیْرِ اَلسُّکُوْتُ عِنْدَ الْعَدَمِ وَالْبَذْلُ عِنْدَ الْوُجُوْدِ وَقَالَ اَیْضًا اَلْاِضْطِرَابُ عِنْدَ الْوُجُوْدِ" (فقیر کی صفت یہ ہے کہ چیز کی عدم

موجودگی میں خاموش رہے اور موجودگی کی صورت میں اُسے خرچ کرے اور یہ بھی کہا ہے کہ اس چیز کے موجود ہونے کی صورت میں بیقرار رہے) یعنی فقیر جب کچھ نہ پائے تو خاموشی اختیار کرئے اور جب پائے تو دوسروں کو اپنے اوپر فوقیت دے اور اُن پر خرچ کرئے۔ پس بڑی عظمت کا حامل کام یہ ہے کہ جس کو خوراک کی ضرورت ہو اور یہ مطلوب (خوراک) اُسے میسر نہ ہو تو مطمئن رہے اور جب وہ مطلوب حاصل ہو جائے تو اس کو دے دے جسے وہ اپنی ذات سے زیادہ اُس کا مستحق (ضرورت مند) سمجھتا ہے۔ اور اس قول کے دو معنی ہیں۔

ایک یہ کہ نعمت دنیا کے موجود نہ ہونے کی صورت میں اللہ تعالےٰ کی ذات پر راضی اور مطمئن رہنا اور نعمت کے موجود ہونے کی صورت میں دوسروں پر خرچ کرنا یہ محبتِ الٰہی ہے اس لئے کہ راضی بہ رضا کا مطلب ہے کہ فرمانبرداری قبول کرنے والا۔ اور فرمانبرداری قربِ الٰہی کی علامت ہے اور محب نعمت کا ترک کرنے والا ہوتا ہے کیوں کہ نعمتِ دنیا میں فرقت کی علامت موجود ہے۔ دوسرے معنی یہ کہ نعمت کے موجود نہ ہونے کی صورت میں سکونِ قلب، نعمت کے عدمِ انتظار کا نام ہے اور جب وہ نعمت موجود ہو تو چونکہ وہ ذاتِ حق کا غیر ہے اور فقیر کو غیر اللہ کے ساتھ آرام نہیں اس لئے وہ اس کو ترک کر دے اور شیخ المشائخ ابوالقاسم جنید بن محمد بن جنید رحمۃ اللہ کے اُس فرمان کا یہی مطلب ہے جو انہوں نے فرمایا کہ اَلفَقرُ خلق القَلبِ عَنِ الاَشکَالِ" (دل کے ماسویٰ اللہ کی صورتوں سے خالی ہونے کا نام فقر ہے) جب اُس کا دل ماسویٰ اللہ کے اندیشہ سے خالی ہو تو ماسویٰ اللہ کی جتنی شکلیں ہیں۔ اُنہیں باہر ہی پھینک دینا چاہیئے۔

شبلی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں" اَلفَقرُ بَحرُ البَلَاءِ وَبَلَاءُہٗ کُلُّہٗ عِزٌّ" درویشی مصیبت کا دریا ہے اور اُس کی تمام مصیبتیں عزت ہیں) اور (حقیقی) عزت فقر کا ہی حصہ ہے کیونکہ فقیر عین مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے اُس کو غیر کی کیا خبر یہاں تک کہ جب وہ مصیبت سے توجہ ہٹا کر مصیبت میں مبتلا کرنے والے (حق تعالےٰ) کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کی مصیبت اس کے لئے عینِ عزت بن جاتی ہے۔ اور اس کی عزت قربت، اس کی قربت۔ محبت اور

اُس کی محبت سب مشاہدہ بن جاتی ہے یہاں تک کہ طالب کا دماغ غلط خیال کی وجہ دیدار کا محل بن جاتا ہے کہ بغیر کان کے سنتا ہے اور بغیر آنکھ کے دیکھتا ہے۔ پس عزت والا بندہ وہ ہے جو دوست کی مصیبت کا بوجھ برداشت کرے کیونکہ بلا، حقیقت میں عزت اور نعمت حقیقت میں ذلت ہوتی ہے اس لئے کہ عزت وہ ہے جو بندے کو اللہ تعالےٰ کے حضور حاضر کر دے اور ذلت وہ ہے جو اُس کو وہاں سے غائب کر دے اور فقر کی آزمائش حضورِ حق کا اور غنا کی راحت اُس سے دوری کا نشان ہے۔ پس بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہونے والا عزیز اور اُس سے غائب ہونے والا ذلیل ہے۔ اور وہ آزمائش جس کا مطلب مشاہدہ اور دیدار محبت ہو اُس کے ساتھ جس طرح بھی تعلق حاصل ہو غنیمت ہے۔

جنید رحمہ اللہ فرماتے ہیں" یَا مَعْشَرَ الْفُقَرَاءِ اِنَّکُمْ تُعْرَفُوْنَ بِاللّٰہِ وَتُکْرَمُوْنَ لِلّٰہِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ تَکُوْنُوْا مَعَ اللّٰہِ اِذَا خَلَوْتُمْ بِہٖ" (اے فقراء کے گروہ! تم اللہ کے واسطے سے پہچانے جاتے ہو اور اللہ کے لئے تمہاری عزت کی جاتی ہے پس دیکھو کہ خلوت میں اللہ تعالےٰ کے ساتھ تمہارا کیا معاملہ ہے) یعنی جب لوگ تمہیں درویش کہتے اللہ کے واسطے سے تمہیں پہچانتے، تمہاری عزت و تکریم کرتے اور تمہارے حقوق بجا لاتے ہیں تو تمہیں غور کرنا چاہیئے کہ تم درویشی کے حقوق کہاں تک پورے کر رہے اور اگر لوگ تمہارے دعوے کے برعکس کسی اور نام سے پکاریں تو تمہیں ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے کیوں کہ اس صورت میں تم سے بھی اپنے دعوے کا حق ادا نہیں کیا ہو گا۔ کیوں کہ سب سے کمینہ وہ انسان ہے جسے لوگ اللہ کا بندہ سمجھیں لیکن خود وہ اُس کا بندہ نہ ہو۔ اور وہ انسان اچھا ہے جسے لوگ اللہ کا بندہ سمجھیں اور وہ واقع میں بھی اس کا بندہ ہے لیکن سب سے عزت والا انسان وہ ہے جسے لوگ اللہ کا بندہ نہ سمجھیں لیکن حقیقت میں وہ اللہ کا بندہ ہو۔ جس شخص کو لوگ بندہ خدا سمجھیں لیکن وہ ایسا نہ ہو اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو طبیب ہونے کا مدعی ہو۔ لوگوں کا علاج بھی کرے لیکن اُس کی حالت یہ ہو کہ اُسے کسی چیز کا علم نہ ہو اور وہ لوگوں کو اور زیادہ بیمار کر دے اور جب کبھی خود بیمار ہو جائے تو اپنا علاج نہ کر سکے اور دوسرے طبیب کا محتاج ہو۔ اور جس شخص کو لوگ بندہ خدا سمجھیں اور وہ ایسا ہی

ہو اُس کی مثال اُس شخص جیسی ہے جو طبیب ہونے کا دعویدار ہو، لوگوں کا علاج بھی کرے اور جب خود بیمار ہو جائے تو اپنا علاج بھی خود کرے اسے کسی دوسرے طبیب کی ضرورت نہ ہو ۔ اور جس شخص کو لوگ بندۂ حق نہ سمجھیں لیکن حقیقت میں وہ بندہ خدا ہو اس کی مثال اُس شخص جیسی ہے جو طبیب ہو اور لوگوں کو اس کا علم نہ ہو اور وہ عوام میں مشغول ہونے سے فارغ ہو اپنے آپ کو موافق غذاؤں فرحت بخش شربتوں اور معتدل ہواؤں سے صحت مند رکھتا ہے تاکہ بیمار نہ ہو جائے حالانکہ لوگوں کی آنکھیں اس کے حال سے بند ہیں ۔ اور بعض متاخرین نے کہا ہے کہ اَلْفَقْرُ عَدَمٌ بِلَا وُجُوْدٍ (فقر، عدم بلا وجود ہے) اس قول کا معنی بیان نہیں کیا جا سکتا کیونکہ معدوم، کوئی چیز نہیں ہوتا، اور کسی چیز کے بغیر غیر چیز کی تعبیر نہیں کی جا سکتی پس یہاں صورت یہ ہوگی کہ فقر کوئی چیز نہیں اور تمام اولیاء اللہ کی عبارتیں اور اُن کا اجماع کسی اصول پر مبنی نہیں ۔ کیوں کہ فقر اپنی ذات میں فانی اور معدوم ہے اور یہاں اس عبارت میں نہ تو عین (ذاتِ فقر) کا عدم مراد لیتے ہیں کہ عین سے انت کا عدم مراد لیں اور آدمی کے تمام اوصاف آفت ہی ہیں جب آفت کی نفی ہوئی تو یہ صفت کا فنا ہوا اور صفت کا فنا اللہ تعالےٰ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اور اُس تک نہ پہنچنے کو اُن کے سامنے سے رفع کر دینا اور اُن کی روش کے مخالف کو یہی چیز نفی عین معلوم ہوتی ہے اور انہیں ہلاکت میں ڈال دیتی ہے

اور میں نے متکلمین کی ایک جماعت کو دیکھا ہے کہ وہ اس معنی کی باریکیاں معلوم نہیں کر پائے اور اس پر ہنستے اور کہتے ہیں کہ یہ بات معقول نہیں اور میں نے دعوےٰ کرنے والے ایک اور گروہ کو دیکھا ہے جو عقل میں نہ ہونے والی اس بات کو قبول کر کے اس پر اعتماد کئے ہوئے ہے ۔ لیکن اصل کیفیت سے بے علم نہ ہونے کی وجہ سے کہتے ہیں کہ "الفقر عدمٌ بلا وجودٍ"۔ کہ فقر لاشیٔ محض ہے اس کا کوئی وجود نہیں ۔ یہ دونوں گروہ غلطی پر ہیں ان میں سے ایک تو اپنی جہالت کی وجہ سے حق تعالےٰ کا منکر ہو گیا ۔ اور دوسرے گروہ نے جہل کو حال بنا لیا ہے اور اسی میں مست ہو گیا ہے اور طبقۂ صوفیا کی عبادات میں عدم اور فنا سے مراد برے اسباب اور بری صفات سے کنارہ کش ہونا اور عمدہ پاکیزہ صفات

کا طالب ہونا ہے یہ نہیں کہ طلب کا سبب موجود ہوتے ہوئے بھی عدم سے عدمِ ذات مراد لیا جائے۔ الغرض درویش فقر کے جملہ معانی سے خالی اور اس کے تمام اسباب سے بیگانہ ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اسرارِ ربانی کی گزرگاہ ہوتا ہے جب تک اُس کے معاملات خود اُس کے کسب سے سرزد ہوتے ہیں تو اُن کی نسبت خود اُسی کی طرف کی جاتی ہے۔ اور جب اُس کے امور اُس کے کسب کے حال سے آزاد ہو جاتے ہیں فعل کی نسبت بھی اُس سے منقطع ہو جاتی ہے اُس وقت اس پر جو بھی حالت گزرتی ہے وہ نہ اُس کے اپنے ارادے سے آتی ہے اور نہ اُس کے ارادے سے جاتی ہے۔ وہ کسی چیز کو خود اپنے اوپر نہ وارد کر سکتا ہے اور نہ ہی اُسے دور کر سکتا ہے کیوں کہ یہ تمام حالات عین ذاتِ حق کی طرف سے ہوتے ہیں خود اُس کی علامت بن جاتے ہیں۔

میں نے متکلمین کا ایک ایسا گروہ بھی دیکھا ہے جو نفی وجود کو ہی عین فقر تصور کرتا ہے اور یہ اُن کے اپنے کمال کی نفی ہے اور یہ بات انتہائی عجیب معلوم ہوتی ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ عینِ فقر میں فقر کی نفی سے ہو سکتا ہے اُن کی مراد صفت کی نفی ہو کیوں کہ میں نے دیکھا ہے کہ وہ طلبِ حقیقت کی نفی کو فقر و صفوت کا نام دیتے ہیں اور نفسانی خواہشات کا اثبات اُن کے نزدیک نفیِ کل ہے گویا اُن میں سے ہر شخص فقر کے حجابوں سے کسی ایک درجے پر رکا ہوا اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہی بات اُس کے کمالِ ولایت کی علامت ہے اور اس بات کی محبت اور اس کا ارادہ تمام غائتوں کی غایت ہے۔ گویا اُن کی محبت محل کمال کی محبت ہے۔ پس اس بات کے طالب کے لئے ان کی راہ پر چلنے۔ اُن کے مقامات طے کرنے اور اُن کی عبادات کے سمجھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تاکہ وہ محل خواص میں عام نہ رہیں کیوں کہ جو عوام خواص کے بارے میں کچھ نہیں جانتے وہ اصول سے اعراض کرتے ہیں اور جو عوام فرع سے واقف نہیں وہ فروع سے روگردانی کرتے ہیں، جو کوئی فرع سے منہ موڑتا ہے اُس کا تعلق اصول سے ہوتا ہے لیکن جو اصولوں سے ہی ناواقف ہو تو کہیں بھی اس کا ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ اور یہ تمام باتیں میں نے اس لئے یہاں بیان کر دی ہیں تاکہ تم ان حقائق کے معانی کو اچھی طرح سمجھ لو اور اُن کی رعایت کرتے ہوئے اُن کی

راہ اختیار کرو اور اُن کی حفاظت میں مشغول رہو ـــــــ اب میں اس جماعت صوفیاء کے چند اصول و رموز اور تصوف کے باب میں اُن کے بعض اشارات کی وضاحت کرتا ہوں۔ اس کے بعد ان مردانِ حق کے اسماءِ گرامی کا ذکر کروں گا۔ اس کے بعد مشائخ صوفیہ کا اختلافِ مذاہب بیان کروں گا اور اس کے بعد حتی الامکان اُن کے مقالات کے آداب و رموز بیان کروں گا تاکہ تجھ پر اور دوسرے پڑھنے والوں پر اس تصوف کی حقیقت منکشف ہو جائے۔

تیسرا باب

تصوّف کے بیان میں

فصل اوّل

اللہ عزوجل نے فرمایا ہے "وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں اور جب جاہل اُن سے ہم کلام ہونے لگتے ہیں تو وہ کہتے سلام ہے) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے "مَنْ سَمِعَ صَوْتَ اَهْلِ التَّصَوُّفِ فَلَا یُؤْمِنَ عَلٰی دُعَائِهِمْ کُتِبَ عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الْغَافِلِیْنَ" (جو شخص اہل تصوف کی آواز سنے اور اُن کی پکار پر یقین نہ کرے اللہ تعالٰے کے ہاں وہ غافلوں میں لکھا جاتا ہے) لوگوں نے اس اسم تصوف کی تحقیق میں بہت سی باتیں کہی ہیں اور متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ صوفی کو صوف کا لباس زیب تن کرنے کی وجہ سے صوفی کہا جاتا ہے ایک اور گروہ یہ کہتا ہے کہ صوفی کو اس لئے صوفی کہتے ہیں کہ وہ (قرب الٰہی کی) صف میں ہوتا ہے۔ ایک گروہ کے مطابق اس کو اصحاب صفہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ محبت و تعلق کی وجہ سے صوفی کہا جاتا ہے۔ اور ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ اسم لفظ صفا سے مشتق ہے۔

ہر کسی کے نزدیک تصوف کے معنی کی تحقیق میں بہت سے لطائف ہیں۔ لیکن لغت کے اعتبار سے اس کا مفہوم اِن معانی سے دُور ہو جاتا ہے۔ پس صفا تمام چیزوں میں قابل تعریف ہے اور اس کی ضد کدورت ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "ذَهَبَ صَفْوُ الدُّنْیَا وَبَقِیَ کَدَرُهَا" (دنیا کی صفائی چلی گئی اور اس کی کدورت باقی رہ گئی) اور کسی چیز کے لطائف و خوبی کا نام اُس کی صفائی و پاکیزگی ہے، پس چونکہ

اس قصہ (تصوف) والوں نے اپنے اخلاق ومعاملات کو مہذب (درست) کرلیا ہے اور اپنی طبیعت کا آفات سے چھٹکارا حاصل کرلیا ہے اس لئے ان کو صوفی کہتے ہیں اور یہ نام ان لوگوں کا "اسم علم" ہے اس لئے کہ ان کا حق اس سے زیادہ و بزرگ ہے کہ ان کے معاملات کو مخفی رکھا جا سکے یہاں تک کہ وصفی معنی پر دلالت کے لئے) اُن کے اسم کے لئے بھی کسی ایسے مادہ سے ہی مشتق ہونا چاہیئے (جس سے یہ مقصد حاصل ہو جائے) اور اس دور میں اللہ تعالےٰ نے بہت سے لوگوں کو تصوف اور اہل تصوف سے حجاب میں رکھا ہے اور اس تصوف کی لطافت کو اُن کے دلوں سے پوشیدہ کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ ایک گروہ کا خیال یہ ہوگیا کہ اس کام میں صرف ظاہری احوال کی اصلاح ہے باطن کا مشاہدہ موجود نہیں۔ اور ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ صوفی صرف ایک اسم ہے جس کی کوئی اصل اور حقیقت نہیں یہاں تک کہ بیہودہ لوگوں کی دیکھا دیکھی ظاہر بین علماء نے بھی اس طریق تصوف کی اہلیت کا انکار کر دیا ہے اور اس حال کے حجاب ہی سے خوش ہو گئے ہیں حتیٰ کہ عوام نے اُن کی تقلید کرتے ہوئے صفائی باطن کی طلب کو دل سے مٹا دیا ہے۔ اور سلف وصحابہؓ کے مذہب کو بالائے طاق رکھ دیا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ امام الصوفیاء

؎ اِنَّ الصَّفَا صِفَۃُ الصِّدِّیق! اِن اردتَ صوفیاً عَلَی التحقیق!

ترجمہ:- اگر تم حقیقی صوفی بننا چاہتے ہو! تو تمہیں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی پیروی کرنا ہوگی) کیوں کہ بلاشبہ صفائے باطن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صفت ہے) اس لئے کہ صفائے باطن کی ایک اصل ہے اور ایک فرع! اس کی اصل دل کے اعتبار سے منقطع ہونا اور اس کی فرع بے وفا دنیا سے دل کا خالی ہونا ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں حضرت ابوبکر صدیق اکبر عبداللہ بن ابی قحافہ رضی اللہ عنہما کی صفات ہیں۔ اس لئے کہ اہل طریقت کے امام وہی تھے اور اُن کے دل کے غیر اللہ سے منقطع ہونے کا یہ عالم تھا کہ جب تمام صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حضرت معلیٰ اور مکان مصطفےٰ میں تشریف

لے جانے (وفات پا جانے) سے شکستہ دل ہو چکے تھے حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تلوار کھینچے کہہ رہے تھے کہ جو شخص یہ کہے گا کہ پیغمبر علیہ السلام فوت ہو گئے ہیں اس کا سر قلم کر دوں گا۔ اس وقت صدیق اکبرؓ باہر تشریف لائے اور بلند آواز سے فرمایا "اَلَا مَنْ کَانَ یَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَمَنْ عَبَدَ رَبَّ مُحَمَّدٍ فَاِنَّہٗ حَیٌّ لَا یَمُوتُ (لوگو آگاہ ہو جاؤ کہ جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پرستش کرتا تھا پس (اُس کے معبود) محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تو موت واقع ہو گئی اور جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پروردگار کی عبادت کرتا تھا۔ تو وہ رب تو زندہ ہے کبھی نہیں مرے گا) پھر آپؓ نے اس آیتِ کریمہ کی تلاوت فرمائی "وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ" (محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے ایک رسول ہی تو ہیں۔ آپؐ سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ پس اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو کیا تم دین سے ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے؟) یعنی جس شخص کے معبود محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے اس کا معبود تو چل بسا اور جو خدائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پوجا کرتا تھا۔ اُس کا معبود زندہ ہے ہرگز نہیں مرے گا۔ اور جس آدمی نے فانی چیز کے ساتھ دل لگا لیا تو فانی تو یقیناً فنا ہو جاتی ہے اور اس کے فنا ہو جانے پر اُسے رنج والم حاصل ہو گا اور جس نے ہمیشہ باقی رہنے والے کے حضور اپنی جان سپرد کر دی تو جب اس کا نفس فنا ہو جاتا اور روح کا تعلق جسم سے منقطع ہو جاتا ہے تو وہ (اس کے باوجود) بقائے دوام سے باقی رہتا ہے پس جس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو چشم آدمیت سے دیکھا جب وہ اُس دنیا سے رحلت فرما گئے تو اس کے دل سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم بھی اٹھ گئی۔ اور جس شخص نے آپ کی ذات کو چشم حقیقت سے دیکھا اُس کے لئے حضور علیہ السلام کا اس دنیا میں رہنا اور اس دنیا سے تشریف لے جانا دونوں امر برابر ہیں کیونکہ اُس نے حالتِ بقا میں آپؐ کی بقا کو بواسطہ حق سبحانہ اور حالتِ فنا میں آپؐ کی فنا کو اللہ تعالےٰ کی جانب سے ہی سمجھا اور وہ مُحَوَّلْ "تبدیل کئے ہوئے جسمِ اقدس) سے اعراض کر کے "مُحَوِّلْ" (تبدیل کرنے والے

حق تعالےٰ) کی طرف متوجہ ہوا۔ محوّل کا قیام محوِّل کے واسطہ سے دیکھا، اور اکرام حق کی مقدار آپؐ کی تعظیم کی نہ کسی مخلوق میں اپنا دل لگایا اور نہ اپنی نگاہ کسی مخلوق پر ڈالی کیونکہ شعر

مَنْ نَظَرَ اِلَی الْخَلْقِ هَلَكَ وَمَنْ رَجَعَ اِلَی الْحَقِ مَلَكَ

ترجمہ :۔ (جس نے مخلوق کی طرف نگاہ ڈالی وہ ہلاک ہو گیا اور جس نے حق تعالےٰ کی طرف رجوع کیا وہ فرشتہ بن گیا) یعنی مخلوق پر نظر رکھنا ہلاکت کی اور رجوع الی الحق فرشتہ ہونے کی علامت ہے۔

اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دل کا دنیائے غدار سے خالی ہونے کا عالم یہ تھا کہ مال۔ اسباب اور غلاموں میں سے جو کچھ آپ کے پاس تھا راہِ حق میں دے دیا اور خود ایک گدڑی پہن کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پوچھا "مَاخَلَّفْتَ لِعِیَالِكَ فقالَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ" (تم نے اپنے مال واسباب میں سے اہل وعیال کے لئے پیچھے کیا چھوڑا ہے؟ انہوں نے عرض کی "دو بیش بہا خزانے چھوڑ آیا ہوں" حضور علیہ السلام نے سوال کیا وہ کیا ہیں؟ عرض کی ایک اللہ تعالےٰ کی محبت اور دوسری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت) جب اُن کا دل دُنیا کی خوبصورتی کے تعلق سے آزاد ہو گیا۔ تو انہوں نے اس کی کدورت سے اپنے ہاتھ کو بھی خالی کر دیا۔ اور ایک صوفی صادق کی یہی صفت ہوتی ہے۔ اور ان باتوں کا انکار حق سے انکار اور مکابرہ (ایک دوسرے پر بڑائی ظاہر کرنا) ہے اور میں کہتا ہوں کہ صفا کدر کی ضد ہے۔ اور کدر بشری صفات میں سے ہے۔ پس فی الحقیقت صوفی وہ ہے جو کدورت بشری سے کنارہ کش ہو کر آگے نکل گیا ہو۔ جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے مشاہدہ اور اُن کے حسن وجمال میں استغراق کی وجہ مصر کی عورتوں کی بشریت اُن پر غالب ہو گئی تھی۔ لیکن جب اس غلبہ سے یہ بشریت سے گزر کر فناء بشریت پر جا کر ٹھہریں تو بے اختیار پکار اٹھیں مَا هٰذَا بَشَرًا (یہ کوئی بشر تو نہیں) انہوں نے نشانہ تو حضرت یوسف علیہ السلام کو بنایا لیکن اپنی حالت کا بیان کیا۔ یہی وجہ ہے کہ مشائخ طریقت رحمہم اللہ نے فرمایا ہے کہ "لَیْسَ الصَّفَا مِنْ صِفَاتِ الْبَشَرِ لِاَنَّ الْبَشَرَ مَدَرٌ وَالْمَدَرُ لَا یَخْلُوْ مِنَ الْکَدَرِ" (صفائے باطن اوصاف بشریت میں سے

نہیں کیونکہ بشر پیکرِ خاکی ہے اور وجودِ خاکی کدورت سے خالی نہیں ہو سکتا) یعنی صفائے باطنی پیکرِ خاکی کی صفات میں سے نہیں کیوں کہ خاک کا مدار کدورت کے بغیر نہیں (اس لئے) بشر کدورت سے نکل نہیں سکتا پس صفاءِ باطن کی مثال افعال سے بیان نہیں کی جا سکتی اور مجاہدات کی وجہ سے بشریت کو زوال نہیں ہو سکتا بلکہ صفتِ صفاء کو احوال و افعال سے کوئی نسبت ہی نہیں اور نہ ہی اس کے اسم کا ظاہری اسماء و القاب سے کوئی تعلق ہے۔ الصفا صفة الاحباب وھم شموس بلا سحاب" (صفائے باطن اللہ تعالےٰ کے دوستوں کی صفت ہے اور وہ سورج ہیں جن پر بادل کا حجاب نہیں ہے) چونکہ صفاء باطن اللہ کے دوستوں کی صفت ہے اس لئے دوست وہی ہے جو اپنی صفت سے فانی اور دوستوں کی صفت سے باقی ہے اور ایسے اولیاء اللہ کے احوال اہلِ حال پر روز روشن کی طرح واضح ہیں۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ نے حبیب خدا حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت حارثہؓ کے بارے میں پوچھا۔ تو آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے" عبدٌ نوّر اللہُ قلبَہٗ بالایمان" (وہ ایک ایسا بندہ ہے جس کے دل کو اللہ تعالےٰ نے نور ایمان سے منور کر دیا ہے) یہاں تک کہ اُس کا چہرہ اُس نورِ ایمان کی تاثیر سے چاند کی طرح روشن اور اس کا وجود نورِ ربانی سے منور ہے۔ اہلِ طریقت میں سے ایک بزرگ کہتے ہیں" ضیاءُ الشمسِ والقمرِ اذا اشترکا نموذجٌ من صفاء الحبِّ والتوحیدِ اذا اشتبکا" (سورج اور چاند کی روشنی جب آپس میں مشترک ہو جائے تو وہ توحید اور محبتِ خداوندی کی صفائی کا نمونہ ہے جب یہ دونوں باہم مل جائیں) بلکہ چاند اور سورج کی روشنی کی اللہ جبار کی توحید اور محبت کے نور کے مقابلہ میں کیا حیثیت ہے کہ اِس کی اُس کے ساتھ نسبت کی جائے لیکن دنیا میں تو ان دو آنکھوں کے نور سے زیادہ ظاہر کوئی نور نہیں کہ جن کی رسائی صرف آسمان پر جلوہ نما چاند اور سورج تک ہی ہے لیکن توحید، معرفت اور محبت کے نور سے منور دل کے ذریعہ ہم عرشِ رحمان بلکہ امورِ عقبیٰ پر بھی اس دنیا میں ہی مطلع ہو سکتے ہیں۔ اہل طریقت کے تمام مشائخ کا اس بات پر اجماع ہے کہ جب بندہ مقامات کی قید سے آزاد، احوال کی کدورت سے خالی اور تغیر و تبدل کے مقام سے بری ہو جائے اور تمام پسندیدہ احوال سے موصوف ہو

جائے اور پھر تمام اوصاف سے جدا ہو جائے یعنی بندہ کے دل میں اپنی کوئی صفت محمود نظر نہ آئے۔ نہ اُس کی طرف دھیان دے اور نہ اُس پر مغرور ہو اور اس کا حال ادراکِ عقول سے مخفی ہو۔ اور اُس کا وقت شکوک وظن کے تصرف سے پاک ہو جائے تو اس وقت حضورِ حق سے اُس کی حاضری منقطع ہوتی ہے اور نہ ہی اُس کے وجود کے لئے ظاہری اسباب کی ضرورت باقی رہتی ہے"لِاَنَّ الصَّفَا حضورٌ بلا ذہابٍ وجودٌ بلا اسباب" (بلاشبہ صفائے باطن بارگاہِ الٰہی میں ایسی حاضری ہے جس پر کبھی زوال نہیں اور ایسا وجود ہے جو اپنے قیام میں ظاہری اسباب کا محتاج نہیں) یعنی وہ بارگاہِ الٰہی کا ایسا حاضر ہوتا ہے جو کبھی غائب نہیں ہوتا اور ایسا موجود ہوتا جس کا وجود اسباب پر موقوف نہیں کیوں کہ جس جگہ غیبت کا وقوع ہو جائے وہاں حاضری باقی نہیں رہتی۔ اور جس کا وجود اسباب وذرائع کا محتاج ہو وہ واجد نہیں کہلا سکتا۔ اور جب وہ اس درجہ تک پہنچ جاتا ہے تو دنیا وآخرت میں فانی ہو جاتا ہے اور انسانیت کی روش میں ربّانی ہو جاتا ہے اس وقت سونا اور مٹی کا ڈھیلا اُس کے نزدیک برابر ہو جاتا ہے اور احکام شریعت میں سے جن امور کی حفاظت اور بجا آوری دوسری مخلوق پر دشوار ہوتی ہے وہ اس کے لئے آسان ہو جاتی ہے۔

حضرت حارثؓ کا ایمان

چنانچہ ایک دفعہ حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضور علیہ السلام نے پوچھا "کَیْفَ اَصْبَحْتَ یَا حَارِثَۃ؟ اے حارثہ تو نے صبح کیسے کی؟ قَالَ اَصْبَحْتُ مُؤْمِنًا بِاللّٰہِ حَقًّا"۔ انہوں نے عرض کی میں نے ایسے حال میں صبح کی کہ میں اللہ پر سچا ایمان رکھنے والا ہوں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا "اُنْظُرْ مَا تَقُولُ یَا حَارِثَۃ اِنَّ لِکُلِّ شَیْئٍ حَقِیْقَۃً فَمَا حَقِیْقَۃُ اِیْمَانِکَ؟ اے حارثہ اپنے قول پر غور کر کیوں کہ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے پس تو بتا تیرے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ حضرت حارثہ نے جواباً عرض کی"۔ عَزَلْتُ نَفْسِی عَنِ الدُّنْیَا فَاسْتَوٰی عِنْدِیْ حَجَرُھَا وَذَھَبُھَا وَفِضَّتُھَا وَمَدَرُھَا فَاسْتَھَرْتُ لَیْلِیْ وَاَظْمَاتُ نَھَارِیْ حَتّٰی حَیْثُ کَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلٰی عَرْشِ رَبِّیْ بَارِزًا وَکَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلٰی اَھْلِ الْجَنَّۃِ یَتَزَاوَرُوْنَ فِیْھَا وَکَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلٰی اَھْلِ النَّارِ یَتَصَادَعُوْنَ وَفِیْ رِوَایَۃٍ یَتَعَاوَرُوْنَ"

میں نے اپنے نفس کو دنیا سے الگ کر لیا اور اس کی علامت یہ ہے کہ اس کے پتھر اور سونا اور چاندی اور مٹی کا ڈھیلا میرے نزدیک سب برابر ہیں۔ پس میں رات کو بیدار اور دن کو روشن رہتا ہوں یہاں تک کہ میری حالت یہ ہو گئی ہے کہ گویا میں اپنے پروردگار کے عرش کو اپنے سامنے کھلا دیکھ رہا ہوں اور جنت والوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ وہاں آپس میں ملاقات کر رہے ہیں اور دوزخ والوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ وہاں آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں اور ایک اور روایت میں ہے کہ وہ ایک دوسرے کو شرمسار کر رہے ہیں اس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ عَرَفْتَ فَالْزِمْ - قَالَهَا ثَلٰثًا۔ "اے حارثہ تو نے اپنے رب کو پہچان لیا پس اس پر ملازمت کر" (یہ تین دفعہ فرمایا)

اور صوفی نام ہے کاملین ولایت کا اور محققین اولیاء اللہ کو اب بھی اسی نام سے پکارتے ہیں اور شروع سے اسی نام سے پکارتے آئے ہیں اور مشائخ میں سے ایک بزرگ نے کہا ہے کہ مَنْ صَفَاهُ الْحُبُّ فَهُوَ صَافٍ وَمَنْ صَفَاهُ الْحَبِيْبُ فَهُوَ صُوفِيٌّ" (جو شخص اللہ تعالےٰ کی محبت کے ذریعہ صاف ہو جائے اس کو صافی اور جس کو محبوب (حقیقی) صاف کر دے اس کو صوفی کہتے ہیں) یعنی جو شخص محبتِ خداوندی کی وجہ سے نفسانی خواہشات سے پاک۔ صاف ہو جاتا ہے وہ صافی کہلاتا ہے اور جو شخص محبوب حقیقی حق تعالےٰ کی ذات میں مستغرق اور اس کے ماسوی سے بیزار ہو جاتا ہے وہ صوفی بن جاتا ہے۔ اور لغت کے اعتبار سے اس اسم (صوفی) کا اشتقاق کسی مادہ سے بھی درست نہیں بنتا کیوں کہ یہ معنی (صوفی کی تعریف) اس سے کہیں زیادہ عظمت والے ہیں کہ اُن کی کوئی جنس ہو جس سے یہ اسم مشتق ہو کہ اشتقاق تو مشتق اور مشتق منہ میں مجانست کو چاہتا ہے اور دنیا میں جو بھی کدر (موجود) ہے وہ صفا کی ضد ہے اور کسی چیز کا اشتقاق اُس کی ضد سے نہیں ہوا کرتا۔ پس یہ معنی اہل تصوف کے نزدیک اظہر من الشمس ہیں۔ اور کسی عبارت یا اشارے کی محتاج نہیں لِاَنَّ الصُّوفِيَ ممنوع عن العبارۃ والاشارۃ (کیوں کہ صوفی کی حقیقت اور مفہوم عبارت اور اشارہ کے ذریعہ بیان نہیں ہو سکتا) جب صوفی کی حقیقت ہر قسم کی عبارات سے ناممکن ہے اور تمام جہاں اُس کی تعبیر بیان کرنے میں مصروف ہے تو پھر کوئی جانتے یا نہ جانے اس اسم صوفی کو کیا خطرہ ہے؟ جب کہ اس کے

معنی حاصل بھی ہو جائیں۔ پس اہل کمال اُنہی (جو صوفی کے اوصاف کے حامل ہوں) کو صوفی کہتے ہیں اور اس صوفی سے تعلق اور محبت رکھنے والوں کو متصوف کا نام دیتے ہیں۔

تصوّف کا لفظ تفعل کے باب سے ہے اور عربی میں باب تفعل تکلف کا تقاضا کرتا ہے اور یہ متصوف اسی اصل (تصوف) کی فرع ہے اور ان دونوں میں جو فرق ہے وہ لغت اور معنی کے اعتبار سے واضح ہے۔ "الصفاوَلَایۃٌ وَلَہَا آیۃٌ وَرِوَایۃٌ والتصوف حکایۃٌ لِلصَّفَا بِلَاشکایۃٍ" (صفائے باطن ولایت ہے اور اس کی ایک علامت اور روایت ہے اور تصوف بلا شبہ صفائی قلب کی حکایت ہے) پس صفا کے معنی روشن اور ظاہر ہیں اور تصوف اسی معنی کی حکایت ہے۔ اور اہل تصوف اس درجہ میں تین طرح کے ہوتے ہیں ایک اُن میں سے صوفی۔ دوسرا متصوف اور تیسرا مستصوف ہوتا ہے۔ پس صوفی وہ ہوتا ہے جو اپنی ذات سے فانی لیکن حق تعالےٰ کے ساتھ باقی ہو۔ اور طبعی تقاضوں سے چھٹکارا حاصل کر کے حقیقت کے ساتھ ملا ہوا ہو۔

متصوف وہ ہے جو مجاہدہ و ریاضت کے ذریعہ اس درجہ (صوفی) کا متلاشی ہو اور اپنے تمام معاملات میں ان صوفیاء کے طرز عمل کو پیش نظر رکھے۔ اور مستصوف وہ ہے جو مال و منال مرتبہ اور اپنی دنیا کے تحفظ کے لئے اپنے آپ کو صوفیاء کی طرح بنائے رکھنے میں مصروف ہو حالانکہ ان دونوں مرتبوں کی اُسے کچھ خبر نہ ہو۔ یہاں تک کہ صوفیا نے کہا ہے کہ "اَلْمُسْتَصوِفُ عِندَ الصوفیۃِ کَالذُبَابِ وَعِندَ غیرِھِم کَالذِیَابِ" (مستصوف، صوفیا کے نزدیک مکھی کی طرح حقیر ہوتا ہے اور دوسرے لوگوں کے نزدیک (مردار کھانے والے خونخوار) بھیڑیئے کی طرح حریص ہوتا ہے) پس صوفی واصل بحق ہوتا ہے اور متصوف اصولِ تصوف پہ چلنے والا ہوتا ہے اور مستصوف بالکل فضول اور بیہودہ ہوتا ہے — جس کو حق تعالےٰ کا وصل نصیب ہو گیا وہ اپنے مقصد کو پا لینے اور مراد پہ پہنچ جانے کی وجہ سے مراد سے بے مراد اور مقصود سے بے مقصود ہو گیا اور جس کو کہ اصولِ تصوف پر چلنا نصیب ہو گیا وہ احوال طریقت پہ متمکن و قادر ہو گیا اور اس کے لطائف میں استحکام کے ساتھ ٹھہر گیا اور جس کے حصہ میں بیہودگی اور واہیات باتیں ہوں وہ ان تمام مقامات سے محروم

ہو گیا اور محض اسم کی درگاہ پر بیٹھ گیا۔ اور اسی میں الجھ کر حقیقت سے حجاب میں ہو گیا اور اس حجاب کی وجہ سے نہ تو اُسے حق کا وصل نصیب ہوا اور نہ ہی طریقت کے اصولوں سے آگاہ ہو سکا۔ مشائخ صوفیاء کے نزدیک اس معنی کی تفصیل میں بہت سے رموز ہیں جن کو اگرچہ مکمل طور پر احاطہ میں لانا ممکن نہیں تاہم ان میں سے بعض رموز انشاء اللہ اس کتاب میں ہم بیان کریں گے اور اللہ سے ہی توفیق ہے۔

دوسری فصل

صوفی کے معنی

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں "الصوفی اِذَا نَطَقَ بَانَ نُطْقُہٗ مِنَ الحقائِقِ وَاِن سَکَتَ نَطَقَتْ عنہ الجوارح بقطع العلائق"۔ (صوفی جب بولتا ہے تو اُس کا کلام اُس کی حقیقتِ حال سے بالکل واضح ہو جاتا ہے اور جب وہ خاموش ہوتا ہے تو دنیاوی تعلقات سے اس کے انقطاع کو اُس کی طرف سے اس کے اعضا بیان کرتے ہیں) یعنی صوفی وہ ہوتا ہے کہ جب وہ بولتا ہے تو اُس کی گفتگو کا بیان اُس کی حقیقتِ حال کے مطابق ہوتا ہے اور وہ کوئی ایسی بات نہیں کرتا جو خود اُس میں موجود نہ ہو اور جب وہ خاموش رہے تو اس کا معاملہ اُس کی حالت سے ہی ظاہر ہو جاتا ہے اور دنیوی تعلقات سے اُس کے انقطاع کو اُس کا حال بیان کر دیتا ہے یعنی اُس کی گفتار تمام کی تمام اصل صحیح پر مبنی ہوتی ہے اور اُس کا کردار دنیا سے اس کی خالصتاً کنارہ کشی کو ظاہر کرتا ہے جب وہ بولتا ہے تو اُس کا قول بالکل حق کے مطابق ہوتا ہے اور جب خاموش رہتا ہے تو اُس کا فعل سراسر فقر ہوتا ہے۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ کا ارشاد ہے "التصوف نعتٌ اَقَامَ العبدُ فیہ قیل نعتٌ للعبدِ اَمْ نعتٌ للحق۔ فقال نعتُ الحق حقیقۃً ونعت العبد اسماً" (تصوف ایک ایسی صفت ہے جس میں بندہ قائم ہے۔ کسی نے سوال کیا کہ یہ بندے کی صفت ہے یا خدا کی؟ جواب دیا کہ وہ حقیقتاً تو خدا کی صفت ہی ہے لیکن رسمی طور پر بندہ کی صفت ہے) یعنی تصوف کی حقیقت بندہ سے اُس کی بشری صفات کے فنا کا تقاضہ

کرتی ہے اور بندہ کی بشری صفات کا فنا ہونا حق تعالیٰ کی صفت کے بقا سے ہوتا ہے اور یہ حق تعالےٰ کی صفت ہوتی اور اس کی اسم بندہ سے ہمیشہ مجاہدہ کا تقاضا کرتی ہے اور دوامِ مجاہدہ بندہ کی صفت ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھو کہ حقیقت توحید کے پیش نظر یہ صفت کسی بندہ کے لئے درست ہی نہیں کیوں کہ بندہ کی صفات اُس کے لئے دائمی نہیں ہیں۔ اور مخلوق کی صفت سوائے اسم ظاہر کے نہیں ہوتی اس لئے کہ مخلوق کی صفات کو بقا حاصل نہیں بلکہ وہ فعلِ حق ہوتا ہے پس درحقیقت وہ صفتِ خداوندی ہوتی ہے اور اسکا معنیٰ وہی ہے کہ جس طرح اللہ تعالےٰ نے بندہ کو حکم دیا کہ روزہ رکھ لے ور روزہ رکھنے کی وجہ سے اس کا نام صائم رکھا اور ظاہری اسم کے اعتبار سے تو روزہ اس بندے کیطرف سے ہے لیکن حقیقت کی رو سے یہ حق تعالےٰ کی صفت ہے، چنانچہ خدا تعالےٰ نے فرمایا ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خبر دی ہے کہ "اَلصَّوْمُ لِی وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ" (روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا) یعنی روزہ میری طرف سے ہے اس لئے کہ دنیا میں کئے جانے والے تمام افعال اسی کی مِلک ہیں اور لوگوں کا ان افعال کو اپنی طرف منسوب کرنا رسمی رواج اور مجاز ہے، حقیقت نہیں۔

حضرت ابوالحسن نوری رحمہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں: "اَلتَّصَوُّفُ تَرْکُ کُلِّ حَظٍّ لِلنَّفْسِ" (نفس کی تمام لذتوں کو چھوڑ دینا تصوف ہے) اور یہ دو طرح کا ہوتا ہے ایک اسم اور دوسرا حقیقت۔ اور اس کے معنی یوں ہیں کہ اگر صوفی خود حظِ نفس کو ترک کرتا ہے تو حظِ نفس کا چھوڑنا بھی تو ایک حظ ہے اس طرح ترکِ حظ، رسم و رواج ہوگا —— اور اگر حظِ نفس جو صوفی کو چھوڑ دے تو یہ حظِ نفس کا فنا ہونا ہے اور اس معنی کا تعلق حقیقتِ مشاہدہ سے ہے۔ پس حظِ نفس کو ترک کر دینا یہ بندہ کا فعل ہے اور فناءِ حظ (حظ کا بندہ کو چھوڑ دینا) خدا تعالےٰ کا فعل ہے۔ اور بندہ کا فعل اسم اور مجاز ہوتا ہے اور فعلِ حق تعالےٰ حقیقت ہوتا ہے —— اس قول سے حضرت جنید رحمہ اللہ کا پہلے بیان ہونے والا قول بھی خوب واضح ہو جاتا ہے —— اور حضرت ابوالحسن نوری ہی فرماتے ہیں: "اَلصُّوْفِیَّۃُ ھُمُ الَّذِیْنَ صَفَتْ اَرْوَاحُھُمْ فَصَارُوْا فِی الصَّفِّ الْاَوَّلِ بَیْنَ یَدَیِ الْحَقِّ" (صوفی وہ لوگ ہیں کہ جن کی ارواح بشریت کی کدورت سے آزاد اور نفسانی خواہشوں سے پاک و صاف

ہوگئی ہیں اور اس طرح خواہشات سے نجات پاکر حق تعالےٰ کے حضور صف اول میں اور اعلیٰ مقام میں آرام پانے کی سعادت حاصل کر چکی ہیں) اور غیر اللہ سے کنارہ کش ہو چکی ہیں۔ اور یہی حضرت فرماتے ہیں کہ" الصوفی الذی لَا یَملِکُ وَلَا یُملَکُ" (صوفی وہ ہے کہ اُس کے قبضہ میں کوئی چیز نہ ہو اور وہ خود بھی کسی غیر اللہ کی ملکیت نہ ہو) اور یہی عین فنا ہے کیونکہ جو فانی الصفت ہو وہ نہ کسی کا مالک ہوتا ہے اور نہ مملوک۔ کیوں کہ مِلک کا اطلاق موجودات پر ہی صحیح ہوتا ہے اور اس کی مراد یہ ہے کہ صوفی دنیا کے مال و متاع بلکہ آخرت کی زینت میں سے بھی کسی چیز کو اپنی ملک نہیں بناتا تاکہ اس طرح کہیں وہ خود ہی اپنے نفس کی مِلک اور حکم کا غلام نہ بن جائے! اور ایک سلطان اولوالعزم کی طرح غیر اللہ سے اپنا ارادہ منقطع کر لیتا ہے تاکہ غیر اللہ اس سے اپنی بندگی کی طمع منقطع کرلیں اور جو لوگ فنائے کل کے قائل ہیں یہی قول اُن کی دلیل ہے ہم ان کی غلط فہمی کے مقام کو اس کتاب میں انشاء اللہ بیان کریں گے تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے۔

ابن جلاء رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ التصوف حَقِیقَۃٌ لَا رَسمٌ (تصوف ایک ایسی حقیقت ہے جس کی ظاہری رسم کوئی نہیں) کیونکہ معاملات میں ظاہری رسم (تعریف) مخلوق کا حصہ ہے اور اس کی حقیقت حق تعالےٰ کا خاصہ ہے تو جب مخلوق سے منہ پھیر لینے کا نام تصوف ہوا تو لامحالہ اُس کی ظاہری تعریف نہ ہوگی۔

اور ابو عمر دمشقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں"۔ التصوفُ رُؤیَۃُ الکونِ بِعَینِ النَّقصِ بَل غَضُّ الطَّرفِ عَنِ الکَونِ" (تصوف یہ ہے کہ موجودات کو نقصان کی نگاہ سے دیکھا جائے بلکہ اُن سے آنکھ بند کرلی جائے) بعض موجودات کو ناقص اور عیب دار دیکھے اور یہ صفت کے بقاء کی دلیل ہے بلکہ اُن سے آنکھ بند ہی کرلے۔ اور یہ صفت کے فناء کی دلیل ہے کیونکہ نگاہ تو موجودات پر ہی ڈالی جاتی ہے جب موجودات ہی نہ رہیں گے تو اُن پر نظر بھی نہ رہے گی اور موجودات دنیا سے آنکھ کا بند کرلینا بصیرتِ ربانی کا بقاء ہے، یعنی جو شخص اپنی ذات سے آنکھ بند کرلیتا ہے حق تعالےٰ کی طرف اُس کی آنکھ کھل جاتی ہے کیونکہ موجود کا طالب اپنا بھی طالب ہوتا ہے اور اُس کا کام اپنی ہی ذات سے متعلق ہوتا ہے

اور اُس کو اپنی ذات سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ اگویا وہ خود ہی طالب اور خود ہی مطلوب ہوتا ہے)۔ پس ایک شخص اپنے آپ کو دیکھتا تو ہے لیکن ناقص دیکھتا ہے اور دوسرا شخص اپنی ذات سے اپنی آنکھ ہی بند کر لیتا ہے اور کچھ بھی نہیں دیکھتا۔ اور جو شخص دیکھتا ہے اگرچہ ناقص نظر سے ہی دیکھتا ہے پھر بھی اُس کی نگاہ اُس کا حجاب ہوتی ہے اور رہا وہ جو کہ وہ دیکھتا ہے لیکن اپنی ناقص بینائی کی وجہ سے محبوب ہوتا ہے اور جو شخص دیکھتا ہی نہیں وہ اپنی نابینائی کی وجہ سے محجوب نہیں ہوتا۔ اور اہل تصوف و ارباب طریقت کے نزدیک یہ بات مضبوط بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے (جس پر تصوف کی ساری عمارت کھڑی ہے) لیکن اس بات کی شرح کی یہ جگہ نہیں۔

حضرت ابوبکر شبلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "اَلتَّصَوُّفُ شِرْكٌ لِاَنَّهٗ صِيَانَةُ الْقَلْبِ مِنْ رُؤْيَةِ الْغَيْرِ وَلَا غَيْرَ" (تصوف شرک ہے کیونکہ وہ دل کو غیر اللہ کے دیکھنے سے محفوظ رکھتا ہے حالانکہ غیر اللہ کا تو وجود ہی نہیں) یعنی اللہ تعالٰے کی توحید کو ثابت کرنے میں غیر کی طرف دیکھنا شرک ہے۔ جب دل میں غیر اللہ کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں تو پھر غیر اللہ کے ذکر سے دل کو محفوظ رکھنا محال ہے۔

حضرت حضری رحمہ اللہ فرماتے ہیں "اَلتَّصَوُّفُ صَفَاءُ الْبَشَرِ مِنْ كُدُوْرَةِ الْمُخَالَفَةِ (تصوف۔ مخالفت کی کدورتوں سے دل اور باطن کو پاک رکھنا ہے) یعنی اس کے معنی یہ ہیں کہ باطن کو حق کی مخالفت سے بچائے رکھے اس لئے کہ دوستی۔ موافقت کا نام ہے اور موافقت مخالفت کی ضد ہے۔ اور دوست کو پوری دنیا میں دوست کے حکم سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہیں ہوتی۔ اور جب مراد ہی ایک ہو تو پھر مخالفت کا تصور کیا کیا جا سکتا ہے۔

حضرت محمدؒ بن علیؓ بن الحسینؓ بن علیؓ بن ابی طالب فرماتے ہیں۔ "اَلتَّصَوُّفُ خُلُقٌ فَمَنْ زَادَ عَلَيْكَ فِي الْخُلُقِ زَادَ عَلَيْكَ فِي التَّصَوُّفِ (تصوف، خوش خلقی کا نام ہے پس جو شخص خوش خلقی میں تجھ سے زیادہ ہے وہ تصوف میں بھی تجھ سے زیادہ ہے) یعنی صوفی اچھے اخلاق کا مالک ہوتا ہے لہٰذا جو زیادہ حسن اخلاق والا ہے وہ

زیادہ صوفی ہے۔ خوش خلقی دو طرح کی ہوتی ہے ایک حق تعالےٰ کے ساتھ اور دوسری مخلوق خدا کے ساتھ۔ حق کے ساتھ نیک خوئی اُس کے فیصلوں پر راضی ہونے کا نام ہے۔ اور مخلوق کے ساتھ حسن اخلاق یہ ہے کہ اللہ کے لئے ان کی صحبت کا بوجھ برداشت کیا جائے (یعنی اُن کے حقوق ادا کئے جائیں) اور یہ دونوں صفات طالب کی طرف ہی لوٹتی ہیں۔ اور طالب کی رضا اور ناراضگی سے مستغنی و بے نیاز ہونا حق تعالےٰ کی صفت ہے اور یہ دونوں اُس کی واحدانیت کے پیش نظر اُس سے وابستہ ہیں۔

ابو محمد مرتعش رحمۃ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔ اَلصُّوْفِیُّ لَا یَسْبِقُ هِمَّتُهٗ خُطْوَتَهٗ اَلْبَتَّہ (صوفی وہ ہے جس کا قصد اُس کے قدم کے ساتھ ساتھ رہے) یعنی دونوں ایک ساتھ حاضر رہیں۔ اور دل وہاں حاضر ہو جہاں جسم حاضر ہے اور جسم وہاں موجود ہو جہاں دل موجود ہے اور (اسی طرح) دل وہاں حاضر ہو جہاں قدم اور قدم وہاں ہو جہاں دل حاضر ہے۔ اور قول وہاں حاضر ہو جہاں قدم اور قدم وہاں ہو جہاں قول حاضر ہو۔ اور یہی دل کے ہمیشہ حاضر رہنے کی علامت ہے۔ بخلاف اس کے کہ جو کہتے ہیں کہ اپنے آپ سے غائب ہے اور اللہ کے حضور حاضر ہے۔ ایسا نہیں بلکہ اللہ کے سامنے بھی حاضر ہے اور اپنے سامنے بھی حاضر ہے۔ اور (صوفیاء کی اصطلاح) "جمع الجمع" سے بھی یہی مراد ہے کیونکہ جب تک اپنے آپ کا دیکھنا متحقق ہو تو اپنی ذات سے غیبت نہیں ہوتی۔ اور جب اپنے آپ کا دیکھنا اٹھ گیا اور اپنی ذات سے غیبت ہو گئی تو اللہ تعالےٰ کے حضور کی حاضری بلا غیبت حاصل ہو گئی اور شبلی رحمۃ اللہ کے اس قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ الصوفی لا یری فی الدارین مَعَ اللّٰہِ غیر اللّٰہ (صوفی دونوں جہانوں میں اللہ تعالےٰ کے ساتھ غیر اللہ کو نہیں دیکھتا) اور چونکہ مخلوقات میں بندہ کی ہستی بھی غیر اللہ میں شامل ہے لہٰذا جب صوفی غیر اللہ کو نہیں دیکھتا تو اپنے وجود کو بھی نہیں دیکھتا اور اپنی نفی و اثبات کی حالت میں اپنی ذات سے ہی فارغ ہو جاتا ہے۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ فرماتے ہیں: التصوف مبنیٌّ عَلٰی ثَمَانِ خِصَالِ اَلسَّخَاءِ والرضا والصبر والاشارۃ والغربۃ وَلُبْسِ الصوفِ والسیاحۃ والفقر اما السخا فلِاِبراھیم واما الرضا

فلاسماعیل واما الصبر فلایوب واما الاشارۃ فلزکریا واما الغربۃ فلیحیی واما لبس الصوف فلموسیٰ واما السیاحۃ فلعیسیٰ واما الفقر فلمحمد صلی اللہ علیہ وسلم وعلیہم اجمعین۔

(تصوف کی آٹھ خصلتیں ہیں۔ سخاوت[۱]، رضا[۲]، صبر[۳]، اشارہ[۴]، غربت[۵]، صوف پہننا[۶]، سیاحت اور فقر۔ سخاوت[۱]۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا شیوہ ہے (کہ انہوں نے اپنی متاع عزیز بیٹا اللہ کی راہ میں قربان کر دیا)۔ رضا[۲]۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا خاصہ ہے (کہ اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے) صبر[۳]، حضرت ایوب علیہ السلام کی خصلت ہے (کہ انہوں نے کیڑوں کی مصیبت پر صبر کا بے مثال مظاہرہ کیا) اشارہ[۴]۔ حضرت زکریا علیہ السلام کی رمز ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا "اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَۃَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا"۔ (آپ تین دن تک لوگوں سے صرف اشارہ سے بات کریں گے) اور نیز اسی حالت میں فرمایا "اِذْ نَادٰی رَبَّہٗ نِدَاءً خَفِیًّا"۔ (جب حضرت زکریا نے اپنے رب کو خفیہ طور پر پکارا) غربت[۵] حضرت یحییٰ علیہ السلام کا وصف ہے کہ اپنے وطن میں رہتے ہوئے بھی بے وطن اور اپنوں سے بیگانہ رہے۔ اور سیاحت[۶]۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اقتداء ہے کہ پوری زندگی تبلیغ حق کے لئے سیاحت میں اس طرح مجرد رہے کہ ایک پیالہ اور ایک کنگھی کے علاوہ کچھ بھی پاس نہ رکھتے تھے پھر جب انہوں نے ایک شخص کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پانی پیتے ہوئے دیکھا تو پیالہ پھینک دیا۔ اور جب ایک اور آدمی کو اپنی انگلیوں سے خلال کرتے ہوئے دیکھا تو کنگھی کو بھی پھینک دیا۔ صوف[۷] پہننا تو یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اتباع ہے کہ ان کا لباس اونی کپڑے کا ہوتا تھا۔ اور فقر[۸]۔ سو یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ السلام کی اطاعت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روئے زمین کے تمام خزانوں کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں دے کر فرمایا کہ آپ کوئی محنت نہ کریں اور ان خزانوں سے اپنی زینت فرمائیں (یعنی اسباب معاش حاصل کریں) تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کی کہ بار خدایا۔ میں یہ خزانے نہیں چاہتا مجھے ایک دن سیر کیجئے اور ایک دن بھوکا رکھئے — اور عمل و بندگی کے لئے یہی اصول بہت اچھے ہیں۔

حضرت حصری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں۔ "الصوفی لا یوجد بعد عدمہ ولا یعدم بعد

وجودہ"۔ (صوفی وہ ہے جو اپنے عدم کے بعد موجود نہ ہو اور اپنے وجود کے بعد معدوم نہ ہو)
یعنی صوفی جو کچھ حاصل کر لیتا ہے اُسے ہرگز گم نہیں کرتا۔ اور جو کچھ کھو دیتا ہے اُسے دوبارہ ہرگز
حاصل نہیں کرتا۔ دوسرے الفاظ میں اس کا حق کو پالینا نہ پالینے میں کبھی تبدیل نہیں ہوتا۔
اور اُس کا نہ پانا کبھی پالینے میں تبدیل نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ اس کا اثبات بغیر نفی کے اور
نفی بغیر اثبات کے ہو جائے اس عبارت سے مراد یہ ہے کہ اُس کی بشریت کی حالت اُس
سے بالکل ساقط ہو جائے اور اُس کے حق میں جسمانی مشاہدات معدوم ہو جائیں اور تمام
موجودات سے اُس کے تعلقات منقطع ہو جائیں حتیٰ کہ جو شخص تمام متفرق اور پراگندہ خیالات
اپنی ذات میں جمع کرے اور اپنی ہی ذات سے قیام حاصل کرے اُسی پر بشریت کے تمام
اسرار ظاہر ہوتے ہیں۔ اور یہ صورت اللہ تعالےٰ کے دو پیغمبروں میں ظاہر ہوئی۔ ایک
حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے کہ ان کے وجود میں عدم نہ تھا۔ اسی لئے انہوں نے اللہ تعالےٰ
سے دعا کرتے ہوئے کہا تھا۔ ربِّ اشْرَحْ لِی صَدْرِی وَیَسِّرْ لِی اَمْرِی (اے میرے پروردگار
میرے سینہ کو کھول دے اور مجھ پر میرا معاملہ آسان فرما دے) اور دوسرے حضرت محمد صلی اللہ
علیہ وسلم ہیں کہ آپ کے عدم میں وجود نہ تھا (یعنی اُن کے مشاہدہ حق میں محویت کاملہ میں
بے حضوری نہ تھی) یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ نے آپؐ سے فرمایا۔ "اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ"
(کیا ہم نے آپ کے لئے آپ کا سینہ کھول نہیں دیا؟) ان میں سے ایک (حضرت موسیٰؑ) نے
اپنی آرائش وزینت کی خود التجا کی اور دوسرے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود آرائش کی
خواہش نہیں کی اللہ تعالےٰ نے خود انہیں آراستہ کر دیا۔

علی بن بندار الصیرفی النیشاپوری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:۔ "اَلتَّصَوُّفُ اِسْقَاطُ الرُّؤْیَۃِ لِلْحَقِّ
ظَاھِراً وَّ بَاطِناً"۔ (تصوف یہ ہے کہ صوفی اپنے ظاہر و باطن کو نہ دیکھے بلکہ سب کچھ حق تعالےٰ
کے لئے دیکھے) یہاں تک کہ اگر ظاہر پر نگاہ ڈالے تو اُس پر توفیق الٰہی کا نشان پائے گا اور
جب غور سے دیکھے گا کہ ظاہر کے معاملات توفیق الٰہی کے مقابلہ میں مچھر کے پر کے برابر
بھی وزن نہیں رکھتے تو ظاہر کے تمام معاملات کو ترک کر دے گا۔ اور جب باطن کو دیکھے گا۔
تو اُس میں بھی توفیق خداوندی کا نشان پائے گا۔ لیکن جب باطن کے معاملات پر غور کرے گا۔

اور اُسے معلوم ہو گا کہ معاملات باطن کی بھی توفیق الٰہی کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں تو باطن کو بھی ترک کر دے گا۔ (لہٰذا اس وقت) صرف حق کو دیکھے گا اور جب صرف حق تعالےٰ کو ہی دیکھے گا تو پھر اپنے آپ کو ہرگز نہ دیکھے گا۔

اور محمد بن احمد المقری رحمہ اللہ فرماتے ہیں "التصوف استقامۃ الاحوال مع الحق" (تصوف یہ ہے کہ صوفی کے تمام حالات حق تعالےٰ کے ساتھ وابستہ ہوں) یعنی صوفی کے احوال (کشف وغیرہ) اُس کو اصلی حال (مشاہدہ حق) سے غیر کی طرف پھیر کر اُسے کج روی میں نہ ڈال دیں اس لئے کہ جس کا دل احوال کے پھیرنے والے اللہ تعالےٰ کا شکار ہو جائے اُس کے حالات اُس کو استقامت کے درجہ نہ تو گراتے ہیں اور نہ ہی اُسے دیدار حق سے باز رکھتے ہیں۔

تیسری فصل

ابو حفص حداد نیشاپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "اَلتَّصَوُّفُ کُلُّہٗ آدَابٌ لِکُلِّ وَقْتٍ اَدَبٌ وَلِکُلِّ مَقَامٍ آدَابٌ وَلِکُلِّ حَالٍ اَدَبٌ فَمَنْ لَزِمَ آدَابَ الاَوْقَاتِ بَلَغَ مَبْلَغَ الرِّجَالِ وَمَنْ ضَیَّعَ الاٰدَابَ فَھُوَ بَعِیْدٌ مِنْ حَیْثُ یَظُنُّ الْقُرْبَ وَمَرْدُوْدٌ مِنْ حَیْثُ یَظُنُّ الْقُبُوْلَ" (تصوف تمام کا تمام ادب کا نام ہے۔ ہر وقت۔ مقام اور حال کے لئے آداب ہیں۔ جو شخص اوقات کے آداب بجا لانے کو اپنے اوپر لازم کر لے وہ مردانِ تصوف کے درجہ پر پہنچ جاتا ہے۔ اور جو آداب کو ضائع کر دے وہ اس درجہ سے دور ہوتا ہے اس حیثیت سے کہ اپنے آپ کو بہت قریب سمجھتا ہے اور اس حیثیت سے مردود ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو مقبول بارگاہ الٰہی سمجھتا ہے۔ اور یہ مطلب حضرت ابوالحسن نوری رحمہ اللہ کے اس قول سے زیادہ قریب ہے کہ جو انہوں نے کہا "لیسَ التَّصَوُّفُ رُسُوْمًا وَلَا عُلُوْمًا وَّلٰکِنَّہٗ اَخْلَاقٌ" (تصوف نہ تو صرف رسوم کا نام ہے اور نہ ہی محض علوم کا بلکہ وہ تو حسنِ اخلاق کا نام ہے) یعنی تصوف اگر کسی اسم کا نام ہوتا تو مجاہدہ و ریاضت کے ذریعہ حاصل ہو جاتا اگر علم کا نام ہوتا تو تعلیم سے حاصل ہو جاتا وہ تو بس اخلاق کا

نام ہے کہ جب تک تو اس کا حکم اپنے اندر نہ چاہے اور اُس کے معاملات اپنے ساتھ درست نہ کرے اور اُس کا انصاف اپنی ذات سے نہ دے اُس وقت تک وہ حاصل نہیں ہو سکتا اسم اور اخلاق کے درمیان فرق یہ ہے کہ اسم ایک ایسا فعل ہے جو تکلف اور اسباب پر اسی طرح مبنی ہوتا ہے کہ اس کا ظاہر اُس کے باطن کے خلاف ہوتا ہے گویا ایک ایسا فعل جو معنی سے خالی ہوتا اور اخلاق تو وہ ایک ایسا قابل تعریف فعل ہے جو تکلف و اسباب کا محتاج نہیں ہوتا۔ اُس کا ظاہر باطن کے موافق اور دعویٰ سے خالی ہوتا ہے۔

مرتعش رحمہ اللہ کہتے ہیں: "اَلتَّصَوُّفُ حُسْنُ الْخُلُقِ۔" (تصوف نیک اخلاق کا نام ہے) اور یہ تین قسم پر ہوتا ہے۔

اوّل، اللہ کے ساتھ حسن خلق:۔ اور یہ ریاکاری کے بغیر اُس کے احکام کی تعمیل سے حاصل ہوتا ہے (دوم) مخلوق کے ساتھ حسن اخلاق۔ اور یہ بزرگوں کا احترام کرنے چھوٹوں پر شفقت کرنے اور اپنے برابر کے لوگوں کے ساتھ بغیر کسی ذاتی لالچ کے مساویانہ سلوک اور انصاف کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اور سوم:۔ اپنی ذات کے ساتھ نیک برتاؤ۔ اور یہ خواہشاتِ نفس و شیطان کی متابعت نہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اور جو شخص ان تینوں باتوں میں اپنے آپ کو درست کرے وہ خوش خلق لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔ اور یہ جو میں نے کہا ہے اس بیان کے مطابق ہے کہ ایک شخص نے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ ہمیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں بتائیے! تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ قرآن سے پڑھو کہ اخلاق نبویؐ کی نسبت خود خدا تعالےٰ نے خبر دی اور فرمایا ہے" خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ۔" (آپ عفو اختیار کیجئے نیکی کا حکم دیجئے اور جاہلوں سے اعراض کیجئے) حضرت مرتعش رحمہ اللہ بھی یہی فرماتے ہیں: "هٰذَا مَذْهَبٌ كُلُّهٗ جِدٌّ فَلَا تَخْلِطُوْهُ بِشَیْءٍ مِنَ الْهَزْلِ۔" (یہ مذہب تصوف تمام، معقول و عمدہ ہے اس میں بیہودہ باتوں کی آمیزش نہ کرو) یعنی تصوف میں رسمی صوفیوں کے معاملات میں نہ پھنسو اور اُن رسمی صوفیوں کی تقلید کرنے والوں سے گریز کرو۔ لیکن جب عوام الناس نے اہل زمانہ پر نگاہ ڈالی اور انہیں زمانہ کے رسمی صوفی ہی نظر آئے۔ اور ان کے محور قص و سرود رہنے۔ ذاتی مفادات

کے لئے بادشاہوں کے درباروں میں جانے اور خوراک وخلعت کے لئے آپس میں جھگڑنے کا عوام کو علم ہوا تو وہ تمام صوفیاء سے ہی بداعتقاد ہو گئے اور کہنے لگے کہ اگر طریقۂ تصوف کی یہی اصل ہے تو متقدمین صوفیاء بھی اس طریق پر چلے ہوں گے۔ اور انہوں نے یہ معلوم نہ کیا کہ یہ فترت (وہ زمانہ جس میں کوئی نبی دنیا میں موجود نہ ہو) اور ابتلا وآزمائش کا زمانہ ہے جب لالچ، بادشاہ کو ظلم میں، طمع، عالم کو نافرمانی اور زناکاری میں اور ریاکاری، زاہد کو منافقت میں مبتلا کر دے تو لامحالہ نفسانی خواہشات، صوفی کو بھی ناچ کود اور گانے بجانے میں ڈال دیتی ہیں —— جان لو کہ اگرچہ اہل طریقت تباہ ہو سکتے ہیں لیکن طریقت کی اصل کبھی تباہ نہیں ہو سکتی۔ اور یہ بھی جان لو کہ بیہودہ لوگوں میں سے کوئی گروہ اپنی بیہودگی کو اہل تصوف کی روش کے پردے میں چھپا دے تو اس سے ان نیک لوگوں کی روش میں بیہودہ پن نہیں آ سکتا ——

حضرت ابو علی قزوینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "اَلتَّصَوُّفُ هُوَ الْاَخْلَاقُ الْمَرْضِيَّةِ (تصوف پسندیدہ اخلاق کو کہتے ہیں) اور پسندیدہ کردار وہ ہوتا ہے کہ بندہ تمام حالات میں حق تعالےٰ سے خوش ہو اور اُس کی رضا پر راضی رہے۔

ابوالحسن نوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ اَلتَّصَوُّفُ هُوَ الْحُرِّيَّةُ وَالْفُتُوَّةِ وَتَرْكُ التَّكَلُّفِ وَالسَّخَاءِ وَبَذْلُ الدُّنْيَا" (تصوف حریت وجوانمردی ترک تکلف، سخاوت اور متاع دنیا راہ حق میں خرچ کرنے کا نام ہے) حریت یہ ہے کہ بندہ نفسانی خواہشات سے آزاد ہو جائے۔ جوانمردی یہ ہے کہ بندہ جواں ہمتی کے دیکھنے سے الگ ہو جائے ترک تکلف یہ ہے کہ اپنے متعلقات اور دنیوی نعمتوں کے لئے کوشش نہ کرے اور سخاوت یہ ہے کہ دنیا کو اہل دنیا کے لئے چھوڑ دے۔

اور ابوالحسن قوشنجہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "التصوف الیوم اسم وَلَا حَقِيقَةٌ وَقَدْ كَانَ حَقِيقَةً" (آج تصوف کا صرف نام رہ گیا اور کوئی حقیقت نہیں حالانکہ پہلے زمانہ میں حقیقت تھی نام نہ تھا) یعنی صحابہؓ اور سلف صالحینؒ کے دور میں تصوف کا اسم تو مستعمل نہ تھا لیکن اس کا مفہوم ہر فرد میں موجود تھا۔ اور اب صرف نام رہ گیا ہے معنی نہیں

ہیں۔ یعنی اُس وقت تصوف کے معاملات مشہور معروف تھے اور دعویٰ کو کوئی نہیں جانتا۔ تھا لیکن اب دعویٰ تصوف معروف ہے اور معاملات تصوف کا نام و نشان نہیں۔

اب تک میں اس کتاب میں تصوف سے متعلق مشائخ طریقت کے اقوال کی اس قدر تحقیق بیان کر چکا ہوں جس سے (اللہ تمہیں سعادت مند بنائے) تم پر طریقت کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔ اور تصوف کے منکروں سے تم کہہ سکو گے کہ اس انکار سے اُن کی کیا مراد ہے؟ اگر وہ صرف اسم تصوف کا انکار کرتے ہیں تو کوئی حرج نہیں کیونکہ اسم اور مسمّیٰ میں یگانگت کوئی ضروری امر نہیں۔ اور اگر تصوف کی اصل اور اس کے معانی کا ہی انکار کرتے ہیں۔ تو یہ تو پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پوری شریعت اور اُس کے قابل تعریف خصلتوں کا انکار ہے" اور میں تمہیں (اللہ تعالےٰ تمہیں اپنے اولیاء کی سی سعادت عطا فرمائے) اس کتاب میں وصیت کرتا ہوں کہ تم اس کی پوری رعایت کرنا اور اس قدر انصاف کرنا کہ تصوف کا دعویٰ کم کرنا اور اہل تصوف کے ساتھ نیک اعتقاد رکھنا ۔ (اور توفیق تو اللہ ہی کی طرف سے ہے)

چوتھا باب

مرقعہ پوشی کے بیان میں

جان لو کہ صوفیاء کا شعار مرقعہ (گدڑی) پہننا ہے اور مرقعات پہننا سنت ہے۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ عَلَیْکُمْ بِلُبْسِ الصُّوْفِ تَجِدُوْنَ حَلَاوَۃَ الْاِیْمَانِ فِیْ قُلُوْبِکُمْ (اپنے اوپر صوف پہننا لازم کر لو تم اپنے دلوں میں ایمان کی حلاوت پاؤ گے) نیز ایک صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "کَانَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم یَلْبَسُ الصُّوْفَ وَیَرْکَبُ الْحِمَارَ" (نبی صلی اللہ علیہ وسلم صوف پہنتے اور گدھے پر سواری فرمایا کرتے تھے) نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا "لَا تُضِیْعِی الثَّوْبَ حَتّٰی تُرَقِّعِیْہِ (کپڑے کو ضائع نہ کرو جب تک کہ اُس میں پیوند نہ لگالو) اور فرمایا تم پر پشم کا لباس ہونا چاہیے تاکہ تم حلاوتِ ایمان پاسکو۔ اور روایت میں ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پشم کا لباس زیب تن کرتے اور گدھے پر سواری فرمایا کرتے تھے۔ نیز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ کپڑوں کو اس وقت تک ضائع نہ کیا کرو جب تک اُن میں پیوند نہ لگا لیا کرو[1]۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ ایسی گدڑی پہنا کرتے تھے جس میں تیس تیس پیوند لگے ہوتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی فرمایا کرتے تھے کہ بہترین لباس وہ ہے جو کم قیمت ہو۔ اور حضرت علی رضی اللہ کے متعلق روایت ہے کہ وہ ایسا کرتہ پہنا کرتے تھے جس کی آستینیں اُن کی انگلیوں کے برابر ہوتیں اور اگر کبھی اس سے بھی لمبا کرتہ پہننے کا اتفاق ہوتا تو اُس کی آستینوں کا سرا پھاڑ دیا کرتے تھے۔

نیز اللہ عزوجل کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کپڑا چھوٹا کرنے کا حکم آیا چنانچہ ارشاد

---

[1] عبارت میں کچھ جملے دوبارہ درج ہیں۔ اس تکرار کو ترجمہ میں ختم کیا جا سکتا تھا لیکن دیانت داری کا تقاضہ یہی تھا کہ فارسی نسخہ میں موجود عبارت کا من وعن ترجمہ کیا جائے۔ چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا۔ ہوسکتا ہے کاتب سے سہواً یہ جملے دوبارہ لکھے گئے ہوں۔ (مترجم)

ربانی ہے، "وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ" اَیْ قَصِّرْ (اور اپنے کپڑوں کو کوتاہ کرو)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے ستر بدری صحابی رضی اللہ عنہم اجمعین ایسے دیکھے ہیں جن سب کا لباس پشم کا تھا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تجرید (دنیا سے قطع تعلقات) کی حالت میں ہمیشہ اون کا لباس زیب تن کیا کرتے تھے اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ کو کئی پیوند لگی گدڑی پہنے ہوئے دیکھا۔

امیرالمومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ۔ امیرالمومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ اور دہرم بن حیان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت اویس قرنی رحمہ اللہ علیہ کو دیکھا کہ وہ اُون کا لباس پہنے ہوئے تھے اور اس پر پیوند لگے ہوئے تھے۔ اور حسن بصری مالک بن دینار اور سفیان ثوری رحمہم اللہ سب صوف کی گدڑی ہی پہنا کرتے تھے۔

اور امام عالم حضرت ابوحنیفہ کوفی رحمہ اللہ علیہ کے متعلق روایت ہے "اور یہ روایت محمد بن علی حکیم ترمذی کی تصنیف "تاریخ مشائخ" میں لکھی ہوئی ہے کہ ابتداء میں آپ نے صوف کا لباس پہن کر گوشہ نشینی کا ارادہ فرمایا تھا یہاں تک کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت کی۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔ تمہیں مخلوق کے درمیان رہنا چاہئیے کیونکہ تمہارے ہی ذریعہ میری سنت کا احیاء ہو گا۔" اس وقت سے آپ نے گوشہ نشینی کا ارادہ تو ترک فرما دیا تاہم پھر بھی زیادہ قیمتی لباس کبھی نہیں پہنا۔ اور داؤد طائی رحمہ اللہ بھی صوف کا لباس ہی پہنا کرتے تھے اور وہ محقق صوفیاء میں سے تھے۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ تعالےٰ صوف کی گدڑی پہنے امام اعظم حضرت ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے پاس آئے تو آپ کے احباب نے انہیں حقارت کی نظر سے دیکھا۔ یہ دیکھ کر حضرت ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا۔ "ہمارے سردار ابراہیم بن ادھم تشریف لائے ہیں۔ امام کے شاگردوں نے کہا کہ مسلمانوں کے امام کی زبان پر فضول اور ناحق بات نہیں آسکتی ابراہیم کو یہ سرداری کیسے ملی؟ امام نے فرمایا "وہ ہر وقت خداوند تعالےٰ جل ذکرہٗ کی خدمت میں مشغول رہتے ہیں اور ہم لوگ اپنے جسموں کی خدمت میں لگے رہتے ہیں اس لئے وہ ہمارے سردار بن گئے۔ اور اب اگر اہل زمانہ میں سے بعض کے نزدیک گدڑی اور خرقہ پہننے سے دنیوی جاہ وجمال مراد ہو اور ان کا دل ظاہر

حال کے موافق نہ ہو تو یہ بھی جائز ہے کہ پورے لشکر میں جنگجو مردِ میدان تو ایک ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح پوری جماعتوں میں محقق کم لوگ ہی ہوتے ہیں لیکن سب کو اُن کے ساتھ ہی نسبت دی جاتی ہے کیوں کہ وہ ایک چیز میں تو صوفیوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے" من تشبّہ بقومٍ فھو منھم" (جس نے کسی قوم کے ساتھ مشابہت اختیار کی وہ انہی میں سے ہے) یعنی جو شخص کردار و اعتقاد میں کسی قوم کے ساتھ مماثلت پیدا کرتا ہے وہ اسی قوم میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن ایک گروہ کی نگاہ اُن کے ظاہری معاملات اور رسم پر پڑتی ہے اور دوسرے گروہ کی نگاہ ان کے ستر اور صفائی باطن کو دیکھتی ہے۔

غرض صوفی کی صحبت کا ارادہ کرنے والے شخص کا حال چار باتوں سے باہر نہیں ہوتا۔ ایک[۱] گروہ کو صفائی باطن، نورانیتِ دل، پاکیزگی طبع اور اعتدالِ مزاج اُن کے اسرارِ باطن کے ساتھ نظر آتا ہے چنانچہ یہ لوگ محققین کا قرب اور اُن کی رفعتِ شان کو دیکھتے ہیں اور اس بلند مقام کی عقیدت اُن کے دامن گیر ہو جاتی ہے اور بصیرتِ باطن کی بنیاد پر اُن کے ساتھ تعلق پیدا کرتے ہیں اور اُن کے حال کا آغاز کشفِ احوال اور خواہش نفس سے مجرد ہونے اور نفس سے روگردانی کرنے سے ہوتا ہے

دوسرے[۲] گروہ کو اُن صوفیاء کرام کے ظاہر حال کے ساتھ جسم کی درستی، دل کی پاکیزگی اور سکون اور سینہ کی سلامتی جلوہ نما نظر آتی ہے۔ چنانچہ ایسے لوگ اُن کے شریعت پر عمل، تحفظ آداب اسلام اور حُسن معاملات کو دیکھتے ہیں اور اُن کی صحبت اختیار کرنے کا ارادہ کرتے ہیں اور اپنے حال کی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں اور اُن کی ابتداء مجاہدہ اور حسن معاملہ سے ہوتی ہے۔

تیسرے[۳] گروہ کو انسانی مروت، عمدہ ہم نشینی اور حُسنِ اخلاق اُن صوفیاء کی سیرت و کردار کی طرف متوجہ کرتے ہیں چنانچہ وہ لوگ ان صوفیاء کرام کی ظاہری زندگی کو دیکھتے ہیں کہ وہ لوگوں کے ساتھ عمدہ سلوک۔ بزرگوں کی عزت و تکریم۔ چھوٹوں پر شفقت اور ہمسروں سے نیک معاملہ وغیرہ سے آراستہ اور دنیوی نعمتوں میں اضافہ کی طلب سے بے فکر اور قناعت پر خوش ہیں اور اُن کی صحبت کا ارادہ کرتے اور طلب دنیا کی تکلیف اور کوشش کا طریقہ اپنے لئے آسان کر لیتے اور بافراغت اپنے آپ کو نیک بنا لیتے ہیں۔

چوتھے[۴] گروہ کی حالت یہ ہے کہ اُس کے افراد طبیعت کی سستی اور نفس کی سرکشی میں مبتلا ہونے

کے باوجود وسائل و ذرائع کے بغیر دنیوی سیادت کی طلب، فضیلت کے بغیر صدارت کا قصد اور علم کے بغیر خصوصی مقام کی جستجو، صوفیاء کے احوال کی طرف متوجہ کرتی ہے اور یہ سوچتے ہوئے کہ اس ظاہری حال کے علاوہ کوئی دوسرا کام ضروری نہیں صوفیاء کی صحبت کا ارادہ کرتے ہیں اور وہ صوفیائے کرام بھی ان کے ساتھ اپنے لطف وکرم اور نرمی کا برتاؤ کرتے اور مصالحت و درگذر سے کام لیتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں حالانکہ اِس گروہ کے لوگوں کے دلوں میں حق بات میں سے کچھ بھی نہیں ہوتا اور ان کے جسموں میں طریقت کی طلب کے مجاہدے کا کوئی نشان نہیں ہوتا اور وہ چاہتے ہیں کہ لوگ ان کا اسی طرح احترام کریں جس طرح محقق صوفیوں کا کرتے ہیں اور اُن سے اسی طرح مرعوب ہوں جس طرح خداوند تعالےٰ کے مقرب حضرات سے خوف کھاتے ہیں۔ اور صوفیاء کرام کی صحبت و تعلق سے ان کی اصلاح کے پردے میں اپنی خرابیوں کو چھپانا چاہتے ہیں اور اُن کا سا لباس زیب تن کر لیتے ہیں لیکن ان کا یہ بے عمل لباس ان کے جھوٹ اور فریب کاری پر شور مچاتا ہے کہ یہ جھوٹ کا لباس اور حشر و نشر کے روز حسرت و غرور کی پوشاک ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے۔ مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (جن لوگوں پر توراۃ پر عمل کرنے کا بار ڈالا گیا تھا پھر وہ اس بار کو نہ اٹھا سکے اُن کی مثال اُس گدھے کی سی ہے جو کتابیں اٹھائے ہوئے ہوتا ہے۔ اس قوم کی مثال بہت بُری ہے جنہوں نے اللہ کی آیتوں کی تکذیب کی اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا) اور اس زمانہ میں اس گروہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ پس تم پر لازم ہے کہ جو کچھ تمہارے اختیار میں نہ ہو اُس کو حاصل کرنے کا قصد نہ کرو کیونکہ اگر تم ہزار بار بھی طریقت کے قبول کرنے کے لئے کوشش کرو تو طریقت ایک لمحہ کے لئے بھی تمہیں قبول نہیں کرے گی اس لئے کہ یہ کام گدڑی پہننے سے نہیں عشق الٰہی میں جلنے سے ہوتا ہے۔ جب طریقت کسی شخص کی آشنا ہو جائے تو اس کا امیرانہ لباس بھی گدڑی کی طرح ہو جاتا ہے اور جب کوئی طریقت سے بیگانہ ہوتا ہے

تو اس کی گدڑی بھی بدبختی کا رقعہ اور قیامت کے روز شقاوت کا فرمان ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اُس بزرگ پیر سے لوگوں نے کہا " لِمَ لَا تَلْبَسُ الْمُرَقَّعَۃَ؟ فَقَالَ مِنَ النِّفَاقِ اَنْ تَلْبَسَ لِبَاسَ الْفِتْیَانِ وَلَا تَدْخُلُ فِیْ حَمْلِ اَثْقَالِ الْفُتُوَّۃِ " (آپ گدڑی کیوں نہیں پہنتے؟ تو انہوں نے جواب دیا یہ منافقت ہے کہ تو جوانمردوں کا سا لباس پہن لے لیکن جوانمردی کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے لئے تیار نہ ہو) کیونکہ جوانمردی کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھائے بغیر جوانمردوں کا لباس زیب تن کرنا منافقت ہے۔ پس اگر یہ فقیرانہ لباس اس لئے ہے کہ خدا تعالےٰ تجھ کو پہچان لے کہ تو اُس کا خاص بندہ ہے تو اللہ تعالےٰ تو بغیر لباس کے بھی تجھے پہچانتا ہے اور اگر یہ اس لئے ہے کہ لوگوں پر ظاہر کرے کہ میں خاصان الٰہی میں سے ہوں تو اگر تو واقعی اُس کا مقرب ہے تو یہ حالت ریا ہو گی اور اگر تو ایسا نہیں ہے تو پھر یہ حالت یقیناً منافقت ہو گی ہے۔ اور یہ راہ پُر صعوبت اور پُر خطر ہے اور اہلِ حق اس چیز سے بالاتر ہیں کہ لباس کے ذریعہ شہرت حاصل کریں۔ اَلصَّفَاءُ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی اِنْعَامٌ وَاِکْرَامٌ وَالصُّوْفُ لِبَاسُ الْاَنْعَامِ " (صفائی قلب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ کے ساتھ انعام و اکرام کا مظہر ہے اور صوف جانوروں کا لباس ہے) پس ظاہری شکل و صورت ایک حیلہ ریاکاری ہے، کچھ لوگ ظاہری بناوٹ و آراستگی کو قربِ الٰہی کے لئے حیلہ سمجھتے ہیں۔ اور صوفیا کا لباس پہن کر اس اُمید پر اپنے ظاہر کو سنوار لیتے ہیں کہ لوگ انہیں بھی صوفیاء میں شمار کریں ــ اس طریقے کے مشائخ نے اپنے مریدوں کو گدڑیوں سے زیب و زینت دینے کا حکم دیا اور خود بھی ایسا ہی کیا ہے تاکہ مخلوق کے درمیان ممتاز ہو جائیں اور لوگ اُن کے محافظ بن جائیں کہ اگر ایک قدم بھی شریعت و طریقت کے خلاف اٹھائیں تو مخلوق کی شرم سے ایسا نہ کر سکیں۔ غرضیکہ گدڑی اولیاء اللہ کی زینت ہے۔ عوام اس سے عزیز اور خواص اس سے ذلیل ہو جاتے ہیں۔ عوام کی عزت یوں کہ جب وہ گدڑی پہن لیتے ہیں تو لوگ اُن کی عزت کرتے ہیں اور خواص کی ذلت اس طرح کہ جب وہ اسے زیب تن کر لیتے ہیں تو لوگ انہیں عوام کی نگاہوں سے دیکھتے اور اُن پر اس کی وجہ سے ملامت کرتے ہیں۔ پس " اَلْمُرَقَّعَۃُ لِبَاسُ النِّعَمِ لِلْعَوَامِّ وَجَوْشَنُ الْبَلَاءِ لِلْخَوَاصِّ " (گدڑی عوام کے لئے نعمت کا لباس اور خواص

کے لئے آزمائشوں کی زرہ بکتر ہے) اسی لئے تو عوام میں سے بہت سے لوگ بڑے بیقرار رہتے ہیں چنانچہ جب اُن کا ہاتھ کسی دوسرے کام تک نہیں پہنچتا اور طلبِ جاہ کا کوئی اور ذریعہ نہیں پاتے تو اسی فقیرانہ گدڑی کے ذریعہ سرداری کی طلب کرتے اور اسی کو دنیوی نعمتوں کے جمع کرنے کے لئے سبب بنا لیتے ہیں۔ حالانکہ خاصان الٰہی ریاکاری و سرداری کو ترک کرنے کا حکم دیتے ذلّت کو عزت پر ترجیح دیتے اور مصیبت کو نعمت پر اختیار کرتے ہیں تاکہ یہ گدڑی اِن کے لئے مصیبت اور عوام کے لئے نعمت بنے۔ "اَلْمُرَقَّعَۃُ قَمِیْصُ الْوَفَا لِاَھْلِ الصَّفَاءِ وَ سِرْبَالُ السُّرُوْرِ لِاَھْلِ الْغُرُوْرِ۔ (گدڑی اہل صفا کے لئے وفا کی قمیص اور اہلِ غرور کے لئے خوشی کا کرتہ ہے) کیونکہ اہل صفا اسے پہن کر دونوں جہاں سے بے نیاز اور مرغوباتِ دنیا سے منقطع ہو جاتے اور اہل غرور اسے پہن کر حق سے حجاب میں اور اصلاح احوال سے الگ ہو جاتے ہیں۔

الغرض گدڑی سب کے لئے بہتری کی علامت اور کامیابی کا سبب ہے۔ اس سے سب کی مراد حاصل ہوتی ہے اگر کسی کے لئے صفائی باطن کا ذریعہ کسی کے لئے دنیوی نعمتوں کے حصول کا سبب۔ کسی کے لئے حق سے حجاب کا ذریعہ اور کسی کے لئے قرب الٰہی کا بچھونا ہے۔ میں امید رکھتا ہوں کہ نیک صحبت اور آپس میں محبت کی وجہ سے سب ہی کامیاب ہوں گے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔" مَنْ اَحَبَّ قَوْمًا فَھُوَ مِنْھُمْ (جو کسی قوم سے محبت رکھے گا اُنہیں میں شمار ہوگا) اور قیامت کے روز ہر قوم کے دوست اُن کے ساتھ اور اُن کے زمرے میں ہوں گے۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ تمہارا باطن حق کا طلب گار ہو اور رسومات سے اعراض کرے کیوں کہ جو کوئی ظاہر پر ہی اکتفا کرتا ہے ہرگز حق تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ اور یہ بھی جان لو کہ آدمیت کا وجود ربوبیت کا حجاب ہے اور یہ حجاب احوال کی گردش اور مقاماتِ فنا میں ریاضت کے بغیر دور نہیں ہو سکتا اور اسی فنا کا نام صفا ہے اور جس کی صفت فنا ہو اُس کے لئے کوئی لباس اختیار کرنا محال ہے۔ اور تکلف سے زینت کرنا کوئی کمال نہیں۔ پس جس شخص کا فانی الصفت ہونا ظاہر ہو جائے اور اس کی طبیعت کی آفت اور خرابی دور ہو جائے تو اُس کو صوفی کہو یا کوئی اور نام رکھ لو اُس کے نزدیک دونوں برابر ہیں۔

دوسری فصل

گدڑی پہننے کی شرائط

گدڑی پہننے کی شرائط یہ ہیں کہ گدڑی ہلکا پن اور سہولت کے پیش نظر پہنی جائے اور جب تک گدڑی کا اصل وجود موجود ہو جہاں سے پھٹ جائے وہاں ٹکڑا (پیوند) لگا لیا جائے۔ اور اس بارے میں مشائخ "اللہ اُن سے راضی ہوا" کے دو قول ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ ٹکڑوں کے سینے میں ترتیب کا لحاظ رکھنا شرط نہیں جہاں سے بھی سوئی کا سرا باہر نکل آئے اُسے باہر کھینچ لیا جائے (سینے میں خاص ترتیب کے لئے) کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ دوسرے فریق کا کہنا ہے کہ چیتھڑے سینے میں اور اُن کے ترتیب دینے میں سلیقہ شرط ہے۔ ترتیب کا لحاظ رکھنا اور ٹکڑوں کے سیدھا ہونے میں تکلف کرنا فقر کے معاملات میں سے ہے اور معاملہ کی صحت ہی اصل کے صحیح ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔ اور میں علی بن عثمانؒ نے شیخ المشائخ ابوالقاسم گرگانی رحمۃ اللہ سے طوس میں دریافت کیا تھا کہ درویش کے لئے کم از کم کس چیز کا ہونا ضروری ہے تاکہ وہ فقر کی سزاوار قرار پائے؟ فرمایا "وہ تین ہیں کہ ان سے کم نہ ہونا چاہئے۔ (اول) یہ کہ چیتھڑوں کو سیدھا سینا جانتا ہو۔ (دوم) سچی بات سننے کی سمجھ ہو۔ (سوم) زمین پر صحیح طریقے سے پاؤں رکھ سکے۔ اس وقت درویشوں کا ایک گروہ میرے ساتھ موجود تھا۔ جب ہم واپس ہوئے اور دروازہ پر پہنچے تو ان میں سے ہر ایک اس میں کچھ تصرف (تاویل) کر رہا تھا۔ اور جاہلوں کی ایک جماعت کو اس میں لالچ پیدا ہوا اور وہ کہنے لگے کہ فقر صرف چیتھڑوں کو سیدھا سینے اور زمین پر پاؤں مارنے (رقص کرنے) کا ہی نام ہے۔ اور ہر شخص یہی سمجھنے لگا کہ ہم طریقت کی باتیں سننا بھی جانتے ہیں۔ اور لیکن چونکہ میرا دل شیخ کی طرف متوجہ تھا اس لئے اُن کی بات زمین پر پھینکنا نہ چاہا اور اُن سے کہا کہ آئیے ہم میں سے ہر شخص اس قول کے معانی سے متعلق کچھ بیان کرے۔ چنانچہ ہر شخص نے اپنا اپنا مفہوم بیان کیا۔ جب میری باری آئی تو میں نے کہا "چیتھڑے کا صحیح سینا یہ ہے کہ اُسے فقر کے ساتھ سیا جائے نہ کہ ظاہری زینت و ترتیب کے ساتھ۔ جب تم پیوند کو فقر کے ساتھ سیو گے تو بظاہر ٹیڑھا ہی کیوں نہ ہو درست ہوگا۔ اور درست بات سننا یہ ہے کہ اُسے حال کے ساتھ سُنا جائے نہ کہ قال کے ساتھ

اور اس میں حق وسچائی کے ساتھ تاویل کریں نہ کہ بیہودہ بات کے ساتھ۔ اور اسے دل سے سمجھیں نہ کہ عقل کے ساتھ۔ اور زمین پر سیدھا پاؤں رکھتا یہ ہے کہ محبت الٰہی کے جذبہ میں سرشار ہو کر زمین پر پاؤں رکھا جائے نہ کہ ظاہر رسم اور لہو ولعب کے ساتھ۔ ان میں سے ایک شخص نے جب یہ بات شیخ المشائخ کے سامنے نقل کی تو انہوں نے فرمایا "اَصَابَ عَلِیٌّ خَیَّرَ اللّٰہُ" (علی نے درست کہا اللہ اسے بھلائی دے) پس اس گروہ صوفیا کے نزدیک گدڑی پہننے سے مراد، دنیا کی محبت کم کرنا اور حق تعالےٰ کے ساتھ سچا فقر حاصل کرنا ہے اور صحیح آثار میں آیا ہے کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم سلام اللہ علیہ جب آسمان پر اٹھائے گئے اس وقت گدڑی ہی پہنے ہوئے تھے اور ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں نے اُن کو صوف کی اسی گدڑی کے ساتھ خواب میں دیکھا کہ اس کے ہر چیتھڑے سے نور پھوٹتا ہے۔ میں نے پوچھا اے مسیح علیہ السلام آپ کے اس لباس پر یہ نور کیسا ہے ؟ تو فرمایا کہ یہ میرے اضطراب و مجبوری کے نور ہیں کہ ان میں سے ہر چیتھڑا میں نے ایک مجبوری اور ضرورت سے سیا تھا تو خداوند تعالےٰ نے میرے دل کو پہنچنے والی ہر تکلیف کو ایک نور بنا دیا ہے۔ اور نیز میں نے اہل ملامت میں سے ایک بوڑھے کو ماوراء النہر میں دیکھا کہ جو چیزیں آدمی کے کھانے اور پہننے کی ہیں نہ وہ انہیں کھاتا ہے نہ پہنتا ہے اور ایسی چیزیں اُس کی خوراک تھیں جنہیں لوگ پھینک دیتے تھے جیسے بوسیدہ سبزی، کڑوا کدو اور خراب شدہ گاجر وغیرہ قسم کی اشیاء اور پوشاک ان چیتھڑوں کی بناتا تھا جو راستے سے اٹھا کر انہیں دھو کر ایک گدڑی کی صورت میں بنا لیتا تھا۔ اور میں نے سنا ہے کہ مرو الرود میں متاخرین اہل طریقت میں سے بہت قوی حال اور نیک سیرت ایک پیر تھا اُس نے بہت سے رو ی چیتھڑے اپنی ٹوپی اور مصلّے میں لگا رہے تھے کہ اُن میں بچھو نے بچّے دے رکھے تھے۔ اور میرے شیخ رحمہ اللہ نے اکاون ۵۱ سال تک ایک ہی جُبہ پہنے رکھا جس میں بے تکلف چیتھڑوں کے پیوند لگاتے رہتے تھے۔ اور عراقی لوگوں کی حکایت میں مَیں نے دیکھا ہے کہ "ایک صاحب مشاہدہ اور دوسرا صاحبِ مجاہدہ درویش تھا۔ صاحب مشاہدہ درویش نے تو پوری زندگی صرف وہی چیتھڑے زیبِ تن کئے جو درویشوں کے لباس سے سماع کی حالت میں پھٹ کر گرتے تھے اور صاحب مجاہدہ درویش نے تمام عمر صرف انہی چیتھڑوں کا لباس پہنا جو درویشوں کے استغفار کرنے کی حالت میں

اُن کے لباس سے پھٹ کر گر تے تھے حتیٰ کر اُن کا ظاہری لباس اُن کی باطنی سیرت کے مطابق ہوتا تھا اور اسی کی نگہداشت کرنا فقر کی حالت ہے۔ اور شیخ محمد بن حنیف رحمہ اللہ نے بیس سال تک ایک کھُردا ٹاٹ پہنے رکھا اور ہر سال میں چار چلّے کھینچتے تھے اور ہر چلّہ میں علوم حقیقت کے مخفی رازوں سے متعلق ایک کتاب تصنیف کرتے تھے۔ اور اُن کے دور میں علماء طریقت و حقیقت کے محققین میں سے ایک بزرگ تھے جو فارسی لباس میں بیٹھتے تھے لوگ انہیں محمد بن زکریا رحؒ کے نام سے یاد کرتے تھے وہ ہرگز گدڑی نہ پہنتے تھے۔ لوگوں نے شیخ محمد حنیف رحمہ اللہ سے دریافت کیا کہ گدڑی پہننے کی شرط کیا ہے اور اس کا پہننا کس کے لیے مسلّم ہے؟ فرمایا گدڑی پہننے کی شرط وہی ہے جسے محمد بن زکریا سفید پیراہن میں بجالا رہے ہیں اور اس کا پہننا بھی انہی کے لئے سزاوار ہے

تیسری فصل

لیکن اس گروہ کی اس عادت کو چھوڑ دینا اہل طریقت کی شرط نہیں اور <u>گدڑی علامتِ فقر نہیں</u> صوفیاء جو اس حال میں پشم کا لباس بہت کم پہنتے ہیں اس کی دو وجوہ ہیں پہلی یہ ہے کہ جانوروں کے پاک و ناپاک جگہوں پر بیٹھنے کی وجہ سے پشم ناپاک ہو جاتی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ بدعتیوںؒ کے ایک گروہ نے پشم کے لباس کو اپنا شعار بنا لیا ہے" اور بدعتیوں کے شعار کی مخالفت کرنا اگر خلاف سنت نہ ہو تو بہت ہی اچھا ہے" لیکن گدڑی کے سینے میں تکلف اس لئے روا رکھتے ہیں کہ ان (گدڑی پوش) صوفیا کا مقام مخلوق میں بڑا بزرگ ہے اس لئے ہر شخص نے اپنے آپ کو ان جیسا بنا لیا ہے اور گدڑی پہن لی ہے اور اُن سے ناپسندیدہ افعال ظاہر ہوتے ہیں اور اُن صوفیاء کو اپنے مخالفین کی صحبت سے رنج ہوتا ہے اس لئے انہوں نے اپنے لئے ایک ایسا لباس پسند کر لیا ہے جسے اُن کے سوا کوئی سی ہی نہیں سکتا اور اس کو ایک

لہ شریعت میں کسی نئی اور بے اصل چیز کو رواج دینا بدعت کہلاتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے۔ کل محدثۃ بدعۃ و کلّ بدعۃ ضلالۃ و کلّ ضلالۃ فی النار" الحدیث (ہر نئی ایجاد شدہ چیز بدعت ہے۔ ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی دوزخ میں جانے والی ہے)

دوسرے کی پہچان کے لئے علامت بنا لیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک درویش کسی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی گدڑی میں ایک ٹکڑا غلط خط میں لگا رکھا تھا اس بزرگ نے اس کو اپنی صحبت سے علیحدہ کر دیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ صوفیا کو طبع نازک اور مزاج لطیف کی وجہ سے طبیعت کی کجی پسند نہیں آئی اور جس طرح ناموزوں شعر ذوقِ لطیف کو پسند نہیں آتا اسی طرح ناموزوں فعل بھی طبع نازک کے لئے ناقابل قبول ہوتا ہے اور صوفیا کے ایک گروہ نے لباس کے وجود و عدم کا تکلف ہی نہیں کیا۔ اللہ تعالےٰ نے انہیں گدڑی دی تو اسے پہن لیا۔ قبا عنایت فرمائی تو اسے زیب تن کر لیا اور اگر برھنہ چھوڑا تو برھنہ رہ لیا اور میں علی بن عثمان الجلابیؒ نے کبھی کسی طریقہ کو پسند کیا اور اپنے بعض سفروں میں اسی پر عمل کیا ہے اور حکایات میں آتا ہے احمد بن خضرویہ رحمۃ اللہ جب بایزید رحمۃ اللہ کی زیارت کے لئے آئے تو انہوں نے قبا پہن رکھی تھی اور جب شاہ بن شجاعؒ ابو حفصؒ کی زیارت کے لئے تشریف لائے تو انہوں نے بھی قیمتی قبا ہی زیب تن کر رکھی تھی۔ تاہم یہ ان کا معین لباس نہ تھا کبھی کبھی وہ عبا (گدڑی) بھی استعمال فرمایا کرتے تھے۔ اور کبھی پشمینہ کا لباس یا سفید پیراہن بھی پہن لیا کرتے تھے غرضیکہ جیسا لباس میسر آتا پہن لیتے کیونکہ انسان کا نفس جس چیز کا عادی ہو اس چیز سے اُسے الفت سی ہو جاتی ہے اور جب کسی چیز کی اُسے عادت ہو جائے گویا طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے اس طرح وہ اس کے لئے حق سے حجاب بن جاتی ہے اسی لئے تو پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا "خیر الصیام صوم اخی داؤد علیہ السلام" (بہترین روزہ میرے بھائی داؤد علیہ السلام کا روزہ ہے) صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ! وہ کس طرح ہوتا تھا؟ فرمایا داؤد علیہ السلام ایک دن روزہ رکھتے تھے اور دوسرے دن افطار کرتے تھے تاکہ نفس کو نہ روزہ رکھنے کی عادت ہو نہ افطار کرنے کی! تاکہ روزہ حق سے حجاب نہ بن جائے اور اس معاملہ میں ابو حامد دستِ روزی کا حال بالکل درست رہا ہے کہ ان کے مرید جب انہیں کوئی لباس پہناتے تو وہ پہن لیتے لیکن جب کسی مرید کو اُس لباس کی حاجت ہوتی تو اُن کی حالت "فراغت" (مشاہدۂ حق میں حالتِ جذب اور دنیا و ما فیہا سے فارغ

ہونے) کا انتظار کرتے جب اُن پر یہ حالت طاری ہو جاتی تو مرید وہ لباس اُن سے اُتار لیتے آپ نہ پہنانے والے سے کہتے کہ کیوں پہنا رہا ہے اور نہ ہی اتارنے والے سے کہتے کہ کیوں اُتار رہے ہو — اور ہمارے اس زمانے میں بھی غزنی میں ایک بزرگ ہیں۔ (اللہ اس شہر کو محفوظ رکھے) اُن کا لقب مُوید رحمۃ اللہ ہے وہ لباس پہننے میں اپنی پسند یا امتیاز کو جائز نہیں سمجھتے اور اس مقام میں وہ بالکل درست عمل کرتے ہیں۔ باقی یہ بات کہ ان صوفیا کے کپڑے اکثر نیلے رنگ کے ہوتے ہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے طریق کی بنیاد سیر و سیاحت پر رکھی ہے اور سفید لباس سفر میں اپنی حالت پر نہیں رہتا اور اس کا دھونا بھی انتہائی دشوار ہوتا ہے اور ہر شخص اس کی لالچ بھی کر سکتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ نیلا لباس اہل ماتم و مصیبت کی علامت اور غمزدہ لوگوں کا لباس ہے۔ اور دنیا محنت کا گھر، مصیبت کا پردہ سرا، غم کا مرکز، جدائی کی جھونپڑی۔ اور آزمائش کا گہوارہ ہے چنانچہ جب حق کے متلاشی لوگوں نے دنیا میں اپنا دلی مقصود نہ دیکھا تو نیلا لباس زیب تن کر لیا اور وصالِ محبوب کے سوگ میں بیٹھ گئے۔ اور ایک دوسرے گروہ نے اپنے عمل میں کوتاہی۔ اپنے دل میں خرابی اور زمانے میں تضیع اوقات کے علاوہ جب کچھ نہ دیکھا تو نیلا لباس اختیار کر لیا کہ مقصود کا فوت ہو جانا موت سے بھی زیادہ سخت ہوتا ہے۔ کسی نے اپنے عزیز کی موت پر نیلا لباس پہنا تو کسی نے مقصد کے فوت ہو جانے پر نیلا لباس پہن لیا — اور علم کے ایک جھوٹے مدعی نے ایک درویش سے کہا کہ تو نے یہ نیلا لباس کیوں پہن رکھا ہے؟ اس نے جواب دیا پیغمبر علیہ السلام سے تین چیزیں دنیا میں باقی رہی ہیں۔ فقرؔ۔ علمؔ اور شمشیرؔ — تلوار بادشاہوں نے حاصل کی لیکن اُس کو موقعہ پر استعمال نہ کیا۔ علم علماء نے اختیار کیا لیکن صرف اُس کے حصول پر ہی اکتفا کیا (عمل نہ کیا) اور فقر۔ فقراء کی جماعت نے اختیار کیا۔ اور اُسے دولت جمع کرنے کا ذریعہ بنا لیا۔ میں نے ان تینوں گروہوں کی مصیبت پر نیلا لباس پہن لیا ہے۔

اور حضرت مرتعش رحمۃ اللہ کے بارے میں آتا ہے کہ آپ بغداد کے ایک محلے سے گزر رہے تھے کہ آپ کو پیاس محسوس ہوئی ایک دروازے پر آکر پانی مانگا تو ایک لڑکی

پانی کا کوزہ لے کر باہر آئی آپ نے پانی لے کر پیا۔ پھر اچانک اُس کے چہرے کو دیکھا تو دل ساقی کے جمال کا شکار ہو گیا۔ آپ نے وہیں ڈیرا لگا دیا حتیٰ کہ جب اُس گھر کا مالک آیا تو آپ نے اُسے کہا۔ اے جناب! میرا دل پانی پینے کو چاہتا تھا مجھے آپ کے گھر کی ایک لڑکی نے پانی پلایا اور میرا دل لے گئی۔ اُس نے کہا "وہ میری بیٹی ہے میں اُس کو آپ کی زوجیت میں دے دیتا ہوں۔ حضرت مرتعشؒ بڑی مسرت کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے اور نکاح کر لیا۔ یہ گھر کا مالک بغداد کے دولت مندوں میں سے تھا۔ آپ کو حمام میں بھیجا اور گدڑی اتروا کر عمدہ لباس پہنایا۔ جب رات ہوئی حضرت مرتعشؒ اپنے اوراد و معمولات ادا کرنے کے لئے نماز میں کھڑے ہوئے اور خلوت میں مشغول عبادت ہوئے تو اسی دوران آپ نے شور مچانا شروع کر دیا کہ "ھَاتُوا مُرَقَّعِی" (میری گدڑی لاؤ) لوگوں نے پوچھا "کیا ہوا؟ آپؒ نے کہا "غیب سے میرے دل میں یہ آواز آئی کہ تم نے ایک نگاہ ہمارے غیر کو دیکھا تو ہم نے نیکی کا لباس اور گدڑی تمہارے ظاہر سے چھین لی اب اگر دوسری نظر ہمارے غیر پر ڈالے گا تو تمہارے دل سے محبت کا لباس بھی اُتار لیں گے۔ جس لباس کے پہننے سے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور اولیاء اللہ کے ساتھ مناسبت پیدا کرنی مقصود ہو تو اگر اس کے حقوق و آداب کو ملحوظ خاطر رکھ کر زندگی بسر کر سکتا ہے تو تجھے وہ لباس پہننا مبارک ہو۔ ورنہ اپنے دین و ایمان کی حفاظت کرنی چاہئے اور اولیاء کے لباس میں خیانت روا نہ رکھنی چاہیئے کیوں کہ سچا مسلمان کسی دوسرے دعوے کے بغیر اُس ولی سے بہتر ہے جو ولایت کا جھوٹا مدعی ہو۔

بہر حال گدڑی کا پہنا دو گروہوں کے لئے درست ہے ایک تو دنیا سے تعلقات منقطع کرنے والوں کے لئے اور دوسرا مشتاقانِ دیدارِ الٰہی کے لئے ـــــ اور مشائخ طریقت کی عادت کچھ یوں رہی ہے کہ جب کوئی مرید دنیوی تعلقات چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کو تین سال میں تین باتوں کی تعلیم دیتے ہیں اگر وہ اس بات کو قبول کر لیتا ہے تو اسے مریدی کے لئے قبول فرما لیتے ورنہ کہہ دیتے کہ طریقت اس چیز کو قبول نہیں کرتی ہے وہ تین چیزیں یہ ہیں! پہلے سال خدمت خلق دوسرے سال خدمت حق اور تیسرے سال اپنے دل کی نگرانی ـــ اور خدمتِ خلق وہ اسی وقت کر سکتا ہے کہ اپنے آپ کو خادموں

اور پوری مخلوق کو مخدوموں کے درجہ میں رکھے۔ یعنی کسی امتیاز کے بغیر سب کو اپنی ذات سے بہتر جانے اور سب کی خدمت کو اپنے اوپر واجب سمجھے نہ اس طرح کہ خدمت کرے اور اپنے آپ کو اس خدمت میں مخدوموں پر فضیلت دے کیوں کہ یہ بات ایک کھلا نقصان واضح عیب اور زمانہ کی تمام آفتوں میں سے بڑی آفت ہے —— اور حق تعالیٰ کی خدمت اس وقت کر سکتا کہ اپنی دنیا و آخرت کی تمام لذتوں کو منقطع کر دے اور محض حق تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کی پرستش کرے کیوں کہ اگر آدمی اللہ تعالےٰ سے کسی اور چیز کے حصول کے لئے اس کی عبادت کرتا ہے تو درحقیقت وہ اپنی ہی عبادت کرتا ہے نہ کہ خدا تعالےٰ کی —— اور اپنے دل کی نگرانی اس وقت کر سکتا ہے کہ اپنے دل کو صرف حق تعالےٰ کی ذات سے وابستہ رکھے، اللہ تعالےٰ کی محبت کے سامنے دنیا کے تمام تفکرات کو دل سے دور کرے اور دل کو غفلت و معصیت کے مواقع سے محفوظ رکھے۔ جب یہ تینوں شرطیں کسی مرید میں پائی جائیں تو پھر ہی گدڑی کا پہننا حقیقی طور پر مسلّم ہوتا ہے نہ کہ محض تقلید کے طور پر —— لیکن مرید کو گدڑی پہنانے والا (مرشد) ایسا مستقیم الحال ہونا چاہیئے۔ جو طریقت کے تمام نشیب و فراز طے کر چکا ہو، احوالِ طریقت کا ذوق چکھ چکا ہو۔ اعمالِ شریعت کا مزہ حاصل کئے ہوئے اور جلالِ خداوندی کا غلبہ اور جمالِ حق کا لطف دیکھے ہوئے ہو۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے مرید کے حال پر مطلع ہو کہ انجام کار وہ کس مقام تک رسائی حاصل کرے گا۔ واپس لوٹ آنے والوں میں سے ہو گا۔ رستہ میں ہی ٹھہر جانے والوں میں سے ہو گا یا منزل مقصود سے ہمکنار ہونے والوں میں سے ہو گا۔ چنانچہ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ یہ مرید طریقت کے سفر پر راہ سے ہی واپس لوٹ آئے گا تو اُسے صاف کہہ دے کہ وہ اس کو شروع ہی نہ کرے۔ اور اگر وہ راہ میں ہی ٹھہر جائے تو اُسے آگے بڑھنے کا حکم دے اور اگر وہ منزل تک پہنچ جائے تو اس کی تربیت و پرورش کرے۔ اور طریق کے مشائخ دلوں کے طبیب ہوتے ہیں۔ اگر طبیب مریض کی بیماری سے واقف ہی نہ ہو سکے تو بیمار کو اپنے (غلط) علاج سے ہلاک کر دے گا اس لئے کہ وہ اس کی

پرورش نہیں کرسکتا اور اُس کے خطرہ کے مقام سے واقف نہیں اور اس کی دواء وغذا اُس کی بیماری کے خلاف تجویز کرتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے" اَلشَّیْخُ فِی قَوْمِہٖ کَا النَّبِیِّ فِی اُمَّتِہٖ" (شیخ اپنی قوم میں اس طرح ہوتا ہے جیسے نبی اپنی امت میں) پس انبیاء کرام لوگوں کو بصیرتِ باطن سے اور ہر شخص کو اپنے اپنے درجے میں رکھتے ہوئے حق تعالےٰ کی طرف دعوت دیتے ہیں اسی طرح شیخ کو بھی پوری باطنی بصیرت کے ساتھ اپنے مریدوں کی تربیت کرنی چاہئیے اور ہر ایک کو اس (کی طبیعت) کے موافق دواء اور غذا دینی چاہئیے۔ تاکہ دعوت الی الحق کا مقصد حاصل ہو۔ پس جب کوئی ولایت خداوندی کے کمال تک پہنچا ہوا مرشد اپنے مرید کو ان تین سالوں کی تربیت اور ریاضت ومجاہدہ کے بعد گدڑی پہنائے تو جائز ہے۔ اور گدڑی پہننے کی شرط وہی ہے جو کفن پہننے کی شرط ہے کہ جب زندگی کی لذتوں سے امید منقطع کرے اور دل کو ضروریات زندگی سے پاک کر لے اور اپنی تمام عمر خدمت حق کے لئے وقف کر دے اور خواہش نفس سے پوری طرح بیزار ہو اُس وقت مرشد اس کو گدڑی جیسی خلعت پہنا کر عزت بخشے اور وہ مرید اس کے حق پر قائم رہے اور اُس کا حق ادا کرنے کی پوری سعی کرے اور اپنی خواہشات کو اپنے اوپر حرام کرلے۔ گدڑی سے متعلق بزرگوں نے بہت سے اشارات بیان فرمائے ہیں شیخ ابو معمر اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں ایک کتاب لکھی ہے لیکن عام صوفی لوگ اس بارے میں بڑا مبالغہ کرتے ہیں۔ تاہم اُس کتاب سے اقوال نقل کرنے کا ہمارا ارادہ نہیں بلکہ ہمیں تو طریقت کے مشکل مسائل کو کھولنا ہے۔ اور گدڑی کے بارے میں بہترین اشارات یہ ہیں کہ گدڑی کا گلا صبر ہے۔ اس کی دو آستینیں خوف ورجا ہے۔ دو تریزیں۔ قبض وبسط سے کمر نفس کی مخالفت سے اُس کی دونوں کرسیاں یقین کی صحت سے اور اُس کی فراویز اخلاص سے بنی ہونی چاہئیں۔ اور اس سے بھی بہتر اشارات یہ ہیں کہ گدڑی کا گلا "اہل دنیا کی محبت کے فنا ہو جانے سے دونوں آستینیں نفس کی حفاظت اور دل کی عصمت سے" دونوں تریزیں فقر و برگزیدگی سے۔ اس کی کمر۔ مشاہدہ حق میں محو ہو جانے سے اور کرسی بارگاہ خداوندی میں اطمینان پانے سے اور اُس کی فراویز حق تعالیٰ کے مقام وصال میں قرار پکڑنے سے

بنی ہونی چاہیئے!

جب باطن کے لئے تو نے اس طرح کی گدڑی تیار کرلی تو اپنے ظاہری وجود کے لئے بھی ایک گدڑی بنالینی چاہئیے۔ اور میری اس بارے میں ایک مستقل کتاب ہے جس کا نام "اسرار الخرق والمؤنات" ہے ہر مرید کے پاس اس کا ایک نسخہ ہونا چاہیئے لیکن مرید نے جب یہ گدڑی پہن لی تو اگر غلبہ حال کے وقت اُس گدڑی کو پھاڑ ڈالے تو وہ معذور ہے اور اس کا عذر قابل تسلیم ہے۔ اور اگر اپنے اختیار اور شرائطِ طریقت کو جانتے ہوئے اس کو پھاڑ ڈالے تو اُس کے لئے گدڑی رکھنا مناسب نہیں اور اگر رکھے گا تو یہ بھی زمانے کے دوسرے گدڑی پوشوں کی طرح کا ایک ہوگا جب اُن میں سے ہوگا تو باطن اکی صفائی کے بغیر صرف ظاہر پر اکتفا کرنے والا ہوگا۔ اس معنی کی حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں کے لباس پھاڑنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف اُن کا انتقال ہوتا ہے تو اُس مقام کے حصول پر شکریہ کے طور پر اس لباس سے باہر آتے ہیں گدڑی کے سوا دوسرے کپڑے صرف ایک مقام کا لباس ہوتے ہیں اور گدڑی طریقت کے تمام مقامات کے لئے مکمل لباس ہے گویا کہ گدڑی طریقت۔ فقر اور صفوت کے جملہ مقامات کا ایک جامع لباس ہے اور ان تمام مقامات سے باہر نکلنا ان سب مقامات سے بیزاری ظاہر کرنے کے مترادف ہے اگرچہ اس مسئلہ کے بیان کرنے کا یہ مقام نہیں کیوں کہ اس کو خرقہ اور کشفِ حجابُ السماع کے باب میں بیان کرنا چاہیئے۔ پھر بھی یہاں اتنا اشارہ اس لئے کردیا ہے تاکہ یہ لطیفہ فوت نہ ہوجائے۔ انشاء اللہ اپنے مقام پر اس کی پوری تفصیل بیان کریں گے ——— اور مشائخ طریقت نے یہ بھی فرمایا ہے کہ گدڑی پہنانے والے (مرشد) میں حقیقت وطریقت کی اتنی قوت ہونی چاہئیے کہ جب وہ طریقت سے بیگانہ شخص کو شفقت کی نگاہ سے دیکھے تو وہ طریقت سے آشنا ہوجائے اور اگر وہ کسی گنہگار کو گدڑی پہنادے تو وہ اولیاء میں سے ہوجائے۔ ایک دفعہ میں اپنے شیخ کے ہمراہ آذربیجان کے ایک شہر میں جا رہا تھا کہ دو تین گدڑی پوشوں کو دیکھا وہ گندم کے ڈھیر پر کھڑے تھے انہوں نے اپنی گدڑیوں کے پلّے پھیلا دئیے تو کسان نے ان میں کچھ غلہ ڈال دیا۔ شیخ نے ان کی طرف توجہ کی اور یہ آیت پڑھی

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ (یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے میں گمراہی کو خرید لیا۔ پس اُن کی تجارت نے اُن کو کوئی نفع نہ دیا اور وہ ہدایت پانے والے نہ تھے) میں نے پوچھا اے شیخ! یہ لوگ کس بے حرمتی کی وجہ سے اس مصیبت میں مبتلا اور مخلوق کے سامنے ذلیل ہوئے ہیں؟ انہوں نے فرمایا! ان کے پیروں کو زیادہ سے زیادہ مرید جمع کرنے کی حرص تھی اور انہیں دُنیا کی دولت جمع کرنے کی اور کوئی حرص دوسری حرص سے بہتر نہیں ہوتی اور امور شریعت کو پیش نظر رکھے بغیر دعوت دینا اپنے نفس کی خواہشات کی پرورش کرنا ہے۔

حضرت جنید رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ میں نے باب الطلق کے بازار میں ایک انتہائی خوبصورت یہودی کو دیکھا میں نے کہا" اے بار خدایا" اس کو میرے کام میں لے آ کہ تو نے اسے کتنا صاحب جمال پیدا کیا ہے"! ابھی کچھ مدت ہی گذری تھی کہ وہ یہودی میرے پاس آیا اور کہنے لگا! یا شیخ! کلمہ شہادت مجھ پر پیش کیجئے چنانچہ وہ مسلمان ہو گیا اور اس کا شمار اولیاء اللہ میں ہوا۔ اور شیخ ابو علی سینا رحمۃ اللہ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ گدڑی پہننا کس کے لئے جائز ہے؟ آپ نے فرمایا اُس شخص کے لئے جو حکومتِ الٰہیہ کے اسرار سے واقف ہو چنانچہ اللہ تعالےٰ کے احکام و احوال میں سے دنیا میں جو چیز بھی جاری ہوتی ہے۔ فا علانِ قضا و قدر اُس کو اُن سے آگاہ کر دیتے ہیں۔ پس گدڑی صالحین کا شعار نیک لوگوں کی علامت اور فقراء و اہل تصوف کا لباس ہے اور فقر و صفوت سے متعلق اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اگر کوئی شخص اولیاء اللہ کے لباس کو دنیوی دولت جمع کرنے کا ذریعہ اور اپنی خرابیوں کے لئے پردہ بنا لے تو اس کے اِس فعل کی وجہ سے اس لباس کے اہل صوفیاء کرام کو مورد الزام ٹھہرانا مناسب نہیں اور اہل ہدایت کے لئے اتنی مقدار میں بیان ہی کافی ہے کیوں کہ اگر میں اس کی تفصیل بیان کرنے لگوں تو اس کتاب کا مقصد فوت ہو جائے گا ——— اور توفیق تو اللہ کی طرف سے ہے۔

پانچواں باب

فقر و صفت میں اختلاف

فقر و صفوت کی تفصیل میں علماء طریقت کا اختلاف ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک فقر صفوت سے افضل ہے۔ اور دوسرے گروہ کے نزدیک صفوت، فقر سے افضل ہے، جو لوگ فقر کو صفوت پر فضیلت دیتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ فقر، اللہ تعالےٰ کے ماسویٰ ہر چیز کے فنا اور ماسویٰ اللہ سے انقطاع کا نام ہے اور صفوت اس کے مقامات میں سے ایک مقام ہے جب فنا حاصل ہو گئی تو مقامات سب نابود ہو گئے اور یہ مسئلہ بھی فقر و غناء کی طرح ہے اور اُن کے متعلق اس سے پہلے گفتگو گزر چکی ہے اور جو لوگ صفوت کو فقر سے اعلیٰ سمجھتے ہیں اُن کا کہنا یہ ہے کہ فقر ایک موجود چیز ہے جس کا نام رکھا جا سکتا ہے اور صفوت تمام موجودات سے تعلق منقطع ہو جانے کو کہتے ہیں اور جملہ موجودات سے انقطاع عینِ فنا ہے اور فقر عین بقاء۔ پس فقر اولیاء اللہ کے مقامات میں سے ایک مقام ہوا اور صفوتِ اُن کے کمالات میں سے ایک کمال۔ اور اس زمانہ میں اسکے متعلق کافی طویل بحثیں ہو چکی ہیں۔ اور ہر شخص اس میں عجیب عجیب تاویلیں کرتا اور ایک دوسرے کے سامنے نادر اقوال پیش کرتا ہے۔ فقر و صفوت کی تفصیل میں واقع اختلاف تمام کا تمام صرف لفظی اختلاف ہے۔ حالانکہ مشائخ متفق ہیں۔ کہ محض عبارت نہ فقر ہے اور نہ صفوت۔ پس ان لوگوں نے محض عبارت کو ایک مذہب بنا لیا ہے اور طبیعت کو معانی کے ادراک سے خالی کر لیا ہے۔ اور حق کی بات کو نیچے پھینک کر خواہشِ نفس کی نفی کو نفیِ عین اور اُس کے اثبات کو اثباتِ عین سمجھ لیا ہے۔ پس اپنی نفسانی خواہش کے قیام کی وجہ سے وہ خود ہی موجود و مفقود اور منفی و مثبت ہیں۔ طریقت۔ جھوٹے مدعیوں کی اس طرح کی واہیات باتوں سے پاک ہے۔ الغرض اولیاء اُس بلند مقام پر پہنچ جاتے ہیں کہ جہاں کوئی مقام باقی نہیں رہتا بلکہ جملہ درجات و مقامات فانی ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ عبارات اپنے معانی بیان کرنے سے عاجز آ جاتی ہیں اس طرح وہاں۔ پینا۔ ذوق، طمع

قوت ۔ ہوشیاری اور بے خودی کوئی چیز بھی باقی نہیں رہتی ۔ اس وقت وہ ایسے نام کے متلاشی ہوتے ہیں جس سے وہ اُن معانی کو بیان کر سکیں جو نہ تو کسی اسم کے تحت آتے ہیں نہ کسی صفت کے تحت ۔ اس وقت ہر شخص اُس نام کو اُن معانی پر چسپاں کرتا ہے جو اس کے نزدیک باعظمت ہو۔ لہٰذا وہاں تقدیم و تاخیر جائز نہیں ہوتی کہ کوئی کہہ سکے کہ یہ مقدم ہے یا وہ مقدم ہے کیونکہ مقدم و مؤخر ہونا تو اُن اشیاء میں ہوتا ہے جن کا کوئی نام ہو۔ پس ایک گروہ کے دل پر فقر کا نام پُرعظمت تھا تو انہیں یہ مقدم معلوم ہوا کیوں کہ اس نام کے ساتھ اُن کا تعلق تواضع و انکساری کی وجہ سے تھا ۔ اور دوسرے گروہ کے لئے صفوت کا نام زیادہ مقدم دکھائی دیتا ہے اور اُن کے دل پر اس کی عظمت زیادہ ہے کیوں کہ یہ دنیوی، نفسانی آلائشوں اور خرابیوں کو فنا کرنے کا آئینہ دار ہے ـــــ اور اُن کی مراد ان دونوں ناموں سے اُس معنی کی علامت ظاہر کرنا ہے جس کے بیان کرنے سے عبارت قاصر ہے حتیٰ کہ ایک دوسرے کے ساتھ اس کے بارے میں اشاروں سے بات کرتے ہیں ۔ اور انہوں نے تمام علامتوں کے ساتھ اپنی ذات کا کشف کیا ۔ اس گروہ نے اس کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کیا کہ حقیقتِ تصوف کو فقر سے تعبیر کیا جائے یا صفوت سے ۔ البتہ اہل عبارت اور اہل زبان و لغت نے اس کے معانی کی حقیقت سے بے خبر ہوتے ہوئے محض عبارت میں کلام کیا اور اسی میں الجھ کر رہ گئے اور ان دو ناموں میں سے ایک کو مقدم اور دوسرے کو مؤخر کیا حالانکہ یہ دونوں قول محض عبارت (لفظی) ہی تھے ـــــ پس اولیاء کا گروہ تو معانی کی تحقیق کی طرف گیا اور یہ اہل لغت صرف عبارت کے اندھیرے میں ہی کھو کر رہ گئے ۔ بہر حال جب کسی شخص کو تصوف کی حقیقت حاصل ہو جائے اور وہ اس کو اپنے دل کی توجہ کا مرکز بنا لے تو اُسے فقیر کہیں یا صوفی ۔ یہ دونوں اُس حقیقت کے اضطراری نام ہیں ۔ جو اسم کے تحت نہیں آسکتی ـــــ اور یہ اختلاف حضرت ابوالحسن سمنون رحمۃ اللہ کے وقت سے چلا آتا ہے کہ وہ جب کشف کی ایسی حالت میں ہوتے جو بقا کے ساتھ تعلق رکھتی ہے تو فقر کو صفوت پر مقدم رکھتے اور جب مشاہدہ کے اس مقام میں ہوتے جس کا تعلق فنا کے ساتھ ہے تو صفوت کو فقر پر ترجیح دیتے اس وقت ارباب معانی ان سے پوچھتے کہ آپ ایسا کیوں کرتے

ہیں؟ تو آپ جواب دیتے کہ جب طبیعت کو فنا میں پورا تنزل اور بقاء کی طرف کامل بلندی حاصل ہوتی ہے تو میں صفوت کو فقر پر مقدم رکھتا ہوں اور جب میں ایسے مقام میں ہوتا ہوں جس کا تعلق بقاء کے ساتھ ہوتا ہے تو صفوت پر فقر کو مقدم رکھتا ہوں کیوں کہ فقر بقاء کا نام ہے اور صفوت فناء کا ۔ گویا میں اپنی ذات سے فنا اور بقاء کا دیکھنا اس طرح فانی کر دیتا ہوں کہ میری طبیعت فناء سے بھی فانی ہو جائے اور بقاء سے بھی فانی ہو جائے ۔

یہ بات عبارت کے اعتبار سے تو بہت اچھی ہے لیکن در حقیقت نہ فناء کو فنا ہے اور نہ بقا کو فنا ہے کیوں کہ جو باقی بالآخر فنا ہونے والا ہے وہ خود خالی ہے اور جو فانی انجام کار باقی رہنے والا ہے وہ خود باقی ہے ۔ اور فنا ایک ایسا اسم ہے جس میں مبالغہ محال ہے ۔ کیوں کہ اگر کوئی یوں کہے کہ فنا فنا ہو جاتی ہے تو یہ بات اس معنی کے وجود کے اثر کی نفی میں مبالغہ ہے کیونکہ فنا میں جب تک کوئی اثر موجود رہتا ہے اس وقت تک وہ بھی فنا نہیں ہوتا ۔ اور جب فنائے کلی حاصل ہو جائے تو فناء کی فنا ۔ ایک ایسی مہمل اور بے معنی عبارت ہے جس میں تعجب کے سوا کچھ نہیں ـــ اور بحث و تحیص کے وقت یہ عبارت اہل لغت کی فضول باتیں ہیں ۔

اگرچہ اپنی کتاب "فنا و بقا" میں ہم نے بھی اسی انداز میں کچھ لکھا ہے لیکن وہ بچپنے اور احوال کی تیزی کی وجہ سے ہوا ہے ۔ تاہم انشاء اللہ اس کتاب میں پوری احتیاط کے ساتھ اس کے احکام بیان کریں گے ۔ علم طریقت میں فقر اور صفوت کا فرق یہی ہے جو بیان ہو چکا لیکن دنیا کے معاملات میں دنیا سے علیحدگی اور اس سے خالی ہاتھ ہونے کے لحاظ سے صفوت اور فقر بالکل مختلف چیزیں ہیں اور اس کی حقیقت محتاجی اور مسکینی کی طرف رجوع کرتی ہے ۔ اور مشائخ طریقت کی ایک جماعت کہتی ہے کہ فقیر (محتاج) مسکین سے بہتر ہے کیونکہ اللہ عزوجل کا فرمان ہے ۔

الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ ۔ صدقات

اُن فقرا کا حق ہیں جو اللہ کی راہ میں روک دیئے گئے ہیں کہ معاش کے لئے زمین میں چل پھر نہیں سکتے (اس لئے کہ مسکین تو وہ ہوتا ہے جس کے پاس تھوڑا بہت سامان موجود ہو اور فقیر وہ ہے جس نے اسباب معیشت کو بالکل ہی ترک کر دیا ہو ۔ پس فقر عزت ہے اور مسکنت ذلت ہے اور اسباب معیشت رکھنے والا طریقت میں ذلیل ہوتا ہے ۔ کیوں کہ

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: تَعَسَ عَبْدَ الدُّنیَا وَ تَعَسَ عبد الدِّرهَم وَ تَعَسَ عَبد الخَمِیصَلۃِ والقطیقۃِ۔ (ہلاکت ہو دنیا کے غلام کو۔ ہلاکت ہو بندہ درہم کو۔ ہلاکت ہو بندہ دینار کو ہلاکت ہو سیاہ لباس والے کو اور پھٹے لباس کے بندہ کو) اور اسباب معیشت کا تارک عزیز ہوتا ہے کیوں کہ اسباب معیشت والے کا اعتماد اسباب معیشت پر ہوتا ہے اور تارک اسباب معیشت کا اعتماد اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہوتا ہے اور ایک گروہ کا کہنا یہ ہے کہ مسکین، فقیر سے افضل ہے اس لئے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "اللّٰھُمَّ اَحیِنِی مِسکِیناً وَّ اَمِتنِی مِسکِیناً وّ احشُرنِی فی زُمرَۃِ المساکین اے اللہ! مجھے مسکینی کی حالت میں زندہ رکھ اور مسکینی کی حالت میں موت دے اور قیامت کے روز مسکینوں کے زمرے میں مجھے اُٹھا) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مسکین کو یاد کیا تو یہ کہا کہ اے میرے رب مجھے موت اور زندگی مسکینوں کی سی عطا فرما اور جب فقر کا ذکر کیا تو فرمایا "کادَ الفقر اَنْ یَکُونَ کُفراً" (فقر اس بات کے قریب ہے کہ کفر ہو جائے) اس سبب کی وجہ سے فقر وہ ہے جو اسبابِ معیشت سے تعلق رکھتا ہو اور مسکین وہ ہے جو اسباب معیشت سے بالکل تعلق نہ رکھتا ہو اور شریعت میں فقہا کے ایک گروہ کے نزدیک مسکین صاحب بُلغہ (زادِ راہ سامان) اور فقیر بالکل بے سرو سامان ہوتا ہے اور دوسرے گروہ کے نزدیک فقیر صاحب بُلغہ اور مسکین بے ساز و سامان ہوتا ہے۔ بس اس جگہ اہلِ مقامات مسکین کو صوفی کہتے ہیں۔ اور یہ اختلاف فقہاء (اللہ اُن سے راضی ہو) کے اختلاف سے قریب ہے جس کے نزدیک فقیر بے سامان اور مسکین صاحب سامان ہے اُس کے نزدیک فقر صفوت سے زیادہ افضل ہوگا اور جس کے نزدیک مسکین مجرد اور فقیر صاحبِ بُلغہ ہے اُس کے نزدیک صفوت فقر سے بہتر ہوگی یہ ہیں صوفیائے کے فقر و صفوت کے درمیان مختصراً اختلاف! واللہ اعلم بالصواب۔

چھٹا باب

ملامت کا بیان

حقیقتِ ملامت: مشائخ طریقت کے ایک گروہ نے ملامت کا طریق اختیار کیا ہے۔ اور ملامت کو اخلاصِ محبت میں بڑا اثر اور پورا عمل دخل حاصل ہے۔ اور حق والے پوری دنیا میں مخلوق کی ملامت کے ساتھ خاص ہیں خصوصاً اس امت کے بزرگ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہ جو حق والوں کے مقتدا اور امام اور محبانِ الٰہی کے پیشرو تھے۔ جب تک اُن پر بُرہانِ حق (نبوت) کا ظہور نہ ہوا تھا اور وحی الٰہی کی ابتداء نہ ہوئی تھی۔ تمام لوگوں کے نزدیک آپ بزرگ اور نیک نام تھے۔ لیکن جب اللہ تعالےٰ نے آپ کو دوستی کی خلعت (نبوت) سے سرفراز فرمایا تو خلعت نے آپ پر زبان ملامت دراز کی۔ ایک گروہ نے کہا کہ آپ کاہن (نجومی۔ جوتشی) ہیں ایک گروہ نے کہا آپ شاعر ہیں۔ کسی گروہ نے کہا وہ دیوانہ ہے اور ایک گروہ نے کہا کہ وہ جھوٹا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور اللہ تعالےٰ نے مومنوں کی تعریف میں کہا ہے کہ وہ ملامت کرنے والوں کی ملامت سے نہیں ڈرتے چنانچہ ارشاد ہے "وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ" (اور وہ ملامت کرنے والوں کی ملامت سے نہیں ڈرتے یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے) اور اللہ تعالےٰ کی سنت اسی طرح چلی آتی ہے کہ جو کوئی اُس کی بات کہتا ہے ساری دنیا اس کو ملامت کرنے لگ جاتی ہے۔ لیکن اللہ تعالےٰ اُس کے دل کو اُن کی ملامت میں مشغول ہونے سے بچائے رکھتا ہے اور یہ غیرتِ الٰہی ہے کہ اپنے دوستوں کو غیروں کی بُری نگاہوں سے محفوظ رکھتا ہے تاکہ کسی کی نظر اُن کے حال کی اصلی جمال پر نہ پڑ سکے۔ اور اپنے دوستوں کو بھی اس طرح خود بینی (اپنے آپ کو بڑا سمجھنا) سے بچاتا ہے۔ تاکہ نہ وہ اپنا جمال دیکھیں اور نہ غرور و عجب میں مبتلا ہوں اور نہ تکبر و خود بینی کی برائی میں پڑیں۔ پس اس لئے مخلوق اُن پر مقرر ہو جاتی ہے

تاکہ اُن پر زبان ملامت دراز کرتے اور ان کے اندر نفسِ لوامہ کو بھی ودیعت کر دیا گیا ہے تاکہ اُن کے ہر فعل پر وہ اُن کو ملامت کرتا رہے۔ اگر غلطی کا ارتکاب ہو تو وہ غلطی پر ملامت کرے اور اگر نیکی کا کام کریں تو اُس میں کوتاہی پر اپنے آپ کو ملامت کریں۔ اور راہِ حق میں یہ اصل ایک ایسی قوی ہے کہ طریقت میں اس سے زیادہ مہلک اور مشکل کوئی آفت اور حجاب نہیں کہ بندہ اپنی ذات میں کمالات و اوصاف دیکھ کر غرور میں مبتلا ہو جائے۔

اور یہ غرور اصل میں دو چیزوں سے پیدا ہوتا ہے پہلی مخلوق کی تعریف اور مدح سے اور یہ اس طرح ہوتا ہے کہ بندہ کا کردار لوگوں کو پسند آتا ہے تو وہ اس پر اس کی تعریف کرتے ہیں تو وہ اس پر مغرور ہو جاتا ہے اور دوسری چیز یہ کہ کسی کا کردار لوگوں کو پسند آتا ہے تو وہ خود ہی اپنے آپ کو تحسین کے قابل سمجھنے لگتا ہے اور غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل سے اپنے دوستوں پر یہ راستہ بند کر دیا ہے حتیٰ کہ اُن کے کام نیک بھی ہوں تو بھی لوگ انہیں پسند نہیں کرتے اس لئے کہ وہ حقیقتِ حال سے ناواقف ہوتے ہیں اور اگرچہ راہِ طریقت میں اُن کے مجاہدے بہت زیادہ تھے پھر بھی وہ اپنی طاقت اور قوت سے اُنہیں خیال میں نہ لاتے تھے اور نہ اپنے آپ کو اُن مجاہدوں کی وجہ سے پسند کرتے تھے تاکہ عُجب اور غرور سے محفوظ رہیں ——— پس جو شخص اللہ تعالےٰ کے نزدیک پسندیدہ ہو مخلوق اُسے پسند نہیں کرتی اور جو بذاتِ خود برگزیدہ بنتا ہو حق تعالےٰ اُسے برگزیدہ نہیں بناتے۔ چنانچہ ابلیس کو مخلوق نے بھی پسند کیا اور فرشتوں نے بھی قبول کر لیا۔ اور اس نے خود بھی اپنے آپ کو پسند کیا لیکن چونکہ وہ حق تعالےٰ کا پسندیدہ نہیں تھا اس لئے اِن سب کا پسند کرنا اُس کے لئے لعنت کا ثمرہ بنا لیکن اس کے برعکس حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں نے پسند نہ کیا اور کہنے لگے "اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا (کیا آپ زمین میں اُس کو پیدا کریں گے جو اُس میں فساد پھیلائے گا؟) اور آدم علیہ السلام نے بھی خود اپنے آپ کو پسند نہ کیا اور کہا "رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا (اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا) لیکن چونکہ حضرت آدم علیہ السلام حق تعالےٰ کے پسندیدہ تھے اس لئے فرمایا" فَنَسِيَ آدَمُ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا" (پس آدم بھول گیا اور ہم نے اس کے لئے ارادہ نہیں پایا) اس لئے فرشتوں کا اُن کو اور خود اُن کا اپنے آپ کو ناپسند کرنا

اُن کے لئے حق تعالیٰ کی رحمت کا پھل لایا۔ تاکہ دنیا والے جان لیں کہ ہمارا (حق تعالیٰ کا) مقبول، مخلوق کے نزدیک متروک اور مخلوق کا مقبول ہمارے نزدیک نامقبول ہوتا ہے۔ اس لئے مخلوق کی ملامت دوستانِ حق کی غذا ہے کیوں کہ اس میں قبولیت کی علامات ہیں اور حق تعالےٰ کے دوستوں کا مشرب بھی یہی ہے کہ مخلوق کی ملامت قربِ الٰہی کی علامت ہے اور جس طرح لوگ اپنی مقبولیت پر خوش ہوتے ہیں اولیاء اللہ مخلوق کے رد کرنے پر خوش ہوتے ہیں۔ اور روایات میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپؐ نے جبریل علیہ السلام سے اور انہوں نے خداوند تعالیٰ سے روایت کیا ہے کہ فرمایا "اَوْلِیَائِیْ تَحْتَ قِبَائِیْ لَا یَعْرِفُھُمْ غَیْرِیْ اِلَّا اَوْلِیَائِیْ"۔ (میرے دوست میری قبا کے نیچے ہیں جنہیں میرے مقرب دوستوں کے سوا کوئی نہیں پہچانتا)

پہلی فصل

ملامت کے اسباب:- تاہم ملامت کے تین اسباب ہیں (۱) راست روی (۲) ارادہ کرنا (۳) ترک کرنا۔ اور راست روی پر ملامت کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص اچھے کام کرتا اور دین کی حفاظت کرتا اور شریعت کے معاملات کی رعایت کرتا ہے لیکن اس حالت میں لوگ اُس کو ملامت کرتے ہیں۔ لوگوں کا اس کے بارے میں یہ عمل ہوتا ہے لیکن وہ اُن سب سے فارغ یعنی بے پرواہ رہتا ہے اور اُن کی ملامت کی توجہ نہیں دیتا ــــ اور ارادہ کرنے پر ملامت کی صورت یہ ہے کہ جب کسی شخص کو لوگوں میں بڑا رتبہ حاصل ہو جائے۔ اور اُن کے درمیان نیکی کی علامت بن جائے اور پھر اُس کا دل رتبہ کی طرف جھکے اور اُس کی طبیعت لوگوں میں لگ جائے اس کے بعد وہ خود چاہے کہ اپنے دل کو لوگوں سے فارغ کرکے خدا تعالےٰ کی طرف مشغول ہو جائے اور بتکلف ایسا کام کرے جس کا کرنا شریعت کے خلاف تو نہ ہو لیکن لوگ اس کی وجہ سے اس پر ملامت کریں اور اُس سے نفرت کرنے لگیں، مخلوق میں یہ اس کی طرف سے قصد ملامت کی راہ ہے جس کی وجہ سے لوگ اُس سے لاتعلق ہو جاتے ہیں۔ اور ترک کرنے پر ملامت کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص کو کفر اور گمراہی طبعاً پسند آجائے اور اس کی خاطر شریعت سے کنارہ کش ہو جائے اور اس کی متابعت چھوڑ

دے اور یوں کہے کہ یہ تو لوگوں کی ملامت کا ایک راستہ ہے جو میں نے اختیار کیا ہے ــــــــ لیکن جو شخص دین میں راست روی، عدم منافقت اور ترکِ ریاکاری کا راستہ اختیار کرتا ہے اُسے لوگوں کی ملامت کا کوئی خوف نہیں ہوتا وہ ہر قسم کے حالات میں اپنے قاعدہ پر رہتا ہے اور اُس کو جس نام سے بھی پکارا جائے اس کے لئے برابر ہوتا ہے۔

اور میں نے حکایات میں پایا ہے کہ شیخ ابو طاہر حراقی رحمہ اللہ ایک روز گدھے پر سوار بازار میں جا رہے تھے اور ایک مرید نے گدھے کی لگام پکڑ رکھی تھی۔ ایک شخص نے آواز دی کہ زندیق (بے دین) پیر آیا ہے۔ جب اُس مرید نے یہ آواز سنی تو عقیدتمندی کی غیرت کے سبب اُس شخص کو زخمی کرنے کا ارادہ کیا جس سے تمام بازار والے جوش میں آ گئے۔ شیخ رحمہ اللہ نے مرید سے کہا کہ اگر تو خاموش رہے تو میں تجھے ایک ایسی چیز سکھاؤں گا کہ تو ان کی تکلیف سے محفوظ رہے گا۔ مرید خاموش ہو گیا۔ جب اپنی قیام گاہ پر واپس پہنچے تو مرید سے فرمایا "وہ صندوق اُٹھا لا۔ وہ اُٹھا لایا۔ اس صندوق میں خطوط تھے۔ صندوق کے جس حصے میں تمام لوگوں کے لکھے ہوئے خطوط تھے نکال کر مرید کے سامنے رکھ دئے اور فرمایا "غور سے دیکھ! ہر شخص کی طرف سے میری طرف بھیجا ہوا خط موجود ہے ان میں سے ایک نے مجھے شیخ الاسلام کے لقب سے مخاطب کیا ہے۔ ایک نے شیخ زکی ایک نے شیخ زاہد اور ایک نے شیخ الحرمین وغیرہ القاب سے مجھے مخاطب کیا ہے اور یہ سب میرے القاب ہیں نام نہیں۔ حالانکہ میں ان میں سے کسی لقب کے لائق نہیں ہوں ہر کسی نے اپنے اعتقاد کے مطابق مجھے لقب دیا ہے اور اگر اس بے چارے نے اپنے اعتقاد کے مطابق مجھے کوئی بات کہی ہے اور میرے لئے کوئی لقب مقرر کیا ہے تو اس پر یہ جھگڑا کیوں اٹھایا ہے؟ ــــــــ اور باقی یہ کہ جس شخص نے ملامت کو قصداً اختیار کرنے اور جاہ پسندی و عزت کو ترک کر دینے کا راستہ اپنایا ہو وہ ایسے ہی ہے جیسا کہ روایت کی گئی ہے کہ امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اپنے دورِ خلافت میں ایک روز اپنے کھجوروں کے باغ سے واپس آ رہے تھے اور ایندھن کا گٹھڑ اپنے سر پر اٹھا رکھا تھا حالانکہ آپ کے چار سو غلام تھے۔ لوگوں نے کہا اے امیر المومنین! یہ کیا حال ہے؟ فرمایا۔ اُرِیْدُ اَنْ اُجَرِّبَ نَفْسِیْ۔ (میں نے اپنے نفس کو آزمانا چاہا) میرے

غلام ہیں اور وہ یہ کام بھی کر سکتے ہیں لیکن میں نے چاہا ہے کہ اپنے نفس کا تجربہ کروں تاکہ مخلوق کے درمیان میرا مرتبہ اس نفس کو کسی کام کے کرنے سے روک نہ لے۔ اور ملامت کے اثبات میں یہ حکایت بالکل واضح ہے اور اسی معنی میں امام اعظم امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی بھی ایک حکایت بیان کرتے ہیں۔ اس کتاب میں جہاں اُن کا تذکرہ آئے گا وہاں اُس حکایت کو تلاش کرنا ——— نیز بایزید بسطامی رحمۃ اللہ کے متعلق روایت کرتے ہیں کہ آپ سفر حجاز سے واپسی پر ایک شہر سے گزرے تو شور ہوا کہ بایزیدؒ تشریف لاتے ہیں۔ شہر کے تمام لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ آپ کو عزت و تکریم کے ساتھ شہر میں لائیں۔ آپ نے جب دیکھا کہ شہر کے لوگ اُن کے سامنے آ گئے ہیں تو آپ کا دل اُن کی رعایت میں مشغول ہو گیا اور توجہ حق تعالےٰ سے ہٹ گئی اور آپ پریشان ہو گئے۔ جب آپ بازار میں پہنچے تو اپنی آستین سے ایک روٹی نکالی اور کھانے لگے۔ چونکہ یہ رمضان کا مہینہ تھا اس لئے یہ دیکھ کر لوگ آپ کے پاس سے ہٹ گئے اور آپ کو تنہا چھوڑ دیا حالانکہ آپ مسافر تھے جو مرید آپ کے ساتھ تھا۔ آپ نے اُس سے فرمایا "تم نے دیکھا کہ میں نے شریعت کے ایک مسئلہ پر عمل نہیں کیا تو تمام مخلوق نے مجھے آزاد چھوڑ دیا ہے ـ اور میں علی بن عثمان الجلابی کہتا ہوں کہ اس زمانہ میں ملامت کے لئے ایسا کام کرنا چاہیئے جو بظاہر خلاف عادت ہو اور لوگ اس سے نفرت کریں چنانچہ اب اگر کوئی شخص چاہتا ہو کہ لوگ اُسے ملامت کریں تو اُسے کہو کہ وہ جائے اور دو رکعت نفل بہت طویل ادا کرے یا دین پر پوری طرح عمل کرے تمام لوگ یک لخت اُسے منافق اور ریاکار کہیں گے لیکن جو شخص ملامت کے حصول کے لئے شریعت کو ترک کرنے کا راستہ اختیار کرے اور شریعت کے خلاف کوئی امر اختیار کر کے یوں کہے کہ یہ میں نے ملامت کا طریق اختیار کیا ہے تو اس کا یہ کام کھلی گمراہی بہت بڑی خرابی اور دنیا کی ہوس پر مبنی ہو گا۔ چنانچہ اس دور میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کا مقصد لوگوں کی سادگی اور بے توجہی کی وجہ سے اُن میں مقبول ہونا ہے۔ اس لئے کہ کوئی شخص لوگوں میں اُس وقت تک مقبول نہیں ہو سکتا جب تک اُن کے رد کا ارادہ نہ کرے اور ایسے فعل کا ارتکاب نہ کرے جس کو وہ رد کرتے ہوں۔ غیر مقبول آدمی کا رد کا تکلف کرنا درحقیقت اپنے مقبول بننے کے لئے ایک بہانہ ہے۔ مجھے (علی بن عثمان)

ایک مرتبہ ان جھوٹے مدعیوں میں سے ایک کے ساتھ صحبت کا اتفاق ہوا ایک دن اُس نے ایک غلط کام کا ارتکاب کیا اور ملامت کو اس کے لئے عذر کے طور پر پیش کیا تو ایک شخص نے اُس سے کہا کہ یہ تو کوئی چیز نہ ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ اس بات پر اس نے غصہ کیا۔ میں نے کہا" اے زاہد! اگر تو حصول ملامت کا دعویٰ کرتا ہے اور اس دعویٰ میں سچا ہے تو اِس جوان کا تیرے فعل کو قبول نہ کرنا تو تیرے مذہب کی تاکید ہی ہے اور جب وہ تمہارے دعوے کے مطابق تمہارے طریق میں تمہاری موافقت بھی کر رہا ہے تو یہ غصہ اور جھگڑا کیسا؟ تمہارا یہ معاملہ تو ملامت کے مقابلہ میں دعوت سے زیادہ مشابہ ہے اور جو شخص لوگوں کو شریعت کے کسی کام کی دعوت دے اس کے لئے قطعی دلیل کی ضرورت ہے اور سنت نبوی علیہ التحیۃ والسلام کی حفاظت ہی سب سے بڑی قطعی دلیل ہے اور میں جب دیکھتا ہوں تو علی الاعلان ایک فریضہ کو ترک کر رہا ہے اور لوگوں کو اس کی گویا دعوت بھی دے تو تمہارا یہ کام دائرہ اسلام سے باہر ہے۔

دوسری فصل

جان لو! کہ مذہب ملامت کو اپنے دور کے شیخ ابو حمدون قصار رحمہ اللہ نے رواج دیا ہے اور ملامت کی حقیقت میں ان کے بہت سے لطائف ہیں اُنہی سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ "اَلْمَلَامَۃُ تَرْکُ السَّلَامَۃِ" ملامت، سلامتی کو ترک کرنے کا نام ہے اور جب کوئی شخص سلامتی کو ترک کر کے مصائب کے لئے کمربستہ ہو جائے اور جلالِ خداوندی کے ظہور اور نیک انجام حاصل کرنے کی امید پر اپنی پسندیدہ چیزوں اور اپنی راحتوں سے بیزاری اختیار کرے یہاں تک کہ لوگوں کے ردّ و انکار کی وجہ سے مخلوق سے مایوس و ناامید ہو جائے تو اس کی طبیعت لوگوں سے الفت و محبت قطع کر لیتی ہے اور وہ جتنا لوگوں سے قطع تعلق کرتا ہے اتنا ہی حق تعالےٰ سے قریب ہو جاتا ہے۔ پس جس چیز کی طرف لوگوں کی توجہ ہوتی ہے اور اُس میں اُن کی سلامتی موجود ہوتی ہے اہل ملامت اُس کی طرف سے منہ موڑ لیتے ہیں وہ اس لئے اس سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں تاکہ اہل ملامت کا غم لوگوں کے غم سے مختلف اور اُن کے مقاصد لوگوں کے مقاصد کے خلاف ہوں ——— وہ اپنے اوصاف میں یکتا اور بے مثل

ہوتے ہیں جیسا کہ احمد بن فاتک رحمہ اللہ حسین بن منصور رحمۃ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ لوگوں نے اُن سے پوچھا" مَنِ الصُّوفِی قال وَحدانی الذات" (صوفی کون ہے؟ تو فرمایا جو اپنی ذات میں یکتا ہو)۔ —— نیز ابو حمدون رحمہ اللہ سے لوگوں نے ملامت کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا اگرچہ اُس کی راہ لوگوں پر دشوار اور مشکل ہے تاہم اس کے متعلق کسی قدر ہم بیان کرتے ہیں" رَجَاءُ المُرجِیَۃِ وَخَوفُ القدریۃِ" (فرقہ مرجیہ کی امید اور فرقہ قدریہ کے خوف کا نام ملامت ہے) یعنی فرقہ مرجیہ کی طرح بعض امور میں شریعت کی خلاف ورزی کے باوجود مغفرت کی امید رکھنا اور فرقہ قدریہ کی طرح عمل میں کوتاہی کی وجہ سے مغفرت کے بارے میں ڈرتے رہنا، ملامت والوں کی صفت ہے اور اس میں ایک رمز ہے اور وہ یہ کہ طبیعت انسانی لوگوں کے نزدیک مرتبہ حاصل ہونے کی وجہ سے جتنا درگاہِ الٰہی سے نفرت کرنے لگتی ہے اتنا اور کسی وجہ سے نہیں کرتی۔ اور کسی آدمی کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ کوئی اس کی تعریف کر دے تو وہ اس کو دل و جان سے پسند کرنے لگے اور اسی وجہ سے وہ خدا تعالےٰ سے دور ہو جائے پس خوف کرنے والا یہ کوشش کرتا ہے کہ خطرے کے مقام سے بھی دور رہے اور طالب کے لئے اس کوشش میں دو خطرے پیش آتے ہیں۔ ایک لوگوں کے حجاب کا خوف اور دوسرا اس فعل سے روکنا جس کی وجہ سے لوگوں نے اُسے گنہگار سمجھا اور اس پر ملامت کی۔ یہ نہ تو اُن کے نزدیک مرتبہ حاصل کر کے مطمئن ہوتا ہے اور نہ اِس بات کا سامان ہے کہ اُن کو اپنی ملامت سے گنہگار گروائے۔ پس ملامتی کو چاہئے کہ پہلے جس معاملہ میں لوگ اسے ملامت کرتے ہیں اُس کے متعلق دنیا و آخرت کا جھگڑا ختم کرے اور دل کی نجات کے لئے ایسا فعل اختیار کرے جو شریعت میں نہ کبیرہ ہو نہ صغیرہ تاکہ لوگ اُسے رد کریں حتیٰ کہ اس شریعت کے معاملات میں اس کا خوف قدریوں کے خوف کی طرح اور ملامت کرنے والوں کے معاملہ میں اس کی مغفرت کی امید مُرجیوں کی امید کی طرح ہو —— درحقیقت کسی چیز کی محبت، ملامت کی محبت سے بہتر نہیں ہوتی کیوں کہ دوست کی ملامت کا دوست کے دل پر اثر نہیں ہوتا۔ اور دوست کا گزر کوچہ دوست کے سوا کہیں ہوتا اور دوست کے دل میں غیروں کا خیال بھی پیدا نہیں ہوتا جیسا کہ ایک سچا عاشق۔ اللہ تعالےٰ کو مخاطب کر کے کہتا ہے اَجِدُ الملامۃَ فی ھواکَ لذیذۃً حُبّاً لِذکرکِ فَلْیَلُمْنِی اللُّوَّمُ

رَوْضَۃُ العَاشِقِینَ وَنُزْھَۃُ المُحِبِّینَ وَرَاحَۃُ المُشْتَاقِینَ وَسُرُورُ المُرِیدِینَ" (میں تیری محبت میں ملامت کو لذیذ محسوس کرتا ہوں کیونکہ ملامت عاشقوں کا باغیچہ دوستانِ حق کی سیرگاہ مشتاقانِ خدا کی راحت اور مریدینِ حق کا سرور ہے) اور یہ گروہ دونوں عالم (جنوں اور انسانوں) میں دل کی سلامتی کے لئے اپنے بدن کی ملامت اختیار کرنے میں مخصوص ہے، اور مخلوق میں سے کسی مقرب، کسی کروبی اور کسی روحانی کو یہ درجہ حاصل نہیں اور اس امت کے صوفیاء اور دنیا سے قطع تعلق کے راستے پر چلنے والوں کے سوا پہلی امتوں کے عابد، زاہد اور طالبان وراغبانِ حق بھی اس مرتبہ پر نہیں پہنچ سکے ــــ لیکن میرے نزدیک ملامت کی طلب عین ریا ہے اور ریا عین منافقت کیوں کہ ریاکار بتکلف ایسے راستے پر چلتا کہ لوگ اسے قبول کرلیں اور ملامتی صوفی بتکلف ایسے راستے پر چلتا ہے کہ لوگ اس کو رد کر دیں اور دونوں گروہ لوگوں میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں اور اس سے باہر نہیں نکل سکے یہاں تک اِن میں سے ریاکاروں کے گروہ نے یہ عمل اختیار کیا ہے تو سلامتی صوفیوں کے گروہ نے وہ عمل اختیار کرلیا ہے ـــــ اور حقیقی درویش کے دل میں تو لوگوں کا خیال تک نہیں گزرتا اور جب اُس کا دل مخلوق سے قطع تعلق کئے ہوئے ہوتا ہے تو وہ ان دونوں راستوں سے فارغ اور بے نیاز ہوتا ہے اور ان میں سے کسی چیز کا پابند نہیں ہوتا ۔ مجھے (مصنفؒ) ایک دفعہ ماوراءالنہر کے ایک ملامتی صوفی کے ساتھ صحبت کا اتفاق ہوا اور جب میں خوش ہوا تو میں نے کہا اے بھائی! ان ناپسندیدہ افعال سے تمہاری مراد کیا ہے؟ اُس نے جواب دیا "لوگوں کو اپنی ذاتؒ میں فنا کردینا۔" میں نے کہا کہ مخلوق تو بے شمار ہے اور اپنی تھوڑی سی عمر میں وہ زمانہ اور درجہ حاصل نہیں کرسکے گا کہ لوگوں کو اپنے حال میں فنا کرسکے لہٰذا تو اپنی ذات کو مخلوق میں فنا کردے تاکہ اس ہر وقت کی مشغولیت سے چھٹکارا حاصل کرے ـــ اور ایک گروہ وہ ہے جو مخلوق میں مشغول ہوتا ہے لیکن خیال کرتا ہے کہ خلقت اُن میں مشغول ہے پس کوئی شخص تجھے نہیں دیکھتا تو بھی اپنے آپ کو نہ دیکھ، جب زمانہ کی خرابی خود تمہاری آنکھ سے ہے تو تجھے غیر سے کیا سروکار ہے؟ وہ شخص دانشمند نہیں جسے پرہیز سے شفا طلب کرنی ہو لیکن وہ دوا سے طلب کرتا ہے اور ایک گروہ ایسا ہے جو کسرِ نفسی کے لئے ملامت کو اختیار کرتا ہے تاکہ لوگوں کے سامنے

ذلت کی وجہ سے اس کا نفس موذب ہو جائے اور وہ اپنے نفس سے اپنا انصاف طلب کرے کیوں کہ ان کے نزدیک سب سے زیادہ اچھا وقت وہی ہوتا ہے جب وہ اپنے نفس کو ذلت وخواری میں دیکھیں۔ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ کے بارے میں حکایت نقل کرتے ہیں کہ کسی شخص نے آپؒ سے دریافت کیا کہ کیا کبھی آپ کو آپ کی مراد بھی حاصل ہوئی ہے؟ فرمایا ہاں! دو مرتبہ! ایک مرتبہ تو میں کشتی میں سوار تھا اور وہاں کوئی بھی مجھے پہچانتا نہ تھا۔ ایک پھٹی ہوئی گدڑی میرا لباس تھا اور بال بڑھے ہوئے تھے۔ کشتی والے سبھی مجھ پر ہنستے اور تمسخر اڑاتے تھے۔ اور کشتی میں ہمارے ساتھ ایک مسخرہ تھا وہ بار بار آتا اور میرے سر کے بال پکڑ کر کھینچتا اور تمسخر کے طور پر مجھے ذلیل کرتا تھا اور میں اس وقت اپنے آپ کو بامراد پاتا تھا۔ اور اپنی اس حالت پر خوش ہوتا تھا حتیٰ کہ میری یہ خوشی ایک انتہا تک پہنچ گئی اور وہ یوں کہ وہ مسخرا اٹھا اور اس نے مجھ پر پیشاب کر دیا —— دوسری مرتبہ سخت بارش کے دوران میں ایک گاؤں میں پہنچا اس طرح کہ میری گدڑی پانی سے تر ہو چکی تھی اور موسم سرما کی سردی مجھ پر غالب ہو چکی تھی۔ میں ایک مسجد میں چلا گیا لوگوں نے مجھے وہاں نہ رہنے دیا۔ میں دوسری مسجد میں گیا تو وہاں بھی لوگوں نے رہنے نہ دیا میں پھر تیسری مسجد میں چلا گیا وہاں بھی لوگوں نے نہ رہنے دیا اور میں عاجز ہو گیا اور میرے دل پر سردی نے شدت اختیار کر لی۔ تو میں ایک حمام کی بھٹی میں گھس گیا اور اپنا دامن اس کی آگ پر تان دیا۔ اُس کا دھواں مجھ پر پڑتا رہا اور میرا منہ اور کپڑا اس کی وجہ سے سیاہ ہو گیا اس رات بھی میں اپنی مراد کو پہنچا تھا۔

اور خود مجھے (علی بن عثمان ہجویریؒ) بھی ایک مرتبہ ایک واقعہ پیش آیا تھا اور میں نے اس اُمید پر اس کے لئے بڑی جدوجہد کی کہ وہ حل ہو جائے لیکن وہ حل نہ ہوا۔ اور اس سے پہلے بھی مجھے اسی طرح کا ایک مشکل مسئلہ پیش آچکا تھا جس کے لئے میں شیخ بایزید رحمۃ اللہ کی قبر پر جا کر مجاور رہا تب وہ حل ہوا تھا۔ اس مرتبہ بھی میں نے وہاں کا ہی ارادہ کیا اور تین مرتبہ اُن کی تربت پر جا کر مجاور رہا تاکہ وہ حل ہو جائے لیکن پھر بھی حل نہ ہوا جبکہ میں اُس کو حل کرنے کی کوشش میں روزانہ تین مرتبہ غسل اور تیس مرتبہ وضو کرتا تھا لیکن اس

کے باوجود وہ حل نہ ہوا تو میں اٹھا اور خراسان کے سفر کا ارادہ کیا۔ سفر کے دوران ایک رات میں برکش نام کے ایک گاؤں میں پہنچا وہاں ایک خانقاہ تھی جس میں صوفی نما لوگوں کی ایک جماعت موجود تھی۔ اور میں ایک کھردری بوسیدہ گدڑی پہنے ہوئے تھا۔ اور اہل رسم (صوفیوں) کے سامان میں سے ایک عصا اور ٹاٹ کے علاوہ میرے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ میں اس جماعت کی نگاہوں میں سخت حقیر معلوم ہوا کسی نے مجھے نہ پہچانا اور وہ آپس میں رسم کے انداز میں کہتے کہ یہ شخص ہماری جنس میں سے نہیں۔ اور سچی بات بھی وہی تھی جو وہ کہہ رہے تھے۔ کہ میں ان میں سے نہ تھا۔ لیکن مجھے مجبوراً اس رات وہاں رہنا تھا۔ مجھے تو انہوں نے ایک بالاخانے پر بٹھایا اور خود اُس سے اوپر والے بالاخانے پر چڑھ گئے گویا میں فرش پر بیٹھا تھا۔ مجھے تو انہوں نے ایسی سوکھی روٹی دی جو پُرانی ہونے کی وجہ سے سبز ہو چکی تھی۔ اور وہ خود ایسا کھانا کھا رہے تھے کہ اُس کی خوشبو کو محسوس کر رہا تھا اور بالاخانے سے میرے ساتھ طنز آمیز قسم کی باتیں کر رہے تھے۔ جب وہ کھانے سے فارغ ہو گئے تو خربوزہ کھاتے ہوئے اپنی خوش طبعی میں اور میری حقارت کے لئے اس کے چھلکے مجھ پر پھینک رہے تھے —— اور میں دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ بار خدایا اگر انہوں نے تیرے دوستوں کا سا لباس نہ پہن رکھا ہوتا تو میں ان سے یہ ذلت کبھی برداشت نہ کرتا —— اور وہ جس قدر اُن کی طعن مجھ پر زیادہ ہوتی اُسی قدر میں دل میں خوش ہوتا یہاں تک کہ اس ذلت کا بوجھ بخوشی برداشت کرنے کی وجہ سے وہ مشکل مسئلہ مجھ پر حل ہو گیا۔ اور اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ مشائخ طریقت نے جاہلوں کو اپنے اندر گھسنے کا موقع کیوں دیا اور اُن کی ذلت کا بار کس لئے برداشت کرتے ہیں —— پس ملامت کے احکام یہی تھے جن کو میں نے اللہ تبارک و تقدس کی توفیق سے پوری تحقیق کے ساتھ بیان کر دیا۔

ساتواں باب

صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے صوفیا کے ائمہ

اب ہم صوفیاء کے اماموں کے حالات بیان کرتے ہیں اور صحابہ میں سے بھی ان مہاجرین و انصار کے بعض احوال کا تذکرہ کرتے ہیں جنہوں نے ایمان قبول کرنے میں دوسروں پر سبقت اور اولیت حاصل کی کہ وہی انبیاء علیہم السلام کے بعد تصوف کے معاملات میں اہل تصوف کے پیشرو، انفاس میں ان کے پیشوا اور احوال میں ان کے قائد ہوتے ہیں۔ اس تذکرہ سے تمہاری مراد ثابت ہو جائے گی انشاء اللہ عزوجل۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

ایک اُن صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے اسلام کے شیخ انبیاء علیہم السلام کے بعد تمام مخلوق میں سے افضل۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ اول، مسلمانوں کے امام۔ اہل تجرید کے سردار، ارباب تفرید کے شہنشاہ اور آفاتِ انسانی سے دور امیر المومنین حضرت ابوبکر عبداللہ بن عثمان الصدیق رضی اللہ عنہما ہیں۔ کہ ان کی کرامتیں مشہور ہیں اور حقائق و معاملات میں ان کے خوارق اور دلائل ظاہر ہیں اور تصوف کے باب میں آپ کے بہت سے مثالی واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ مشائخ طریقت آپ کی روایتوں اور حکایتوں کی قلت کی وجہ سے آپ کو ارباب مشاہدہ کا سردار اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان کی دین کے معاملات میں شدت اور پختگی کی بنا پر اہل مجاہدہ کا پیشوا مانتے ہیں۔ اور صحیح احادیث میں لکھا ہوا اور اہل علم میں مشہور ہے کہ حضرت صدیق اکبر رات کی نماز میں قرآن مجید آہستہ آواز میں تلاوت کرتے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بلند آواز میں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تم نرم آواز میں کیوں پڑھتے ہو؟ تو انہوں نے جواب دیا۔ "اُسْمِعُ مَنْ اُنَاجِیْہِ" (میں اُس کو سناتا ہوں جس سے میں راز میں بات کہہ سکتا ہوں) کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے

غائب نہیں ہے اور اُس کی سماعت کے نزدیک تو آہستہ یا زور سے پڑھنا دونوں طرح برابر ہے۔ اور جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو انہوں نے جواباً عرض کیا "اُوْقِظُ الْوَسْنَانَ اَیِ النَّائِمَ وَاَطْرُدُ الشَّیْطَانَ" (میں سونے والوں کو جگاتا اور شیطان کو ہٹاتا ہوں) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ حالت اُن کے مجاہدے کا پتہ دیتی ہے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی وہ بات اُن کے مشاہدے کی علامت ہے، اور مقام مجاہدہ، مقام مشاہدہ کے مقابلے میں اتنی ہی حیثیت رکھتا ہے۔ جتنی ایک قطرہ کو سمندر کے مقابلے میں حاصل ہوتی ہے۔ اسی لئے تو پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا تھا "هَلْ اَنْتَ حَسَنَةٌ مِنْ حَسَنَاتِ اَبِي بَكْرٍ" (ابوبکرؓ کی نیکیوں کے مقابلہ میں تیری حیثیت ایک نیکی جتنی ہے) غور کرو کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جو اسلام کی عزت ہیں" کی حیثیت حضرت ابوبکرؓ کی نیکیوں کے مقابلہ میں ایک نیکی جتنی ہے تو باقی اہل جہاں کی آپ کے مقابلہ میں کیا حقیقت ہوگی۔ آپ کے بارے میں روایت ہے کہ فرمایا "دَارُنَا فَانِيَةٌ وَاَحْوَالُنَا عَارِيَةٌ وَ اَنْفَاسُنَا مَعْدُوْدَةٌ وَكَسْلُنَا مَوْجُوْدَةٌ" (ہمارا گھر فنا ہونے والا ہے، ہمارے سب احوال ناپائیدار ہیں۔ ہمارے سانس گنتی کے ہیں اور ہماری سستی موجود ہے) پس فانی گھر کو آباد کرنا جہالت ہے اور ناپائیدار حالت پر بھروسہ کرنا بے وقوفی ہے اور گنتی کی چند سانسوں پر دل لگا لینا غفلت ہے اور سستی کو دین کہنا خسارا ہے کیوں کہ جو چیز مستعار ہے واپس ہو جائے گی جو چیز جانے والی ہے نہ رہے گی۔ جو چیز شمار کی جا سکتی ہے ایک دن ختم ہو جائے گی اور کاہلی کا تو کوئی علاج ہی نہیں۔ حضرت رضی اللہ عنہ نے ہمیں خبر دی کہ دنیا اور دنیا کی چیزیں اس قابل نہیں کہ دل کو اُن میں مشغول کیا جائے۔ کیوں کہ جب تو فانی میں مشغول ہو تو باقی سے حجاب میں ہو جائے گا۔ چونکہ نفس اور دنیا دونوں حق تعالےٰ سے حجاب کا سبب بنتی ہیں اس لئے دوستان حق نے ان دونوں سے کنارہ کشی اختیار کی ہے اور جب انہوں نے جان لیا کہ یہ سب چیزیں مستعار ہیں اور مستعار چیز دوسروں کی ملکیت ہوتی ہیں۔ تو دوسروں کی ملک میں تصرف سے ہاتھ کھینچ لیا ——— نیز آپؓ ہی کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ اپنی مناجات میں آپؓ نے فرمایا "اَللّٰهُمَّ ابْسُطْ لِيَ الدُّنْيَا وَزَهِّدْنِي عَنْهَا" (اے اللہ! میرے لئے دنیا فراخ کر دے

اور مجھے اس سے بے پرواہ بنا دے) پہلے تو آپ نے دعا کی کہ دنیا مجھ پر فراخ کر دے اور پھر فرمایا کہ مجھے اُس کی آفت سے محفوظ رکھ۔ اس میں ایک خاص رمز ہے اور وہ یہ کہ پہلے دنیا عطا فرما تاکہ میں اس پر تیرا شکر ادا کروں۔ پھر مجھے اس بات کی توفیق مرحمت فرما کہ میں تیری رضا جوئی کے لئے اُس سے دست بردار اور کنارہ کش ہو جاؤں تاکہ صبر کا مقام مجبوری اور اضطراری طور پر نہیں بلکہ اختیاری طور پر حاصل کر لوں۔ اور آپؓ کا یہ قول اس دنیا دار پیر کا رد ہے جس نے کہا تھا کہ جس کا فقر مجبوری سے ہو وہ اس سے بہتر ہے جس کا فقر اپنے اختیار سے ہو۔ کیوں کہ اگر فقر اضطراری ہو تو گویا فقیر اس کا معمول ہوا اور اگر اختیاری ہو تو گویا فقر اس فقیر کا معمول ہوا اور چونکہ پہلی صورت میں اُس کے کسب اور فعل کو فقر کے حصول میں کوئی دخل نہیں اس لئے وہ اُس شخص سے بہتر ہے جس نے بتکلف فقر کو اختیار کیا ہو —— اور ہم کہتے ہیں کہ فقر کا عمل تو اُس وقت ظاہر ہوتا جب غنا کی حالت میں اُس کے دل پر فقر کا ارادہ غالب ہو جائے اور اُس شخص پر اس قدر اثر انداز ہو جائے کہ اس کو اولادِ آدم علیہ السلام کی محبوب چیز دنیا سے الگ تھلگ کر دے۔ نہ اس طرح کہ فقر کی حالت میں دولت کی خواہش اس کے دل پر اس قدر غلبہ حاصل کئے ہوئے ہو کہ اُس کو درہم و دینار کے لئے ظالموں اور بادشاہوں کے درباروں میں جانا پڑے — اور درحقیقت فقر کا عمل یہ ہے کہ وہ غنا چھوڑ کر فقر کو اختیار کرے نہ یہ کہ فقر کی حالت میں سرداری اور دنیا کی دولت و ثروت کا طلبگار ہو۔ چنانچہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ انبیاء علیہم السلام کے بعد تمام مخلوق سے مقدم اور بلند مقام ہیں۔ لہٰذا کسی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ یہ کہہ کر اُن کا مقابلہ کرے کہ وہ فقرِ اختیاری کو فقرِ اضطراری پر مقدم گردانتے تھے —— اور تمام مشائخ طریقت کا بھی وہی مسلک ہے جو حضرت صدیق اکبرؓ کا ہے سوائے اس دُنیا دار پیر کے کہ جس کے قول کو ہم نے حضرت صدیق اکبرؓ کے قول اور روشن حجت سے رد کر دیا ہے۔

اور امام زہری رحمہ اللہ اُن سے روایت کرتے ہیں کہ لوگوں نے جب آپ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی تو آپؓ نے بر سر منبر خطبہ ارشاد فرمایا اور دوران خطبہ فرمایا " واللہِ مَا کُنْتُ حَرِیْصًا عَلَی الْاِمَارَۃِ یَوْمًا وَّلَا لَیْلَۃً قَطُّ وَلَا کُنْتُ فِیْھَا رَاغِبًا وَلَا سَئَلْتُھَا اللہَ

قَطُّ فِی سِرٍّ وَّعَلَانِیَۃٍ وَمَالِی فِی الۡاِمَارَۃِ رَاحَۃٌ" (اللہ کی قسم میں نے کسی دن میں اور کسی رات میں کبھی بھی امارت کی حرص نہیں کی اور نہ ہی مجھے اس کی خواہش تھی اور نہ میں نے کبھی پوشیدہ یا ظاہر اللہ تعالےٰ سے اس کی درخواست کی اور نہ ہی مجھے اس میں کوئی راحت ہے) اور جب اللہ تعالےٰ بندے کو کمالِ صدق پر پہنچا دے اور عزت کے مقام پر معزز و ممکن کر دیتے ہیں تو وہ بندہ اللہ تعالےٰ کے امر کا منتظر رہتا ہے کہ وہ کس انداز میں آتا ہے تاکہ امر الٰہی کے مطابق وہ اسی طرح ہو جائے اگر حکم آتا ہے کہ فقیر ہو جا تو وہ فقیر ہو جاتا ہے اور اگر حکم آتا ہے کہ امیر ہو جا، تو وہ امیر ہو جاتا ہے، اس حکم میں اپنی طرف سے کوئی تصرف نہیں کرتا۔ جیسا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ابتداء سے انتہا تک تسلیم و رضا کے علاوہ کوئی راستہ اختیار نہیں کیا۔ پس تجرید و تمکین فقر پر حرص اور سرد ی کے ترک پر صوفیا کرام آپؓ کی ہی اقتدا کرتے ہیں کیونکہ وہ تمام مسلمانوں کے عموماً اور اہل طریقت کے خصوصاً دینی امام اور پیشوا ہیں۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ

اور انہی میں سے ایک اہل ایمان کے میر لشکر، اہل احسان کے مقتدا، اہل تحقیق کے امام اور محبت الٰہی کے سمندر کے شناور حضرت ابو حفص عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہیں۔ جن کی کرامات مشہور اور فراستِ ایمان کی باتیں لوگوں میں عام ہیں اور وہ دین کے معاملات میں فراست اور سخت پابندی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اور طریقت و تصوف میں آپ کے بہت سے لطائف اور قیمتی رموز ہیں۔ اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آپ کے متعلق ہی فرمایا کہ اَلۡحَقُّ یَنۡطِقُ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ (عمر رضی اللہ عنہ کی زبان پر حق بولتا ہے) اور نیز پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا "قَدۡ کَانَ فِی الۡاُمَمِ مُحَدَّثُوۡنَ فَاِنۡ یَّکُ مِنۡھُمۡ فِیۡ اُمَّتِیۡ فَعُمَرُ" (پہلی امتوں میں محدث ہوتے تھے۔ اگر میری امت میں کوئی محدث ہے تو وہ عمرؓ ہے) اور اس طریقت میں آپ کے بہت سے لطائف ہیں جن کو اس کتاب میں شمار کرنا ممکن نہیں۔ تاہم آپ کے بارے میں آتا ہے کہ فرمایا "اَلۡعُزۡلَۃُ رَاحَۃٌ مِّنۡ خُلَطَاءِ السُّوۡءِ" (برے ہم نشینوں سے علیحدگی راحت ہے) —— اور عزلت دو طرح ہوتی ہے ایک لوگوں سے اعراض کرنا اور دوسری اُن سے

قطع تعلق کر لینا ——— لوگوں سے اعراض کرنے کا مطلب ہے خالی جگہ اختیار کرنا، ہم جنسوں کی صحبت سے کنارہ کش ہونا۔ اپنے بُرے اعمال کی خرابیوں کے دیکھنے سے آرام پانا۔ اپنے آپ کو لوگوں کے میل جول سے خلاصی طلب کرنا" اور لوگوں کو اپنے ہاتھ کی بُرائی سے محفوظ رکھنا۔ اور لوگوں سے قطع تعلق دل سے ہوتا ہے، اور دل کی صفت کا ظاہر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جب کوئی شخص دلی طور پر قطع تعلق کر لیتا ہے تو مخلوق کی کسی چیز سے اس کا کوئی واسطہ نہیں رہتا کہ مخلوقات کا خیال اُس کے دل پر غلبہ حاصل کر سکے۔ اور اس وقت یہ شخص اگرچہ مخلوق کے اندر ہی موجود ہوتا ہے لیکن درحقیقت مخلوق سے بالکل الگ ہوتا ہے۔ اور اُس کا ارادہ اُن سے بالکل منفرد ہوتا ہے اور یہ مقام بہت بلند اور دور ہے اور یہ صفت حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں بوجہ اتم موجود تھی کہ انہوں نے تنہائی کو راحت قرار دیا۔ حالانکہ آپ بظاہر مخلوق کے درمیان امارت وخلافت کی ذمہ داریاں سرانجام دیتے تھے اور یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اہل باطن اگرچہ بظاہر مخلوق کے ساتھ ملے جلے ہوتے ہیں لیکن اُن کا دل حق تعالےٰ سے وابستہ ہوتا ہے اور ہر حالت میں اُسی کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔ اور جتنا وقت اُن کا لوگوں کے ساتھ گزرتا ہے اُسے وہ حق تعالےٰ کی طرف سے اپنے لئے آزمائش سمجھتے ہیں اور مخلوق کی اس سے صحبت سے حق تعالےٰ کی طرف بھاگتے ہیں غرضیکہ دوستانِ حق کو یہ دنیا کبھی بھی مصفا معلوم نہیں ہوتی اور نہ اس کے حالات کبھی اُن کے ساتھ خوشگوار ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے۔ دَارٌ اُسِّسَتْ عَلَی الْبَلْوٰی بِلَا بَلْوٰی مُحَالٌ "(جس گھر کی بنیاد ہی مصیبت پر رکھی گئی ہو اُس کا مصیبت سے خالی ہونا محال ہے) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے تھے، اور حق تعالیٰ کی بارگاہ میں آپؓ کے تمام افعال یہاں تک مقبول تھے کہ اہل اسلام میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آمد کے موقع پر حضرت جبریل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا قَدِ اسْتَبْشَرَ یَا مُحَمَّدُ اَهْلُ السَّمَاءِ الْیَوْمَ بِاِسْلَامِ عُمَرَ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آج کے دن عمرؓ کے اسلام لانے پر آسمان والے خوشیوں کا اظہار کر رہے ہیں) ——— پس صوفیاء کی جماعت گدڑی پہننے اور دین کے معاملات میں شدت اختیار کرنے میں آپؓ ہی

کی پیروی کرتی ہے کیوں کہ آپؓ دین و دنیا کے تمام معاملات میں پوری امت کے امام ہیں۔

حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ

اور اُن میں سے ایک حیاء کا خزانہ، اہل صفا میں سب سے زیادہ عبادت گزار، رضائے الٰہی کی درگاہ سے تعلق رکھنے والے اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق سے مزین حضرت ابو عمر عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہیں کہ تمام معاملات میں اُن کی فضلیتیں آشکار اور فضائل ظاہر ہیں۔ حضرت عبداللہ بن رباح اور ابو قتادہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حرب الدار (حضرت عثمانؓ کے گھر کے چالیس روز کے محاصرہ کے بعد آپ کی شہادت واقعہ ہوئے) کے دن ہم آپؓ کے پاس موجود تھے، جب باغی آپ کے دروازہ تک پہنچ گئے تو آپ کے غلاموں نے ہتھیار سنجال لئے۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا "جو شخص ہتھیار نہ اٹھائے وہ اللہ کے راہ میں میری ملکیت سے آزاد ہے"۔ ---- اور ہم لوگ خوف کی حالت میں باہر نکلے تو حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما ہمیں راستہ میں ملے۔ ہم بھی اُن کے ساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس لوٹ آئے تاکہ جان سکیں کہ حضرت حسن بن علی کرم اللہ وجہ، کس مقصد کے پیش نظر آپ کے پاس آرہے ہیں۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اندر آپ کے پاس آئے تو آپ کو سلام کیا اور اس مصیبت پر اظہار افسوس و ہمدردی کرتے ہوئے عرض کیا کہ "اے امیر المومنینؓ! میں آپ کے فرمان کے بغیر مسلمانوں پر تلوار نہیں کھینچ سکتا اور آپ امام برحق ہیں مجھے حکم فرمائیے تاکہ اس قوم کی یہ مصیبت آپ سے دفع کردوں"۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آپ کو جواباً فرمایا۔ يَا ابْنَ اَخِىْ اِرْجِعْ وَاجْلِسْ فِىْ بَيْتِكَ حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ فَلَا حَاجَةَ لَنَا فِىْ اِهْرَاقِ الدِّمَاءِ" (اے میرے بھتیجے! لوٹ جاؤ اور اپنے گھر میں بیٹھ جاؤ حتیٰ کہ اللہ تعالےٰ اپنا حکم بھیج دے ہم خون بہانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے) اور یہ بات خُلّتُ کے درجہ میں مصیبت کے وارد ہونے کے وقت تسلیم و رضا کی علامت ہے، جیسا کہ نمرود لعین نے آگ بھڑکائی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس میں پھینکنے کے لئے منجنیق کے پلڑے میں رکھا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حاضر ہو کر پوچھا کہ "هَلْ لَكَ مِنْ حَاجَةٍ" (کیا آپ کو کوئی حاجت ہے؟)

تو آپ نے جواب دیا۔ اَمَّا اِلَیْکَ فَلَا "(تیری طرف تو میری کوئی حاجت نہیں) حضرت جبریئل نے عرض کیا تو پھر اللہ تعالےٰ سے امداد طلب کیجئے تو آپ نے فرمایا "حَسْبِیْ مِنْ سُؤَالِیْ عِلْمُہٗ بِحَالِیْ" (میرے حال کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ میرے سوال کو بذات خود جانتا ہے) یعنی اللہ بڑی اچھی طرح جانتا ہے کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے اور وہ میرے حال کو مجھ سے بھی بہتر طور پر جانتا ہے۔ اس لئے مجھے سوال کرنے کی ضرورت نہیں اُسے معلوم ہے کہ میری بہتری کس چیز میں ہے؟ پس اس جگہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بالکل وہی حالت ہے جو منجنیق میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تھی اور (سبائی) باغیوں کا اجتماع بمنزلہ آتش نمرود کے تھا اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ یہاں حضرت جبریئل علیہ السلام کے قائم مقام تھے (فرق یہ ہے کہ) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس مصیبت سے نجات پائی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس مصیبت میں شہید ہو گئے۔ اور ظاہر ہے کہ نجات کا تعلق بقا سے ہے اور ہلاکت کا تعلق فنا سے ہے اور بقا و فنا کی تفصیل ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں۔ پس گروہ صوفیاء مال وجان کو راہِ خدا میں قربان کر دینے اپنے تمام امور کو خدا تعالےٰ کے سپرد کر دینے اور عبادت میں اخلاص کے طریقے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی کی اقتداء کرتے ہیں۔ آپؓ درحقیقت شریعت اور حقیقت میں امام برحق ہیں اور طریقت کی ترتیب میں آپ کی محبت بالکل ظاہر ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ

اور انہی صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے حضرت مصطفےٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بھائی، بحرِ ابتلاٗ کے غریق آتشِ ولایت کے سوختہ اور تمام اولیاء و اصفیاء کے مقتداء ابوالحسن علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہٗ ہیں۔ طریقت میں آپ کی شان بڑی عظیم اور درجہ بہت بلند ہے۔ اصول حقیقت کی باریک و دقیق عبارتوں کے بیان کرنے میں آپ کو پورا حصہ حاصل تھا۔ یہاں تک کہ حضرت جنید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اِمَامُنَا فِی الْاُصُوْلِ وَالْبَلَاءِ عَلِیُّ الْمُرْتَضٰی۔ (اصول حقیقت اور مصیبتیں برداشت کرنے میں ہمارے شیخ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں) یعنی طریقت اور اُس کے معاملات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ ہمارے امام ہیں۔ اس لئے کہ اہل طریقت علم طریقت

کو اصلِ اصول کہتے ہیں اور مصیبتوں کو برداشت کرنا معاملات طریقت کہلاتا ہے۔ روایت میں آیا ہے کہ ایک شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ "اے امیر المومنین! مجھے کوئی وصیت کیجئے" آپؓ نے فرمایا لَا تَجْعَلَنَّ اَکْبَرَ شُغْلِكَ بِاَهْلِكَ وَوَلَدِكَ فَاِنْ يَكَ اَهْلُكَ وَوَلَدُكَ مِنْ اَوْلِيَاءِ اللّٰهِ تَعَالٰى فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ اَوْلِيَاءَهُ وَاِنْ كَانُوا اَعْدَاءَ اللّٰهِ فَمَا هَمُّكَ وَشُغْلُكَ لِاَعْدَاءِ اللّٰهِ۔ (تم اپنی بیوی بچوں میں مشغول ہونے کو سب سے بڑا کام نہ بنانا کیوں کہ اگر تیرے بیوی بچے اللہ تعالےٰ کے دوستوں میں سے ہیں تو اللہ تعالےٰ اپنے دوستوں کو کبھی ضائع نہیں کرتا لیکن اگر وہ اللہ تعالےٰ کے دشمنوں میں سے ہیں تو اللہ تعالےٰ کے دشمنوں میں مشغول ہونا اور اُن کا فکر کرنا تیرے لئے کسی طرح بھی درست نہیں) اور اس مسئلے کا تعلق غیر اللہ سے دل کے قطع تعلق کے ساتھ ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالےٰ اپنے بندوں کو جس طرح چاہتا ہے اُسی طرح رکھتا ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام کی صاجزادی (اپنی بیوی) کو ایک وقت مشکل ترین حالت میں چھوڑ کر خداوند تعالےٰ کے سپرد کر گئے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ھاجرہ سلام اللہ علیہا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اٹھایا اور بے آب و گیاہ زمین میں لے جا کر خدا تعالےٰ کے سپرد کر دیا تھا۔ اور اُن میں مصروف رہنے کو اپنا شغل نہ بنایا۔ اور اپنے دل کو مکمل طور پر حق تعالےٰ سے وابستہ کر لیا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ عزوجل پر تمام معاملات میں بھروسہ کر لینے کی وجہ سے اس بظاہر نامرادی کی حالت میں بھی انہوں نے دونوں جہانوں کی مرادیں حاصل کر لیں۔ اور یہ بات بالکل اُس قول کے مشابہ ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُس سائل کے جواب میں فرمایا تھا کہ جس نے آپؓ سے دریافت کیا تھا کہ پاکیزہ ترین کام کونسا ہے؟ تو آپؓ نے ارشاد فرمایا تھا "غِنَاءُ الْقَلْبِ بِاللّٰهِ" (دل کو اللہ سے لگا کر غیر سے بے پرواہ ہو جانا) جو دل اللہ تعالےٰ کی محبت سے مالا مال ہو دنیا کا نہ ہونا اُسکو محتاج نہیں کرتا اور دنیا کا ہونا اُس کیلئے خوشی کا باعث نہیں بنتا۔ اس معنی کی حقیقت سے فقر اور صفوت کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے جس کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے۔ پس اہل طریقت کو چاہیئے کہ وہ عبارات کی حقیقتوں اشارات کی باریکیوں، دنیا و آخرت سے بے پرواہی اور تقدیر الٰہی پر نظر رکھنے میں آپؓ ہی کی اقتداء کریں۔ اور آپؓ کے کلام کے لطائف شمار میں آنے سے کہیں زیادہ ہیں اور اس کتاب میں میرا طریق اختصار کا ہے۔ وباللہ التوفیق۔

آٹھواں باب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان میں سے صوفیائے کے ائمہ

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل خاندان کے لوگ وہ ہیں جو ازلی ودائمی تقدس وپاکیزگی کے ساتھ مخصوص ہیں ان میں سے ہر ایک کو طریقت کے معاملات میں پوری دسترس حاصل تھی۔ اور اُن میں سے عام وخاص سب ہی اہل طریقت کے پیشوا ہوئے ہیں۔ میں انشاء اللہ اُن میں سے ایک گروہ کے حالات بیان کروں گا۔

سیدنا حضرت حسن رضی اللہ عنہ

اُن میں سے ایک جگر پارۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دل کے پھول اور حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی آنکھوں کی ٹھنڈک ابو محمد حسن بن علی کرم اللہ وجہہ ہیں جن کو طریقت میں نظرِ کامل اور تصوف کی باریکیوں کو بیان کرنے میں پورا حصہ حاصل تھا یہاں تک کہ آپؓ نے اپنی وصیت میں فرمایا تھا۔ عَلَیْکُم بِحِفْظِ السَّرَائِرِ فَاِنَّ اللّٰہَ مُطَّلِعٌ عَلَی الضَّمَائِر (باطن کے اسرار کی حفاظت کرو کیوں کہ اللہ تعالٰے دلوں کے بھیدوں کو جاننے والا ہے) حقیقت اس کی یہ ہے کہ بندہ کو باطن کے اسرار کی حفاظت کا حکم بھی اسی طرح دیا گیا ہے جس طرح کہ ظاہری احوال کی حفاظت کا۔ پس اسرار باطن کی حفاظت یہ ہے کہ اغیار (ما سوی اللہ) کی طرف توجہ نہ کرے اور احوال ظاہر کی حفاظت یہ ہے کہ اپنی باگ اللہ تعالٰے کی مخالفت سے موڑ لے۔ چنانچہ روایت میں آتا ہے کہ جب گروہِ قدریہ نے غلبہ حاصل کیا اور معتزلہ کا مذہب دنیا میں پھیل گیا تو حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے حضرت حسن بن علی کرم اللہ وجہہ کو ایک خط لکھا اور اس میں کہا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیک یا ابن رسول اللہ و قرۃ عینہ و رحمۃ اللہ و برکاتہ

اما بعد! فانکم معاشر بنی ہاشم کالفلک الجاریۃ فی بحر لجی ومصابیح الدجی واعلام الھدی والائمۃ القادۃ الذین من تبعھم نجی کسفینۃ نوح المشحونۃ التی یؤل الیھا المؤمنون و ینجو فیھا المتمسکون فما قولک یا ابن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عند حیرتنا فی القدر واختلافنا فی الاستطاعۃ لتعلمنا بما تاکد علیہ رایک فانکم ذریۃ بعضھا من بعض بعلم اللہ علمتم وھو الشاھد علیکم وانتم شھداء اللہ علی الناس ۔ والسلام!

ترجمہ! اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے اور آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک آپ پر اللہ کی سلامتی اُس کی رحمت اور برکت ہو۔ اس کے بعد اے گروہ بنی ہاشم! آپ لوگ بحر پرامواج میں جاری کشتی کی طرح، روشنی کے چراغ، ہدایت کے جھنڈے اور وہ امام و رہنما ہیں کہ جو بھی اُن کی اتباع کرے وہ نجات پا جائے اور آپ لوگ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کی طرح ہیں کہ اہل ایمان اُس کی طرح رجوع کرتے اور اس میں بیٹھنے والے نجات پاتے ہیں۔ پس اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند ارجمند! تقدیر کے بارے میں ہماری حیرت اور استطاعت کے بارے میں ہمارے اختلاف میں آپ کی کیا رائے ہے؟ تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ آپ کی رائے کس بات پر قائم ہے کیوں کہ آپ نسل در نسل انبیاء کرام کی اولاد ہیں، اللہ تعالیٰ کے علم سے آپ کو تعلیم دی گئی ہے وہ اللہ آپ کا محافظ و نگہبان ہے اور آپ لوگ اللہ کی طرف سے لوگوں پر گواہ ہیں۔ والسلام

جب یہ خط حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پہنچا تو آپ نے یہ جواب لکھا۔"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اما بعد: فقد انتھی الی کتابک عند حیرتک و حیرۃ من زعمت من امتنا

وَالَّذِیْ طلبہ رَأْیِ مَنْ لَمْ یُؤْمِنْ بِالْقَدَرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تعالےٰ فَقَدْ
کَفَرَ وَمَنْ حَمَلَ الْمَعَاصِیْ عَلَی اللّٰہِ فَقَدْ فَجَرَ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُطَاعُ بِاِکْرَاہٍ وَلَا
یُعْصٰی بِغَلَبَۃٍ وَلَا یُمْہِلُ الْعِبَادُ الْعِبَادَ فِیْ مُلْکِہٖ وَلٰکِنْ الْمَالِکُ لِمَا مَلَّکَہُمْ وَالْقَادِرُ
عَلٰی مَا عَلَیْہِ تدرہم فَاِنْ ایتمروا بِالطَّاعَۃِ لَمْ یَکُنْ لَہُمْ صَادًّا وَلَا لَہُمْ عَنْہَا مَانِعًا
وَاِنْ اَتَوْا بِالْمَعْصِیَۃِ لمشاء اَنْ یَمُنَّ عَلَیْہِمْ فَیَحُوْلُ بَیْنَہُمْ وَبَیْنَ مَا فَعَلُوْا وَ
اِنْ لَمْ یَفْعَلْ فَلَیْسَ حَمَلَہُمْ عَلَیْہَا اِجْبَارًا وَلَا اَلْزَمَہُمْ اِکْرَاہًا اِیَّاہَا
حتیاجہ عَلَیْہِمْ اَنْ عَرَّفَہُمْ وَمَکَّنَہُمْ وَجَعَلَ لَہُمُ السَّبِیْلَ اِلٰی اَخْذِ مَا دَعَاہُمْ
اِلَیْہِ وَتَرْکِ مَا نَہَاہُمْ عَنْہُ وَلِلّٰہِ الْحُجَّۃُ الْبَالِغَۃُ ۔ والسلام

ترجمہ (شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے) اما بعد آپ کی اور اُن لوگوں کی کہ جن کو آپ ہماری امت میں سمجھتے ہیں، حیرانی کے بارے میں آپ کا خط مجھے پہنچ گیا۔ اس مسئلہ کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ جو شخص اس بات پر ایمان نہیں رکھتا کہ ہر نیک اور بُرے کام کی تقدیر اللہ تعالےٰ کی جانب سے ہے وہ کافر ہے اور جس نے گناہوں کو اللہ تعالےٰ کے ذمہ لگایا وہ فاجر و گمراہ ہے۔ نہ تو اللہ تعالےٰ کی اطاعت جبراً کی جاتی ہے اور نہ ہی اُس کی نافرمانی کسی مجبوری کے تحت کی جاتی ہے اور نہ ہی وہ اپنی مملکت میں اپنے بندوں کو مُہلت دیتا ہے۔ تاہم وہ اُن تمام چیزوں کا مالک ہے جن کا اس نے اپنے بندوں کو مالک بنایا ہے اور اُن سب چیزوں پر اُس کی قدرت ہے جن پر اُس نے اپنے بندے کو قادر بنایا ہے لہٰذا اگر وہ اطاعت کا ارادہ کریں تو وہ اُن کو روکتا یا فرمانبرداری کرنے سے ہٹاتا نہیں اور اگر وہ نافرمانی کا ارتکاب کریں اور پھر وہ اُن پر احسان فرمانا چاہے تو اُن کے اور معصیت کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو اُس نے اُن کو معصیت پر نہ تو مجبور کیا ہے اور نہ ہی نافرمانی کا ارتکاب اُن پر جبراً لازم کیا ہے۔ اُس نے تو اُن پر یہ سب کچھ بتا کر اپنی حجت تمام کر دی ہے کہ اُنہیں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قوت بخش دی گئی ہے اور اُن کے لئے اس امر کے اختیار کرنے کی جس کی اُس نے انہیں دعوت دی ہے اور اُس کام کے ترک کرنے کی جس سے اُس نے انہیں منع کیا ہے آسانی پیدا کر دی تھی۔ اور

اللہ تعالٰی کی حجت ہی غالب ہے۔ والسلام"

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے جو اپنی اُن لوگوں کی جنہیں آپ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی امت میں سمجھتے ہیں تقدیر کے مسئلہ میں حیرت و استعجاب کے بارے میں ہماری رائے دریافت کی ہے تو اس مسئلہ میں ہماری رائے تو یہ ہے کہ جو شخص خیر اور شر کی تقدیر کو اللہ تعالٰی کی طرف سے تسلیم نہیں کرتا وہ تو کافر ہے اور جو گناہ کو اُس کے ذمہ لگاتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ تعالٰی نے ہمیں نافرمانیوں پر مجبور کیا ہے تو وہ فاسق و فاجر ہے۔ یعنی تقدیر کا انکار قدریہ کا مذہب ہے اور معاصی کو اللہ کے ذمے لگانا جبریہ کا مذہب ہے حالانکہ بندہ اللہ کی دی ہوئی طاقت کے مطابق اپنے اعمال میں خود مختار ہے اور ہمارا اہل سنت وجماعت کا مذہب قدریہ اور جبریہ کے درمیان ہے ———— اور اس خط کو نقل کرنے سے میرا (حضرت علی ہجویری) مقصود صرف اسی قدر تھا۔ لیکن پورا خط اس لئے درج کر دیا کہ وہ فصاحت و بلاغت کا ایک شاہکار ہے اور یہ سب باتیں اس لئے میں نے بیان کر دی ہیں تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ حقائق معرفت اور اصول طریقت کے کس بلند درجے پر فائز تھے کہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ جیسا بلند پایہ عالم بھی اس طرح کے دقیق مسائل اور اشارات میں آپؓ کی طرف رجوع کرتا تھا۔

اور ایک حکایت میں میں نے دیکھا ہے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کوفہ میں اپنے مکان کی دہلیز پر تشریف فرما تھے کہ ایک دیہاتی آپؓ کے پاس آیا اور آپؓ کو اور آپ کے ماں باپ کو گالیاں بکنے لگا۔ آپؓ اٹھے اور فرمایا اے اعرابی! تجھے بھوک لگی ہے یا پیاس یا کوئی اور مصیبت تجھے لاحق ہے مجھے بتا تاکہ میں تیری امداد کروں حالانکہ وہ دیہاتی مسلسل آپ کو اور آپ کے والدین کو ایسا ویسا کہے جا رہا تھا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اپنے غلام کو حکم دیا کہ درہموں کی ایک تھیلی لا کر اس کو دے دو۔ (غلام نے حکم کی تعمیل کی) تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے اعرابی! معاف کرنا! میرے گھر میں اس کے علاوہ کچھ موجود نہ تھا ورنہ میں تمہیں دینے سے دریغ نہ کرتا۔ جب اُس دیہاتی نے آپؓ کی یہ بات سنی بے اختیار پکار اُٹھا۔ اَشْھَدُ اَنَّکَ اِبْنُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؓ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کے صاحبزادے ہیں) اور میں تو آپ کے حلم اور بُردباری کا تجربہ کرنے آیا تھا ——
اور حقیقت شناس اولیاء و مشائخ کی یہی صفت ہوتی ہے کہ لوگوں کی مدح اور مذمت ان کے نزدیک برابر ہوتی ہے اور وہ کسی کے بُرا کہنے سے خفا نہیں ہوتے ——

سیّدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ

اور انہی آئمہ خاندان نبوت میں سے شمع آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم، معاملاتِ دنیا سے بے نیاز اور اپنے دور کے سردار حضرت ابو عبداللہ الحسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما بھی ہیں۔ آپ بلند پایہ اولیاء میں سے ایک، اہل مصیبت کے قبلہ اور کربلا کے شہید ہیں۔ اہل طریقت آپ کے حال و کردار کی درستی پر متفق ہیں کہ جب تک حق غالب و ظاہر رہا آپ اُس کے تابع رہے لیکن جب حق مفقود ہونے لگا تو آپ نے تلوار کھینچ لی اور جب تک آپ نے اپنی عزیز جان راہِ خدا میں قربان نہ کر دی آرام و چین سے نہ بیٹھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی علامات آپ میں موجود تھیں جن کی وجہ سے آپ ممتاز تھے چنانچہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن میں حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپ نے حضرت حسینؓ کو اپنی پشت مبارک پر بٹھا رکھا ہے اور ایک رسی اپنے دھن مبارک میں ڈال کر اُس کے سرے حضرت حسینؓ کے ہاتھ میں دیئے ہوئے ہیں اور وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو چلا رہے ہیں اور خود حضور علیہ السلام گھٹنوں کے بل چل رہے ہیں۔ جب میں نے یہ کیفیت دیکھی تو میں نے کہا نِعْمَ الْجَمَلُ جَمَلُكَ يَا أَبَا عَبْدِ اللّٰهِ (اے حسینؓ آپ کا اونٹ بہت ہی اچھا ہے) یہ سُنکر پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا۔ نِعْمَ الرَّاكِبُ هُوَ يَا عُمَرُ (اے عمرؓ! یہ سوار بھی تو بہت اچھا ہے)

طریقت میں آپ کے بہت سے لطائف اور بے شمار رموز اور پُر حکمت اقوال ہیں اور آپ کے بارے میں یہی روایت بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "أَشْفَقُ الْإِخْوَانِ عَلَيْكَ دِينُكَ (بھائیوں سے بھی زیادہ تجھ پر شفقت کرنے والا تیرا دین ہے) کیوں کہ دین کی متابعت میں ہی انسان کی نجات اور دین کی مخالفت میں اس کی موت و ہلاکت ہے پس عقلمند

آدمی وہ ہے جو اپنے مشفقوں کے فرمان کے مطابق عمل کرے اور اپنے اوپر اُن کی شفقت کو قبول کرتے ہوئے ان کی مخالفت سے اجتناب کرے۔ اور بھائی وہ ہے جو دوسرے بھائی کو نصیحت کرے اور اپنی شفقت کا دروازہ اُس پر بند نہ کرے اور میں نے حکایات میں پڑھا ہے کہ ایک دن ایک شخص آپؓ کے پاس آیا اور کہنے لگا "اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے! میں ایک درویش آدمی ہوں اور صاحب اولاد ہوں مجھے آج کی رات کے کھانے کے لئے اپنی طرف سے کچھ عنایت فرمائیے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اُسے فرمایا! بیٹھ جاؤ! ہمارا رزق راستے میں ہے ابھی آجائے گا۔ ابھی زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ لوگ آپؓ کے پاس حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے پانچ تھیلیاں لے کر آئے۔ ہر تھیلی میں ایک ہزار دینار تھے لوگوں نے عرض کی کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ آپؓ سے معذرت چاہتے ہوئے کہتے تھے کہ یہ تھوڑی سی رقم خرچ کیجئے پھر اس کے بعد اس سے بہتر امداد کی جائے گی۔۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اُس درویش کی طرف اشارہ کیا اور وہ پانچ تھیلیاں اُسے عطا فرما دیں اور اُس سے معذرت کی کہ تھوڑی دیر ہوگئی اور یہ بے قدر سا عطیہ ہے جو تجھے ملا اگر مجھے علم ہوتا کہ یہ رقم اتنی تھوڑی ہے تو میں تمہیں انتظار کے لئے نہ کہتا۔ ہمیں معذور سمجھنا کہ ہم اہل بلاء ہیں ہم دنیا کی تمام راحتوں سے دست بردار ہو چکے ہیں اور اپنی خواہشات کو کم کرکے دوسروں کی ضرورتوں کے لئے زندہ ہیں۔ اور آپؓ کے مناقب اس قدر مشہور ہیں کہ امت کے کسی فرد پر پوشیدہ نہیں۔ رضوان اللہ علیہ۔

حضرت زین العابدین رحمۃ اللہ

اور انہی میں سے نبوت کے وارث، امت کے چراغ، سید مظلوم، امام مرحوم، عبادت کرنے والوں کی زینت اور اوتاد کی شمع حضرت ابوالحسن علی زین العابدین بن حسین بن علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ ہیں۔ آپ اپنے دور میں سب سے زیادہ کریم اور عبادت گزار تھے اور معرفت کے حقائق کو کھولنے اور طریقت کے دقائق کو بیان کرنے میں مشہور تھے، ایک دفعہ لوگوں نے آپ سے استفسار کیا کہ دنیا و آخرت میں سب سے زیادہ سعادت مند کون ہے؟ تو

ارشاد فرمایا۔ "مَنْ اِذَا رَضِیَ لَمْ یُحْمِلْہُ رِضَاہُ عَلَی الْبَاطِلِ وَاِذَا سَخَطَ لَمْ یُخْرِجْہُ سَخَطُہُ مِنَ الْحَقِّ" (وہ شخص کہ جب خوش ہو تو اُس کی خوشی اُس کو باطل پر آمادہ نہ کرے اور جب ناراض ہو تو اُس کا غصہ اُس کو حق سے باہر نہ نکال دے) مستقیم الحال لوگوں کے کاملی اوصاف میں سے ہے اس لئے کہ باطل پر راضی ہونا باطل ہے اور غصہ کی حالت میں حق سے دست بردار ہو جانا بھی باطل ہے۔ اور مومن باطل کا ارتکاب کرنے والا نہیں ہوتا — اور روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ جب یزیدیوں نے جب حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما کو مع آپ کے عزیز و اقارب کے کربلا کے میدان میں شہید کر دیا اور حضرت زین العابدین کے علاوہ کوئی باقی نہ رہا جو عورتوں کی نگرانی کرتا۔ اور آپ بیمار بھی تھے حضرت حسین رضی اللہ عنہ آپ کو علی اصغر کہتے تھے۔ جب ان کو برہنہ بیٹھ (بے کجاوہ) اونٹوں پر سوار کر کے دمشق میں یزید بن معاویہ کے سامنے لایا گیا تو ایک شخص نے آپ سے کہا۔ کَیْفَ اَصْبَحْتُمْ یَا عَلِیُّ وَیَا اَھْلَ بَیْتِ الرَّحْمَۃِ (اے علی اور اے اہل بیت رحمت! آپ نے صبح کیسے کی) تو آپ نے جواب دیا "اَصْبَحْنَا مِنْ قَوْمِنَا بِمَنْزِلَۃِ قَوْمِ مُوْسٰی مِنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَاءَ ھُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَاءَ ھُمْ فَلَا نَدْرِیْ صَبَاحَنَا مِنْ مَسَاءِنَا وَھٰذَا مِنْ حَقِیْقَۃِ بَلَاءِنَا" (ہم نے اپنی قوم سے بالکل ویسی ہی صبح کی جیسی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے آلِ فرعون سے کی تھی کہ وہ آلِ فرعون اُن کے بیٹوں کو ذبح کرتے اور عورتوں کو زندہ چھوڑتے تھے پس ہم نہ صبح کو پہچانتے ہیں نہ شام کو۔ بس یہی ہماری مصیبت کی حقیقت ہے) اور ہم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر اُس کا شکر ادا کرتے ہیں اور اس کی آزمائش پر صبر کا مظاہرہ کرتے ہیں

اور حکایات میں آتا ہے کہ ہشام بن عبدالملک بن مروان ایک سال حج کے لئے آیا خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے حجرِ اسود کا بوسہ لینا چاہا تو لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے کوئی راستہ نہ ملا تو منبر پر چڑھ کر خطبہ دینے لگا اسی دوران حضرت زین العابدین علی بن الحسین بن علی رضی اللہ عنہما مسجد حرام میں تشریف لائے چاند سے چہرے، روشن رخساروں اور خوشبودار لباس کے ساتھ آپ نے بیت اللہ کا طواف شروع کیا۔ آپ جب حجرِ اسود کے قریب پہنچے تو آپ کی تعظیم کے لئے لوگوں نے حجرِ اسود کے آس پاس کی جگہ خالی کر دی، ہشام نے کہا یہ نوجوان

کون ہے؟ میں اس کو نہیں پہچانتا۔ اس سے مقصد اس کا یہ تھا کہ اہل شام اس کو نہ پہچانیں اور نہ ہی اس کی خلافت کی خواہش کریں۔ فرزدق شاعر وہاں کھڑا تھا اس نے کہا "میں اس کو خوب پہچانتا ہوں لوگوں نے پوچھا اے ابا فراس! ہمیں بتاؤ وہ کون ہے؟ کہ ہم نے اُسے بڑا بارعب جوان دیکھا ہے، فرزدق نے کہا" اچھا خوب کان لگا کر سنو میں اس کی صفت اور اُس کا نسب بیان کرتا ہوں۔ پس فرزدق نے یہ شعر پڑھے۔

قصیدہ

۱۔ ھٰذَا الَّذِی تَعرِفُ البَطحاءُ وَطاَتَہٗ   وَالبَیتُ یَعرِفُہٗ وَالحِلُّ وَالحَرَمُ

یہ وہ ہستی ہے جس کے قدموں کو وادی بطحا پہچانتی ہے اور بیت اللہ وحل وحرم بھی اس سے خوب واقف ہیں۔

۲۔ ھٰذا ابن فاطمۃ الزھراء ان کنت جاھلہ   وَ بِجَدِّہٖ انبیاء اللّٰہ قَد خُتِمُوا

یہ فاطمۃ الزہراؑ کا صاجزادہ ہے اگر تو اس سے ناواقف ہے اور اس کے نانا پر انبیاء کا سلسلہ ختم کیا گیا ہے۔

۳۔ ھٰذا ابنِ خیرِ عبادِ اللّٰہِ کُلِّھِمِ   ھٰذا التَّقِیُّ النَّقِیُّ الطّاھِرُ والعَلَمُ

یہ اللہ کے تمام بندوں میں سے بہتر بندے کی اولاد ہے۔ یہ متقی۔ پاک باطن اور پاکیزہ بدن ہے۔

۴۔ یَنْشَقُّ نُورُ الدُّجیٰ عَن نورِ طلعتِہٖ   کالشمسِ ینجابُ عَن اشراقِھا الظُّلَمِ

اسکی پیشانی کی چمک سے تاریکی اس طرح ختم ہو جاتی ہے جس طرح طلوع آفتاب سے ظلمتیں چھٹ جاتی ہیں۔

۵۔ یُغضِی حَیاءً وَیُغضیٰ مِن مَھابتِہٖ   فَمَا یُکَلَّمُ اِلَّا حِینَ یَبتَسِمُ

وہ حیاء کے سبب نگاہیں جھکائے رہتا ہے اور لوگ اسکے رعب سے نگاہیں نیچی رکھتے ہیں اور اسوقت بولتے ہیں جب وہ مسکرا رہا ہو۔

۶۔ یَنمِی اِلیٰ ذُروَۃِ العِزِّ الَّتِی قَصُرَت   عَن نَیلِھا عَرَبُ الاسلامِ والعَجَمُ

وہ عزت کی اس بلندی پر پہنچا ہوا ہے جہاں تک عرب وعجم کے تمام مسلمان پہنچنے سے قاصر ہیں۔

۷۔ اِذَا رَاَتہُ قُرَیشٌ قالَ قائِلُھا   اِلیٰ مَکارِمِ ھٰذا یَنتَھِی الکَرَمُ

قبیلہ قریش اسے دیکھ کر اعتراف کرتا ہے کہ اس پر جود وکرم کی انتہاء ہو چکی ہے۔

۸۔ مَنْ جَدُّہٗ وان فضل الانبیاء لہ وَفَضْلُ امتہٖ دانت لَہُ الامَمُ

اس کے نانا کا مقام تمام انبیاء سے افضل ہے اور اُن کی امت کو تمام اُمتوں پر فضیلت حاصل ہے۔

۹۔ یکاد لمسکۂ عرفان راحتہٖ رُکن الحطیم اِذا ماجاء لیستلِمُ

قریب ہے کہ حطیم خود بڑھ کر اس کے ہاتھوں کی خوشبو کو چوم لے جب وہ اسے چومنے کے لئے بڑھتا ہے

۱۰۔ فِی کفِہٖ خیزران ریحھا عبقٌ مِنْ کفّ اروع فی ارنینہٖ شممُ

اس کے ہاتھ میں بڑی خوشگوار خوشبو والی بید مشک کی چھڑی ہے

۱۱۔ سَھلُ الخلیقۃِ لَا یخشیٰ بوادرہ یزینہ اثنان حسن الخلق والشّیَمُ

وہ ایسا نرم مزاج ہے کہ اُس کا غصہ بے خطر ہے حُسن سیرت اور حسن صورت اس کی زینت ہیں۔

۱۲۔ مُشتقۃٌ عن رسول اللہِ بنعتہٖ طابت عناصِرُہٗ والخِیمُ والشِیَمُ

اسکی صفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات سے مشتق ہیں اور اُس کے عناصر انتہائی عمدہ اور پاکیزہ ہیں

۱۳۔ فَلَیسَ قولکَ مَنْ ھٰذا؟ بضائرہٖ العربُ تعرِفُ مَنْ انکرتَ والعجمُ

تیرا اُس کو پہچاننے سے انکار کرتے ہوئے "یہ کون ہے؟" کہنا اُسکی عزت میں کمی کا سبب نہیں کہ اس کو تو پورا عرب و عجم پہچانتا ہے

۱۴۔ کِلتا یدیہِ غیاثٌ عَمّ نفعھُما تَسْتَوکفانِ وَلَا یعروھُمَا العَدَمُ

اُس کے دونوں ہاتھ سخاوت میں گویا موسلا دھار بارش ہیں اور مال و دولت کا عدم اُن کے ہاتھ خالی نہیں کرتا۔

۱۵۔ عَمّ البریۃ بالاحسان فالقشعَتْ عَنِ الغیابۃِ والاملاقِ والظلم

مخلوق پر اُن کا احسان عام ہے پس اُن کی وجہ سے مخلوق میں غربت اور گمراہی رفع ہو گئی ہے۔

۱۶۔ لَا یستطیع جوادٌ بعد غایتھم وَلَا یُدانیھم قومٌ وَّاِن کَرُمُوا

کوئی جوانمرد سخاوت میں اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور کوئی قوم اُن کے مقام تک نہیں پہنچ سکتیں۔

۱۷۔ ھُمُ الغیوثُ اِذا مَا اَزمۃٌ اَزمَتْ وَالاُسدُ اُسدُ الشریٰ والباس محتدِمُ

جب قحط سالی ہو تو اس کے ہاتھ موسلا دھار بارش ہیں اور جب لوگ جنگ میں مبتلا ہوں تو وہ ایک شیر کی طرح ہیں۔

۱۸۔ مِن معشرٍ حُبُّھم دینٌ وبُغضُھم کُفرٌ وَقُربُھم منجاً و مُعتصمُ

وہ اُس گروہ کے فرد ہیں جن کی محبت دین، بغض کفر اور اُن کا قرب باعثِ تحفظ و نجات ہے۔

۱۹۔ اِنْ عُدَّ اَھْلُ التُّقٰی کَانُوْا اَئِمَّتَھُمْ — اَوْ قِیْلَ مَنْ خَیْرُ اَھْلِ الْاَرْضِ قِیْلَ ھُمْ

اگر دنیا کے تمام اہلِ تقویٰ کو شمار کیا جائے تو یہ اُن کے مقتدا ہیں اور اگر پوچھا جائے کہ زمین والوں میں بہتر کون ہے تو انہی کا نام لیا جائے گا۔

۲۰۔ سِیَّانِ ذٰلِكَ اِنْ اَثْرَوْا وَاِنْ عَدِمُوْا — لَا یَنْقُصُ الْعُسْرُ بَسْطًا مِنْ اَکُفِّھِمْ

مال دار ہونا یا نہ ہونا دونوں برابر ہے تنگی اِن کے ہاتھوں کی کشادگی کو کم نہیں کرتی

۲۱۔ اَللّٰہُ فَضَّلَہٗ قِدْمًا وَشَرَّفَہٗ — جَرٰی بِذَالِكَ لَہٗ فِی اللَّوْحِ وَالْقَلَمُ

اِن کو فضیلت اور بزرگی اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل وکرم سے دی ہے اور لوح وقلم میں اس کے احکام جاری کر دیئے ہیں

۲۲۔ مُقَدَّمٌ بَعْدَ ذِکْرِ اللّٰہِ ذِکْرُھُمْ — فِیْ کُلِّ بَدْءٍ وَمَخْتُوْمٌ بِہِ الْکَلِمُ

ہر چیز کی ابتداء وانتہا میں اللہ کے ذکر کے بعد اِن کا ذکر ہی مقدم ہے

۲۳۔ مَنْ یَعْرِفُ اللّٰہَ یَعْرِفُ اَوَّلِیَّتَہٗ — وَالدِّیْنُ مِنْ بَیْتِ ھٰذَا نَالَہُ الْاُمَمُ

جو شخص اللہ کو پہچانتا ہے وہ اِن کی اولیت کو بھی پہچانتا ہے کہ پوری امت کو دین انہی کے گھرانے سے ملا ہے

۲۴۔ اَیُّ الْقَبَائِلِ لَیْسَتْ فِیْ رِقَابِھِمْ
لِاَوَّلِیَّۃِ ھٰذَا اَوْ لَہٗ نِعَمُ

عرب کا کونسا قبیلہ ہے جس کی گردن اس کے یا اس کے بزرگوں کی دی ہوئی نعمتوں سے جھک نہ گئی ہو۔

اسی طرح فرزدق نے حضرت زین العابدین رحمہ اللہ کی تعریف میں چند اشعار پڑھے اور آپ کی اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خاندان والوں کی خوب تعریف کی۔ یہ سن کر ہشام اس پر سخت ناراض ہوا اور مکہ و مدینہ کے درمیان ایک مقام عسفان میں اس کو قید کر دینے کا حکم دیا۔ یہ خبر جب لوگوں نے حضرت زین العابدین رحمہ اللہ کے سامنے عرض کی تو آپ نے بارہ ہزار درھم اس کے پاس لے جانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اسے کہہ دینا کہ اے ابافراس ہمیں معذور سمجھنا کہ ہم اہلِ بلا ہیں۔ اس سے زیادہ رقم تمہارے پاس نہیں بھیج سکتے فرزدق نے وہ رقم واپس کر دی اور کہلا بھیجا کہ اے پیغمبر خدا کے بیٹے! میں نے حصولِ دولت کے لئے بادشاہوں اور امراء کے لئے بڑے اشعار کہے ہیں اور اُن کی تعریف میں جھوٹ اور مبالغہ سے بھی کام لیا ہے لیکن یہ اشعار میں نے محض اللہ تعالےٰ اور فرزندان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اُن جھوٹی مدائح کے کفارہ کے طور پر کہے ہیں ——

جب یہ پیغام حضرت زین العابدین کی خدمت میں پہنچا تو آپ نے فرمایا "یہ درہم واپس

لے جاؤ۔ اور اس سے کہو کہ اے ابو فراس! اگر تمہیں ہم سے محبت ہے تو پھر اس بات کو پسند نہ کرو۔ کہ ہم جو چیز دے چکے اور اپنی ملکیت سے نکال چکے ہیں اسے واپس لے لیں۔ حضرت کا یہ پیغام سُن کر فرزدق نے وہ رقم قبول کر لی ——— آپ کے فضائل و مناقب اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ انہیں جمع کیا جا سکے۔

سیدنا حضرت محمد باقر رحمہ اللہ تعالےٰ

اور انہی ائمہ اہل بیت میں سے اہل معاملہ کی حجت، اربابِ شاہد کی بُرھان، اولادِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے امام اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نسل میں برگزیدہ حضرت ابو جعفر محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابو طالب الباقر کرم اللہ وجہہ بھی ہیں۔

یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ کی کنیت ابو عبداللہ اور لقب باقر تھا۔ آپ کتاب الٰہی کے لطیف اشارات اور علومِ دینیہ کے رموز بیان کرنے میں فاضل مقام کے حامل تھے۔ آپ کی کرامات مشہور، دلائل معروف اور براھین روشن ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ کسی خلیفہ نے آپ کو قتل کرنے کے ارادہ سے آپ کے پاس آدمی بھیج کر آپ کو بلوایا۔ جب آپ تشریف لائے تو خلیفہ نے فوراً آپ سے معافی مانگ لی اور عزت و احترام سے ہدیہ پیش کر کے آپ کو رخصت کر دیا۔ درباریوں نے سوال کیا اے بادشاہ! آپ تو اُن کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن اُن کے ساتھ یہ اچھا سلوک دیکھ کر تو ہم حیران رہ گئے ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے۔ بادشاہ نے جواب دیا۔ جب آپ میرے سامنے تشریف لائے تو میں نے دیکھا کہ آپ کے دائیں بائیں دونوں طرف دو شیر موجود ہیں اور مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ اے بادشاہ، اگر تم نے حضرت کے قتل کا قصد کیا تو ہم تمہیں ہلاک کر دیں گے ——— اور آپ ہی کے بارے میں روایت ہے کہ آپ نے حق تعالےٰ کے ارشاد۔ فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰہِ" (پس جو شخص شیطان کا کفر کرے اور اللہ پر ایمان لائے) کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: "کُلُّ مَنْ شَغَلَکَ عَنْ مطالعۃ الحق فَھُوَ طاغوتُکَ (جو چیز بھی تجھے مطالعہ حق سے باز رکھے وہ تیرا شیطان ہے) اب تم غور کرو کہ تم اللہ تعالےٰ سے کس چیز کی وجہ سے لاتعلق اور حجاب میں ہو کہ اگر اُس

چیز اور حجاب کو ترک کر دو تو مکاشفہ الٰہی تک تمہیں رسائی حاصل ہو جائے اور تم حق سے ممنوع اور محجوب نہ رہو اور جو شخص مشاہدہ حق سے روک دیا گیا۔ اسے قربِ حق کا دعویٰ نہیں کرنا چاہیئے!

آپ کے خصوصی عقیدت مندوں میں سے ایک شخص بیان کرتے ہیں کہ جب رات کا ایک حصہ گزر جاتا اور آپ اورادو وظائف سے فارغ ہو جاتے تو اپنی مناجات میں اونچی آواز سے یوں عرض کرتے۔ اے میرے معبود! اے میرے آقا! رات آگئی اور بادشاہوں کے تصرف کی حکومت ختم ہو گئی۔ اور آسمان پر ستارے نمودار ہو گئے اور سب لوگ نیند کی حالت میں معدوم ہو گئے اور لوگوں کی زبانیں خاموش ہو گئیں۔ اور اُن کی آنکھیں بند ہو گئیں اور لوگ مخلوق کے دروازوں سے بھاگ گئے اور خاندان بنوامیہ آرام پا گئے اور اپنی خواہشات کو چھپالیا اور اپنے دروازے بند کر کے اُن پر محافظ مقرر کر دئے اور جو لوگ ان سے اپنی ضرورتیں وابستہ کئے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی حاجتیں چھوڑ دیں لیکن بار خدایا! تو زندہ ہے اور ہمیشہ رہنے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اُونگھ اور نیند تیری ذات پر طاری نہیں ہو سکتی۔ جو شخص تجھے ان صفات کے ساتھ نہ پہچانے وہ کسی نعمت کا مستحق نہیں۔ اے وہ ذات کہ کسی کام کے کرنے سے تجھے کوئی طاقت نہیں روک سکتی اور ہر پکارنے والے پر تیری رحمت کے دروازے کھلے ہیں اور جو شخص تیری حمد و ثنا کرتا ہے اس پر تیرے خزانے فدا ہیں تُو وہ داتا ہے کہ کسی سائل کو خالی لوٹا دینا تجھے زیبا نہیں! مومنوں میں سے جو شخص تیری بارگاہ میں دعا کرتا ہے زمین و آسمان کی مخلوق میں سے کوئی بھی اُسے سوال کرنے سے روکنے والا نہیں۔ بارِ خدایا! ہم دنیا کی کسی چیز سے آرام کیسے پا سکتے ہیں جب کہ موت، قبر اور حساب کو ہم یاد رکھتے ہیں۔ پس میں تجھ ہی سے مانگتا ہوں کیوں کہ میں تجھے واحد جانتا ہوں اور تجھ ہی سے طلب کرتا ہوں کیوں کہ صرف تجھے ہی پکارتا ہوں کہ موت کے وقت وہ راحت عطا کر جس میں عذاب نہ ہوں اور حساب کے وقت وہ خوشی عطا فرما جس میں تکلیف نہ ہو۔ (راوی بیان کرتا ہے کہ) آپ یہ سب باتیں کہتے ہوئے روتے جاتے تھے یہاں تک کہ ایک رات میں نے آپ سے عرض کی کہ اے میرے اور میرے آباؤ اجداد کے آقا! آپ اس گریہ زاری

اور نالہ وشیون میں کب تک لگے رہیں گے؟ آپ نے فرمایا اے دوست! حضرت یعقوب علیہ السلام کا تو ایک یوسفؑ گم ہوا تھا تو آپ اس قدر روئے کہ آپ کی آنکھیں سفید ہو گئیں اور آپ نابینا ہو گئے تھے جب کہ میں نے اپنے باپ حضرت حسینؓ کے ہمراہ اٹھارہ اشخاص اور دوسرے شہداء کربلا کو کھویا ہے لہٰذا میں اس سے کم تو نہیں رہوں گا۔ کہ ان کے فراق میں اپنی آنکھیں سفید کر لوں ——— آپ کی یہ مناجات عربی میں فصاحت و بلاغت سے بھری ہوئی ہے۔ لیکن طوالت کے خوف سے میں نے اس کے فارسی میں معانی بیان کر دئے ہیں تاکہ تکرار نہ ہو البتہ کسی دوسرے مقام پر انشاء اللہ اسے بیان کر دوں گا۔

سیّدنا حضرت محمد جعفر رحمۃ اللہ تعالےٰ

اور انہی میں سے سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے یوسف، طریقت کی زینت، معرفت کے ترجمان اور صفوت کے مزین حضرت ابو محمد جعفر بن محمد صادق بن علی بن حسین بن علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہم بھی ہیں۔ آپ بڑے بلند حال۔ نیک سیرت اور ظاہر و باطن کے آراستہ وپیراستہ تھے تمام علوم میں آپ کے عمدہ اور لطیف اشارات موجود ہیں۔ آپ کلام الٰہی کی باریکیوں اور طریقت کے معانی سے واقفیت کی بنا پر مشائخ میں مشہور ہیں اور طریقت کے موضوع پر آپ کی بہت سی تصانیف مشہور ہیں۔ آپ کے متعلق روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔ مَنْ عَرَفَ اللّٰہُ اَعْرَضَ عن ما سواہُ (جس نے اللہ تعالےٰ کو پہچان لیا وہ غیر اللہ سے منہ پھیر لیتا ہے) یعنی عارف الٰہی وہ ہے جو غیر اللہ سے منہ پھیرلے اور اسبابِ دنیا سے رشتہ توڑ لے کیوں کہ حق تعالےٰ کی معرفت بعینہٖ غیر اللہ کی عدم شناخت کا نام ہے اس لئے کہ غیر اللہ کی عدم معرفت اللہ تعالےٰ کی معرفت کی وجہ سے ہوتی ہے اور غیر اللہ کی معرفت حق تعالےٰ کی عدم معرفت کا سبب ہوتی ہے۔ پس عارفِ الٰہی، مخلوق سے الگ اور حق سے پیوستہ ہوتا ہے غیر اللہ کی اس کے دل میں اتنی بھی قدر نہیں ہوتی کہ ان کی طرف دھیان دے اور اُن کے وجود سے اُس کو اتنا اندیشہ بھی نہیں ہوتا کہ دل میں اُن کی طرف دھیان دے اور اُن کے وجود ... سے اس کو اتنا اندیشہ بھی نہیں ہوتا کہ دل میں ان کی یاد کو جگہ دے ——— اور

آپ سے ہی روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔ لَا تَصِحُّ الْعِبَادَۃُ اِلَّا بِالتَّوْبَۃِ لِاَنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی قَدَّمَ التَّوْبَۃَ عَلَی الْعِبَادَۃِ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی اَلتَّائِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ" (عبادت، توبہ کے بغیر صحیح نہیں ہوتی کیوں کہ اللہ تعالٰے نے اپنے ارشاد "التائبون العابدون" میں توبہ کو عبادت پر مقدم ذکر فرمایا ہے) اس لئے کہ توبہ طریقت کے مقامات کی ابتدا ہے اور عبودیت اُن مقامات کی انتہا ہے اور اللہ تعالٰے نے جب گنہگاروں کا ذکر فرمایا تو انہیں توبہ کا حکم دیا چنانچہ فرمایا "تُوْبُوْا اِلَی اللّٰہِ جَمِیْعًا اَیُّھَا الْمُؤْمِنُوْنَ" (اے ایمان والو! تم سب اللہ کی جناب میں توبہ کرو) اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کیا تو عبودیت کے ساتھ یاد کیا اور فرمایا "فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَا اَوْحٰی (پس وحی کی اپنے بندے کی طرف جو وحی کی) — اور حکایت ہے کہ حضرت داؤد طائی رحمہ اللہ آپ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے ابن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے کوئی نصیحت فرمائیے کہ میرا دل سیاہ ہو چکا ہے۔ آپ نے فرمایا اے ابو سلیمان! آپ تو خود اپنے زمانہ کے زاہد ہیں آپ کو میری نصیحت کی کیا ضرورت ہے، انہوں نے عرض کی اے فرزند پیغمبر علیہ السلام آپ کو تمام مخلوق پر فضیلت حاصل ہے اور سب کو نصیحت کرنا آپ پر واجب ہے۔ آپ نے فرمایا اے ابو سلیمان میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کہیں میرے نانا پاکؐ قیامت کے دن میرا دامن نہ پکڑ لیں کہ تم نے میری اطاعت کا حق کیوں نہیں ادا کیا۔ اور یہ نصیحت کرنے کا کام کسی نسبی تعلق اور مضبوط نسبت پر منحصر نہیں بلکہ یہ اللہ تعالٰے کے حضور اچھے اعمال پر موقوف ہے۔ یہ سن کر حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ رونے لگے اور کہنے لگے۔ اے خداوندا! جب نبوت کے پانی سے گوندھی ہوئی طبیعت اور برہان و دلائل کے اصولوں سے ترکیب پانے والی طبیعت والا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نواسہ اور حضرت بتول بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہما کا صاحبزادہ اتنی حیرانی و پریشانی میں مبتلا ہے تو پھر داؤد کون ہے جو اپنے عمل پر مغرور ہو۔ — اور آپ ہی سے روایت ہے کہ ایک روز اپنے غلاموں کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ اُن سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آؤ آپس میں عہد اور بیعت کریں کہ ہم میں سے جو بھی نجات پا جائے قیامت کے دن سب کی شفاعت کرے گا۔ یہ سن کر غلاموں نے عرض کیا "اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے! آپ کو

ہماری شفاعت کی کیا ضرورت ہے. جب کہ آپ کے جدِّ بزرگوار پوری مخلوق کے شفیع ہیں. آپ نے فرمایا۔ مجھے اپنے ان افعال کی وجہ سے قیامت کے دن اپنے جدِّ امجد کا رخ انور دیکھنے سے شرم آتی ہے —— یہ باتیں اپنے نفس کے عیوب کی طرف نگاہ کرنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور اوصافِ کمال میں سے یہ بھی ایک صفت ہے اور انبیاء و اولیاء میں سے تمام مقربانِ الٰہی اس صفت سے متصف رہے ہیں. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اِذَا اَرَادَ اللہُ بِعَبْدٍ خَیْرًا اَبْصَرَہٗ بِعُیُوْبِ نَفْسِہٖ (اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتے ہیں تو اُسے اُس کے نفس کے عیوب دکھا دیتے ہیں) اور جو شخص تواضع سے اپنا سر جھکا لیتا ہے اللہ تعالیٰ دونوں جہاں میں اُس کے تمام کام سنوار دیتا ہے —— اور اگر میں تمام اہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین کو یاد کروں اور اُن کے مناقب علیحدہ علیحدہ شمار کروں تو یہ کتاب اس کی متحمل نہیں ہو سکتی طریقت کے ارادت مندوں اور منکروں میں سے جن کی عقل کو ادراک کا لباس حاصل ہے اُن کی ہدایت کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ ——

اب ہم اس کتاب میں ایجاز و اختصار کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابِ صفہ کا ذکر لاتے ہیں۔ اور اس سے پہلے ہم نے ایک کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام "منہاج الدین" رکھا ہے اُس میں ہم نے اصحابِ صفہ میں سے ہر ایک کے مناقب تفصیل سے بیان کر دیئے ہیں۔ یہاں صرف اُن کے نام اور کنیتیں الگ الگ بیان کریں گے تاکہ تمہارا مقصد حاصل ہو۔ اللہ تمہیں عزت سے نوازے۔ واللہ اعلم و باللہِ التوفیق۔

نواں باب

اصحابِ صفہ کے ذکر میں

جان لے کہ پوری امت اس بات پر متفق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام میں سے ایک جماعت ایسی تھی جو ہر وقت عبادت کے لئے مسجد نبوی میں رہتی تھی۔ یہ حضرات دنیا سے دست بردار اور روزی کمانے سے کنارہ کش ہو چکے تھے۔ اللہ تعالےٰ نے انہی کے لئے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو عتاب[۱] کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدَاۃِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَہٗ" (اُن لوگوں کو اپنے پاس سے نہ ہٹائیے جو محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے رات دن اللہ تعالےٰ کو پکارتے رہتے ہیں) اور اللہ تعالےٰ کی کتاب ان کے فضائل پر ناطق ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اُن کے فضائل میں بہت سی احادیث ہیں جو ہم تک پہنچی ہیں اور ہم نے کتاب کے مقدمہ میں اُن کا کچھ ذکر کر دیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے روایت کرتے ہیں کہ! وَقَفَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عَلٰی اصحاب الصفّۃِ فَرَاٰی فَقْرَھُمْ وَجُھْدَھُمْ وَطِیْبَ قُلُوْبِھِمْ فقالَ اَبْشِرُوْا یَا اَصْحَابَ الصفّۃِ فَمَنْ بَقِیَ مِنْ اُمَّتِیْ عَلَی النَّعْتِ الَّذِیْ اَنْتُمْ عَلَیْہِ رَاضِیًا بِمَا فِیْہِ فَاِنَّہٗ مِنْ رُفَقَائِیْ فِی الْجَنَّۃِ " (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصحابِ صفہ کے پاس جا کر کھڑے ہوئے اور اُن کی تنگدستی اور مجاہدے اور پھر اس حالت میں اُن کے دلوں کے اطمینان اور خوشی کو دیکھا تو فرمایا: اے صفہ والو! تمہیں بشارت ہو کہ میری امت کا جو شخص بھی اس صفت پر رہے گا جس پر تم ہو پھر اُس پر راضی بھی رہے گا

---

[۱] :- عتاب کا معنی ہے "پیار بھرا شکوہ"۔

تو وہ جنت میں میرے رفیقوں میں سے ہو گا۔

ان اصحاب صفہ میں سے ایک اللہ جبار کی درگاہ کے منادی (اعلان کرنے والے مؤذن) اور حضرت محمد مختار صلی اللہ علیہ وسلم کے برگزیدہ حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ ——— دوسرے خداوند واحد کے دوست اور واقفِ احوال پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوعبدالله سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ——— تیسرے مہاجرین وانصار رضی اللہ عنہم کے سالار اور خداوند جبار کی خوشنودی کی طرف متوجہ، حضرت ابوعبیداللہ عامر بن عبداللہ بن الجراح رضی اللہ عنہ ——— چوتھے برگزیدہ اصحاب صفہ اور زینتِ اہلِ تصوف حضرت ابوالیقظان عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ ——— پانچویں علم کا خزانہ اور حلم کا مخزن حضرت ابومسعود عبداللہ ابن مسعود الہذلی رضی اللہ عنہ ——— چھٹے۔ اللہ رب العزّت کی درگاہ کا تمسک کرنے والے اور گناہوں سے پاک حضرت عبداللہ بن مسعود کے بھائی حضرت عتبہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ——— ساتویں راہِ عزلت کے سالک اور عیوب و ذلّت کی باتوں سے کنارہ کش حضرت مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ ——— آٹھویں۔ مقامِ تقویٰ کے داعی اور مصیبت و ابتلا پر راضی حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ ——— نویں رضاء الٰہی کی درگاہ کا ارادہ کرنے اور مقام فنا میں بارگاہ بقا کے تلاش کرنے والے حضرت صہیب بن سنان رضی اللہ عنہ ——— دسویں، سعادت کے سیپ کے موتی اور قناعت کے سمندر حضرت عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ ——— گیارہویں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بھائی، مخلوق اور دونوں جہاں سے بے نیاز حضرت زید بن الخطاب رضی اللہ عنہ ——— بارہویں مشاہدات کی طلب میں مجاہدوں کے مالک، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام حضرت ابولبشر رضی اللہ عنہ ——— تیرہویں، صاحب عزت و توبہ اور ساری دنیا کو چھوڑ کر حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے حضرت ابوالمرشد کنانہ الحصین العدوی رضی اللہ عنہ ——— چودہویں تواضع اور انکساری کے عبور کرنے والے، دنیا سے قطع تعلق کرنے والے حذیفہ الیمانی رض کے غلام حضرت سالم رضی اللہ عنہ ——— پندرہویں عذاب آخرت سے ڈرنے والے اور مخالفت شریعت سے بھاگنے والے حضرت عکاشہ بن المحصن رضی اللہ عنہ ———

سولھویں مہاجرین وانصار کی زینت اور بنی قار کے سردار حضرت مسعود بن ربیع القاری رضی اللہ عنہ ——— سترھویں زہد میں مانند عیسیٰ علیہ السلام اور شوق میں مانند موسیٰ علیہ السلام حضرت ابوذر جندب ابن الجناوۃ الغفاری رضی اللہ عنہ ——— اٹھارہویں، انفاس پیغمبر علیہ السلام کے محافظ اور خیرات شایان حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ——— انیسویں استقامت دین میں قائم اور اتباع شریعت میں راست۔ رو حضرت صفوان بن بیضا رضی اللہ عنہ ——— بیسویں صاحب ہمت اور خالی از تہمت حضرت ابودردا عویم بن عامر رضی اللہ عنہ ——— اکیسویں اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ امید سے تعلق رکھنے والے اور دربار مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کے برگزیدہ حضرت ابولبابہ بن عبدالمنذر رضی اللہ عنہ ——— اور بائیسویں سمندر شرف کے کیمیا، اور صدف توکل کے موتی حضرت عبداللہ بن بدر الجہنی رضی اللہ عنہ وعنہم اجمعین ہیں۔

اگر ہم ان تمام اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم کا تذکرہ کریں تو کتاب طویل ہو جائے گی۔ شیخ ابو عبدالرحمٰن بن الحسین السلمی رحمہ اللہ تعالےٰ جو طریقت اور مشائخ کے کلام کو نقل کرنے والے ہیں انہوں نے اہل صفہ رضی اللہ عنہم کے حالات پر ایک تاریخ مرتب کی ہے جس میں اُن کے فضائل ومناقب، اسماء اور کنیتیں بیان کی ہیں ——— لیکن انہوں نے مسطح بن ثابت بن عباد کو بھی اصحاب صفہ میں شمار کیا ہے جب کہ میں اس کو دل سے پسند نہیں کرتا کیونکہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت کی ابتدا اُسی نے کی تھی۔ البتہ حضرات ابوہریرہ، ثوبان، معاذ بن الحارث، تاتب بن خلاب، ثابت بن ابو عینی عویم بن ساعد، سالم بن عمر بن ثابت، ابواللیث کعب بن عمر، وھب بن معقل، عبداللہ بن اُنیس اور حجاج بن عمر الاسلمی رضی اللہ عنہم اجمعین سب انہی اصحاب صفہ میں سے تھے، کبھی کبھی کسی خاص مقصد کے پیش نظر دنیا کی کسی دوسری خدمت میں شامل ہو جاتے تھے تاہم تمام کے تمام ایک ہی درجہ میں تھے۔

اور درحقیقت صحابہ کا دور خیر القرون (بہترین زمانہ) تھا لہٰذا وہ جس درجہ میں بھی تھے بعد کے ہر زمانہ کے لوگوں سے بہترین اور افضل ترین مخلوق تھے اس لئے کہ حق تعالےٰ نے ان کو اپنے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صحبت کی سعادت سے نوازا تھا اور اُن کے قلوب کو

ہر قسم کے عیوب سے محفوظ رکھا تھا جیسا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم الحدیث (سب زمانوں سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر وہ لوگ جو ان کے بعد آنے والے ہیں پھر وہ لوگ جو اُن کے بعد آنے والے ہیں) اور خود اللہ تعالےٰ نے فرمایا" والسابقون الاولون من المھاجرین والانصار والذین اتبعوھم باحسان" اور ایمان میں سبقت حاصل کرنے والے پہلے مہاجرین اور انصار اور وہ لوگ جنہوں نے خلوص کے ساتھ اُن کی متابعت کی" اللہ اُن سے راضی ہو چکا اور وہ اللہ سے راضی ہو چکے) ———

اب ہم اس کتاب میں بعض تابعین رحمہم اللہ اجمعین کا تذکرہ کریں گے تاکہ پورا پورا فائدہ بھی حاصل ہو اور زمانے بھی ایک دوسرے کے ساتھ متصل ہو جائیں۔

دسواں باب

تابعین میں تصوّف کے امام

حضرت اویس قرنی رحمہ اللہ تعالیٰ

تابعین میں تصوّف کے آئمہ میں سے اُمت کے آفتاب اور دین وملّت کی شمع حضرت اویس قرنی رحمہ اللہ تعالیٰ اہل تصوّف کے بڑے مشائخ میں سے تھے۔ آپ رسوؐل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک میں موجود تھے۔ لیکن دو وجہ سے پیغمبر علیہ السلام کی زیارت سے محروم رہے ایک غلبۂ حال اور دوسرے اپنی والدہ کے حقوق کے پیش نظر اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا تھا کہ قبیلہ قرن کا ایک اویس نامی آدمی ہے جو قیامت کے روز قبیلہ ربیعہ اور مضر کی بھیڑوں کی مقدار میری امت میں شفاعت کرے گا۔ اور آپؐ نے چہرۂ انور حضرت عمر فاروق اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہما کی طرف کر کے فرمایا کہ تم دونوں اُسے دیکھو گے وہ چھوٹے اور درمیانے قد کا لمبے بالوں والا آدمی ہے اور اُس کے دائیں پہلو پر ایک درہم کی مقدار سفید نشان ہے جو چنبل کے علاوہ کسی اور چیز کا نہیں اور اس کے ہاتھ کی ہتھیلی پر بھی اسی طرح کا سفید داغ ہے اور اُس کو میری امت میں قبیلہ ربیعہ و مضر کی بھیڑوں کی مقدار شفاعت کا حق ملے گا۔ جب تم اُسے دیکھو تو اسے میرا سلام پہنچا دینا اور کہنا کہ میری اُمت کے لئے دعا کرے، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ تشریف لائے اور امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی آپ کے ہمراہ تھے تو آپؓ نے خطبہ کے دوران فرمایا "یا اھل نجد قوموا" (اے نجد کے رہنے والو کھڑے ہو جاؤ) اہل نجد کھڑے ہوئے تو آپؓ نے اُن سے دریافت فرمایا کہ کیا تم میں قبیلہ قرن کا کوئی آدمی ہے؟ انہوں نے جواب دیا ہاں! چنانچہ قرن کے رہنے والے کچھ لوگوں کو آپ کے سامنے پیش کیا گیا تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ان سے اویس قرنی

رحمہ اللہ کے متعلق پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ ہاں اویس نام کا ایک دیوانہ آدمی ہے جو نہ تو آبادی میں آتا اور کسی شخص کے ساتھ بیٹھتا ہے اور نہ ہی وہ چیز کھاتا ہے جو لوگ کھاتے ہیں اور غم و خوشی میں شریک نہیں ہوتا۔ جب لوگ ہنستے ہیں تو وہ روتا ہے اور جب لوگ روتے ہیں تو وہ ہنستا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں اُس سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں انہوں نے عرض کی کہ وہ تو تمہارے اونٹوں کے ساتھ جنگل میں ہے ۔ دونوں بڑے بزرگ (حضرت عمر و علی رضی اللہ عنہما) اُٹھے اور اُس کے پاس پہنچ گئے۔ حضرت اویس اس وقت نماز میں مشغول تھے۔ جب وہ فارغ ہوئے تھے تو انہیں سلام کیا اور اپنے پہلو اور ہتھیلی کا نشان دکھایا تاکہ ان کو معلوم ہو جائے پھر اُن سے انہوں نے دعا کی وصیت کی۔ یہ حضرات تھوڑی دیر اُن کے پاس ٹھہرے تب حضرت اویس نے عرض کی کہ آپ حضرات نے تکلیف گوارا فرمائی اب آپ واپس تشریف لے جائیے کہ قیامت نزدیک ہے ہمیں وہاں ایسی ملاقات نصیب ہو گی کہ اس سے کبھی محروم نہ ہوں گے کیوں کہ اس وقت میں سفر قیامت کا سامان تیار کرنے میں مصروف ہوں ـــــــ جب اہل قرن ان دونوں امراء رضی اللہ عنہما سے واپس لوٹے تو انہیں حضرت اویسؒ کے مرتبے اور مقام کا اندازہ اور علم ہو چکا تھا لہٰذا آپؒ وہاں سے کوفہ چلے گئے ـــــــ بس ایک دن ھرم بن حیان رحمہ اللہ نے آپ کو دیکھا اس کے بعد کسی نے نہیں دیکھا حتی کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں فتنہ برپا ہوا تو آپ وہاں آئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہمراہ آپؓ کے مخالفین کے ساتھ جنگ کی۔ یہاں تک کہ جنگ صفین کے روز شہادت پائی "عاشَ حَمِیدًا وَّمَاتَ شَہِیدًا" رضی اللہ عنہ (زندہ رہتے تو تعریف کے لائق اور وفات پائی تو شہادت کی، اللہ ان سے راضی ہو) آپ سے روایت بیان کرتے ہیں کہ فرمایا: "السلامۃ فی الوحدۃ" (سلامتی تنہائی میں ہے) اس لئے جس کا دل تنہا ہو وہ غیر کے خیال سے الگ ہوتا اور اپنے تمام حالات میں مخلوق سے بے تعلق ہوتا ہے یہاں تک کہ ہر قسم کی آفات سے محفوظ رہتا ہے اور تمام لوگوں سے منہ پھیر لیتا ہے لیکن اگر کوئی یہ خیال کرے کہ تنہا جینا وحدت ہے تو یہ ایک محال امر ہے کیوں کہ جب تک شیطان سے کسی کے دل کو محبت ہوتی اور نفسِ امارہ کو اس کے سینہ میں غلبہ حاصل ہوتا ہے اور جب تک

دنیا وآخرت کا فکر دامن گیر ہو اور مخلوق کا خیال موجود ہو اُس وقت تک وحدت نہیں ہوتی کیوں کہ کسی چیز کی موجودگی ہیں یا صرف اس کے خیال سے آرام ہو دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ پس جو شخص وحید ہو اگرچہ اُسے لوگوں کے ساتھ محبت حاصل ہو اُس کی صحبت، وحدت کے ساتھ مزاحم نہیں ہوتی اور جو شخص لوگوں میں مشغول ہوتا ہے اُس کی خلوت نشینی بھی اس کے دل کی فراغت کا سبب نہیں بنتی۔ لہٰذا اللہ تعالےٰ کی محبت کے بغیر لوگوں سے قطع تعلق نہیں ہو سکتا جس شخص کو حقیقتاً اللہ تعالےٰ سے محبت ہو اس کا ظاہری طور پر لوگوں سے ملنا جلنا اُسے کچھ نقصان نہیں دیتا۔ اور جس کو لوگوں کے ساتھ محبت ہو اُس کے دل کو اللہ تعالےٰ کی محبت کا نہ تو گزر ہوتا ہے اور نہ ہی محبتِ حق کی اُسے خبر ہوتی ہے لِاَنَّ الوحدۃ صفۃ عبدٍ صافٍ سَمِعَ قولہٗ تعالیٰ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ (اس لئے کہ حقیقی تنہائی ایسے صاف باطن بندے کی صفت ہے جس نے اللہ تعالےٰ کا یہ قول سُن رکھا ہے کہ کیا اللہ تعالےٰ اپنے بندے کے لئے کافی نہیں ہے)

حضرت ہرم بن حیّان رحمۃ اللہ تعالیٰ

اور انہی ائمہ تابعین میں سے صفائی باطن کا سرچشمہ اور اخلاص و وفا کی کان حضرت ہرم بن حیّان رحمۃ اللہ تعالےٰ ہیں آپ طریقت کے بزرگوں میں سے تھے اور طریقت کے معاملات میں حصۂ وافر رکھتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صحبت سے مشرف ہوئے تھے۔ آپ نے حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ کی زیارت کا ارادہ کیا لیکن جب قبیلہ قرن کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ وہاں سے چلے گئے ہیں آپ مایوس ہو کر مکہ کی طرف آئے تو معلوم ہوا کہ وہ کوفہ میں رہتے ہیں چنانچہ آپ شوقِ زیارت میں کوفہ آئے تو یہاں بھی ملاقات نہ ہوئی کچھ روز وہاں ٹھہر کر آپ بصرہ کی طرف روانہ ہوئے تو راستہ میں دریائے فرات کے کنارے پر اُن سے ملاقات ہو گئی کہ وہ وضو فرما رہے تھے انہوں نے گدڑی زیب تن کر رکھی تھی اس لئے ان کو پہچان لیا، حضرت اویس رحمۃ اللہ نے وضو سے فارغ ہو کر دریا کے کنارے سے ذرا ہٹ کر بالوں کو کنگھی کی تو حضرت ہرم بن حیانؒ نے سامنے آکر سلام کیا۔ انہوں نے جواب میں کہا اے ہرم بن حیانؒ

تم پر بھی سلام ہو! آپ نے سوال کیا کہ آپ نے کس طرح مجھے پہچان لیا کہ میں ہرم ہوں؟ انہوں نے نے جواب دیا کہ "عَرَفَتْ رُوحِی رُوحَکَ" (میری روح نے تمہاری روح کو پہچان لیا ہے) تھوڑی دیر یہ اکٹھے بیٹھے پھر آپ کو رخصت کر دیا۔ ہرم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے ساتھ زیادہ تر باتیں ہر دو امیر اعمر و علی رضی اللہ عنہما کے بارے میں کرتے رہے اور میرے لئے انہوں نے حضرت عمرؓ سے روایت بیان کی کہ حضرت عمرؓ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی کہ آپؐ نے فرمایا "انّما الاعمال بالنیات وَلِکلِ امرءٍ ما نوی فمن کانت ھجرتہٗ الی اللہ وَرسولہٖ فھجرتُہٗ الی اللہِ ورسولہٖ وَمن کانت ھجرتہٗ الی الدنیا لیصیبھا اوالیٰ امراۃٍ یتزوّجھا فھجرتُہٗ الی ما ھاجرَ الیہِ" (بے شک اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہے اور ہر آدمی کے لئے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی پس جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہے تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہی شمار ہو گی اور جس کی ہجرت دنیا کے لئے ہے کہ اس کو حاصل کرے یا کسی عورت کی طرف ہے کہ اس سے نکاح کرے تو اس کی ہجرت اسی کے لئے سمجھی جائے گی جس کی طرف اس نے ہجرت کی) —— پھر آپ نے مجھ سے فرمایا کہ عَلَیْکَ بِقَلْبِکَ (تجھ پر اپنے دل کی حفاظت لازم ہے) یعنی غیر اللہ کے خیال سے اپنے دل کو محفوظ رکھ اور اس کے دو معنی ہیں —— ایک یہ کہ مجاہدہ کی حالت میں اپنے دل کو حق کے تابع کر دے —— اور دوسرا یہ کہ اپنے آپ کو اپنے دل کے تابع کر دے اور یہ دونوں اصل قوی ہیں، حق تعالےٰ کے ارادتمندوں کا کام یہ ہے کہ دل کو نفسانی شہوات کی کثرت اور خواہشات کی محبت سے خالی کر دیں، دل سے ناموافق حالات کو آہستہ آہستہ دُور کریں اور عمل کی درستگی اور امور طریقت کی نگہداشت کی تدبیر میں اپنی نگاہ کو آیاتِ خداوندی میں لگا دیں تاکہ حق تعالیٰ کی محبت کا محل ہو جائیں اور اپنے آپ کو دل کے تابع بنا لینا کامل لوگوں کا کام ہے حق تعالےٰ نے جن کے دلوں کو اپنے جمال کے نور سے منور فرمایا اور تمام ظاہری اسباب و علل سے ان کو نجات عطا فرمائی اور بلند مقام پر پہنچا کر خلعتِ قرب سے سرفراز فرمایا اور اپنے لطف و کرم سے اُن پر تجلی فرما کر اپنے مشاہدہ اور قرب سے محبت کی نظر ڈالی ہے اُن کے جسم کو دل کے موافق کر دیا ہے ——

پس پہلا گروہ وہ ارباب قلوب ہوتے ہیں اور دوسرا طبقہ مغلوب القلوب لوگوں کا ہوتا ہے اور صاحب قلوب دلوں کے مالک اور باقی الصفۃ ہوتے ہیں اور مغلوب القلوب فانی الصفۃ اور اس مسئلہ کی حقیقت حق تعالےٰ کے اس ارشاد سے واضح ہوتی ہے کہ اللہ عزوجل نے فرمایا۔ "اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ (مگر تیرے وہ بندے جو اخلاص والے ہیں) اس میں دو قرأتیں ہیں۔ مخلصین بکسر اللام اور مخلصین بفتح اللام۔ مخلص بکسر اللام فاعل اور باقی الصفۃ ہوتا ہے اور مخلص بفتح اللام مفعول اور فانی الصفۃ بمعنی خالص کیا گیا" ہوتا ہے۔ اور انشاء اللہ یہ مسئلہ کسی دوسرے مقام پر شرح و تفصیل کے ساتھ بیان کروں گا —— اور درحقیقت فانی الصفت لوگ زیادہ فضیلت کے حامی ہوتے ہیں کہ وہ اپنے اجسام کو دل کے موافق کر لیتے ہیں کیوں کہ اس طرح ان کے دل حق کی تحویل میں ہوتے ہیں اور اسی کے مشاہدہ میں قائم رہتے ہیں بہ نسبت ان لوگوں کے جو باقی الصفۃ ہوتے ہیں اور دل کو بہ تکلیف امر الٰہی کے موافق کرتے ہیں —— اور اس مسئلہ کی بنیاد صحو اور سکر (ہوشیاری و بے ہوشی) اور مشاہدہ اور مجاہدہ پر قائم ہے —— واللہ اعلم۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تعالےٰ

اور انہی میں سے امام العصر اور یکتائے زمانہ حضرت ابو علی الحسن بصری رحمہ اللہ بھی ہیں ایک گروہ آپ کی کنیت ابو محمد بتلاتا ہے اور دوسرا گروہ ابو سعید۔ اہل طریقت کے نزدیک آپ کی بڑی قدر و منزلت ہے اور علم معاملات میں آپ کے بڑے لطیف اشارے ہیں اور میں نے حکایات میں پڑھا ہے کہ ایک اعرابی نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر صبر کی حقیقت دریافت کی تو آپ نے فرمایا کہ صبر دو طرح کا ہوتا ہے —— اول مصیبتوں اور آزمائشوں میں صبر کرنا اور دوسرا اُن کاموں سے باز رہنے پر صبر کرنا جن سے اللہ تعالےٰ نے اجتناب کرنے کا حکم دیا اور اُن کی متابعت سے منع فرمایا ہے اعرابی نے کہا اَنْتَ زَاهِدٌ مَا رَاَيْتُ اَزْهَدَ مِنْكَ" (آپ یقیناً زاہد ہیں میں نے آپ سے بڑھ کر کوئی زاہد نہیں دیکھا) امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا۔ اے اعرابی! میرا زہد تمام تر رغبت ہے اور میرا صبر بے قراری!

اعرابی نے کہا "اس کلام کی تفسیر بیان فرمائیے کیوں کہ اس سے تو میرا اعتقاد پریشان ہو گیا ہے"۔ آپ نے فرمایا "مصیبت یا اطاعت و فرمانبرداری میں میرا صبر دوزخ سے میرے خوف کو ظاہر کرتا ہے اور یہ عین جزع اور بیقراری ہے اور دنیا سے میرا بے تعلق ہونا آخرت کی خواہش ہے اور یہ عین رغبت ہے۔ وہ شخص بڑا خوش نصیب ہے جو ان دونوں کے درمیان سے اپنا حصہ اٹھا لے تاکہ اُس کا صبر عذابِ دوزخ سے بچنے کے لئے نہ ہو بلکہ اللہ تعالےٰ کی خوشنودی کے لئے ہو اور اسی طرح اُس کی رغبت بہشت میں پہنچنے کے لئے نہ ہو بلکہ حق تعالےٰ کی رضا جوئی کے لئے ہو اور یہی اخلاص کی علامت ہے —— اور اُنہی سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا" اِن صحبۃ الاشرار تورث سُوءَ الظن بالاخیار"۔ (شریر لوگوں کے ساتھ صحبت نیک لوگوں کے ساتھ بدظنی پیدا کر دیتی ہے) جو شخص اس طائفہ کے بُرے لوگوں کا ہمنشیں ہوتا ہے اس گروہ کے اچھے اور بزرگ حضرات سے بدگمان ہو جاتا ہے، اور یہ بات متفق علیہ اور اس زمانہ کے لوگوں کے حال سے بالکل موافق ہے جو بارگاہِ حق تعالےٰ کے عزیزوں کا انکار کرتے ہیں۔ اور ایسا اس لئے ہوا ہے کہ جب لوگ نام نہاد صوفیوں کے ساتھ صحبت اختیار کرتے ہیں اور اُن کے افعال کو خیانت پر، زبان کو جھوٹ اور غیبت پر کانوں کو بیہودہ اور فضول باتوں کے سننے پر، آنکھ کو لہو اور شہوت پر اور اُن کے ارادوں کو حرام اور مشتبہ چیزوں کے جمع کرنے پر مصروف دیکھتے ہیں تو یہ خیال کرتے ہیں کہ تمام صوفیاء کا یہی حال اور یہی مذہب ہے۔ اُن کا دل محبت الٰہی کا مسکن ہے اور اُن کا کان درحقیقت سماعِ حق کا، آنکھ مشاہدۂ تجلیات کا اور اُن کی ہمیت رؤیت حق کا مرکز و محل ہے۔ یہ سب اسرارِ الٰہی ہیں —— اور کچھ لوگ ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو صوفیا کی جماعت اور اُن کے کردار و سیرت میں خیانت کا ارتکاب کرتے ہیں لیکن ان خیانت کرنے والوں کی ضیافت کا تعلق محض خود اُن کی ذات کے ساتھ ہے جہاں کے شرفاء اور زمانہ کے سادات کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں —— پس جو شخص کسی طبقہ کے شریر لوگوں کے ساتھ محبت کرتا ہے تو وہ درحقیقت اُس کی اپنی بُرائی اور شرارت کا نتیجہ ہے کیوں کہ اگر اس کے وجود میں کوئی بھلائی ہوتی تو وہ نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرتا پس ہر شخص کو اپنے آپ پر ملامت کرنی چاہیے کہ وہ ایک نالائق

اور نامناسب شخص سے صحبت اختیار کرتا ہے اور صوفیا کرام کے اقوال سن کر بھی سب سے زیادہ ایسے شریر اور رذیل ہی ہیں کہ رذیلوں اور شریروں سے اُن کی صحبت ہوتی ہے لہٰذا جب سچے صوفیاء کرام سے اپنی خواہشاتِ نفس نہیں پاتے تو اُن کے منکر ہو جاتے ہیں۔ اور اُن شریر اور رذیل نام نہاد صوفیوں کی اقتداء کر کے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ بخلاف اُن نیک اور بارگاہِ خداوندی کے عزیزوں کے جنہوں نے اپنی چشم رضا کے ساتھ ان صوفیاء میں سے نیک لوگوں کو دیکھا۔ اُن کی صحبت کو دل و جان سے خرید لیا۔ پوری دنیا میں سے اس برگزیدہ گروہ کے طریق کو اختیار کر کے اُن کی برکات سے دونوں جہانوں کا مقصود حاصل کر لیا اور باقی سب سے تعلق منقطع کر دیا اور اسی مفہوم کو ایک بزرگ نے یوں ادا کیا ہے۔

شعر:- فَلَا تَحقِرَنَّ نَفسِی وَاَنتَ حَبِیبُھَا فَکُلُّ امرِءٍ یَصبُو اِلٰی مَن یُجَانِسُ

ترجمہ:- پس میرے نفس کو حقیر نہ سمجھ جب کہ تو اُس کا محبوب ہے کیوں کہ ہر شخص اپنے ہم جنس کا مشتاق ہوتا ہے۔

حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ

اور انہی میں سے علماء کے سردار اور فقہا کے مقتدا حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ ہیں۔ آپ کی شان بہت بڑی اور قدر بہت بلند ہے اور آپ کا فرمان قابل عزت اور سینہ قابل تعریف تھا۔ اور علم فقہ، توحید، حقائق طریقت، تفسیر، شعر اور دوسرے تمام فنون کے علوم میں آپ کے بے شمار مناقب ہیں۔ کہتے ہیں کہ آپ بظاہر ہوشیار اور طبعاً پارسا تھے اور تمام مشائخ طریقت کے نزدیک یہی طرز عمل نہایت عمدہ اور قابلِ تعریف ہے اور آپ سے روایت کرتے ہیں کہ فرمایا" اِرضَ بِالیَسِیرِ مِنَ الدُّنیَا مَعَ سَلَامَتِ دِینِکَ کَمَا رَضِیَ قَومٌ بِکَثِیرِھَا مَعَ ذَھَابِ دِینِھِم" (تو اپنے دین کی سلامتی کے دنیا کے تھوڑے سے مال پر راضی ہو جا جس طرح کچھ لوگ دین کے چلے جانے کے بدلے میں بہت سی دنیا پر راضی ہوئے بیٹھے ہیں) یعنی دین کی سلامتی کے ساتھ فقر و افلاس اُس دولت مندی اور رغنا سے بدرجہا بہتر ہے جو دین سے غفلت کا سبب بن جائے۔ کیوں کہ فقیر جب دل کی طرف دھیان دیتا ہے تو

وہاں زیادتی دنیا کی خواہش نہیں پاتا اور جب ہاتھ دیکھتا ہے تو ناپاک دنیا دیکھتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے دوستوں کا اللہ تعالیٰ کی خداوندی پر بغیر غفلت کے راضی رہنا۔ خدا تعالیٰ سے غافل لوگوں کے دھوکا دینے والی دنیا پر راضی رہنے سے بہتر ہے اور مصیبت پر حسرت و ندامت کے بغیر صبر کرنا اس نعمت سے بدرجہا بہتر ہے جس کے ساتھ ذلت اور معصیت ہو۔ پس جب مصیبت آتی ہے تو غافل لوگ کہتے ہیں۔ الحمد للہ کہ یہ مصیبت جسم پر نہیں آئی۔ اور دوستانِ حق تعالیٰ کہتے ہیں کہ الحمد للہ کہ بدن مصیبت میں مبتلا ہوا ہے یہ مصیبت ہمارے دین پر واقع نہیں ہوئی۔ کیوں کہ اگر مصیبت جسم پر واقع ہو لیکن دل میں بقا موجود ہو تو یہ مصیبت جسم کے لئے خوشی کا موجب ہوتی ہے۔ اور اگر دل میں غفلت شعاری ہو تو جسم اگرچہ نعمت میں ہی کیوں نہ ہو وہ نعمت عذاب بن جاتی ہے اور درحقیقت تھوڑی سی دنیا پر راضی ہونا دنیائے کثیر پر راضی ہونے کے برابر ہے اور زیادہ دنیا پر راضی ہونا قلیل دنیا کے مترادف ہے اس لئے کہ دنیا کی قلت بھی دنیا کی کثرت کی طرح ہی ہے ——

اور آپ ہی کے متعلق آتا ہے کہ آپ ایک روز مکہ مکرمہ میں تشریف فرما تھے کہ ایک آدمی نے حاضر ہو کر سوال کیا کہ مجھے وہ حلال چیز بتائیے جس میں کوئی حرام نہ ہو اور وہ حرام چیز کہ جس میں کوئی حلال نہ ہو؟ آپ نے جواباً فرمایا " ذِکْرُ اللّٰہِ حَلَالٌ لَیْسَ فِیْہِ حَرَامٌ وَذِکْرُ غَیْرِہٖ حَرَامٌ لَیْسَ فِیْہِ حَلَالٌ"۔ (اللہ تعالیٰ کا ذکر ایسا حلال ہے کہ اُس میں کچھ بھی حرام نہیں اور غیر اللہ کا ذکر ایسا حرام ہے جس میں کچھ بھی حلال نہیں) کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں نجات ہے اور غیر اللہ کے ذکر میں ہلاکت! اور توفیق اللہ ہی کے قبضہ میں ہے۔

گیارہواں باب

تبع تابعین میں سے ائمہ تصوّف

حضرت حبیب عجمی رحمہ اللہ تعالےٰ

تبع تابعین میں آپ کا شمار ہوتا ہے آپ طریقت کے بہادر اور شریعت میں بڑے مضبوط تھے آپ کا نام حضرت حبیب عجمی رحمہ اللہ ہے آپ بڑے بلند حوصلہ اور قیمتی انسان تھے اور مردانِ خدا کے درجات میں بہت بڑے مرتبہ کے حامل تھے آپ کو شروع میں حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ کے ہاتھ پر توبہ نصیب ہوئی تھی کہ آپ ابتداء عمر میں لوگوں کو سود پر رقم دیا کرتے تھے اور ہر قسم کا غلط کام کرتے تھے لیکن اللہ تعالےٰ سے آپ کو سچی توبہ کی توفیق نصیب ہوئی اور آپ نے رب العزت کی طرف رجوع فرمایا اور طریقت کا عمل اور اس کا بنیادی علم حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے سیکھا۔ آپ کی زبان عجمی تھی اور عربی پر جاری نہ ہوتی تھی۔ اللہ تعالےٰ نے آپ کو بہت سی کرامات سے مخصوص فرمایا تھا اور آپ اس درجے تک پہنچ گئے تھے کہ ایک شام حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تعالےٰ آپ کے عبادت خانہ کے دروازے پر سے گزر رہے تھے کہ آپ تکبیر کہہ کر شام کی نماز میں کھڑے ہو چکے تھے۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ آئے لیکن نماز میں آپ کی اقتداء نہ کی۔ کیوں کہ آپ کی زبان عربی اور قرآن مجید کی تلاوت پر جاری نہ ہوتی تھی۔ —— جب رات کو سوئے تو خواب میں حق تعالےٰ کی زیارت نصیب ہوئی۔ پوچھا بار خدایا! تیری خوشنودی کس چیز میں ہے؟ حق تعالےٰ نے فرمایا اے حسن! میری رضا تو نے پا تو لی تھی لیکن تو نے اس کی قدر نہ کی۔ آپ نے عرض کی بار خدایا! یہ کیسے؟ فرمایا! اگر گزشتہ رات تو حبیب کی اقتداء میں نماز ادا کر لیتا اور اُس کی صحتِ نیت تجھ کو اُس کی عبادت کے انکار سے باز رکھتی تو میں تجھ سے راضی ہو جاتا —— طائفہ صوفیاء میں یہ بات مشہور ہے کہ جب حضرت

حسن بصریؒ۔ حجاج بن یوسف کے کارندوں سے بھاگ کر آپ کی عبادت گاہ میں آ گئے تو وہ سپاہی آئے اور حضرت حبیبؒ سے دریافت کیا اے حبیب! حسن بصری کو آپ نے کسی جگہ دیکھا ہے؟ فرمایا ہاں! انہوں نے پوچھا تو وہ کہاں ہیں؟ فرمایا میری عبادت گاہ میں موجود ہیں! چنانچہ وہ عبادت خانہ میں داخل ہو گئے لیکن وہاں انہوں نے کسی کو نہ دیکھا تو یہ سمجھ کر کہ حبیبؒ نے اُن سے استہزا کیا ہے آپ کے ساتھ سخت کلامی کی کہ آپ نے ہم سے غلط بیانی کی کہ حسنؒ یہاں ہیں۔ آپ نے قسم کھا کر کہا کہ میں سچ کہہ رہا ہوں اس طرح سپاہی دوبارہ اور پھر سہ بارہ اندر گئے لیکن حضرت حسن کو نہ پایا اور واپس چلے گئے تو حضرت حسنؒ باہر تشریف لے آئے اور فرمایا اے حبیب! میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ نے تیری برکت سے مجھے اُن کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھا ہے۔ لیکن آپ نے یہ کیوں کہا تھا کہ حسنؒ اندر ہی موجود ہے؟ آپ نے جواب دیا اے استاد محترم! وہ جو آپ کو دیکھ نہ سکے تھے یہ میری برکت نہ تھی بلکہ میرے سچ بولنے کی برکت سے وہ آپ کو دیکھ نہ سکے تھے اور اگر میں دروغ بیانی سے کام لیتا تو وہ مجھے اور آپ دونوں کو رسوا کرتے ۔۔ اور آپ کی اس طرح کی کرامات بہت ہیں۔ آپ سے لوگوں نے پوچھا کہ اللہ تعالےٰ کی رضا کس چیز میں ہے؟ تو آپ نے فرمایا "فی قلبٍ لیس فیہِ غبارُ النفاق" (اللہ کی رضا اُس دل میں ہے جس میں منافقت کا غبار نہ ہو) اس لئے کہ نفاق۔ وفاق کی ضد ہے اور رضا عین وفاق ہے اور محبت کو نفاق کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور اس کا محل رضا ہے۔ پس قضاء الٰہی پر راضی رہنا حق تعالیٰ کے دوستوں کی صفت ہے اور نفاق دشمنوں کی صفت ہے ——— اور یہ مسئلہ بڑا اہم ہے ہم اسے انشاء اللہ کسی دوسرے مقام پر بیان کریں گے۔ اور توفیق اور مدد اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ

اور انہی ائمہ تبع تابعین میں سے اہلِ محبت کے نقیب اور جملہ جن وانس کی زینت حضرت مالک بن دینار رحمہ اللہ تعالیٰ بھی ہیں وہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ کے دوست اور

طریقت کے بزرگوں میں سے تھے ان کی کرامات مشہور ہیں اور ریاضیات میں اُن کے خصائل مذکور ہیں آپ کے والد دینار غلام تھے اور حضرت مالکؒ کی ولادت والد کی غلامی کے دور میں ہی ہوئی تھی۔ اور آپ کی توبہ کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ ایک رات آپ ایک گروہ کے ساتھ عیش و طرب میں مشغول تھے جب سب لوگ سو گئے تو جو باجا آپ بجا رہے تھے اُس میں سے آواز آئی "یَا مَالِکُ مَا لَکَ اَنْ لَا تَتُوْبَ" (اے مالک تجھے کیا ہوا کہ تم توبہ نہیں کرتے) چنانچہ آپ نے اُن سب چیزوں سے ہاتھ اٹھا لیا اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر توبہ کی اور اپنا معاملہ درست کر لیا پھر اس مقام تک پہنچے کہ ایک دفعہ کشتی میں سوار تھے کہ ایک دوسرے سوار کا ایک قیمتی موتی غائب ہو گیا۔ آپ چونکہ سب کے لئے اجنبی تھے اس لئے انہوں نے موتی چُرانے کی تہمت آپ پر لگا دی۔ آپ نے اپنا سر مبارک آسمان کی طرف اٹھایا تو فوراً دریا کی تمام مچھلیوں نے اپنے سر سطح پانی پر نکال لئے اور ہر مچھلی نے اپنے منہ میں ایک قیمتی پتھر لے رکھا تھا۔ آپ نے اُن میں سے ایک موتی لے کر اس شخص کو دے دیا۔ اور خود سطح پانی پر قدم رکھا اور دریا کے پانی پر چلتے ہوئے ساحل پر پہنچ گئے۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "اَحَبُّ الْاَعْمَالِ اِلَیَّ الْاِخْلَاصُ فِی الْاَعْمَالِ"۔ (میرے نزدیک سب سے پسندیدہ عمل، اعمال میں اخلاص ہے) کیونکہ کوئی عمل اخلاص سے ہی عمل بنتا ہے گویا عمل کے لئے اخلاص کی وہی حیثیت ہے جو جسم کے لئے روح کی ہوتی ہے جس طرح روح کے بغیر جسم ایک پتھر ہوتا ہے اسی طرح اخلاص کے بغیر عمل بھی ایک بیکار چیز ہوتا ہے لیکن اخلاص کا تعلق باطن کے معاملات سے ہے اور عبادت ظاہری اعمال میں سے ہے اور ظاہری اعمال، باطنی اعمال کے ساتھ مل کر ہی مکمل ہوتے ہیں۔ اور باطنی اعمال ظاہری اعمال کے ساتھ ہی قیمتی بنتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ہزار سال تک دل میں مخلص ہو لیکن جب تک اس کا عمل اخلاص کے ساتھ موافق نہیں ہوگا اخلاص کی کوئی حیثیت نہیں اور اگر ایک شخص ہزار سال تک ظاہری طور پر عمل کرتا رہے لیکن جب تک خلوصِ نیت اُس کے عمل کے ساتھ نہیں ملے گا وہ عمل عبادت نہیں قرار پائے گا۔

حضرت جبیب بن اسلم الراعی رحمۃ اللہ تعالےٰ

اور انہی تبع تابعین رحمہم اللہ اجمعین میں سے بہت بڑے فقیر اور تمام اولیاء پر امیر حضرت ابوحلیم جبیب بن اسلم الراعی رحمۃ اللہ تعالےٰ ہیں آپ مشائخ طریقت میں بہت بڑے مرتبہ کے حامل تھے تمام احوال میں آپ کے بہت سے براہین اور دلائل موجود ہیں۔ آپ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی صحبت میں بیٹھنے والے تھے۔ آپ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا نِیَّۃُ الْمُؤْمِنِ خَیْرٌ مِّنْ عَمَلِہٖ، (مومن کی صحیح نیت اُس کے عمل سے بہتر ہے) حضرت جبیبؒ نے بھیڑ بکریاں رکھی ہوئی تھیں اور فرات کے کنارے پر قیام فرما تھے اور عزلت و تنہا نشینی اختیار کر رکھی تھی۔ ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں آپ کے پاس سے گزرا تو میں نے آپ کو نماز میں مشغول پایا اور دیکھا کہ بھیڑیئے آپ کی بکریوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔ میں نے دل میں سوچا کہ میں اس پیر کی ضرور زیارت کروں گا کہ مجھے اس میں بزرگی کی علامات نظر آتی ہیں۔ میں کچھ دیر وہاں ٹھہرا رہا یہاں تک کہ جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے فرمایا! بیٹے! کس کام کے لئے آئے ہو؟ میں نے عرض کی کہ آپ کی زیارت کے لئے! فرمایا" اللہ تعالےٰ تمہیں اس کی جزا دے! میں نے کہا" یا شیخ! بھیڑیئے کو بکری کے موافق دیکھ رہا ہوں اس کی کیا وجہ ہے؟ تو انہوں نے فرمایا" اس کی وجہ یہ ہے کہ بکریوں کے چرواہے نے حق تعالےٰ کے ساتھ موافقت اختیار کر رکھی ہے"۔ یہ کہہ کر آپ نے لکڑی کا ایک پیالہ ایک پتھر کے نیچے رکھا تو اُس پتھر سے دو چشمے پھوٹ پڑے ایک دودھ کا اور دوسرا شہد کا —— آپ نے فرمایا۔ لو پی لو! میں نے عرض کی" اے شیخ! آپ نے کس عمل کی وجہ سے یہ مقام حاصل کیا؟ فرمایا: حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت سے۔ پھر فرمایا" اے لڑکے! حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم باوجودیکہ اپنے نبی کی مخالف تھی پھر بھی پتھر نے ان کے لئے پانی دے دیا تھا اور جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی حضرت محمد مصطفےٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے درجہ کے برابر نہ تھے۔ تو جب میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اطاعت گزار

ہوں تو یہ پتھر مجھے دودھ اور شہد کیوں نہ دے گا جب کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مرتبہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہیں بہتر تھے —— میں نے عرض کی کہ مجھے کوئی نصیحت فرمائیے! آپ نے فرمایا "لَا تَجْعَلْ قَلْبَكَ صُنْدُوقَ الْحِرْصِ وَبَطْنَكَ وِعَاءَ الْحَرَامِ" اپنے دل کو دنیوی لالچ کا صندوق اور اپنے پیٹ کو حرام مال کا برتن نہ بنا کیوں کہ مخلوق کی تباہی انہی دو چیزوں کی وجہ سے ہے اور اس کی نجات انہی دو چیزوں سے حفاظت میں ہے[۱] ——

اور میرے شیخ رحمۃ اللہ نے آپ کے بارے میں مجھ سے بہت سی روایات بیان کی ہیں لیکن وقت کی قلت کی وجہ سے اس سے زیادہ لکھنا ممکن نہیں کہ میری کتابیں غزنی میں رہ گئی ہیں اللہ انہیں محفوظ رکھے) اور میں خود ہندوستان کے شہر بھنور (لاہور) میں ہوں جو ملتان کے مضافات میں سے ہے اور بیگانہ لوگوں میں گھرا ہوا ہوں اور خوشحالی و تنگ حالی ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کا شکر ہے ——

حضرت ابوحازم مدنی رحمہ اللہ تعالے

اور انہی میں سے بڑے نیک بزرگ اور مشائخ طریقت میں سے بعض کے پیشوا حضرت ابو حازم المدنی رحمۃ اللہ بھی ہیں۔ طریقت کے معاملات میں آپ حصۂ وافر اور مقام بلند کے مالک تھے اور فقر میں سچی استقامت اور مجاہدات میں کامل دسترس رکھتے تھے اور حضرت عمر بن عثمان مکی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے احکام پر سختی سے پابند تھے اور آپ کی کلام کو دل وجان سے پسند کرتے تھے بہت سی کتابوں میں مذکور ہے اور یہی عمر بن عثمانؒ آپ سے روایت کرتے ہیں کہ لوگوں نے حضرت ابوحازمؒ سے دریافت کیا کہ "مَا مَالُكَ؟ (آپ کا مال کیا ہے؟) تو آپ نے جواب دیا۔ الرضاء عن اللہ والغنیٰ عن الناس" (ہر حال میں اللہ

---

[۱] صاحب کشف المحجوب نے آپ کا ذکر تبع تابعین میں کیا ہے لیکن حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ معروف صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس اعتبار سے حضرت حبیب کا ذکر تابعین میں ہونا چاہئے تھا کہ کسی صحابی کی صحبت سے مشرف ہونے والا بزرگ اصطلاحاً تابعی کہلاتا ہے۔ (مترجم)

سے راضی رہنا اور لوگوں سے بے نیاز رہنا) اور لامحالہ جو شخص حق تعالےٰ سے راضی ہو وہ مخلوق سے بے پرواہ ہوتا ہے اور کسی مردِ بزرگ کے لئے سب سے بڑا خزانہ یہی رضاء الٰہی ہے اور اس میں خدائے عزوجل کے ساتھ غنی ہونے کی طرف اشارہ ہے پس جو شخص ذاتِ حق تعالےٰ کے ذریعہ غنی ہوتا ہے وہ غیر اللہ سے بے نیاز ہی ہوتا ہے اور اس کی درگاہ کے علاوہ کسی کے دروازے کا راستہ نہیں جانتا اور ظاہر و باطن میں اس کے علاوہ کسی کو نہیں پکارتا ——— مشائخ میں سے ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حضرت ابو حازمؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت آپ سو رہے تھے میں تھوڑی دیر ٹھہرا کہ آپ بیدار ہوئے اور مجھ سے فرمایا "کہ ابھی میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تمہارے لئے پیغام دیتے ہوئے فرمایا کہ ماں کے حقوق کی حفاظت کرنا حج ادا کرنے سے بہتر ہے اس لئے لوٹ جا اور ماں کی دلجوئی کر" میں وہیں سے واپس لوٹ آیا اور مکہ مکرمہ کی طرف نہ گیا ——— اس سے زیادہ کوئی کلام میں نے آپ سے متعلق نہیں سنی۔

حضرت محمد بن واسع رحمۃ اللہ تعالےٰ

اور انہی تبع تابعین میں سے اہل مجاہدہ کے داعی اور مشاہدات میں ہمیشہ قائم رہنے والے حضرت محمد بن واسع رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔ آپ کے دور میں آپ کا ہم مرتبہ بزرگ نہ تھا۔ آپ نے تابعین رحمہم اللہ میں سے بہت سے حضرات کی صحبت کا شرف پایا تھا اور مشائخ متقدمین میں سے ایک گروہ کے ساتھ ملاقات کی تھی۔ آپ طریقت میں کامل حصہ رکھتے تھے طریقت کے حقائق میں بہت اعلیٰ خیالات اور کامل اشارات آپ سے ثابت ہیں ——— اور آپ سے ہی آتا ہے کہ آپ نے فرمایا "مَا رَأَیْتُ شَیْئًا اِلَّا وَرَاَیْتُ اللّٰہَ فِیْہِ" (میں نے کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی جس میں اللہ تعالےٰ کو نہ دیکھا ہو) یہ مقام مقامِ مشاہدہ ہے کہ بندہ فاعل حقیقی کی محبت میں اُس مقام تک پہنچ جاتا ہے کہ جب اُس کے کسی بھی فعل پر نظر کرتا ہے تو فعل کو نہیں دیکھتا بلکہ صرف فاعل کو دیکھتا ہے جیسا کہ کوئی شخص کسی تصویر کو دیکھتے ہوئے مصور کو دیکھتا ہے اور اس کلمہ کی حقیقت پیغمبر خدا حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام

کے قول کی طرف لوٹتی ہے کہ انہوں نے چاند سورج اور ستارے کے بارے میں کہا کہ "ھذا ربی"۔ (یہ میرا رب ہے) اور یہ چیز محبت کے غلبہ کی وجہ سے تھی کہ جس چیز کو بھی دیکھتے اس کو اپنے محبوب کی صفت پر دیکھتے تھے کیوں کہ جب دوستانِ الٰہی نگاہ کرتے ہیں تو تمام جہان کو اللہ تعالیٰ کے قہر سے مغلوب اور اس کی حاکمیت کے تابع دیکھتے ہیں اور تمام موجودات میں اُن کے فاعل حقیقی کی قدرت کے متلاشی ہوتے ہیں اور ممکن کی تکوین کو معدوم سمجھتے ہیں جب نگاہِ شوق سے اس میں دیکھتے ہیں تو مغلوب کو نہیں بلکہ غالب کو دیکھتے ہیں اور مفعول کو نہیں بلکہ فاعل کو دیکھتے ہیں اور مخلوق کو نہیں خالق کو دیکھتے ہیں — اور ہم اس مسئلہ کو باب مشاہدہ میں انشاء اللہ بیان کریں گے۔

اور اس مقام پر ایک گروہ مغالطہ میں مبتلا ہوا ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ حضرت محمد بن واسعؒ نے جو کہا ہے کہ "رائیتُ اللّٰہ فیہِ"۔ (میں نے اس چیز میں حق تعالیٰ کو دیکھا) یہ مکان حق تعالیٰ کے لئے تجزیہ اور حلول کا تقاضہ کرتا ہے اور یہ بات صریح کفر ہے اس لئے کہ مکان متمکن کی جنس ہوتا ہے اگر کوئی شخص اس قول کو اس تقدیر پر مانے کہ مکان مخلوق ہے تو مکین بھی مخلوق ہونا چاہیئے۔ اور اگر اس تقدیر پر مانے کہ متمکن قدیم ہے تو مکان کو بھی قدیم ماننا پڑے گا اس طرح اس قول سے دو فساد لازم آئیں گے یا تو مخلوق کو قدیم ماننا پڑتا ہے یا خالق کو حادث اور یہ دونوں باتیں کفر ہیں۔ لیکن حقیقت اس طرح نہیں بلکہ آپ کا اشیاء کو اس طرح دیکھنا اس معنی میں ہے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اشیاء میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی آیات اور براہین دیکھنا مراد ہے — اور اس میں بڑے لطیف رموز ہیں جنہیں ہم اپنی جگہ پر بیان کریں گے انشاء اللہ۔

حضرت امام اعظم ابو حنیفہؓ رحمۃ اللہ تعالیٰ

اور انہی میں سے اماموں کے امام اہل سنت وجماعت کے مقتداء، فقہاء کے باعث شرف

ؓ صاحب کشف المحجوبؒ نے امام اعظم حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا شمار تبع تابعین رحمھم میں کیا ہے لیکن یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت انس رضی اللہ کی ملاقات اور زیارت کا شرف آپ کو حاصل ہے اس اعتبار سے آپ کا شمار حضرات تابعین رحمھم میں ہوتا ہے لہٰذا آپ کا تذکرہ اس سے قبل باب میں ہونا چاہیئے تھا۔ (مترجم)

اور علماء کے لئے نشانِ عزت حضرت ابو حنیفہ نعمان بن ثابت الخراز رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں مجاہدات اور عبادات میں آپ بڑے صاحب استقامت تھے اور اس طریقت کے اصولوں میں بڑی بلند شان کے مالک تھے۔ آپ نے ابتدائی زندگی میں خلوت نشینی کا ارادہ فرمایا تھا اور لوگوں سے الگ ہو کر بالکل تنہا رہنا چاہا تھا کیونکہ آپ نے اپنے دل کو دنیاوی ریاست اور طلبِ جاہ سے بالکل پاک کر لیا اور اپنے دل کو حق کے لئے اچھی طرح سنوار لیا تھا حتیٰ کہ ایک رات آپ نے خواب دیکھا کہ آپ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک ہڈیوں کو آپؐ کی قبر منور میں اکٹھا کر رہے ہیں اور اُن میں سے بعض کو بعض سے چُن رہے ہیں۔ آپ اس خواب کی ہیبت سے بیدار ہوئے اور امام محمد بن سیرینؒ کے اصحاب میں سے ایک کے پاس جا کر اس خواب کی تعبیر دریافت کی۔ انہوں نے تعبیر بیان کی کہ آپ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم نبوت اور آپؐ کی سنت کی حفاظت میں بڑے بلند مرتبہ و مقام پر پہنچیں گے اور اس میں پوری مہارت حاصل کر کے صحیح احادیث کو ضعیف روایات سے جدا کریں گے ——— آپؒ نے پھر دوبارہ خواب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں" اے ابو حنیفہ! اللہ تعالےٰ نے تمہاری زندگی کو میری سُنت کے زندہ کرنے کے لئے بنایا ہے۔ گوشہ نشینی کا ارادہ نہ کرو"———

آپ ابراہیم بن ادھم، فضیل بن عیاض داؤد طائی، بشر حافی رحمہم اللہ اجمعین اور اسی طرح کے مشائخ طریقت کے بڑوں بزرگوں میں سے بہت سے حضرات کے استاد تھے۔

علماء میں یہ بات مشہور رہی ہے کہ خلیفہ ابو جعفر منصور نے یہ تدبیر کی کہ حضرت امام ابو حنیفہ، حضرت امام سفیان ثوری حضرت امام صلہ بن اشیم اور حضرت امام شریک رحمہم اللہ اجمعین میں سے کسی ایک کو قاضی مقرر کیا جائے کیوں کہ یہ چاروں حضرات اپنے دور کے بڑے عالم سمجھے جاتے تھے۔ خلیفہ نے آدمی بھیج کر ان چاروں حضرات کو دربار میں بلوایا۔ جب یہ دربار کی طرف جا رہے تھے تو راستے میں حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ میں ہر ایک کے لئے دربار جانے کے بارے میں فراست سے ایک بات کہتا ہوں" انہوں نے کہا ٹھیک ہے، فرمائیے! تب آپ نے فرمایا میں تو ایک حیلہ کے ذریعہ اس عہدۂ قضا کو اپنے

سے ہٹاؤں گا۔ اور صلہؒ اپنے آپ کو دیوانہ بنا لے، اور سفیان بھاگ جائے گا اور شریکؒ قاضی بن جائے گا۔ چنانچہ حضرت سفیان ثوری تو موقع پا کر راستہ سے ہی بھاگ گئے اور ایک کشتی میں داخل ہو کر کشتی والوں سے کہا کہ مجھے چھپا لو میرا سر کاٹنا چاہتے ہیں۔ اور آپ نے یہ پیغمبر علیہ السلام کی اس حدیث کی تاویل کے طور پر کہا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ مَنْ جُعِلَ قاضیاً فقد ذُبِحَ بغیر سکین" (جو شخص قاضی بنا یا گیا تو گویا وہ بغیر چھری کے ذبح کر دیا گیا) چنانچہ ملاح نے آپ کو کشتی میں چھپا لیا۔ باقی ان تینوں ائمہ کرام کو خلیفہ کے دربار میں لے گئے۔ خلیفہ نے سب سے پہلے حضرت امام ابو حنیفہؒ سے کہا کہ آپ کو قاضی ہونا چاہیئے۔ آپ نے جواب دیا "اے امیر! میں ایک عجمی نسل کا آدمی ہوں عربی نہیں بلکہ ان کے غلاموں میں سے ہوں لہٰذا سرداران عرب میرے احکام پر راضی نہ ہوں گے"۔ خلیفہ نے کہا۔ اس عہدے کا نسب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں بلکہ اس کا تعلق علم سے ہے اور علم کے اعتبار سے آپ اس دور کے تمام علماء پر مقدم ہیں" آپؒ نے فرمایا میں اس کام کے لائق نہیں ہوں اور اس قول میں اگر میں سچا ہوں تو واقعی قضا کے لائق نہیں اور اگر جھوٹا ہوں تو جھوٹے آدمی کو مسلمانوں کی قضاء کے لئے نہیں ہونا چاہیئے" اور آپ کو جو خلیفہ وقت ہیں کسی جھوٹے آدمی کو اپنا قاضی نہیں بنانا چاہیئے اور نہ ہی مسلمانوں کے مال، خون اور شرمگاہوں سے متعلق اس پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔" آپ نے یہ کہا اور عہدۂ قضا سے نجات حاصل کر لی۔ بعد ازیں حضرت صلہؒ منصور کے سامنے آئے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے "آپ کیسے ہیں؟ اور آپ کے فرزندوں اور جانوروں کا کیا حال ہے؟ منصور نے کہا "یہ تو دیوانہ ہے اسے باہر نکال دو۔ پھر شریکؒ سے کہا۔ آپ کو قضاء کی خدمت سرانجام دینی چاہیئے! آپ نے جواباً فرمایا کہ میں سودائی مزاج کا آدمی ہوں اور میرا دماغ کمزور ہے اس لئے میں اس عہدہ کی ذمہ داریاں پوری نہ کر سکوں گا۔ خلیفہ منصور نے کہا" مقوی اور موافق غذاؤں اور خوشبو دار پھلوں کے جوس سے علاج کیجئے تاکہ آپ کی عقل تیز اور مضبوط ہو جائے۔ پھر عہدۂ قضا ان کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد حضرت ابو حنیفہؒ نے آپ کو چھوڑ دیا اور پھر کبھی آپ سے بات نہ کی۔ اور یہ سب کچھ آپ کے ہر شخص کے بارے

ہیں سچی فراست۔ خود صحت و سلامتی کی راہ پر چلنے۔ مخلوق کو اپنے سے دور کرنے لوگوں کے نزدیک مرتبہ والی چیز پر مغرور نہ ہوتے دین لور کامل الحال ہونے کی واضح علامت ہے اور آپ کی یہ حکایت اس بات کی قوی دلیل ہے کہ لوگوں سے کنارہ کش رہنا ہی صحت و سلامتی کا موجب ہے کہ ان تینوں بزرگوں نے کسی نہ کسی حیلہ کے ذریعہ مخلوق کو اپنے آپ سے دور کر دیا۔ لیکن آج کے عام علماء اس معاملہ کے منکر ہیں کیوں کہ وہ خواہشات نفس سے آرام پاتے ہیں اور حق کے راستے سے بھاگ گئے ہیں۔ اور امراء کے دروازوں کو اپنے لئے قبلہ اور ظالموں کے درباروں کو اپنے لئے بیت المعمور اور جابر لوگوں کے دسترخوان کو اپنے لئے مقام قاب قوسین کی طرح قابل تعظیم بنا لیا ہے اور جو کوئی بھی اُن کی خواہشات کی مخالفت کرے وہ اُس سے انکار کر دیتے ہیں۔۔۔۔۔ ایک دفعہ میرے قیام غزنی (اللہ اس کی حفاظت کرے) کے دوران امانت اور علم کے مدعی ایک شخص نے دعویٰ کیا کہ گدڑی پہننا بدعت ہے۔ میں نے کہا "حشیش اور دبیقی جو بالکل ریشمی کپڑے ہیں جن کا استعمال کرنا مردوں کے لئے حرام محض ہے اور پھر ظالموں کے مطلق حرام مال سے منت اور زاری کر کے حاصل کرنا اور بھی زیادہ موجب حرمت بن جاتا ہے لیکن تم اس طرح حرام مال سے حرام طریقہ سے لیا ہوا کپڑا تو بے تکلف پہن لیتے ہو اور یہ نہیں کہتے کہ یہ بدعت ہے تو پھر حلال رقم سے خریدے ہوئے حلال کپڑے کو کیوں کہتے ہو کہ یہ بدعت ہے اگر رعونتِ طبع اور نفس کی گمراہی تم پر مسلط نہ ہوتی تو اس طرح کی کمزور باتیں نہ کرتے لیکن ریشمی کپڑا عورتوں کے لئے حلال اور مردوں کے لئے حرام اور دیوانوں پر مباح ہے اگر تم ان دونوں میں سے کسی ایک کا اقرار کرو پھر تو تم معذور ہو پس ہم ناانصافی سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

حضرت امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت نوفل بن حیان رحمۃ اللہ نے وفات پائی تو میں نے خواب دیکھا کہ قیامت بپا ہے اور تمام لوگ حساب گاہ میں کھڑے ہیں۔ میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ حوض کوثر کے کنارے کھڑے ہیں اور آپ کے دائیں بائیں بہت سے مشائخ کھڑے ہیں اور ایک نیک صورت بوڑھے شخص کو دیکھا جس نے اپنے سر کے سفید بال چھوڑ رکھے تھے وہ اپنے رخسار کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے رخسار مبارک پر رکھے ہوئے تھا

اور اُن کے برابر میں حضرت نوفلؒ کو دیکھا۔ جب انہوں نے مجھے دیکھا تو میری طرف آئے اور مجھے سلام کیا۔ میں نے کہا مجھے پانی دیجئے! انہوں نے فرمایا" میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلی مبارک سے اشارہ فرمایا کہ پانی دے دو۔ تو انہوں نے مجھے پانی دیا۔ میں نے اُس میں سے خود بھی پیا اور اپنے ساتھیوں کو بھی پلایا لیکن اُس پیالہ میں سے کچھ بھی کم نہ ہوا۔ میں نے پوچھا اے نوفل! پیغمبر علیہ السلام کی داہنی جانب بوڑھے بزرگ کون ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ حضرت ابراہیم خلیل صلوات اللہ علی نبینا وعلیہ ہیں۔ اور آپؐ کی بائیں جانب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ اسی طرح میں پوچھتا جاتا تھا یہاں تک کہ سترہ آدمیوں کے متعلق میں نے دریافت کیا۔ جب میں بیدار ہوا۔ تو میرے ہاتھ پر سترہ کا عدد گرہ کیا ہوا تھا ـــــ اور حضرت یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خواب میں دیکھا تو آپ کی خدمت میں عرض کیا" یا رسول اللہ! اَیْنَ اَطْلُبُکَ" (یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ کو کہاں تلاش کروں؟) تو آپؐ نے فرمایا۔ عِنْدَ عِلْمِ اَبِی حَنِیْفَۃ" (ابوحنیفہ کے علم کے پاس مجھے تلاش کرو!) اور پرہیزگاری و تقویٰ میں آپ کے بہت سے طریق اور بے شمار مناقب مشہور ہیں۔ یہ کتاب اُن کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

اور میں علی بن عثمان الجلابی رحمۃ اللہ ملک شام میں مؤذن رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے روضہ مبارک پر سو رہا تھا کہ خواب کی حالت میں اپنے آپ کو مکہ مکرّمہ میں موجود پایا اور دیکھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم باب بنی شیبہ سے اندر تشریف لائے اور ایک بوڑھے شخص کو اس طرح اپنی بغل میں لے رکھا ہے جس طرح شفقت سے بچوں کو بغل میں لیتے ہیں۔ میں دوڑ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے گیا اور آپؐ کے پاؤں مبارک کی پشت پر بوسہ دیا۔ اور میں اس تعجب میں تھا کہ یہ بوڑھے بزرگ کون ہیں؟ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم معجزہ کے طور پر میرے باطن اور میری سوچ پر مطلع ہو گئے اور مجھے کہا کہ یہ تمہارے ملک کے مسلمانوں کے امام ابوحنیفہ ہیں (رحمۃ اللہ علیہ) مجھے اور میرے ہم وطنوں کو اس خواب میں اپنے امام کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پہلو میں دیکھ کر بڑی امید

ہوئی اور اس خواب سے مجھ پر یہ بھی واضح ہوا کہ ہمارے امام اُن بلند مرتبہ لوگوں میں سے ہیں جو اوصاف طبع سے فانی اور احکام شریعت سے باقی اور شریعت کے ساتھ قائم ہیں اس لئے کہ اوصافِ طبع سے آپ کو نکال کر لے جاتے والے خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ اور اگر وہ خود جانے والے ہوتے تو باقی الصفۃ ہوتے اور باقی الصفت مخطی ہوتا ہے یا مصیب! لیکن جب کہ اُن کو لے جانے والے خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس لئے وہ فانی الصفت ہیں اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی صفتِ بقا کے ساتھ باقی ہیں اور جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے خطا کا صدور ناممکن ہے تو جو شخص آپ کے ساتھ قائم ہو گا اس سے بھی خطا سرزد نہ ہو سکے گی اور یہ ایک لطیف رمز ہے یعنی جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کا تعلق اتنا گہرا ہے تو آپ کے اجتہاد میں بھی خطا نہ ہو گی چنانچہ دوسرے مجتہدین مخطی بھی ہو سکتے ہیں اور مصیب بھی لیکن حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ اپنے اجتہاد میں مصیب ہی ہوں گے۔

اور بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ نے علم حاصل کیا اور اپنے دور کے مقتدا اور علماء کے سردار بن گئے تو حضرت ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوچھا کہ میں اب کیا کروں؟ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ نے فرمایا۔ عَلَیْکَ بِالْعَمَلِ فَاِنَّ الْعِلْمَ بِلَا عَمَلٍ کَالْجَسَدِ بِلَا رُوْحٍ "تجھ پر لازم ہے کہ علم کے مطابق عمل کرو کیوں کہ بغیر عمل کے علم اس طرح بیکار ہے جیسے جسم بغیر روح کے" اور اے داؤد طائیؒ میں تجھ پر قربان ہو جاؤں جب تک عمل کے ساتھ علم ملا ہوا نہ ہو نہ عمل صاف ہوتا ہے اور نہ ہی زندگی میں خلوص پیدا ہوتا ہے۔ اور جو شخص صرف علم پر قناعت کر لیتا ہے وہ حقیقت میں عالم ہی نہیں ہوتا کیوں کہ عالم کے لئے مجرد علم پر قناعت نہیں ہوتی اس لئے کہ علم خود عمل کا متقاضی ہوتا ہے اور جیسا کہ ہدایت خود بخود مجاہدے کا تقاضہ کرتی ہے اور جس طرح مشاہدہ بغیر مجاہدہ کے نہیں ہو سکتا اسی طرح علم بغیر عمل کے نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ علم عمل کی جڑ ہے۔ اور علم کی کشائش اور اس کا تمام تر نفع عمل کی برکت سے ہی ہوتا ہے اور کسی طرح بھی علم کو عمل سے جدا نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ آفتاب سے اُس کی روشنی کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔

اور کتاب کی ابتداء میں علم کے باب میں مختصر طور پر اس کا بیان ہم کر چکے ہیں اور توفیق اللہ سے ہی ہے ـــــــ

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ تعالیٰ

زاہدوں کے سردار اور اوتاد کے قائد حضرت عبداللہ بن مبارک المروزی رحمہ اللہ بھی تبع تابعین میں تصوف کے ائمہ میں سے تھے۔ آپ اس قوم کے ذی حشمت۔ شریعت و طریقت کے احوال و اقوال و اسباب کے عالم اور اپنے دور کے بہت بڑے امام تھے۔ آپ نے بہت سے مشائخ کا زمانہ پایا اور ان سے ہم نشینی کا شرف حاصل کیا تھا۔ علوم کے ہر شعبے میں آپ کی تصنیفات موجود ہیں اور آپ کی کرامات مشہور ہیں۔ آپ کی توبہ کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ آپ ایک کنیزک (باندی۔ چھوٹی لڑکی) کے فتنہ محبت میں مبتلا تھے۔ ایک رات اپنے ساتھیوں میں سے اٹھے اور ایک ساتھی کو ساتھ لے کر اپنی معشوقہ کی دیوار کے نیچے جا کر کھڑے ہو گئے وہ منڈیر پر آئی اور دونوں ایک دوسرے کے مشاہدے میں محو کھڑے رہے یہاں تک کہ جب نماز فجر کی آذان سنی تو یہ سمجھے کہ یہ نماز عشاء کی آذان ہے لیکن جب دن روشن ہوا تو معلوم ہوا کہ محبوبہ کے دیدار اور مشاہدہ میں پوری رات مستغرق رہے ہیں۔ اس بات سے آپ کو تنبیہ ہوئی اور اپنے آپ سے کہنے لگے کہ اے مبارک کے بیٹے! تمہیں شرم آنی چاہئے کہ آج کی پوری رات تو نفسانی خواہش کے لئے پاؤں پر کھڑا رہا ہے اور پھر بھی تو عزت چاہتا ہے لیکن اگر امام نماز کے دوران ذرا لمبی سورت پڑھ لے تو دیوانہ ہو جاتا ہے اس نفسانی خواہش کے دعویٰ کے ہوتے ہوئے تو ایمان کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہے؟ چنانچہ اسی وقت توبہ کی اور علم اور طلب علم میں مشغول ہو گئے اور زہد و دیانت اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ ایسے بلند مقام پر پہنچے کہ ایک دفعہ آپ کی والدہ نے باغ میں آپ کو دیکھا کہ آپ سوئے ہیں اور ایک بہت بڑا سانپ ریحان کی ٹہنی منہ میں لئے ہوئے آپ پر سے مکھیاں ہٹا رہا ہے۔ اس کے بعد آپ نے مرو سے کوچ کیا اور بغداد آ کر ایک مدت تک مشائخ کی صحبت میں رہے پھر کچھ عرصہ مکہ مکرمہ میں رہنے کے بعد واپس مرو تشریف لے آئے۔ شہر کے تمام باشندوں نے

آپ کے ساتھ عہد کیا اور آپ کے لئے درس اور مجلس کی مسند مقرر کی۔ اُن دنوں شہر کے آدھے لوگ تو حدیث کے ظاہری معانی کی متابعت کرتے تھے اور آدھے رائے اور قیاس سے بھی کام لیتے تھے۔ لیکن آپ وہاں اس طرح رہے کہ لوگ آپ کو آج تک "رضی الفریقین" (فریقین میں مقبول) کہتے ہیں کیوں کہ آپ کا طرز عمل دونوں فریقوں کے موافق تھا، اور ہر مشرب کے لوگ آپ کے بارے میں اپنا ہم مشرب ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ آپ نے وہاں دو رباط (مسند علم) بنائے تھے ایک خاص اہل حدیث کے لئے اور دوسرا خاص اہل رائے کے لئے یہ دونوں مکان اپنے قاعدہ کے مطابق آج تک قائم ہیں۔ لیکن کچھ عرصہ یہاں قیام کے بعد آپ دوبارہ حجاز واپس تشریف لے گئے اور وہاں قیام اختیار کیا۔ ایک مرتبہ آپ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ عجائبات میں سے آپ نے کیا کیا دیکھا ہے؟ آپ نے فرمایا میں نے ایک پادری کو دیکھا کہ مجاہدات کی کثرت کی وجہ سے کمزور ہو چکا تھا اور خوفِ الٰہی سے اس کی پشت میں خم آگیا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا "یا راهِبُ کیف الطریق الی اللہ (اے راہب اللہ تعالےٰ کی طرف راستہ کس طرح حاصل ہوتا ہے؟) تو اُس نے جواب دیا کہ لَوْ عَرَفْتَ اللہَ لعَرَفْتَ الطَّرِیْقَ اِلَیْہِ فقال اَعْبُدُ مَن لَا اَعْرِفُہٗ وتعصی مَنْ تَعْرِفُہٗ" (اگر تو اللہ تعالےٰ کو پہچان چکا ہے تو اس کی طرف کا راستہ بھی پہچان لیا۔ پھر کہا کہ میں اُس کی پرستش کرتا ہوں جسے نہ میں جانتا ہوں اور نہ پہچانتا ہوں اور تو اُس کی نافرمانی کرتا ہے جسے تو پہچانتا ہے) یعنی معرفت خداوندی تو اس سے خوف کا تقاضہ کرتی ہے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تو اُس سے بے خوف ہے اور اس کی ذات سے انکار جہالت کا مقتضی ہے اور میں اپنے آپ کو اُس سے خائف پاتا ہوں —— آپ نے فرمایا یہ بات میرے لئے نصیحت ہو گئی اور اس نے مجھے بہت سے نامناسب امور سے باز رکھا —— اور آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "السکونُ حرامٌ علیٰ قلبِ اولیائہٖ" (اللہ تعالےٰ کے دوستوں کے دل پر آرام وسکون حرام ہے) کیوں کہ دنیا میں وہ حالت طلب میں مضطرب اور آخرت میں حالت خوشی کے لئے بے چین رہتے ہیں۔ اس لئے دنیا میں تو انہیں حق تعالیٰ سے دوری کے خیال کی وجہ سے آرام نصیب نہیں ہوتا۔ اور آخرت میں حق تعالےٰ کے دربار کی حاضری اور اس کے

دیدار کی تجلیات کی وجہ سے اُن کے لئے آرام جائز نہیں پس اُن کے لئے دنیا تو آخرت کی طرح ہے کیوں کہ دلی اطمینان دو چیزوں کا تقاضا کرتا ہے مقصد میں کامیابی یا مقصد سے غفلت ـــ اور مقصد کا حصول اور اس میں کامیابی تو دنیا و عقبے میں روا نہیں تاکہ محبت کی خلش سے آرام حاصل ہو اور غفلت اُس کے دوستوں پر حرام ہے کہ دل طلب کی حرکات سے ساکن ہو جائے۔ اور یہ قول اہل تحقیق کے ہاں ایک بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ تعالٰی

اور انہی میں سے اہل حق کے بادشاہ اور بارگاہِ وصل الٰہی کے شاہنشاہ حضرت ابو علی فُضَیل بن عیاض رحمۃ اللہ بھی ہیں۔ آپ کا شمار صوفیاء کے بزرگوں اور حقیقی درویشوں میں ہوتا ہے۔ آپ طریقت کے معاملات اور حقائق میں بہت بڑے حصہ اور بلند مقام کے حامل تھے۔ آپ طریقت کے اُن مشہور بزرگوں میں سے ایک تھے جن کی تمام فریق تعریف کرتے ہیں اور آپ کے احوال صدق اور اخلاص سے معمور تھے۔ آپ عمر کے ابتدائی حصہ میں مرو اور ماورد کے درمیان راہزنی اور ٹھگی کیا کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ کی طبیعت نیکی کی طرف ہر وقت مائل اور راغب رہتی تھی اور آپ طبعاً بڑے صاحب ہمت اور جوانمرد تھے چنانچہ جس قافلہ میں کوئی عورت موجود ہوتی تو آپ اسکے قریب میں بھی نہ جاتے اور جس کے پاس سرمایہ کم ہوتا اُس کا سامان بھی نہ چھینتے بلکہ ہر شخص کے پاس کچھ نہ کچھ سرمایہ باقی رہنے دیتے یہاں تک کہ خسرو سے ایک سوداگر سفر کے لئے چلنے لگا تو لوگوں نے اسے کہا کہ فضیل راستہ میں ہے اس لئے کوئی حفاظتی دستہ ساتھ لے لو۔ اُس نے کہا میں نے سُنا ہے کہ وہ ایک خداترس آدمی ہے چنانچہ اسنے قرآن کے ایک قاری کو اُجرت پر لے لیا اور اُسے اونٹ پر بٹھا لیا جو راستہ میں رات دن قرآن مجید کی تلاوت کرتا رہا یہاں تک کہ جب قافلہ فضیل کی کمین گاہ کے مقام تک پہنچا تو اتفاقاً اس وقت قاری یہ آیت پڑھ رہا تھا "اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ" "کیا ایمان والوں کے لئے ابھی وہ وقت قریب نہیں آیا کہ اُن کے دِل اللہ تعالٰی کے ذکر کے لئے گڑگڑا اٹھیں" یہ سنتے ہی آپ کے دل پر رقت

طاری ہو گئی اور آپ کے جسم وجان پر اللہ تعالےٰ نے اپنے غلبہ کو ظاہر کر دیا اور آپ نے اس شغل سے توبہ کر لی اور جن لوگوں کا مال آپ لوٹ چکے تھے ان سب کا سامان لوٹا دیا اور انہیں ہر طرح سے راضی کر کے آپ مکہ مکرمہ کی طرف تشریف لے گئے اور ایک عرصہ تک وہاں قیام کیا اور اس دوران بعض اولیاء اللہ سے ملاقات کا شرف بھی حاصل کیا۔ اس کے بعد آپ کوفہ واپس آگئے اور ایک طویل مدت تک حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کی صحبت اختیار کی فنِ حدیث کے جاننے والوں میں آپ کی روایات بڑی قابل قدر اور بیحد مقبول ہیں اور تصوف و معرفت میں بھی آپ کا کلام بہت بلند ہے آپؒ ہی کے بارے میں روایت ہے کہ آپؒ نے فرمایا "مَن عَرَفَ اللّٰہ حق معرفتہٖ عَبدہٗ بکل طاقتہٖ (جس نے اللہ تعالےٰ کو اس طرح پہچان لیا جیسا کہ اس کو پہچاننے کا حق ہے تو وہ پوری طاقت کے ساتھ اس کی عبادت کرتا ہے) کیونکہ جو بھی اس کو پہچانتا ہے اُس کے انعام و احسان اور اس کی رحمت و مہربانی سے پہچانتا ہے اور جب اس طرح پہچان لیتا ہے تو اس کو دوست بنا لیتا ہے اور جب اس کے ساتھ دوستی اختیار کرتا ہے تو اپنی پوری طاقت اُس کی اطاعت میں صرف کر دیتا ہے۔ کیونکہ دوستوں کے فرمان پر عمل کرنا دشوار نہیں ہوتا۔ پس جس شخص کی دوستی جتنی زیادہ ہوتی ہے اُتنی ہی اُس کی اطاعت پر حرص زیادہ ہوتی ہے اور دوستی میں اضافہ معرفت کی حقیقت کی وجہ سے ہی ہوتا ہے جیسا کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات اُٹھے اور میرے حجرے سے کہیں باہر تشریف لے گئے مجھے گمان گزرا کہ شاید کسی دوسری زوجہ محترمہ کے حجرہ میں تشریف لے گئے ہیں چنانچہ میں اٹھی اور آپ کے محسوس اثرات پر چلتی رہی یہاں تک کہ میں مسجد میں پہنچ گئی اور وہاں میں نے آپ کو نماز میں کھڑے پایا کہ آپ مسلسل رو رہے ہیں یہاں تک کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ آئے اور انہوں نے نماز فجر کے لئے اذان دی اور جب آپ نماز فجر ادا کر کے حجرہ میں تشریف لائے تو میں نے دیکھا کہ آپؐ کے دونوں پاؤں مبارک پر ورم آیا ہوا ہے اور انگلیوں کے سرے پھٹے ہوئے ہیں اور اُن سے زرد رنگ کا پانی بہہ رہا ہے، میں رو پڑی اور عرض کیا "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے تو اگلے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے گئے ہیں۔ پھر آپ اتنی تکلیف

کیوں برداشت کرتے ہیں۔ چھوڑیئے یہ کام تو وہ شخص کرتا ہے جو اپنی عاقبت کے بارے میں امن میں نہ ہو۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عائشہؓ! یہ سب اللہ عز وجل کا لطف وفضل ہے تو اَفَلَا اَکُوْنَ عَبْدًا شَکُوْرًا" (کیا میں اس کا شکرگزار بندہ نہ بن جاؤں) جب اُس نے اپنا کرم مجھ پر فرمایا اور مجھے بخشش کا مژدہ سُنا دیا ہے تو تمہارا کیا خیال کہ مجھے اُس کی بندگی نہیں کرنی چاہیئے اور اپنی طاقت کے مطابق اُس کی نعمتوں کا استقبال نہیں کرنا چاہیئے۔

——— اور نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو معراج کی رات پچاس نماز قبول کرلیں اور انہیں گراں نہیں سمجھا یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کہنے پر لوٹ کر بارگاہ الٰہی میں حاضر ہوئے اور پانچ وقت کی نمازوں کا حکم لے کر واپس تشریف لائے۔ اس لئے کہ آپ کی طبیعت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کے فرمان کی کسی درجہ میں بھی مخالفت موجود نہ تھی۔ "لِاَنَّ الْمحبۃ ھِیَ الْموافقۃ" (کیونکہ محبت نام ہے دوست سے موافقت کا) ——— نیز حضرت فضیل رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "الدُّنیا دارالمرضیٰ وَالنَّاسُ فیھا مجانین وللمجانین فِی دارالمرضیٰ الغُلُّ والقید" (دنیا بیماروں کا گھر ہے اور لوگ اس میں دیوانوں کی طرح ہیں اور دیوانوں کے لئے بیماری کے گھر میں طوق اور بیڑیاں ہوئی ہیں) اور ہماری نفسانی خواہشات ہمارے طوق ہیں اور ہماری نافرمانیاں ہماری بیڑیاں ہیں۔ فضل بن ربیع روایت کرتے ہیں میں خلیفہ ہارون الرشید کے ہمراہ مکہ مکرمہ میں تھا۔ جب ہم حج ادا کر چکے تو خلیفہ نے مجھ سے پوچھا! کیا یہاں اولیاء اللہ میں سے کوئی موجود ہیں تاکہ میں اُن کی زیارت کروں؟ میں نے کہا ہاں حضرت عبدالرزاق صنعانی رحمۃ اللہ یہاں موجود ہیں خلیفہ نے کہا مجھے اُن کے ہاں لے چلو! چنانچہ ہم اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کچھ دیر ان کے ساتھ گفتگو میں مصروف رہے جب واپسی کا ارادہ کیا تو ہارون الرشید نے مجھے اشارہ کیا کہ ان سے پوچھو کہ کیا اُن کے ذمہ کوئی قرضہ ہے! میں نے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ہاں میں مقروض ہوں۔ خلیفہ نے وہ قرض ادا کرنے کا فرمان جاری کیا۔ جب وہاں سے نکلے تو خلیفہ نے کہا اے فضل! میرا دل اب بھی چاہتا ہے کہ میں ان سے بھی زیادہ بزرگ آدمی کی زیارت کروں۔ میں نے عرض کی کہ حضرت سفیان بن عینیہ رحمۃ اللہ یہاں موجود ہیں۔ خلیفہ

نے کہا کہ وہاں چلتے ہیں۔" ہم وہاں حاضر ہوئے کچھ دیر بات چیت کرنے کے بعد جب واپسی کا ارادہ کیا تو خلیفہ نے پھر مجھے اشارہ کیا تاکہ اُن کے قرضہ کے متعلق سوال کروں۔ میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ہاں میرے ذمہ قرضہ ہے۔ خلیفہ نے وہ بھی ادا کرنے کا فرمان جاری کر دیا۔ جب یہاں سے باہر آئے تو خلیفہ نے کہا اے فضل! ابھی تک میرا مقصد مجھے حاصل نہیں ہوا۔" میں نے عرض کی کہ مجھے یاد آیا کہ حضرت فضیل بن عیاض بھی یہاں موجود ہیں۔ چنانچہ میں خلیفہ کو حضرت فضیل کے پاس لے گیا وہ جھروکے میں بیٹھے قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے۔ ہم نے دروازے پر دستک دی انہوں نے پوچھا کون ہے؟ میں نے جواب دیا کہ امیر المومنین ہیں۔ انہوں نے فرمایا مالی ولامیر المومنین" (ہمیں امیر المومنین سے کیا سروکار ہے) میں نے کہا سبحان اللہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لَيْسَ لِلْعَبْدِ اَنْ يُذِلَّ نَفْسَهٗ فِی طَاعَةِ اللّٰهِ" (بندے کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اللہ تعالےٰ کی اطاعت میں اپنے نفس کو ذلیل کرے)" یہ سن کر آپ نے فرمایا" بلیٰ اَمَّا الرضاء عِزٌّ دائمٌ عند اھلہٖ" (یہ ٹھیک ہے لیکن اہل رضاء کے لئے رضا ہی ہمیشہ کی عزت ہے) تم اس کو میری ذلت سمجھتے ہو لیکن اللہ تعالےٰ کے حکم پر راضی رہنے کی وجہ سے اسی میں اپنی عزت سمجھتا ہوں اس کے بعد نیچے تشریف لائے دروازہ کھولا اور چراغ بجھا دیا۔ اور ایک کونے میں ہو کر کھڑے ہو گئے تو آپ نے فرمایا آہ اُس ہاتھ سے کہ جس سے زیادہ نرم ہاتھ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ یہ عذاب الٰہی سے بچ جائے! یہ سُنکر خلیفہ ہارون الرشید پر گریہ طاری ہو گیا حتیٰ کہ روتے روتے بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش آیا تو کہا اے فضیل" مجھے کوئی نصیحت فرمایئے آپ نے فرمایا اے امیر المومنین آپ کے دادا حضرت عباسؓ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے انہوں نے حضرت پیغمبر علیہ السلام سے درخواست کی تھی کہ مجھے ایک قوم پر امیر مقرر فرما دیجئے! حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا میں نے آپ کے ایک نفس کو آپ کے جسم پر امیر مقرر کر دیا ہے یعنی اللہ تعالےٰ کی اطاعت میں گزرنے والا آپ کا ایک سانس اس سے بہتر ہے کہ لوگ ہزار سال تک آپ کی اطاعت کریں۔ اِنَّ الامارۃ یومًا لقیامۃ النداامۃٌ" کیونکہ

امارت قیامت کے دن ندامت کا باعث ہوگی) خلیفہ ہارون الرشید نے عرض کی کہ کچھ اور نصیحت فرمائیے۔ آپ نے فرمایا "لوگوں نے جب حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ کو خلافت پر مقرر کیا تو آپ نے حضرت سالم بن عبداللہ، حضرت رجاء بن حیات اور محمد بن نصب القرضی رحمہم اجمعین کو بلاکر فرمایا کہ میں خلافت کی آزمائشوں میں مبتلا ہو گیا ہوں، میرے لئے کیا تدبیر ہے کیوں کہ میں تو اس کو اپنے لئے بڑی آزمائش سمجھتا ہوں حالانکہ دوسرے لوگ اسے نعمت سمجھتے ہیں؟ اُن میں سے ایک نے کہا اگر آپ کل قیامت کے دن اللہ تعالٰے کے عذاب سے بچنا چاہتے ہیں تو تمام بوڑھے مسلمانوں کو اپنے باپ کی طرح۔ اُن کے جوانوں کو اپنے بھائیوں کی طرح اور ان کے لڑکوں کو اپنے بیٹوں کی طرح جانئے اور اُن کے ساتھ ایسا معاملہ کیجئے جیسا گھر میں باپ بھائیوں اور بیٹوں کے ساتھ کیا جاتا ہے کیوں کہ یہ سارا اسلامی ملک آپ کے گھر کی طرح ہے اور اس میں رہنے والے آپ کے اہل وعیال ہیں۔" زُرْ اَبَاكَ وَاكْرِمْ اَخَاكَ وَاحْسِنْ عَلٰی وَلَدِكَ" (اپنے والد کی زیارت کر اپنے بھائی کی عزت کر اور اپنے بیٹے کے ساتھ حُسن سلوک کر) اس کے بعد حضرت فضیل بن عیاض نے فرمایا اے امیرالمومنین! میں ڈرتا ہوں کہ کہیں آپ کا یہ خوبصورت چہرہ دوزخ کی آگ میں گرفتار نہ ہو جائے۔ اس لئے خدا تعالٰے سے ڈرتے رہئیے اور اُس کا حق بہتر طور پر ادا کیجئے۔ اس کے بعد ہارون الرشید نے کہا کہ کیا آپ کے ذمہ کوئی قرضہ ہے"، فرمایا" ہاں" اللہ تعالٰے کا قرض میری گردن پر موجود ہے اور وہ اس کی اطاعت ہے اگر وہ مجھے اس سے متعلق پکڑے تو مجھ پر افسوس ہے۔ خلیفہ نے کہا "اے فضیل" میں لوگوں کے قرض سے متعلق بات کر رہا ہوں" تو آپ نے فرمایا کہ "حمد اور سپاس ہے خدائے عزوجل کے لئے کہ مجھے اُس کی طرف سے بہت سی نعمتیں میسر ہیں مجھے اُس سے کوئی گلہ نہیں کہ بندوں کے سامنے اس کا شکوہ کروں۔ ہارون الرشید نے ایک ہزار دینار کی ایک تھیلی نکال کر آپ کے سامنے رکھی اور کہا کہ اسے اپنے مصارف میں سے کسی مصرف میں استعمال کیجئے! حضرت فضیل نے فرمایا اے امیرالمومنین! میری نصیحتیں آپ پر کچھ بھی سود مند ثابت نہیں ہوئیں کہ آپ نے یہیں پر ظلم اور ناانصافی کا طرز عمل شروع کر دیا ہے' خلیفہ نے پوچھا! میں نے کون سی بے انصافی کی ہے؟ آپ نے فرمایا" میں تو آپ کو نجات کی طرف بلا رہا ہوں اور آپ مجھ کو مصیبت میں ڈال رہے ہیں۔ یہ ناانصافی نہیں تو کیا ہے؟ ——— یہ سُن کر ہارون الرشید

اور فضل دونوں روتے ہوئے باہر نکلے۔ ہارون نے مجھ سے کہا اے فضل بن ربیع! بادشاہ تو درحقیقت فضیل ہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ نے دنیا اور اہل دنیا سے منہ موڑ رکھا ہے۔ اور دنیا کی زیب و زینت کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اہل دنیا کے سامنے دنیا کے لئے کوئی تواضع نہیں کرتے۔ اور آپ کے مناقب اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ اُن کو احاطہ تحریر میں لایا جا سکے۔ واللہ اعلم۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ تعالیٰ

اور تحقیق و کرامت کے سفینہ اور شرفِ ولایت کے خزانہ حضرت ابوالفیض ذوالنون بن ابراہیم المصری رحمۃ اللہ بھی ائمہ تبع تابعین رحمہم اللہ اجمعین میں سے تھے۔ آپ کا تعلق ثوبی نسل کے ساتھ تھا اور آپ کا نام ثوبان تھا۔ آپ اپنی قوم کے منتخب لوگوں اور طریقت کے اُن باخبر بزرگوں میں سے تھے جو مصیبت پسندی اور ملامت کی راہ پر چلتے تھے۔ تمام اہل مصر آپ کی شان کے بارے میں حیران اور آپ کے احوال کو سمجھنے سے عاجز اور آپ کے مرتبے سے ناواقف تھے حتیٰ کہ آپ کی وفات تک آپ کے حال اور جمال کو کسی نے شناخت نہیں کیا۔ اور جس رات آپ دنیا سے رخصت ہوئے ستر افراد نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ فرما رہے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے دوست ذوالنون آ رہے ہیں میں اُن کے استقبال کے لئے آیا ہوں ——— اور جب آپ فوت ہوئے لوگوں نے آپ کی پیشانی پر یہ لکھا ہوا پایا کہ "ھٰذا حبیبُ اللّٰہِ مَاتَ فی حُبِّ اللّٰہ قتیلُ اللّٰہِ" (یہ اللہ کا پسندیدہ بندہ ہے جو اللہ کی محبت میں شہید مرا ہے) اور جب آپ کا جنازہ لوگوں نے اٹھایا تو پرندے آپ کے جنازے کے اُوپر مجتمع ہو گئے اور ایک دوسرے کے پَروں سے پَر ملا کر جنازے پر سایہ کر دیا۔ جب اہل مصر نے یہ دیکھا تو نادم ہوئے اور جو ظلم آپ پر ڈھائے تھے اُن سے توبہ کی ——— علوم کے حقائق میں آپ کے بہت سے انداز اور خوبصورت کلمات ہیں چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ "العارِفُ کُلَّ یومٍ اَخشعُ لِاَنّہٗ فی کُلِّ ساعۃٍ مِنَ الربِّ اَقربُ"۔ (عارف ہر روز زیادہ سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوتا ہے کیوں کہ وہ ہر ساعت اپنے رب سے قریب ہوتا ہے) اور جو شخص زیادہ نزدیک

ہوتا ہے لامحالہ اُس کی حیرت اور خشوع میں اضافہ ہوتا ہے اس لئے کہ حق تعالیٰ کی حکمرانی کی ہیبت سے وہ آگاہ ہوتا ہے اور اس کے دل پر حق تعالیٰ کا جلال غالب ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اُس سے دُور دیکھتا ہے اور اُس کے وصل کی کوئی صورت نہ پا کر خشوع وخضوع میں بڑھتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ صلوٰت اللہ علیہ نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنی ہمکلامی کے دوران یوں کہا یا رب اَیْنَ اَطْلُبُکَ؟ (اے اللہ میں آپ کو کہاں تلاش کروں؟) تو حق تعالیٰ نے جواب دیا "عِندَ المنکسرۃِ قلوبُھُم" (ٹوٹے ہوئے دلوں میں) جو اپنے اخلاص میں نا امید ہو چکے ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی "بارخدایا! کوئی بھی دل میرے دل سے زیادہ شکستہ اور نا امید نہیں، تو حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ "پس میں بھی تیرے ٹوٹے ہوئے دل میں ہوں"۔ پس خشوع وخضوع کے بغیر حق تعالیٰ کی معرفت کا دعویٰ کرنے والا جاہل ہے نہ کہ عارف! اور حقیقت معرفت کی علامت سچی ارادت ہے اور سچی محبت بندہ کے لئے تمام اسباب اور اللہ کے سوا تمام تعلقات کو توڑنے والی ہوتی ہے جیسا کہ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ "الصِّدْقُ سَیْفُ اللّٰہِ فِی اَرْضِہٖ مَا وُضِعَ عَلٰی شَیْءٍ اِلَّا قَطَعَہٗ" (سچائی اللہ تعالیٰ کی زمین میں اُس کی تلوار ہے کہ جس چیز پر رکھ دی جائے اس کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے) اور سچائی یہ ہے کہ مسبب الاسباب (حق تعالیٰ) پر نظر رکھی جائے نہ کہ اسباب پر۔ اور جب بندہ اسباب کی طرف دیکھتا ہے تو سچائی کا حکم ساقط ہو جاتا ہے ——— اور آپؒ سے متعلق حکایات میں میں نے دیکھا ہے کہ ایک روز اپنے رفقاء کے ہمراہ کشتی میں بیٹھے ہوئے تھے کہ سامنے سے ایک اور کشتی آ رہی تھی جس میں مصر کے کھیل کود کرنے والوں کی ایک جماعت (اتفاقی طائفہ) بیٹھی ہوئی تھی اور دریائے نیل میں اپنی عادت کے مطابق کھیل تماشے اور شور وغوغا میں مشغول تھے۔ آپ کے شاگردوں کو ان سے بڑی نفرت ہوئی اور عرض کرنے لگے "یا شیخ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو غرق کر دیں تاکہ ان کی نحوست لوگوں سے دور ہو جائے" حضرت ذوالنونؒ نے اپنے پاؤں پر کھڑے ہوئے اور اپنے ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے اور کہا بارخدایا! جس طرح اس گروہ کو اس دنیا میں آپ اچھی زندگی عطا فرمائی ہے اسی طرح آخرت میں بھی ان کو اچھی زندگی عطا فرما۔ آپ کی اس دعا سے تمام مرید حیران ہوئے تاہم جب وہ کشتی ذرا اور قریب آئی اور انہوں

نے حضرت ذوالنون رحمۃ اللہ کو دیکھا تو سب پر گریہ طاری ہو گیا اور آپ سے معذرت کرنے لگے اپنے ساز اور موسیقی کے آلات توڑ ڈالے اور توبہ کر کے اللہ تعالٰے کی طرف رجوع کر لیا۔ آپؒ نے اپنے شاگردوں سے فرمایا "آخرت کی اچھی زندگی اس جہان سے توبہ میں ہے تم نے دیکھا کہ سب کا مقصد پورا ہو گیا تم نے اور انہوں نے اپنی اپنی مراد کو پا لیا اسی طرح کہ کسی کو کوئی رنج بھی نہیں پہنچا۔ اس سچے مرشد کا یہ قول مسلمانوں پر اس کی کمال شفقت کا آئینہ دار ہے اور اس میں انہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کی ہے کہ باوجودیکہ کفار کی طرف سے آپؐ کے ساتھ بڑی جفا اور ظلم کیا گیا لیکن آپ اس پر رنجیدہ خاطر نہ ہوئے اور یہی کہتے رہے کہ " اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ "۔ (اے اللہ میری قوم کو ہدایت فرما کہ وہ مجھے جانتے نہیں) —— نیز حضرت ذوالنون سے روایت ہے کہ فرمایا میں مصر جانے کا ارادہ لئے بیت المقدس سے آ رہا تھا کہ راستہ میں دور سے آتے ہوئے ایک شخص کو میں نے دیکھا میں نے دل میں سوچ لیا کہ جب یہ میرے قریب پہنچ جائے گا تو میں اس سے ایک سوال کروں گا جب وہ نزدیک آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک بڑھیا ہے جس کے ہاتھ میں نوکدار لاٹھی ہے اور اس نے اونی جُبّہ پہن رکھا ہے میں نے اس سے پوچھا "مِنْ اَیْنَ" (کہاں سے آ رہی ہو) "قالت مِنَ اللّٰہِ (اس نے کہا اللہ کی طرف سے) میں نے پھر سوال کیا کہ اِلٰی اَیْنَ" (کہاں جا رہی ہو؟) اس نے جواب دیا: اِلَی اللّٰہِ۔ (اللہ کی طرف جا رہی ہوں) میرے پاس کچھ دینار تھے میں نے اسے دینے کے لئے وہ نکالے لیکن اُس نے ہاتھ کو جنبش دیتے ہوئے کہا "اے ذوالنون! تم نے جو میرے متعلق یہ صورت اختیار کی ہے یہ تمہاری عقل کی کمزوری کی وجہ سے ہے میں تو اللہ تعالٰی کے لئے ہی کام کرتی ہوں اور اُس کے علاوہ کسی سے کچھ نہیں لیتی۔ جس طرح کہ میں اُس کے سوا کسی کی پرستش نہیں کرتی اسی طرح اُس کے سوا کسی سے کچھ نہیں مانگتی۔ یہ بات کہہ کر وہ مجھ سے جُدا ہو گئی۔ اس حکایت میں ایک لطیف رمز ہے کہ اس بڑھیا نے جو یہ کہا کہ میں اس کے لئے ہی کام کرتی ہوں تو یہ اُس کی سچائی اور حق تعالٰے کے ساتھ اُس کی محبت کی دلیل ہے کیوں کہ لوگوں میں سے عمل کرنے والے لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں —— ایک وہ

جو کوئی عمل کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ حق تعالےٰ کے لئے کر رہے ہیں حالانکہ وہ اپنی ذات کے لئے کر رہے ہیں کہ اگرچہ اُن کی نفسانی خواہش تو اُس سے منقطع ہوتی ہے لیکن آخرت میں اُنہیں ثواب کے حصول کی ہوس ضرور ہوتی ہے ـــــــ اور دوسرے وہ کہ انہیں عالم آخرت کے ثواب وعقاب اور عالم دنیا کے دکھاوے اور ریاکاری سے کوئی سروکار نہیں ہوتا بلکہ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں حق تعالےٰ کے فرمان کی تعظیم کے لئے کرتے ہیں اور حق تعالےٰ کی محبت کے تقاضے کے پیش نظر اپنی غرض اور خواہش کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اور ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں سامانِ آخرت کے لئے کرتے ہیں اور یہ درست ہے اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی اطاعت میں اطاعت کرنے والے کو وہ وافر حصہ ملتا ہے جو اُس سے زیادہ ہوتا ہے جو کسی معصیت کرنے والے کو دنیا میں ملتا ہے کیوں کہ گناہوں کی لذت اور راحت ایک ساعت کے لئے ہوتی ہے اور اطاعت گذاری کی راحت ہمیشہ کے لئے ہوتی ہے ـــــــ اور لوگوں کے مجاہدات اور محنتوں سے حق تعالےٰ کو کیا فائدہ ہے اور اُن کے ترک سے کیا نقصان ہے؟ اگر تمام اہل عالم حق تعالیٰ کی تصدیق میں سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرح ہو جائیں تو اس کا نفع خود انہی کو حاصل ہوگا اور اگر حق تعالیٰ کی تکذیب میں سب کے سب فرعون کی طرح ہو جائیں تو اس کا نقصان بھی انہی کو ہوگا۔ جیساکہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے" اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَأْتُمْ فَلَهَا ط (اگر تم اچھائی کروگے تو اپنے لئے کروگے اور اگر کوئی برائی کروگے تو وہ بھی تمہارے لئے ہی ہوگی۔ نیز یہ بھی ارشاد ہے کہ وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ" اور جو شخص دین میں جدوجہد کرتا ہے تو وہ اپنے لئے ہی کرتا ہے کیوں کہ بے شک اللہ تعالیٰ تو بے پرواہ ہے جہان والوں سے) لوگ تو اپنے نیک اعمال کے ذریعہ اپنے لئے ابدی ملک یعنی جنت کی خواہش کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالےٰ کے لئے کر رہے ہیں لیکن اپنے آپ کو دوستی کے راستے پر چلانا ایک الگ چیز ہے کیوں کہ اس راہ کو اختیار کرنے والے حق تعالےٰ کے فرمان کی تعمیل میں دوستی کے معاملات کو ہی پیش نظر رکھتے ہیں اور اُن کی نگاہیں اس کے علاوہ کسی دوسری چیز پر نہیں ہوتیں۔ اور اس کتاب میں اس طرح کی اور باتیں ہم

انشاء اللہ باب الاخلاص میں بیان کریں گے۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ

سرداروں کے سردار اور لقاء الٰہی کی راہ کے سالک حضرت ابو اسحٰق ابراہیم بن ادھم منصور رحمہ اللہ بھی انہی تبع تابعین میں سے ایک ہیں۔ آپ اپنے دور میں طریقت کے یکتا اور اپنے ہمعصروں کے سردار تھے اور حضرت خضر علیہ السلام کے مرید تھے۔ بہت سے متقدمین مشائخ سے ملاقات کی تھی اور حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کی صحبت میں رہ کر علم حاصل کیا تھا۔ آپ ابتداء میں بلخ کے بادشاہ تھے ایک روز شکار کرتے ہوئے اپنے لشکر سے جدا ہو گئے اور ایک ہرن کے تعاقب میں دور تک نکل گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ہرن کو آپ کے ساتھ بات کرنے کی قدرت عطا فرمائی اور ہرن نے بڑی فصیح زبان میں آپ سے مخاطب ہو کر کہا اَلِھٰذا خُلِقْتَ اَمْ بِھٰذا اُمِرْتَ"۔ (کیا تو اس کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے یا اس کام کا تمہیں حکم دیا گیا ہے؟) آپ اس کی اس بات سے بے حد متاثر ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کی اور امور مملکت سے ہاتھ کھینچ لئے اور زہد اور پرہیز گاری کی زندگی اختیار کر لی۔ آپ نے حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ اور حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ سے شرفِ ملاقات حاصل کیا اور ان کی صحبت اختیار کی۔ پھر توبہ کر لینے کے بعد اپنے ہاتھ کی حلال کمائی کے علاوہ کچھ نہیں کھایا۔ آپ کے معاملات واضح اور کرامات مشہور ہیں اور تصوف کے حقائق میں آپ کے عجیب کلمات اور نفیس لطائف موجود ہیں۔ حضرت جنید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "مفاتیح العلوم ابراہیم" (حضرت ابراہیمؒ تمام علوم طریقت کی کنجی ہیں) اور آپ سے روایت کہ آپ نے فرمایا"

اتخذ اللہ صاحبًا وذرِ الناس جانبًا" (اللہ تعالیٰ کو اپنا دوست بنا اور لوگوں کو ایک طرف چھوڑ دے) اس کا مطلب یہ ہے کہ جب بندہ کی توجہ حق تعالیٰ کی طرف درست ہو اور حق تعالیٰ کی محبت میں وہ مخلص ہو تو یہ چیز مخلوق سے اعراض کرنے کا خود بخود تقاضہ کرتی ہے کیوں کہ مخلوق کی صحبت کا حق تعالیٰ کی باتوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اور محبت حق یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے فرمان کی بجا آوری میں اخلاص ہو اور اطاعت میں اخلاص درحقیقت

محبتِ حق سے ہی پیدا ہوتا ہے اور حق تعالیٰ کی محبت کا اخلاص اپنے نفس کی خواہشات کے ساتھ دشمنی کا نام ہے جو کوئی بھی اپنی خواہشات سے آشنا ہو۔ وہ حق تعالیٰ سے جُدا ہوتا ہے اور جو شخص خواہشات سے رشتہ توڑ دے وہ حق تعالیٰ کی محبت سے آرام پاتا ہے پس اپنے حق میں تو تو خود ہی تمام مخلوق ہے لہٰذا جب تو نے اپنے آپ سے ہی اعراض کر لیا تو گویا تمام مخلوق سے تو نے اعراض کر لیا۔ اور اگر تمام مخلوق سے تعلقات منقطع کرنے کے باوجود تو اپنی ذات کی طرف متوجہ رہا تو یہ تو ظلم ہے کیوں کہ تمام لوگ جس جس کام میں لگے ہوئے ہیں حکم خداوندی اور تقدیر کے سبب ہیں تیرا معاملہ تیری ذات کے ساتھ متعلق ہے اور طالبِ حق کے ظاہر و باطن کی استقامت دو چیزوں پر موقوف ہے۔ ایک کا تعلق پہچاننے سے ہے اور دوسری کا کرنے سے جو چیز پہچاننے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ تمام اچھائیوں اور برائیوں میں اللہ تعالےٰ کی تقدیر کو حق جانے کہ پوری دنیا میں حق تعالےٰ کی پیدا کی ہوئی حرکت کے بغیر کوئی ساکن متحرک نہیں ہو سکتا اور نہ ہی کوئی متحرک ساکن ہو سکتا ہے —— اور جو چیز کرنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ حق تعالےٰ کے احکام کو بجا لائے، معاملات کو درست رکھے اور حلال و حرام کی تمیز کرے کیوں کہ اس کی تقدیر کسی حالت میں بھی اُس کے فرمان کو ترک کرنے کے لئے حجت نہیں بن سکتی پس مخلوق سے اعراض اُس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک اپنی ذات سے بھی اعراض نہ کرے۔ اور جب تو اپنی ذات سے اعراض کر لے گا تو پوری مخلوق حق تعالیٰ کی مراد کے حصول کے لئے تیار ہو جائے گی۔ اور جب تو حق تعالےٰ کی طرف متوجہ ہو گا تو خود حق تعالیٰ کے احکام کو قائم کرنے کے لئے تیار ہو جائے گا۔ پس مخلوق کے ذریعہ آرام پانے کی تو کوئی صورت نہیں اور اگر حق کے سوا کسی اور چیز سے تو خلاصی پانا چاہے تو غیر سے خلاصی حاصل کر کیوں کہ غیر سے چھٹکارا حاصل کرنا توحید حق کو دیکھنا ہے اور اپنی ذات کے ساتھ آرام تعطل کو ثابت کرنا ہے اسی لئے حضرت شیخ ابوالحسن سالبہ رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ مرید کو کسی بلّی کے حکم میں رہنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ اپنے نفس کے تابع رہے کیوں کہ کسی غیر کی صحبت خدا تعالےٰ کے لئے ہوتی ہے اور اپنی صحبت اپنے نفس کی خواہشات کو پانے کے لئے ہوتی ہے اور اس معنی سے متعلق انشاء اللہ اس کتاب میں

اپنی جگہ پر مزید کلام کیا جائے گا۔

اور حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کی حکایات میں آتا ہے انہوں نے بیان کیا کہ جب میں جنگل میں پہنچا تو ایک بوڑھا شخص میرے پاس آیا اور مجھ سے کہا کہ اے ابراہیم! تم جانتے ہو کہ یہ کونسی جگہ ہے جس میں بغیر سامان سفر اور سواری کے چلے جا رہے ہو؟ آپ فرماتے ہیں کہ میں جان گیا کہ یہ شیطان ہے لہٰذا چاندی کے چار دانگ جو میں نے کوفہ میں ایک زنبیل بیچ کر حاصل کئے تھے اور میری جیب میں موجود تھے انہیں بھی جیب سے نکالا اور پھینک دیا اور میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ ہر میل پر چار سو رکعت نماز ادا کروں گا۔ چنانچہ میں چار سال تک اُس جنگل میں رہا اور اس عرصہ میں اللہ تعالےٰ وقت پر بے تکلف مجھے روزی پہنچاتے رہتے اور اسی دوران حضرت خضر علیہ السلام نے میرے ساتھ صحبت اختیار کی اور مجھے حق تعالےٰ کا اسم اعظم سکھایا اس وقت سے میرا دل مخلوق سے بالکل ہی بے نیاز ہو گیا ———— آپ کے مناقب بے شمار ہیں وباللہ التوفیق۔

حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ

معرفت کے تخت اور اہل معاملہ کے تاج حضرت بشر الحافی رحمۃ اللہ تعالیٰ بھی انہی تبع تابعین میں سے تھے مجاہدات میں آپ بڑی شان اور بلند برہان اور طریقت کے معاملات میں کامل نصیب کے مالک تھے۔ آپ کو حضرت فضیل بن عیاض کی صحبت حاصل رہی اور اپنے ماموں حضرت بوعلی بن حشرم رحمۃ اللہ کے مرید تھے اور آپ علم اصول و فروع کے زبردست عالم تھے آپ کی توبہ کی ابتداء یوں ہوئی کہ آپ مستی کی کیفیت میں کہیں جا رہے تھے کہ راستہ میں ایک کاغذ کا ٹکڑا پڑا پایا جس پر "بسم اللہ الرحمن الرحیم" لکھا تھا آپ نے بڑی تعظیم کے ساتھ اُسے اٹھایا اور عطر لگا کر ایک پاک جگہ پر رکھ دیا۔ اُسی رات خواب میں حق تعالےٰ کی زیارت ہوئی کہ وہ فرما رہے ہیں "یا بشر طیبت اِسمی فبعزتی لاُطیبن اِسمک فی الدنیا والآخرۃ" اے بشر! تو نے میرے نام کو خوشبو لگائی۔ مجھے اپنی عزت کی قسم میں تیرے نام کو دنیا اور آخرت میں خوشبودار کروں گا، یہاں تک کہ جب بھی کوئی تیرا نام سنے گا اپنے دل میں راحت محسوس کرے گا۔" آپ نے اُسی وقت توبہ کر لی اور زہد و عبادت کا راستہ اختیار کیا۔ اور مشاہدۂ حق کے غلبہ کی یہاں

تک شدت تھی کہ اپنے پاؤں میں کوئی چیز نہ پہنتے تھے لوگوں نے آپ سے اس کا سبب پوچھا تو فرمایا "کہ زمین اللہ تعالیٰ کا بچھایا ہوا بستر ہے اور میں جائز نہیں سمجھتا کہ اس کے فرش اور میرے پاؤں کے درمیان کوئی چیز حائل ہو ــــ اور یہ بات آپ کے معاملات کے عجائب میں سے ہے کہ اپنی ہمت کو حق تعالیٰ کے ساتھ مجمع کرنے میں جوتا بھی آپ کو حجاب نظر آیا آپ سے ہی روایت ہے کہ فرمایا "مَنْ اَرَادَ اَنْ یَکُوْنَ عَزِیْزًا فِی الدُّنْیَا وَشَرِیْفًا فِی الْاٰخِرَۃِ فَلْیَجْتَنِبْ ثَلَاثًا لَا یَسْأَلُ اَحَدًا حَاجَۃً وَّلَا یَذْکُرُ اَحَدًا بِسُوْءٍ وَّلَا یُجِیْبُ اَحَدًا اِلٰی طَعَامِہٖ"۔ (جو شخص دنیا میں صاحب عزت اور آخرت صاحب شرف بننے کا ارادہ رکھتا ہو اُسے چاہیئے کہ تین باتوں سے اجتناب کرے۔

۱۔ کسی سے بھی اپنی حاجت کے بارے میں سوال نہ کرے۔ ۲۔ ــــ کسی کو برائی کے ساتھ یاد نہ کرے، اور ــــ ۳۔ کھانے کی طرف کسی کا بلاوا قبول نہ کرے) کیونکہ جو شخص راہِ خدا سے واقف ہے مخلوق سے کسی حاجت کی طلب نہیں کرتا اس لئے کہ مخلوق سے حاجت طلب کرنا معرفت نہ ہونے کی دلیل ہے کہ اگر وہ قاضی الحاجات (حاجت روا) سے وابستہ ہوتا تو اپنی طرح کی مخلوق سے حاجت نہ مانگتا۔ لِاَنَّ اِسْتِعَانَۃَ الْمَخْلُوْقِ اِلَی الْمَخْلُوْقِ کَاسْتِعَانَۃِ الْمَسْجُوْنِ اِلَی الْمَسْجُوْنِ" (کیوں کہ مخلوق کا مخلوق سے مدد مانگنا ایسا ہے جیسے کہ ایک قیدی کا دوسرے قیدی سے مدد مانگنا) اور جو کوئی کسی کو بُرا کہتا ہے تو یہ خدا تعالیٰ کے حکم میں تصرف ہے کیوں کہ وہ شخص اور اُس کا فعل دونوں ہی اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو رد کرتا ہے گویا وہ حق تعالیٰ کو رد کرتا ہے کیوں کہ جو کسی فعل کو عیب دار کہے گا تو گویا اس نے فاعل کو عیب دار کیا۔ البتہ سوائے اس کے جو خود حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میری موافقت میں کفار کی مذمت کرو" باقی یہ جو فرمایا ہے کہ لوگوں کی دعوت طعام قبول کرنے سے پرہیز کرو تو یہ اس لئے کہ اصل رزق دینے والا تو خدا ہے اگر اُس نے مخلوق کو تیری روزی کا سبب بنا دیا ہے تو تُو اس سبب کو نہ دیکھ بلکہ جان لے کہ وہ تیری ہی روزی تھی جو خدا نے تجھے پہنچائی ہے نہ کہ اس سبب کی۔ اور اگر وہ شخص یہ سمجھتا ہو کہ وہ اس کی ملکیت ہے اور اس طرح وہ مجھ پر احسان کرتا ہے تو اُس کی دعوت قبول نہ کرو کیوں کہ روزی کے معاملہ میں کسی کا کسی پر ہرگز کوئی احسان نہیں۔ اسلئے کہ اہل سنت و جماعت

کے نزدیک روزی غذا ہے اور معتزلہ کے نزدیک ملکیت ہے۔ اور خدا تعالےٰ غذاؤں کے ذریعہ مخلوق کی پرورش فرماتے ہیں۔ اور اس قول کے جواز کے لئے ایک اور وجہ بھی ہے واللہ اعلم

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ

معرفت کے آسمان اور محبت خداوندی کی کشتی حضرت بایزید طیفور بن عیسیٰ بسطامی رحمۃ اللہ بھی بزرگ ترین تبع تابعین اور بڑے مشائخ میں شمار ہوتے ہیں آپ کا حال سب سے بڑا اور شان سب سے عظیم تھی یہاں تک کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ "بایزید منا بمنزلہ جبریل من الملئکۃِ" (ہم میں بایزید اسی طرح بلند مرتبہ ہیں جس طرح حضرت جبرئیل فرشتوں میں) آپ کے دادا مجوسی تھے اور والد بسطام کے بزرگوں میں سے تھے اور انہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں سے بہت روائتیں بیان کی ہیں اور آپ کا شمار تصوف کے دس بڑے اماموں میں ہوتا ہے۔ آپ سے قبل علم تصوف کے حقائق سے استنباط کی اتنی مہارت کسی کو حاصل نہ تھی جتنی کہ آپ کو حاصل ہوئی"۔ درحقیقت آپ تمام حالات میں علم دوست اور شریعت کی تعظیم کرنے والے تھے بخلاف اُس گروہ کے جو الحاد کی وجہ سے مردود تھا اور مصنوعی طور پر آپ کے ساتھ وابستگی کا دعویٰ کرتا تھا" آپ کا ابتدائی دور مجاہدات اور معاملاتِ طریقت میں ریاضت پر مشتمل تھا —— اور آپ سے روایت ہے کہ فرمایا" عَمِلْتُ فی المجاھدۃِ ثلثین سَنَۃً فَمَا وَجدتُ شیئًا اَشَدّ عَلَیَّ مِنَ العِلْمِ وَمتابعتِہٖ وَلَوْلَا اختلافُ العُلَمَاءِ لَبَقِیْتُ واختلاف العلماء رحمۃ اِلَّا تجریدِ التوحیدِ" (میں نے تیس سال کا عرصہ مجاہدہ میں گزارا پس میں نے علم اور اُس کی متابعت سے زیادہ سخت کوئی چیز نہیں دیکھی اور اگر علماء کے درمیان اختلاف نہ ہوتا تو دین کے تمام امور پر عمل کرنے سے میں قاصر رہتا اور مسئلہ توحید کے علاوہ دوسرے امور میں علماء کا اختلاف رحمت ہے) اور حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ انسانی طبیعت علم کی بجائے جہالت کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہے کیوں کہ جہالت میں بہت سے کام بغیر رنج کے کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن علم میں بغیر تکلیف کے ایک

قدم بھی نہیں رکھ سکتے۔ اور شریعت کی راہ اُس جہان کی پُل صراط سے بھی بہت زیادہ باریک اور بہت زیادہ پُرخطر ہے پس تمہیں چاہئے کہ تمام احوال میں اس طرح رہے کہ اگر بلند احوال اور عظیم مقامات سے تو رُک بھی جائے تو شریعت کے میدان کی طرف تو تیری توجہ برقرار رہے تاکہ اگر تمام معاملات تجھ سے جاتے بھی رہیں تو بھی عمل تو تیرے ساتھ رہ جائے اس لئے کہ مرید کے لئے سب سے بڑی آفت عمل کا ترک کرنا ہے اور جھوٹے دعویداروں کے تمام دعوے شریعت پر عمل کرنے کے مقابلے میں ہیچ ہیں اور تمام اہل زبان اس کی برابری سے عاری ہیں ——— نیز آپ سے روایت ہے کہ فرمایا "الجنة لاخطر لها عند اهل المحبة محجوبون بمحبتهم"۔ (اہل محبت کے نزدیک جنت کی کوئی وقعت نہیں اور اہل محبت اپنی محبت کی وجہ سے حجاب میں ہیں) اور حق تعالیٰ کی محبت کے سوا کوئی چیز اُن کے نزدیک نہیں آسکتی یعنی بہشت اگرچہ اعلیٰ درجہ کی مخلوق ہے لیکن محبت الٰہی اُس کی صفتِ قدیم ہے مخلوق نہیں۔ اور جو شخص غیر مخلوق کو چھوڑ کر مخلوق میں اُلجھ جاتا ہے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی۔ پس دوستانِ حق کے لئے مخلوق کی کوئی وقعت نہیں اور دوستان حق اس کی محبت میں محجوب ہیں کیوں کہ غیر کی محبت کا وجود دوئی کا تقاضہ کرتا ہے اور اصل توحید میں دوئی کا تصور غلط ہے اور دوستانِ حق کا راستہ واحدانیت کی طرف ہوتا ہے اور راہِ محبت میں یہ بات دوستی کے لئے نقصان دہ ہے کہ دوستی میں ایک مرید ہو اور دوسرا مراد۔ خواہ حق تعالیٰ مرید ہو اور بندہ مراد یا بندہ مرید ہو اور حق تعالیٰ مراد۔ اگر مرید حق تعالیٰ ہو اور مراد بندہ تو حق تعالیٰ کی مراد میں بندہ کی ہستی ثابت ہو گئی۔ اور اگر مرید بندہ ہو اور مراد حق تعالیٰ تو مخلوق کی طلب وارادت کو اس میں کوئی راہ نہیں ہوتا۔ اب اس مقام پر وجود کی آفت دونوں حالتوں میں باقی رہے گی۔ پس محب کا محبت کی بقاء میں فنا ہو جانا اس سے بہتر ہے کہ بقائے محبت کے سبب اُس کو فنا حاصل ہو ——— اور نیز آپ سے روایت ہے کہ فرمایا کہ ایک دفعہ میں مکہ میں تھا صرف خانہ کعبہ کو دیکھا تو میں نے کہا کہ حج تو قبول نہیں کیوں کہ اس طرح کے پتھر تو میں نے بارہا دیکھے ہیں۔ دوبارہ جب مکہ مکرمہ گیا تو خانہ کعبہ بھی دیکھا اور خداوند خانہ کعبہ

کی زیارت بھی کی تو میں نے کہا کہ اب بھی حقیقتِ توحید حاصل نہیں ہوئی جب تیسری دفعہ گیا تو صرف خداوند خانہ کعبہ کو دیکھا اور خانہ کعبہ کو نہ دیکھا تو میرے دل سے آواز آئی کہ اے بایزید! اگر تو اپنے آپ کو نہ دیکھے اور باقی تمام مخلوق کو دیکھ لے تو مشرک نہ ہوگا لیکن اگر تو نے تمام جہان کو تو نہ دیکھا اور اپنے آپ کو دیکھا تو تو مشرک ہوگا۔ اسی وقت میں نے توبہ کی اور نیز توبہ سے بھی توبہ کی۔ اور اپنی ہستی کو دیکھنے سے بھی توبہ کی۔ اور آپ کے حال کے صحیح ہونے میں یہ حکایت نہایت لطیف ہے اور اہلِ حال کے لئے عمدہ علامت ہے۔

حضرت حارث بن اسد رحمۃ اللہ علیہ

تمام فنون کے امام اور تمام شبہات کا پتہ لگا لینے والے حضرت ابو عبداللہ حارث بن اسد المحاسبی رحمۃ اللہ بھی تبع تابعین رحمہم میں سے اصول اور فروع کے بہت بڑے عالم اور اپنے دور میں تمام اہل علم کے لئے مرجع تھے۔ آپ نے اصول تصوف میں رغائب نام کی ایک کتاب تصنیف کی اور اس کے علاوہ بھی تمام فنون میں آپ کی بہت سی تصنیفات ہیں آپ بڑے بلند حال اور بزرگ ہمت اور اپنے دور میں بغداد کے شیخ المشائخ تھے آپ سے روایت بیان کرتے ہیں کہ فرمایا العلم بحرکات القلوب فی مطالعۃ القلوب اشرف من العمل بحرکات الجوارح (اپنے دل کی حرکات سے جہان کے پوشیدہ علوم حاصل کرنا اعضا کی حرکات سے عمل کرنے سے زیادہ شریف ہے) اس سے مراد یہ ہے کہ علم محل کمال ہے اور جہالت محل طلب! اور بارگاہ خداوندی میں علم جہالت سے بہتر ہے۔ کیونکہ علم انسان کو درجۂ کمال تک پہنچا دیتا ہے۔ اور بارگاہ الٰہی میں جہالت کا گزر بھی نہیں ہو سکتا۔ درحقیقت علم، عمل سے زیادہ بزرگ ہے کیوں کہ علم سے اللہ تعالےٰ کو پہچانا جا سکتا ہے اور عمل سے اُسے حاصل نہیں کیا جا سکتا اگر عمل کو علم کے بغیر اس کی بارگاہ میں رسائی ہو سکتی تو نصاریٰ اور اُن کے پادری اپنے سخت مجاہدوں کے سبب مشاہدہ الٰہی کی منزل میں داخل ہو جاتے اور گنہگار مومن راہِ حق سے دور رہتے۔ پس عمل بندے کی صفت ہے اور علم حق تعالیٰ کی ـــــ اس قول کے بعض راویوں کو غلطی واقع ہوئی

اور انہوں نے دونوں جگہ لفظ عمل کو بیان کر دیا اور یوں کہا کہ "العمل بحرکاتِ القلوبِ اشرف من العملِ بحرکاتِ الجوارح" (دل کی حرکات سے عمل کرنا اعضا کی حرکات سے عمل کرنے سے زیادہ بہتر ہے) حالانکہ یہ محال ہے بندہ کا عمل صرف دل کی حرکات سے ہی متعلق نہیں ہوتا البتہ اگر اس سے تفکر اور احوالِ باطن کا مراقبہ مراد لیتے ہوں تو کوئی تعجب نہیں کیوں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "تَفَکُّرُ ساعَۃٍ خیرٌ مِن عبادۃِ ستین سَنَۃٍ" (دل میں ایک ساعت کے لئے غور و فکر کرنا ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے) اور در حقیقت اسی اعتبار سے دل کے اعمال کو اعضا کے اعمال سے زیادہ فضیلت حاصل ہے اور باطن کے احوال و افعال کی تاثیر ظاہری اعمال سے زیادہ کامل ہوتی ہے اسی لئے کہتے ہیں کہ "نومُ العالِم عبادۃٌ وسہرُ الجاھلِ معصیۃٌ" (عالم کی نیند بھی عبادت ہے اور جاہل کی بیداری بھی معصیت ہے) کیوں کہ عالم کا دل خواب اور بیداری دونوں حالتوں میں مغلوب ہوتا ہے اور جب دل مغلوب ہو تو جسم بھی مغلوب اور تابعدار ہوتا ہے پس دل کا غلبہ حق سے مغلوب ہونا مجاہدہ کی وجہ سے نفس کے ظاہری حرکات پر غلبے سے بہتر ہے ——— نیز آپ سے روایت ہے کہ آپ نے ایک روز ایک درویش سے فرمایا: "کُن للّٰہِ وَاِلّا فَلَا تَکُن" (خداوند تعالےٰ کے لئے ہو جاؤ ورنہ پھر کچھ بھی نہ رہو) یعنی باقی رہنا ہے تو حق تعالےٰ کے ساتھ باقی رہو یا پھر اپنے وجود سے فانی ہو جاؤ۔ یعنی یا تو صفائی قلب سے اپنی خاطر مجتمع رکھ اور یا فقر سے اپنے آپ کو پریشان۔ یا تو اس صفت کے ساتھ متصف رہ کہ جو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "اُسْجُدُوا لِآدَمَ" (آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو) یا پھر اس صفت کے ساتھ متصف رہو کہ "ھَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّھْرِ لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا" (انسان پر ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے کہ وہ عالم ہستی میں قابلِ ذکر چیز نہ تھا) اگر تو اپنی مرضی سے اللہ تعالےٰ کے لئے ہو جائے گا تو تیرا وجود بذات خود قائم رہے گا اور اگر تو اپنے اختیار سے نہ ہوگا تو تیرا قیام حق تعالےٰ کے ساتھ ہوگا اور یہ معنی بہت لطیف ہیں۔ واللہ اعلم۔

حضرت داؤد ابن طائی رحمۃ اللہ

مخلوق سے قطع تعلق کرنے والے اور طلب جاہ سے بچنے والے امام ابو سلیمان حضرت داؤد ابن طائی رحمۃ اللہ بھی تبع تابعین میں سے تھے آپ اپنے دور کے مشائخ کبار اور اہل تصوف کے سرداروں میں شمار ہوتے ہیں اور اپنے زمانہ کے بے نظیر انسان تھے۔ آپ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کے شاگرد اور حضرت فضیل وحضرت ابراہیم ادھم رحمہما وغیرہ کے ہمعصر اور طریقت میں حضرت حبیب راعیؒ کے مرید تھے۔ تمام علوم میں کافی دسترس اور بلند درجہ کے مالک تھے خصوصاً فقہ میں تمام فقہا زمانہ کے امام مانے جاتے تھے آپ نے گوشہ نشینی اختیار کی اور ریاست چھوڑ کر زہد و تقویٰ کا راستہ اپنا لیا تھا۔ آپ کے مناقب بہت ہیں اور فضائل کا بہت چرچا ہے کیوں کہ آپ طریقت کے معاملات کے عالم اور حقائق کے بیان کرنے میں کامل مہارت رکھتے تھے روایت ہے کہ آپ نے ایک مرید سے فرمایا ——— اِنْ اَرَدْتَ السَّلَامَۃَ سَلِّمْ عَلَی الدُّنْیَا وَاِنْ اَرَدْتَ الْکَرَامَۃَ کَبِّرْ عَلَی الْآخِرَۃِ۔" (اگر تو سلامتی کا خواہاں ہے تو دنیا کو سلام کہہ دے اور اگر بزرگی چاہتے ہو تو آخرت پر تکبیر موت پڑھ دو) یعنی دنیا و آخرت دونوں ہی محل حجاب ہیں اور ہر قسم کی فراغت اِن دو چیزوں سے ہی وابستہ ہے لہٰذا جو شخص بدن سے فراغت چاہتا ہو تو اُسے چاہیے کہ وہ دنیا سے کنارہ کش ہو جائے اور جو شخص دل سے فارغ ہونا چاہتا ہو تو اُسے کہہ دو کہ وہ آخرت کی محبت اپنے دل سے نکال باہر کرے ———

حکایات میں آپ کے متعلق آتا ہے کہ آپ امام محمد بن حسن شیبانیؒ سے اکثر میل ملاقات کا سلسلہ رکھتے لیکن امام قاضی ابو یوسفؒ سے بہت کم تعلق رکھتے تھے۔ آپ سے دریافت کیا گیا کہ یہ دونوں بزرگ علم میں بڑے درجہ کے حضرات ہیں آپ ان میں سے ایک کو کیوں عزیز رکھتے ہیں اور دوسرے کو اپنے پاس نہیں آنے دیتے؟ جواب میں فرمایا اس لئے کہ محمد بن حسنؒ دنیا اور اُس کی تمام نعمتوں کو چھوڑ کر علم میں داخل ہوئے ہیں چنانچہ آپ کا علم دین کی عزت اور دنیا کی ذلت کا سبب ہے اور قاضی ابو یوسفؒ درویشی اور ذلت کو چھوڑ کر علم میں داخل

ہوئے ہیں اور علم کو اپنی عزت اور عہدہ کے لئے سبب بنایا ہے۔ اس لئے محمد بن حسن خلوص میں امام ابو یوسف سے بلند مرتبہ ہیں —— اور حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے کسی شخص کو نہیں دیکھا کہ اس کی نگاہوں میں دنیا اس قدر حقیر ہو جتنی کہ حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ کی نظر میں۔ کہ دنیا اور دنیا دار کی آپ کے نزدیک کچھ بھی قدر نہ تھی لیکن فقراء کو آپ بڑی ہی وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے خواہ وہ بظاہر کتنے ہی مصیبت زدہ کیوں نہ ہوں اور آپ کے مناقب بے شمار ہیں —— واللہ اعلم

حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ

اور انہی تبع تابعین میں سے اہل حقائق کے شیخ اور جملہ علائق دنیا سے بے نیاز حضرت ابوالحسن سری بن مغلس السقطی رحمۃ اللہ بھی ہیں۔ آپ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ کے ماموں تھے۔ اور تصوّف میں آپ عظیم شان کے مالک تھے آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مقامات کی ترتیب اور احوال کی وضاحت میں غور فرمایا عراق کے مشائخ میں سے بہت سے بزرگ آپ کے مرید ہیں۔ آپ کو حضرت حبیب راعی رحمۃ اللہ کو دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی اور آپ سے صحبت کا شرف بھی حاصل ہوا۔ آپ حضرت معروف کرخیؒ کے مرید تھے۔ آپ بغداد کے بازار میں کباڑی کی دکان کرتے تھے جب بغداد کا بازار جل کر خاکستر ہو گیا تو لوگوں نے آپ کو اطلاع دی کہ آپ کی دکان جل گئی۔ فرمایا "چلو اس کی فکر سے تو فارغ ہوئے"۔ لیکن جب لوگوں نے وہاں جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ارد گرد کی تمام دکانیں جل چکی ہیں لیکن آپ کی دکان محفوظ ہے، آپ نے خود تشریف لا کر جب یہ حالت دیکھی تو اپنا تمام سامان درویشوں میں تقسیم کر دیا اور خود تصوف کا راستہ اختیار کر لیا —— آپ سے ایک دفعہ لوگوں نے پوچھا کہ شروع میں آپ کی حالت کیا تھی؟ فرمایا کہ ایک دن حضرت حبیب راعی رحمۃ اللہ میری دکان پر سے گزرے میں نے روٹی کے ٹکڑے انہیں دیئے کہ وہ درویشوں میں تقسیم کر دیں تو انہوں نے مجھے کہا۔ "خیرک اللہ" (اللہ تجھے بھلائی دے) بس جس دن سے میرے ان کانوں نے ان کی یہ دعا سنی ہے احوال دنیا سے بیزار ہو گیا ہوں اور دنیا سے چھٹکارا حاصل کر لیا ہے —— آپ سے ہی روایت

ہے کہ فرمایا " اللھم ھما عذبتنی بہ شئ فلا تعذ بنی بذل الحجاب " اے اللہ! اگر مجھے کسی چیز سے آپ عذاب دیں تو حجاب کی ذلت سے عذاب نہ دیں، کیوں کہ جب میں حجاب میں نہ ہوں گا تو تیرے ذکر اور مشاہدہ کی وجہ سے ہر قسم کی سختی مجھ پر آسان ہو جائے گی اور جب میں تجھ سے حجاب میں ہوں گا تو تجھ سے حجاب کی وجہ سے دنیا کی نعمتیں بھی میرے لئے ہلاکت کا باعث ہوں گی۔ پس جو مصیبت، مشاہدۂ محبوب کے اندر ہو وہ مصیبت نہیں ہوتی۔ بلکہ مصیبت تو وہ نعمت ہوتی ہے جو محبوب سے حجاب میں ہو اور دوزخ میں کوئی مشقت حجاب سے زیادہ سخت اور تکلیف دہ نہ ہوگی کیونکہ اگر اہل دوزخ کو دوزخ میں حق تعالیٰ کے دیدار کی سعادت نصیب ہوئی تو گنہگار مومنین کو کبھی بھی جنت یاد نہ آتی کیونکہ دوزخ میں بھی دیدار الٰہی سے ان کی جان کو اس قدر خوشی نصیب ہوتی کہ بدن کی مصیبت اور جسم کے عذاب کی ان کو خبر تک نہ ہوتی اور جنت میں بھی کوئی نعمت دیدار خداوندی سے زیادہ کامل نہیں کیونکہ اگر جنت کی تمام نعمتیں بلکہ سو گنا زیادہ بھی حاصل ہوں لیکن وہ خداوند تعالےٰ سے حجاب میں ہوں تو وہ ہلاک ہو جائیں اور ان کے دل سے زندگی ختم ہو جائے۔ پس اللہ تعالےٰ کی سنت یہی ہے کہ وہ دل کے تمام احوال میں اپنے دوستوں کو اپنی ذات کے بارے میں بینا رکھتے ہیں تاکہ تمام مشقتیں ریاضتیں اور بشریت کی تمام آزمائشیں وہ آسانی سے برداشت کر سکیں۔ تو لامحالہ اس حال میں ان کی دعائیں یہی ہوتی ہیں کہ اے باری تعالےٰ تیرے تمام عذاب ہمیں تیرے حجاب کی نسبت زیادہ پسندیدہ ہیں۔ کیونکہ جب تیرا جمال ہمارے دلوں میں جلوہ نما ہو تو ہمیں مصیبتوں کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا ——— واللہ اعلم

حضرت شفیق بن ابراہیم الازدی رحمۃ اللہ

اور انہی تبع تابعین میں سے اہل بلا و مصیبت کے سالار اور زہد و تقویٰ کے سرمایہ حضرت ابو علی شفیق بن ابراہیم الازدی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔ آپ اپنی قوم کے معززین ان کے مقتدا، اور شریعت، طریقت اور حقیقت کے جملہ علوم کے عالم تھے۔ علم تصوف میں آپ کی بہت سی تصانیف ہیں۔ آپ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کے ہم صحبت

تھے اور بہت سے مشائخ کی زیارت اور ان کی صحبت کا شرف حاصل تھا۔ آپ سے روایت آتی ہے کہ فرمایا "جعل اللہ اھل طاعتہ احیاء فی مماتھم واھل المعاصی اموات فی حیوتھم (اللہ تعالیٰ اہل الطاعت کو اُن کی موت کے بعد بھی زندہ کر دیتے ہیں اور اہلِ معصیت کو ان کی زندگی میں ہی مردہ بنا دیتے ہیں) یعنی خدا تعالیٰ کی اطاعت کرنے والا اگرچہ مر جائے۔ زندہ ہوتا ہے کیونکہ اس کی فرمانبرداری پر فرشتے اُسے ہمیشہ آفرین کہتے ہیں اور اس کو ہمیشہ ثواب ملتا رہتا ہے۔ پس وہ اپنی موت کے بعد بھی ہمیشہ ملنے والی جزا کی وجہ سے باقی رہتا ہے۔ آپ کے متعلق ہی روایت کرتے ہیں کہ آپ کے پاس ایک بوڑھا شخص آیا اور کہنے لگا۔ اے شیخ میں بہت گنہگار ہوں اور چاہتا ہوں کہ گناہوں سے توبہ کر لوں آپ نے فرمایا کہ تو نے بہت دیر کر دی "بوڑھے نے کہا کہ میں تو بہت جلدی آگیا ہوں" آپ نے پوچھا وہ کیسے؟ اُس نے کہا "جو کوئی اپنی موت سے پہلے توبہ کے لئے آجائے اگرچہ دیر بعد آئے وہ جلدی ہی آنے والا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ آپ کی توبہ کی ابتداء یوں ہوئی کہ ایک سال بلخ شہر میں قحط پڑا اور لوگ ایک دوسرے کو کھانے پر آمادہ ہو گئے۔ تمام مسلمان بڑے غمگین تھے۔ آپ نے ایک غلام کو دیکھا کہ وہ بازار میں ہنس رہا ہے اور خوشی کا اظہار کر رہا ہے۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ تمام مسلمان غم و اندوہ میں مبتلا ہیں لیکن تو خوشی کا اظہار کر رہا ہے تجھے شرم نہیں آتی؟۔ وہ کہنے لگا کہ مجھے کسی طرح کا کوئی غم نہیں کیونکہ میں ایسے شخص کا غلام ہوں جو ایک پورے گاؤں کا مالک ہے اور اس نے میرے دل سے تمام اندیشوں کو اٹھا دیا ہے "حضرت شفیق رحمۃ اللہ نے کہا، اے میرے خُدا! یہ غلام اپنے اس مالک پر اتنا خوش ہو رہا ہے جو صرف ایک گاؤں کا مالک ہے اور آپ تو تمام جہان کے مالک ہیں اور ہمیں روزی پہنچانے کا آپ نے ذمہ لے رکھا ہے پھر بھی ہم نے اپنے دلوں میں اس قدر غموں کو کیوں جگہ دے رکھی ہے؟ یہ کہہ کر آپ نے دنیا کے تمام معاملات کو چھوڑ کر طریقت کا راستہ اختیار کر لیا اور اس کے بعد کبھی بھی روزی کا غم اپنے دل میں پیدا نہیں ہونے دیا۔ آپ فخریہ فرمایا کرتے تھے کہ میں تو ایک غلام کا شاگرد ہوں اور میں نے جو کچھ پایا ہے اسی سے حاصل کیا ہے" اور آپ یہ انکساری کے طور پہ کہتے تھے۔ اور آپ کے مناقب بہت ہیں۔ اور توفیق،

تو اللہ تعالےٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے ۔

حضرت عبدالرحمٰن الدارانی رحمۃ اللہ علیہ

اور انہی میں سے اپنے وقت کے شیخ اور راہِ حق کے مردِ یکتا حضرت ابو سلیمان عبدالرحمٰن بن عطیہ الدارانی رحمۃ اللہ بھی ایک ہیں۔ آپ اپنی قوم کے معزز اور ان کے دلوں کی راحت تھے۔ آپ اپنے مجاہدات اور ریاضات کی وجہ سے اپنے گروہ میں مخصوص تھے۔ آپ عصری علوم کے عالم اور آفاتِ نفس کے عارف اور نفس کی کمین گاہوں سے اچھی طرح خبردار تھے۔ معاملاتِ تصوف، دلوں کی حفاظت اور اعضا کی نگہداشت میں آپ کا کلام بڑا لطیف ہے۔ آپ سے روایت ہے کہ فرمایا" اذا غلب الرجاء علی الخوف فسد الوقت" (جب امید خوف پر غالب ہو جائے تو عارف کا وقت خراب ہو جاتا ہے) کیونکہ حال کی رعایت کا نام وقت ہے۔ پس بندہ جس وقت تک اپنے حال کی نگہداشت کرتا رہتا ہے اس کے دل پر خوف طاری رہتا ہے اور جب اُٹھ جاتا ہے تو وہ احوال کی نگرانی کو ترک کر دیتا ہے اور اس کا وقت فاسد ہو جاتا ہے اور اگر خوف اس کی امید پر غالب ہو جائے تو اس کی توحید باطل ہو جاتی ہے اس لئے کہ خوف کا غلبہ نا امیدی کی وجہ سے ہوتا ہے اور حق تعالےٰ سے نا اُمیدی شرک ہے۔ پس توحید کی حفاظت بندہ کی امید کے صحیح ہونے پر منحصر ہے اور وقت کی حفاظت اس کے خوف کی صحت پر موقوف ہے۔ لہٰذا جب خوف اور امید دونوں برابر ہوں تو توحید اور وقت دونوں محفوظ رہتے ہیں اور بندہ توحید کی حفاظت کی بناء پر صاحبِ ایمان ہوتا ہے اور وقت کی حفاظت کے سبب مطیع و فرمانبردار رہتا ہے اور امید کا تعلق صرف مشاہدۂ حق سے ہے کہ اس میں مکمل اتحاد ہے اور خوف کا تعلق صرف مجاہدہ سے کہ اس میں مکمل اضطراب ہے اور مشاہدہ مجاہدہ کی میراث ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ تمام امیدیں نا اُمیدی سے ہی پیدا ہوتی ہیں اور جو شخص اپنے کردار کی وجہ سے اپنی کامیابی سے نا اُمید ہو جائے تو یہ نا اُمیدی ہی اس کو نجات، فلاح اور حق تعالےٰ کے کرم کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور اس کے چہرے پر خوشی کا دروازہ کھول دیتی ہے اور اس کے دل کو طبیعت کی

تمام خرابیوں سے صاف کر دیتی ہے اور اس پر اسرار الٰہی کے تمام دروازے کھل جاتے ہیں
حضرت احمد بن لابی الحواری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک رات میں خلوت میں نماز پڑھ رہا تھا
کہ مجھے اس نماز میں بڑی ہی راحت محسوس ہو رہی تھی۔ جب میں نے دوسرے روز حضرت ابو سلیمان
رحمۃ اللہ کے سامنے اپنی اس کیفیت کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا:۔ کہ تم کمزور آدمی ہو ابھی
تک مخلوق تیرے پیش نظر ہے اس لئے خلوت اور جلوت میں تمہاری حالتیں مختلف ہیں حالانکہ
دونوں جہان میں کسی چیز کی یہ طاقت نہیں کہ بندہ کو حق تعالےٰ سے روک رکھے جس طرح دلہن کو
لوگوں کے سامنے اس لئے دکھاتے ہیں کہ تمام لوگ اس کو دیکھ لیں گے اور اس طرح اس کی
عزت میں اضافہ ہو۔ لیکن اُسے خود ایسا نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ اگر وہ اپنے مقصود کے علاوہ
کسی اور کو دیکھے گی تو اس کا دیدار اس کو ذلیل کر دے گا۔ اسی طرح اگر تمام مخلوق فرمانبرداری
اطاعت کو عزت کی نگاہ سے دیکھے تو اسے کوئی نقصان نہیں ہوتا لیکن اگر وہ خود اپنی اطاعت کو
غرور کی نگاہ سے دیکھے تو ہلاک ہو جائے گا۔ اور اس حالت سے ہم اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔

حضرت معروف بن فیروز الکرخی رحمۃ اللہ

اور انہی میں سے رضائے خداوندی کی درگاہ سے تعلق رکھنے والے اور حضرت علی بن
موسیٰ الرضا رحمۃ اللہ کے تربیت یافتہ حضرت ابو المحفوظ معروف بن فیروز الکرخی رحمۃ اللہ
بھی ہیں۔ آپ متقدمین اور مشائخ کے سرداروں میں سے ہیں۔ آپ پرہیزگاری میں
مشہور اور تقویٰ ورجوع الی اللہ میں معروف ہیں۔ آپ کا ذکر ترتیب کے اعتبار
سے مقدم ہونا چاہیئے تھا لیکن میں نے پہلے دو بزرگوں کی موافقت میں اس جگہ پر
آپ کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک تو صاحب نقل حضرت شیخ مبارک ابو عبدالرحمٰن
سلمی رحمۃ اللہ ہیں کہ ان کی کتاب اسی ترتیب پر ہے اور دوسرے صاحب تصرف
حضرت استاد امام ابوالقاسم القشیری رحمۃ اللہ ہیں کہ ان کی کتاب کے شروع میں بھی
آپ کا ذکر اسی ترتیب پر ہے۔ میں نے اس مقام پر آپ کا تذکرہ اس لئے لکھ دیا ہے
کہ آپ حضرت سرّی سقطی رحمۃ اللہ کے استاد اور حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ کے مرید

تھے۔ زندگی کے ابتدائی دور میں آپ دین سے بیگانہ تھے پھر حضرت علی بن موسیٰ الرضا رحمۃ اللہ کے ہاتھ پہ آپ نے اسلام قبول کیا اور ان کے نزدیک آپ بڑے عزیز اور پسندیدہ تھے۔ آپ کے فضائل و مناقب بہت ہیں اور آپ علم کے تمام فنون میں صوفیا کے مقتداء شمار ہوئے ہیں۔ اور آپ سے روایت ہے کہ فرمایا" للفتیان ثلاث علامات وفاء بلا خلاف ومدح بلا جود وعطاء بلا سوال" (جوانمردوں کی تین نشانیاں ہیں۔

(۱) خلاف ورزی کے بغیر وعدہ پورا کرنا۔ (۲) کسی لالچ اور طمع کے بغیر مستحق کی تعریف کرنا اور۔ (۳) مانگے بغیر محتاج کی امداد کرنا۔ وفاء بلا خلاف یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبودیت کے عہد میں مخالفت اور معصیت کو اپنے اوپر حرام کرے۔ اور مدح بلا جود یہ ہے کہ کسی سے بھلائی پائے بغیر اس کی تعریف کرے اور ــــ عطاء بلا سوال یہ ہے کہ جب دولت موجود ہو تو سخاوت کرنے میں اپنے، پرائے کی تمیز نہ کرے اور جب کسی کی حالت کا علم ہو تو اسے سوال کی ذلت سے دوچار ہونے سے پہلے دے دے۔ اور یہ تمام صفات اگرچہ بظاہر مخلوق کے درمیان وقوع پذیر ہوئی ہیں لیکن تمام لوگ اپنی صفات سے مجازی طور پر متصف ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ تینوں صفات درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہیں اور اپنے بندوں پر اس فعل کا اظہار فرماتے ہیں اور حق تعالیٰ کی یہ حقیقی صفات ہیں کیونکہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ وفا کرنے میں خلاف ورزی نہیں کرتا۔ ہرچند کہ بندے اپنے عہد وپیماں میں خلاف ورزی کرتے رہتے ہیں لیکن وہ پھر بھی ان پر اپنی مہربانیوں میں اضافہ کرتے ہیں اور حق تعالیٰ کے وفاء کی دلیل یہ ہے کہ اس نے ازل میں بندہ کے کسی نیک عمل کے بغیر اسے پیدا فرما کر اسے اپنا مخاطب بنایا اور آج دنیا میں اس کے بُرے افعال کے باوجود اس کو اپنی درگاہ سے نہیں ہٹاتا ــــ اور مدح بلا جود بھی اس کے سوا کوئی نہیں کر سکتا کیونکہ وہ بندے کے کسی فعل کا محتاج نہیں پھر بھی بندے کے معمولی سے عمل پر بھی اس کی تعریف کرتا ہے ــــ اور عطاء بلا سوال بھی اس کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا کیونکہ وہ کریم ہے اور ہر ایک کی حالت سے بخوبی واقف ہے اور بن مانگے ہر ایک کا مقصود اسے دیئے دیتا ہے۔ پس جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے پر کرم فرماتے

اور اس بزرگ کو اپنے قرب کے ساتھ مخصوص فرماتے ہیں تو اس کے یہ تینوں معاملات درست فرما دیتے ہیں پھر وہ بندہ اپنی کوشش سے حتی الامکان مخلوق کے ساتھ یہی معاملہ کرتا ہے تو بزرگ اس کا نام جوانمرد رکھ دیتے ہیں اور جوانمردوں کی فہرست میں اس کا نام لکھ دیتے ہیں ۔ اور یہ تینوں صفات حضرت ابراہیم علیہ السلام میں بدرجہ کمال موجود تھیں۔ میں انشاء اپنے مقام پر اس کو بیان کروں گا۔

حضرت حاتم اصم رحمۃ اللہ علیہ

اور انہی تبع تابعین میں سے ایک بندوں کی زینت اور اوتاد کا جمال حضرت ابو عبدالرحمٰن حاتم بن عنوان الاصم رحمۃ اللہ بھی ہیں۔ آپ کا شمار بلخ کے صاحب حشمت بزرگوں اور خراسان کے قدیم مشائخ میں ہوتا ہے آپ حضرت شفیق رحمۃ اللہ کے مرید اور حضرت احمد خضرویہ رحمۃ اللہ کے استاد ہیں۔ آپ نے ابتداء سے انتہاء تک تمام حالات میں ایک قدم بھی سچائی کے خلاف نہیں رکھا ۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ "صدیق زماننا حاتم الاصم" (حاتم اصم رح ہمارے دور کے صدیق ہیں) نفس کی خرابیوں اور طبیعت کی رعونت میں آپ کا کلام بڑا بلند پایہ ہے اور علم طریقت میں آپ کی تصانیف مشہور ہیں ۔ آپ سے روایت ہے کہ فرمایا "الشھوۃ ثلاثۃ شھوۃ فی الاکل وشھوۃ فی الکلام وشھوۃ فی النظر" (شہوت تین طرح کی ہوتی ہے ۔ (۱) کھانے میں شہوت ۔ (۲) کلام کرنے میں شہوت ۔ اور (۳) نظر میں خواہش) "فاحفظ الاکل بالثقۃ واللسان بالصدق والنظر بالعبرۃ" (پس اللہ تعالےٰ پر توکل کر کے اپنے کھانے کو حرام سے محفوظ رکھ۔ سچائی کے ساتھ اپنی زبان کی حفاظت کر اور عبرت کے ذریعہ نظر کا تحفظ کر) پس جو شخص کھانے کے معاملہ میں حق تعالےٰ پر توکل کرتا ہے وہ طعام کی خواہش سے چھوٹ جاتا ہے اور جو شخص سچ بولے وہ زبان کی خواہش سے بچ جاتا ہے اور جو شخص آنکھ سے امر حق کو دیکھے وہ نظر کی خواہش سے بچ جاتا ہے اور یہ یاد رکھ کہ حقیقت توکل امر حق کے جاننے سے حاصل ہوتی

ہے کیونکہ جو شخص حق تعالےٰ کو صحیح طور پر جان لیتا ہے وہ اس کے روزی پہچاننے پر بھی یقین کر لیتا ہے پھر اپنے سچے علم کی بدولت اس کی عبادت کرتا اور اپنی صحیح معرفت کی بناٗ پر اس کی ذات وصفات میں تدبر کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا کھانا پینا بھی محبت الٰہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اور اس کی عبادت وجد کے علاوہ اور اس کی نظر مشاہدہ حق کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتی۔ پس جس وقت وہ حق تعالےٰ کو صحیح طور پر جان لیتا ہے تو حلال روزی کھاتا ہے اور جب سچ بولتا ہے تو اس کا ذکر کرتا ہے اور جب امر حق کا مشاہدہ کرتا ہے تو خود اُسی کو دیکھتا ہے کیوں کہ اس کے دیئے ہوئے رزق اور اس کی اجازت کے بغیر کھانا حلال نہیں اور اس کے ذکر کے بغیر اور کسی کا ذکر کرنا درست نہیں اور اس کے جمال و جلال کے علاوہ اس کی پیدا کردہ دوسری موجودات کو دیکھنا صحیح نہیں اور جب تو اس ذاتِ حق تعالےٰ سے رزق حاصل کرے اور اسی کی اجازت سے کھائے تو نفس کی خواہش پیدا نہ ہو گی اور جب تو اسی کی طرف سے اور اسی کے حکم سے کچھ کہے گا تو بھی خواہش پیدا نہ ہو گی اسی طرح جب اس کے فعل یعنی مخلوقات کو دیکھے اور اسی کے حکم سے دیکھے تو بھی خواہش نفس نہ ہو گی۔ لیکن اگر تو اپنے نفس کی چاہت پر کھانا کھائے تو اگرچہ وہ حلال ہی ہو خواہش نفس ہو گی اور اگر تو اپنے نفس کی خواہش کے مطابق کچھ کہے گا تو اگرچہ وہ حق تعالےٰ کا ذکر ہی ہو، جھوٹ اور خواہش نفس ہو گی اور اگر تو اپنے نفس کی خواہش سے دیکھے گا تو اگرچہ اس سے حق پر استدلال ہی کرے، وبال اور نفس کی خواہش ہو گی۔ (واللہ اعلم)

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ

اور انہی تبع تابعین میں سے ایک امام مطلبی اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے چچا کے بیٹے ابو عبد اللہ محمد بن ادریس بن عباس بن شافع بن السائب بن عبید بن عبد یزید بن ہاشم بن عبد المطلب بن عبد مناف القرشی الشافعی رحمۃ اللہ بھی ہیں اپنے وقت کے بزرگوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ جملہ علوم میں اپنے دَور کے امام اور جوانمردی و پرہیزگاری میں معروف تھے۔ آپ اوصافِ حمیدہ اور بلند پایۂ کلام کے مالک تھے، آپ

جب تک مدینہ منورہ میں رہے حضرت امام مالک بن انس رحمۃ اللہ کی شاگردی اختیار کئے رکھی اور جب عراق میں تشریف لے آئے تو حضرت امام محمد بن الحسن شیبانیؒ کی صحبت اختیار کی۔ آپ کی طبیعت ہمیشہ گوشہ نشینی کے ارادے پر مائل رہی اور طریق تصوف کی تحقیق کی جستجو میں مصروف رہے یہاں تک کہ ایک جماعت آپ کے گرد جمع ہو گئی اور آپ کی اقتدا کرنے لگی اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ بھی انہی میں سے تھے۔ اس کے بعد طلبِ جاہ اور امامت کی کوشش میں مشغول ہو گئے لیکن کچھ مدت کے بعد اس سے بھی رک گئے۔ آپ جملہ احوال میں قابلِ تعریف عادات کے مالک تھے۔ شروع میں اہلِ تصوف کے لئے آپ کے دل میں کچھ سختی موجود تھی لیکن جب حضرت سلیمان راعی رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کی ملاقات ہوئی اور ان کے قریب رہنے کا اتفاق ہوا تو پھر آپ جہاں کہیں بھی تشریف لے جاتے حقیقتِ تصوف کے متلاشی رہتے۔ آپ سے روایت ہے کہ فرمایا "اذا رأیت العالِمَ یشتغلُ بالرخصِ فلن یجئ مِنہ شیئٌ" (جب تم کسی عالم کو دیکھو کہ وہ دین کے احکام میں آسانیاں تلاش کرنے میں مشغول ہے تو جان لو کہ اس سے کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔) یعنی علماء ہر قسم کے لوگوں کے پیشوا ہوتے ہیں ان کے لئے جائز نہیں کہ کوئی شخص ان سے آگے قدم رکھ سکے۔ لہٰذا وہ اس وقت تک حق کا راستہ نہیں پا سکتے جب تک وہ اپنے تمام افعال و اقوال میں کامل احتیاط اور خوب محنت اختیار نہ کریں اور علم میں رخصت اور آسانیوں کو تلاش کرنا اسی آدمی کا کام ہو سکتا ہے جو دین میں مجاہدہ سے راہ فرار کرے اور اپنے لئے تخفیف و آسانی پیدا کرے پس دین کے معاملات میں رخصتوں کی طلب کرنا یہ عوام کا درجہ ہے تاکہ دائرہ شریعت سے باہر نہ نکل جائیں اور مجاہدہ اور محنت کے ساتھ دین کے احکام کو پورا کرنا خواص کا مقام ہے تاکہ اپنے دل میں اس مجاہدہ کا ثمرہ حاصل کر لیں اور علماء تو خواص میں شمار ہوتے ہیں لہٰذا جب یہی عام لوگوں کے درجہ پر راضی ہو جائیں تو ان سے کسی چیز کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ رخصت طلب کرنا تو احکام الٰہی کو ہلکا سمجھنا ہے۔ حالانکہ علماء اللہ تعالےٰ کے دوست ہوتے ہیں اور کوئی دوست اپنے دوست کے حکم کو حقیر نہیں سمجھا کرتا اور اس کے فرمان کو ادنیٰ سمجھنے

کی بجائے اس کے بجالانے میں پوری احتیاط کرتے ہیں ۔۔۔ مشائخ میں سے ایک بزرگ بیان فرماتے ہیں کہ ایک رات میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواب میں زیارت کی اور عرض کی کہ" یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے آپ کی طرف سے ایک روائت پہنچی ہے کہ زمین میں اللہ کے اولیاء ، اوتاد اور ابرار ہیں۔حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ راوی نے میری طرف سے میرے سامنے درست روائت بیان کی ہے" میں نے عرض کی۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں ان میں سے ایک ولی کی زیارت کرنا چاہتا ہوں" آپؐ نے فرمایا" کہ محمدؒ ادریس الشافعی ان اُولیا میں سے ایک ہیں"۔۔۔ اس کے علاوہ بھی آپ کے مناقب بہت زیادہ ہیں۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ

اور ان میں سے ایک سُنت رسول کو زندہ کرنے والے اور اہلِ بدعت کو مٹانے والے حضرت ابو محمد احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔ آپ تقویٰ و پرہیزگاری میں مخصوص اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی احادیث کے حافظ تھے۔ آپ کا شمار علماء و صوفیاء دونوں میں ہوتا ہے اور ہر طبقہ کے لوگ آپ کی ذات کو اپنے لئے باعثِ برکت سمجھتے تھے آپ کو حضرت ذوالنون مصری، حضرت بشر حافی، حضرت سرّی سقطی، اور حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ جیسے بڑے بڑے مشائخ کی صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ آپ کی کرامتیں بڑی واضح اور فراست بے حد درست تھی اور بعض مشبہین آج کل جو کچھ آپ کی طرف منسوب کر رہے ہیں یہ آپ پر افتراء اور بہتان ہے آپ ان باتوں سے بالکل بری تھے۔ اصولِ دین میں آپ صحیح اعتقاد اور آپ کا مذہب تمام علماء کو پسند ہے اور جب بغداد میں معتزلہ کا غلبہ ہوا تو انہوں نے آپس میں مشورہ کر کے طے کیا کہ آپ کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ آپ قرآن مجید کو مخلوق کہیں۔ آپ بوڑھے اور کمزور ہو چکے تھے اس حالت میں آپ کے ہاتھ شکنجہ میں کس کر آپ کو ہزار کوڑے لگائے گئے تاکہ آپ قرآن کو مخلوق کہہ دیں لیکن آپ نے پھر بھی ایسا کہنے سے انکار کر دیا۔ کہتے

ہیں کہ اسی دوران آپ کا ازار بند کھل گیا جب کہ آپ کا ہاتھ بندھا ہوا تھا اتنے میں غیب سے ایک ہاتھ نمودار ہوا جس نے آپ کا ازار بند باندھ دیا۔ لوگوں نے جب آپ کی یہ کرامت اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تو آپ کو چھوڑ دیا لیکن آپ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چند روز کے بعد وفات پا گئے۔ زندگی کے آخری وقت میں کچھ لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ آپ اُن لوگوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں جنہوں نے آپ کو کوڑے لگائے؟ آپ نے فرمایا میں کیا کہوں کہ ان لوگوں نے تو بزعم خویش مجھے حق تعالےٰ کی رضاجوئی کے لئے مارا ہے کہ گویا میں باطل ہوں اور وہ حق پر ہیں۔ بس صرف ان زخموں کی بنیاد پر روز قیامت ان کے ساتھ جھگڑا نہ کروں گا — دین کے مسائل میں آپ کا کلام بڑا بلند پایہ ہے۔ جب کوئی شخص آپ سے کوئی مسئلہ دریافت کرتا تو اگر وہ اعمال سے متعلق ہوتا تو جواب ارشاد فرما دیتے لیکن اگر طریقت کے حقائق سے متعلق ہوتا تو حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ کے پاس جا کر ان سے دریافت کرنے کی تاکید فرما دیتے۔ چنانچہ ایک روز ایک شخص نے سوال کیا کہ "ماالاخلاص"؟ (اخلاص کسے کہتے ہیں؟) آپ نے فرمایا "الاخلاص ھوالخلاص من آفاتِ الاعمال" (اخلاص یہ ہے کہ انسان اعمال کی خرابیوں سے نجات پا جائے یعنی تیرا عمل ریاکاری اور نقصان سے خالی ہو۔ اس نے سوال کیا "ماالتوکل" (توکل کیا ہے؟) آپ نے جواب دیا "الثقتہ باللہ" (اللہ پر پوری طرح بھروسہ کرنا) اس نے دریافت کیا "ماالرضاء" (رضا کیا ہے؟) آپ نے ارشاد فرمایا "تسلیم الامور الی اللہ" (اپنے تمام معاملات کو حق تعالےٰ کے سپرد کر دینا) اُس نے پوچھا "ماالمحبتہ" (محبت کیا ہے؟) تو آپ نے فرمایا "یہ بات جا کر حضرت بشر حافی سے پوچھو کیوں کہ جب تک وہ زندہ ہیں میں اس کا جواب نہیں دے سکتا" — حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تمام احوال میں آزمائشوں میں ڈالے گئے۔ زندگی میں معتزلہ نے آپ کو اذیتیں دیں اور وفات کے بعد بعض لوگوں نے آپ پر طرح طرح کی الزام تراشیاں کیں۔ حالانکہ آپ ان تمام الزامات سے بالکل پاک ہیں حتیٰ کہ اہلِ سنت وجماعت نے بھی آپ کے حالات سے ناواقفی کی بنا پر بعض باتیں آپ کی طرف غلط منسوب کر دی ہیں حالانکہ وہ ان سے بری ہیں۔ (واللہ اعلم)

حضرت احمد بن الحواری رحمۃ اللہ

اور انہی تبع تابعین میں سے وقت کے چراغ اور عذاب الٰہی کی آفتوں سے واقف حضرت ابوالحسن احمد بن الحواری رحمۃ اللہ علیہ بھی ایک ہیں۔ آپ شام کے بڑے جلیل القدر مشائخ میں شمار ہوتے تھے اور تمام صوفیاء کے ممدوح تھے۔ یہاں تک حضرت جنید رحمۃ اللہ نے فرمایا "احمد ابن الحواری ریحانۃ الشام" (احمد بن الحواری رحمۃ اللہ شام کی خوشبو ہے) علم طریقت کے شعبوں میں آپ کا کلام بہت بلند پایہ اور اشارات بہت لطیف ہیں، اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی احادیث میں آپ کی روایت کردہ احادیث سب کی سب صحیح ہیں اور طریقت میں آپ کا مقام اتنا بلند تھا کہ وقت کے تمام صوفیاء اس سلسلے میں آپ سے ہی رجوع کیا کرتے تھے۔ آپ حضرت ابوسلیمان دارانی رحمۃ اللہ کے مرید تھے اور سفیاں بن عیینہ مروان بن معاویہ الفاری جیسے بزرگوں رحہم اللہ اجمعین، کی صحبت سے تربیت حاصل کی اور سیاحت کے دوران ہر ایک بزرگ سے ادب اور فائدہ حاصل کیا تھا۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "الدنیا بلة ومجمع الکلاب وَاقل من الکلاب من عکف علیها فان الکلب یاخذ فیها حاجتہٗ وَتنصرف وَالمحب لها لا یزول عنها وَلا یترکها بحال"

(دنیا کوڑے کرکٹ کا مقام اور کتوں کے جمع ہونے کی جگہ ہے اور وہ آدمی تو کتوں سے بھی کم درجہ ہے جو ہر وقت اس پہ گرا رہتا ہے اس لئے کہ کتا تو اس جگہ سے اپنی ضرورت پوری کر کے واپس لوٹ جاتا ہے لیکن دنیا سے محبت کرنے والا ہر وقت اس سے چمٹا رہتا ہے اور کسی حال میں بھی اس کو چھوڑتا نہیں) یعنی آپ کے نزدیک دنیا اس قدر حقیر تھی کہ آپ نے اس کو کوڑے کرکٹ سے تشبیہ دی اور اہلِ دنیا کو کتوں سے بھی کم مرتبہ شمار کیا۔ اور وجہ یہ بتائی کہ کتے تو کوڑے سے اپنی ضرورت پوری کر کے الگ ہو جاتے ہیں لیکن اہل دنیا اس کو جمع کرنے کے لئے ہمیشہ اس پہ بیٹھے رہتے ہیں، اس لئے کتا حرص میں اہلِ دنیا سے کم تر

اور اہلِ دنیا درجہ میں کتنے سے کم تر ہوئے اور یہ بات آپ کے اہلِ دنیا سے قطع تعلق کی بڑی واضح دلیل ہے۔ درحقیقت اربابِ طریقت کا دنیا و ما فیہا سے لاتعلق ہونا ایک شاندار محل اور تر و تازہ باغیچہ کی مانند ہے ___ آپ ابتدائے عمر سے ہی حصولِ علم میں مصروف ہو گئے تھے اور اس کے لئے اتنی محنت کی کہ آپ ائمہ کے درجہ تک پہنچ گئے، بالآخر آپ نے تمام کتابیں دریا بُرد کر دیں اور فرمانے لگے "نعم الدلیل انت و اما الاشتغال بالدلیل بعد الوصول الی المدلول محال" (تم بہترین دلیل اور رہنما ہو لیکن مدلول و مقصود تک پہنچ جانے کے بعد دلیل کے ساتھ مشغول رہنا محال ہے) کیونکہ رہنما کی ضرورت تو اس وقت تک ہوتی ہے جب تک مرید راستہ میں ہو لیکن جب منزلِ مقصود تک رسائی ہو جائے تو پھر رہنما کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ اور بعض مشائخ نے آپ کے اس کلام کو حالتِ سکر پر محمول کیا ہے کہ "مَنْ قال وَصلت فقد وَصل" (جس آدمی نے کہا کہ میں پہنچ گیا تو وہ واقعی پہنچ گیا) کیونکہ منزل پر پہنچ جانا کام سے رُک جانا ہے، پس شغل مشغل ہوتا ہے ہوتا ہے اور فراغت فراغت اور حق تک وصول کا راستہ شغل اور فراغت دونوں میں نہیں کیونکہ یہ دونوں بندہ کی صفات ہیں اور فصل و وصل۔ حق تعالیٰ کی عنایت اور اس کے ازلی ارادہ سے حاصل ہوتے ہیں نہ کہ بندہ کی مشغولیت و فراغت سے۔ پس حق تعالےٰ تک پہنچنے کا کوئی اصول نہیں اور حق تعالےٰ کے لئے قربت اور نزدیکی کی نسبت درست نہیں۔ اس کا وصل تو بندہ کو صرف بزرگی عطا کرتا ہے اور اس کا ہجر بندہ کو ذلیل کرتا ہے کیوں کہ اس کی صفاتِ حقیقہ میں تغیر درست نہیں ___ اور میں علی بن عثمان رحمۃ اللہ الجلابی کہتا ہوں کہ اس معنی کا احتمال موجود ہے کہ اس بزرگ احمد بن الحواری رحمۃ اللہ کی لفظ وصول سے مراد راہِ حق تک وصول ہو نہ کہ ذاتِ حق تعالےٰ تک وصول۔ کیونکہ کتابوں میں وصول سے مراد راہِ حق ہی ہے اس لئے کہ جب راستہ واضح ہو جائے تو پھر رہنما کی چنداں ضرورت نہیں رہتی۔ کیونکہ مقصود واضح ہو تو بیان کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی جتنی کہ مقصود کے غائب ہونے کی

صورت میں ہوتی ہے۔ غرضیکہ جب راہِ حق مل گئی تو اس کا دکھانا لاحاصل ہو گیا۔ اور جب صحیح طور پر معرفتِ حق کے بیان کرنے میں زبانیں عاجز ہیں تو کتابیں بدرجہ اوّل اس سلسلہ میں بیکار ہوں گی۔ آپ کے علاوہ دیگر مشائخ نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ جیساکہ شیخ المشائخ ابوسعید فضل اللہ بن محمد المہینی وغیرہ رحمہم اللہ نے اپنی کتابیں پانی میں پھینک دی تھیں اور بعض نام نہاد صوفیوں نے بھی سستی، ناکامی اور اپنی جہالت کی وجہ سے ان مردانِ حریت کی تقلید کی۔ تاہم ان بزرگوں کی اس سے مُراد ماسوی اللہ سے اپنے دل کو فارغ کرتے۔ دنیا سے لاتعلق ہونے اور اس سے اپنی توجہ ہٹانے کے علاوہ اور کچھ نہ تھی۔ تاہم حالتِ سکر اور غلبۂ جذب کے علاوہ یہ بات درست نہیں کیونکہ جو شخص مقام مشاہدہ میں قیام پذیر ہو دونوں جہان کی کوئی چیز اس کے مشاہدہ میں حائل نہیں ہو سکتی چنانچہ جب دل دنیا کے تعلقات سے منقطع ہو گیا تو کاغذ کے چند اوراق کی کیا وقعت باقی رہ گئی۔ لیکن جیساکہ کسی نے کہا ہے کہ شاید کتاب کو دھونے سے مُراد یہ ہو کہ مقصودی معنی کے حصول کے بعد الفاظ وعبارت کی نفی کر دی تو جیساکہ ہم نے کہا ہے کہ اس صورت میں بہتر یہ ہے کہ عبارت زبان سے بھی دُور ہو جائے کیونکہ کتاب میں عبارت لکھی ہوتی ہے اور زبان پر جاری ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی صورت بھی دوسری سے بہتر نہیں۔ اور مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ احمد بن الحواری کو غلبہ حال میں ایسا کوئی شخص نہ ملا جس کو وہ اپنا کلام سنا دیتے اس لئے انہوں نے اپنی حالت کی تفصیل کاغذوں پر تحریر کر دی اور جب کاغذ زیادہ جمع ہو گئے اور ان کو عام طور پر تبلیغ کرنے کے قابل کوئی آدمی میسّر نہ آیا تو انہوں نے ان کاغذوں کو پانی میں ڈال دیا اور کہا کہ تم بہت اچھی دلیل ہو لیکن چونکہ تم سے میری مراد مجھے حاصل ہو چکی ہے اس لئے اب تم میں مشغول رہنا بے فائدہ ہے۔ نیز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کے پاس کتابیں زیادہ جمع ہو گئی ہوں جو آپ کو اوراد اور معاملات کے ادا کرنے میں رکاوٹ محسوس ہوتی ہو۔ اس لئے آپ نے اس شغل اور رکاوٹ کو اپنے سامنے سے اٹھا دیا ہو اور معانی کے حصول کے لئے دل کی فراغت چاہی ہو اور عبارات کو ترک کر دیا ہو۔

(واللہ اعلم ونعوذ باللہ من السفہ)

حضرت احمد بن خضرویہ البلخی رحمۃ اللہ

اور ان تبع تابعین میں سے جوانمردوں کے سالار لشکر اور آفتاب خراسان حضرت ابو حامد احمد خضرویہ البلخی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔ آپ اپنے دور کے بلند حال و بلند شرف صوفیاء کے مقتداء اور خواص و عوام کے انتہائی پسندیدہ تھے۔ آپ ملامت کے طریق پر چلتے اور سپاہیانہ لباس زیب تن فرمایا کرتے تھے، آپ کی اہلیہ فاطمہ بھی طریقت میں بڑی نشان کی مالک تھیں۔ وہ حاکم بلخ کی صاحبزادی تھیں جب سچی توبہ کا ارادہ کر لیا تو کسی شخص کے ذریعہ حضرت احمد کے پاس پیغام بھجوایا کہ اپنے ساتھ نکاح کیلئے مجھے میرے والد سے مانگ لیجئے! آپ نے قبول نہ کیا۔ تو انہوں نے دوبارہ پیغام بھجوایا کہ اے احمد! میں تو آپ کو اس سے بھی بہادر سمجھتی تھی کہ آپ راہ حق میں رہبر ثابت ہوں گے نہ کہ رہزن۔" یہ سن کر آپ نے ان کے والد کے پاس ایک آدمی بھیج کر فاطمہ کے ساتھ نکاح کی درخواست کی۔ حاکم بلخ نے تبرک کے طور پر اُن کا نکاح حضرت احمد بن خضرویہ کیساتھ کر دیا۔ حضرت فاطمہ نے بھی دنیا کے شغل اور دھندے چھوڑ دیئے اور حضرت احمد بن خضریہ کے ساتھ گوشہ نشینی اختیار کر کے دائمی سکون حاصل کر لیا۔ ایک دفعہ حضرت احمد کے دل میں حضرت بایزید کی زیارت کا ارادہ پیدا ہوا تو حضرت فاطمہ نے بھی آپ کے ساتھ موافقت کی۔ چنانچہ جب حضرت بایزید کے سامنے پہنچے تو حضرت فاطمہ نے اپنے چہرے سے نقاب اٹھا دیا اور حضرت بایزید کے ساتھ گستاخانہ گفتگو شروع کر دی۔ حضرت احمد کو انتہائی تعجب ہوا اور ان کے دل پر غیرت پیدا ہوئی اور کہا "اے فاطمہ! حضرت بایزید کے سامنے تم نے یہ گستاخانہ انداز کیوں اختیار کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ آپ میری طبیعت کے محرم ہیں اور حضرت بایزید میری طریقت کے محرم ہیں۔ آپ کے ذریعہ میں اپنی خواہش کی تسکین کرتی ہوں اور ان کے ذریعہ روح کی طمانیت اور تعلق باللہ حاصل کرتی ہوں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت بایزید تو میری

صحبت سے بے نیاز ہیں اور آپ میری صحبت کے محتاج ہیں۔ چنانچہ آپ ہمیشہ حضرت بایزید کے ساتھ اسی طرح شوخی کے انداز میں باتیں کیا کرتی تھیں یہاں تک ایک مرتبہ حضرت بایزید کی نگاہ آپ کے ہاتھ پر پڑھ گئی جس پر مہندی لگی ہوئی تھی آپ نے فرمایا "اے فاطمہ! تم نے ہاتھ پر مہندی کیوں لگائی ہے! حضرت فاطمہ نے جواباً کہا "اے بایزید! جب تک آپ نے میرے ہاتھ اور مہندی کو نہ دیکھا تھا مجھے یہاں خوشی و راحت محسوس ہوتی تھی لیکن اب چونکہ آپ کی نظر میرے جسم کے ایک حصے پر پڑ گئی ہے۔ لہٰذا میرے لئے آپ کی صحبت میں رہنا حرام ہو گیا ہے، اور وہ دونوں وہاں سے لوٹ آئے اور نیشاپور میں رہائش اختیار کر لی۔ یہاں کے جملہ مشائخ حضرت احمد سے بہت خوش رہتے تھے جب حضرت یحییٰ بن معاذ الرازی رحمۃ اللہ نیشاپور تشریف لائے اور پھر وہاں سے بلخ جانے کا ارادہ فرمایا تو حضرت احمد نے ان کی دعوت کرنا چاہی اور حضرت فاطمہ سے مشورہ کیا کہ حضرت یحییٰ کی دعوت کے لئے کیا انتظام کیا جائے! انہوں نے کہا کہ اتنی گائیں، اتنی بھیڑیں اور اتنی دیگر ضروری اشیاء اور اتنی موم بتیاں اور عطر درکار ہے اور ان تمام چیزوں کے علاوہ بیس گدھے ذبح کرنے چاہئیں یہ سن کر حضرت احمد نے پوچھا کہ گدھوں کو ذبح کرنے کا کیا مقصد! انہوں نے جواب دیا کہ جب کوئی کریم کسی کریم کے گھر مہمان آئے تو محلہ کے کتوں کے لئے بھی کوئی حصہ ہونا چاہیئے اور حضرت ابویزید رحمۃ اللہ نے فرمایا "مَن اراد اَن ینظر الیٰ رجلٍ من الرجال مختو تحت لباسِ النسوانی فلینظر الیٰ فاطمۃ رحمتہ اللہ علیہا" (جو شخص کسی مرد کو عورتوں کے لباس میں پوشیدہ دیکھنا چاہے تو وہ فاطمہ رحمۃ اللہ علیہا کو دیکھ لے) اور ابوحفص حداد رحمۃ اللہ نے فرمایا ہے کہ "لولا احمد بن خضرویہ ماظہرت الفتوۃ" (اگر احمد بن خضرویہ نہ ہوتے تو جوانمردی ظاہر ہی نہ ہوتی) ـــــ غرضیکہ آپ کے ملفوظات بڑے بلند اور انفاس بڑے مہذب ہیں۔ علم طریقت کے ہر شعبے میں آپ کی مشہور تصانیف ہیں اور حقائق کے بیان میں آپ کے اداب اور نکات بڑے واضح ہیں اور آپ سے روایت ہے کہ

آپ نے فرمایا "الطریق واضح والحق لائح" والراعی فدا سمع فما التحیر بعدھا الا من العمیٰ" (راستہ بڑا واضح ہے اور حق روشن ہے اور نگہبان خوب سننے والا پس اس کے بعد حیرانی دل کے اندھے پن کی وجہ سے ہی ہو سکتی ہے) یعنی راستہ کی تلاش بالکل خطا ہے کیونکہ راہ حق تو آفتاب کی طرح روشن ہے۔ تو اپنے آپ کو تلاش کر کہ تو کہاں ہے۔ تو جب اپنے آپ کو پالے گا تو خود بخود راستہ پہ آجائے گا۔ کیونکہ حق تو اس سے بہت زیادہ روشن ہے کہ طالب اس کی طلب کرے ـــــ نیز آپ سے روایت ہے کہ فرمایا کہ "اُستر عز فقرك عن الخلق" (اپنی درویشی کی عزت کو مخلوق سے پوشیدہ رکھو) یعنی مخلوق کے سامنے یہ مت کہو کہ میں درویش ہوں تاکہ تیرا راز آشکار نہ ہو۔ کیونکہ یہ خدا تعالےٰ کی طرف سے بڑی عظیم کرامت ہے۔ نیز آپ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رمضان کے مہینہ میں ایک درویش نے ایک مالدار کی دعوت کی جبکہ اس کے گھر میں خشک روٹی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ وہ دولت مند جب واپس ہوا تو سونے کی ایک تھیلی درویش کے پاس بھیجی۔ اس نے یہ کہہ کر وہ واپس کر دی کہ یہ اُس شخص کے لائق ہے جو اپنی درویشی کو تجھ جیسے شخص پر ظاہر کرے یا دولت مندوں کو فقیری کی عزت کے قابل سمجھے۔ اور یہ بات اس فقیر کے محبت فقر کی علامت ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت عسکر بن الحسین رحمۃ اللہ علیہ

اور انہی تبع تابعین میں سے ایک توکل کرنے والوں کے امام اور اہل زمان کے برگزیدہ حضرت ابو تراب عسکر بن الحسین النسفی رحمۃ اللہ بھی ہیں۔ آپ خراسان کے بڑے مشائخ اور ان کے سرداروں میں شمار ہوتے تھے۔ جوانمردی، زہد و تقویٰ میں بے مثل تھے۔ لوگوں میں آپ کی بہت سی کرامات اور عجیب باتیں مشہور ہیں جو آپ سے جنگل میں ظاہر ہوئیں۔ آپ بڑے صوفی سیاحوں میں سے تھے اور جنگلوں میں تنہا زندگی بسر کرتے تھے۔ آپ کی وفات بھی بصرہ کے ایک جنگل میں ہوئی تھی۔ کئی سال کے بعد ایک جماعت کا آپ پر گزر ہوا تو اس نے آپ کو قبلہ رُو پاؤں پر کھڑے پایا کہ آپ خشک ہو چکے

تھے۔ مشکیزہ آپ کے سامنے پڑا تھا اور ہاتھ میں عصا تھام رکھا تھا۔ درندوں میں سے کوئی آپ کے پاس نہیں پھٹکا اور نہ ہی آپ نیچے گرے۔ آپ سے روائت ہے کہ آپ نے فرمایا "الفقیر قوتہ ما وجد ولباسہ ما ستر وسکنہ حیث نزل" (فقیر کی روزی وہ ہے جو اسے مل جائے اور لباس وہ ہے جس سے وہ بدن ڈھانپ سکے اور اس کی قیام گاہ وہی ہے جہاں وہ آترے) کیونکہ تینوں چیزوں میں تصرف کرنا غفلت ہے اور تمام اہلِ جہاں انہی تین چیزوں کی بلا میں مبتلا ہیں۔ کیونکہ وہ ان تینوں میں تکلف برتتے ہیں۔ اور یہ بات تو دنیاوی اور مادی معاملات کے لحاظ سے تھی لیکن تحقیق کے مطابق حالتِ وجد درویش کی غذا۔ تقویٰ اس کا لباس اور غیب اس کا مسکن ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "وان لو استقاموا علی الطریقۃ لاسقینٰھم ماءً غدقاً" (اور یہ کہ اگر وہ لوگ راہِ حق پر ثابت قدم ہو جائیں تو ہم انہیں کثیر پانی سے سیراب کرتے) نیز ارشاد فرمایا "وریشا ولباس التقویٰ ذالك خیر" (اور ہم نے انہیں لباس عطا کیا اور تقویٰ کا لباس بہت بہتر ہے") نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا "الفقر وطن الغیب" (فقر، غیب کا وطن ہے) پس جب اس کا کھانا پینا قرب کی شراب سے ہو اور مجاہدہ و تقویٰ اس کا لباس ہو اور وطن، غیب ہو اور انتظار اس کا وصل ہو تو پھر فقر کی راہ بالکل واضح اور اس کے معاملات بڑے روشن ہیں۔ اور یہ درجۂ کمال ہے

حضرت یحییٰ بن معاذ الرازی رحمۃ اللہ علیہ

اور تبع تابعین میں سے محبّت و وفا کی زبان اور ولائت و طریقت کی زینت حضرت ابوزکریا یحییٰ بن معاذ الرازی رحمۃ اللہ بھی ایک ہیں۔ آپ بڑے بلند حال اور نیک کردار بزرگ تھے۔ حق تعالیٰ سے امید میں بڑے ثابت قدم تھے یہاں تک کہ حضرت حضری رحمۃ اللہ کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دو یحییٰ ہیں ایک گروہ انبیا علیہم السلام میں اور دوسرے گروہ اولیاء رحمہم میں سے ــــ حضرت یحییٰ بن زکریا علیٰ نبینا و علیہما السلام نے تو اس طرح خشیت الٰہی کی راہ طے فرمائی کہ خوفِ الٰہی کے تمام دعویدار آپ کے مقابلہ میں اپنی کامیابی سے نا امید ہو گئے۔ اور حضرت یحییٰ بن معاذ الرازی رح نے اللہ تعالیٰ

سے اُمید کی راہ اس انداز سے طے کی کہ آپ کے مقابلہ میں اللہ تعالےٰ کی اُمید کے تمام دعویداروں نے ہاتھ باندھ دیئے۔ لوگوں نے پوچھا کہ حضرت یحییٰ بن زکریا کا حال تو سب کو معلوم ہے حضرت یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ کا حال کیسا تھا؟ حضرت خضری رحمۃ اللہ نے جواباً فرمایا" مجھے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ انہوں نے کبھی جہالت کا کوئی کام نہیں کیا۔ کبھی کبیرہ گناہ کا ارتکاب نہیں کیا اور آپ مجاہدہ و عمل میں اس قدر کوشاں رہتے تھے کہ دوسرا کوئی اس کی طاقت نہ رکھتا تھا۔ آپ کے دوستوں میں سے ایک نے کہا کہ اے شیخ! آپ کا مقام تو مقام اُمید ہے لیکن آپ کا عمل اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کا سا عمل ہے؟ آپ نے فرمایا۔ اے بیٹے! جان لو کہ عبادت کا ترک کرنا گمراہی ہے اور خوف و رجاء دونوں ایمان کے دوست ہیں اور کوئی شخص ارکانِ ایمان میں کسی رکن پر عمل کرتا ہو تو اس کا گمراہ ہو جانا محال ہے اللہ تعالےٰ سے ڈرنے والا شخص تو اللہ تعالےٰ سے علیحدگی کے خوف سے اللہ تعالےٰ کی عبادت کرتا ہے اور اللہ تعالےٰ سے امید رکھنے والا اللہ تعالےٰ کے وصل کی امید پہ اس کی عبادت کرتا ہے، جب تک عبادت موجود نہ ہو اُس وقت تک نہ خوفِ الٰہی درست ہو سکتا ہے اور نہ اُمید! لیکن جب عبادت کا درجہ حاصل ہو تو خوف و رجاء سب عبادت بن جاتا ہے اور جس جگہ عبادت کی ضرورت ہے وہاں محض عبارت کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ آپ کی تصانیف، نکات اور بدیع اشارات بہت ہیں اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے بعد مشائخ صوفیاء میں سے پہلا وہ شخص جو مسائل طریقت بیان کرنے کے لئے منبر پہ چڑھا وہ آپ ہی تھے۔ اور مجھے ان کا کلام انتہائی محبوب ہے کیونکہ اس کے سننے سے طبیعت کو تازگی اور کانوں کو سرور حاصل ہوتا ہے اور اس کا مفہوم بڑا لطیف اور عبارت بڑی شگفتہ ہے۔ اور آپ سے روایت ہے کہ فرمایا" الدنیا دار الاشتغال والاٰخرۃ دار الاھوال ولایزال العبدبین الاشتغال والاھوال حتیٰ نستقربہ القرارا ماالی الجنۃ واماالی النار" (دنیا مقام عمل ہے اور آخرت خوف و خطرہ کا گھر ہے اور بندہ اس وقت تک شغل اور خوف کے

درمیان رہتا ہے جب تک یا تو جنت میں یا پھر دوزخ میں قرار نہ پکڑلے) وہ دل بڑا خوش نصیب ہے جو دنیا کے دھندوں سے چھوٹ جائے اور آخرت کے خطرات سے بے خوف ہو جائے اور دونوں جہان سے اپنا ارادہ منقطع کر کے اپنا رشتہ حق تعالیٰ سے جوڑ لے اور آپ کا مذہب یہ تھا کہ غنا. فقر سے افضل ہے ۔ کہتے ہیں کہ جب رئے میں آپ پر قرضہ بہت ہو گیا تو خراسان کا ارادہ فرمایا اور وہاں کے لوگوں کو ایک عرصہ تک وعظ و نصیحت کی ۔ پھر جب واپس لوٹنے لگے تو لوگوں نے آپ کی خدمت میں ایک لاکھ درہم پیش کئے ۔ یہ رقم لے کر جب آپ رئے کی طرف روانہ ہوئے تو راستہ میں چوروں نے آپ کو لوٹ لیا اور تمام رقم چھین لی اور آپ بالکل خالی ہاتھ نیشاپور میں آگئے اور وہیں آپ کی وفات ہوئی ۔ اور آپ تمام احوال میں لوگوں کے درمیان معزز اور وجیہہ تھے ۔ واللہ اعلم ۔

حضرت عمر بن السالم نیشاپوری رحمۃ اللہ

اور انہی تبع تابعین میں سے ایک خراسان کے شیخ المشائخ اور اپنے دور میں زمین کے بے مثل بزرگ حضرت ابو حفص عمر بن سالم نیشاپوری الحدادی رحمۃ اللہ بھی ہیں ۔ آپ کا شمار بڑے بزرگ اور بلند پایہ صوفیاء میں ہوتا ہے اور تمام بزرگوں کے ممدوح تھے ۔ حضرت ابو عبداللہ لاہوری رحمۃ اللہ کے صحبت یافتہ اور حضرت احمد خضرویہ رحمۃ اللہ کے دوست تھے اور شاہ شجاع جیسا انسان کرمان سے چل کر آپ کی زیارت کے لئے تشریف لایا تھا ۔ ایک مرتبہ آپ بغداد کے مشائخ کی زیارت کے لئے روانہ ہوئے لیکن آپ عربی نہ بول سکتے تھے ۔ جب بغداد پہنچے تو آپ کے مریدوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ یہ بڑی نامناسب بات ہے کہ خراسان کے شیخ المشائخ کو گفتگو کے لئے ترجمان کی ضرورت پڑے ۔ لیکن جب مسجد شونیزیہ میں آئے اور بغداد کے تمام مشائخ بھی وہاں آگئے تو آپ نے ان کے ساتھ ایسی فصیح عربی میں گفتگو کی کہ تمام مشائخ دنگ اور عاجز رہ گئے ۔ آپ سے مشائخ نے سوال کیا کہ "ما الفتوۃ"

(جوانمردی کیا ہے ؟) آپ نے فرمایا "آپ ہیں کوئی صاحب ابتداء کر کے اس کے متعلق پہلے کوئی قول بیان کریں۔ چنانچہ حضرت جنید رحمۃ اللہ نے فرمایا" الفتوۃ عندی ترک الرؤیۃ واسقاط النسبۃ" (میرے نزدیک جوانمردی یہ ہے کہ تو جوانمردی کو نہ دیکھے اور اپنے کسی عمل کی نسبت اپنی طرف نہ کرے کہ یہ میں نے کیا ہے) حضرت ابو حفص نے کہا" مَا احسن مَا قال الشیخ وَلکن الفتوۃ عندی اَداء الانصاف وترک مطالبۃ الانصافِ" (شیخ نے بہت خوب فرمایا ہے لیکن میرے نزدیک جواں مردی یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ انصاف کرے لیکن دوسروں سے انصاف کا تقاضہ نہ کرے") یہ سُن کر حضرت جنید رحمۃ اللہ نے فرمایا" قوموا یا اصحابنا فقد زاد ابوحفص علیٰ آدم وَ ذریتہ" (اے دوستو! اٹھو کہ حضرت ابوحفص جوانمردی میں آدم اور تمام اولاد آدم[1] پر بڑھ گئے ہیں)

اور کہتے ہیں کہ آپ کی توجہ کی ابتداء یوں ہوئی کہ آپ ایک کنیز پر فریفتہ ہو گئے تھے۔ لوگوں نے آپ سے کہا کہ نیشاپور کے قریب ایک گاؤں میں ایک یہودی جادوگر رہتا ہے آپ کے اس کام کا علاج اس کے پاس موجود ہے۔ آپ اس کے پاس گئے اور اپنا حال اس کے سامنے بیان کیا۔ یہودی نے کہا کہ چالیس روز تک تم نہ تو نماز پڑھو۔ نہ کوئی اچھا عمل کرو اور نہ ہی نیک نیتی کا کوئی کام دل و زبان پر لاؤ پھر میں عمل کروں گا جس سے تمہاری مراد پوری ہو جائے گی۔ آپ نے ایسا ہی کیا اور جب چالیس روز ہو گئے تو اس یہودی نے جادو کا عمل کیا لیکن آپ کی مُراد پوری نہ ہوئی۔ یہودی نے کہا کہ اے ابو حفص اس عرصہ میں تو نے ضرور کوئی نیک کام کیا ہے خوب سوچ لو! ابوحفص نے

---

[1] ، کشف المحجوب کے فارسی نسخوں میں یوں ہی لکھا ہے لیکن یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا کیونکہ کسی بزرگ یا ولی کا کسی نبی سے کسی بھی درجہ میں بڑھ جانا ناممکن ہے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ کتابت کی غلطی سے عبارت اس طرح بن گئی ہو ورنہ اصل عبارت یوں ہو کہ "زاد ابوحفص علی ذریۃ آدم" (کہ ابوحفص اولاد آدم سے بڑھ گئے ہیں) واللہ اعلم۔ مترجم۔

کہا اس عرصے میں کسی اچھے عمل کو میں نہیں جانتا جو میرے ظاہر و باطن سے سرزد ہوا ہو سوائے اس کے کہ ایک روز میں راستہ میں جا رہا تھا کہ راہ میں ایک پتھر پڑا تھا جسے میں نے اس ارادہ سے راستہ سے ہٹا دیا کہ کسی کو ٹھوکر نہ لگے۔ تو یہودی نے کہا کہ پھر تو اس خدا کو آزردہ نہ کر کہ جس کا فرمان تو نے چالیس دن تک ضائع کیا ہے لیکن اس نے تیری اتنی سی تکلیف کو ضائع نہیں کیا۔ آپ نے یہ سن کر اسی وقت توبہ کر لی اور وہ یہودی بھی مسلمان ہو گیا۔ آپ وہی لوہار کا کام کرتے رہے یہاں تک کہ باورہ جا کر حضرت ابو عبداللہ باوری رحمۃ اللہ کی زیارت کی اور اُن سے ارادتمندی کا عہد باندھ لیا اور کچھ دن کے بعد نیشاپور واپس تشریف لے آئے۔ کہتے ہیں کہ ایک روز آپ اپنی دکان پر بیٹھے کام کر رہے تھے کہ بازار میں ایک نابینا قرآن کی تلاوت کر رہا تھا اس کی قرأت آپ پر اس قدر غالب ہوئی کہ آپ پر وجد طاری ہو گیا اور آپ بے خود ہو گئے اور ہاتھ آگ میں ڈال کر بغیر آہن گیر کے بھٹی سے تپا ہوا لوہا باہر نکال لیا۔ جب اس حالت میں شاگرد نے آپ کو دیکھا تو وہ بے ہوش ہو گیا، حضرت ابو حفص کو جب ہوش آیا تو آپ نے لوہا کا پیشہ چھوڑ دیا اور پھر کبھی بھی اس کی طرف دھیان نہ دیا۔ آپ سے روایت ہے کہ فرمایا "ترکت العمل ثم رجعت الیہ ثم ترکنی العمل فلم ارجع الیہ" (پہلے میں نے کام کو چھوڑا پھر اس کی طرف رجوع کیا تو پھر عمل نے خود ہی مجھے چھوڑ دیا پس میں نے کبھی اس کی طرف رجوع نہ کیا۔) کیونکہ جس کام کو بندہ تکلف اور اپنے کسب کے ساتھ چھوڑے اُس کا چھوڑنا اس کے کرنے سے بہتر نہیں ہوتا۔ اس قول کی صحت کی دلیل "کہ تمام اکتساب محلِ آفات ہوتے ہیں" یہ ہے کہ قدر و قیمت تو صرف اس بات کی ہوتی ہے جو تکلف کے بغیر غیب سے حاصل ہو اور جس محل میں بھی ہو بندے کا اختیار اس کے ساتھ متصل نہ ہو اور حقیقت کا بھید اس سے زائل ہو جائے پس کسی کام کے ترک کرنے یا اختیار کرنے کی نسبت بندہ کی طرف درست نہیں کیونکہ عطاء و زوال اللہ تعالےٰ کی طرف سے اور اُسی کی تقدیر سے ہے۔ جب عطاء اُس کی طرف سے ہو گی تو اس کا اختیار بھی اسی جانب سے حاصل

ہو گا۔ اور جب زوال آئے گا تو حق تعالےٰ کی طرف سے اس کا ترک کرنا بھی حاصل ہو جائے گا۔ جب معاملہ یوں ہے تو پھر قدر و قیمت بھی اسی چیز کی ہو گی جس کے ساتھ اخذ و ترک کا قیام ہے نہ اس چیز کی بندہ اپنے اجتہاد سے اس کو کرنے یا نہ کرنے والا ہو پس اگر کوئی مرید ہزار سال تک بارگاہِ خداوندی میں مقبول بننے کے لئے کوشاں رہے تو بھی وہ ایسا نہ ہو سکے گا۔ جیساکہ اگر حق تعالےٰ ایک لمحہ اس کے قبول کرنے کے لئے فرما دیں۔ کیونکہ دائمی اقبال۔ ازلی قبولیت سے وابستہ ہے اور سرور سرمدی ہمیشہ کی سعادت کے ساتھ پیوستہ ہے اور عنائت الٰہی کے علاوہ بندہ کو اپنی نجات کے لئے کوئی راستہ نہیں مل سکتا۔ پس صاحب عزت وہ بندہ ہے کہ سبب الاسباب جس کو اسباب کا ضرورت مند و محتاج نہ رکھیں۔

حضرت حمدون بن احمد رحمۃ اللہ

اہل ملامت کے پیشوا اور ہر آزمائش میں راضی رہنے والے حضرت ابو صالح حمدون بن احمد بن عمارۃ القصار رحمۃ اللہ بھی تبع تابعین میں سے ایک ہیں آپ متقدمین مشائخ میں سے تھے اور ان میں سے انتہائی پرہیزگار تھے۔ فقہ اور شریعت کے باقی علوم میں آپ اعلیٰ درجہ پر فائز تھے اور حضرت امام ثوری رحمۃ اللہ کا مذہب رکھتے تھے۔ طریقت میں حضرت ابوتراب نخشبی رحمۃ اللہ کے مرید تھے اور علی نصر آبادی جیسے بزرگ آپ کے ارادتمندوں میں شامل تھے۔ جملہ معاملاتِ طریقت میں آپ کے باریک رموز اور تمام طرح کے مجاہدات میں آپ کا کلام دقیق موجود ہے روایت ہے کہ جب علم میں آپ کا درجہ و مقام بہت بڑھ گیا تو نیشاپور کے ائمہ اور بزرگ آپ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ آپ کو بر سرِ منبر لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنی چاہیئے تاکہ لوگوں کو آپ کے کلام سے فائدہ ہو۔ آپ نے فرمایا "ابھی میرے لئے وعظ کہنا جائز نہیں" لوگوں نے پوچھا۔ آخر کیوں؟ آپ نے فرمایا اس لئے کہ میرا دل ابھی دنیا اور مرتبہ و جاہ میں وابستہ ہے اس لئے میری کلام کا نہ فائدہ ہو گا

اور نہ دلوں پر کوئی اثر ہوگا۔ اور جو کلام دلوں پر اثر انداز نہ ہو وہ علم کی توہین اور شریعت پر استہزاء کے مترادف ہے۔ وعظ کہنا تو اس شخص کے لئے ضروری ہے جس کی خاموشی سے دین میں خلل کا اندیشہ ہو اور جب وہ کلام کرے تو وہ اندیشہ اور نقصان رفع ہو جائے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ سلف صالحین کا کلام دلوں کو متاثر کرتا ہے اس کی وجہ کیا ہے ؟ تو فرمایا " لانھم تکلموا لعزالاسلام ونجاتِ النفوس و رضاء الرحمن ونحنُ نتکلم لعزِ النفسِ وطلب الدنیا وقبول الخلق " (اس لئے کہ سلف صالحین اسلام کی عزت، لوگوں کی نجات اور اللہ تعالےٰ کی خوشنودی کیلئے کلام کرتے تھے اور ہم اپنے نفس کی عزت۔ دنیا کی طلب اور مخلوق میں مقبول ہونے کے لئے کلام کرتے ہیں) پس جو کوئی حق کی مراد کے موافق کلام کرے اور حق بیان کرے تو اس کے کلام میں رعب اور اثر ہوتا ہے کہ وہ شریروں پر اثر کرتا ہے اور جو کوئی اپنی مراد کے موافق کلام کرتا ہے اس کی کلام میں ذلت اور رسوائی ہوتی ہے اور مخلوق کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور اس کا کچھ نہ کہنا کچھ کہنے سے بہتر ہوتا ہے کیونکہ اس کی اپنی عبارت سے مقصود بیگانہ اور فارغ ہوتا ہے۔

حضرت منصور بن عمار رحمۃ اللہ علیہ

اور انہی میں سے شیخ باوقار و دلوں کے اسرار سے واقف حضرت ابوالسری منصور بن عمار رحمۃ اللہ بھی ایک ہیں جو درجہ کے اعتبار سے بزرگ ترین مشائخ اور مقام کے اعتبار سے صوفیا میں بلند مقام شمار ہوتے ہیں۔ آپ کا تعلق صوفیاء عراق سے تھا تاہم اہلِ خراساں میں بھی مقبول تھے۔ وعظ و نصیحت میں آپ کا کلام بڑا اچھا اور بیان بہت لطیف ہوتا تھا آپ لوگوں کو وعظ کہا کرتے تھے۔ آپ علم کے فنون روایات و درایات اور احکام و معاملات کے بہت بڑے عالم تھے۔ بعض صوفی آپ کے بارے میں حد سے زیادہ مبالغہ کرتے ہیں ۔۔۔ آپ سے روایت ہے کہ فرمایا۔
، سبحان من جعل قلوب العارفین راعیۃ الذکر وقلوب الزاھدین اوعیۃ التوکل

وَقلوب المتوکلین اوعیۃ الرضاء وقلوب الفقراء اوعیۃ القناعۃ وقلوب اھلِ الدنیا اوعیۃ الطمع ٭ (پاک ہے وہ ذات جس نے عارفین کے دلوں کو اپنے ذکر کا محل، زاہدوں کے دلوں کو توکل کا محل، متوکلین کے قلوب کو رضاء کی جگہ، فقراء کے قلوب کو قناعت کا مقام اور اہلِ دنیا کے دلوں کو طمع ولالچ کا ٹھکانا بنا دیا ہے) اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حق تعالےٰ نے انسان کے جسم میں جو بھی عضو اور قوّتِ حاسہ پیدا فرمائی ہے اس میں اس عضو اور قوت سے مناسب ایک خاص بات رکھ دی ہے چنانچہ ہاتھوں کو گرفت کا محل، پاؤں کو چلنے کا، آنکھوں کو دیکھنے کا۔ کانوں کو سُننے کا اور زبان کو بولنے کا محل پیدا کیا اور ان امور کے وجود پذیر ہونے کے مقاصد میں کوئی زیادہ اختلاف نہیں ہوتا، پھر دلوں کو پیدا فرمایا تو ان میں سے ہر دل میں مختلف مقصد وخاصہ رکھا اور ہر ایک میں ارادہ اور خواہش دوسرے سے مختلف رکھے۔ چنانچہ کسی دل کو تو معرفتِ الہٰی کا محل بنا دیا اور کسی کو گمراہی کا مقام اور کسی دل کو قناعت کا ٹھکانا بنا دیا تو کسی کو لالچ کا مرکز اور اسی طرح دوسرے دلوں میں بھی مختلف خواص پیدا کر دیئے اور دلوں کے علاوہ کسی دوسرے عضو میں حق تعالےٰ کی اتنی عجیب وغریب کاریگری ظاہر نہیں ہوئی — اور نیز روایت ہے کہ آپ نے فرمایا" الناس رجلان عارف بنفسہٖ فشغلہٗ فی المجاھدات والریاضات وَعارف بربہٖ وشغلہ بخدمتہٖ وَعبادتہٖ وَمَرضاتہٖ") لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک اپنے نفس کا عارف! سو اس کا مشغلہ مجاہدے وریاضت میں ہوتا ہے اور دوسرا اپنے رب کا عارف سو اُس کی مشغولیت اللہ کی خدمت اس کی عبادت اور اس کی رضا جوئی ہوتی ہے) پس اپنے نفس کے عارف کی عبادت تو ریاضت ہوتی ہے لیکن عارفانِ حق کی عبادت رُویتِ حق ہوتی ہے۔ عارفِ نفس تو کسی درجہ کے حصول کے لئے عبادت کرتا ہے لیکن عارف باللہ کسی لالچ کے بغیر عبادت کرتا ہے کیونکہ درجہ تو اسے پہلے سے حاصل ہوتا ہے۔ پس دونوں الگ الگ مقامات میں ہوتے ہیں کہ ایک مقام مجاہدہ پر قائم ہوتا ہے اور دوسرا مقام مشاہدہ پر — نیز

روائت ہے کہ آپ نے فرمایا "النّاس رجلان مفتقرٌ الی اللہ فھو فی اعلیٰ الدرجات علیٰ لسان الشریعۃ والآخر لا یری الافتقار بما علم من فراغ اللہ من الخلق والرزق والاجل والحیوٰۃ والسعادۃ والشقاوۃ فھو فی افتقار الیہ واستغنائہ بہٖ عن غیرہ" لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک گروہ وہ جو اللہ تعالےٰ کی طرف محتاج ہوتا ہے سو یہ شریعت پر عمل کرنے کی وجہ سے درجات کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ پر ہوتا ہے اور دوسرا گروہ اپنی احتیاج کو اللہ تعالےٰ کی طرف دھیان میں نہیں لاتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ازل سے اس کی پیدائش، رزق، موت، زندگی، سعادت اور بدبختی وغیرہ کو مقرر کر رکھا ہے لہٰذا وہ اپنی زندگی کے تمام معاملات میں شیوہ تسلیم و رضا اختیار کرتے ہیں پس پہلا گروہ حق تعالےٰ کی طرف محتاج ہونے کی وجہ سے تقدیر الٰہی کی رویت سے حجاب ہوتا ہے اور دوسرا گروہ حق تعالےٰ کی طرف اپنی احتیاج کو پیش نہ کرنے کی وجہ سے حق تعالےٰ کی تجلیات کا مشاہدہ کرنے والا ہوتا ہے اور اسی لئے وہ ماسویٰ اللہ سے بے پرواہ ہوتے ہیں۔ پس ان میں سے ایک اللہ تعالےٰ کی نعمت حاصل کرتا ہے اور دوسرا خود منعم حقیقی کو پاتا ہے جو نعمت حاصل کرتا ہے وہ نعمت پالینے پر غنی ہونے کے باوجود فقیر ہوتا ہے اور جو منعم حقیقی کو حاصل کرتا ہے وہ بظاہر فقیر ہونے کے باوجود غنی ہوتا ہے

حضرت احمد بن عاصم انطاکی رحمۃ اللہ

ممدوح اولیاء اور اہل رضا کے مقتداء حضرت ابو عبد اللہ احمد بن عاصم انطاکی رحمۃ اللہ بھی انہی میں سے ایک ہیں۔ آپ قوم صوفیاء کے بزرگ اور سردار تھے آپ شرعی علوم کے اصول و فروع اور طریقت کے بہت بڑے عالم تھے۔ آپ نے بڑی طویل عمر پائی دور قدیم مشائخ کی صحبت اور تبع تابعین کی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ آپ حضرت بشر حافی اور حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ کے ہمعصر تھے حضرت حارث محاسبی رحمۃ اللہ کے مرید تھے اور حضرت فضیل رحمۃ اللہ کی زیارت کی تھی اور ان

سے فیضِ صحبت بھی حاصل تھا۔ سب لوگ آپ کی تعریف کرتے تھے اور صوفیائے کرام میں راسخ علوم میں آپ کا کلام بڑا بلند اور اشارات بڑے لطیف اور نفع بخش ہیں۔ آپ سے روایت ہے کہ فرمایا "انفعُ الفقرِ ماکنتَ بہٖ متجملاً وَبِہٖ راضیاً" (سب سے نفع مند فقر وہ ہے جس سے تو اپنے آپ کو آراستہ کرے اور اس پر راضی ہو) یعنی ساری مخلوق کا جمال تو اسباب کے ثابت کرنے سے ہوتا ہے لیکن فقر کا جمال اسباب کی نفی اور مسبب کے ثابت کرنے۔ اس کی طرف دھیان دینے اور اس کے احکام پر راضی ہونے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے کہ فقر اسباب کے کھو دینے کا نام ہے اور غنا اسباب کے وجود کا نام ہے۔ بغیر اسباب کے فقر حق تعالےٰ کے ساتھ ہوتا ہے اور اسباب کے ہمراہ فقر اپنی ذات کے ساتھ ہوتا ہے۔ پس اسباب مشاہدۂ حق سے حجاب کا محل ہیں اور اسباب کو چھوڑنا حق تعالےٰ کے مشاہدہ اور کشف کا محل ہے اور دونوں جہان کی خوبصورتی حق تعالےٰ کے مشاہدہ اور اُس کی خوشنودی میں ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور تمام دنیا حق تعالےٰ سے حجاب کی صورت میں ہیں۔ اور فقر کی تفصیل میں وضاحت کے ساتھ یہ بیان آئے گا۔

حضرت عبداللہ بن خفیف رحمۃ اللہ

اور تبع تابعین میں سے ایک پرہیزگاری و تقویٰ کی راہ کے سالک اور زہد میں اس اُمت کے یحییٰ حضرت ابو محمد عبداللہ خفیف رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔ آپ جملہ احوال میں اپنی قوم کے زاہدوں اور پرہیزگاروں میں شمار ہوتے تھے۔ احادیث کے بارے میں آپ کی روایات بہت بلند ہیں اور آپ فقہ میں حضرت امام ثوری کا مذہب رکھتے تھے۔ اسی طرح معرفت و حقیقت میں بھی آپ انہی کے مذہب پر قائم تھے اور آپ کے شاگردوں اور اصحاب کو دیکھا اور ان کی صحبت سے فیض حاصل کیا تھا۔ طریقت کے مقالات و معاملات میں آپ کا کلام لطیف ہے آپ سے روایت ہے کہ فرمایا "من ارادَ ان یکون حیاً فی حیواتہٖ فلا یسکن الطمع فی قلبہٖ" (جو شخص اپنی زندگی میں واقعی زندہ رہنا چاہتا ہو تو اُسے چاہیئے کہ اپنے دل میں لالچ کو ٹھکانہ نہ دے) تاکہ وہ سختی اور وبال۔ سے آزاد ہو جائے کیونکہ دل میں طمع

رکھنے والے کے جذبات لالچ کی وجہ سے مُردہ ہو جاتے ہیں۔ پس دل میں لالچ ہونے کی مثال بالکل ایسی ہی ہے کہ جیسے دل پر مہر لگی ہوئی ہو اور جس دل پر مہر لگ چکی ہو لامحالہ وہ مردہ ہوتا ہے۔ وہ دِل بڑا ہی خوش نصیب ہے کہ جو غیر اللہ سے مردہ اور حق تعالےٰ کے ساتھ زندہ ہو۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے ہر دل کے لئے ایک عزت اور ایک ذلت پیدا فرمائی ہے۔ اپنے ذکر کو دل کے لئے عزت اور لالچ کو اس کے لئے ذلت قرار دیا ہے۔ چنانچہ آپ نے ہی یہ بھی فرمایا ہے کہ "خلق اللہ القلوب مساکن الذکر فصارت مساکن الشہوات ولا یمحوا الشہوات من القلوب الا خوفٌ مُزعجٌ اوشوقٌ مقلقٌ" (حق تعالےٰ نے دلوں کو اپنے ذکر کی قیام گاہ بنایا ہے لیکن وہ نفس کی مصیبت کی وجہ سے خواہشات کا مسکن بن گئے۔ اور شہوات کو دلوں سے یا تو بے قرار کرنے والا خوف دور کر سکتا ہے اور یا بے آرام کر دینے والا شوق۔ پس شوق اور خوف ایمان کے دو ستون ہیں سے ہیں جب کوئی دل ایمان کا محل ہوتا ہے تو اس کے ساتھ قناعت اور ذکر الٰہی ہوتا ہے نہ کہ طمع اور غفلت پس مومن کا دل لالچی اور خواہشات کا تابع نہیں ہوتا۔ کیونکہ خواہش نفس اور لالچ وحشت کا نتیجہ ہوتے ہیں اور وحشت زدہ دل ایمان سے واقف نہیں ہوتا کیونکہ ایمان کو تو حق تعالےٰ سے اُنس اور غیر حق سے وحشت ہوتی ہے۔ اسی لئے بزرگوں کا قول ہے کہ "الطامع مستوحش منہ کل واجدٍ" (لالچی آدمی سے ہر کوئی وحشت زدہ اور متنفر ہوتا ہے)

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ

انہی تبع تابعین میں سے ایک طریقت میں شیخ المشائخ اور شریعت میں امام الائمہ حضرت ابوالقاسم جنید بن محمد بن جنید البغدادی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔ آپ اہلِ ظاہر اور اربابِ قلوب کے یکساں مقبول تھے اور علم کے جملہ فنون میں کامل اور معاملاتِ شریعت اور اصول و فروع میں مفتی اور امام کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ ثوری رحمۃ اللہ کے اصحاب میں سے تھے۔ آپ کا کلام اتنا عالی اور احوال اس قدر کامل تھے کہ تمام اہلِ طریقت آپ کی امامت پہ متفق ہیں اور کسی بھی مدعی اور متصرف کو آپ پر کوئی اعتراض نہیں۔ آپ حضرت سری

سقطی رحمۃ اللہ کے خواہر زادہ اور مرید تھے۔ ایک مرتبہ حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ "کیا کسی مرید کا درجہ اپنے مُرشد سے بڑھ سکتا ہے؟" آپ نے فرمایا ہاں! اور اس کی واضح سی دلیل ہے کہ جنیدؒ کا درجہ میرے درجہ سے بلند ہے۔" لیکن آپ کا یہ قول تواضع کی وجہ سے تھا اور آپ نے جو کچھ کہا وہ بصیرت کی بنا پر کہا ورنہ کوئی شخص اپنے سے اوپر نہیں دیکھا کرتا۔ کہ دیدار کا تعلق نیچے سے ہوتا ہے اور آپ کا یہ قول اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپ حضرت جنیدؒ کو اپنے سے اوپر دیکھا۔ تاہم اگرچہ آپ نے اپنے سے اوپر دیکھا لیکن درحقیقت وہ نیچے ہے ۔ اور یہ بات بڑی مشہور ہے کہ حضرت سرّی سقطی کی زندگی میں مریدوں نے حضرت جنیدؒ سے درخواست کی کہ " اے شیخ! آپ ہمیں کوئی نصیحت فرمائیے تاکہ ہمارے دلوں کو راحت نصیب ہو" آپ نے اُن کی درخواست قبول نہ کی اور فرمایا کہ جب تک میرے شیخ بقید حیات ہیں میں کوئی نصیحت نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ رات کو سو رہے تھے کہ خواب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ آپؐ نے فرمایا "اے جنید! لوگوں کو نصیحت کی باتیں کہا کرو کہ حق تعالےٰ نے تمہارے کلام کو ایک جہان کی نجات کا سبب بنا دیا ہے۔" آپ جب بیدار ہوئے تو دل میں خیال پیدا ہوا کہ شاید میرا درجہ حضرت سرّی سقطی رحمۃ اللہ سے بڑھ گیا ہے۔ اسی لئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے وعظ کہنے کا حکم دیا ہے۔ صبح ہوئی تو حضرت سرّی سقطیؒ نے اپنے ایک مرید کو بھیجا کہ جب جنید نماز سے فارغ ہو تو اسے کہنا کہ تم نے مریدوں کی درخواست پر تو انہیں وعظ نہیں کیا۔ پھر مشائخ بغداد کی سفارش کو بھی رُد کر دیا اور میرے پیغام بھیجنے پر بھی تم نے وعظ و نصیحت کا سلسلہ جاری نہیں کیا۔ لیکن اب جب کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تجھے حکم فرمایا ہے تو آپ کے فرمان پر ضرور عمل کرنا۔" حضرت جنیدؒ کہتے ہیں کہ یہ سُن کر وہ خیال میرے دل سے نکل گیا اور میں نے جان لیا کہ حضرت سرّی سقطی میرے ظاہری اور باطنی تمام احوال سے واقف ہیں اور آپ کا درجہ بہر حال میرے درجہ سے بہت بلند ہے کہ وہ تو میرے اسرار سے مطلع ہیں اور میں ان کے حالات سے بے خبر ہوں چنانچہ میں ان کی خدمت میں حاضر

ہوا اور اپنے خیال پر معافی مانگی اور پھر آپ سے پوچھا کہ آپ کو یہ علم کس طرح ہوا کہ میں نے خواب میں پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت کی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ "میں نے خواب میں اللہ عزوجل کو دیکھا کہ وہ مجھے فرمارہے ہیں کہ میں نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیجا ہے تاکہ وہ جنید سے فرمائیں کہ وہ مخلوق کو وعظ کہا کرے تاکہ اس سے اہلِ بغداد کی مُراد حاصل ہو۔" اس حکایت میں اس بات پر بڑی واضح دلیل موجود ہے کہ مرشد جس حالت میں بھی ہوں مریدوں کے باطنی احوال سے آگاہ ہوتے ہیں۔ آپ کا کلام بڑا بلند اور رموز بڑے لطیف ہیں۔ آپ سے روائت ہے کہ فرمایا "کلام الانبیاء نبأ عَنِ الحضورِ وکلام الصدیقینَ اشارات عن المشاھدہ" (انبیاء علیہم السلام کا کلام رب العزت کے حضور کی خبر دیتا ہے اور صدیقین کا کلام مقام مشاہدہ کی طرف اشارہ اور رہنمائی کرتا ہے) خبر کی صحت دیکھنے سے ہوتی ہے اور اشارہ کی صحت تفکر اور سوچ سے۔ اور خبر عین ذات کے علاوہ نہیں دی جا سکتی اور اشارہ غیر کے سوا نہیں ہو سکتا پس صدیقین کے کمال کی انتہاء سے انبیاء کے احوال کی ابتداء ہوتی ہے اور اس بیان سے نبی اور ولی کے درمیان فرق اور انبیاء کی اولیاء پر فضیلت واضح ہے بخلاف ملحدین کے دو گروہوں کے کہ جو انبیاء کرام کو فضیلت میں مؤخر اور اولیاء کرام کو مقدم سمجھتے ہیں۔ نیز آپ سے روائت ہے کہ فرمایا "ایک دفعہ میں نے خواہش کی کہ میں ابلیس کو دیکھوں چنانچہ میں ایک دن مسجد کے دروازے پر کھڑا تھا کہ ایک بوڑھا شخص دور سے میری طرف آتا دکھائی دیا۔ جب میں نے اُسے دیکھا تو وحشت نے میرے دل میں اثر پیدا کیا جب وہ میرے نزدیک آیا تو میں نے پوچھا کہ اے بوڑھے! تو کون ہے کہ وحشت کی وجہ سے میری آنکھ تجھے دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتی اور ہیبت سے میرے دل میں تیرا خیال لانے کی ہمت نہیں ہے؟" اُس نے جواب دیا کہ "میں وہی ہوں جسے دیکھنے کی آپ کو آرزو تھی" میں نے کہا "اے ملعون! آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے روک لیا تھا؟" اس نے کہا "اے جنید! تمہارے دل میں یہ خیال کیوں پیدا ہوا کہ میں اللہ تعالےٰ کی ذات کے علاوہ کسی اور کو سجدہ کرتا؟" حضرت جنید رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا یہ جواب

سُن کر میں بڑا حیران ہوا اور مجھے کوئی جواب سمجھ نہ آیا کہ یکایک میرے دل سے آواز آئی کہ "قل لہ کذبت لو کنت عبداً مامورا لما خرجت من امرہ إلی نہیہ فسمع الندا من قلبی فصاح وقال احرقتنی باللہ وغاب" (اے جنید! اُس سے کہو کہ تو جھوٹ کہتا ہے کہ اگر تو اللہ تعالےٰ کا فرمانبردار بندہ ہوتا تو اس کے حکم سے نکل کر اس کی منع کردہ چیز کی طرف نہ جاتا" پس اس نے میرے دل سے یہ آواز سُنی تو چلایا اور کہنے لگا خدا کی قسم تو نے مجھے جلا دیا ہے اور پھر وہ غائب ہو گیا) یہ حکایت آپ کی ابلیس سے حفاظت اور عصمت کی دلیل ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ اپنے اولیاء کو تمام احوال میں شیطان کی مکاریوں سے محفوظ رکھتے ہیں — آپ کی طرف سے ایک دفعہ ایک مرید کے دل میں ناراضگی پیدا ہو گئی اور اس نے سمجھا کہ شاید میں کسی درجہ پر پہنچ گیا ہوں اس لئے آپ سے روگردانی کر لی۔ پھر ایک روز آپ کی آزمائش کرنے کے لئے آپ کے پاس آیا لیکن آپ اس کے حالات سے مطلع ہونے کی وجہ سے اس کے آنے کا مقصد سمجھ گئے" چنانچہ اس نے کوئی سوال کیا تو حضرت جنیدؒ نے پوچھا کہ اس سوال کا جواب تم الفاظ میں چاہتے ہو یا معانی میں؟ اس نے کہا" دونوں صورتوں میں جواب چاہتا ہوں" آپ نے فرمایا" اگر عبارت میں جواب چاہتے ہو تو یہ ہے کہ اگر تو نے اپنے آپ کو آزمایا ہوتا تو میرا تجربہ کرنے کی ضرورت تمہیں محسوس نہ ہوتی اور یہاں مجھے آزمانے کے لئے نہ آتے" اور اگر معنوی جواب چاہتے ہو تو وہ یہ ہے کہ میں نے تجھے ولائت سے معزول کر دیا ہے" چنانچہ اسی وقت اس مرید کا چہرہ سیاہ ہو گیا اور چلانے لگا کہ یقین کی راحت میرے دل سے اُٹھ گئی ہے" پھر توبہ و استغفار میں مشغول ہو گیا اور اس فضول خیال کو چھوڑ دیا" تب حضرت جنیدؒ نے اس سے فرمایا کیا تو جانتا نہ تھا کہ اولیاء اللہ مخفی رازوں سے واقف ہو جاتے ہیں اور تم ان کا زخم برداشت نہیں کر سکتے! پھر آپ نے اس پر پھونک ماری تو وہ اپنی پہلی حالت کے مطابق اچھا ہو گیا اور مشائخ کے معاملات میں تصرف کرنے سے توبہ کر لی۔

حضرت احمد بن محمّد نوری رحمۃ اللہ علیہ

اور انہی میں سے طریقت میں شیخ المشائخ شریعت میں امام الائمہ، اہلِ تصوف کے بادشاہ اور تکلف کی آفت سے بَری حضرت ابوالحسن احمد بن محمد الخراسانی نوری رحمۃ اللہ بھی ہیں۔ آپ اچھے معاملات واضح کلمات اور روشن مجاہدات کے مالک تھے اور تصوف میں آپ کا مذہب مخصوص تھا۔ صوفیاد میں سے ایک گروہ ہے جس کو نوری کہا جاتا ہے وہ آپ کی اقتداء کرتا اور آپ سے عقیدت رکھتا تھا اور جان لو کہ تمام صوفیاد کے بارہ گروہ ہیں۔ ان میں سے دو گروہ مردود اور دس گروہ مقبول ہیں۔ جو گروہ مقبول ہیں وہ یہ ہیں (۱) محاسبی (۲) قصاری (۳) طیفوری (۴) جنیدی (۵) نوری (۶) سہیلی (۷) حکیمی (۸) خرازی (۹) خفیفی (۱۰) مستاری۔

اور یہ سب کے سب اہل تحقیق اور اہلِ سنت وجماعت کے گروہ ہیں۔ باقی جو دو گروہ مردود ہیں اُن میں سے ایک تو حلولی ہیں جو حلول اور امتزاج کی طرف منسوب ہے، سالمی اور مشبہ انہی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں ــــ اور دوسرے حلاجی ہیں جنہوں نے شریعت کو ترک کرکے الحاد اختیار کرلیا اور مردود ہو گئے اباحتی اور فارسی فرقے انہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں اس کتاب میں اپنے مقام پر ایک مستقل باب ان گروہوں کے فرق میں تحریر کروں گا جس میں ان دو فرقوں کے درمیان اختلاف اور ان دو گروہوں کی مخالفت کو بیان کروں گا۔ تاکہ انشاء اللہ مکمل فائدہ حاصل ہو۔ تاہم حضرت احمد نوری رحمۃ اللہ کا طرز عمل دین کے معاملات میں سستی وچشم پوشی ترک کرنے اور ہمیشہ مجاہدہ کرنے میں قابلِ تعریف طریقہ ہے اور آپ سے روائت ہے کہ فرمایا "میں حضرت جنید رحمۃ اللہ کی خدمت میں آیا تو آپ کو مسند ارشاد پر تشریف فرمایا یا میں نے کہا" یا ابا القاسم غششتہم فصدّروک ونصحتہم فرموني بالحجارۃ" (اے ابو القاسم! آپ نے ان سے حق چھپایا

تو انہوں نے آپ کو مسند وعظ پر بٹھا دیا اور میں نے ان کو نصیحت کی تو انہوں نے مجھ پر پتھر برسائے) اس لئے کہ دین میں مداہنت کو نفسانی خواہشات سے موافقت ہے اور نصیحت کو اس سے مخالفت اور انسان اس چیز کا دشمن ہوتا ہے جو اس کی خواہشات کے برعکس ہو اور جو چیز اس کی خواہش نفس کے موافق ہو اس کا دوست ہوتا ہے ـــ اور حضرت ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ، حضرت جنید رحمۃ اللہ کے رفیق اور حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ کے مرید تھے۔ آپ کو بہت سے مشائخ کی زیارت اور ان کی صحبت کا شرف حاصل ہوا تھا اور حضرت احمد بن ابی الحواری رح کو بھی پایا تھا۔ تصوف و طریقت میں آپ کے اشارات بڑے لطیف اور اقوال بڑے خوبصورت ہیں اور علم کے تمام شعبوں میں آپ کے نکات بہت بلند ہیں۔ آپ سے روایت ہے کہ فرمایا "الجمع بالحق تفرقۃٌ عن غیرہٖ والتفرقۃ من غیرہٖ جمعٌ بہٖ" (حق تعالےٰ سے وابستہ ہونا اس کے غیر سے علیحدگی ہے اور غیر اللہ سے علیحدہ ہونا حق تعالےٰ سے وابستگی ہے)، یعنی جس کسی کا ارادہ حق تعالےٰ کے ساتھ مجتمع اور وابستہ ہے وہ اس کے غیر سے جدا ہے اور جو کوئی اس کے غیر سے منقطع ہے وہ حق تعالےٰ کے ساتھ متعلق اور مجتمع ہے۔ پس ہمت و ارادہ کا حق تعالےٰ کے ساتھ وابستہ کرنا، مخلوقات کے خیال سے جدا ہونا ہے۔ چنانچہ جب موجودات سے روگردانی صحیح ہو گئی تو حق تعالےٰ کی طرف توجہ درست ہو گئی اور مخلوق سے اعراض درست ہو گیا کیونکہ "الضدان لا تجتمعان" (دو ضدیں جمع نہیں ہو سکتیں) ـــ میں نے حکایات میں پڑھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت نوری رحمۃ اللہ تین دن رات تک مکان میں ایک ہی جگہ کھڑے ذکر الٰہی میں مشغول رہے۔ لوگوں نے حضرت جنید رح کے سامنے یہ حالت بیان کی تو آپ اُٹھے اور ان کے پاس تشریف لائے اور کہا۔ اے ابوالحسن! اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اس کے سامنے شور و غوغا کچھ مفید ہے تو مجھے بھی بتاؤ تاکہ میں بھی اسی طرح بلند آواز سے ذکر کروں اور اگر جانتے ہو کہ اس کے یہاں شور و غوغا قطعاً سود مند نہیں تو پھر دل کو تسلیم و رضا میں لگا دو تاکہ تمہارے دل

کو راحت نصیب ہو۔ حضرت نوری نے شور کرنا چھوڑ دیا اور کہا کہ اے ابوالقاسم آپ ہمارے بہتر معلّم ہیں ۔۔۔۔ اور آپ سے ہی روایت میں آتا ہے کہ فرمایا "اَعَزّ الاشیاءِ فی زماننا شیئانِ عَالِم یعمل بعلمہٖ وَعارف ینطقُ عَنِ الحقیقۃِ" (ہمارے زمانے میں دو چیزیں سب سے عزت والی ہیں۔ ایک وہ عالم جو اپنے علم کے تقاضوں کیمطابق عمل کرے اور دوسرا وہ عارف جو اپنی حقیقت حال کے مطابق گفتگو کرتا ہے) یعنی ہمارے زمانے میں علم اور معرفت دونوں ہی عزیز ہیں۔ اس لئے کہ علم، عمل کے بغیر علم ہی نہیں ہوتا اور معرفت، حقیقت کے بغیر معرفت ہی نہیں ہوتی ۔۔۔ اس پیر حضرت نوری نے تو یہ اپنے دور کا پتہ بتایا ہے۔ لیکن ہر دَور میں ہی یہ دو چیزیں عزیز رہی ہیں اور آج بھی عزیز ہیں اور جو کوئی علم اور معرفت کی تلاش میں مشغول ہو اس کی حالت پراگندہ ہو جاتی ہے لیکن وہ مقصد حاصل نہیں کر سکتا لہٰذا اُسے اپنے آپ میں مشغول ہو جانا چاہیئے تاکہ وہ تمام جہان کو عالم اور عارف دیکھے اور اپنی طرف سے حق تعالےٰ کی طرف رجوع کرے تاکہ تمام اہلِ عالم کو عارف دیکھے۔ اس لئے کہ عالم و عارف عزیز ہوتے ہیں اور عزیز مشکل سے ملا کرتے ہیں۔ اور جس چیز کا حصول دشوار ہو اس کی تلاش کرنا وقت کا ضیاع ہے۔ اس لئے علم معرفت اور عمل و حقیقت اپنی ذات میں ہی تلاش کرنے چاہئیں ۔۔۔ آپ سے ہی آتا ہے کہ فرمایا "مَنْ علم الاشیاءِ باللّٰہِ فرجوعہ فی کل شیئٍ الی اللّٰہ" (جو شخص تمام اشیاء کو اللہ تعالےٰ کی وجہ سے جانتا اور پہچانتا ہے وہ ہر چیز میں اللہ تعالےٰ کی طرف ہی رجوع کرتا ہے) اس لئے کہ ملکیت اور حکومت کا قیام مالک کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ اس لئے راحت خالق کو دیکھنے سے ہوتی ہے نہ کہ مخلوق کی رویت سے۔ کیوں کہ اگر چیزوں کو افعال کے اسباب جانے گا تو ہمیشہ رنج زدہ رہے گا اور ہر چیز کی طرف رجوع کرنا اس کے لئے شرک ہوگا۔ جب اشیاء کو افعال کا سبب جانے گا تو جان لے گا کہ سبب خود بخود تو قائم نہیں ہوتا بلکہ مسبب کے ساتھ قائم ہوتا ہے لہٰذا جب وہ مسبب الاسباب کی طرف رجوع کرے گا تو تعلقاتِ دنیا سے رجوع پا جائے گا۔

حضرت سعید بن اسمٰعیل الحیری رحمۃ اللہ

اور انہی تبع تابعین میں سے سلفِ صالحین کے امام اور اپنے اسلاف کے سچے جانشین حضرت ابو عثمان سعید بن اسماعیل الحیری رحمۃ اللہ بھی ایک ہیں۔ آپ قدیم اور بزرگ صوفیاء میں سے تھے۔ اپنے دور کے مرد یکتا تھے اور تمام صوفیاء کے دلوں میں آپ کی بڑی قدر تھی۔ اولاً آپ حضرت یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ کی صحبت میں رہے اور اس کے بعد حضرت شاہ شجاع کرمانی رحمۃ اللہ کی صحبت میں رہے اور انہی کے ہمراہ نیشاپور میں حضرت ابو حفص رحمۃ اللہ کی زیارت کے لئے آئے اور باقی تمام زندگی انہی کی صحبت میں گزار دی۔ بڑے ثقہ لوگ آپ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "بچپن کی عمر میں میرا دل ہمیشہ ایک حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا اور اہلِ ظاہر سے نفرت کرتا تھا اور میں جانتا تھا کہ لا محالہ لوگ جس ظاہر پر عمل پیرا ہیں اس کے علاوہ شریعت کا ایک باطن بھی ہے۔ حتیٰ کہ میں نے اپنا مقصود پالیا ایک روز میں حضرت یحییٰ بن معاذ رازیؒ کی مجلس میں پہنچ گیا اور وہ راز میں نے پالیا اور اپنا مقصد حاصل کر لیا تو میں نے انہی کی صحبت اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ حضرت شاہ شجاع کرمانیؒ کے ہاں سے ایک جماعت یہاں آئی اور ان کی صفات بیان کیں تو میں نے اپنے دل کو ان کی زیارت کی طرف مائل پایا اور میں نے رے سے کرمان جانے کا ارادہ کر لیا اور حضرت شاہ شجاعؒ سے ان کی صحبت کا طریق حاصل کرنے کی درخواست کی مگر انہوں نے اجازت مرحمت نہ فرمائی کہ تمہاری طبیعت رجاء پروردہ ہے اور تم نے حضرت یحییٰؒ کی صحبت حاصل کی ہے اور ان کا مقام رجاء ہے اور جس کسی نے رجاء کا شرب پایا ہو اسے طریقت اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے، کیونکہ رجاء کی تقلید کرنے والے میں کاہلی پیدا ہو جاتی ہے آپ کہتے ہیں کہ میں نے بڑی تضرع اور زاری کی اور بیس روز تک ان کی درگاہ پہ پڑا رہا تب کہیں انہوں نے مجھے اجازت دی اور اپنی صحبت کے لئے قبول فرمایا

اور میں ایک عرصہ تک ان کی صحبت میں رہا وہ بڑے ہی غیور بزرگ تھے۔ حتیٰ کہ آپ نے نیشاپور جا کر حضرت ابو حفص رح کی زیارت کرنے کا ارادہ کیا تو میں بھی آپ کے ساتھ ہو لیا۔ جس روز ہم حضرت ابو حفص رح کے یہاں پہنچے حضرت شاہ شجاع رح نے قبا پہن رکھی تھی۔ جب حضرت ابو حفص نے آپ کو دیکھا تو احتراماً کھڑے ہو گئے اور استقبال کے لئے آگے بڑھ کر کہا "وَجَدْتُ فی القباءِ مَاوَجَدْتُ فی العباءِ" (میں جو چیز گدڑی میں تلاش کر رہا تھا وہ میں نے قباء میں پالی ہے) حضرت شاہ رحمۃ اللہ ایک عرصہ تک وہاں رہے اور اس دوران حضرت ابو حفص نے میری ساری توجہ کو اپنی گرفت میں لے لیا تاہم حضرت شاہ رح کا رعب مجھے ان کی صحبت میں ہمیشہ رہنے سے باز رکھتا۔ لیکن حضرت ابو حفص رح میرے دل کی اس ارادت کو دیکھ رہے تھے اور میں اللہ تعالےٰ سے بڑی عاجزی کے ساتھ یہ مانگتا رہتا تھا کہ کسی طرح حضرت ابو حفص رح کی صحبت مجھے میسر آجائے اور حضرت شاہ بھی آزردہ نہ ہوں یہاں تک کہ جس روز حضرت شاہ نے واپسی کا ارادہ کیا تو میں نے بھی ان کی موافقت میں تیاری کی اور سفر کا لباس پہن لیا اور اپنا دل حضرت ابو حفص کے پاس چھوڑ دیا۔ حضرت ابو حفص نے حضرت شاہ سے کہا کہ صحبت کی انبساط کا خیال رکھتے ہوئے اس لڑکے کو اسی جگہ چھوڑ جائیے کہ مجھے اس سے بڑی خوشی نصیب ہوتی ہے۔ حضرت شاہ نے اپنا چہرہ میری طرف کیا اور فرمایا "اجب الشیخ" (شیخ کی بات مان لو) چنانچہ حضرت تو تشریف لے گئے اور میں یہیں رہ گیا۔ یہاں تک کہ حضرت ابو حفص کی صحبت میں بڑے ہی عجائب و غرائب دیکھے اور آپ کا مقام شفقت کا مقام تھا۔ اس طرح اللہ عزوجل نے تین رہناؤں کے ذریعہ مجھے تین مقامات سے گزار دیا۔ یہ تینوں مقام جن کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے۔ خود آپ کو حاصل تھے۔ مقام رجاء حضرت یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ کی صحبت سے، مقام غیرت حضرت شاہ شجاع رحمۃ اللہ کی صحبت سے اور مقام شفقت حضرت ابو حفص رحمۃ اللہ کی صحبت سے حاصل ہوا اور یہ بات درست ہے کہ کوئی مرید پانچ۔ چھ یا اس سے بھی زیادہ رہناؤں کی صحبت سے منزل تک پہنچ جائے اور پیر اور اس کی صحبت سے اس کو کشف میں ایک مقام حاصل ہو۔ لیکن

بہتر یہ ہے کہ نہ تو پیروں کو اپنے مقام سے آلودہ کرے اور نہ ہی ان کی نہایت کو اپنے مقام میں محدود سمجھے اور کہے کہ مجھے ان کی صحبت سے یہ حصّہ ملا ہے اور کا درجہ اس سے بلند ہے ان کے پاس میرے لئے اس سے زیادہ حصّہ موجود نہ تھا یہ بات ادب سے زیادہ نزدیک ہے کیونکہ راہ حق کے کاملین کو مقام و احوال سے سروکار نہیں ہوتا ــــ نیشاپور اور خراسان میں تصوف کے اظہار کا آپ ہی ذریعہ تھے۔ آپ نے حضرت جنید، حضرت رُویم، حضرت یوسف بن الحسین اور حضرتِ محمد بن فضل بلخی رح کی صحبت سے بھی استفادہ کیا تھا۔ اور مشائخ میں سے کسی شیخ نے اپنے شیوخ سے وہ فائدہ حاصل نہیں کیا جو آپ نے اپنے پیروں سے حاصل کیا تھا۔ نیشاپور کے رہنے والوں نے آپ کے لئے ایک منبر رکھ دیا تھا تاکہ آپ تصوف کی زبان میں ان کے سامنے وعظ کہا کریں گے۔ طریقت کے علم کے تمام فنون میں آپ کی کتابیں بلند پایہ اور روایات بڑی پختہ ہیں۔ آپ سے روایت ہے کہ فرمایا "حق لِمَن اعزہ اللّٰہ بالمعرفۃِ اَن لایزلہ بالمُعْصِیۃ" (جس کو اللہ تعالےٰ نے اپنی معرفت سے عزت بخشی ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو معصیت کے ساتھ ذلیل نہ کرے) اور اس چیز کا تعلق بندہ کے اپنے کسب کے ساتھ ہے اور اس کا مجاہدہ ہمیشہ امورِ حق کی رعایت کرنا ہے اور اگر تم اس کا راز جاننا چاہو تو وہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالےٰ کسی کو اپنی معرفت سے عزیز بنا دیں تو اُسے چاہیئے کہ وہ معصیت سے اپنے آپ کو ذلیل نہ کرے۔ کیونکہ معرفت اللہ تعالےٰ کی عطاء ہے اور معصیت انسان کا اپنا فعل ہے اس لئے جو شخص اللہ تعالےٰ کی عطاء سے صاحب عزت ہو اس کے لئے نامناسب ہے کہ وہ اپنے فعل سے ذلیل ہو جائے۔ جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جب اللہ تعالےٰ نے اپنی معرفت سے عزت بخشی تو پھر ان کی لغزش کی وجہ سے انہیں عزت سے گرایا نہیں۔

حضرت ابوعبداللہ احمد بن یحییٰ رحمۃ اللہ

اوجِ معرفت کے سہیل اور محبت الٰہی کے قطب حضرت ابوعبداللہ احمد بن یحییٰ بن جلالی رحمۃ اللہ بھی تبع تابعین میں سے اپنی قوم کے بزرگوں اور اپنے وقت کے سرداروں میں سے ہیں۔ آپ کے طریقے بہت اچھے اور سیرت بڑی قابلِ تعریف تھی۔ آپ کو حضرت جنید حضرت ابوالحسن نوری اور بڑے بزرگوں کی ایک جماعت کا رفیق ہونے کا شرف حاصل تھا۔ حقائق طریقت میں آپ کا کلام بڑا بلند اور اشارات انتہائی لطیف ہیں۔ آپ سے روائت ہے کہ فرمایا "ھمۃ العارف الی مولاہ ولم یعطف علی شیئ سواہ" (عارف کی توجہ اپنے مولا کی طرف ہوتی ہے اور وہ اُن کے سوا کسی چیز پر ہرگز دھیان نہیں دیتا) اس لئے کہ عارف کو معرفت کے علاوہ کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ جب اس کے دل کا سرمایہ ہی معرفت ہوتا ہے تو پھر اس کے ارادوں کا مرکز بھی دیدارِ حق ہوتا ہے۔ کیونکہ ارادوں کا پراگندہ ہونا غم کا باعث بنتا ہے اور غم اس کو بارگاہِ حق سے روک دیتے ہیں۔ اور آپ سے حکایت بیان کرتے ہیں کہ فرمایا "میں نے ایک روز ایک بڑے ہی خوبصورت کافر نوجوان کو دیکھا اور اس کے حسن و جمال میں متحیر ہو کر رہ گیا اور اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا کہ حضرت جنید کا میرے پاس سے گزر ہوا تو میں نے ان سے کہا "اے استاد! اللہ تعالےٰ اس جیسے چہرے کو دوزخ کی آگ میں جلائے گا؟ حضرت جنید نے کہا بیٹے! یہ نفس کا بازار ہے جو تجھے اپنی طرف بلا رہا ہے یہ عبرت کا نظارہ نہیں کیونکہ اگر تو عبرت کی نگاہ سے دیکھے تو جہان کے ہر ذرے میں اسی طرح کا تعجب انگیز حسن موجود ہے لیکن صنعت الٰہی کی اس بے حرمتی کی وجہ سے بہت جلد تو کسی گرفت میں مبتلا ہو جائے گا" آپ کہتے ہیں کہ جب جنیدؒ نے میری طرف سے منہ پھیرا اسی وقت مجھے قرآن مجید بھول گیا اور پھر کئی سال تک میں اللہ تعالےٰ سے استعانت چاہتا اور توبہ کرتا رہا تب جا کر کہیں مجھے قرآن یاد ہوا اور اب میں اس بات کی طاقت نہیں رکھتا کہ موجودات کی کسی بھی چیز کی طرف توجہ کر کے ان چیزوں کو دیکھنے میں اپنا وقت

ضائع کروں۔

حضرت ابو محمدؒ رویم بن احمد رحمۃ اللہ علیہ

اپنے دَور کے یکتا اور زمانہ کے امام حضرت ابو محمد رویم بن احمد رحمۃ اللہ بھی تبع تابعین میں سے بڑے بلند پایہ بزرگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ حضرت جنید رحمۃ اللہ کے محرم راز اور قریبی ساتھی تھے۔ حضرت داؤد رحمۃ اللہ کے فقہی مسلک پر چلنے والے فقہا کے سردار اور علم تفسیر و علم قرأت میں پوری مہارت رکھتے تھے اور اس دَور میں فنونِ علم میں آپ جیسا بلند حال اور اعلیٰ مقام کوئی نہ تھا آپ نے تجرید میں بڑے اچھے سفر اور تفرید میں بڑی سخت ریاضتیں برداشت کی تھیں۔ آپ نے آخری عمر میں اپنے آپ کو دنیا داروں میں چُھپا لیا اور عہدۂ قضاء کا معاہدہ کر لیا تھا حالانکہ دنیا کے حجاب میں آجانے سے آپ کا درجہ کہیں زیادہ بلند تھا۔ یہاں تک کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ ہم دنیا سے فارغ رہتے ہوئے بھی ان میں مشغول ہیں اور رویمؒ اس میں مشغول ہوتے ہوئے بھی اس سے فارغ ہے۔ علم طریقت میں آپ کی بہت سی کتابیں ہیں خصوصاً وہ کتاب کہ جس کا نام "غلط الواجدین" رکھا ہے اور وہ مجھے بڑی پسند ہے۔ روایات میں ہے کہ ایک دن کسی نے آپ کے پاس آکر پوچھا کہ "کیف حالکَ" (آپ کا حال کیا ہے؟) آپ نے فرمایا "کیفَ حالُ من دینہٗ ھواہ وَھمتہٗ دنیاہ لَیْسَ ھُوَ بصالح تقی وَلا بِعارِفٍ نقی" (اس شخص کا حال کیا ہوگا جس کا دین اس کی خواہش ہو اور جس کا مقصود اپنی دنیا ہو۔ وہ نہ تو متقی صالح ہے اور نہ ہی پاکیزہ عارف ہے) اور آپ نے اس طرح نفس کے عیوب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس لئے کہ نفس کے نزدیک دین، خواہش نفس ہے اور نفس کا اتباع کرنے والے اپنی خواہشات کو دین کا نام دے دیتے ہیں اور اس کی متابعت کو شریعت کا درجہ دے دیتے ہیں۔ چنانچہ جو کوئی اس کی منشا کے مطابق چلے وہ اگرچہ بدعتی ہی ہو اس کے نزدیک دین دار ہوتا ہے اور جو کوئی اس کی منشاء کے خلاف چلے اگرچہ متقی ہی ہو ان کے نزدیک بے دین قرار پاتا ہے اور یہ بُرائی ہمارے زمانہ میں بھی ایک دوسرے سے الگ

نہیں ہوئی اور شائع ہو رہی ہے۔ پس ہم ایسے آدمی کی صحبت سے اللہ تعالےٰ کی پناہ چاہتے ہیں ــ باقی ہو سکتا ہے کہ حضرت نے اس طرح سائل کے حال کی حقیقت بیان کی ہو نیز یہ بھی درست ہے کہ آپ نے سائل کو تو اس کی حالت پر چھوڑ دیا ہو اور نصیحت و تادیب کے لئے ان باتوں کو اپنی طرف منسوب کر لیا ہو کیونکہ تبلیغ کا یہ بھی ایک طریقہ ہے ــ

حضرت یوسف بن حسین رازی رحمۃ اللہ

اپنے زمانہ کے بے مثال اور بلند مرتبہ حضرت ابو یعقوب یوسف بن حسین رازی رحمۃ اللہ علیہ بھی تبع تابعین میں سے اپنے وقت کے بڑے ائمہ اور قدیم مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ نے طویل عمر پائی اور حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ کے مرید تھے۔ بہت سے مشائخ کی صحبت کا شرف حاصل ہوا اور سب کی خدمت کا کام سرانجام دیا۔ آپ سے روائت ہے کہ "اذل الناس الفقیر الطماع واعزھم اعحبُّ لمحبوبہ الصدیق" (لوگوں میں سب سے زیادہ ذلیل وہ فقیر ہے جو لالچی ہو اور تمام لوگوں میں صاحب عزت وہ ہے جس نے اپنی تمام صحبت کو محبوب کے لئے خالص کر دیا) اور طمع درویش کو دونوں جہان کی رسوائی میں ڈال دیتی ہے کیونکہ درویش تو ویسے بھی اہلِ دنیا کی نگاہوں میں حقیر ہوتے ہیں لہٰذا جب وہ طمع کریں تو اور بھی ذلیل ہو جاتے ہیں۔ پس عزت والے غنی اس فقیر سے بہتر ہیں جو ذلت سے دوچار ہوں اور طمع درویش کو جھوٹ کا ارتکاب کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ محب اپنے محبوب کی نگاہوں میں ساری مخلوق سے زیادہ ذلیل ہوتا ہے کیونکہ محب خود بھی اپنے آپ کو اپنے محبوب کے مقابلہ میں سخت حقیر سمجھتا ہے اور اس کے سامنے تواضع کرتا ہے اور یہ سب طمع کے نتائج میں سے ہے۔ لیکن جب یہ لالچ ختم ہو جائے تو پھر ذلت تمام تر عزت میں بدل جاتی ہے۔ جیساکہ جب تک زلیخا کو حضرت یوسف علیہ السلام کی حرص تھی ہر قدم پر ذلت سے دوچار رہی لیکن جب اس نے لالچ چھوڑ دیا اور اپنے دل سے ان کی حرص نکال دی تو خدا تعالیٰ نے اسے حسن اور جوانی دوبارہ لوٹا دی اور اسی طرح ہونا ہی تھا کہ محب کی رغبت

پر محبوب اعراض اور روگردانی کرتا ہے اور بے اعتنائی سے پیش آتا ہے لیکن جب محب اپنی رغبت کو چھوڑ دیتا اور صرف دلی ربط و تعلق پر ہی اکتفا کر لیتا ہے تو محبوب بے چین ہو کر خود بخود اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک محب کو وصل کی طمع نہ ہو اس کے لئے عزت ہے لیکن جب اس کو وصال کا لالچ لاحق ہو جاتا ہے تو پھر ساری عزت، ذلت بن جاتی ہے اور محبت وہ خالص ہوتی ہے جس میں محبوب کے فرق و وصال کی گنجائش نہ ہو۔

حضرت سمنون بن عبداللہ رحمۃ اللہ

اہلِ محبت کے آفتاب اور پیشوا حضرت ابوالحسن سمنون بن عبداللہ الخواص رحمۃ اللہ بھی بزرگانِ تبع تابعین میں سے ایک ہیں۔ آپ اپنے دور میں بے نظیر اور محبت خداوندی میں بڑی بلند شان کے مالک تھے تمام مشائخ آپ کو بزرگ جانتے اور آپ کو سمنون المحب کے نام سے پکارتے تھے لیکن آپ خود اپنے آپ کو سمنون الکذاب کے نام سے متعارف کراتے تھے ـــ آپ نے غلام الخلیلی نامی ایک شخص سے بڑے رنج برداشت کئے تھے اس نے ایک مرتبہ خلیفہ وقت کے سامنے ایسی باتوں کی آپ کے متعلق گواہی دی جن کا آپ سے صادر ہونا محال تھا۔ اس سے تمام مشائخ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ دراصل یہ غلام الخلیل ایک ریاکار آدمی تھا جس نے تصوف اور پارسائی کا دعویٰ کر رکھا تھا اور دین کو دنیوی دولت و عزت کے بدلہ میں بیچ کر خلیفہ وقت کے دربار میں اپنی پارسائی کا ڈھونگ رچا رکھا تھا۔ جیسا کہ اس دور میں بھی ہو رہا ہے اور پھر بادشاہ اور اس کے درباریوں کے سامنے مشائخ اور درویشوں پر نکتہ چینیاں کرتا تھا تاکہ لوگ ان بزرگوں سے دور رہیں اور اُن سے کوئی فیض حاصل نہ کر سکیں، اس طرح خود اس کا مرتبہ قائم رہے۔ حضرت سمنون اور اُس دور کے مشائخ بڑے خوش نصیب تھے کہ ان کے لئے اس طرح کا دشمن صرف ایک تھا ورنہ اس دور میں تو ہر محقق صوفی کے لئے سینکڑوں، ہزاروں بلکہ لاکھوں غلام الخلیل موجود ہیں ـــ لیکن کوئی پرواہ نہیں کیونکہ مردار، کرگسوں

(گدھوں) کے ہی قابل ہوتا ہے ۔۔۔ اور جب بغداد میں حضرت سمنون کا مرتبہ بڑھ گیا اور ہر کوئی آپ کا قرب تلاش کرنے لگا تو غلام الخلیل کو بڑی تکلیف ہوئی اور اس نے آپ پر بہتان لگانے اور رنجیدہ کرنے کے ہتھکنڈے شروع کر دیئے یہاں تک کہ ایک عورت کو آپ کے پاس بھیجا۔ حضرت سمنون کی نگاہ اس کے جمال پر پڑی اور اس عورت نے اپنے آپ کو حضرت سمنون پر پیش کیا تو آپ نے صاف انکار کر دیا۔ وہ حضرت جنید رحمۃ اللہ کے پاس گئی اور کہا کہ آپ سمنون سے کہیں کہ وہ مجھے اپنی زوجیت میں قبول کر لیں۔ جنید اس پر سخت ناراض ہوئے اور بڑی سختی سے ڈانٹ دیا۔ چنانچہ وہ عورت غلام الخلیل کے پاس آئی اور جس طرح ایسی عورتیں تہمت لگایا کرتی ہیں اس طرح حضرت سمنون پر ایک تہمت لگا دی۔ غلام الخلیل نے دشمنوں کی طرح اس عورت کی تہمت کو سنا اور حضرت سمنون کو برا بھلا کہنے لگا اور خلیفہ وقت کو آپ کے خلاف بھڑکا دیا حتیٰ کہ خلیفہ نے آپ کے قتل کر دینے کا فرمان جاری کر دیا۔ جب جلاد کو لایا گیا اور آپ کو قتل کرنے کی خلیفہ سے اجازت طلب کی گئی اور خلیفہ نے قتل کا حکم دینے کا ارادہ کیا تو اس کی زبان بند ہو گئی۔

جب اس رات وہ سویا تو خواب میں دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے کہ تمہارے ملک کا زوال حضرت سمنون کی زندگی کے ساتھ وابستہ ہے۔۔۔ دوسرے روز اس نے معافی مانگی اور عزت کے ساتھ آپ کو رخصت کیا۔۔۔ محبتِ الٰہی کی حقیقت کے بیان میں آپ کا کلام بلند پایہ اور اشارات بڑے باریک ہیں۔ اور آپ وہی عظیم بزرگ ہیں کہ آپ جب حجاز سے واپس آ رہے تھے تو اہلِ فید نے آپ سے وعظ و نصیحت کرنے کی درخواست کی آپ برسرِ منبر لوگوں کو نصیحتیں کرنے لگے لیکن توجہ سے کوئی بھی سن نہ رہا تھا چنانچہ آپ نے مسجد کی قندیلوں کی طرف رُخ کر کے فرمایا "میں تم سے کہتا ہوں" یہ سنتے ہی تمام قندیلیں نیچے گر پڑیں اور ٹوٹ کر چور ہو گئیں ۔۔۔ اور آپ سے روایت ہے کہ فرمایا لا یعبر عن شیئٍ الا بما ھو ارق منہ ولا شیئٌ ارق عن المحبۃ فلم یعبر عنہا (کسی چیز کی تعبیر اس چیز سے کی جاتی ہے جو اس سے زیادہ نازک ہو اور جب کہ محبت سے زیادہ نازک چیز کوئی نہیں تو پھر محبت کی تعبیر کس چیز سے کی جائے گی) مطلب اس کا یہ

ہے کہ محبت کو ان الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا کیونکہ عبارت تعبیر کرنے والے کی کی صفت ہے جب کہ محبت، محبوب کی صفت ہے پس اس کی حقیقت کا ادراک عبارت کے ذریعہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔

حضرت ابوالفوارس شاہ شجاع کرمانی رحمۃ اللہ علیہ

اور ان تبع تابعین میں سے مشائخ کے بادشاہ اور زمانہ کے تغیرات سے بے نیاز حضرت ابوالفوارس شاہ شجاع الکرمانی رحمۃ اللہ بھی ایک ہیں۔ آپ بادشاہوں کی اولاد میں سے تھے اور اپنے زمانہ میں بے نظیر سے تھے۔ حضرت ابو تراب نخشبی کی صحبت سے فیض حاصل کیا تھا اور بہت سے مشائخ کا زمانہ پایا تھا حضرت ابو عثمان حیری کے تذکرہ میں آپ کا کچھ ذکر گزر چکا ہے۔ تصوف میں آپ کے رسائل بڑے مشہور ہیں اور ایک کتاب بھی تصنیف کی ہے جس کا نام مرأۃ الحکما رکھا۔ آپ کا کلام بڑا بلند پایہ ہے روایات میں آتا ہے کہ آپ نے فرمایا "لِاَھلِ الفضل فضل ما لَم یَرَوہ فاذا راؤہ فلا فضل لھم وَلاھل الولایۃ وَلایۃ مَالَم یَرَوھا فاذا راؤھا فلا وَلایۃ لھم" (اہلِ فضیلت کے لئے اس وقت تک فضیلت ہے جب تک وہ اسے نہ دیکھیں اور جب اسے دیکھ لیں تو پھر اُن کے لئے کوئی فضیلت نہیں، اور اہلِ ولائت کے لئے ولائت ہے جب تک وہ اُسے نہ دیکھیں اور جب اُسے دیکھ لیں تو پھر اُن کے لئے کوئی ولایت نہیں) معنی اس کا یہ ہے کہ جس جگہ فضیلت اور ولائت موجود ہو اس کی رؤیت ساقط ہوتی ہے اور جب اس کی رؤیت حاصل ہو جائے اس کی حقیقت ساقط ہو جاتی ہے کیوں کہ فضیلت ایک ایسی صنعت ہے جس میں فضیلت کا دیکھنا درست نہیں اور ولایت ایسی صفت ہے جس میں ولائت کو دیکھنا جائز نہیں۔ اور جب کوئی کہے کہ میں صاحب فضیلت ہوں یا ولی ہوں تو نہ وہ صاحب فضیلت رہتا ہے اور نہ ولی! —— اور آپ کے آثار میں یہ لکھا ہے کہ آپ چالیس سال تک نہ سوئے اور جب سوئے تو حق تعالے کو خواب میں دیکھا تو عرض کی "بارِ خدایا! میں آپ کو حالتِ بیداری میں تلاش کرتا رہا ہوں لیکن آپ کو نیند

کی حالت میں حاصل کیا ہے! حق تعالٰے نے ارشاد فرمایا "اے شاہ! ان شب بیداریوں کی وجہ سے ہی تو نے خواب میں مجھے پایا ہے اگر تم ان راتوں میں سو جاتے تو آج اس طرح مجھے حاصل نہ کر پاتے ——— واللہ اعلم

حضرت عمرو بن عثمان المکیؒ رحمۃ اللہ

اور انہی میں سے دلوں کے سرور اور سینوں کے نور حضرت عمرو بن عثمان المکیؒ رح بھی ہیں۔ آپ اہل طریقت کے بزرگوں اور سرداروں میں سے ہیں۔ علم تصوف کے حقائق میں آپ کی تصانیف مشہور ہیں۔ آپ اپنی ارادت کی نسبت حضرت جنید رحمۃ اللہ کی طرف کرتے تھے، حضرت ابو سعید خراز رحمۃ اللہ کی زیارت اور حضرت نباجی رحمۃ اللہ کی صحبت کا شرف حاصل کیا تھا۔ اصولِ طریقت میں آپ اپنے وقت کے امام تھے۔ آپ سے روایت ہے فرمایا "لا یقع علی کیفیۃِ الواجد عبارۃ لانہ سر اللہ عند المو منین" (وجد کی کیفیت، عبارت میں بیان نہیں کی جا سکتی کیوں کہ یہ اہلِ ایمان کے پاس اللہ تعالٰے کا ایک راز ہے) اور جو چیز عبارت میں بیان کی جا سکے وہ اللہ تعالٰے کا راز نہیں ہوتی کیوں کہ بندہ کا تصرف اور تکلیف اسرار ربانی سے منقطع ہوتا ہے؛ اور کہتے ہیں کہ حضرت عمرو بن عثمان، اصفہان میں تشریف لائے تو ایک نوجوان آپ کی صحبت میں داخل ہوا جب کہ اس کا باپ آپ کی صحبت سے اس کو منع کرتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ نوجوان بیمار ہو گیا اور کچھ عرصہ بستر علالت پر پڑا رہا۔ شیخ ایک دن ایک جماعت کے ہمراہ اُٹھے اور اس کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ اس نوجوان نے حضرت کی طرف اشارہ کیا کہ آپ قوال سے چند اشعار پڑھنے کے لئے فرمائیں۔ حضرت نے قوال کو حکم دیا تو اس نے پڑھا۔ شعر

مالی مرضت فلم یعدنی عائدٌ
منکم و یمرض عبدُکم فاعودُ!

(کیا وجہ ہے کہ میں بیمار ہوا تو تمہاری طرف سے کوئی بھی عیادت کے لئے نہ آیا۔ حالانکہ آپ کا کوئی غلام بھی بیمار ہو جائے تو میں اس کی بھی بیمار پرسی کرتا ہوں)۔

اس بیمار نوجوان نے یہ شعر سُنا تو اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس کی تکلیف اور بیماری کی شدت کم ہو گئی اور کہا "زدنی" (میرے لئے کچھ اور پڑھو!) قوال نے دوسرا شعر پڑھا۔

وَاشَدُّ من مَرضِی علیٰ صدودکُم

وصدود عبدکم علیٰ شدیدٌ!

(اور تمہارا میرے پاس آنے سے رُکا رہنا میرے نزدیک میری بیماری سے بھی سخت اور میرا آپ کے پاس آنے سے رُکا رہنا بھی مجھ پر بڑا سخت ہے) یہ سُن کر بیمار اٹھ کھڑا ہوا اور اس سے بیماری جاتی رہی۔ چنانچہ اس کے باپ نے بخوشی اسے حضرت عمرو بن عثمان کی صحبت میں دے دیا اور اپنے دل میں موجود اندیشے سے توجہ کی ـــــ اور وہ دونوں آپ کی صحبت کی برکت سے طریقت کے بزرگوں میں سے ہوا۔ واللّٰہ اعلم بالصواب)

حضرت سہل تستری رحمۃ اللہ علیہ

دلوں کے مالک اور برائیوں کو مٹانے والے حضرت ابو محمد سہل بن عبداللہ تستریؒ بھی تبع تابعین میں اپنے وقت میں پیر تھے اور تمام لوگ آپ کے عقیدتمند اور مداح تھے آپ نے بہت سی ریاضتیں کیں اور آپ کے معاملات بہت اچھے تھے، اخلاص اور افعال کے عیوب میں آپ کا کلام بڑا لطیف ہے، علماء ظاہر کا کہنا ہے کہ "ھو جمع بین الشریعۃ والحقیقۃ" (آپ نے شریعت اور حقیقت کو باہم جمع کر دیا ہے) لیکن ان کا یہ قول خطا پر مبنی ہے کیونکہ کسی نے بھی شریعت وحقیقت میں فرق نہیں کیا کیونکہ شریعت بغیر حقیقت کے کچھ نہیں اور حقیقت بغیر شریعت کے کچھ نہیں! اور اس وجہ سے کہ اس پیر کی باتوں کا ادراک بڑا آسان ہے، اور طبیعتیں اس کو بہتر طور پر پالیتی ہیں اس لئے لوگ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں ورنہ حق تعالیٰ نے جب شریعت وحقیقت کو آپس میں جمع کر دیا ہے تو پھر یہ بات محال ہے کہ اولیاء اللہ اس میں فرق کریں۔ لامحالہ اگر دونوں میں کوئی فرق موجود ہو تو ایک کو قبول اور دوسری کو رد کرنا پڑے گا جبکہ شریعت کا رد الحاد اور حقیقت کا رد کفر اور شرک ہے اور صوفیاء جو فرق کرتے ہیں وہ معنی کا فرق نہیں

بلکہ شریعت کے ذریعہ حقیقت کو ثابت کرتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "لاالہ الا اللہ حقیقۃ ومحمد رسول اللہ شریعۃ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں یہ تو حقیقت ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ جملہ شریعت ہے) اگر کوئی شخص ایمان کی صحت کی حالت میں ان میں سے ایک کو دوسرے سے جُدا کرنا چاہئے تو ہرگز نہیں کر سکتا اور اس کی یہ خواہش باطل ہو گی۔ غرضیکہ شریعت اصل ہے۔ حقیقت کے لئے اور حقیقت، شریعت کے لئے اصل الاصول ہے جیسا کہ توحید کی معرفت حقیقت ہے جو شریعت کے لئے اصل الاصول کی حیثیت رکھتی ہے اور تمام احکام و نواحی کا اتباع شریعت ہے۔ پس اہلِ ظاہر کی طبیعت جس چیز میں نہ لگے وہ اس سے منکر ہی جاتے ہیں۔ حالانکہ راہِ حق کے اصولوں میں سے کسی ایک اصل کا انکار بھی بڑا خطرناک امر ہے۔ اور ایمان کی نعمت پر حق تعالےٰ کا شکر گزار ہی ہونا چاہیئے ـــــ اور آپ سے روایت ہے کہ فرمایا "ماطلعت الشمس ولا غربت علی اھلِ وجہِ الارض الاّ وھم جھالٌ باللہ الا من یوثرِ اللہ علی نفسہٖ وروحہٖ ودنیاہ وآخرتہٖ (سورج نہ طلوع ہوا اور نہ ہی غروب ہوا زمین پر رہنے والوں پر مگر ایسی حالت میں کہ وہ اللہ تعالےٰ کے بارے میں جاھل تھے۔ سوائے اس شخص کے جس نے اپنے جسم و روح اور اپنی دنیا و آخرت پر حق تعالےٰ کو ترجیح دی ہو) یعنی جو شخص دنیا میں اپنے حصے کی تلاش میں کوشاں رہتا ہے اس کا یہ فعل اس بات کی دلیل ہے کہ وہ حق تعالےٰ کے متعلق بالکل جاہل ہے اس لئے کہ حق تعالےٰ کی معرفت تو دنیا کی تدبیروں کو چھوڑ دینے کا تقاضہ کرتی ہے اور دنیا کی تدابیر کو ترک کرنا یہ ہے کہ اپنے تمام امور کو حق تعالےٰ کے سپرد کر دیا جائے اور دنیا کے معاملات میں تدبیر کو جاری رکھنا تقدیر الٰہی سے جہالت کی وجہ سے ہوتا ہے ـــ واللہ اعلم

حضرت محمد بن فضل البلخی رحمۃ اللہ

اور انہی میں سے برگزیدۂ اہل حرمین شریفین اور جملہ مشائخ کی آنکھوں کی ٹھنڈک حضرت ابوعبداللہ محمد بن فضل البلخی رحمۃ اللہ بھی ہیں، آپ بڑے مشائخ میں سے

تھے۔ عراق و خراسان کے رہنے والوں کے پسندیدہ اور حضرت احمد بن خضرویہ کے مرید تھے۔ حضرت ابو عثمان حیری رحمۃ اللہ آپ سے بڑی محبت کرتے تھے ۔۔۔ مذہب کے ساتھ آپ کے والہانہ عشق کی وجہ سے متعصب لوگوں نے آپ کو بلخ سے باہر نکال دیا تھا۔ چنانچہ آپ سمرقند تشریف لے گئے اور تمام زندگی وہیں گزار دی۔ مروی ہے کہ آپ نے فرمایا "اعرف الناس باللہ اشدھم مجاھدۃً فی اوامرہٖ واتبعھم لسنۃ" (لوگوں میں سب سے زیادہ عارف باللہ وہ ہے جو اس کے احکام بجالانے اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی میں سب سے زیادہ محنت کرنے والا ہو) ظاہر ہے کہ جو شخص حق تعالیٰ کے جتنا قریب ہوتا ہے، اتنا ہی اس کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتباع سے رو گرداں ہوتا ہے ۔۔۔ روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "عجبت لمن یقطع البوادی والقفار والمفاوز حتیٰ یصل الی بیتہٖ وحرامہٖ لان فیہ آثار الانبیاء کیف لا یقطع نفسہٗ وھواہ حتیٰ یصل الی قلبہٖ لان فیہ آثار مولاہ" (میں اس شخص پر تعجب کرتا ہوں جو دشت و صحراء اور جنگل قطع کر کے اللہ تعالیٰ کے گھر اور اس کے حرم میں پہنچتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے انبیاء کے آثار ہیں۔ لیکن وہ اپنی خواہشات اور اپنے نفس کو قطع کر کے اپنے دل میں کیوں نہیں پہنچتا کہ جس میں اس کے مولا تعالیٰ کے آثار موجود ہیں) ۔۔۔ یعنی دل جو معرفت الٰہی کا محل ہے کعبہ سے جو عبادتِ الٰہی کی جہت ہے سے زیادہ بزرگ ہے، کیونکہ کعبہ تو وہ ہے کہ عبادت میں اس کی طرف بندہ کی نظر پیوست رہتی ہے اور دل وہ مقام ہے جس پر ہر وقت حق اللہ تعالیٰ کی نظر پڑتی رہتی ہے۔ جہاں دوست کا دل ہے وہاں میں ہوں اور جس جگہ اس کا حکم ہے وہاں میری مراد ہے اور جس جگہ میرے انبیاء علیہم السلام کے آثار ہیں وہاں میرے دوستوں کا قبلہ ہے ۔۔۔

حضرت محمدؐ بن علی الترمذی رحمۃ اللہ

انہی میں سے شیخ بزرگ اور صفاتِ بشریت سے خالی حضرت ابو عبد اللہ محمد بن علی الترمذی رحمۃ اللہ بھی ایک ہیں۔ آپ جملہ علوم میں کامل اور پیشوا کی حیثیت رکھتے ہیں اور

مشائخ محققین میں سے طریقت کے معاملات میں آپ کی بہت سی تصنیفات ہیں "ختم الولایۃ کتاب المنہج، نوادر الاصول اور ان کے علاوہ بھی بہت سی کتابوں میں آپ کی کرامات ظاہر ہیں۔ میرے نزدیک آپ بڑے باعظمت بزرگ ہیں اور میرا دل پوری طرح آپ کی محبت کا شکار ہو چکا ہے۔ میرے شیخ رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ محمد ترمذی ایک ایسا در یتیم ہے جس کی مثال نہیں ملتی ـــ علم ظاہر میں آپ کی بہت سی کتب ہیں اور احادیث میں آپ کی اسانید بڑی عالی اور معتبر ہیں، آپ نے قرآن کریم کی ایک تفسیر لکھنی شروع کی تھی لیکن عمر نے اس کو مکمل کرنے تک وفا نہ کی تاہم جس قدر لکھی گئی وہ بھی اہل علم کے درمیان استفادہ کے قابل سمجھی جاتی ہے، آپ نے فقہ کا علم حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کے شاگردوں میں سے ایک خاص شاگرد سے حاصل کیا تھا ـــ آپ کو ترمذ میں محمد حکیم کے نام سے پکارا جاتا تھا اور ملک کے صوفیا ءکرام آپ کی اقتداء کرتے تھے۔ آپ کے مناقب و فضائل بے شمار ہیں۔ منجملہ ان میں سے یہ بھی ہے کہ آپ نے حضرت خضر علیہ السلام کی صحبت کا شرف حاصل کیا تھا اور آپ کے مرید حضرت ابو بکر وراق آپ سے روائت کرتے ہیں کہ ہر یک شنبہ کو حضرت خضر علیہ السلام آپ کے پاس تشریف لایا کرتے تھے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے باطنی و مخفی حقائق اور واقعات کے بارے میں گفتگو کیا کرتے تھے ـــ نیز آپ نے فرمایا کہ " من جھل باوصاف العبودیہ یکون اجھل باوصاف الربوبیۃ ومن لم یعرف طریق معرفۃ النفس لم یعرف طریق معرفۃ الرب بان الظاھر متعلق بالباطن ولتعلق بالظاھر بلا باطن محال ودعوی الباطن بلا ظاھر محال فمعرفۃ اوصاف الربوبیۃ فی تصحیح ارکان العبودیۃ ولا یصح ذالک الا بالادب" (جو شخص اوصاف عبودیت یعنی علم شریعت سے جاہل ہو وہ اوصاف ربوبیت کے بارے میں زیادہ جاہل ہوتا ہے اور جو شخص معرفت نفس کا طریق نہیں جانتا وہ حق تعالیٰ کی معرفت کے طریق سے بھی ناواقف ہے کیونکہ ظاہر کا باطن کے ساتھ تعلق ہوتا ہے اور باطن کے بغیر ظاہر کے ساتھ تعلق محال ہے اور ظاہر کے بغیر باطن کا دعویٰ محال ہے، پس اوصاف ربوبیت کی معرفت عبودیت کے ارکان و احکام کو صحیح طور پہ بجا لانے میں ہے اور یہ چیز ادب کے بغیر صحیح نہیں ہو سکتی ـــ اور یہ کلمہ ایک بنیادی اور

بڑا ہی مفید مطلب ہے جس کا تفصیلی بیان انشاء اللہ اپنے مقام پر ہوگا۔

حضرت محمدؒ بن عمر الوراق رحمۃ اللہ

حضرت ابوبکر محمدؒ بن عمر الوراق رحمۃ اللہ بھی انہی تبع تابعین میں سے ایک تھے جو امت کے زاہدوں کے شرف اور اہلِ فقر و صفا کے پاکباز کی حیثیت کے حامل تھے، کبار مشائخ اور بلند پایۂ زاہدوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے آپ کو حضرت احمد بن حضرویہ کی زیارت اور حضرت محمدؒ بن علی ترمذی رحمۃ اللہ کی صحبت کا شرف حاصل ہوا تھا۔ آداب اور معاملات میں کے بیان میں آپ کی تصنیفات بہت سی ہیں اور مشائخ آپ کو مؤدب الاولیاء کہا کرتے تھے ۔ آپ حکائت کرتے ہیں کہ حضرت محمدؒ بن علی ترمذیؒ نے ایک مرتبہ مجھے ایک کتاب کے چند اجزاء دیئے اور فرمایا کہ انہیں دریائے جیجوں میں ڈال دو۔ میرے دل نے مجھے اس کی اجازت نہ دی چنانچہ میں نے ان کو گھر میں رکھ دیا اور واپس آکر حضرت سے کہہ دیا کہ میں ڈال آیا ہوں حضرت نے سوال کیا کہ پھر تم نے کیا دیکھا؟ میں نے عرض کی کچھ بھی نہیں دیکھا" آپ نے فرمایا" تو پھر تم نے وہ اجزاء دریا میں نہیں ڈالے، جاؤ اور انہیں دریا میں ڈال کر آؤ" میں واپس آیا اور میرا دل وسوسوں میں مبتلا تھا پھر بھی جب میں نے انہیں دریا میں پھینک دیا تو دریا کا پانی دو حصوں میں بٹ گیا اور اس میں سے ایک صندوق نمودار ہوا جس کا ڈھکنا کھلا تھا۔ جب وہ اجزاء صندوق میں جا پڑے تو اس کا منہ بند ہو گیا اور پھر پانی بھی آپس میں مل گیا۔ میں نے واپس آکر یہ ساری کیفیت بیان کی تو حضرت نے فرمایا کہ ہاں اب تم نے واقعی وہ اجزاء دریا میں ڈال دیئے ہیں۔ میں نے عرض کی: اے شیخ! اس معاملہ کے بعد مجھے ضرور بتلایئے! آپ نے فرمایا کہ میں نے یہ کتاب اصول طریقت اور اس کے اسرار و رموز کی تشریح میں تصنیف کی تھی مگر لوگوں کے لئے اس کا سمجھنا دشوار تھا۔ چنانچہ یہ کتاب مجھ سے میرے بھائی حضرت خضر علیہ السلام نے مانگ لی اور اللہ تعالےٰ نے اس دریا کو حکم دیا کہ وہ کتاب ان تک پہنچا دے ۔۔۔ اور حضرت ابوبکر وارق سے یہ حکائت بھی مروی ہے کہ آپ نے فرمایا" الناس ثلاثۃٌ العلماء والامراء والفقراء فاذا

فَسَدَ العلماءُ فَسَدَ الطاعۃ والشریعۃ واذا فَسَدَ الامراء فَسَدَ المعاش وَاذا فَسَدَ الفقرأُ فَسَدَ الاخلاق" (لوگ تین طرح کے ہوتے ہیں (۱) علماء (۲) امراء اور (۳) فقراءؔ پس جب علماء برباد ہو جاتے ہیں تو لوگوں پر شریعت اور اس کی اطاعت میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے، جب امراء بگڑتے ہیں تو لوگوں کی معیشت تباہ ہو جاتی ہے اور جب فقراء میں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو اخلاق برباد ہو جاتے ہیں) پس امراء اور بادشاہوں کی تباہی تو ظلم وستم سے ہوتی ہے اور علماء کی تباہی طمع اور لالچ سے اور فقراء کی بربادی جاہ طلبی سے ہوتی ہے۔ جب تک بادشاہ علماء سے روگرداں نہیں ہوتے تباہ نہیں ہوتے اور جب تک علماء بادشاہوں کی صحبت سے کنارہ کش رہتے ہیں تباہی سے محفوظ رہتے ہیں اور جب تک فقراء دنیوی جاہ طلبی کے دلدادہ نہیں ہوتے تباہ نہیں ہوتے۔ کیونکہ بادشاہوں کا ظلم وستم جہالت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ علماء کی طمع ان کی بد دیانتی کی وجہ سے اور فقراء کی ریاکاری اللہ تعالےٰ پہ بھروسہ نہ کرنے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ پس بے علم بادشاہ۔ بے پرہیز عالم اور بے توکل فقیر سلطان کا ہم نشین ہوتا ہے اور پوری مخلوق کا بگاڑ انہیں تین طبقوں کے بگاڑ کے ساتھ وابستہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت ابوسعید احمد بن عیسیٰ الخراز رحمۃ اللہ

توکل و رضاء کا سفینہ اور راہ فنا کے سالک حضرت ابوسعید احمد بن عیسیٰ الخرازؒ بھی حضرتِ تبع تابعین میں سے ایک ہیں۔ آپ ارادتمندوں کے احوال کے بیان کرنے والے اور طالبانِ حق کے اوقات کی دلیل تھے، فناء و بقاء کے طریقہ کی وضاحت کرنے والے آپ پہلی شخصیت ہیں۔ آپ ہی نے اس کے اصول وضوابط مرتب فرمائے۔ آپ کے مناقب مشہور، ریاضت بڑی خوب، نکات بصیرت افروز، تصانیف گرانقدر اور کلام و رموز بلند پایہ ہے، حضرت ذوالنون مصری سے ملاقات اور حضرتِ بشر اور حضرت سری سقطیؒ کی صحبت کا شرف حاصل تھا۔ مروی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ مبارک "جبلتِ القلوب علیٰ حب مَن احسن الیہا" (دل فطرتاً اس سے محبت کرتے ہیں جو ان کے

ساتھ اچھا برتاؤ کرے") کے متعلق آپ نے فرمایا "وَاَعجبا لمن لم یر محسنا غیر اللہ کیف لا یمیل بکلیتہ الی اللہ" (اس شخص پر بڑا تعجب ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو اپنا محسن نہیں پایا پھر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہوتا) اس لئے کہ درحقیقت احسان وہی ہوتا ہے جو مالک الملک کی طرف سے ہو کیوں کہ بغیر کسی بدلہ کے احتیاج کسی کے ساتھ نیکی کرنے کا نام احسان ہے اور جو کوئی خود کسی دوسرے سے کسی احسان کا محتاج ہو وہ کسی کے ساتھ نیکی اور احسان کیسے کر سکتا ہے پس تمام جہان کی ملکیت خداوند عزوجل کے لئے اور وہ ایسی ذات ہے جو غیر سے بے نیاز ہے لہذا جب حق تعالیٰ کے دوستوں نے اس معنی کو جان لیا تو انہوں نے احسان اور انعام میں محسن و منعم حقیقی کا مشاہدہ کر لیا اور ان کے دل اس کی دوستی اور عشق میں پوری طرح اسیر ہو گئے اور غیر اللہ سے انہوں نے منہ موڑ لیا۔

حضرت علی بن محمدؒ الاصفہانی رحمۃ اللہ

محققین کے بادشاہ اور مریدین کی دلیل حضرت ابوالحسن علی بن محمد الاصفہانی رحمۃ اللہ علیہ بھی حضرات تبع تابعین میں سے ایک تھے۔ بعض نے آپ کا اسم گرامی حضرت علی بن سہیل بیان کیا ہے، آپ کبار مشائخ میں سے تھے۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ کے ساتھ آپ کی بڑی لطیف خط و کتابت رہی ــــ آپ اس پایہ کے بزرگ تھے کہ حضرت عمرو بن عثمان مکی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی زیارت کے لئے اصفہان کا سفر کیا تھا ــــ آپ حضرت ابو تراب رحؒ کے مصاحب اور حضرت جنید رحؒ کے رفیق تھے، آپ قابل تعریف طریقہ کے ساتھ مخصوص، رضا و ریاضت میں آراستہ آفات و فتن سے محفوظ معاملات تصوف اور حقائق کے بیان میں اچھی زبان اور رموز و اشارات کے انکشاف میں بڑے لطیف بیان کے مالک ہیں ــ

مروی ہے کہ آپ نے فرمایا "الحضور افضل من الیقین لان الحضور وطنات والیقین خطرات" (حق تعالیٰ کی بارگاہ میں ہر وقت کی حاضری اس کی ذات کے یقین سے افضل ہے کیونکہ بارگاہِ خداوندی میں حاضر رہنا اس کو اپنا وطن بنا لینے کی طرح ہے جب کہ یقین تو صرف دل

میں پیدا ہونے والے خطرات و خیالات کا نام ہے) چنانچہ وطن بنا لینے میں غفلت کا گذر نہیں ہوتا اور صرف یقین کی کیفیت صرف دل میں گزرنے والی ایک چیز ہے جو کبھی آجاتی ہے کبھی نہیں آتی۔ پس حاضرانِ بارگاہِ قدس کے اندر قیام پذیر ہوتے ہیں اور صرف یقین رکھنے والے اس بارگاہ کے دروازے پر کھڑے ہوتے ہیں۔ میں غیبت اور حضور کے بیان میں انشاء اللہ ایک باب لا رہا ہوں ـــــ اور نیز آپ نے فرمایا کہ "من وقتِ آدم الیٰ قیام الساعۃ الناس یقولون القلب القلب وَانا اجب ان اری رجلاً یصفِ القلب ویقول ایش القلب او کیف القلب فلا اریٰ" (حضرت آدم علیہ السلام سے آج تک لوگ میرا دل میرا دل کہتے چلے آتے ہیں جب کہ میں چاہتا ہوں کہ ایسے ایک آدمی کو دیکھ لوں جو دل کی صفات بیان کرے اور بتائے کہ دل کیا چیز ہے یا اس کی کیفیت کیا ہے لیکن مجھے آج تک ایسا آدمی نہیں مل سکا) اور عوام تو اس گوشت کے ٹکڑے کو دل کہتے ہیں جب کہ وہ تو دیوانوں، مغلوب الحال اور بچوں کو بھی حاصل ہوتا ہے، لیکن وہ اس گوشت کے ٹکڑے کے باوجود بغیر دل کے ہی ہوتے ہیں۔ پس دل کیا چیز ہے؟ کہ جس کے بارے میں الفاظ کے علاوہ میں کچھ نہیں سنتا۔ یعنی اگر میں عقل کو دل کہوں تو یہ غلط ہے کیونکہ وہ تو دل نہیں اور اگر روح کو دل کہوں تو یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ وہ بھی دل نہیں اور اگر اس علم کو دل کہوں تو یہ بھی نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ حق تعالےٰ کے تمام مشاہدات کا تعلق دل سے ہے اور اس کیفیت کے سمجھنے کا الفاظ و عبارت کے سوا کوئی ذریعہ نہیں۔

حضرت محمّد بن اسمٰعیل خیر النساج رحمۃ اللہ علیہ

اور انہی میں سے اہلِ تسلیم کے مُرشد اور محبتِ خداوندی کے طریق میں صاحب استقامت حضرت ابوالحسن محمّد بن اسمٰعیل خیر النساج رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔ آپ بزرگ مشائخ میں سے ہیں اور معاملات ولفصائح بیانی اور مہذب عبارات میں اپنے دور میں اچھی شہرت کے حامل تھے۔ آپ کو طویل زندگی نصیب ہوئی تھی، حضرت شبلی اور حضرت ابراہیم خواص دونوں نے آپ کی مجلس میں ہی توبہ کی تھی۔ چنانچہ آپ نے حضرت جنید کی حرمت

کا لحاظ رکھتے ہوئے حضرت شبلی کو اس کی خدمت میں بھیج دیا تھا۔ آپ حضرت سری سقطی کے مرید اور حضرت جنید و حضرت ابوالحسن نوری کے ہمعصر تھے، حضرت جنید کے نزدیک آپ قابلِ احترام تھے اور حضرت ابوحمزہ بھی آپ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ روائت ہے کہ آپ کو خیر النساج کہنے کا سبب یہ ہے کہ آپ ایک مرتبہ اپنے پیدائشی وطن سے جب سامرہ تشریف لے گئے تو حج کے ارادہ سے آپ کا گزر کوفہ سے ہوا۔ ایک ریشم باف نے کوفہ کے دروازے پر آپ کو پکڑ لیا کہ تم تو میرے غلام ہو اور تمہارا نام خیر ہے آپ نے اس کو حق تعالےٰ کی طرف سے خیال کیا اور اُس آدمی کی مخالفت نہ کی اور کئی سال تک اس کا کام کرتے رہے، وہ شخص آپ کو جب بھی خیر کہہ کر پکارتا تو آپ اُس کی آواز پر لبیک کہتے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی اسی حرکت پر پشیمان ہوا اور کہا کہ آپ تشریف لے جایئے کیونکہ میں نے غلطی کی تھی، آپ میرے غلام نہیں" آپ چلے گئے اور مکہ مکرمہ پہنچ گئے اور اتنا مقام حاصل کیا کہ حضرت جنیدؒ فرمایا کرتے تھے کہ "خیرٌ خیرنا" (خیر ہم سے بہتر ہے) آپ اسی بات کو پسند کرتے تھے کہ لوگ آپ کو خیر کے نام سے پکاریں اور فرمایا کرتے تھے کہ جب ایک مسلمان نے میرا نام خیر رکھ دیا ہے تو اس کو تبدیل کرنا مناسب نہیں۔ کہتے ہیں کہ جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو شام کی نماز کا وقت ہو رہا تھا، نزع کی بیہوشی سے ذرا افاقہ ہوا تو آنکھیں کھول کر ملک الموت کی طرف دیکھا اور فرمایا" قف عافاك الله فانما انت عبد مامور وانا عبدٌ مامورٌ وما امرت به لا یفوتك وما امرت به فهو شیئٌ یفوتنی فدعنی امضی فیما امرت به ثم امض بما امرت بهٖ"

(اللہ تجھے معاف کر دے ذرا ٹھہر جا! تو بھی اللہ تعالےٰ کا ایک بندہ ہے جو ایک کام پہ مامور ہے اور میں بھی اللہ تعالےٰ کا بندہ ہوں جو ایک کام پہ مامور ہوں۔ تاہم جس کام کا تمہیں حکم دیا گیا ہے وہ تم سے فوت نہیں ہو رہی البتہ مجھے جس کام کا حکم دیا گیا ہے وہ مجھ سے فوت ہو رہا ہے) پھر آپ نے پانی منگوا کر وضو کیا اور شام کی نماز ادا کی اور پھر جان دے دی۔ لوگوں نے اسی رات آپ کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ حق تعالےٰ نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ آپ نے جواب دیا" لا تسئلنی عن هذا ولكن استرحت من دنیاكم" (مجھ سے اس معاملے میں کچھ نہ پوچھو البتہ

تمہاری دنیا سے چھٹکارا پایا کہ مجھے آرام مل گیا ہے)۔ آپ سے روایت ہے کہ اپنی مجلس میں آپ نے فرمایا " مشرح اللہ صدور المتقین بنور الیقین وکشف بصایر الموقنین بنور حقائق الایمان " (اللہ تعالیٰ نے متقی لوگوں کے سینوں کو یقین کے نور کے ساتھ کھول دیا ہے اور اہل یقین کے دلوں کی آنکھوں کو ایمان کے نور سے بینائی عطاء فرمائی") کیونکہ متقی انسان کو یقین کے سوا چارہ نہیں کہ اس کا دل یقین کے نور سے روشنی پاتا ہے، اور اہل یقین کو ایمان کے حقائق کے سوا چارہ نہیں کیونکہ اس کی عقل کی آنکھیں نورِ ایمان سے ہی روشن ہوتی ہیں پس جہاں ایمان ہوتا ہے وہاں یقین بھی ہوتا ہے اور جہاں یقین ہوتا ہے وہاں تقویٰ بھی ہوتا ہے کیوں کہ یہ ایک دوسرے کا ذریعہ اور ایک دوسرے کے تابع ہوتے ہیں ـــــ واللہ اعلم

حضرت ابو حمزہ خراسانی رحمۃ اللہ

انہی تبع تابعین میں سے زمانے کو حق کی طرف دعوت دینے والے اور اپنے عہد کے یکتا حضرت ابو حمزہ خراسانی رحمۃ اللہ علیہ بھی ایک ہیں، خراسان کے قدیم مشائخ میں سے تھے اور حضرت ابو تراب رحمۃ اللہ کی صحبت سے مشرف ہوئے اور حضرت خراز رحمۃ اللہ کی زیارت نصیب ہوئی تھی۔ خدا تعالیٰ پر بھروسے میں کامل درجہ کے مالک تھے۔ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک مرتبہ کہیں جا رہے تھے کہ کنوئیں میں گر پڑے اور تین روز تک اسی میں پڑے رہے، سیاحوں کا ایک گروہ وہاں پہنچا تو آپ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ان کو آواز دوں کہ وہ مجھے یہاں سے باہر نکال لیں مگر ساتھ ہی یہ خیال آگیا کہ غیر اللہ سے مدد مانگنا مناسب نہیں اور یہ تو اللہ تعالیٰ کی شکائت ہو جائے گی کہ میں ان سے کہوں کہ میرے اللہ نے مجھے کنوئیں میں ڈال دیا ہے تم سب مل کر مجھے باہر نکال لو! چنانچہ میں چپ ہو رہا، جب وہ لوگ قریب آئے اور دیکھا کہ راستے میں کنوئیں کا منہ کھلا ہے تو انہوں نے ثواب کی نیت سے اس کا منہ بند کر دینے کا مشورہ کیا تاکہ کوئی مسافر اس میں گر نہ جائے ان کی اس طرح کی باتیں سن کر مجھے پریشانی ہوئی اور میں اپنی زندگی سے نا اُمید

ہو گیا۔ وہ لوگ جب کنویں کا مُنہ ڈھانپ کر واپس چلے گئے تو میں موت کے لئے تیار ہو گیا اور خدا کے حضور بڑی عاجزی سے دعا کی اور سب مخلوق سے مایوس ہو گیا۔ جب رات خوب پھیل گئی تو کنویں کے اوپر سے مجھے سرسراہٹ سی محسوس ہوئی میں نے غور سے دیکھا تو نظر آیا کہ کنویں کا مُنہ کسی نے کھول دیا ہے اور ایک بڑے اژدھا کی طرح کے ایک جانور نے اپنی دُم نیچے لٹکا دی ہے، میں نے سوچا کہ غالباً اللہ تعالےٰ نے میری نجات کیلئے اسے بھیجا ہے، چنانچہ میں نے اس کی دم کو زور سے پکڑ لیا اور اس نے مجھے اوپر کھینچ لیا اتنے میں کسی ھاتف نے آواز دی کہ اے ابا حمزہ! تیری نجات بڑی خوب ہے کہ ہم نے ایک ہلاک کرنے والے جانور کے ذریعہ تجھے موت کے مُنہ سے نجات دی!

—— آپ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ "غریب کون ہے؟" تو آپ نے فرمایا "المستوحش من الالف" (جو شخص الفت سے وحشت زدہ ہوا) یعنی وہ آدمی جس کو دنیا و مافیہا بلکہ اپنی ذات کی محبت سے بھی وحشت ہو۔ کیونکہ دنیا اور عقبیٰ میں درویش کا وطن نہیں ہوتا اور وطن کے علاوہ کسی بھی چیز سے الفت، وحشت ہی ہوتی ہے جب تمام جہان سے اس کی الفت منقطع ہو جاتی ہے تو وہ سب چیزوں سے وحشت زدہ ہی ہو جاتا ہے پھر وہ غریب ہوتا ہے —— اور یہ مقام بہت ہی بلند ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابو العباس احمد بن مسروق رحمۃ اللہ

ان تبع تابعین میں سے فرمان خداوندی کے مطابق مریدوں کو دعوتِ حق دینے والے حضرت ابو العباس احمد بن مسروق رحمۃ اللہ علیہ بھی ایک ہیں۔ خراسان کے بزرگوں اور بڑے صوفیا میں آپ کا شمار ہوتا ہے، اولیاء کرام اس بات پر متفق ہیں کہ آپ زمین کے اوتاد میں سے تھے، قطب المدار علیہ کے ساتھ آپ کو صحبت حاصل رہی۔ لوگوں نے ایک دفعہ آپ سے دریافت کیا کہ اس دور کے قطب کون ہیں؟ آپ نے وضاحت کے ساتھ اظہار تو نہ کیا لیکن اشارتاً کہا کہ حضرت جنید اس وقت کے قطب ہیں۔ آپ کو چالیس کے لگ بھگ بلند مرتبہ اولیاء کرام کی خدمت اور ان سے استفادے کا

شرف حاصل ہوا تھا اور ظاہری و باطنی علوم میں آپ شاہسوار تھے، ــــ روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "من کان مسرورہ لغیر الحق فسرورہ یورث الھموم ومن لم یکن انسہ فی خدمۃ ربہ فانسہ یورث الوحشۃ" (جس شخص کو اپنے رب کی خدمت سے لگاؤ نہ ہو تو اس کی محبت، وحشت کا پیش خیمہ ہوتی ہے) یعنی اللہ کے سوا جو کچھ ہے فانی ہے لہٰذا جو شخص فنا ہونے والی چیز سے خوش ہوتا ہے تو جب وہ چیز فنا ہو جاتی ہے تو یہ غمگین ہو جاتا ہے اور حق کی خدمت کے علاوہ سب کچھ بیکار ہے لہٰذا جب بندہ پر مخلوق کا حقیر و بیکار ہونا ظاہر ہو جاتا ہے تو اس کے ساتھ ہر طرح کی محبت تمام تر وحشت ہو جاتی ہے۔ پس تمام جہان کے غم اور وحشت غیر اللہ کے دیکھنے میں ہیں ــــ واللہ اعلم۔

حضرت ابو عبد اللہ بن احمد اسمٰعیل المغربی رحمۃ اللہ علیہ

تبع تابعین میں سے ایک متوکلین کے استاد اور محققین کے شیخ حضرت ابو عبد اللہ احمد بن اسمٰعیل المغربی رحمۃ اللہ بھی ہیں، آپ اپنے وقت کے بزرگوں اور مشائخ میں شمار ہوتے ہیں اور اپنے دور کے اساتذہ میں مقبول اور مریدوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرنے والے بزرگ تھے۔ حضرت ابراہیم خواص اور حضرت ابراہیم رشنیبانی رح دونوں آپ کے مرید تھے۔ آپ کا کلام بلند پایہ اور دلائل بڑے واضح ہیں، اور آپ دنیا سے قطع تعلقی پر بڑے استقامت سے قائم رہے۔ آپ سے روائت ہے کہ فرمایا "ما رأیت انصف من الدنیا ان خدمتھا خدمتک وان ترکتھا ترکتک" (میں نے دنیا سے زیادہ انصاف کرنے والا کسی کو نہیں دیکھا کہ اگر تو اس کی خدمت کرے گا تو وہ بھی تیری خدمت کرے گا۔ لیکن اگر تو اس کو چھوڑ دے تو وہ بھی تجھے چھوڑ دے گا) یعنی جب تک تمہیں اس کی جستجو ہے وہ بھی تمہاری طالب ہے لیکن جب تم اس کو نظر انداز کر کے حق تعالےٰ کی طلب کی طرف متوجہ ہو جاؤ گے وہ بھی تم سے بھاگ جائے گی اور اس کے خیالات تمہارے دل سے نکل جاتے ہیں۔ پس جو شخص صدقِ دل کے ساتھ دنیا سے اعراض کرے وہ اس کے شر سے محفوظ اور اس کی مصیبت سے نجات پا جاتا ہے۔

حضرت ابو علی بن الحسن بن علی الجوزجانی رحمۃ اللہ علیہ

زمانہ کے پیر اور اپنے دور کے مرد یکتا حضرت ابو علی بن الحسن بن علی الجوزجانی رح بھی حضرات تبع تابعین میں سے ایک تھے۔ آپ اپنے زمانہ کے بے مثل بزرگ تھے معاملاتِ طریقت اور نفس کی خرابیوں پر لکھی جانے والی آپ کی تصانیف بہت سی ہیں حضرت محمد بن علی ترمذی رحمۃ اللہ کے ہمعصر تھے اور حضرت ابراہیم سمرقندی رحمۃ اللہ جیسے بزرگ آپ کے ہی مرید تھے ۔ روائت ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا" الخلق کلھم فی میادین الفضلۃِ یر کضون وعلیٰ الظنون یعتمدون وعندھم انھم فی الحقیقۃِ یقلبون وعنِ المکاشفۃِ ینطقون"۔ (سب لوگ غفلت کے میدانوں میں گھوڑے دوڑا دیتے ہیں اور شکوک و اوھام پر اعتماد کئے ہوئے ہیں لیکن سمجھتے ہیں کہ درحقیقت ہم سے ہی دنیا ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف آ، جا رہی ہے اور ہماری ہی گفتگو اسرار کو کھولنے والی ہے) اس مُرشد نے اس طرح غرورِ طبیعت اور نفس کی سرکشی کی طرف اشارہ کیا ہے جیسا کہ ایک جاہل آدمی اپنی جہالت کا ہی معتقد ہوتا ہے اسی طرح جاہل صوفی اور بھی زیادہ اپنی جہالت کا عقیدتمند ہوتا ہے۔ چنانچہ صوفیاء میں سے وہ صوفی زیادہ صاحب عزت و احترام ہوتا ہے جو صاحب علم بھی ہو اور جاہل صوفی سب سے زیادہ ذلیل ہوتا ہے کیونکہ صاحب علم صوفیوں کو حقیقت کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے اور غرور ان کے نزدیک بھی نہیں آتا لیکن جاہل صوفی محض غرور میں مبتلا ہوتے ہیں انہیں حقیقت حاصل نہیں ہوتی۔ وہ غفلت کے میدان میں چکر تے پھرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ ولائت کا میدان ہے، اپنے وہم و گمان پر اعتماد کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی یقین ہے، رسم و رواج کے پابند ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ ہی حقیقت ہے اپنی نفسانی خواہش کے مطابق بولتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی مکاشفہ ہے، کیوں کہ غرور انسان کے سر سے اس وقت ہی نکل سکتا جب اُسے جلال یا جمال حق کا مشاہدہ حاصل ہو۔ اس لئے کہ جب اس کا جمال ظاہر ہوتا تو سب لوگ اسے ہی دیکھتے ہیں تو ان

کا غرور فنا ہوتا ہے اور حق تعالےٰ کا جلال ظاہر ہونے کی صورت میں وہ اپنے آپ کو نہیں دیکھتا اور اس کا غرور سر ہی نہیں اٹھاتا۔

حضرت ابو محمّد احمد بن الحسین الحریری رحمۃ اللہ تعالیٰ

علوم طریقت کو پھیلاتے اور رسوم طریقت کو مقرر کرنے والے حضرت ابو محمد احمد بن الحسین الحریری رحمۃ اللہ تعالیٰ بھی حضراتِ تبع تابعین میں سے ایک تھے۔ آپ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے راز داروں میں سے تھے اور حضرت سہیل بن عبداللہ رحمۃ اللہ کی صحبت کا شرف حاصل کیا تھا۔ ظاہری اور باطنی تمام علوم سے باخبر، علم فقہ میں اپنے دور کے امام۔ اصولِ فقہ کے کامل ماہر اور طریق تصوف میں اس بلند مقام پر فائز تھے کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ جیسے بلند پایہ بزرگ نے آپ سے کہا تھا کہ "میرے مریدوں کو ادب سکھایئے اور انہیں ریاضت کی تاکید کیجئے!" آپ حضرت جنید رحمۃ اللہ کے ولیعہد مقرر ہوئے کہ ان کے بعد ان کی مسند پر تشریف فرما ہوئے ـــــ آپ کے بارے میں روائت ہے کہ فرمایا "دوام الایمان وقوام الادیان وصلاح الابدان فی ثلاثۃِ خصالٍ الاکتفاء والاتقاء والاحتماءُ، فمن اکتفیٰ باللّٰہِ صلحت سریرتہٗ وَمنِ اتقیٰ مانھی اللہ عنہ استقامت سیرتُہٗ وَمن احتماءَ مالم یوافقہ ارتاضت طبیعتہ فثمرۃ الاکتفاء صفوا لمعرفۃ وُعاقبۃ الاتقاء حسن الخلیقۃ وغایۃ الاحتماء اعتدال الطیقۃ" (ایمان کی ہمیشگی، دین کی پختگی اور بدن کی اصلاح تین خصلتوں" (۱) اکتفاء کرنے (۲) پرہیز کرنے اور (۳) غذا کی نگہداشت" پر منحصر ہے، پس جس کسی نے حق تعالےٰ کی ذات کو اپنے لئے کافی سمجھ لیا اس کا باطن درست ہو گیا اور جس کسی اللہ کے منع کردہ امور سے پرہیز کیا اس کی سیرت نیک ہو گئی اور جس کسی نے خوراک کی حفاظت (یعنی حلال وحرام اور مناسب و نامناسب میں تمیز کی) اور اپنے نفس کو ریاضت کا خوگر بنایا اس کی طبیعت اعتدال پر آگئی۔ پس اللہ تعالےٰ پر اکتفاء کرنے کا ثمرہ معرفتِ خداوندی کی صفائی، تقویٰ و پرہیزگاری کا انجام خوش خلقی اور غدا

کی نگہداشت کا نتیجہ طبیعت کی تندرستی اور اعتدال ہے)۔ یعنی جو شخص اپنے تمام معاملات میں حق تعالےٰ کو کافی سمجھتا اور اس پہ توکل کرتا ہے اس کی معرفت بالکل صاف ستھری ہوتی ہے اور جو معاملات میں تقویٰ کو اختیار کرتا ہے اس کا اخلاق دنیا اور آخرت میں نیک ہو جاتا ہے، جیساکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "من کثر صلاتہ باللیل حسن وجھہ بالنہار" (جو کوئی رات کو زیادہ نماز پڑھتا ہے اس کا چہرہ دل کے وقت زیادہ باجمال ہو جاتا ہے) ایک روائت میں ہے کہ قیامت کے دن متقی لوگ اس شان کے ساتھ آئیں گے کہ" وجوھھم نور علی منابر من نور" (ان کے چہرے منور ہوں گے اور وہ نور کے منبروں پہ بیٹھے ہوں گے) اور جو شخص غیر مناسب غذاؤں سے اجتناب کی راہ اختیار کرے گا اس کا جسم بیماریوں سے اور نفس شہوت و سرکشی سے محفوظ رہے گا۔ اور یہ بات بڑی جامع اور عمدہ ہے جو سننے کے قابل ہے —— واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت ابوالعباس احمد بن محمد بن سہل الآملی رحمۃ اللہ تعالیٰ

ان تبع تابعین میں سے اہل طرافت کے شیخ اور اہلِ صفا کے پیشوا حضرت ابوالعباس احمد بن محمد بن سہل الآملی رحمۃ اللہ بھی ایک تھے۔ بزرگ مشائخ اور ارباب حشمت میں آپ کا شمار ہوتا ہے، اپنے ہمعصر لوگوں میں آپ کا بے حد احترام تھا۔ علم تفسیر اور قرأت کے جید عالم تھے اور قرآن کے لطائف بیان کرنے میں آپ کو خاص درک حاصل تھا۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ کے عظیم مریدوں میں سے تھے، حضرت ابراہیم بارستانی رحمۃ اللہ کی صحبت سے فیض یاب ہوئے تھے اور حضرت ابوسعید خراز رحمۃ اللہ آپ کی بے حد تکریم کرتے تھے بلکہ آپ کے علاوہ تصوف میں کسی کو تسلیم ہی نہ کرتے تھے۔ روائت ہے کہ آپ نے فرمایا" السکون الیٰ مالوفات الطبائع یقطع صاحبھا عن بلوغ درجات الحقائق" (طبیعت کی پسندیدہ چیزوں کی طرف سکون تلاش کرنا انسان کو حقائق کے درجات تک پہنچنے سے روک دیتا ہے) یعنی جو شخص طبیعت کی پسندیدہ چیزوں سے آرام حاصل کرتا ہے وہ

حقیقت تک پہنچنے میں ناکام رہتا ہے، کیونکہ طبیعتیں تو نفس کے اسباب و آلات ہیں اور نفس اللہ تعالےٰ سے محل حجاب میں ہے، جب کہ حقیقت محل کشف ہے، اس لئے جو مرید حق سے حجاب میں ہو اور طبیعت کی مرغوبات کی طرف آرام پاتا ہو وہ کبھی اس شخص جیسا نہیں ہو سکتا جسے حق تعالےٰ کا مشاہدہ حاصل ہو۔ پس حقائق تک رسائی کشف کا مقام ہے جو مرغوبات طبعی سے اعراض کرنے سے وابستہ ہے، کیونکہ طبیعتوں کی الفت دو چیزوں سے ہوتی ہے۔ ایک دنیا اور اس کی چیزوں سے اور دوسری آخرت اور اس کے حالات سے۔ دنیا سے تو اس لئے الفت کرتا ہے کہ اس کا ہم جنس ہے اور عقبےٰ سے اپنے باطل گھمنڈ کی وجہ سے الفت کرتا ہے کیونکہ وہ نہ تو اس کا ہم جنس ہے اور نہ ہی اس کی حقیقت کا اُسے علم ہے، پس عقبےٰ سے اس کی محبت اپنے زعم کی بنا پر ہے نہ کہ اس کی حقیقت کے علم کی وجہ سے۔ کیونکہ اگر اسے حقیقت عقبیٰ کی معرفت حاصل ہو جاتی تو وہ اس دنیا سے قطع تعلق کر لیتا اور جب اس دنیا سے قطع تعلق ہو جاتی تو طبیعت کی حکمرانی ختم ہو جاتی اور پھر حقائق کا مشاہدہ نصیب ہوتا۔ کیونکہ عالم عقبیٰ کا طبیعت کے ساتھ صرف اتنا ہی تعلق ہے کہ طبیعت فنا ہو جائے۔ لان فیہما ما لا خطر علیٰ قلب بشر" (اس لئے کہ جنت میں وہ نعمتیں ہیں جن کا کبھی وہم انسانی میں خیال تک بھی نہیں گزرا۔) دل میں گزر نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ راستہ پُرخطر ہے اور جو چیز ایک دفعہ خیال اور وہم میں آجائے اس کی زیادہ وقعت نہیں ہوتی۔ بہرحال جب وہم و خیال حقیقت عقبیٰ کی معرفت سے عاجز ہیں، تو طبیعت کو اس کی اصلی حقیقت سے الفت کیسے ہو سکتی ہے۔ پس یہ بات درست ہو گئی کہ عقبیٰ کے ساتھ طبیعت کا لگاؤ ایک خیال باطل ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابوالمغیث الحسین بن منصور الحلاج رحمۃ اللہ

معانی میں مستغرق اور اپنے دعویٰ میں ہلاک شدہ حضرت ابوالمغیث الحسین بن منصور الحلاج رحمۃ اللہ بھی حضرات تبع تابعین میں سے ایک ہیں، آپ طریقت کے مشتاقوں اور

منسوئ میں سے تھے، آپ قوی حال اور بلند ہمت کے مالک تھے، آپ کے بارے میں مشائخ کا اختلاف ہے بعض کے نزدیک آپ مردود ہیں لیکن بعض کے ہاں مقبول! حضرات عمر بن عثمان المکیؒ، ابویعقوب نہرجوری، ابویعقوب اقطع، علی بن سہل اصفہانی اور ان جیسے دوسرے بزرگوں رحمہم نے آپ کو رد کر دیا ہے، لیکن ابن عطار، محمد بن حنیف، ابوالقاسم نصرآبادی اور دوسرے متاخرین رحمہم نے آپ کو قبول کیا ہے اور حضرات جنید شبلی، حریری، مصری اور ان جیسے بزرگوں رحمہم کی ایک جماعت نے آپ کے بارے میں توقف کیا ہے جب کہ ایک دوسرے گروہ نے آپ کو جادو اور اس کے اسباب کی طرف منسوب کیا ہے، تاہم ہمارے دَور میں شیخ المشائخ حضرت ابوسعید ابوالخیر، حضرت شیخ ابوالقاسم اور حضرت شیخ ابوالعباس مشقانی رحمہم نے آپ کے بارے میں اپنی رائے کو راز میں ہی رکھا ہے، البتہ ان حضرات کے نزدیک آپ بزرگ ہی تھے۔ حضرت استاد ابوالقاسم قشیری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ واقعی اہلِ طریقت واہل معانی میں سے ایک بزرگ تھے تو لوگوں کے نظر انداز کرنے سے وہ مردود ہرگز قرار نہیں پاتے اور اگر وہ طریقت میں مہجور اور حق تعالےٰ کے نزدیک مردود ہیں تو وہ لوگوں میں مقبول ہونے کے باعث مقبول قرار نہیں پا سکتے۔ لہٰذا ہم ان کے معاملے کو حق تعالےٰ کے سپرد کرتے ہیں۔ البتہ جس قدر بزرگی کا نشان ہم نے ان میں پایا ہے اس قدر ان کو بزرگ سمجھتے ہیں۔ بہر حال صرف چند بزرگوں کے علاوہ باقی تمام مشائخ میں سے ان کی فضیلت کے کمال اور حال کی صفائی اور اجتہاد و ریاضت کی کثرت کا کوئی بھی منکر نہیں ـــ اس کتاب میں ان کا تذکرہ نہ کرنا دیانت کے خلاف ہوتا کیونکہ بعض اہلِ ظاہر ان کی تکفیر کرتے اور ان کی فضیلت و ولایت کا انکار کرتے ہیں، اور آپ کے احوال عذر، حیلہ سازی اور جادو کی طرف منسوب کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ حسین بن منصور حلاج بغداد کا وہ بے دین شخص ہے جو محمد بن زکریا کا استاد اور ابوسعید قرمطی کا رفیقِ کار تھا۔ حالانکہ جن حسین کے بارے میں مشائخ کا اختلاف ہے وہ بیضا کے رہنے والے فارسی النسل بزرگ تھے اور مشائخ کا ان کو ترک اور رد کرنا ان کے دین میں کسی طعن کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے عجیب د

غریب حالات و واقعات کی وجہ سے ہے، کہ پہلے وہ حضرت سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ کے ارادتمند تھے لیکن پھر اُن سے اجازت لئے بغیر وہاں سے چلے گئے اور حضرت عمرو بن عثمان رحمۃ اللہ سے رابطہ پیدا کیا پھر وہاں سے بھی بغیر اجازت چلے گئے اور حضرت جنید رحمۃ اللہ سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے قبول نہ کیا تو وقت کے دیگر تمام مشائخ نے بھی ان کو چھوڑ دیا۔ پس وہ عمل میں متروک ہیں اصلِ طریقت میں متروک نہیں ۔۔ کیا نہیں دیکھتے کہ حضرت شبلیؒ نے فرمایا" انا والحلاج فی شیئ واحد فخلصنی جنونی واھلکہ عقلہ" (میں اور حلاج ایک ہی حالت میں تھے پس مجھے تو میرے جنون نے بچا لیا اور اس کی عقل نے ہلاک کر دیا) اگر وہ دین کے بارے میں مطعون ہوتے تو حضرت شبلیؒ یوں کبھی نہ کہتے کہ میں اور حلاج ایک ہی حالت میں ہیں ۔۔ اور حضرت محمّد بن خفیفؒ نے فرمایا کہ" ھو عالمٌ ربانی" (وہ عالم ربانی ہیں) اسی طرح آپ کی بزرگی اور فضیلت کی اور بھی بہت سی دلیلیں موجود ہیں۔ تاہم مشائخ کی ناراضگی اور نافرمانی اس راہ طریقت میں اُن کے لئے وحشت اور ہجران کا باعث بن گئی ۔۔ تصوّف کے اصول و فروع اور رموز و کلام میں ان کی تصنیفات بہت سی ہیں۔ اور میں علی بن عثمان جلابی نے بغداد اور اس کے گرد و نواح میں اُن کی تصنیفات کے پچاس نسخے اور خوزستان کارس اور خراسان میں بھی بعض نسخے خود دیکھے ہیں۔ ان میں ہر قسم کی وہ باتیں موجود پائی ہیں جو ابتداء میں مریدوں پر ظاہر ہوا کرتی ہیں۔ اس میں سے بعض باتیں تو بڑی قوی ہیں اور بعض بہت ضعیف ہیں۔ بعض بڑی آسان اور بعض انتہائی مشکل ہیں۔ درحقیقت حق تعالےٰ کی طرف سے جب کسی شخص پر کوئی بات ظاہر ہوتی ہے تو اپنے حال کی قوّت کے مطابق اسے لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے اور حق تعالےٰ کا فضل اس کی امداد کرتا ہے۔ لیکن اگر اپنے کلام کی تعبیر میں عجلت سے کام لے اور تعجب کا مظاہرہ کرے تو اس طرح پیدا ہو جانے والے اوہام اور پیچیدگیاں سُننے والے کو نفرت اور بیزاری میں مبتلا کر دیتی ہیں، اور عقل اس کلام کے ادراک میں ناکام ثابت ہوتی ہے تو اس وقت لوگ کہنے لگتے ہیں کہ یہ

کلام بڑا ہی بلند ہے۔ چنانچہ ایک گروہ تو اپنی جہالت کی وجہ سے اس سے منکر ہو جاتا ہے اور دوسرا گروہ اپنی جہالت ہی کی وجہ سے اس کا اقرار کرتا ہے، اور ایک گروہ کا انکار دوسرے گروہ کے اقرار کی طرح ہی ہے، لیکن جب اہلِ تحقیق و بصیرت اس عبارت میں غور کرتے ہیں تو انہیں نہ تو کوئی الجھن ہوتی ہے اور نہ ہی وہ کسی تعجب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اور وہ اس کی مدح یا ذم سے فارغ اور اس کے انکار و اقرار سے ایک طرف ہو جاتے ہیں۔ اور باقی وہ لوگ سخت غلطی میں مبتلا ہیں جو اس جوانمرد حسین بن منصور حلاج کے تعجب انگیز واقعات کو جادوگری سے منسوب کرتے ہیں کیوں کہ اہلِ سنت وجماعت کے ہاں جادو کا وجود اسی طرح حق ہے جس طرح کرامت کا وجود! البتہ جادو کا اظہار ہر حالت میں کامل درجے کا کفر ہے اور کرامت کا اظہار کامل درجے کی معرفت ہے۔ اس لئے کہ ان میں سے ایک (جادو) تو حق تعالےٰ کی ناراضگی اور غضب کا نتیجہ ہے اور دوسرا (کرامت) اس کی خوشنودی اور رضا کا ثمر ہے۔ اور میں اثباتِ کرامات کے باب میں پوری شرح کے ساتھ اس مسئلے کو بیان کروں گا اور اہلِ سنت و جماعت کے اربابِ بصیرت کا اتفاق ہے کہ کوئی مسلمان نقصان پسند اور جادوگر نہیں ہو سکتا اور نہ ہی کوئی کافر صاحبِ کرامت ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ضدین ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ حالانکہ حسین بن منصور جب تک زندہ رہے نیکی کے لباس میں رہے، یعنی اچھی نمازوں اور اللہ تعالےٰ کے ذکر اور مناجات میں مشغول رہے، ۔ ہمیشہ روزے سے رہتے، اللہ تعالےٰ کی حمد و ثناء اور اس کی عظمتوں کو بیان کرتے رہتے اور حق تعالےٰ کی صفتِ توحید کے عمدہ نکات بیان کرتے رہے، لہٰذا اگر آپ کے افعال سحر پر مبنی ہوتے تو اس طرح کے نیک کام آپ سے محال ہوتے۔ پس بلاشبہ یہ افعال کرامت تھے اور کرامت کسی محقق ولی سے ہی ظاہر ہوا کرتی ہے، اہلِ سنت کے بعض علماء اُن کے اس نظریئے کا ردّ کرتے ہیں کہ "بندہ اور خدا باہم مل کر ایک وحدت بن جاتے ہیں" لیکن علماء کی یہ تشنیع آپ کی عبارت پر ہے نہ کہ معنی پر۔ کیونکہ مغلوب الحال شخص کا غلبۂ حال کے وقت اپنی عبارت کو درست رکھ سکنا ممکن نہیں۔ نیز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس عبارت کا مفہوم اس قدر

مشکل ہو کہ لوگ اس کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہوں اور ان کے اپنے وہم نے اس عبارت سے ان کے لئے ایسی صورت پیدا کر دی ہو کہ وہ محض اپنی کم فہمی کی وجہ سے اس کا انکار کر رہے ہوں حالانکہ ان کا یہ انکار خود اُن کی کم فہمی کی طرف راجع ہو گا نہ کہ اس معنی کی طرف ! لیکن میں نے بغداد میں ملحدین کے ایک ایسے گروہ کو دیکھا ہے کہ وہ آپ سے محبت کا مدعی ہے اور آپ کے کلام کو اپنے الحاد کے لئے محبت قرار دیتا اور اپنے آپ کو حلاجی کہلاتا ہے، اور آپ کے معاملہ میں بڑی مبالغہ آمیزی سے کام لیتا ہے جس طرح کہ راضی (شیعہ) لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اپنی محبت کے بارے میں انتہائی مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ میں انشاء اللہ ان کے کلام کی تردید اور ان فرقوں کے بیان میں ایک مستقل باب لاؤں گا۔ الغرض آپ چونکہ مغلوب الحال شخص تھے اور اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکتے تھے اس لئے آپ کا کلام لائقِ اقتداء نہیں کیونکہ صرف اسی شخص کا کلام لائق اقتداء ہوتا ہے جو اپنے آپ پر قابو رکھ سکے۔ پس الحمد اللہ کہ میرے دل میں آپ کی عزت موجود ہے تاہم نہ تو آپ کا طریق کسی اصل پر صحیح ہے اور نہ ہی آپ کا حال کسی محل پر متمکن ہے اور آپ کے احوال میں بظاہر بڑا فساد ہے، مجھے اپنے مکاشفات کی ابتداء میں آپ سے متعلق بہت سے دلائل حاصل ہوئے اور میں نے آپ کے کلام کی شرح میں ایک مستقل کتاب بھی لکھی جس میں آپ کے کلام کی عظمت اور آپ کے احوال کی محبت کو دلائل و براھین سے ثابت کیا۔ علاوہ ازیں اس سے قبل ذکر کہ وہ اپنی کتاب منہاج الدین میں بھی آپ کے احوال کی ابتداء و انتہاء کو بیان کیا ہے اور مختصراً یہاں بھی کچھ بیان کر دیا ہے۔ پس جس طریق کی اصل کو اتنے اعتراضات کے ساتھ ثابت کرنا پڑے اس کیساتھ کس طرح تعلق پیدا کیا جائے اور کس طرح اس کی اقتداء کی جائے ؟ کیونکہ نفسانی خواہشات کو تو سچائی کے ساتھ ہرگز موافقت نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ حق سے انحراف اور کجروی کے لئے طریقے تلاش کرتی رہتی ہیں تاکہ اس سے لپٹ جائیں ۔۔ آپ سے روایت ہے کہ فرمایا "الالسنۃ فستنطقات تحت نطقھا مستھلکات" (زبانیں بولتی ہیں لیکن ان سے نکلنے والے الفاظ میں دل کی ہلاکت کے سامان پوشیدہ ہوتے ہیں) یعنی عبارتیں

اور الفاظ باعثِ آفت ہیں اور معنی کی حقیقت بیان کرنے میں ناکام ہیں۔ کیونکہ اگر معنی حاصل ہو جائے تو پھر وہ عبارات کی وجہ سے گم نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر وہ گم ہو جائے تو پھر عبارات کی وجہ سے وجود پذیر نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ طالب اپنی سوچ سے کسی عبارت کو کوئی معنی پہناتا ہے اور پھر ان کو حقیقی اور صحیح معنی سمجھ لیتا ہے اس لئے ہلاکت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم

حضرت ابو اسحاق ابراہیم بن احمد الخواص رحمۃ اللہ

اور انہی تابعین رحمہم میں سے ایک متوکلین کے سپہ سالار اور اہلِ تسلیم و رضاء کے پیشوا حضرت ابو اسحاق ابراہیم بن احمد الخواص رحمۃ اللہ بھی ہیں۔ آپ توکل میں بڑی شان اور بلند مقام کے مالک تھے آپ نے بہت سے مشائخ کو پایا۔ آپ کی بہت سی کرامتیں مشہور ہیں اور معاملاتِ طریقت میں بڑی عمدہ تصانیف موجود ہیں۔ آپ کے بارے میں روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "العلم کلہ فی کلمتین لاتتکلف ما کفیت ولا تضیع ما استکفیت" (تمام کا تمام علم دو جملوں میں مجتمع ہے ایک یہ کہ حق تعالےٰ نے جس کام کا تجھے مکلف نہیں بنایا اس کا تکلف نہ کرے اور دوسرا یہ کہ جس کام کا تجھ پر فریضہ عائد کیا گیا ہے اس کو ضائع نہ کرے) تاکہ دنیا و آخرت میں تو حق تعالےٰ کے منشاء کے موافق ہو جائے۔ اس کلام سے مُراد یہ ہے کہ تو اپنی قسمت کو تبدیل کرنے کی کوشش نہ کر کیونکہ یہ قسمت ازلی ہے اور تمہارے تکلف سے یہ تبدیل نہیں ہو سکتی اور ان کے احکام کی بجاآوری میں کوتاہی کا مرتکب نہ ہو کہ حکم کا ترک تجھ کو بُرے انجام سے دوچار کر دے گا۔

لوگوں نے آپ سے دریافت کیا کہ عجائبات میں سے آپ نے کیا کچھ دیکھا ہے؟ تو آپ نے فرمایا یوں تو بہت سے عجائب دیکھے ہیں لیکن سب سے عجیب تر یہ بات دیکھی ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے میری صحبت اختیار کرنا چاہی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ لوگوں نے پوچھا اس کی وجہ کیا ہے؟ تو فرمایا "میں نے یہ اس لئے نہیں کیا تھا کہ مجھے ان سے زیادہ کسی اچھے رفیق کے ملنے کی توقع تھی بلکہ صرف اس لئے کہ میرے دل میں خوف

پیدا ہوا کہ حق تعالےٰ کو چھوڑ کر آپ پر بھروسہ نہ کرنا پڑے اور یوں آپ کی صحبت میرے توکل کو نقصان نہ پہنچائے اور یہی فریضہ کو ترک کر کے نفل کی ادائیگی میں نہ لگ جاؤں۔ ظاہر ہے کہ آپ کی یہ بات آپ کے کمال پر دلالت کرتی ہے۔

حضرت ابوحمزہ بغدادی رحمۃ اللہ

عزت کے سراپردہ اور اہل یقین کی بنیاد حضرت ابوحمزہ بغدادی البزاز رحمۃ اللہ بھی حضرات تبع تابعین میں سے ایک تھے۔ آپ اپنے حلقے کے بڑے اور مشائخ کے متکلمین میں شمار ہوتے تھے۔ حضرت حارث محاسبی رحمۃ اللہ کے مرید حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ کے صحبت یافتہ حضرت نوری اور حضرت خیر النساج رحمہم کے ہمعصر اور بڑے بڑے مشائخ سے اکتساب فیض کرنے والے تھے۔ آپ بغداد کی مسجد رصافہ میں حلقہ وعظ فرمایا کرتے تھے، آپ علم تفسیر اور علم تجوید کے بلند پایہ عالم تھے اور پیغمبر علیہ السلام کی احادیث کے سلسلہ میں آپ کی روائت کردہ حدیثیں بڑی ثقہ اور مستند سمجھی جاتی ہیں۔ آپ وہی واحد قابلِ تعریف انسان ہیں جنہوں نے حضرت نوری رحمۃ اللہ کا زن کی مصیبت کے دور میں ساتھ دیا تھا چنانچہ حق تعالےٰ نے ان سب کو نجات سے نوازا۔ میں انشاء اللہ اس کو حضرت نوریؒ کے مذہب کی شرح میں بیان کروں گا — آپ سے روائت ہے کہ فرمایا" اذا سلمت منك نفسك فقد اديت حقها واذا سلم منك الخلق فقد اديت حقوقهم" (جب تجھ سے تیرا نفس محفوظ رہ گیا تو گویا تو نے اپنے وجود کا حق ادا کر دیا اور جب تجھ سے مخلوقِ خدا محفوظ رہی تو گویا تو نے ان کے حق بھی ادا کر دیئے) یعنی حقوق کی دو قسمیں ہیں ایک تیرے اپنے وجود کا حق اور دوسرا لوگوں کا حق — جب تو اپنے نفس کو اللہ تعالےٰ کی نافرمانی اور گناہ سے روک رکھے اور آخرت کی سلامتی کا راستہ تلاش کرے تو تُو نے اپنے نفس کا حق ادا کر دیا اور جب تو نے لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رکھا اور ان کے لئے بُرائی کا ارادہ نہ کیا تو تو نے ان کا حق بھی ادا کر دیا۔ لہٰذا اس کوشش میں لگا رہ کہ تجھ کو اور مخلوق کو

تجھ سے کوئی بُرائی نہ پہنچے پھر اس کے بعد حق تعالےٰ کے حقوق ادا کرنے میں مشغول ہو جا۔ واللہ اعلم

حضرت ابوبکر محمدؐ بن موسیٰ الواسطی رحمۃ اللہ

اپنے فن کے امام، بلند حال اور لطیف کلام حضرت ابوبکر محمد بن موسیٰ الواسطی رحمۃ اللہ تعالےٰ بھی حضرت تبع تابعین میں سے ایک تھے۔ آپ محقق مشائخ میں شمار ہوتے تھے اور حقائق تصوف کے بیان کرنے میں پر عظمت شان اور بلند مقام کے حامل بزرگ تھے جملہ مشائخ کے نزدیک آپ قابلِ تعریف تھے۔ حضرت جنیدؒ کے قدیم اصحاب میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ کا کلام اس قدر مشکل ہوتا تھا کہ اہل ظاہر کی آنکھ میں جچتا نہ تھا۔ آپ زیادہ عرصہ کسی شہر میں آرام کے لئے ٹھہرتے نہ تھے۔ لیکن جب آپ مرو میں تشریف لائے تو چونکہ یہاں کے لوگ اپنی لطافتِ طبع کی وجہ سے بڑے نیک سیرت تھے اس لئے انہوں نے آپ کا بڑا احترام کیا اور عزت کے ساتھ آپ کو قبول اور آپ کا کلام سنا چنانچہ آپ نے باقی عمر وہاں ہی گزار دی۔ آپ سے روایت ہے کہ فرمایا "الذاکر فی ذکرہٖ اکثر غفلۃِ الناس لذکرہٖ" (اس کا ذکر کرنے والے کو ذکر کرنے میں اکثر ایسی غفلت ہو جاتی ہے کہ ایسی غفلت تو اس کا ذکر بھول جانے والوں کو بھی نہیں ہوتی) کیونکہ اگر اس کی ذات کو یاد رکھے اور زبان سے اس کا ذکر بھول بھی جائے تو نقصان دہ نہیں، نقصان دہ حالت تو یہ ہے کہ زبان پر اس کا ذکر تو کرتا رہے لیکن اس کی ذات کو فراموش کر دے کیونکہ اس طرح ذکر بغیر مذکور کے ہوگا۔ پس حق تعالےٰ کی ذات سے روگردانی کے باوجود ذکر کرتے ہوئے کسی غرور میں مبتلا ہو جانا غفلت کے اعتبار سے اس حالت سے زیادہ ہے کہ غرور میں مبتلا کر دینے والے ذکر سے روگردانی کرے اور ذاتِ حق تعالےٰ کو یاد رکھے۔ کیونکہ ذکر کو بھول جانے والے شخص کو بھول جانے میں اس کے حضور کا گھمنڈ نہیں ہوتا لیکن ذاکر کو اس کی غیبت کے باوجود ذکر میں اس کے حضور کا گمان ہوتا ہے۔ پس بے حضوری کی حالت میں حضوری کا غرور اس غیبت

سے زیادہ غفلت کے قریب ہے جس میں حضوری کا گھمنڈ موجود نہ ہو۔ کیونکہ طالبانِ حق کی ہلاکت اسی وقت واقع ہوتی ہے جب وہ کسی باطل گمانی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ جب زعم باطل پیدا ہو جاتا ہے تو پھر مقصود حاصل نہیں ہوتا۔ اور یہ بات ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ حق تعالےٰ کے متلاشی لوگوں کا زعم درحقیقت عقل کی تہمت سے اور عقل عام طور پر ہمت سے حاصل ہوتی ہے اور ہمت کا غرور اور بڑائی کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ۔ بہر حال ذکر یا تو غیبت ہوتا ہے یا حضور ہیں! اگر ذکر کرنے والا اپنے آپ سے بے خبر ہو لیکن حق تعالےٰ کے حضور حاضر ہو تو پھر اس کا ذکر ہی نہیں بلکہ مشاہدہ بن جاتا ہے اور اگر اپنے آپ سے باخبر اور حق تعالےٰ سے غافل ہو تو وہ ذکر ہی نہیں بلکہ غیبت ہے اور غیبت دراصل غفلت ہی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے ۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت ابوبکر بن دُلف بن جحدار شبلی رحمۃ اللہ

احوال کے لئے تسکین اور مقال کے لئے کشتی حضرت ابوبکر بن دُلف بن جحدار شبلی رحمۃ اللہ بھی حضرات تبع تابعین میں سے ایک تھے۔ آپ کا شمار بڑے بزرگوں اور مشہور مشائخ میں ہوتا ہے۔ حق تعالےٰ سے تعلق کے معاملہ' پ آپ کی زندگی بڑی پاکیزہ اور اچھی رہی ہے اور حقیقتِ تصوف کے بیان میں آپکے بڑے قابلِ تعریف اور لطیف اشارے موجود ہیں۔ چنانچہ متاخرین میں سے ایک بزرگ کا کہنا ہے کہ "ثلثۃٌ من عجائب الدنیا اشاراتُ الشبلی ونکاتُ المرتعش وحکایات الجعفر" (تین چیزیں دنیا کے عجائبات میں سے ہیں۔ حضرت شبلیؒ کے اشارات، حضرت مرتعشؒ کے نکات اور حضرت جعفر کی حکایات) آپ اپنے دَور کے بزرگ صوفیا اور سرداران اہلِ طریقت میں سے ایک تھے۔ عمر کے ابتدائی حصے میں خلیفۂ وقت کے دربانوں کے افسر تھے لیکن پھر حضرت خیر النساج کی صحبت میں توجہ کی اور حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ کے مرید ہو گئے ان کے علاوہ بھی وقت کے دوسرے بہت سے بزرگوں کی زیارت

کا شرف حاصل کیا۔ آپ سے روائت ہے کہ آپ نے حق تعالیٰ کے ارشاد قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ (مومنوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں) کے معنی میں فرمایا "ای ابصار الرؤس عن المحارم و ابصار القلوب عما سوی اللہ تعالیٰ" (یعنی اپنے سر کی آنکھوں کو شہوت کے ساتھ دیکھنے سے اور اپنے دل کی آنکھوں کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کی طرف متوجہ ہونے سے محفوظ رکھیں) پس شہوت کا اتباع اور غیر محرم کو شہوت کی نگاہ سے دیکھنا حق تعالیٰ سے غفلت کی وجہ سے ہوتا ہے اور اہلِ غفلت کے لئے سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ وہ اپنے عیوب سے بھی غافل ہوتے ہیں اور جو کوئی اس دنیا میں غفلت شعار ہو گا وہ آخرت میں بھی غافل اور جاہل ہی ہو گا۔ "وَمَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ اَعْمٰی" (اور جو کوئی اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہو گا) اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک حق تعالیٰ کسی کے دل سے شہوت کا ارادہ پاک نہ فرما دیں اس وقت تک اس کے سر کی آنکھیں شہوت کی تباہ کاریوں سے محفوظ نہیں رہ سکتیں اور جب تک حق تعالیٰ کسی کے دل میں اپنا ارادہ قائم نہ کر دیں اس وقت تک اس کے دل کی نگاہیں غیر اللہ کے نظارے سے محفوظ نہیں ہو سکتیں ـــــ اور آپ کے بارے میں آتا ہے کہ ایک روز آپ بازار میں تشریف لائے تو ایک گروہ نے آپ کو دیکھ کر کہا کہ "ھٰذا مجنون" (یہ تو کوئی دیوانہ ہے) تو آپ نے فرمایا "انا عندکم مجنون وانتم عندی اصحاء فزادنی اللہ فی جنونی و زادنی صحتکم" (میں تمہارے نزدیک دیوانہ ہوں اور تم میرے نزدیک ہوشیار ہو۔ پس حق تعالیٰ میری دیوانگی میں اور تمہاری ہوشیاری میں اضافہ کر دیں) یعنی میری دیوانگی حق تعالیٰ کے ساتھ میری شدتِ محبت کی بناء پر ہے اور تمہاری ہوشیاری حق تعالیٰ سے تمہاری شدتِ غفلت کی وجہ سے ہے اس لئے میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری دیوانگی میں اضافہ کر دیں تاکہ میرا قرب اور بڑھ جائے اور تمہاری ہوشیاری میں اضافہ کر دیں تاکہ تمہاری غفلت اور دوری بھی بڑھ جائے ـــ آپ کا یہ جوابی قول آپ کی غیرت کی وجہ سے تھا کہ یہ لوگ مسلمان ہونے کے باوجود اس

قدر کم علم کیوں ہو گئے ہیں کہ وہ جنون اور محبت الہٰی کی کیفیت میں فرق بھی محسوس نہیں کر سکتے۔ واللہ اعلم —

حضرت ابو محمّد بن جعفر بن نصیر الخالدی رحمۃ اللہ

اور انہی حضرات تبع تابعین میں سے اولیاء کرامؒ کے احوال و اقوال کو لطیف پیرایہ میں بیان کرنے والے حضرت ابو محمد جعفر بن خالدی رحمۃ اللہ بھی ایک ہیں آپ کا شمار حضرت جنیدؒ کے بڑے اور پرانے اصحاب میں ہوتا ہے۔ آپ علوم تصوف کے بڑے متبحر عالم۔ مشائخ کے کلام کے حافظ اور ان کے حقوق کی بڑی رعایت کرنے والے تھے۔ علم کے تمام شعبوں میں آپ کا کلام بڑا بلند پایہ شمار کیا جاتا ہے اور آپ نے نفس کی سرکشی کو ترک کرنے کے سلسلہ میں تمام مسائل میں بڑی عُمدہ حکایتیں بیان فرمائی ہیں لیکن ان کو منسوب کسی اور کی طرف کیا ہے — آپ سے روائت ہے کہ فرمایا۔ اَلتوکل استواء القلب عند الوجود والعدم (رزق کے ملنے یا نہ ملنے تمام صورتوں میں دل کے ایک حال پر برابر رہنے کا نام توکل ہے) یعنی رزق کے موجود ہونے پر خوش نہ ہو اور موجود نہ ہونے پر غمگین نہ ہو کیونکہ انسان کا جسم حق تعالےٰ کی ملکیت ہے اور اس کی پرورش یا ہلاکت کے معاملہ میں حق تعالےٰ ہی زیادہ بہتر اور حقدار ہیں کہ اُس کو جس طرح چاہئیں رکھیں تو درمیان میں دخل نہ دے، ملک کو مالک کے حوالے کر اور اپنے تصرف کو ترک کر دے — حضرت ابو محمد بن جعفرؒ بیان فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ حضرت جنیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ بخار میں مبتلا تھے، میں نے عرض کی استادِ مکرم! اللہ تعالےٰ سے دعا کیجئے کہ وہ آپ کے جسم کو تندرستی عطا فرمائیں، آپ نے فرمایا۔ کل میں تندرستی کے لئے دُعا کر رہا تھا کہ میرے اندر سے آواز آئی کہ تمہارا جسم ہماری ملک ہے۔ ہم چاہئیں گے تو اسے تندرست رکھیں اور چاہئیں گے تو بیمار رکھیں گے۔ ہمارے اور ہماری ملک کے درمیان دخل دینے والے تم کون ہوتے ہو، اپنے تصرف کو

ترک کر دو تاکہ ہمارے بندے ہو جاؤ! ــــ واللہ اعلم۔

حضرت ابو علی محمد بن قاسم الرودباری رحمۃ اللہ علیہ

قابلِ تعریف اور سخاوت کے معدن حضرت ابو علی محمد بن القاسم الرودباری رحمۃ اللہ بھی انہی حضراتِ تبع تابعین میں سے ایک ہیں، آپ صوفیاء میں سے بڑے جوانمرد بزرگ اور بادشاہوں کی اولاد میں سے تھے۔ معاملاتِ تصوف کے جملہ فنون میں بڑی شان کے مالک تھے، آپ کے اوصاف اور کرامتیں بکثرت ہیں اور طریقت کی باریکیوں کو بیان کرنے میں آپ کا اسلوب انتہائی لطیف ہے آپ سے روائت ہے کہ فرمایا" المرید لا یرید لنفسہ الا ما اراد اللہ لہٗ والمراد لا یرید من الکونین شیاءً غیرہٗ" (مرید وہ ہوتا ہے جو اپنے نفس کے لئے وہی چیز چاہئے جو اللہ تعالےٰ اس کے لئے چاہتے ہیں اور مراد وہ شخص ہے جو دونوں جہانوں میں حق تعالےٰ کے سوا کسی چیز کو نہ چاہے) پس ایک تو اپنے ارادے سے حق تعالےٰ کے ارادے پر راضی ہوتا ہے تاکہ وہ مرید ہو اور اللہ تعالےٰ کے محب کا تو کوئی ارادہ ہی نہیں ہوتا چنانچہ وہ حق تعالےٰ کی مراد ہوتا ہے لہٰذا جو شخص حق تعالےٰ کو چاہتا ہے وہ اس چیز کے علاوہ کسی چیز کا ارادہ نہیں کرے گا جو چیز حق تعالےٰ اس کے لئے چاہئیں گے وہ بھی حق تعالےٰ کے علاوہ کسی چیز کا ارادہ نہیں کرے گا۔ پس حق تعالےٰ کے ارادے پر راضی ہو جانا طالب حق کے مقامات کی ابتداء ہے اور حق تعالےٰ سے محبت اس کے احوال کی انتہا ہے ــ اور مقامات کا تعلق عبودیت کے متحقق ہونے سے ہے جب کہ انتہائی درجات کا حصول محض تائید ربانی سے ہوتا ہے اور جب ایسا ہے تو پھر مرید اپنی ذات کے ساتھ قائم ہوتا ہے لیکن مراد حق تعالےٰ کے ساتھ قائم ہوتا ہے ــ واللہ اعلم۔

حضرت ابوالعباس قاسم بن مہدی السیاری رحمۃ اللہ تعالیٰ

اور انہی میں سے توحید خداوندی کے خزینہ اور اس کی یکتائی کی طرف رہنمائی کرنے والے بزرگ حضرت ابوالعباس قاسم بن مہدی السیاری رحمتہ اللہ بھی ایک ہیں آپ اپنے دور کے بہت بڑے پیشوا اور علوم ظاہری و باطنی کے بلند پایہ عالم تھے آپ نے حضرت ابوبکر واسطی کی صحبت اور دوسرے بہت سے مشائخ سے تربیت کا شرف حاصل کیا تھا آپ طبقہ صوفیاء میں بڑے ممتاز اور صاحب شرف حق تعالیٰ کی محبت میں سب سے زیادہ زاہد تھے۔ آپ کا کلام بلند پایہ اور تصانیف بڑی قابل تعریف ہیں ___ آپ کے بارے میں آتا ہے کہ فرمایا" التوحید ان لایخطر بقلبک ما دون التوحید" (حق تعالےٰ کی توحید کا حق یہ ہے کہ دل میں اس کے سوا کسی چیز کا گزر ہی نہ ہو) یعنی تیرے دل میں مخلوق بلکہ اپنے معاملے کی صحت و صفائی کا دھیان بھی نہ آئے کیونکہ غیر کا خیال ان کے اثبات کی وجہ سے آتا ہے۔ اور جب غیر ثابت ہو گیا تو گویا مقصد توحید تو ساقط ہو گیا ___ آپ ایک علمی اور دولتمند خاندان کے چشم وچراغ تھے اور مرد میں کسی کو بھی آپ کے خاندان پر فوقیت حاصل نہ تھی۔ آپ نے اپنے والد سے بہت بڑی جائیداد وراثت میں پائی تھی لیکن وہ تمام دولت و میراث دے کر آپ نے حضرت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دو موئے مبارک خرید لئے تھے۔ خدا تعالےٰ نے ان دو بالوں کی برکت سے آپ کو توبہ نصوح کی توفیق نصیب فرمائی اور آپ حضرت ابوبکر واسطی رحمۃ اللہ کی صحبت میں داخل ہو گئے اور اس مقام و مرتبہ تک پہنچے کہ صوفیاء کے ایک گروہ کے امام و پیشوا ہو گئے ___ جب آپ دنیا سے رخصت ہونے لگے تو وصیت کی کہ یہ دونوں موئے مبارک میرے منہ میں رکھ دیئے جائیں۔ اس کے اثر سے آج تک آپ کی قبر مرو میں ظاہر ہے اور مرجع خاص و عام ہے، لوگ آپ کے توسط سے اپنی مہمات حق تعالےٰ کے حضور پیش کرتے ہیں اور اپنی مراد حاصل کرتے ہیں۔

حضرت ابوعبداللہ محمد بن خفیف رحمۃ اللہ تعالیٰ

تصوف میں اپنے دور کے بادشاہ اور تصرف و تکلف سے بے نیاز حضرت ابوعبداللہ محمد بن خفیف رحمۃ اللہ تعالیٰ بھی انہی حضرات تبع تابعین رحمہم میں سے ایک تھے۔ آپ اپنے دور میں علوم کے تمام شعبوں کے امام رہے ہیں مجاہدات میں آپ بڑی شان اور حقائق کے بیان میں مہارت تامہ کے مالک تھے۔ آپ کی پر مسرت زندگی اور مرتبہ و مقام آپ کی تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے۔ حضرات ابن عطاء شبلی حسین بن منصور جریدی وغیرہ رحمہم اللہ اجمعین کو آپ نے پایا اور مکہ مکرمہ میں حضرت یعقوب نہرجوری رحمۃ اللہ کی صحبت کا فیض حاصل کیا تھا۔ مجرد ہونے کی وجہ سے آپ نے بڑے نیک سفر اختیار کئے، آپ کا تعلق شاہی خاندان سے تھا لیکن جب اللہ تعالیٰ نے توجہ کی توفیق ارزانی فرمائی تو آپ نے دنیا سے منہ موڑ لیا۔ اہل معانی کے دلوں میں آپ کی بڑی عظمت و بزرگی موجود ہے ___ آپ سے روائت ہے کہ فرمایا "التوحید الاعراض عن الطبیعۃ" (اپنی طبیعت سے اعراض کرنے کا نام توحید ہے) اس لئے کہ تمام طبیعتیں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے محجوب اور نابینا ہوئی ہیں، پس جب تک طبیعت سے اعراض نہ کیا جائے حق کی طرف توجہ نہیں ہو سکتی اور طبیعت کی طرف توجہ کرنے والا توحید کی حقیقت سے محجوب رہتا ہے اور جب تم نے طبیعت کی خرابیوں کو دیکھ لیا تو توحید کی حقیقت تک رسائی حاصل کر لی ___ اور آپ کی کرامتیں اور دلیلیں بہت ہیں۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابوعثمان سعید بن سلام المغربی رحمۃ اللہ تعالیٰ

حضرات تبع تابعین رحمہم میں سے ایک سیف سیادت اور آفتاب سعادت حضرت ابوعثمان سعید بن سلام المغربی رحمۃ اللہ تعالیٰ بھی ہیں۔ آپ اپنے حال پر

قابو رکھنے والے بزرگوں میں سے ایک تھے۔ علم کے فنون میں کافی حصہ رکھتے تھے۔ تصوف میں صاحب ریاست وسطوت تھے نفس کی برائیوں کو بیان کرنے میں آپ کی بہت سی روایات ہیں اور عمدہ کرامات مشہور ہیں ___ آپ سے روایت ہے فرمایا" من الشر صحبة الاغنیاء علی مجالسة الفقراء ابتلاہ اللّٰہ تعالیٰ بموت القلب" (جو آدمی فقراء کی مجالس پر دولتمندوں کی صحبت و ہم نشینی کو ترجیح دیتا ہے اللّٰہ تعالیٰ اس کو دل کی موت میں مبتلا کر دیتے ہیں) یعنی جو آدمی فقراء کی مجلسوں میں بیٹھنا چھوڑ کر امراء اور دولتمندوں کی صحبت اختیار کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے دل کو نور معرفت سے بیگانہ کر دیتے ہیں کیونکہ فقراء سے روگردانی وہی کر سکتا ہے جس نے ابھی تک ان سے مجالست ہی اختیار کی ہو لیکن جو شخص صوفیاء و فقراء کی باقاعدہ صحبت اختیار کر لیتا ہے پھر وہ روگردانی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا جو فقراء کی ہم نشینی چھوڑ کر دولتمندوں کی صحبت اختیار کر لیتا ہے اس کا دل نیاز مندی کی موت مر جاتا ہے اور اس کا جسم غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے ___ پس جب فقراء کی مجالست ترک کر دینے کا ثمرہ دل کی موت ہے تو پھر ان کی صحبت سے روگردانی کا انجام کتنا خطرناک ہوگا؟ ___ ان کلمات سے صحبت اور مجالست کا فرق معلوم ہو جاتا ہے ___ واللّٰہ اعلم بالصواب۔

حضرت ابوالقاسم محمّد بن محمود النصر آبادی رحمۃ اللّٰہ تعالیٰ

اور انہی میں سے صوفیاء کے صفِ اوّل کے بہادر اور عارفانِ طریقت کے احوال بیان کرنے والے حضرت ابوالقاسم محمّد بن محمود النصر آبادی رحمۃ اللّٰہ بھی ہیں آپ نیشاپور میں اسی طرح بلند حال اور عالی مرتبہ تھے جس طرح نیشاپور میں خوارزم شاہ اور حمویہ میں شاہ پور ___ فرق یہ تھا کہ ان بادشاہوں کی عزت و مرتبہ اس دنیا میں تھا لیکن آپ کی عزت آخرت میں ___ آپ کا کلام بڑا عجیب اور کرامتیں بڑی بلند پایہ ہیں آپ حضرت شبلی رحمۃ اللّٰہ کے مرید اور اہلِ خراسان کے متاخرین صوفیاء کے استاد

تھے۔ اپنے دور میں آپ کا کوئی ثانی نہ تھا۔ فنونِ علم میں آپ اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم اور سب سے بڑے متقی تھے ــــ آپ کے بارے میں آتا ہے کہ فرمایا انت بین نسبتین، نسبۃ الیٰ آدم ونسبۃ الی الحق فاذا انتسبت الیٰ آدم دخلت فی میادین الشھوات و مواضع الآفات والزلات وھی نسبۃ تحقق البشریہ، قال اللہ تعالیٰ انہٗ کان ظلوماً جھولاً۔ واذا نسبت الی الحق دخلت فی مقاماتِ الکشف والبراھین والعصمۃ والولایۃ وھی نسبۃ تحقق العبودیۃ قال اللہ تعالیٰ و عباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض ھوناً" (تو دو نسبتوں کے درمیان ہے ایک نسبت آدم علیہ السلام کی طرف اور دوسری حق تعالےٰ کی طرف۔ پس جب تمہاری نسبت حضرت آدم علیہ السلام کی طرف کی جائے گی تو تم شہوت کے میدانوں اور خرابیوں اور خطاؤں کے مقامات میں داخل ہو جاؤ گے یہ نسبت تمہاری بشریت کو ثابت کرتی ہے جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ "بے شک وہ اپنی جان کو مشقت میں ڈالنے والا نادان ہے ــــ اور جب تم حق تعالےٰ کی طرف اپنی نسبت کرو گے تو کشف، دلائل پاک بازی اور ولایت کے مقامات میں داخل ہو جاؤ گے اور یہ نسبت تمہاری عبدیت کو ثابت کرے گی جیسا کہ حق تعالےٰ نے فرمایا "اور حق تعالےٰ کے وہ بندے جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں) بندوں کی نسبت حضرت آدم علیہ السلام سے تو قیامت کے دن منقطع ہو جائے گی لیکن حق تعالےٰ کے ساتھ عبودیت کی نسبت ہمیشہ قائم رہے گی اور اس میں کبھی تغیر نہیں آئے گا ــــ جب بندہ اپنے آپ کو اپنی ذات کی طرف یا حضرت آدم علیہ السلام کی طرف منسوب کرے تو اس کا کمال یہ ہے کہ یوں کہے "انی ظلمتُ نفسی" (میں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے)، اور جب بندہ اپنی نسبت حق تعالےٰ کے ساتھ کرے تو اس وقت اس مقام میں ہوتا ہے کہ حق تعالےٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ "یَا عِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ" (اے میرے بندو! آج تم پر کوئی خوف نہیں

واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت ابوالحسن علی بن ابراہیم الحصری رحمۃ اللہ تعالیٰ

اور انہی حضراتِ تبع تابعین رحمہم میں سے ایک راہِ حق پر چلنے والوں کے دلی سرداز اور تحقیقِ حق میں مصروف رہنے والوں کے جانوں کا حسن حضرت ابوالحسن علی بن ابراہیم الحصری رحمۃ اللہ تعالےٰ بھی ہیں. آپ بارگاہِ حق کے ذی احتشام بزرگوں اور صوفیاء کے بڑے اماموں میں سے تھے. اپنے دور میں آپ بے مثال تھے اور تمام معانی طریقت میں آپ کا کلام بلند مرتبہ اور عبارات پسندیدہ ہیں ــــ اور آپ سے روائت ہے کہ فرمایا دعونی فی بلائی، ھاتوا ما لکم اُلستم من اولادِ آدم الذی خلقہ اللہ تعالیٰ بیدہٖ و نفخ فیہ من روحہٖ وَ اُسجدَ لہ ملٰئکتہٗ ثم اَمرہٗ یا مرٍ فخالف فاذا کان اول الدن دردیا فکیف کان آخرہٗ (مجھے میری مصیبت میں چھوڑ دو، لاؤ جو کچھ تمہارے پاس ہے، کیا تم اس آدم (علیہ السلام) کی اولاد نہیں ہو جس کو حق تعالےٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی اور اپنے فرشتوں سے اس کو سجدہ کرایا پھر اُسے ایک بات کا حکم دیا تو اس نے اس کی خلاف ورزی کی. جب مٹکے کی پہلی شراب ہی اس طرح تلچھٹ ہو تو بتاؤ اس کا آخر کیا ہوگا) یعنی جب آدمی کو اس کی حالت پر چھوڑ دیں تو وہ پوری طرح مخالفت پہ اتر آتا ہے لیکن اگر حق تعالےٰ اس پر اپنی نظرِ عنایت فرمائے رکھیں تو وہ مجسم محبت بن جاتا ہے ــــ لہٰذا تم حق تعالےٰ کی عنایات کی خوبصورتی کا اندازہ کرو اور اپنے بد معاملگی کا اس سے مقابلہ کرو اور تمام عمر اسی میں گزار دو ــــ وباللہ التوفیق۔

یہ صوفیاء متقدمین اور ان کے پیشواؤں میں سے بعض بزرگوں کا تذکرہ تھا اگر ہم ان تمام کا ذکر اس کتاب میں کرتے یا اس گروہ کے مذکورہ حالات کی شرح کرتے اور ان کی حکایات بھی لکھتے تو کتاب طویل ہو جاتی اور اصلی مقصد فوت ہو جاتا. اب ہم متاخرین صوفیاء کے ایک گروہ کے حالات بیان کرتے ہیں۔ توفیق، حفاظت اور امداد صرف اللہ ہی کی جانب سے ہوتی ہے ــــ

بارھواں باب

صوفیاء متاخرین کے آئمہ کے ذکر میں

جان لو! اللہ تعالےٰ تمہیں بھلائی نصیب کریں۔ کہ ہمارے اس دور میں ایک طبقہ ایسے لوگوں کا ہے جن میں ریاضت و مجاہدہ کی تو طاقت نہیں پھر بھی ریاضت کے بغیر ہی بزرگی اور فضیلت کے خواہشمند ہیں اور تمام اہل طریقت کو اپنے جیسا ہی سمجھتے ہیں لیکن جب پہلے بزرگوں کی باتیں سنتے اُن کی عزت و شرف دیکھتے اور اُن کے معاملات کو پڑھتے ہیں اور پھر اپنے اندر نگاہ ڈالتے ہیں اور اپنے آپ کو اُن سے بہت دور پاتے ہیں تو اس خواہش کو ترک کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اُن کی طرح نہیں ہیں اور نیز کہتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں اُن جیسے لوگ موجود نہیں ہیں۔ لیکن ان کا یہ قول سراسر غلط ہے کیوں کہ اللہ تعالےٰ زمین کو کسی دور میں بھی محبت کے بغیر نہیں چھوڑتے اور اس امت کو ہرگز اپنے دوستوں سے خالی نہیں کرتے جیسا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لَا یَزَالُ طَائِفَۃٌ مِنْ اُمَّتِیْ عَلَی الخیر والحق حتّٰی تقوم الساعۃ (میری امت میں سے ایک گروہ تا قیام قیامت نیکی اور حق پہ قائم رہے گا) اور نیز حضرت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ " لَا یزال فی اُمّتی اَربَعُونَ عَلٰی خُلُقِ ابراھیم" (میری امت میں ہمیشہ ایسے چالیس افراد موجود رہیں گے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خُلق پہ قائم رہیں گے) ——— جس گروہ کا ابھی ہم ذکر کرنے والے ہیں اُن میں سے کچھ حضرات تو اس دنیا سے گزر چکے ہیں اور اپنی روح کو راحت و آرام پہنچا چکے ہیں اور کچھ حضرات ابھی تک زندہ ہیں۔ اللہ تعالےٰ ہم سے اور تمام مسلمان مرد و زن سے اپنی رحمت کے سبب راضی ہوں:۔

حضرت ابوالعباس احمد بن محمد القصاب رحمۃ اللہ تعالےٰ

ان متاخرین صوفیاء رحمھم اللہ تعالےٰ میں سے ایک راہِ ولایت کی رونق جماعت اہل ہدایت کا حسن حضرت ابوالعباس احمد بن محمد القصاب رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ کہ آپ نے ماوراءالنہر کے مقتدین

صوفیا کی زیارت کی اور اُن کی صحبت کا شرف حاصل کیا تھا۔ آپ عالی مرتبے، سچی فراست، کثرتِ برھان اور زہد و کرامت میں بڑے مشہور و معروف تھے۔ طبرستان کے امام حضرت ابو عبداللہ خیاطی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کی دی ہوئی فضیلتوں میں سے ایک یہ ہے کہ کسی کو تعلیم حاصل کئے بغیر وہ مقام عطا فرما دیں کہ جب ہم کو دین کے اصولوں اور توحید کی باریکیوں کے سمجھنے میں کوئی مشکل پیش آئے تو ہم اُس سے دریافت کریں، اور وہ حضرت ابوالعباس قصابؒ کی شخصیت ہے۔ آپ بالکل اُمّی تھے پھر بھی آپ کا کلام اور گفتگو اصول دین اور علم تصوف میں بڑی بلند مرتبہ ہوتی تھی اور آپ اپنے ابتدائی اور انتہائی تمام حالات میں عالی حال اور نیک سیرت تھے۔ میں نے اُن کی بہت سی حکایات سُنی ہیں لیکن اس کتاب میں ہم اختصار کے طریقہ کو اپنائے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بوجھ سے لدے اونٹ کی مہار پکڑے ایک لڑکا آمل کے بازار "جہاں ہر وقت کیچڑ رہتا تھا" سے گزر رہا تھا کہ اونٹ کا پاؤں پھسلا اور وہ زمین پر گر پڑا جس سے اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ لوگوں نے اونٹ کی پیٹھ سے بوجھ اتارنے کا ارادہ کیا کیوں کہ وہ لڑکا ہاتھ ہلا ہلا کر لوگوں کو مدد کے لئے پکار رہا تھا اتنے میں اتفاقاً حضرت شیخ ابوالعباس اُس طرف آ نکلے اور پوچھا کہ "کیا ہوا؟ لوگوں نے بتایا کہ اونٹ کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ آپؒ نے اونٹ کی مہار تھامی اور آسمان کی طرف سر اٹھا کر دعا کی "بار خدایا اس اونٹ کی ٹانگ درست فرما دے کہ اگر اس کو درست نہیں کرنا چاہتا تو پھر اس لڑکے کے رونے سے قصاب کے دل کو تو نے کیوں بے قرار کر دیا ہے؟ آپ کا یہ کہنا تھا کہ اُسی وقت اونٹ اٹھ کھڑا ہوا اور چلنے لگا۔ اور آپ سے روایت ہے کہ فرمایا "تمام لوگوں کو حق تعالےٰ کی تقدیر پر بہر صورت راضی رہنا چاہئے ورنہ وہ رنجیدہ رہیں گے کیوں کہ اگر تو اس کی تقدیر پر راضی ہوگا تو مصیبت کے وقت آزمائش میں ڈالنے والے کی طرف دیکھے گا۔ اور اس طرح تجھے اس مصیبت پر تکلیف نہ ہوگی لیکن اگر تو تقدیرِ الٰہی پر راضی نہ رہے گا تو بلا تو ضرور آئے گی کیوں کہ اللہ تعالےٰ ہماری رضامندی یا نہ رضامندی سے اپنی مقررہ تقدیر کو تبدیل نہیں کرتے۔ تو اس طرح تو رنجیدہ خاطر رہے گا۔ پس ہمارا اس کے فیصلوں پر راضی رہنا ہماری راحت کا سبب ہے

اور جو شخص اُس کے فیصلوں پر راضی رہتا ہے اس کا دل آرام پاتا ہے اور جو کوئی اُس کی تقدیر سے روگردانی کرتا ہے وہ اس کی تقدیر کے وارد ہونے پر رنجیدہ ہوتا ہے —— واللہ اعلم

حضرت ابو علی بن الحسین بن محمد الدقاقی رحمۃ اللہ تعالےٰ

مریدوں کا بیان اور محققین کی بُرھان حضرت ابو علی بن الحسین بن محمد الدقاق رحمۃ اللہ تعالیٰ بھی انہی متاخرین صوفیاء کرام میں سے ایک ہیں۔ آپ اپنے فن کے امام اور اپنے دور کے بے مثل انسان تھے۔ راہ حق کے بیان کرنے میں آپ کا بیان بڑا واضح اور زبان بڑی فصیح تھی۔ آپ نے بہت سے مشائخ کی زیارت کی اور اُن سے صحبت کا شرف حاصل کیا تھا۔ آپ حضرت نصر آبادی کے مرید تھے اور لوگوں کو وعظ و نصیحت کیا کرتے تھے۔ روایت ہے کہ آپ نے فرمایا مَنْ اُنس بغیرہٖ ضَعف فِی حَالِہٖ وَمَنْ نَطَقَ مِنْ غیرہٖ کَذَبَ فی مقالِہٖ" (جس نے غیر حق کے ساتھ اُنس کیا وہ اپنے حال میں ضعیف ہو گیا اور جس نے غیر اللہ کی طرف سے نطق کیا اُس نے اپنے کلام میں جھوٹ بولا) کیوں کہ حق تعالےٰ کے علاوہ کسی سے اُنس کرنا معرفت حق کی کمی کی وجہ سے ہوتا ہے اور حق تعالےٰ سے اُنس کرنا غیر سے وحشت کرنا ہے اور غیر سے وحشت محسوس کرنے والا غیر اللہ کی طرف سے بول نہیں سکتا۔ میں نے ایک بزرگ سے سنا ہے کہ ایک دفعہ میں اُن کی محفل میں حاضر ہوا تا کہ آپ سے متوکلین کے حال سے متعلق دریافت کروں آپ نے اس وقت بڑی عمدہ دستار پہن رکھی تھی میرے دل میں اس کی خواہش پیدا ہو گئی تاہم میں نے سوال کیا کہ ایھا الاستاد ما التوکل؟ (اے استاد توکل کیا ہے؟) آپ نے فرمایا۔ توکل یہ ہے کہ تو لوگوں کی دستار کی طمع نہ کرے یہ کہہ کر آپ نے اپنی دستار اتار کر میرے سامنے ڈال دی۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابوالحسن علی بن احمد الخرقانی رحمۃ اللہ تعالےٰ

متاخرین صوفیاء میں سے ایک اہل زمانہ کا شرف اور اپنے دور کے یگانہ صفت بزرگ حضرت

ابوالحسن علی بن احمد الخرقانی رحمۃ اللہ تعالیٰ بھی ہیں کہ آپ متقدمین مشائخ میں سے بڑے بزرگ اور اپنے وقت کے تمام اولیاء کرام کے ہاں قابل تعریف تھے۔ حضرت شیخ ابوسعید رحمہ اللہ نے آپ کی زیارت کا ارادہ کیا اور آپ کے ساتھ گفتگو کی تو ہر فن میں آپ کا کلام انتہائی عمدہ اور لطیف پایا جب واپس جانے لگے تو آپ نے فرمایا "میں نے تمہیں اپنے دور کی ولایت کے لئے منتخب کر لیا ہے"۔ میں نے حضرت شیخ ابوسعید کے خادم حضرت حسین مؤدب سے سنا ہے کہ جب شیخ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ بالکل خاموش بیٹھے رہے اور آپ کی گفتگو غور سے سنتے رہے اور آپ کی باتوں کے جواب دینے کے علاوہ کسی قسم کی کلام نہ کی، میں نے دریافت کیا کہ اے شیخ آپ کس وجہ سے خاموش ہو گئے تھے؟ فرمایا کہ ایک وقت میں ایک ہی باتیں کرنے والا کافی ہوتا ہے!

اور میں نے حضرت استاد ابوالقاسم قشیری سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا۔ جب میں ولایت خرقان میں داخل ہوا تو اس پیر کامل حضرت خرقانی کی حشمت و رعب کی وجہ سے میری فصاحت ختم ہو گئیں اور مجھ میں بیان کرنے کی طاقت باقی نہ رہی۔ میں نے یہ سمجھا کہ شاید میں اپنی ولایت سے معزول ہو گیا ہوں ——— اور آپ سے روایت ہے کہ فرمایا۔ "راستے دو ہی ہیں، ایک گمراہی کا راستہ اور دوسرا ہدایت کا۔ گمراہی کا راستہ وہ ہے جو خود بندے کا اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اور ہدایت کا راستہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کا بندے کی طرف ہے (یعنی) جو بندہ یہ کہتا ہے کہ میں حق تعالیٰ تک پہنچ گیا ہوں وہ درحقیقت نہیں پہنچا۔ اور جو بندہ یہ کہے کہ حق تعالیٰ نے مجھے اپنی ذات تک رسائی نصیب فرمائی ہے تو وہ واقعی حق تعالیٰ تک پہنچ گیا ہے کیونکہ اس راہ میں پہنچنا نا پہنچنا اور نا پہنچنا پہنچنا ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابوعبداللہ محمد بن علی رحمہ اللہ تعالیٰ

اپنے وقت کے بادشاہ اور مطالب و معانی بیان کرنے میں یکتا حضرت ابوعبداللہ محمد بن علی المعروف بالداغستانی مقیم بہ بسطام رحمۃ اللہ تعالیٰ بھی انہی صوفیاء متاخرین میں سے

ایک ہیں۔ آپ جملہ علوم ظاہری و باطنی کے مایہ ناز عالم اور بارگاہِ الٰہی کے ذی احتشام بزرگوں میں سے تھے۔ آپ کا کلام بڑا مہذب اور اشارے انتہائی لطیف ہیں۔ اس مسلک کے امام اور نیک سیرت بزرگ حضرت شیخ سہلکی رحمہ اللہ سے میں نے آپ کے کلام کی کچھ باتیں سنی ہیں جو بڑی ہی بلند اور پسندیدہ ہیں۔ اُن میں سے ایک یہ ہے کہ آپ فرماتے ہیں: "التوحید عنک موجودٌ وانت فی التوحید مفقودٌ" توحید تو تجھ سے درست ہے لیکن تو خود توحید میں درست نہیں ہے، کیوں کہ تو حق تعالےٰ کے تقاضوں کے مطابق اس میں قیام نہیں کرتا۔

اور توحید میں ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ تو اپنی ملکیت میں اپنا تصرف چھوڑ دے اور اپنے تمام معاملات کو حق تعالیٰ عزوجل کے سپرد کر دے ـــــ اور حضرت شیخ سہلکی نے بیان کیا کہ بسطام میں ایک مرتبہ ٹڈی دل آیا اور اُس کی کثرت سے تمام درخت اور کھیتیاں سیاہ ہو گئیں۔ چنانچہ لوگوں نے فریاد کرنا شروع کر دی۔ شیخ نے مجھ سے دریافت کیا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ میں نے بتایا کہ ٹڈی دل آگیا ہے اور لوگ اس کی وجہ سے انتہائی پریشان ہیں۔ یہ سُنکر شیخ چھت پر تشریف لے گئے اور اپنا منہ آسمان کی طرف کر لیا۔ اسی وقت تمام ٹڈی دل چلا گیا۔ حتیٰ کہ نمازِ عصر تک ایک دانہ بھی باقی نہ رہا اور کسی کا ایک پتہ تک نقصان نہ ہوا۔ ـــــ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت ابوسعید فضل بن محمد المیہنی رحمہ اللہ تعالےٰ

اور انہی میں سے محبانِ خدا کے شہنشاہ اور صوفیاء کے بادشاہوں کے بادشاہ حضرت ابوسعید فضل بن محمد المیہنی رحمہ اللہ تعالےٰ بھی ایک ہیں۔ آپ اپنے وقت کے سلطان اور طریقت کا جمال تھے، تمام اہلِ زمانہ آپ کے تابع فرمان تھے، کچھ لوگ آپ کے حسن وجمال کے فریفتہ اور ایک گروہ آپ کے حُسنِ اعتقاد کا قائل اور ایک گروہ آپ کی قوتِ حال سے مرعوب تھا۔ آپ ظاہری و باطنی جملہ علوم کے بہت بڑے ماہر اور روحانی اسرار و رموز کی آگاہی میں آپ بہت بڑی شان کے مالک تھے۔ اس کے علاوہ آپ کی کرامات، آثار اور

دلائل بہت زیادہ ہیں چنانچہ آج تک دنیا میں آپ کے آثار نمایاں ہیں۔ آپ اپنے ابتدائی حالات میں حصولِ علم کے لئے مہنہ سے سرخس تشریف لائے اور حضرت ابوعلی زاہد رحمہ اللہ سے تعلق قائم کیا اور ایک دن میں تین دن کا سبق لیتے اور وہ تین دن عبادت میں گزار دیتے۔ یہاں تک کہ امام ابوعلی زاہد رحمہ اللہ آپ کے اندر رشد و ہدایت کے نمایاں آثار دیکھ کر آپ کی پہلے سے زیادہ عزت وتکریم کرنے لگے۔ کہتے ہیں کہ ان دنوں شیخ ابوالفضل حسنؒ سرخس کے حاکم تھے۔ حضرت ابوسعید ایک روز ندی کے کنارے جا رہے تھے کہ شیخ ابوالفضل حسن نے آپ کے سامنے آکر کہا کہ اے ابوسعید یہ تمہاری راہ تو نہیں جس پر تم چل رہے ہو۔ اپنے راستہ پر چلو آپ نے شیخ ابوالفضل سے اپنا تعلق قائم نہ کیا اور اُس جگہ سے واپس اپنی جگہ پر آکر ریاضت اور مجاہدے میں مصروف ہو گئے حتیٰ کہ حق تعالےٰ نے آپ پر ہدایت کا دروازہ کھول دیا اور آپ کو بڑے اعلےٰ درجے تک رسائی نصیب فرمائی ——— حضرت شیخ ابومسلم فارسیؒ سے میں نے سُنا ہے کہ میرا آپ کے ساتھ ہمیشہ کچھ جھگڑا رہا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ میں آپ کی زیارت کے لئے گیا اس وقت میرے جسم پر ایک گدڑی تھی جو میل کچیل سے چمڑے کی طرح ہو گئی تھی۔ اُسے اوڑھ کر جب میں آپ کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ آپ تخت پر بیٹھے ہیں اور مصر کا ریشمی لباس زیب تن کئے ہوئے ہیں۔ میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ان دنیاوی تعلقات اور علائق کے ہوتے ہوئے یہ فقیری کے مدعی ہیں جب کہ میں دنیوی علائق سے مجرد اور علیحدہ رہ کر فقیری کا مدعی ہوں۔ میری اس شخص کے ساتھ کس طرح موافقت ہو سکتی ہے؛ آپ میرے اس خیال سے آگاہ ہو گئے اور سر اُٹھا کر فرمایا۔ "یَا اَبَا مسلم فِی اَیِّ دیوانٍ وجدت مَن کَانَ قَلبُہٗ قائمًا فِی مشاھدۃِ الحق یقعُ علیہ اسم الفقیر" (اے ابومسلم تم نے کس دیوان میں یہ پایا ہے کہ جس آدمی کا دل مشاہدۂ حق میں قائم ہو اُس پر فقیر کا اسم واقع ہو سکتا ہے) یعنی اصحاب مشاہدۂ حق تعالےٰ کے ساتھ غنی ہوتے ہیں۔ اور فقراء تو ارباب مجاہدہ ہوتے ہیں۔ حضرت ابومسلمؒ کہتے ہیں کہ میں اپنے اس خیال سے بڑا پشیمان ہوا اور اس ناپسندیدہ خیال سے توبہ کی ——— اور آپ سے روایت ہے کہ

فرمایا "التصوف قیام القلب مع اللہ بلا واسطۃ" (دل کے حق تعالےٰ کے ساتھ بلا واسطہ قائم ہو جانے کا نام تصوف ہے) اور یہ مشاہدہ کی طرف اشارہ ہے اور مشاہدہ محبت کے غلبے شوق دیدار میں استغراق اور حق کے بقا سے صفت کے فنا کا نام ہے" کتاب الحج میں مشاہدہ اور اس کے وجود سے متعلق انشاء اللہ میں ایک مستقل باب لکھوں گا ـــــــ ایک مرتبہ آپ نے نیشاپور سے طوس کے سفر کا ارادہ کیا۔ دشوار گزار پہاڑی راستے میں سخت سردی تھی حتیٰ کہ آپ کے پاؤں موزوں کے اندر بھی سردی محسوس کرتے تھے۔ ایک درویش کہتے ہیں کہ میرے دل میں آیا کہ اپنی اس چادر کے دو ٹکڑے کر کے آپ کے پاؤں پر لپیٹ دوں۔ لیکن میرے دل نے نہ چاہا کیوں کہ یہ چادر بڑی عمدہ تھی۔ جب ہم طوس میں پہنچ گئے تو مجلس میں میں نے سوال کیا کہ مجھے الہام اور شیطانی وسوسے کے درمیان فرق بتلائیے؟ آپ نے فرمایا "الہام تو وہ تھے جس نے تیرے دل میں چادر پھاڑ کر ابو سعید کے پاؤں کے گرد لپیٹ دینے کی آرزو پیدا کی تاکہ وہ سردی سے محفوظ ہو جائیں اور شیطانی وسوسہ وہ ہے جس نے تجھے اس نیک کام سے روکے رکھا ـــ اس قسم کی بے شمار باتیں ہیں جو آپ سے ظاہر ہیں لیکن ہم طوالت کے خوف سے انہیں چھوڑتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابو الفضل محمد بن الحسن الختلی رحمۃ اللہ تعالےٰ

اوتاد کی زینت اور عابدوں کے شیخ حضرت ابو الفضل محمد بن الحسن الختلی رحمۃ اللہ علیہ بھی انہی صوفیاء متاخرین میں سے ایک ہیں۔ طریقت میں مَیں انہی کی اقتداء کرتا ہوں آپ علم تفسیر اور حدیث کے بہت بڑے عالم تھے، اور تصوف میں حضرت جنید رحمہ اللہ کا مذہب رکھتے تھے، آپ حضرت مصری رحمہ اللہ کے مرید راز دار اور حضرت ابو عمر قزوینیؒ و حضرت ابو الحسنؒ بن سالبہ کے ہمعصر تھے، آپ ساٹھ سال تک سچی خلوت پسندی کی وجہ سے پہاڑوں میں دوڑتے رہے اور اپنے آپ کو لوگوں میں گمنام کر لیا۔ زیادہ عرصہ آپ نے کوہِ لگام میں بسر کیا آپ نے بڑی اچھی عمر پائی، اور آپ کی کرامات و براہین بہت ہیں لیکن آپ صوفیانہ لباس اور رسوم کے پابند نہ تھے بلکہ اہل رسم کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتے تھے۔ میں نے آپ سے زیادہ پُر ہیبت انسان

نہیں دیکھا ـــــــــ آپ سے روایت ہے کہ فرمایا "الدنیا یومٌ ولنا فیہا صومٌ" (یہ دنیا دن ہے اور ہم خود اس میں روزہ دار ہیں) یعنی ہم اس میں سے نہ کوئی حصہ لیتے ہیں۔ اور نہ اس میں اُلجھتے ہیں۔ کیوں کہ ہم نے اس کی خرابی کو دیکھ لیا ہے اور اس کے پردوں سے واقفیت حاصل کر کے ہم نے اس سے منہ موڑ لیا ہے ـــــ میں ایک دفعہ آپ کے ہاتھ دھلا رہا تھا کہ میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ جب تمام معاملات تقدیر اور حق تعالےٰ کی تقسیم پر موقوف ہیں تو پھر آزاد منش لوگ اپنے آپ کو کرامت کی امید پر پیروں کا غلام کیوں بنا لیتے ہیں؟ ـــ آپ نے فرمایا "بیٹا! تم نے جو کچھ خیال کیا ہے مجھے اس کا علم ہو گیا ہے، چنانچہ جان لے! کہ ہر حکم کا ایک سبب ہوتا ہے جب حق تعالےٰ کسی بچے کو ولایت کا تاج اور حکومت دینے کا ارادہ فرماتے ہیں تو پہلے اس کو توبہ کی توفیق نصیب فرماتے ہیں اور پھر اس کو اپنے کسی دوست کی خدمت میں بھیج دیتے ہیں تاکہ اس کی یہ خدمت اس کے لئے کرامت کا سبب بن جائے ـــــ ایسے ہی بہت سے لطائف روزانہ ہم پر ظاہر ہوتے تھے ـــــــ جس روز آپ کی وفات ہوئی آپ بانیان اور دمشق کے درمیان ایک گھاٹی سے ملحقہ گاؤں بیت الجن میں قیام پذیر تھے اور میری گود میں آپ نے اپنا سر رکھا ہوا تھا۔ عام عادت کے مطابق ایک سچے دوست کی جدائی کا میرے دل پر شدید اثر اور رنج تھا۔ آپ نے مجھ سے فرمایا "بیٹا! میں تجھے اعتقاد کا ایک مسئلہ بتاتا ہوں اگر تو نے اپنے آپ کو اس کے مطابق درست کر لیا تو تو ہر قسم کے رنج و غم سے چھوٹ جائے گا جان لے! کہ نیک و بد ہر قسم کے حالات اور مقامات حق تعالےٰ ہی پیدا فرماتے ہیں اس لئے تمہیں اس کے کسی فعل پر نہ تو جھگڑا کرنا چاہئے اور نہ ہی دل میں رنج کرنا چاہئے" اس کے علاوہ آپ نے کوئی لمبی وصیت نہ فرمائی اور جان دے دی رحمۃ اللہ تعالےٰ ـــــــ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت ابوالقاسم عبدالکریم ابن ہوازن قشیری رحمۃ اللہ

انہی میں سے ایک مسلمانوں کے استاد امام اور اسلام کی زینت حضرت ابوالقاسم عبدالکریم

ابن ہوازن القشیری رحمۃ اللہ تعالےٰ بھی ہیں۔ آپ اپنے دور میں یکتا۔ بلند مرتبہ اور عالی مقام بزرگ تھے۔ اہل زمانہ آپ کی فضیلتوں اور بزرگی سے بخوبی واقف ہیں۔ تمام فنون میں آپ کے لطائف بہت ہیں اور بڑی عمدہ و تحقیقی تصنیفات موجود ہیں۔ حق تعالےٰ نے آپ کے حال اور زبان کو فضولیات سے محفوظ فرما دیا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے سُنا تو آپ فرما رہے تھے۔ مثل التصوف کعلۃ البرسام اولہ ھذیان وآخرہٗ سکوتٌ واذا تمکّنَ خَرَسٌ" (تصوف کی مثال مرضِ برسام کی طرح ہے کہ اس کی ابتداء ہذیان گوئی اور انتہاء خاموشی ہے اور جب مضبوط ہو گئی۔ تو گونگا پن ہو گیا) پس صفوت کے دو پہلو ہیں۔ ایک وجد اور دوسرا نمود۔ نمود مبتدی حضرات کے لئے ہے اور نمود میں نمود سے عبارت ہذیان گوئی ہوتا ہے۔ اور وجد منتہی حضرات کے لئے ہے اور وجد کی حالت میں وجد سے عبادت محال ہے۔ پس جب تک وہ طالبِ حق ہوتے ہیں اپنی بلند مقصد کے سبب ناطق ہوتے ہیں اور ہمت و نطق میں اہلِ آرزو کو اُن کا نطق ہذیان معلوم ہوتا ہے، اور جب وہ انتہاء تک پہنچ جاتے ہیں تو پھر تمام باتوں سے خلاصی پا جاتے ہیں یہاں تک کہ اُن میں بیان کرنے بلکہ اشارہ کرنے کی ہمت بھی باقی نہیں رہتی۔ اس کی مثال وہ ہے کہ چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی مبتدی تھے اور اُن کی تمام ہمت صرف رویت حق تک ہی تھی اس لئے آپ نے اسی قصد کو بیان کرتے ہوئے درخواست کی کہ "ربِّ اَرِنی اَنظُر اِلیکَ" (اے میرے رب مجھے اپنا دیدار نصیب کرتا کہ میں تجھے دیکھوں) آپ کی یہ عبادت مقصود کے حاصل نہ ہو سکنے کے سبب ہذیان اور بے فائدہ دکھائی دیتی ہے۔ لیکن ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ منتہی اور متمکن تھے اس لئے جب آپ کی شخصیت مقام ہمت تک پہنچ گئی اور آپ کی ہمت فانی ہو گئی تو آپ نے فرمایا "لَا اُحصِی ثناءً علیکَ (اے اللہ! میں تیری حمد و ثنا نہیں کر سکتا) اور یہ منزل بڑی بلند اور مقام انتہائی عالی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت ابوالعباس احمد بن محمد رحمۃ اللہ تعالےٰ

شیخ و امام یکتا اور اپنے طریق میں منفرد حضرت ابوالعباس احمد بن محمد الاشقانی رحمۃ اللہ

بھی انہی متاخرین رحمہم اللہ میں سے تھے۔ آپ علم اصول وفروع کے تمام شعبوں میں امام تھے طریقت کے تمام معانی و مطالب میں کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ آپ نے بہت سے مشائخ کی زیارت کی اور خود بھی جلیل القدر اہل تصوف میں شمار ہوتے تھے۔ اپنے طریق کو مشکل عبارت میں فنا سے تعبیر کرتے تھے اور اس عبارت میں آپ ہی مخصوص تھے میں نے جاہلوں کے ایک گروہ کو دیکھا ہے کہ ان عبارات میں آپ کی تقلید کرتا ہے اور آپ کے مشکل اور مبہم کلمات کو اختیار کر رکھا ہے حالانکہ تقلید تو معنی میں بھی ناپسندیدہ ہے بھلا عبارت میں تقلید کیسے درست ہو سکتی ہے۔ مجھے آپ سے بڑا اُنس تھا اور آپ بھی مجھ پر سچی شفقت فرمایا کرتے تھے۔ بعض علوم میں آپ میرے اُستاد بھی ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی گروہ کے کسی فرد کو آپ سے زیادہ شریعت کی تعظیم کرنے والا نہیں دیکھا۔ آپ نے تمام موجودات سے قطع تعلق کر رکھا تھا ——— علم اصول میں آپ کی مشکل علمی عبادات کی وجہ سے کسی امام محقق کے علاوہ کسی کو آپ سے فائدہ نہ ہوتا تھا ——— آپ کی طبیعت دنیا و عقبیٰ سے ہمیشہ متنفر رہی، اور جوش میں ہمیشہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ اشتھی عَدَمًا لَا وجود لَہٗ۔" (میں ایسا عدم چاہتا ہوں جس کے لئے کوئی وجود نہ ہو) اور فارسی میں فرمایا کرتے تھے کہ "ہر آدمی کو جس طرح ہونا چاہیئے وہ نہیں ہو سکتا اور مجھے بھی جیسا ہونا چاہئے ایسا ہونا محال ہے کہ میں یقیناً جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوگا اور وہ بات یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ مجھے اُس عدم میں لے جائے جس کے لئے ہرگز وجود نہ ہو کیوں کہ مقامات و کرامات میں سے جو کچھ بھی ہے۔ حجاب اور بلاء کا محل ہے۔ اور بندہ اپنے حجاب کا ہی عاشق ہو کر رہ گیا ہے حالانکہ آرزوئے دیدار میں بندے کا فنا ہو جانا اُس آرام سے بہتر ہے جو حجاب کے ساتھ ہو اور چونکہ حق تعالےٰ ایسی ذات ہے کہ جس پر عدم کا اطلاق جائز ہی نہیں اس لئے اگر میں اس کے ملک میں نیست ہو جاؤں تو کیا نقصان ہے؟ کیوں کہ میری اُس فنا کو کبھی وجود نہیں ہوگا ——— اور صحتِ فنا میں یہ اصل بڑی ہی قوی ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

حضرت ابوالقاسم بن علی بن عبداللہ گرگانی رحمۃ اللہ

قطب زمانہ اور اپنے زمانہ میں یگانہ حضرت ابوالقاسم بن علی بن عبداللہ الگرگانی رحمۃ اللہ بھی انہی حضرات متاخرین رحمہم اللہ میں سے ایک تھے اللہ تعالےٰ اُن سے راضی ہو۔ آپ اپنے وقت میں بے مثل اور اپنے دور میں بے بدل بزرگ تھے۔ آپ کی ابتدائی حالت بڑی اعلیٰ اور بلند تھی۔ آپ نے بڑی کڑی شرائط کے ساتھ طریقت کی خاطر بڑے کٹھن سفر اختیار کئے۔ اس دوران تمام اہل درگاہ کے دل آپ کی طرف متوجہ تھے اور تمام طالبانِ حق کا اعتقاد آپ پر تھا۔ آپ کو مریدوں کے واقعات کے کشف میں بڑی مہارت حاصل تھی اور تمام فنونِ علم میں آپ کی نشانیاں بڑی واضع ہیں۔ آپ کے مریدوں میں سے ہر اک اپنے زمانے کی زینت رہا ہے اور انشاء اللہ آپ کے خلفاء بھی قوم کے پیشوا ہوں گے۔ آپ لسان الوقت یعنی مستجاب الدعوات تھے۔ حضرت ابوعلی ابوالفضل بن محمد انصارمنی کہ جنہوں نے اپنا تمام حصہ آپ کے حق میں چھوڑ دیا تھا اور تمام دنیا سے روگردانی کرلی تھی۔ اللہ تعالےٰ نے ان کو آپ ہی کی زبان حال کی برکت سے سید و سردار بنا دیا تھا۔

میں ایک روز حضرت شیخ کے سامنے بیٹھا اپنے مشاہدات و احوال آپ کے سامنے پیش کر رہا تھا تاکہ کھوٹے اور کھرے کی مجھے پرکھ حاصل ہو جائے کیوں کہ آپ ہی اس دور کے ناقد تھے۔ اور آپ بڑی حرمت کے ساتھ ان باتوں کو سن رہے تھے۔ میں اپنی جوانی کے جوش اور بچپن کے غرور کی بنا پر ان باتوں میں حریص ہوا جا رہا تھا اس طرح کہ شاید حضرت شیخ کو ابتداء میں ان حالات سے واسطہ ہی نہیں پڑا کہ آپ میرے معاملے میں اتنی عاجزی و انکساری سے کام لے رہے ہیں۔ آپ نے میرے باطن میں دیکھا اور فرمایا اے دوست! میری یہ عاجزی تیرے یا تیرے احوال کی وجہ سے نہیں کیوں کہ اصول کو تبدیل کرنا بڑا مشکل ہے بلکہ میں یہ انکساری اور گڑگڑاہٹ احوال کو تبدیل کرنے والے مریدوں کو آداب صحبت سکھانے کے لئے کرتا ہوں اور یہ سب طالبان حق کے لئے برابر ہے نہ کہ خاص تیرے لئے۔ جب میں نے یہ بات سُنی تو حیران رہ گیا۔

آپ نے ایک دفعہ مجھے دیکھ کر فرمایا" اے بیٹا! آدمی کو طریقت میں اس سے زیادہ تعلق نہیں ہوتا کہ جب کسی کو اس کا پیر طریقت سے وابستہ کرتا ہے تو اُس کو طریقت کے حاصل کر لینے کا غرور پیچھے دھکیل دیتا ہے اور جب پیر اس کو طریقت سے معزول کر دے تو وہ اپنے غرور کو بیان کرتے میں بھی بند ہو جاتا ہے، پس اس کا حق تعالےٰ کے ماسوٰی کی نفی کرنا اور وجود باری تعالےٰ کو ثابت کرنا بلکہ اپنا وجود و عدم سب کا سب غرور اور زعم باطل ہوتا ہے اور انسان زعم باطل کی قید سے آزاد نہیں ہوتا اس لئے اس کو چاہئے کہ درگاہ عبودیت کو لازم پکڑے اور بندگی کی نسبت کے علاوہ تمام نسبتوں کو اپنے آپ سے دور کر دے" ——— اس واقعہ کے بعد بھی آپ کے بہت سے اسرار مجھ پر ظاہر ہوئے اور اگر میں آپ کی کرامات کے بیان کرنے میں مشغول ہو جاؤں تو اصل مقصد بیان کرنے سے قاصر رہ جاؤں گا۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابو احمد المظفر بن حمدان رحمہ اللہ تعالےٰ

اور انہی حضرات صوفیاء متاخرین رحمہم اللہ میں سے ایک اولیاء کے رئیس اور اہل صفا کے ناصح حضرت ابو احمد المظفر بن حمدان رحمہ اللہ تعالےٰ بھی ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے مسند ریاست پر ہی آپ کے لئے اس طریقت کی راہیں کشادہ فرما دی تھیں اور آپ کے سر پر کرامت کا تاج رکھ دیا تھا۔ فناء و بقا میں آپ کا بیان بڑا عمدہ اور عبارت بڑی بلند مرتبہ ہوتی تھی۔ حضرت شیخ المشائخ ابو سعیدؒ فرماتے تھے کہ ہم بندگی کی راہ سے حق تعالےٰ کی درگاہ تک پہنچتے ہیں جب کہ خواجہ مظفر خداوندی کی راہ سے ——— یعنی ہم نے تو مجاہدہ سے مشاہدۂ حق کا مقام حاصل کیا ہے لیکن وہ مشاہدۂ حق سے مشاہدہ کی طرف آئے ہیں ——— میں نے آپ سے سنا ہے کہ فرمایا،" جو کچھ دوسرے بزرگوں کو وادیوں اور جنگلوں کو قطع کرنے سے میسر آیا ہے مجھے وہ مسند نشینی اور ریاست کے دوران ہی مل گیا ہے" ——— اہل رعونت آپ کے اس قول کو محض دعویٰ پر ہی محمول کرتے ہیں لیکن یہ ان کی کوتاہی فہم ہے کیوں کہ اہل معانی کا اپنی کسی حالت کی خبر دینا ہرگز محض دعویٰ کی بنیاد پر نہیں ہوتا۔

آپ کے نیک خلفاء آج تک باقی اور موجود ہیں۔ اور بزرگوار خواجہ احمد سلمہٗ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو نیشاپور کے مدعیوں میں سے ایک شخص آپ کے پاس بیٹھا تھا اور کہہ رہا تھا کہ طالب پہلے فانی ہو جائے تب باقی ہوتا ہے۔ خواجہ مظفرؒ نے فرمایا کہ "فنا پر بقا کیسے متصور ہو سکتی ہے کیوں کہ فنا تو نیستی سے عبارت ہے اور بقا ہستی کی طرف اشارہ ہے اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کی نفی کرتا ہے پس فنا معلوم ہے تاہم جب یہ نیست ہو جائے پھر اگر ہست ہو بھی تو یہ بعینہٖ وہ نہ ہوگی بلکہ وہ خود کوئی دوسری ہی چیز ہوگی۔ اور یہ درست نہیں کہ ذوات یعنی اصل ہی فانی ہو جائیں البتہ صفت اور سبب کا فنا ہونا درست ہے۔ پس جب صفت و سبب فنا ہو جائیں تو موصوف اور مسبب باقی رہتا ہے اور اُس کی ذات پر فنا کا وارد ہونا درست نہیں۔
میں علی بن عثمان کہتا ہوں کہ مجھے حضرت خواجہ کی عبارت بلفظہٖ تو یاد نہیں تاہم معنی وہی ہیں جو میں نے بیان کئے ہیں اور میں اس عبارت کی مراد زیادہ واضح کر دیتا ہوں تاکہ عام فہم ہو جائے، پس مراد اس سے یہ ہے کہ بندہ کا اختیار اس کی اپنی صفت ہے اور وہ اپنے اختیار کی بدولت حق تعالےٰ کے اختیار سے محجوب ہے پس بندہ کی اپنی صفت اُس کے لئے حق تعالےٰ سے حجاب ہے اور لامحالہ حق تعالےٰ کا اختیار ازلی ہے اور بندہ کا اختیار حادث اور ازلی پر فنا درست نہیں اور جب حق تعالےٰ کا اختیار بندہ کے حق میں بقا حاصل کر لے گا تو لامحالہ اس کا اپنا اختیار فانی اور اُس کا تصرف منقطع ہو جائے گا ——— واللہ اعلم۔

گرمیوں کے موسم میں ایک دفعہ میں سفر کا لباس پہنے پریشان حال آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے پوچھا "ابوالحسن! مجھے بتاؤ اس وقت تمہارا ارادہ کیا ہے"؛ میں نے عرض کیا "میرے لئے سماع کی محفل ہونی چاہئے"! آپ نے اُسی وقت آدمی بھیجکر ایک قوال اور اہل عشرت کی ایک جماعت کو بلوایا۔ میرے بچپن کی گرمی اور قوت و ارادہ اور محبت کی سوزش نے ابتداء ہی میں سماع کے اندر میری حالت کو مضطرب کر دیا۔ جب کچھ وقت گزر گیا اور اس آفت کے جوش و غلبہ میں کچھ کمی واقع ہوئی تو آپ نے مجھے فرمایا "تمہارے

لئے یہ سماع کیسا رہا؟ میں نے عرض کیا۔ شیخ! مجھے بہت ہی پسند آیا" فرمایا" ایک وقت آئے گا کہ یہ راگ اور گوّیے کی آواز تمہیں ایک جیسی محسوس ہوگی۔ کیوں کہ سماع کی قوت اُسی وقت تک رہتی ہے جب تک مشاہدۂ حق حاصل نہ ہو۔ جب مشاہدہ حاصل ہو جائے تو پھر سماع کی قوت ختم ہو جاتی ہے، یاد رکھو! اس سماع کو اپنی عادت نہ بنا لینا کہ یہ تمہاری طبیعت ثانیہ ہی بن جائے اور اس طرح اپنے اصل مقصود سے ہی باز رہ جاؤ ——————۔

واللہ اعلم بالصواب

تیرھواں باب

متاخرین صوفیا کرام کا مختصر تذکرہ

مختلف شہروں میں موجود تمام صوفیاء کرام کے حالات اگر بیان کروں تو کتاب بہت طویل ہو جائے گی اور اگر سب کو نظرانداز کر دوں تو کتاب کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ اس لئے میں اپنے عہد کے اُن صوفیاء اور مشائخ کے مختصر حالات بیان کرتا ہوں جو ارباب معانی ہیں اور اہل رسوم کی بجائے صرف اسرار ربانی سے واقف۔ حضرات کا تذکرہ کرتا ہوں تاکہ اگر اللہ تعالےٰ کی مشیت ہو تو اپنی مراد کے حصول سے زیادہ قریب ہو جاؤں چنانچہ وہ یہ حضرات ہیں!

متاخرین صوفیاء اہل شام و عراق

(۱) حضرت شیخ زکی بن العلاء اپنے دور کے بزرگ مشائخ اور سادات میں سے تھے. میں نے آپ کو محبت کے شعلوں میں سے ایک شعلہ جوالہ کی مانند پایا۔ آپ کی براہین اور کرامات بڑی ظاہر ہیں ——— (۲) حضرت شیخ بزرگوار ابوجعفر محمد بن المصباح العیدلانی صوفیاء کے رئیس حضرات میں سے تھے، آپ حقارف کی تحقیق میں کامل مہارت کے مالک تھے۔ اور زبان بڑی ہی خوب پائی تھی۔ آپ حضرت حسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ کے ساتھ بڑی عقیدت اور میلان طبع رکھتے تھے. میں نے آپ کی بعض تصانیف خود آپ ہی سے پڑھی ہیں۔ ——— (۳) حضرت ابوالقاسم سدسی کہ آپ صاحب مجاہدہ اور بڑے نیک حال بزرگ تھے درویشوں کے نگران اور ان کے ساتھ اچھا اعتقاد رکھنے والے تھے۔

صوفیاء اہل فارس

(۱) حضرت شیخ الشیوخ ابوالحسن بن سالبہ۔ تصوف میں بڑے فصیح اللسان اور مسئلہ توحید

ہیں بڑے ہی واضح بیان کے مالک بزرگ تھے آپ کے کلمات بڑے مشہور ہیں ۔۔۔ (۲) حضرت شیخ مرشد ابو اسحاق ابن شہر یار صوفیا میں صاحب حشمت تھے اور انتظامی امور کا پورا ملکہ رکھتے تھے ۔۔۔ (۳) حضرت شیخ طریقت ابوالحسن علی بن بکران بزرگ صوفیاء میں سے تھے ۴۔ حضرت شیخ ابو مسلم ہروی وقت کے پسندیدہ اور نیک حال بزرگ تھے ۔۔۔ (۵) حضرت شیخ ابوالفتح اپنے والد محترم کے نیک خلف الرشید اور سچے امیدوار تھے ۔۔۔ (۶) اور حضرت شیخ ابوطالب کلماتِ حق کے گرفتار بزرگ تھے ۔۔۔ باقی ان میں سے شیخ الشیوخ حضرت ابواسحٰق کی میں نے زیارت نہیں کی۔

قہستان آذربیجان اور طبرستان کے صوفیاء

۱۔ شیخ شفیق فرح معروف باخی زنجانی ایک نیک سیرت اور پسندیدہ طریقت کے بزرگ تھے ۔۔۔ (۲) شیخ وندری اس گروہ کے بزرگوں میں سے ہیں اور آپ کے نیک کام بے شمار ہیں ۔۔۔ (۳) بادشاہِ تائب راہِ حق کے تیز رفتار صوفی ہیں ۔۔۔ (۴) شیخ ابوعبداللہ جنیدی، نرم دل اور قابل احترام بزرگ ہیں ۔۔۔ (۵) شیخ ابو طاہر مکشوف اس دور کے بڑے بزرگوں میں سے ہیں ۔۔۔ (۶) خواجہ حسن سمنانی محبت الٰہی میں گرفتار اور خوش نصیبی کے امیدوار صوفی ہیں ۔۔۔ (۷) شیخ سہلکی صوفی حضرات کے بڑے درویش ہیں ۔۔۔ (۸) احمد پسر شیخ خرقانی اپنے والدِ بزرگوار کے اچھے جانشین ہیں (۹) اور ادیب کمندی اس دور کے سادات میں سے ہیں۔

اہلِ کرمان کے صوفیاء

(۱) حضرت خواجہ علی بن الحسین السیرکانی آپ اپنے دور کے سیاح ہوئے ہیں۔ اور آپ نے بڑے اچھے سفر کئے ہیں۔ اور آپ کے صاجزادے حکیم بھی ایک مردِ یگانہ تھے ۔۔۔ (۲) شیخ محمد بن سلمہ اپنے وقت کے بزرگوں میں سے ہیں ۔۔۔ اس کے علاوہ بھی اللہ تعالےٰ کے اولیاء میں سے کچھ بزرگ پوشیدہ ہیں اور نوجوان و نوخیز امیدوارِ تصوف بھی ہیں۔

اہل خراسان کے صوفیاء متاخرین

خراسان کہ جہاں آج حق تعالیٰ کی رحمتوں اور توجہ کا سایہ ہے بزرگوں میں سے (۱) شیخ مجتہد ابو العباس دامغانی ہیں آپ کی زندگی بڑی اچھی اور وقت بڑا ہی پسندیدہ گزرا ہے۔ (۲) خواجہ ابو جعفر محمد بن علی الجوینی اس طائفہ صوفیاء کے محققین اور بزرگوں میں سے ایک ہیں — (۳) خواجہ ابو جعفر ترشیزی اپنے دور کے یکتا و بے مثال لوگوں میں سے تھے۔ (۴) خواجہ محمود نیشاپوری اپنے دور کے پیشوا اور بڑی اچھی زبان کے مالک تھے۔ ۵۔ شیخ محمد معشوق۔ بڑی اچھی زندگی اور اچھے وقت کے مالک تھے۔ آپ عشق الٰہی کی چنگاری تھے اور بڑے نیک باطن اور خوش سیرت بزرگ تھے۔ (۶) خواجہ رشید مظفر پسر شیخ ابو سعید راہِ تصوف کے امیدوار اپنی قوم کے مقتداء اور صوفیاء کے دلوں کا قبلہ تھے — (۷) خواجہ شیخ احمد حمادی سرخسی اپنے وقت کے مردِ میدان تھے اور ایک عرصہ تک میرے رفیق بھی رہے ہیں۔ میں نے آپ کے بہت سے عجیب کام خود دیکھے ہیں اور آپ واقعی جہاد میں سے ایک مرد مجاہد تھے — (۸) شیخ احمد نجار سمرقندی۔ مرو میں مقیم تھے اور اپنے دور کے سلطان الصوفیاء تھے — (۹) اور شیخ ابو الحسن علی بن علی الاسود، اپنے والد بزرگوار کے سچے خلیفہ اور اپنے معاملات میں صدقہ۔ فراست اور بلند ہمتی میں بے مثال بزرگ تھے۔ میں نے خراسان میں تین سو صوفی بزرگ دیکھے ہیں جن میں سے ہر ایک تصوف میں ایک مشرب رکھتا تھا کہ اُن میں سے ہر ایک تمام دنیا کے لئے کافی تھا اور یہ سب اس لئے ہے کہ محبت خداوندی کا آفتاب اور طریقت کا اقبال خراسان میں طلوع ہوا تھا لیکن میں اُن سب حضرات کا شمار کروں تو کتاب بہت طویل ہو جائے گی۔

صوفیاء اہلِ ماوراء النہر

(۱) خواجہ امام ابو جعفر محمد بن الحسین الحرمی خواص و عوام میں بڑے مقبول تھے۔ آپ کلام حق سننے والے اور حق تعالیٰ کی محبت میں گرفتار صوفی تھے۔ آپ بڑی بلند ہمت اور اچھے

حالات کے مالک تھے ۔۔۔ (۲) خواجہ فقیہہ ابو محمد بالفری اچھے حالات اور مضبوط معاملات کے ساتھ ساتھ اپنے اصحاب میں بڑے ہی صاحب عظمت تھے ۔۔۔ (۳) حضرت احمد ایلاقی اپنے وقت کے شیخ اور زمانے کے بزرگ تھے آپ دنیوی رسوم و عادات کے تارک تھے ۔۔۔ (۴) حضرت خواجہ عارف اپنے وقت کے یکتا موتی اور زمانہ کے بے نظیر انسان تھے ۔۔۔ (۵) اور حضرت علی بن ابی اسحٰق اپنے زمانہ کے بزرگ اور مردِ ذی وقار تھے اور آپ کی کلام بڑی اثر انگیز تھی ۔ یہ اسماء گرامی اُن بزرگوں کے تھے جنہیں میں نے خود دیکھا ہے اور ان کے حالات سے مجھے اچھی طرح واقفیت حاصل ہے اور یہ سب بزرگ اہلِ تحقیق میں سے ہوئے ہیں !

اہلِ غزنی کے صوفیاء

(۱) حضرت ابوالفضل بن الدسدی معرفت کے شیخ اور بزرگ پیر تھے آپ کی براہین ظاہر اور کرامات بڑی روشن ہیں آپ محبت خداوندی کی آگ کے ایک شعلہ تھے اور آپ کے معاملات بالکل گمنام ہیں ۔۔۔ (۲) حضرت اسماعیل اشاشی ۔ علائق دنیا سے مجرد اور کنارہ کش بزرگ تھے ۔ آپ ایک صاحب حشمت پیر تھے اور آپ نے ملازمت کا راستہ اختیار کیا تھا ۔ (۳) شیخ سالار طبری ۔ علماء تصوف میں سے ہیں اور بڑی اچھی سیرت کے مالک ہیں ۔۔۔ (۴) حضرت ابو عبداللہ محمد بن الحکیم المعروف بمرید آپ اسرارِ تصوف کے معدن اور راہِ حق کے تیز گام بزرگ تھے آپ بارگاہ الٰہی کے دیوانوں میں سے تھے اور اپنے دور میں اپنے فن کے بے مثل ولاثانی صوفی تھے آپ کے معاملات لوگوں پر پوشیدہ ہی رہے ، آپ کی براہین بڑی واضح اور نشانیاں بڑی ظاہر ہیں اور دیدار کے مقابلہ میں آپ کی صحبت کا معاملہ بہت بہتر ہے ۔۔۔ (۵) حضرت سعید بن ابی سعید ذی احترام شیخ اور سب سے زیادہ مقدم بزرگ ہیں ۔ آپ حضرت پیغمبر علیہ السلام کی احادیث کے حافظ تھے آپ نے بڑی اچھی عمر پائی اور بہت سے مشائخ کی زیارت کی ، آپ بڑے قوی الحال اور باخبر صوفی تھے ۔ لیکن آپ نے معاملات لوگوں سے پوشیدہ رکھے اور اپنے معانی کسی کو نہیں دکھائے ۔۔۔

۶۔ حضرت ابوالعلاء عبدالرحیم بن احمد اسعدی بڑے بزرگوار سردار اور صاحبِ عزت و وقار صوفی تھے آپ اپنی قوم کے عزیز اور وقت کے سردار تھے، میرا دل آپ سے بڑا خوش ہے آپ بڑے مہذب حالات اور نیک معاملات کے مالک تھے اور علم کے جملہ فنون سے بخوبی واقف تھے۔ (۷) اور شیخ یکتاء روزگار سورۃ بن محمد بن الجرو بیزی۔ اہلِ طریقت کے ساتھ پوری شفقت رکھتے تھے اور آپ کے نزدیک ہر ایک کی ایک عزت تھی۔ آپ نے مشائخ کی زیارت کی تھی۔ عوام و علماء شہر کی خوش اعتقادی کے پیش نظر میں بھی بڑی امید رکھتا ہوں کہ آپ کے بعد ایسے لوگ پیدا ہوں گے کہ ہمارا اعتقاد اُن سے وابستہ ہوگا۔ اور یہ پراگندہ حال لوگوں کا گروہ جو اب اس شہر میں راہ پا چکا ہے۔ اور طریق تصوف کو تبیح کر دیا ہے وہ اس شہر سے مٹ جائے گا اور یہ شہر پھر ایک دفعہ اولیاء اور بزرگوں کی قیامگاہ قرار پائے گا ——— اب ہم ان فرقوں کے مذاہب کا فرق بیان کریں گے۔

واللہ اعلم بالصواب۔

چودھواں باب

مذاہب صوفیاء میں مختلف فرقوں کا باہمی فرق

اس سے قبل حضرت ابوالحسن نوریؒ کے تذکرہ میں میں نے بیان کیا تھا کہ صوفیاء کے بارہ گروہ ہیں۔ ان میں سے دو گروہ مردود اور دس گروہ مقبول ہیں۔ اور ان دس گروہوں میں سے ہر گروہ کا معاملہ اور طریق، مجاہدات میں نیک اور درست ہے اور مشاہدات میں بھی آداب بڑے ہی عمدہ ہیں۔ اور یہ لوگ تصوف کے معاملات، مجاہدات اور ریاضات میں مختلف ہونے کے باوجود شریعت کے اصول و فروع اور توحید میں بالکل باہم موافق ہیں۔ حضرت ابویزیدؒ نے فرمایا ہے کہ اختلاف العلماء رحمة الا فی تجرید التوحید۔

مسئلہ توحید خالص کے علاوہ علماء کا اختلاف رحمت ہے

اور اس کلمہ کے موافق ایک حدیث پاک بھی مشہور ہے۔ غرضیکہ تصوف کی حقیقت ان مشائخ کے درمیان حقیقی معنی میں متفق علیہ ہے اور مجازی و رسمی لحاظ سے اس میں اختلاف ہے۔ پس میں اختصار و اعجاز کے ساتھ اُن کے کلام کو تصوف کے بیان میں تقسیم کرتا ہوں اور اصل مذہب میں ہر ایک کے لیے مقام عزت متعین کرتا ہوں تاکہ طالبان حق کو اس کا علم حاصل ہو، علماء کے لیے ہتھیار مریدوں کے لیے اصلاح، اہل محبت کے لیے کامیابی، اہلِ مروّت و ذی عقل لوگوں کے لیے تنبیہ اور میرے لیے دونوں جہان میں یہ چیز باعث ثواب ہو۔

وباللہ التوفیق۔

فرقہ محاسبیہ

محاسبی فرقے کے لوگ حضرت ابوعبداللہ حارث بن اسد المحاسبی رحمۃ اللہ کی طرف منسوب ہیں۔ جو تمام اہل زمانہ کے نزدیک مقبول النفس اور مقتول النفس بزرگ تھے۔ اصول و فروغ اور حقائق کے بڑے زبردست عالم تھے اور آپ کا کلام معاملاتِ ظاہری و باطنی کی صحت کے

ساتھ خالص توحید کے بیان میں تھا۔ اور آپ کا عجیب مذہب یہ تھا کہ آپ رضا کو طریقت کے مقامات میں شمار نہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ احوال میں سے ایک حالت ہے۔ اس اختلاف کی ابتداء تو انہوں نے ہی کی تھی لیکن اب اہل خراسان نے اس قول کو لے لیا ہے اس کے برعکس عراقی حضرات کہتے ہیں کہ رضا بھی مقامات میں سے ایک مقام ہے اور یہ توکّل کی انتہاء ہے، اور اس قوم میں آج تک یہ اختلاف موجود ہے۔ اب ہم انشاء اللہ اس قول کو بیان کرتے ہیں۔

رضاء کی حقیقت

ان مذاہب کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے ہم رضاء کی حقیقت کو ثابت اور اُس کی اقسام کو بیان کریں گے اور اس کے بعد حال ومقام کی حقیقت اور اُن کا فرق واضح کریں گے۔

جاننا چاہیئے کہ رضاء کی حقیقت کتاب وسنّت سے ثابت ہے اور امت کا اس پر اتفاق ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ۔ اللہ تعالیٰ اُن سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے۔

نیز فرمانِ الٰہی ہے کہ

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ۔ تحقیق اللہ تعالیٰ مومنیں سے راضی ہوا جب وہ آپ (پیغمبر علیہ السلام) سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔

اور پیغمبر علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

ذَاقَ طَعْمَ الْاِيْمَانِ مَنْ رَضِيَ بِاللّٰهِ رَبًّا۔ اُس آدمی نے ایمان کا مزہ چکھ لیا جو اللہ تعالیٰ کے رب ہونے پر راضی ہوا۔

رضاء کی اقسام

رضاء دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک اللہ تعالیٰ کا بندے سے راضی ہونا اور دوسری بندے کا اللہ تعالیٰ سے راضی ہونا۔ حق تعالیٰ کی رضاء کی حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ بندے کے لیے

ثواب، نعمت اور کرامت عطاء کرنے کا ارادہ فرمالیں اور بندے کی رضا کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اُس کے احکام پر ثابت قدم رہے اور اُس کے ہر فرمان کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کر دے۔ پس حق تعالیٰ کی رضا بندے کی رضا پر مقدم ہوتی ہے کیونکہ جب تک حق تعالیٰ بندے کو توفیق نہ بخشیں وہ نہ تو اُس کے حکم کی تعمیل کر سکتا ہے اور نہ ہی اُس کے فرمان پر ثابت قدم رہ سکتا ہے۔ اس لیے کہ رضاء بندہ رضا الٰہی کے ساتھ وابستہ ہے اور اُس کا قیام اُس کی ذات کے ساتھ ہے، خلاصہ کلام بندہ کی رضا یہ ہے کہ اس کا دل قضائے الٰہی کی دونوں طرفوں یعنی قضائے منع اور قضائے عطاء پر یکساں طور پر مطمئن رہے اور اُس کا باطن جمالی اور جلالی دونوں طرح کے احوال کا نظارہ کرنے پر مستقیم رہے۔ چنانچہ قضائے الٰہی اگر کسی چیز کے نہ دینے پر ٹھہر جائے یا اُس کے عطاء کرنے پر سبقت کرے تو رضائے بندہ کے نزدیک دونوں حالتیں برابر ہوں، اور اگر ہیبت و جلالِ خداوندی کی آگ سے جل جائے یا اُس کے جمال اور نورِ لطف سے روشن ہو جائے تو یہ جلنا اور روشن ہونا اُس کے دل کے نزدیک برابر ہو کیوں کہ وہ حق تعالیٰ کا مشاہدہ کرنے والا ہے۔ لہٰذا اُس کی ذات سے جو کچھ بھی مشاہدہ میں آئے بندہ کے لیے بہتر ہی ہے، جیسا کہ امیر المومنین حضرت حسن بن حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے لوگوں نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے اس قول کے متعلق پوچھا کہ

اَلْفَقْرُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنَ الْغِنَاءِ وَ السَّقْمُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنَ الصِّحَّۃِ۔

میرے لیے فقر، دولت مندی سے اور بیماری صحت سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا

رَحِمَ اللّٰہُ اَبَاذَرٍّ اَمَّا اَنَا فَاَقُوْلُ مَنْ اَشْرَفَ عَلٰی حُسْنِ اِخْتِیَارِ اللّٰہِ لَہٗ لَمْ یَتَمَنَّ غَیْرَ مَا اخْتَارَ اللّٰہُ لَہٗ۔

اللہ تعالیٰ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ پر رحم کرے تاہم میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو آدمی اپنے بارے میں اللہ تعالیٰ کی پسند کردہ چیز کے حُسن پر آگاہ ہو جائے وہ اللہ تعالیٰ کی اپنے لیے اختیار کردہ چیز کے علاوہ کسی چیز کی آرزو نہیں کرتا۔

اور بندہ جب حق تعالیٰ کے اختیار کو دیکھ کر اپنی پسند اور اختیار سے اعراض کرتا ہے وہ ہر قسم کے غم و اندوہ سے نجات پالیتا ہے۔ اور یہ چیز حق تعالیٰ سے دوری کی حالت میں نصیب

نہیں ہوتی کیوں کہ اس کے لیے تو حضورِ حق ضروری ہے

لِاَنَّ الرِّضَا لِلْاَحْزَانِ نَافِيَةٌ وَلِلْغَفْلَةِ مُعَالِجَةٌ شَافِيَةٌ کیوں کہ قضائے الٰہی پر رضا غموں کو دور کرنے والی اور غفلت کے لیے علاج شافی ہے۔

یعنی حق تعالیٰ کے فیصلوں پر رضاء انسان کو غموں سے دور کرتی ہے، پنجۂ غفلت سے چھڑاتی غیر خدا کا خیال دل سے دور کرتی اور مشقتوں کی قید سے آزاد کرتی ہے۔ کیوں کہ رضاء کی صفت رہائی دلاتا ہے۔ لیکن رضا کی اصل حقیقت یہ ہے کہ بندہ یہ جان لے کہ کسی چیز کا ملنا یا نہ ملنا اللہ عزوجل کے علم اور ارادہ کے مطابق ہوتا ہے اور یہ اعتقاد رکھے کہ ہر طرح کے احوال میں اللہ تعالیٰ اُس کو دیکھتے ہیں۔

اربابِ رضاء کی قسمیں

اور اس طرح کا اعتقاد رکھنے والے حضرات چار طرح کے ہیں۔

۱۔ وہ گروہ جو دنیا کی نعمتوں پر راضی رہتا ہے۔

۲۔ وہ گروہ جو دنیا کی آزمائشوں اور مصائب و آلام پر راضی رہتا ہے۔

۳۔ وہ گروہ جو اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس سے محبت پر راضی رہتا ہے۔

۴۔ اور وہ گروہ جو معرفت حق تعالیٰ پر راضی رہتا ہے۔

پس جو شخص عطا کرنے والے کو پیش نظر رکھتے ہوئے عطا کو دیکھتا ہے وہ اس عطاء کو صدقِ دل سے قبول کرتا ہے اور جب صدقِ دل سے قبول کر لیتا ہے تو ہر قسم کی کلفت اور مشقت اس سے دور ہو جاتی ہے۔ اور جو آدمی عطاء کو پیشِ نظر رکھ کر عطاء کرنے والے کو دیکھتا ہے وہ عطاء میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے اور رضا کے راستے پر تکلف کے ساتھ چلتا ہے۔ جب کہ تکلف میں تمام رنج اور مشقتیں موجود ہیں۔ اور معرفت، حقیقت کی صورت اُس وقت اختیار کرتی ہے جب بندہ معرفت کے حق میں مکاشف ہو جائے لیکن اگر معرفت ہی اُس کے لیے مشاہدۂ حق میں حجاب اور رکاوٹ بن جائے تو وہ معرفت ناشناسائی، وہ نعمت عذاب اور وہ عطاء درحقیقت پردہ ہو جاتی ہے۔ اور باقی جو آدمی حق تعالیٰ سے دنیا پر

ہی راضی ہو جائے وہ ہلاکت اور نقصان میں رہتا ہے کیونکہ وہ رضا اس کے لیے آتشِ دوزخ کا سبب بن جاتی ہے کیونکہ تمام کی تمام دنیا بھی اس لائق نہیں کہ اس سے دل لگایا جائے یا ذرہ برابر بھی اس کے غم کا بوجھ دل پر ڈالا جائے۔ اور نعمت تو اسی وقت نعمت ہوتی ہے جب وہ انعام کرنے والے کی طرف رہنمائی کرے لیکن اگر وہ منعم سے حجاب بن جائے تو پھر وہ نعمت مصیبت ہوتی ہے۔ اور جو شخص آزمائش پر حق تعالیٰ سے راضی رہتا ہے وہ وہ شخص ہے جو بلاؤں میں بھی بلا بھیجنے والے کی طرف دیکھے اور اس بلا کی مشقت کو بلا بھیجنے والے کے مشاہدہ سے برداشت کرے کیونکہ دوست کے مشاہدہ کی صورت میں بلا کی مشقت، مشقت ہی نہیں رہتی۔ اور رہا باقی وہ لوگ جو حق تعالیٰ کی طرف سے برگزیدگی اور اس کی محبت پر راضی رہتے ہیں وہ حق تعالیٰ کے ایسے عاشق ہیں کہ رضا اور ناراضگی میں اُن کا وجود عارضی ہوتا ہے، اُن کا دل حق تعالیٰ کی محبت کے علاوہ کسی کی منزل نہیں ہوتا اور اس کے اسرار کا خیمہ محبت الٰہی کے گلستان کے بغیر کہیں نہیں ہوتا۔ یہ بارگاہِ خداوندی کے وہ حاضر ہیں جو ماسوی اللہ سے غائب ہیں۔ وہ فرشی ہیں جن کا تصور عرش پر ہے، وہ جسم ہیں جن کی روح نورانی ہے اور وہ موحد ربانی ہیں کہ جن کا دل مخلوق سے جدا ہے۔ یہ لوگ تمام کائنات سے اپنے باطن کو روک کر مکافات اور احوال کی جستجو میں گرفتار ہیں اور محبت الٰہی میں کمر بستہ ہو کر اُس کے لطف وکرم کے لیے سراپا انتظار بنے بیٹھے ہیں۔ انہی کے متعلق حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا۔	وہ اپنے نفسوں کے لیے نہ تو نقصان اور نفع کے مالک ہیں اور نہ ہی موت، زندگی اور دوبارہ اٹھائے جانے کا اُن کے پاس کوئی اختیار ہے۔

پس حق تعالیٰ کے علاوہ کسی اور چیز کے لیے رضا نقصان ہے اور کسی چیز کے بغیر حق تعالیٰ سے رضا، رضوانِ الٰہی کا ذریعہ ہے کیونکہ اُس کے علاوہ کسی چیز سے راضی ہونا ہلاکت اور صرف حق تعالیٰ پر راضی ہو جانا بڑی سعادت ہے اور اسی میں عافیت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

مَنْ لَّمْ يَرْضَ بِاللّٰهِ وَبِقَضَائِهٖ شَغَلَ قَلْبَهٗ وَتَعَبَ بَدَنُهٗ۔	جو آدمی اللہ تعالیٰ پر اور اُس کے فیصلوں پر راضی نہیں ہوتا وہ اپنے دل کو اسباب کی تلاش میں مشغول اور اپنے بدن کو مصیبتوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب۔

فصل

مشائخ کے اقوال

آثار میں آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی

اَللّٰھُمَّ دُلَّنِیْ عَلٰی عَمَلٍ اِذَا عَمِلْتُ رَضِیْتَ عَنِّیْ۔ — اے اللہ! مجھے ایسا عمل بتا جسے میں سرانجام دوں تو تُو مجھ سے راضی ہو جا۔

اللہ تعالیٰ نے جواب میں ارشاد فرمایا

اِنَّکَ لَا تُطِیْقُ ذٰلِکَ یَا مُوْسٰی۔ — اے موسیٰ تجھ میں اس چیز کی طاقت موجود نہیں۔

فَخَرَّ مُوْسٰی سَاجِدًا مُتَضَرِّعًا فَاَوْحَی اللّٰہُ اِلَیْہِ یَا ابْنَ عِمْرَانَ اِنَّ رِضَائِیْ فِیْ رِضَاکَ بِقَضَائِیْ۔ — پس حضرت موسیٰ سجدے میں گر کر عاجزی وزاری کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرف وحی فرمائی کہ اے عمران کے بیٹے میری رضا میری قضاء پر تیرے راضی رہنے میں ہے۔

یعنی جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر راضی رہتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس سے راضی ہیں۔ حضرت بشر حافیؒ نے ایک مرتبہ حضرت فضیل بن عیاضؒ سے پوچھا کہ زُہد کی فضیلت زیادہ ہے یا رضاء کی! حضرت فضیلؒ نے فرمایا

اَلرِّضَاءُ اَفْضَلُ مِنَ الزُّھْدِ لِاَنَّ الرَّاضِیَ لَا یَتَمَنّٰی فَوْقَ مَنْزِلَتِہٖ۔ — رضاء زہد سے افضل ہے کیوں کہ قضاء پر راضی رہنے والا اپنی اس منزل سے اوپر کی آرزو نہیں رکھتا۔

یعنی زُہد کی منزل سے اوپر اور بھی منزل ہے جس کے لیے زاہد کے دل میں تمنا پیدا ہو۔ پس سب سے آخری منزل افضل ہے اُس منزل سے جس کے بعد بھی منزلیں موجود ہیں۔ اور یہ حکایت حضرت محاسبیؒ کے قول کی صحت پر دلیل ہے کہ رضا احوال میں سے ہے منازل میں سے نہیں اور یہ حق تعالیٰ کی عطاء پر منحصر ہے اس کا حصول کسب و محنت سے نہیں ہوتا۔ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آتا ہے کہ اپنی دعاء میں کہا کرتے تھے کہ

اسئلک الرضا بعد القضاء: — اے اللہ! میں قضاء کے آجانے پر تیری رضاء کا تجھ سے سوال کرتا ہوں۔

یعنی مجھے وہ صفت عطاء کر کہ جب تیری طرف سے قضاء میرے مقدر ہو تو مجھ کو اُس پر راضی پائے۔ اس سے یہ بات بھی درست ہوگئی کہ قضاء کے ورود سے پہلے رضاء درست نہیں ہے کیونکہ قضاء کے وارد ہونے سے پہلے رضاء کا ارادہ تو ہوتا ہے لیکن عزم رضا عینِ رضاء نہیں ہوسکتا۔ حضرت ابوالعباس بن عطأ فرماتے ہیں کہ

الرضاء نظر القلب إلى قديم اختيار الله للعبد۔

رضا یہ نام ہے دل کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کے لیے ازلی اختیار پر نگاہ رکھنے کا۔

یعنی اُسے جو بھی مصیبت پہنچے جان لے کہ میرے لیے اس مصیبت کا حق تعالیٰ کی طرف سے ازلی ارادہ اور حکم موجود تھا اور اس پر بیقرار نہ ہو بلکہ اپنے دل میں خوشی محسوس کرے۔ اس مذہب والے حضرت حارث محاسبیؒ فرماتے ہیں کہ

الرضاء سکون القلبِ تحتَ مجاری الاحکام۔

احکامِ الٰہی کے جاری ہونے پر دل کے مطمئن رہنے کا نام رضاء ہے۔

اور اس معاملے میں آپ کا مذہب بڑا قوی ہے کیونکہ سکون اور طمانیتِ قلب بندہ کے کسب و محنت سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے عطیات میں سے ایک عطیہ ہے اور یہ اس بات پر دلیل ہے کہ رضا احوال میں سے ہے مقامات میں سے نہیں ـــ کہتے ہیں کہ حضرت عتبۃ الغلامؒ ایک مرتبہ پوری رات نہ سوئے اور صبح تک یہی کہتے رہے۔

ان تعذبنی فانا لک محبٌّ وان ترحمنی فانا لکَ محبٌّ۔

اگر تو مجھے عذاب دے پھر بھی میں تجھ سے محبت کرتا ہوں اور اگر مجھ پر رحم کرے پھر بھی میں تیرا محب ہی ہوں۔

یعنی عذاب کی تکلیف اور نعمت کی لذت دونوں جسم پر ہوتی ہیں جب کہ دوستی کی بیقراری دل میں ہوتی ہے لہٰذا جسم کی تکلیفیں، دل کی محبت پر اثر انداز نہیں ہوسکتیں، یہ بھی حضرت محاسبیؒ کے قول کی تائید ہی ہے کہ رضا محبت کا نتیجہ ہوتی ہے کہ محبوب کے ہر فعل پر محب راضی رہے، اگر محبوب اُس کو عذاب میں رکھے تو بھی دوستی کی وجہ سے حجاب میں نہیں ہوتا بلکہ خوش ہوتا ہے اور اگر محبوب اس کو نعمت میں رکھے تو بھی دوستی سے حجاب میں نہیں ہوتا اور حق تعالیٰ کے اختیار کے مقابلہ میں اپنے اختیار کو ہیچ سمجھتا ہے ـــ حضرت ابوعثمانؒ

حیریؒ فرماتے ہیں کہ

مُنذُ اربعین سنۃً ما اَقَامَنِیَ اللہُ فی حالٍ فکرھتہٗ وَمَا نَقَلَنِیْ اِلیٰ غیرِہٖ فسخطتہٗ

چالیس سال کے عرصہ سے اللہ تعالیٰ نے مجھے جس حال بھی رکھا میں نے ناپسند نہیں کیا اور اگر اس حال سے دوسرے حال میں تبدیل کیا تو میں نے بُرا نہیں منایا۔

یہ دوامِ رضا اور کمالِ محبت کی طرف اشارہ ہے ــــــ حکایات میں ایک حکایت مشہور ہے کہ ایک درویش دریائے دجلہ میں گر پڑا جب کہ وہ تیرنا بھی نہیں جانتا تھا۔ کنارے سے ایک آدمی نے کہا کہ تم چاہتے ہو کہ میں سب کو آگاہ کروں تاکہ وہ تمہیں باہر نکال لیں! درویش نے کہا "نہیں!" پھر اُس نے پوچھا کیا تم یہ چاہتے ہو کہ غرق ہو جاؤ! درویش نے کہا نہیں! اُس نے پوچھا پھر تم کیا چاہتے ہو! درویش نے کہا۔ میں وہی چاہتا ہوں جو حق تعالیٰ میرے لیے چاہتے ہیں ــــ اور رضا کے بیان میں مشائخ کے اقوال بہت ہیں۔ گو عبارت میں اختلاف ہے تاہم اس کا قاعدہ انہی دو باتوں پر مشتمل ہے جو میں نے بیان کر دی ہیں۔ اور طوالت کو ترک کر کے انہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ البتہ میں چاہتا ہوں کہ یہاں حال اور مقام کے درمیان فرق بیان کروں اور اُن کی حدود کو واضح کر دوں تاکہ تجھ پر اور دوسرے پڑھنے والوں پر اس معنی کو سمجھنا آسان ہو جائے۔

حال اور مقام کے درمیان فرق

جان لو کہ یہ دونوں لفظ گروہِ صوفیاء کے درمیان مستعمل ہیں۔ اُن کی عبارت میں جاری اور اُن کے علوم میں بکثرت موجود ہیں۔ ان کے اثبات اور توضیح کے لیے اس مقام پر گنجائش نہ تھی لیکن چونکہ علم تصوّف کے طالب علموں کے لیے ان کے بغیر چارہ نہیں اس لیے اس مقام پر ہم ان کو بیان کر رہے ہیں۔ وباللہ التوفیق والعظمۃ والعون۔

مقام کی تحقیق

جان لو کہ "مقام" میم کے پیش کے ساتھ بندہ کے کھڑا ہونے اور میم کے زبر

کے ساتھ کھڑا ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں، لیکن دراصل یہ تفصیل اور معنی سہو اور غلط ہیں کیونکہ عربی لغت میں مقام، میم کی پیش کے ساتھ قائم ہونے اور قائم ہونے کی جگہ کو، اور مقام میم کی زبر کے ساتھ قیام کرنے اور قیام کرنے کی جگہ کو کہتے ہیں لیکن تصوف میں مقام بندے کے راہِ حق میں قیام کرنے اُس کے حقوق ادا کرنے اور اُس کے اُس مقام کی رعایت ملحوظ رکھنے کو کہتے ہیں تاکہ جس طرح بھی ہو سکے اس مقام کا کمال حاصل کرے اور جب تک حق تعالیٰ اس مقام سے نہ گزاریں بندہ خود نہیں گزر سکتا چنانچہ مقاماتِ تصوف میں سے پہلا مقام توبہ (ترکِ گناہ) ہے، دوسرا انابت (رجوع الی اللہ) تیسرا زُہد (ترکِ دنیا) اور چوتھا توکل (اللہ کی ذات پر بھروسہ) ہے اسی طرح دوسرے مقاماتِ تصوف کا درجہ آتا ہے۔ کسی کے لیے یہ درست نہیں کہ توبہ کے بغیر انابت کا دعویٰ کرے، انابت کے بغیر زہد کا اور زہد کے بغیر توکل کا دعویٰ بھی قطعاً درست نہیں۔ اور خدائے عزّ وجلّ نے ہمیں جبرئیل کے متعلق یہ خبر دی کہ انہوں نے کہا،

وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ۔ — اور ہم میں سے ایک کے لیے ایک معین مقام ہے۔

تحقیقِ حال

اور حال اُس کیفیت کو کہتے ہیں جو حق تعالیٰ کی طرف سے صوفی کے دل پر طاری ہوتی ہے۔ اس طرح کہ جب وہ کیفیت طاری ہو جائے تو اپنے اختیار سے اُس کو دُور نہیں کر سکتے اور جب وہ ختم ہو جائے تو اپنی کوشش سے اُسے حاصل نہیں کر سکتے، پس مقام تو طالب کے راستے، محلِ مجاہدہ میں اس کی قیام گاہ اور اس کی محنت کے مطابق بارگاہِ الٰہی میں اُس کے درجے سے عبارت ہے، اور حال، بندہ کے مجاہدات میں مصروف ہوئے بغیر اللہ تعالیٰ کے فضل و لطف کے طاری ہونے سے عبارت ہے۔ اس لیے کہ مقام اعمال میں سے ایک عمل ہے جب کہ حال افضال میں سے ایک فضل گویا کہ مقام میں انسانی محنت اور اکتساب کا دخل ہے جب کہ حال اللہ تعالیٰ کے عطیات میں سے ایک عطیہ ہے پس صاحبِ مقام اپنے مجاہدات کے ساتھ قائم ہوتا ہے جب کہ صاحبِ حال اپنے آپ سے فانی

ہوتا ہے اور اُس کا قیام اُس حالت کے ساتھ ہوتا ہے جو حق تعالیٰ خود اُس میں پیدا فرماتے ہیں۔ اور اُس جگہ مشائخ رحمہم اللہ کا آپس میں اختلاف ہے چنانچہ ایک گروہ تو حال کی ہمیشگی کو جائز سمجھتا ہے اور دوسرا گروہ اس کے دوام کو درست نہیں جانتا۔ حضرت حارث محاسبیؒ حال کے دوام کو جائز رکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ محبت۔ شوق، قبض اور بسط یہ سب احوال ہیں اگر ان میں دوام کو درست نہ سمجھا جائے تو نہ محب، محب ہوگا اور نہ ہی مشتاق، مشتاق۔ اور جب تک حال بندہ کی صفت نہ بن جائے اُس وقت تک اُس کے نام کا اطلاق اس بندے پر نہیں ہو سکتا۔ اور اسی لیے آپ رضا کو بھی منجملہ احوال کہتے ہیں، اور حضرت ابو عثمانؒ نے جو فرمایا تھا کہ منذ اربعین سنۃ ما اقامنی اللّٰہُ علیٰ حال فکرھتہ اس میں بھی اشارہ اسی بات کی طرف تھا۔ اور دوسرا گروہ حال کے دوام و بقا کو درست نہیں سمجھتا۔ جیسا کہ حضرت جنید رحمہ اللہ فرماتے ہیں

الاحوال کالبروق فان بقیت فحدیث النفس۔ — احوال تو بجلیوں کی مانند ہوتے ہیں کہ نظر آتے ہیں اور چھپ جاتے ہیں وہ اگر باقی رہ جائیں تو نفس کی بات ہوتی ہے۔

یعنی اگر انہیں دوام حاصل ہو تو وہ حال نہیں ہوتے بلکہ نفس کی بات اور طبیعت کی ہوس ہوتی ہے ــــ اور ایک گروہ کا کہنا ہے کہ

الاحوال کاسمِہَا یعنی اَنَّھَا کَمَا تَحِلُّ فِی القلب تزول۔ — احوال اپنے ناموں کی طرح ہوتے ہیں کہ جس طرح دل میں واقع ہوتے ہیں اسی طرح زائل ہوتے ہیں۔

یعنی ایک حالت میں حال دل میں طاری ہوتا ہے اور دوسری حالت میں اس سے زائل ہو جاتا ہے اور جو کچھ باقی رہ جاتا ہے وہ صفت بن جاتی ہے اور صفت کا قیام موصوف کے ساتھ ہوتا ہے اور موصوف کو اپنی صفت سے زیادہ کامل ہونا چاہیے جب کہ یہ سب کچھ محال ہے ــــ حال اور مقام کے درمیان یہ فرق میں نے یہاں اس لیے بیان کر دیا ہے تاکہ صوفیاء کی عبارات میں اور اس کتاب میں جہاں کہیں حال اور مقام کی اصطلاح کو دیکھو، سمجھ لو کہ اس جگہ کیا چیز مراد ہے ــــ تاہم یہ جان لو کہ رضا مقاماتِ تصوف کی انتہا اور احوال کی ابتدا ہے، اور یہ وہ جگہ ہے کہ جس کی ایک جانب کسب اور اجتہاد میں ہے اور دوسری

جانب محبت اور غلبہ شوق میں۔ اور اس سے اوپر اور کوئی مقام نہیں ہے اور اس حالت میں آکر مجاہدات کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ پس اس کی ابتدا اکتسابِ بندہ سے ہوتی ہے اور انتہا فضل و عطاءِ خداوندی پر ہوئی ہے۔ یہاں پر یہ احتمال بھی موجود ہے کہ صوفی و سالک جب رضا کی ابتدا میں خود اپنی طرف دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ مقام ہے اور جب اس کی انتہا میں حق تعالیٰ کے فضل و انعام کی طرف دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ حال ہے۔ تصوّف کے اصول میں حضرت محاسبیؒ کا مذہب یہی ہے جو بیان ہو چکا البتہ معاملاتِ طریقت میں انہوں نے باقی صوفیا سے کوئی اختلاف نہیں کیا تاہم وہ اپنے مریدوں کو اُن عبارات اور معاملات سے منع فرمایا کرتے تھے جن میں خطار کا وہم موجود ہوتا گو اُن کی اصل درست ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ ایک دن آپ کے مرید ابوحمزہ بغدادیؒ آپ کے پاس آئے جو سماع سننے والے اور صاحبِ حال مرد تھے حضرت محاسبیؒ نے ایک شاہ مرغ رکھا ہوا تھا جو بانگ دیتا تھا اُس نے اس وقت بانگ دی تو ابوحمزہ نے نعرہ بلند کیا۔ حضرت حارث محاسبی نے اُٹھ کر اُس کو پکڑ لیا اور کہا تو کافر ہو گیا ہے اور اس کو ذبح کر دینے کا ارادہ کر لیا۔ مریدوں نے پاؤں پر گر کر آپ کو اُس سے جدا کر دیا تاہم آپ نے ابوحمزہ سے کہا۔

اَسْلِمْ یَا مَطْرُوْدُ۔

اے مردود دوبارہ اسلام لا۔

مریدوں نے عرض کی اے شیخ ! ہم سب تو اُس کو خواصِ اولیا اور موحدین میں سے سمجھتے ہیں شیخ کو اس کے بارے میں یہ تردّد کیسے پیدا ہوا ! آپ نے فرمایا مجھے اُس کے اسلام کے متعلق کوئی تردّد نہیں بلکہ میں اُس میں خوبی کے سوا کچھ نہیں دیکھتا اور اس کے باطن کو بھی توحید میں مستغرق پاتا ہوں لیکن اُس نے ایسا کام کیوں کیا جو حلولیوں (حلولی ایک گروہ جس کا عقیدہ ہے کہ خدا اپنی مخلوق میں حلول کرتا ہے) سے مشابہ تھا تاکہ اُن کے مقالات میں سے کسی چیز کا اس کے معاملات میں دخل ہو کہ ایک مرغ جو عقل نہیں رکھتا اُس نے تو اپنی عادت اور خواہش کے مطابق بانگ دی ہے لیکن اس کی آواز سے اس کو سماع کی کیفیت کیوں واقع ہو گئی حالانکہ حق جلّ و عزّ کی ذات قابلِ تقسیم نہیں کہ اس کا کچھ حصہ اس مرغ میں حلول کر گیا ہو اور صوفی اس کی آواز پر وجد میں آجائے۔ اور حق تعالیٰ کے دوستوں کو اس کے کلام

کے بغیر آرام اور اُس کے اسلام کے بغیر وقت اور حال نصیب نہیں ہوتا اور حق تعالیٰ اشیاء میں نہ تو حلول و نزول فرماتے ہیں اور نہ ہی ذاتِ قدیم کا حادث اشیاء کے ساتھ اتحاد اور امتزاج درست ہو سکتا ہے۔ جب ابو حمزہ نے اس وقت شیخ کی طرف دیکھا تو فوراً پکار اٹھے کہ اے شیخ! اگرچہ میں اصل میں صحیح تھا تاہم چونکہ میرا فعل اس وقت ایک گمراہ قوم کے فعل کی مانند ہو گیا تھا اس لیے میں توبہ کرتا ہوں اور اس سے باز آتا ہوں ــ اور اس معاملہ میں آپ کے بہت سے طریق ہیں، میں نے تو مختصراً بیان کر دیا ہے۔ اور یہ طریق بڑا قابل تعریف ہے کہ سلامتی کی راہ میں صحو و ہوشیاری کو چھوڑے بغیر کمال درجے کی سلامتی حاصل ہو جاتی ہے۔ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ

من کان یومن باللہ والیوم الاٰخر فَلَا یَقِفَنَّ مَوَاقِفَ التُّھَم۔ — جو کوئی اللہ پر اور آخرت کے دن پر یقین رکھتا ہے اُسے چاہیے کہ تہمت کے مقامات پر نہ کھڑا ہو۔

اور میں علی بن عثمان الجلابی ہر وقت اللہ تعالیٰ سے یہ استدعا کرتا ہوں کہ مجھے ایسے ہی عمل کی توفیق نصیب فرمائے۔ لیکن یہ بات زمانہ کے رسمی صوفیوں کی محبت میں نہیں مل سکتی کیوں کہ اگر تم مصیبت اور ریاکاری میں اُن کی موافقت نہیں کرو گے تو وہ تمہارے دشمن بن جائیں گے۔ پس ہم جہالت سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں ـ واللہ اعلم بالصواب ـ

قصاری فرقہ

قصاری حضرات کی محبت حضرت ابی صالح بن حمدون بن احمد بن عمارۃ القصار رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ہے جو بڑے بزرگ علماء اور اس طریقت کے سرداروں میں سے تھے۔ آپ کا طریقہ ملامت کے اظہار اور نشر کا طریقہ تھا اور معاملات طریقت کے تمام فنون میں آپ کا کلام بڑا بلند پایہ ہے، آپ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا تمہارے بارے میں علم اُس علم سے زیادہ اچھا اور نیک ہونا چاہیے جو تیرے متعلق مخلوق کو حاصل ہے، یعنی تمہیں چاہیے کہ خلوت و تنہائی میں حق تعالیٰ کے ساتھ تمہارا معاملہ مخلوق کے سامنے تمہارے معاملے سے زیادہ بہتر ہو ــ کیوں کہ حق تعالیٰ سے تمہارا سب سے بڑا حجاب یہی ہے کہ تمہارا دل غیر حق میں مشغول ہو۔ مخلوق کے ساتھ آپ کے مسائل ملامت کے متعلق کتاب کے شروع میں احوال و حکایات کے ضمن میں بیان کر

چکا ہوں لہذا یہاں طوالت کو ترک کر کے اختصار کو اپنا رہا ہوں ۔ آپ کی نادر حکایات میں سے ایک یہ ہے کہ ایک دن میں نیشاپور کی نہر حیرہ کے کنارے چلا جا رہا تھا کہ میری ملاقات نوح نام کے ایک عیار کے ساتھ ہو گئی جو جوانمردی میں بڑا شہرت یافتہ رہا اور نیشاپور کے تمام عیار اور راہزن اس کے تابع فرمان تھے ۔ میں نے اُس کو دیکھا تو دریافت کیا کہ "اے نوح" جوانمردی کیا چیز ہے ! اُس نے پوچھا میری جوانمردی پوچھتے ہو یا اپنی جوانمردی ! میں نے کہا دونوں کے متعلق بتا دیں ۔ کہنے لگا ! میری جوانمردی تو یہ ہے کہ میں قبا اُتار کر گدڑی زیب تن کر لوں اور اُسی کے لوازمات اپنا لوں تاکہ صوفی بن جاؤں اور پھر حق تعالیٰ سے حیا کرتا ہوا معصیت سے پرہیز کروں ۔ اور تیری جوانمردی یہ ہے کہ تم گدڑی اتار دو تاکہ تم مخلوق کے لیے اور مخلوق تمہارے لیے فتنہ کا باعث نہ بنے ۔ تاہم میری جوانمردی شریعت کی حفاظت کرنے اور تمہاری جوانمردی باطن میں حقیقت کی حفاظت کا نام ہوگا ۔ اور یہ بنیاد بڑی ہی مضبوط ہے ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

طیفوری فرقہ

یہ گروہ حضرت ابویزید طیفور بن عیسیٰ بن سروشان البسطامی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت رکھتا ہے جو صوفیاء کے رؤسا اور بڑے بزرگوں میں سے تھے ۔ غلبۂ شوق اور مستی آپ کا طریق تھا ۔ حق تعالیٰ کی محبت کا شوق اور اس میں مستی انسان کے اپنے اکتساب سے حاصل نہیں ہوتی ۔ اور جو چیز انسان کے اپنے دائرہ اختیار سے خارج ہو اس کا دعویٰ کرنا باطل ہوتا ہے اور اُس کی تقلید بالکل محال ہوتی ہے اس لیے لامحالہ ہوشمند کے لیے صفتِ سکر ثابت نہیں ہو سکتی اور آدمی کو اپنے اندر سکر کی حالت پیدا کرنے کا اختیار نہیں ہوتا ۔ اور حالتِ سکر والا صوفی مغلوب ہوتا ہے ۔ اُس کو مخلوق کی طرف کوئی توجہ نہیں ہوتی کہ اُس سے تکلف والے اوصاف میں سے کوئی وصف ظاہر ہو ۔ مشائخ طریقت اس بات پر متفق ہیں کہ احوال کی منزل سے گزر چکنے والے مستقیم الحال صوفی کے علاوہ کسی کی پیروی درست نہیں ۔ پھر اگر صوفیاء کا ایک گروہ انسان کے اپنے آپ پر تکلفاً صحو و سکر طاری

کر لینے کو درست گردانتا ہے کیونکہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ
اُبْکُوا فَاِنْ لَّمْ تَبْکُوْا فَتَبَاکُوْا۔ گریہ کرو اور اگر رو نہ سکو تو رونے والی شکل بنالو۔
اور اس کی دو صورتیں ہیں ایک ریاکاروں کے گروہ کی مانند اپنے آپ کو کر لینا یہ تو صریح شرک ہے۔ دوسرے اپنے کو صوفیاء کی مانند کر لینا تاکہ حق تعالیٰ ان کے اس تشبہہ کو دیکھ کر انہیں اس درجہ پر پہنچا دیں جس پر وہ لوگ پہنچے ہوئے ہیں اس طرح پیغمبر علیہ السلام کے ارشاد کے موافق ہو جائیں کہ
مَنْ تَشَبَّہَ بِقَوْمٍ فَھُوَ مِنْھُمْ۔ جو آدمی کسی قوم کے ساتھ مشابہت پیدا کرتا ہے وہ اسی میں سے ہوگا۔

پس حق کی راہ میں مجاہدات کی اقسام میں سے جو بھی درپیش آئے اُسے اختیار کرے اور حق تعالیٰ سے امیدوار رہے تاکہ حق تعالیٰ اس پر معانی کی تحقیق کا دروازہ کھول دیں کیونکہ مشائخ میں سے ایک بزرگ نے کہا ہے کہ
المشاھدات مواریث المجاھدات۔ مشاہدے، مجاہدات کی میراث ہوتے ہیں۔
میں کہتا ہوں کہ مجاہدات ہر اعتبار سے بہتر اور مفید ہوتے ہیں لیکن سکر اور صحو آدمی کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتے کہ مجاہدات کے ذریعہ اُن کو حاصل کر لیں اور نہ ہی مجاہدات کو سکر کے حصول کی علامت قرار دیا جاسکتا ہے۔ اور مجاہدات تو حالتِ صحو میں ہی کئے جاسکتے ہیں اور صاحبِ صحو کا قیام سکر کو قبول کرنے کے ساتھ نہیں ہوتا۔ لہٰذا مجاہدات سے سُکر اور صحو کی حالت کو حاصل کرنا محال ہے۔ اور اب میں مشائخ طریقت کے اختلاف کی بنیاد پر سکر اور صحو کی حقیقت کو بیان کرتا ہوں تاکہ اگر اللہ عزوجل چاہیں تو یہ اشکال دور ہو جائے۔

سُکر اور صحو کا بیان

جان لو! اللہ تعالیٰ تمہیں عزت نصیب کریں کہ سکر اور غلبہ ارباب معانی کے نزدیک ایسی عبارت ہے جس سے حق تعالیٰ کی محبت کا غلبہ مراد لیا جاتا ہے اور صحو عبارت ہے

مقصود و مراد کو حاصل کر لینے سے ۔ ان کے متعلق اہل معانی کے بہت سے اقوال ہیں ایک جماعت سکر کو صحو پر فضیلت دیتی ہے اور دوسری صحو کے سکر سے افضل ہونے کی قائل ہے۔ جو حضرات سکر کو صحو پر فضیلت دیتے ہیں وہ حضرت ابو یزید اور اُن کے پیرو ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ صحو تو صفتِ آدمیت کے معتدل اور مستحکم ہونے کی صورت میں متصور ہوتا ہے اور یہ چیز حق تعالیٰ سے حجاب اعظم ہے لیکن سکر اس وقت متحقق ہوتا ہے جب آفت زائل ہو جائے، صفاتِ بشریت کم ہو جائیں، اپنی تدبیر اور اختیار ختم ہو جائے اور اپنے وجود میں اپنی جنس بشریت کے خلاف موجود معانی اور قوتوں کی بقا کی وجہ سے اپنے حق میں تصرف فنا ہو جائے ۔ اور یہ حالت اُس دوسری حالت سے زیادہ کامل و مکمل اور بہتر ہے، جیسا کہ حضرت داؤد علیہ السلام حالتِ صحو میں تھے اور اُن سے ایک کام سرزد ہوا تو حق تعالیٰ نے اُن کے اس فعل کو انہی کی طرف منسوب کیا اور فرمایا کہ

وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ ۔ — اور حضرت داؤدؑ نے جالوت کو قتل کیا ۔

اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم حالتِ سکر میں تھے اور آپؐ سے ایک فعل وجود میں آیا تو حق تعالیٰ نے آپؐ کے فعل کی نسبت اپنی ذات کی طرف فرمائی اور کہا کہ

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۔ — جب آپؐ نے مشرکین کے لشکر پر مٹھی بھر خاک پھینکی تو وہ آپؐ نے نہیں بلکہ درحقیقت اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھی ۔

پس دیکھو تو سہی ایک بندے اور دوسرے بندے کے درمیان کتنا فرق ہے کہ جو بندہ (حضرت داؤد علیہ السلام) اپنی ذات کے ساتھ قائم اور اپنی صفات کے ساتھ ثابت ہے اُس کے بارے میں تو بطور کرامت کے فرمایا ہے کہ تو نے خود یہ کام سرانجام دیا ہے لیکن جو بندہ (پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام) اپنی صفات سے فانی ہو کر حق تعالیٰ کے ساتھ قائم ہے۔ اُس کے فعل کے متعلق فرماتے ہیں کہ ہم نے خود کیا ہے جو بھی کیا ہے۔ پس بندہ کے فعل کی اضافت حق تعالیٰ کی طرف اُس حالت سے بہت زیادہ بہتر ہے کہ حق تعالیٰ کے فعل کی اضافت بندے کی ذات کی طرف کی جائے کیوں کہ جب حق تعالیٰ کے کسی فعل کی اضافت بندے کی طرف کی جائے گی تو بندہ اپنی ذات کے ساتھ قائم ہوتا ہے

جیسا کہ حضرت داؤدؑ کی ایک نظر جب وہاں پڑی جہاں نہ پڑنی چاہیے تھی یعنی روریا کی بیوی پر تو آپ کو حق تعالیٰ کی طرف سے تنبیہہ کا سامنا کرنا پڑا لیکن جب بندہ حق تعالیٰ کے ساتھ قائم ہوتا ہے تو صورتِ حال مختلف ہوتی ہے جیسا کہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اسی طرح کی نگاہ حضرت زیدؓ کی بیوی پر پڑی تو حضرت زید پر حرام ہو گئیں۔ اس لیے کہ حضرت داؤدؑ کی نظر حالتِ صحو میں تھی اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر حالتِ سکر میں تھی۔ ؏

اور جو حضرات صحو کو سکر پر فضیلت دیتے ہیں وہ حضرت جنیدؒ اور آپ کے پیرو ہیں وہ کہتے ہیں کہ سکر حالتِ آفت میں ہے کیونکہ وہ احوال کی تشویش، صحت کے ختم ہو جانے اور اپنی حالت پر قابو باقی نہ رہنے کا باعث ہے، اور جب کہ جملہ معانی کی بنیاد خود طالب ہے خواہ اپنے فنا کی وجہ سے ہو یا بقا کی وجہ سے اور خواہ اپنے آپ کو محو کر دینے کی بنیاد پر خواہ اپنے آپ کو ثابت کرنے کی بنیاد پر۔ تو جب وہ طالب خود ہی صحیح الحال نہ ہو گا اس کو تحقیق کا کچھ بھی فائدہ حاصل نہ ہو گا کیوں کہ اہل حق کا دل تو تمام اشیائے ثابتہ سے مجرد ہونا چاہیے، اور ایک نابینا آدمی کو تو اشیاء کے ساتھ تعلق سے نہ کوئی راحت حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی اُن کی خرابی سے چھٹکارا نصیب ہوتا ہے۔ باقی لوگوں کا حق تعالیٰ کے ماسوا دوسری چیزوں میں اُلجھے رہنا۔ انہیں صرف اس لیے کہ وہ ان چیزوں کی حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے۔

؏ فائدہ۔ حضرت داؤدؑ علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ اور صاحب کتاب رسول ہیں اس اعتبار سے آپ معصوم عن الخطاء ہیں کہ عصمت اور نبوت لازم و ملزوم ہیں۔ آپ کی طرف روریا نامی شخص کی بیوی کو دیکھنے وغیرہ کی جملہ روایات غلط ہیں، محقق مفسرین نے ان کو یکسر رد کر دیا ہے اور یہ بعض غیر محتاط حضرات نے اسرائیلی روایات سے لے کر متعلقہ آیات کے ضمن میں بیان کر دی ہیں۔ ان کو درست مان لینے کی صورت میں حضرت داؤدؑ علیہ السلام کی عصمت پر حرف آتا ہے۔ اسی طرح حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی زوجہ کی طرف حضور علیہ السلام کے دیکھنے کی روایت بھی بالکل غلط، لغو اور بیہودہ ہے۔ کسی نبی اور خصوصاً امام الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں ایسا سوچنا اور تصور کرنا بھی بہت بُری بات ہے! اعاذنا اللہ۔ نہ جانے بعض صوفیاء نے صحو اور سکر کے بیان میں ایسی غلط روایات کو مثال کے طور پر بیان کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی۔ (مترجم)

اور درست طور پر دیکھنا دو طرح کا ہوتا ہے، ایک یہ کہ دیکھنے والا اپنی آنکھ سے اُس کے بقا کو دیکھے اور دوسرا یہ کہ اپنی آنکھ سے اُس کے فنا کو دیکھے۔ اور اگر آنکھ کے ساتھ اُس کے بقا کو دیکھے گا تو تمام چیزوں کو اپنی بقاء میں ناقص پائے گا کیوں کہ وہ اُن کی حالت کے بقاء میں بذاتِ خود اُن کو قائم دیکھ رہا ہے اور اگر اُن کے فنا کو دیکھے گا تو حق تعالیٰ کی بقاء کے مقابلے میں تمام موجودات کی بقاء کو فانی پائے گا۔ اور یہ دونوں صورتیں اس کو موجودات سے روگرداں کر دیں گی۔ اسی لیے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعا کی حالت میں عرض کی کہ

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْاَشْیَاءَ کَمَا ھِیَ ۔ اے اللہ! ہمیں چیزیں اس طرح دکھا دے جس طرح کہ وہ ہیں۔

کیوں کہ جو آدمی چیزوں کی اصلی حالت اور حقیقت دیکھ لے گا وہ آسودہ حال ہو جائے گا، اور حق تعالیٰ کے اس قول کا بھی یہی معنی ہے کہ

فَاعْتَبِرُوْا یٰاُولِی الْاَبْصَارِ ۔ اے آنکھوں والو، عبرت حاصل کرو۔

کیونکہ جب تک وہ چیزوں کو اُسی طرح نہ دیکھیں گے جس طرح کہ وہ ہیں تو عزت حاصل نہ کر سکیں گے۔ پس یہ تمام باتیں حالتِ صحو کے علاوہ کسی حالت میں درست نہیں ہوتیں اور اہلِ سکر کو ان معانی سے کچھ بھی واقفیت نہیں ہوتی۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حالتِ سکر میں تھے تو اللہ تعالیٰ کی ایک تجلّی کو بھی برداشت نہ کر سکے اور بیہوش ہو گئے۔

خَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا ۔ موسیٰ بیہوش ہو کر گر پڑے۔

لیکن ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم حالتِ صحو میں مکّہ سے عین تجلیاتِ الٰہی میں قاب قوسین تک چلے گئے پھر بھی ہر دم ہوشیار اور زیادہ بیدار رہے ـــــ شعر

شَرِبْتُ الرَّاحَ کَاْسًا بَعْدَ کَاْسٍ
میں نے پے بہ پے پیالے پر پیالہ شراب پی۔ لیکن نہ تو شراب

فَمَا نَفِذَ الشَّرَابُ وَمَا رَوِیْتُ
ختم ہوئی اور نہ ہی میں سیراب ہوا۔

میرے مُرشد جو جنیدی مذہب رکھتے تھے، نے فرمایا کہ سکر تو بچوں کے کھیلنے کا میدان ہے اور صحو مردوں کی فنا گاہ ہے۔ اور میں علی بن عثمان الجلابی بھی اپنے شیخ کی موافقت میں کہتا ہوں کہ صاحب سکر کی حالت کا کمال صحو میں ہے۔ اور صحو میں کم از کم درجہ یہ ہے

کہ انسان اپنی بشریت کے دور ہو جانے کو دیکھ لے۔ پس وہ صحو جو خرابی اور آفت کو ظاہر کرے اُس سُکر سے بہت بہتر ہے جو عین آفت ہے ــــ حضرت ابو عثمانؒ کے متعلق حکایت بیان کرتے ہیں کہ آپ نے اپنے ابتدائی بیس سال تک بیابانوں میں اس طرح خلوت نشینی اختیار کی کہ آدمی کی آہٹ تک نہ سنی، یہاں تک کہ کثرتِ ریاضت اور مجاہدات سے آپ کا جسم گھُل گیا۔ آپ کی آنکھیں اندر کو گھس گئیں اور آپ کی صورت آدمیوں کی سی نہ رہی۔ بیس سال کے بعد حق تعالیٰ نے انہیں فرمایا کہ مخلوق کی محبت اختیار کرو۔ چنانچہ انہوں نے اپنے آپ سے کہا کہ پہلے اہل اللہ اور اللہ تعالیٰ کے گھر کے پڑوسیوں کی محبت اختیار کرنی چاہیئے تا کہ زیادہ باعث برکت ہو۔ اس لیے آپ نے مکہ مکرمہ کا ارادہ فرمایا، مشائخ کو دلی طور پر آپ کے آنے کی پہلے سے خبر تھی لہٰذا وہ آپ کے استقبال کے لیے شہر سے باہر نکلے تو آپ کو اس حالت میں پایا کہ آنکھیں بدلی ہوئی ہیں اور مخلوق کی رمق کے سوا آپ پر کوئی چیز نہ تھی۔ مشائخ نے پوچھا کہ اے ابو عثمانؒ تم نے بیس سال تک زندگی اس طرح گزاری ہے کہ اولادِ آدم تجھ کو پہچاننے سے بھی عاجز ہو گئی ہے۔ ہمیں بتاؤ کہ تم کس لیے گئے تھے، کیا دیکھا، کیا حاصل کیا اور کیوں واپس آ گئے؟۔ آپؒ نے فرمایا "میں سکر کی وجہ سے گیا تھا، سُکر کی آفت کو دیکھا، ناامیدی کو حاصل کیا اور عاجزی کے ساتھ واپس آ گیا ہوں۔ مشائخ نے کہا" اے ابو عثمان تیرے بعد تعبیر کرنے والوں پر حرام ہے کہ وہ صحو اور سکر کے معانی بیان کریں کیونکہ تم نے سکر کی صحیح تحقیق کر لی اور پھر اُس کی آفت کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ پس سکر عین بقاء میں فنا کا سراسر گمان ہے اور اس کی صفت حجاب ہے اور صحو فنائے صنعت میں سراسر دیدار بقاء ہے، اور یہ عین کشف ہے۔ باقی اگر کسی کو یہ خیال ہو کہ صحو کے مقابلہ میں سکر فنا سے زیادہ قریب ہے تو یہ محال ہے کیوں کہ سکر حالتِ صحو پر ایک زائد صفت ہے۔ جب تک بندہ کے اوصاف روبہ ترقی ہوتے ہیں وہ بے خبر رہتا ہے لیکن جب وہ کم ہونے لگتے ہیں تو اس وقت طالبوں کو اُس سے حصولِ مقصود کی امید ہو جاتی ہے اور صحو و سکر میں ان کے حال کی انتہا یہی ہے ــــ اور حضرت ابو یزیدؒ جو مغلوب الحال تھے کے بارے میں ایک حکایت بیان کرتے ہیں کہ حضرت یحییٰ بن معاذؒ نے

آپ کی خدمت میں خط لکھا کہ آپ اس آدمی کے بارے میں کیا رائے ظاہر فرماتے ہیں کہ جس نے حق تعالیٰ کی محبت سے صرف ایک قطرہ ہی پیا اور مست ہو گیا! حضرت بایزیدؒ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ آپ اُس آدمی کے بارے میں کیا کہتے ہیں کہ تمام دنیا کے دریا محبت کی شراب بن جائیں اور وہ اُن سب کو پی کر بھی تشنگی سے چلاتا رہے! ۔ صوفیاؒ کا خیال ہے کہ حضرت یحییٰؒ نے حالتِ سکر سے اور حضرت بایزیدؒ نے حالت صحو سے عبارت کی ۔ اس کے برعکس صورت حال یہ ہے کہ صاحب صحو وہ ہوتا ہے جو ایک قطرہ کی طاقت بھی نہ رکھتا ہو اور صاحب سکر وہ ہے جو مستی میں سب کچھ پی جائے اور ابھی اُس کو اور بھی ضرورت ہو اس لیے کہ شراب سکر کا آلہ ہے، اور جنس کو اپنی ہی جنس سے زیادہ تعلق ہوتا ہے ۔ اور صحو اس کی ضد ہے ۔ اس کو شراب پینے سے آرام حاصل نہیں ہوتا ۔

باقی سکر کی دو قسمیں ہیں ۔ ایک سکر، دوستی کی شراب سے اور دوسرا محبت کے پیالہ سے ۔ دوستی کا سکر کسی سبب کا نتیجہ ہوتا ہے کیونکہ اس کا وجود کسی نعمت کو دیکھنے سے ہوتا ہے ۔ پس جو کوئی نعمت کو دیکھتا ہے وہ دراصل اپنی ذات سے دیکھتا ہے لہٰذا اپنے آپ کو ہی دیکھتا ہے اور جو کوئی منعم کو دیکھتا ہے وہ چونکہ اُس کے واسطے سے ہی دیکھتا ہے اس لیے اپنے آپ کو نہیں دیکھتا ۔ وہ اگرچہ بظاہر سکر کی حالت میں ہو لیکن درحقیقت اُس کا سکر بھی صحو ہوتا ہے ۔ اور صحو بھی دو طرح کا ہوتا ہے ۔ پہلا صحو غفلت پر اور دوسرا صحو محبت پر ہوتا ہے ۔ جو صحو غفلت پر ہوتا ہے وہ تو حجاب اعظم ہے، اور جو صحو محبت پر ہوتا ہے وہ بہت زیادہ واضح کشف ہوتا ہے ۔ پس جو حالت غفلت سے ملی ہوئی ہو اگرچہ صحو ہو، سکر ہو گی اور جو حالت محبت سے مقرون ہے وہ اگرچہ سکر ہے صحو ہو گی ۔ جب بنیاد اور اصل مستحکم ہو تو صحو سکر کی طرح ہو گا اور سکر صحو کی طرح ۔ اور جب بنیاد ہی مستحکم نہ ہو تو دونوں بے فائدہ ہیں ۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ صوفیاء کی حد نگاہ میں علتوں کے اختلاف کی بنا پر صحو اور سکر بھی مختلف ہوتے ہیں ۔ اور جب حقیقت کا سلطان اپنے جمال کو دکھاتا ہے تو صحو اور سکر دونوں طفیلی معلوم ہوتے ہیں ۔ اس لیے کہ ان دونوں معانی کے اطراف ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں ۔ ایک کی انتہاء دوسرے کی ابتداء ہوتی ہے ۔ اور

ابتداء و انتہا باہمی تفرقہ کے بغیر صورت پذیر نہیں ہوتے۔ اور جس چیز کی نسبت تفرقہ کے ساتھ ہو وہ حکم میں مساوی ہوتی ہے اور اُن کو ایک چیز میں جمع کرنا گویا تفریق کی نفی کرنا[1] ہے۔ اسی معنی کو بیان کرنے کے لیے کسی شاعر نے کہا ہے کہ

إذا طلع الصباحُ بنجمِ راحٍ — جب خوشی کے ستارے کے ساتھ صبح طلوع ہوتی

تساوی فیہِ سُکرانٌ وصَاحٍ — ہے تو اس وقت مست اور ہوشیار دونوں برابر ہوتے ہیں۔

سرخس میں دو بزرگ رہتے تھے ایک لقمان اور دوسرے ابوالفضل حسن۔ لقمان ایک روز ابوالفضل کے پاس آئے تو دیکھا کہ اُن کے ہاتھ میں ایک جزو پکڑا ہوا ہے۔ انہوں نے پوچھا اے ابوالفضل اس جزو میں کیا تلاش کرتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا "وہی کچھ جو تم اس کو ترک کرتے میں ڈھونڈتے ہو"۔ لقمانؒ نے کہا "کہ یہ اختلاف کیوں ہے!" ابوالفضل نے جواب دیا" اختلاف تو تمہیں نظر آرہا ہے جو تم مجھ سے پوچھ رہے کہ مَیں اس میں کیا ڈھونڈتا ہوں۔ مستی سے ہوشیار اور ہوشیاری سے بیدار ہو جاؤ تاکہ یہ اختلاف اٹھ جائے اور تم جان لو کہ میں اور تم کیا تلاش کر رہے ہو — پس طیفوریوں کا جنیدیوں سے یہی اختلاف ہے جو میں نے بیان کر دیا۔ اور مطلق معاملات میں اُن کا مذہب لوگوں کی صحبت کا ترک کرنا اور گوشہ نشینی کو اختیار کرنا ہے اور وہ اپنے مریدوں کو بھی یہی حکم دیتے ہیں اور اگر میسر آجائے تو یہ طریق بڑا قابل تعریف اور یہ سیرت بڑی قابل ستائش ہے۔

جنیدی فرقہ

جنیدی حضرات، حضرت ابوالقاسم جنید بن محمدؒ سے محبت کرتے ہیں۔ اور اُن کے دور میں اُن کو طاؤس العلماء کہتے تھے، آپ اس گروہ کے سردار اور ان کے امام الائمہ تھے۔ طیفوریوں کے برعکس ان کا طریق صحو پر مبنی تھا اور ان کا اختلاف بیان کر دیا گیا ہے۔ تمام مذاہب صوفیاء میں معروف اور مشہور ترین مذہب آپ کا ہی ہے اور تمام مشائخ

---

[1] مفہوم یہ ہے کہ طالب کے لیے مقصود تو کشف اور مشاہدہ حق ہے جب تک وہ حاصل نہ ہو صحو اور سکر دونوں الگ الگ چیزیں ہیں لیکن جب مشاہدہ حاصل ہو جائے تو پھر یہ دونوں ہی مفید ہیں۔

بھی جنیدی مذہب کے ہی ہوتے ہیں، تاہم اس کے علاوہ اس طریقت کے معاملات میں اُن کے اقوال بہت زیادہ مختلف ہیں لیکن میں نے طوالت کے خوف سے اسی پر اختصار کیا ہے، اگر کوئی شخص اس سے زیادہ جاننا چاہتا ہو تو اُسے چاہیئے کہ وہ دوسری جگہ پڑھ لے تاکہ اس سے بہتر طور پر اُسے معلوم ہو جائے کیوں کہ اس کتاب میں میرا مذہب تو اختصار کرنا اور تطویل کو ترک کرنا ہے۔ وباللہ التوفیق۔

حکایات میں میں نے پایا ہے کہ حضرت حسین بن منصورؒ اپنے غلبہ کی حالت میں حضرت عمر بن عثمانؒ سے بیزار ہو کر حضرت جنیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت جنیدؒ نے اُن سے پوچھا "میرے پاس کس لیے آئے ہو"؟ انہوں نے جواب دیا "تاکہ میں شیخ کی صحبت اختیار کروں" آپ نے فرمایا "میرے پاس مجنونوں کی صحبت کے لیے گنجائش نہیں کیوں کہ صحبت کے لیئے دماغ کی صحت ضروری ہے کیوں کہ جب تم مستی کی آفت کے باوجود صحبت اختیار کرو گے تو وہی انجام ہو گا جو تم نے سہل بن عبداللہ تستری اور عمرؒ کے ساتھ کیا ہے۔ انہوں نے عرض کیا:

ایہا الشیخ الصحو والسکر صفتان للعبد وما دام العبد محجوبا عن ربہ حتی فنیٰ اوصافہٗ۔

اے شیخ! صحو اور سکر بندہ کی دو صفتیں ہیں، بندہ اُس وقت تک اپنے رب سے محجوب ہی رہتا ہے جب تک اُس کی صفات فنا نہ ہو جائیں۔

حضرت جنیدؒ نے فرمایا۔

یا ابن المنصور اخطأت فی الصحو والسکر لان الصحو بلا خلاف عبارۃ عن صحۃ حال العبد مع الحق وذالک لا ید خل تحت صفۃ العبد واکتساب المخلوق وانا اری فی کلامک یا ابن منصور فضولا کثیرا وعبارات لا طائل تحتہ۔

اے ابن منصور! تم نے صحو اور سکر کو سمجھنے میں خطا کھائی ہے، کیوں کہ صحو بغیر کسی اختلاف عبارت ہے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندے کے صحیح سے، اور یہ چیز بندے کی صفت اور مخلوق کے کسب کے تحت داخل نہیں ہوتی۔ اور اے ابن منصور! اس کے علاوہ بھی میں تیری کلام میں فضول گفتگو اور ایسی عبارتیں پاتا ہوں جن کا کوئی فائدہ نہیں۔

واللہ اعلم بالصواب۔

نوری فرقہ

نوری فرقے کے حضرات کی محبت حضرت ابوالحسن احمد بن محمد نوری رحمۃ اللہ کے ساتھ ہے۔ جو علماء صوفیاء کے سرداروں میں سے ایک تھے اور نور کے لقب سے زیادہ مشہور تھے۔ صوفیاء میں روشن مناقب اور قاطع دلائل کے ساتھ آپ کا ذکر ہوتا ہے اور تصوف میں آپ کا مذہب بڑا پسندیدہ ہے جس کی بنیاد یہ ہے کہ صفوت کو فقر پر فضیلت حاصل ہے اور آپ کا معاملہ حضرت جنیدؒ کے موافق ہے۔ آپ کے طریق کی نادر باتوں میں سے ایک یہ ہے کہ آپ کے نزدیک محبت میں دوسرے کے حق کو اپنے حق پر ترجیح دینا ضروری ہے، اور آپ بغیر ایثار کے محبت کو حرام قرار دیتے اور فرماتے ہیں کہ درویشوں کے لیے محبت ایک فریضہ ہے اور عزلت نشینی ناپسندیدہ فعل ہے، اسی طرح دوست کا دوست کے ساتھ ایثار کرنا بھی فریضہ ہے اور آپ سے نقل ہے کہ آپ نے فرمایا

ایّاکمو العزلۃ فانّ العزلۃ مقارنۃ الشیطان وعلیکم بالصحبۃ فانّ الصحبۃ رضاء الرحمٰن۔ — تم عزلت نشینی سے بچو کہ خلوت نشینی شیطان کی ہم نشینی ہے، اور صحبت کو اختیار کرو کہ صحبت میں خداوند عزوجل کی خوشنودی ہے۔

اب میں ایثار کی حقیقت بیان کروں گا۔ اور جب عزلت و صحبت کے باب پر پہنچوں گا تو وہاں ان کے رموز کی شرح کروں گا تاکہ فائدے زیادہ عام ہو جائیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ عزّ وجلّ۔

ایثار کا بیان

اللہ تعالیٰ عزّ وجلّ کا ارشاد ہے وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ کَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دوسروں کو اپنے نفسوں پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ اس کے حاجت مند ہوں۔ اس آیت کا نزول خصوصی طور پر فقراء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان میں ہوا ہے۔ اور ایثار کی حقیقت یہ ہے کہ دوستی میں اپنے دوست کے حق کا خیال رکھے اور

اپنے حصے کو اس حصے میں چھوڑ دے اور اپنے ساتھی کی راحت کے لیے اپنے آپ پر تکلیف برداشت کرے

لِاَنَّ الْاِیْثَارَ الْقِیَامُ بِمُعَاوَنَةِ الْاَغْیَارِ مَعَ الْاِشْتِغَالِ بِمَا اَمَرَہُ الْجَبَّارُ لِرَسُوْلِہِ الْمُخْتَارِ صلی اللہ علیہ وسلم قال اللہ تعالیٰ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاھِلِیْنَ۔

کیوں کہ ایثار دوسروں کی امداد پر قائم رہنے اور اس امر میں مشغول رہنے کا نام ہے جو حق تعالیٰ نے اپنے رسول مختار صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا تھا چنانچہ فرمان الٰہی ہے کہ "درگزر اختیار کیجیے اور نیکی کا حکم دیجیے اور جاہلوں سے اعراض فرمائیے۔"

اس کی پوری تفصیل آداب صحبت کے بیان میں ہو گی تاہم یہاں آیت کریمہ میں ایثار ہی مراد ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو صحبت میں، جیسا کہ اوپر اس کا ذکر ہو چکا ہے اور دوسرا محبت میں — اپنے ساتھی کے لیے ایثار کرنے میں ایک طرح کا رنج اور تکلیف ہوتی ہے لیکن محبوب کے حق میں ایثار کرنے سے خوشی اور راحت ہی ہوتی ہے — حکایات میں مشہور ہے کہ جب غلام الخلیل نے صوفیاء کے ساتھ اپنی دشمنی ظاہر کی اور ہر ایک کے ساتھ اپنی عداوت کا اظہار کیا تو سرکاری کارندے حضرت نوری، حضرت رقام اور حضرت ابوحمزہ کو گرفتار کر کے دار الخلافہ میں لے گئے، غلام الخلیل نے امیر المومنین سے کہا کہ یہ لوگ زندیق اور بے دین ہیں۔ اگر امیر المومنین ان کے قتل کا فرمان جاری کر دیں تو بے دینی کی بنیاد ختم ہو جائے گی کیوں کہ یہی لوگ بے دینوں کے سرکردہ ہیں، اور جو کوئی بھی یہ نیکی سرانجام دے گا میں حق تعالیٰ کے ہاں اس کے لیے بڑے اجر و ثواب کا ضامن ہوں۔ امیر المومنین نے اسی وقت ان حضرات کی گردنیں مار دینے کا حکم جاری کر دیا۔ چنانچہ جلاد آ گیا اور ان تینوں حضرات کے ہاتھ باندھ دیئے۔ جلاد نے جب پہلے حضرت امام کو قتل کرنے کا ارادہ کیا حضرت نوری اپنی جگہ سے اٹھے اور حضرت امام کی جگہ پر جلاد کے سامنے بڑی گرم جوشی سے آ کر بیٹھ گئے۔ تمام لوگ بڑے حیران ہوئے اور جلاد نے آپ سے کہا کہ "اے جوانمرد! یہ تلوار ایسی چیز نہیں کہ کوئی اتنے شوق سے اس کے سامنے آئے جس طرح تو آیا ہے! حالانکہ ابھی تمہاری باری بھی نہیں آئی"۔ آپ نے فرمایا "یہ سب کچھ درست ہے لیکن میرا طریق ایثار پر مبنی ہے، اور دنیا میں زندگی ہی سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے اس

لیے میں چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی کے یہ چند سانس اپنے ان بھائیوں کے کام میں لگا دوں، کیوں کہ میرے نزدیک دنیا کا ایک سانس آخرت کے ہزار سال سے بھی زیادہ پسندیدہ ہے کہ دنیا خدمت کا مقام ہے اور آخرت ثواب کا اور ثواب تو خدمت کرنے سے ہی حاصل ہوتا ہے"۔ قاصد نے یہ اطلاع خلیفہ تک پہنچائی تو خلیفہ ان کی اس حالت میں بھی رقتِ طبع اور کلام کی باریکیوں سے سخت حیران ہوا اور ایک آدمی کو بھیجا کہ سرِدست ان حضرات کے بارے میں توقف کیا جائے، اس وقت حضرت ابوالعباس بن علی قاضی القضاۃ تھے، خلیفہ نے ان حضرات کا معاملہ ان کے سپرد کر دیا۔ وہ ان حضرات کو اپنے گھر لے گئے، اور شریعت و حقیقت کے احکام میں سے جو کچھ بھی اُن سے پوچھا اُس میں اُن کو درست پایا۔ اور اُن کے حال سے اپنی غفلت پر بڑے پشیمان اور پریشان ہوئے اس وقت حضرت نوری نے فرمایا" اے قاضی! آپ نے یہ جو کچھ پوچھا ہے یہ تو کچھ بھی نہیں"

فَاِنَّ لِلّٰہِ عِبَادًا یَاکُلُوْنَ بِاللّٰہِ وَیَشْرَبُوْنَ بِاللّٰہِ وَیجلسون بِاللّٰہ ویقولون باللّٰہِ۔ بے شک اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں جن کا کھانا، پینا بیٹھنا اور بولنا سب کچھ اللہ کے ساتھ ہے۔

کیونکہ اُن کا قیام اُس کے ساتھ ہے اور قعود، نطق، حرکت اور سکون سب کچھ اُسی کے ساتھ ہے، وہ اُسی کے ساتھ زندہ ہیں، اور اُسی کے مشاہدہ سے پائندہ ہیں کہ اگر مشاہدہ حق ایک لمحہ کے لیے بھی اُن حال سے منقطع ہو جائے تو اُن کے وجود میں ایک شور برپا ہو جائے،، قاضی آپ کے کلام کی باریکی اور حال کی صحت پر بڑا متعجب ہوا اور خلیفہ کو لکھ بھیجا کہ اگر یہ گروہ ملحدوں کا ہے تو

فمن الموحدُ فی العالم۔ پھر دنیا میں موحد کون ہے!

میں گواہی دیتا اور فیصلہ کرتا ہوں کہ اگر یہ لوگ بے دین ہیں تو پوری دنیا میں ایک آدمی بھی توحید پرست نہیں ہے۔ خلیفہ نے اُن کو بلوا کر فرمایا کہ اگر کوئی ضرورت ہے تو مجھ سے طلب کر لو، انہوں نے کہا کہ اے خلیفہ! ہماری تم سے حاجت صرف یہ ہے کہ آپ ہمیں بالکل فراموش کر دیں، نہ تو قبول کر کے ہمیں اپنے دربار کا مقرب بنائیں اور نہ ہی چھوڑ کر ہمیں راندہ قرار دیں کیوں آپ کا چھوڑ دینا ہمارے نزدیک آپ کے قبول

کر لینے کی طرح ہے اور آپ کا قبول کر لینا ہمارے نزدیک آپ کے چھوڑ دینے کے برابر ہے، خلیفہ یہ سُن کر رو پڑا اور عزت و تکریم سے اُن کو واپس کر دیا۔ حضرت نافع روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو ایک دفعہ مچھلی کی خواہش ہوئی۔ پورے شہر میں تلاش کے باوجود مچھلی نہ مل سکی، چند روز کے بعد مجھے ایک مچھلی میسر آئی تو آپ نے مجھے اس کے بھوننے کا حکم دیا۔ میں جب بھون کر آپ کے سامنے لایا تو مچھلی کے لائے جانے پر آپ کے چہرے پر میں نے خوشی کے آثار دیکھے، اسی وقت ایک سائل دروازے پر آگیا۔ آپ نے حکم دیا کہ یہ مچھلی اس سائل کو دے دو! غلام نے عرض کیا اے میرے آقا! اتنے دنوں کے بعد تو یہ ملی ہے پھر اب آپ یہ کیوں دیتے ہیں ہم سائل کو اس کی بجائے اور کوئی چیز دے دیتے ہیں، آپ نے فرمایا "اے غلام! اب اس کا کھانا مجھ پر حرام ہو گیا ہے کہ میں نے اس کو اپنے دل سے ہی نکال دیا ہے کیوں کہ میں نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ

أَيُّمَا امْرِءٍ يَشْتَهِي شَهْوَةً فَرَدَّ شَهْوَتَهُ وَاٰثَرَ الْاٰخَرَ عَلٰى نَفْسِهٖ غُفِرَ لَهٗ۔	جو شخص کسی چیز کی خواہش کرے پھر حاصل ہو جانے پر اُس سے اپنا ہاتھ روک لے اور دوسرے شخص کو اپنے اوپر ترجیح دے دے تو اللہ تعالیٰ اُس کو ضرور بخش دیں گے۔

میں نے حکایات میں دیکھا ہے کہ دس درویش جنگل سفر کرتے ہوئے راستہ بھول گئے انہیں شدت کی پیاس محسوس ہوئی جب کہ اُن کے پاس پانی کا ایک ہی پیالہ تھا۔ وہ سب ایک دوسرے پر ایثار کرتے رہے، اور کسی نے بھی پانی نہ پیا حتیٰ کہ ایک کے سوا باقی سب دنیا سے رخصت ہو گئے۔ وہ ایک درویش کہتا ہے کہ جب میں نے دیکھا کہ سب ہی مر گئے ہیں میں نے وہ پانی پی لیا اور اسی کی قوت سے راستے پر واپس پہنچ گیا کسی آدمی نے اس سے کہا کہ اگر تو بھی پانی نہ پیتا تو زیادہ بہتر تھا۔ درویش نے کہا نہیں میں نے شریعت کو اسی طرح سمجھا ہے کہ اگر میں اب بھی نہ پیتا تو اپنی جان کا قاتل بن جاتا۔ اُس نے کہا تو کیا وہ سب اپنی جانوں کے قاتل قرار پائیں گے؟ درویش نے کہا نہیں! کیونکہ ان میں سے ہر ایک نے اس لیے پانی نہ پیا تا کہ دوسرا پی لے لیکن

جب وہ سب ایک دوسرے کی موافقت میں فوت گئے اور صرف میں باقی رہ گیا تو لامحالہ شریعت کے حکم مطابق مجھ پر واجب ہوگیا کہ وہ پانی میں پی لوں۔ جیسا کہ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہجرت کی رات پیغمبر علیہ السلام کے بستر پر سو گئے اور آپؐ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہمراہ مکہ سے باہر آگئے اور غار (ثور) میں تشریف لے آئے، اُس رات کفار مکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کر رکھا تھا، خداوند تعالیٰ نے حضرت جبرائیلؑ اور حضرت میکائیلؑ سے کہا کہ میں نے تم دونوں میں بھائی چارہ قائم کر دیا ہے اور دونوں کی زندگی ایک دوسرے سے دراز کر دی ہے تم میں سے کون ہے جو اپنی زندگی کا دوسرے بھائی کے حق میں ایثار کرے اور اپنے لیے موت کو اختیار کرے، دونوں نے اپنی زندگی کو موت پر ترجیح دی تو حق تعالیٰ عزوجل نے جبرئیلؑ و میکائیلؑ سے فرمایا تم اپنے مقابلے میں حضرت علیؓ کی فضیلت اور شرف دیکھو کہ میں نے اُن کے اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا ہے۔ تو انہوں نے اپنے قتل اور موت کو اختیار کر لیا ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ پر سو گئے ہیں، اپنی جان کو اُن پر فدا اور اپنی زندگانی کو اُن پر نچھاور کر دیا ہے، اب تم دونوں زمین پر جاؤ اور اُن کو دشمنوں سے محفوظ رکھو! چنانچہ جبرائیلؑ و میکائیلؑ دونوں آئے اور ان میں سے ایک آپ کے سرہانے اور دوسرا پاؤں کی جانب بیٹھ گیا۔ اور جبرائیلؑ نے کہا

بخٍ بخٍ من مثلک یا ابن ابی طالب	ابوطالب کے بیٹے! تمہارے جیسا کون ہے؟ کہ اللہ
انّ اللہ تعالیٰ یباھی بک علیٰ ملٰئکتہٖ۔	تعالیٰ تمام فرشتوں پر آپ کے سامنے فخر کرتے ہیں۔

اور آپ میٹھی نیند سو رہے ہیں، اسی وقت آپؐ کی شان میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَہُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ۔	اور وہ لوگوں میں سے وہ بھی تو ہے جو اپنی جان کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بیچ دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔

جنگ اُحد کی مصیبت میں جب حق تعالیٰ نے مومنوں کو آزمائش میں مبتلا کیا تو انصار کی

نیک عورتوں میں سے ایک بیان کرتی ہیں کہ میں پینے کا تھوڑا سا پانی لے کر باہر نکلی تا کہ مجاہدین میں سے کسی کے پاس لے جاؤں ۔ میدان جنگ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ایک کو میں نے دیکھا کہ زخمی حالت میں پڑے اپنے سانس گن رہے ہیں، انہوں نے مجھے اشارہ کیا کہ مجھے پانی دو! میں پانی انہیں دینے لگی تو دوسرے زخمی صحابیؓ نے آواز دی کہ " مجھے پانی دو"! پہلے صحابیؓ نے پانی نہ پیا اور مجھے کہا " اس کے پاس لے جاؤ"! اسی طرح جب میں اُس کے پاس لے گئی تو ایک اور نے آواز دی کہ " مجھے پانی دو!" تو انہوں نے بھی خود نہ پیا اور کہا " اُس کے پاس لے جاؤ" اسی طرح سات حضرات کے پاس میں پانی لے کر گئی لیکن ہر ایک نے خود پینے کی بجائے دوسرے کی طرف بھیج دیا حتی کہ جب ساتویں صحابیؓ نے مجھ سے پانی لینا چاہا تو اُن کی روح پرواز کر گئی، میں واپس لوٹی تا کہ دوسرے کو دے دوں لیکن وہ چھ صحابی رضی اللہ عنہم بھی اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر چکے تھے، اسی وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔

بنی اسرائیل میں ایک عابد تھا کہ اس نے چار سو سال تک حق تعالیٰ کی عبادت کی تھی ایک دن کہنے لگا " یا خدایا! اگر آپ ان پہاڑوں کو پیدا نہ کرتے تو تیرے بندوں کے لیے چلنا اور سیاحت کرنا بڑا آسان ہو جاتا۔" اُس وقت کے پیغمبر صلوات اللہ علیہ پر وحی آئی کہ اُس عابد کو جا کر کہو کہ تمہیں ہماری مِلک میں تصرف کرنے سے کیا کام تھا؟ اگر اب پھر تم نے تصرف کیا تو تمہارا نام سعادت مندوں کے دیوان سے کاٹ کر بدبختوں کے دیوان میں لکھ دیا جائے گا۔ یہ سُن کر اُس عابد کے دل میں خوشی پیدا ہوئی اور خداوند کے حضور سجدہ شکر ادا کیا۔ پیغمبر وقت نے کہا " نادان! بدبختی پر سجدۂ شکر تو ادا نہیں کرتے" اُس نے جواب دیا " میرا شکر بدبختی پر نہیں بلکہ اس بات پر ہے کہ میرا نام حق تعالیٰ کے دفتروں میں سے کسی دفتر میں تو ہے!" تاہم اے پیغمبر خدا میری ایک خواہش ہے انہوں نے کہا " کہو تا کہ میں اللہ تعالیٰ سے عرض کر دوں" کہنے لگا حق تعالیٰ سے کہیے! اگر اب تو مجھے دوزخ میں بھیجتا ہے تو مجھے اس طرح کر دے کہ میں تمام گنہگار مسلمانوں کی جگہ گھیر لوں تا کہ وہ سب

جنت میں چلے جائیں"۔ حق تعالیٰ کا فرمان آیا کہ اے پیغمبر! میرے اس بندے سے کہہ دو کہ تمہارا یہ امتحان تمہاری اہانت کے لیے نہ تھا بلکہ مخلوقات پر تجھے ظاہر کرنا مقصود تھا اور قیامت کے دن تو جن کی شفاعت کرے گا وہ سب جنت میں ہوں گے۔
اور حضرت احمد حماد سرخسی رحمہ اللہ سے میں نے ایک دفعہ دریافت کیا کہ آپ کی توبہ کا آغاز کیسے ہوا؟ آپ نے فرمایا ایک دفعہ میں اپنے اونٹوں کو لے کر سرخس سے باہر بیابان کی طرف نکل گیا اور ایک عرصہ تک وہیں رہا۔ اور میں اس بات کو ہمیشہ پسند کرتا تھا کہ خود بھوکا رہ جاؤں اور اپنا حصّہ کسی دوسرے کو دے دوں اور حق تعالیٰ عزوجل کا یہ قول وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ہر وقت میرے دل میں تازہ رہتا تھا اور ایسے لوگوں کے ساتھ میرا بڑا اعتقاد تھا۔ ایک دن ایک بھوکا شیر جنگل سے ظاہر ہوا اور میرے اونٹوں میں سے ایک اونٹ کو مار ڈالا اور بلندی پر بیٹھ کر چنگھاڑنے لگا۔ اس کے نزدیک نزدیک جتنے درندے اُس کی آواز سنتے گئے اس کے گرد جمع ہوتے چلے گئے وہ آیا اور اونٹ کو پھاڑ ڈالا۔ خود کچھ نہ کھایا اور بلندی پر چڑھ گیا۔ وہ درندے، لومڑی، گیدڑ، بھیڑیئے اور اسی طرح دوسرے جانوروں نے اُس کو کھانا شروع کر دیا اور خود وہیں کھڑا رہا تاآنکہ وہ سب واپس لوٹ گئے، اس وقت اس نے ارادہ کیا تاکہ تھوڑا سا خود بھی کھا لے کہ ایک لنگڑی لومڑی دور سے آتی ہوئی نظر آئی، شیر واپس لوٹ کر بلندی پر چڑھ گیا یہاں تک کہ وہ لومڑی اس میں سے جو کچھ کھا سکتی تھی کھا کر واپس چلی گئی تو اب شیر آیا اور اس میں سے تھوڑا سا کھا لیا۔ میں دور سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ جب وہ واپس لوٹا تو مجھے فصیح زبان میں کہنے لگا" اے احمد! ایک لقمے کا ایثار تو کتے بھی کر لیتے ہیں۔ مردانِ حق تو اپنی جان اور زندگی کا ایثار کرتے ہیں"۔ جب میں نے یہ بُرہان دیکھ لی تو تمام شغال دنیا سے دست بردار ہو گیا۔ اور یہی میری توبہ کی ابتدا تھی۔ حضرت جعفری فلامی رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت ابوالحسن نوری خلوت میں مناجات کر رہے تھے۔ میں وہاں گیا تاکہ اُن کی مناجات اس طرح سُن لوں کہ انہیں علم نہ ہو سکے کہ آپ بڑے فصیح اور ہوشیار تھے، میں نے سُنا تو آپ کہہ رہے تھے کہ" بار خدایا! آپ دوزخ والوں کو عذاب دیں گے حالانکہ وہ سب

علم، قدرت اور آپ کے قدیم ارادے سے آپ کے اپنے ہی پیدا کردہ ہیں۔ اور اگر آپ دوزخ کو انسانوں سے ضرور ہی بھرنا چاہتے ہیں تو آپ اس پر بھی قادر ہیں کہ دوزخ اور اس کے تمام طبقات کو صرف میرے وجود سے ہی پُر کردیں اور اُن کو جنت میں بھیج دیں حضرت جعفر کہتے ہیں کہ میں اُن کے معاملے میں بڑا متحیر ہوا۔ کچھ روز بعد میں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی آنے والا آیا اور کہنے لگا کہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ابوالحسن کو کہہ دو کہ میں نے تمہیں اُس شفقت اور تعظیم کی بدولت بخش دیا ہے جو تجھے میرے اور میرے بندوں کے ساتھ ہے۔ آپ کو نوری اس لیے کہتے ہیں کہ جب آپ کسی تاریک مکان میں گفتگو کرتے تو آپ کے باطنی نور سے وہ مکان جگمگا اٹھتا تھا۔ نیز آپ نور خداوندی سے اپنے مریدوں کے اسرار جان لیا کرتے تھے حتیٰ کہ حضرت جنید فرمایا کرتے تھے کہ ابوالحسن دلوں کے جاسوس ہیں۔ یہ آپ کے مذہب کی خصوصیت ہے اور اہل بصیرت کے نزدیک یہ بڑی مضبوط بنیاد اور پرعظمت معاملہ ہے اور آدمی پر اس سے زیادہ سخت چیز کوئی نہیں کہ وہ اپنی روح کو دوسرے کے لیے خرچ کردے اور اپنی پسندیدہ چیز سے دست کش ہوجائے۔ خداوند تعالیٰ نے بھی تمام نیکیوں کی کنجی اپنی پسندیدہ چیز کو خرچ کردینے کو ہی قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا

لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ۔ — تم اُس وقت تک نیکی حاصل نہیں کرسکتے جب تک اپنی محبوب چیزوں میں سے راہ حق میں خرچ نہ کرو۔

جب کسی کی روح ہی دوسرے کے لیے فدا ہوجائے تو پھر حال ومنال اور خرقہ ولقمہ کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ اور اس طریقت کی اصل وہی ہے جیسا کہ ایک آدمی حضرت رویمؒ کے پاس آیا کہ مجھے وصیت کیجئے! آپ نے فرمایا

یَا بُنَیَّ لَیْسَ الْاَمْرُ غَیْرَ بَذْلِ الرُّوْحِ اِنْ قَدَرْتَ عَلٰی ذٰلِکَ وَاِلَّا فَلَا تَشْتَغِلْ بِتُرَّهَاتِ الصُّوْفِیَّةِ۔ — اے بیٹا! تصوف: اپنی جان کو خرچ کرنے کے سوا کچھ نہیں اگر تو یہ کرسکتا ہے تو ٹھیک! ورنہ صوفیوں کی فضول باتوں میں مشغول نہ ہو۔

کیونکہ جان خرچ کے علاوہ جو کچھ بھی ہے سب فضول ہے، اور خداوند عزوجل ارشاد

فرماتے ہیں کہ

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید کر دیئے جاتے ہیں انہیں مردہ گمان نہ کرو بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس رزق دیے جاتے ہیں۔

اور نیز ارشادِ خداوندی ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ۔

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کر دیے جاتے ہیں انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں۔

پس یہ لوگ اپنی جان قربان کر کے قربِ الٰہی میں ہمیشہ کی زندگی پا لیتے ہیں اور فرمانِ الٰہی کے مطابق حق تعالیٰ کے دوستوں کے لیے اپنا حصہ چھوڑ دیتے ہیں۔ باقی ایثار اور اختیار بنظرِ ظاہر جدا جدا ہیں مگر حقیقت میں ایک ہی ہیں۔ کیونکہ حقیقتِ ایثار یہ ہے کہ اپنے حصہ کو چھوڑ دیا جائے اور یہی اصل اپنا حصہ بن جاتا ہے۔ طالب کی روش جب تک اپنے کسب سے متعلق رہتی ہے وہ اُس کے لئے ہلاکت کا موجب بنی رہتی ہے اور جب حق تعالیٰ کی کشش اپنی ولایت ظاہر کرتی ہے تو اس کے افعال واحوال سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ اور پھر اُس کے لیے نہ کوئی عبارت رہتی ہے اور نہ ہی اس کے معاملہ کے لیے کوئی نام باقی رہتا ہے کہ کوئی اس کا نام رکھے یا کسی عبارت سے اُسے تعبیر کرے یا کسی چیز کو اُس کے حوالے کرے اسی معنی میں شبلیؒ نے فرمایا ہے — شعر

غبت عنی فما احس بنفسی | وتلاشت بہ صفاتی الموصوفۃ

(میں اپنے آپ سے غائب ہو گیا ہوں پس مجھے اپنے نفس کا بھی احساس نہیں رہا اور اس کی وجہ سے میری تمام صفاتِ موصوفہ لاشی ہو گئی ہیں)

فانی الیوم غائب عن جمیع | لیس الا العبارۃ الملھوفۃ

(پس میں آج ہر چیز سے غائب ہوں کہ پریشان عبارت کے سوا کچھ نہیں رہا۔)

فرقہ سہلیہ

سہلی حضرات، حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں جو اہلِ تصوف کے ذی احتشام اور بڑے بزرگوں میں سے تھے جیسا کہ پہلے تذکرہ ہو چکا ہے فی الجملہ آپ اپنے دور میں سلطانِ وقت اور اس طریقت کے اہلِ حل وعقد میں تھے آپ کی دلیلیں بڑی ظاہر ہیں کہ آپ کی حکایات کے ادراک سے عقل عاجز آجاتی ہے اور آپ کا طریق اجتہاد، مجاہدہ نفس اور ریاضت پر مبنی ہے اور آپ اپنے مریدوں کو مجاہدہ کے ذریعہ درجہ کمال پر پہنچا دیتے تھے ۔ حکایات میں مشہور ہے کہ آپ نے ایک مرید سے فرمایا کہ کوشش کر حتیٰ کہ ایک روز دن بھر تو "یا اللہ" "یا اللہ" "یا اللہ" کہتا رہے، اسی طرح دوسرے اور پھر تیسرے دن بھی یہی ورد کرتا رہے اس نے ایسا ہی کیا حتیٰ کہ اُس کی عادت بن گئی تو آپ نے فرمایا اب راتوں کو بھی ساتھ ملا لے، اُس نے ایسا ہی کیا یہاں تک کہ اس طرح ہو گیا کہ اگر اپنے آپ کو خواب میں دیکھتا تو بھی یہی ورد کرتا یہاں تک کہ یہ اُس کی طبیعت ثانیہ بن گئی تو اس وقت حکم دیا کہ اب اس سے باز آ اور اس کو یاد رکھنے میں مشغول ہو جا۔ وہ یادِ الٰہی میں مشغول ہو گیا یہاں تک کہ اُس کا سارا وقت اسی میں مستغرق ہو گیا۔ ایک وقت اپنے گھر میں بیٹھا تھا کہ ہوا کے ساتھ ایک لکڑی اندر آ پڑی اور اس کے سر پر لگی اور اُس کا سر پھٹ گیا۔ اُس کے سر سے خون کے جو قطرے زمین پر آئے تھے اُن میں اللہ اللہ لکھا ہوا ظاہر ہوتا تھا ۔ مجاہدات و ریاضت کے ذریعہ مریدوں کی تربیت سہلیوں کا طریقہ ہے۔ جب کہ درویشوں کی خدمت اور اُن کی تعظیم حمدونیوں کا طریق ہے اور مراقبہ باطن جنیدیوں کا طریقہ ہے۔ تاہم مجاہدہ اور ریاضت ہر آدمی کے لیے نفع بخش نہیں ہوتا۔

اب میں نفس کی پہچان اور اس کی حقیقت بیان کرتا ہوں تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے اس کے بعد مجاہدات کے بارے میں سرخیہ کے مذاہب۔ اور اُن کے احکام تحریر کروں گا

تاکہ طالب معرفت پر یہ دونوں چیزیں ظاہر ہو جائیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حقیقتِ نفس اور معنی "ہویٰ"

جان لو کہ نفس، لغت کی رو سے کسی چیز کے وجود، اُس کی حقیقت اور اس کی ذات کو کہتے ہیں، لیکن علم عادات اور لوگوں کی عبارتوں میں یہ کئی معانی کا محتمل ہے جو ایسے متضاد معانی میں ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ کسی گروہ کے نزدیک تو نفس بمعنی روح کے ہے اور کسی گروہ کے ہاں بمعنی مروت کے ہے اسی طرح ایک گروہ نفس سے جسم مراد لیتا ہے تو ایک اور جماعت اس سے خون مراد لیتی ہے۔ لیکن محقق صوفیہ کے نزدیک ان میں سے کوئی معنی بھی مراد نہیں بلکہ درحقیقت وہ اس بات پر متفق ہیں کہ ہر شر کا سرچشمہ اور برائی کا رہنما ہے۔ باقی ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ جسم کے اندر روح کی طرح ودیعت رکھی گئی ایک چیز ہے، اور ایک گروہ کا کہنا ہے کہ یہ جسم کے اندر زندگی کی طرح ایک صفت ہے۔ تاہم وہ متفق ہیں کہ بُرے اخلاق کا اظہار اس سے ہوتا ہے اور یہی قابل مذمت افعال کا سبب بنتا ہے اور ان کی دو قسمیں ہیں اول معاصی یعنی گناہوں کا سرزد ہونا اور دوسرے بُرے اخلاق، مثلاً تکبر، حسد، بخل غصہ، کینہ اور دوسرے وہ افعال جو شریعت اور عقل دونوں کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔ پس ان اوصاف کو ریاضت کے ذریعہ اپنے آپ سے اسی طرح دفع کیا جاتا ہے جیسا کہ معاصی کو توبہ کے ذریعہ دور کیا جاتا ہے۔ معاصی یعنی گناہ ظاہری اوصاف میں سے ہے اور یہ بُرے اخلاق باطنی اوصاف ہے اور ریاضت ظاہری افعال میں سے ہے لدر توبہ باطنی افعال میں سے ہے۔ چنانچہ باطن میں جو بُرے اوصاف پیدا ہوتے ہیں وہ ظاہری اچھے اوصاف کے ذریعہ پاک ہو جاتے ہیں اور جو بُرے افعال ظاہر میں ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ باطن کے پسندیدہ اوصاف کے ذریعہ پاک ہو جاتے ہیں۔

اور جس طرح جہان میں شیاطین، فرشتے، جنت اور دوزخ موجود ہیں اسی طرح انسانی جسم میں نفس اور روح دونوں لطائف میں سے ہیں، تاہم ان میں سے ایک "روح" تو

محلِ خیر ہے اور دوسرا "نفس" محل شر ہے جس طرح آنکھ محل نظر، کان محلِ شنوائی، زبان محلِ ذوق اور اسی طرح دوسرے محسوسات اور اوصاف جو آدمی کے جسم میں بطور ودیعت رکھے گئے ہیں۔ پس نفس کی مخالفت ہی تمام عبادات کی اصل اور تمام مجاہدات کا کمال ہے اور بندہ اس کے بغیر حق تعالیٰ کی طرف راہ نہیں پا سکتا کیونکہ نفس کی موافقت بندے کی ہلاکت اور اس کی مخالفت بندے کی نجات ہے۔ حق تعالیٰ نے نفس کی مخالفت کرنے کا حکم دیا ہے اور اُن لوگوں کی تعریف کی ہے جو اس کی مخالفت میں کوشاں رہتے ہیں۔ اور جو لوگ اس کی موافقت میں چلتے ہیں ان کی مذمت کی ہے حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ

وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى۔

اور جس نے نفس کو خواہشات سے روک کے رکھا پس جنت ہی اُس کا ٹھکانا ہے۔

اور نیز یہ بھی فرمایا ہے کہ

اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ۔

کیا ایسا نہیں کہ جب کبھی کوئی رسول ایسے احکام لایا جنہیں تمہارے نفس نہیں چاہتے تھے تو تم اکڑ گئے۔

اور حق تعالیٰ نے ہمیں حضرت یوسف صدیق علیہ السلام کی طرف سے خبر دی کہ

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ۔

میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتا کیونکہ نفس تو بلاشبہ برائی کا حکم دینے والا ہے۔ بجز اس کے کہ میرا پروردگار رحم کرے۔

اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

اِذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدٍ خَيْرًا بَصَّرَهٗ بِعُيُوْبِ نَفْسِهٖ۔

جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتے ہیں اُسے اُس کے نفس کے عیوب دکھا دیتے ہیں۔

اور آثار میں آیا ہے کہ حق تعالیٰ عز و جل نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی اور فرمایا کہ

يَا دَاوٗدُ عَادِ نَفْسَكَ فَاِنَّ وُدِّيْ فِيْ عَدَاوَتِهَا۔

اے داؤدؑ اپنے نفس کے ساتھ عداوت رکھ کیونکہ میری محبت نفس کی عداوت میں ہے۔

پس یہ تمام جو میں نے بیان کئے ہیں، اوصاف ہیں اور صفت کے لیے ایک موصوف ضروری ہے کہ جس کے ساتھ یہ قائم ہو کیوں کہ صفت بذات خود قائم نہیں ہوتی اور اس صفت کی پہچان پورے جسم کی شناخت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور جسم کی شناخت کا طریقہ یہ ہے کہ انسانیت کے اوصاف اور اس کے اسرار بیان کیے جائیں۔

انسانیت کی حقیقت میں لوگوں نے کلام کی ہے کہ انسانیت کس چیز کا نام ہے اور یہ کس چیز کے لیے سزاوار ہے؟ اور اس کا علم تمام متلاشیان حق کے لیے فرض ہے کہ جو کوئی اپنے آپ سے جاہل ہے وہ غیر کی حقیقت سے بہت زیادہ جاہل ہوگا۔ جب بندہ کو خداوند تعالیٰ کی معرفت کا مکلّف بنایا گیا ہے تو اُسے اپنی معرفت بھی حاصل ہونی چاہیے تاکہ اپنے حادث ہونے کی صحت سے حق تعالیٰ کے قدیم ہونے کو پہچان لے اور اپنی فنا سے حق تعالیٰ کی بقا کو معلوم کرلے۔ اور کتاب اللہ صراحت کے ساتھ بیان کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ سے جاہل ہونا ہی کافروں کی صفت بیان کی اور فرمایا ہے

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ إِبْرَاهِيْمَ إِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ۔ — اور ملتِ ابراہیمی سے وہی آدمی روگردانی کرسکتا ہے جو اپنی ذات سے جاہل ہو۔

اور مشائخ میں سے ایک بزرگ نے کہا ہے کہ

مَنْ جَهِلَ نَفْسَهٗ فَهُوَ بِالْغَيْرِ أَجْهَلُ — جو آدمی اپنی ذات سے جاہل ہو وہ غیر سے بہت زیادہ جاہل ہوتا ہے۔

اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ۔ — جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اُس نے اپنے رب کو پہچان لیا ہے۔

یعنی مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ بالفناء فقد عرف ربّهٗ بالبقاء ويقالُ من عرف نفسهٗ بِالذل فقد عرف ربّهٗ بالعز ويُقالُ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ بِالعبودية فقد — جس نے اپنے نفس کو فنا سے پہچان لیا اُس نے اپنے رب کو بقا سے پہچان لیا اور کہا جاتا ہے کہ جس نے اپنے آپ کو ذلت سے پہچان لیا اُس نے اپنے رب کو عزت سے پہچان اور بعضوں نے کہا کہ جس نے اپنی ذات کو عبودیت سے پہچان

عرف ربّہٗ بالربوبیّۃ۔ لیا اس نے اپنے رب کی ربوبیت کی معرفت حاصل کر لی۔

پس جو آدمی اپنے آپ کو نہیں پہچانتا وہ تمام چیزوں کی معرفت سے محروم رہتا ہے اور اس جگہ اس جملے سے مراد انسانیت کی معرفت ہے — اہلِ قبلہ میں سے بعض حضرات کا انسان کی حقیقت کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ انسان روح کے سوا کچھ نہیں، یہ جسم اس کے لیے زرہ اور ڈھانچہ ہے، اور اس کا مقام اور ٹھکانہ ہے تاکہ وہ طبیعتوں کے خلل سے محفوظ رہے اور حس اور عقل اس کی صفتیں ہیں — لیکن یہ قول باطل ہے اس لیے کہ جب اس جسم سے جان جدا ہو جاتی ہے اس وقت بھی اس کو انسان ہی کہتے ہیں اور یہ نام مردہ شخص سے اٹھا نہیں لیا جاتا۔ بلکہ جب اس میں جان ہوتی ہے تو اسے زندہ انسان کہتے ہیں اور جب بے جان ہو جاتا ہے تو انسانِ مردہ کہہ دیتے ہیں۔ اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ جان تو ایک حیوان میں بھی موجود ہوتی ہے لیکن اس کو انسان نہیں کہتے، اگر انسانیت کی علت صرف روح ہی ہے تو پھر تو جس جگہ بھی جان ہو اس پر انسانیت کا حکم موجود ہونا چاہیئے۔ پس اُن کے اس قول کے بطلان پر تو یہ دلیل قائم ہے۔ اور ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ نام روح اور جسم دونوں کے مجموعے پر واقع ہوتا ہے چنانچہ جب ان میں سے ایک، دوسرے سے جدا ہو جائے تو اسم انسان ساقط ہو جاتا ہے، جیساکہ گھوڑے پر جب کالا اور سفید دو رنگ اکٹھے ہو جائیں تو اس کو ابلق کہتے ہیں اور جب ایک رنگ دوسرے سے جدا ہو جائے تو ان میں سے ایک رنگ کو سیاہ اور دوسرے کو سفید کہتے ہیں

یہ قول بھی باطل ہے حق تعالیٰ کے اس قول کی وجہ سے کہ هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَكُنْ شَیْـًٔا مَّذْكُوْرًا انسان پر ایک زمانہ ایسا بھی آچکا ہے کہ اس کا ذکر تک نہ تھا اس آیت مبارکہ میں آدمی کی بے جان مٹی کو انسان کہا ہے جب کہ اس کے جسم کے ساتھ ابھی تک جان کا تعلق نہیں ہوا تھا۔ ایک اور گروہ کہتا ہے کہ انسان ایک ایسا جُزو ہے جس کی آگے تقسیم نہیں کی جا سکتی اور محل دل ہے کہ آدمی کے تمام اوصاف کی اصل وہی ہے لیکن یہ قول بھی محال ہے کیونکہ اگر کسی کو قتل کر دیا جائے اور دل اس سے نکال لیں

تو بھی انسانیت کا نام اُس سے گرتا نہیں اور بالاتفاق روح سے پہلے جسم انسانی میں دل موجود نہ تھا۔ اور مدعیانِ تصوف کے ایک گروہ کو اس کے معانی میں غلطی واقع ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کھانے پینے والی اور محل تغیر ذات انسان نہیں بلکہ وہ ایک سرِ الٰہی ہے اور یہ جسم اس کا لباس ہے اور وہ طبیعت کے امتزاج اور جسم و روح کے اتحاد میں ودلیعت کیا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تمام عقلمندوں، دیوانوں، کافروں فاسقوں اور جاہلوں کو بالاتفاق انسان ہی کہا جاتا ہے اور ان کے اندر اسرار خداوندی میں سے کوئی چیز بھی موجود نہیں۔ اور تمام تغیر پذیر اور کھانے پینے والے ہیں اور کسی شخص کے جسم اور وجود میں کوئی ایسے معنی نہیں جن کو انسان کہا جائے اور اس کے معدوم ہو جانے کے بعد بھی کوئی ایسے معنی نہیں جن کو انسان کہا جا سکے۔ اور خداوند عزوجلّ نے اُن معنوں کے بغیر جو بعض انسانوں میں نہیں پائے جاتے اُن تمام ماہیتوں کو جنہیں ہمارے وجود میں ترکیب دیا ہے، انسان کیا ہے جیسے کہ حق تعالیٰ کا قول ہے

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔

اور تحقیق ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔ پھر اُس کو ایک مضبوط قرار گاہ (رحم) میں نطفہ بنایا پھر ہم نے نطفہ خون بستہ بنایا، پس خون بستہ کو گوشت کا لوتھڑا بنایا پھر لوتھڑے کو ہڈیاں بنایا پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا، پھر اُسے اور ہی مخلوق یعنی مکمل انسان بنا دیا، پس اللہ برکتوں والا ہے سب سے اچھا پیدا کرنے والا ہے۔

پس خداوند تعالیٰ کے قول کے مطابق "کہ وہ سب سچوں سے زیادہ سچا ہے" پاک مٹی سے بننے والی یہ مخصوص صورت تمام تغیرات کے ساتھ انسان ہے جیسا کہ اہل سنّت کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ انسان نام ہے اس جاندار کا کہ اس کی صورت اس طرح موجود ہے کہ موت بھی اس نام کو اس سے نفی نہ کرے جب تک یہ صورتِ معہودہ ظاہر و باطن کے ساتھ موسوم ہو۔ صورتِ معہود سے مراد ظاہر میں تندرست اور بیمار ہونا اور باطن میں

مجنوں اور عقلمند سے موسوم ہوتا ہے، اور بالاتفاق جو انسان جتنا زیادہ صحیح ہے وہ اتنا ہی پیدائش میں زیادہ کامل ہے۔ پس جان لو کہ انسان کی ترکیب جن چیزوں سے مکمل ہوتی ہے وہ محقق صوفیہ کے نزدیک تین ہیں — ایک روح دوسری نفس اور تیسری جسم — اور ان میں سے ہر ایک کے لیے ایک صفت ہے جو اس کے ساتھ قائم ہے۔ روح کے لیے عقل — نفس کے لیے خواہش — اور جسم کے لیے حس، صفات ہیں — اور انسان تمام عالم کا نمونہ ہے، جب کہ عالم نام ہے دونوں جہانوں کا۔ اور دونوں جہانوں سے انسان میں نشان موجود ہے، چنانچہ پانی، مٹی، ہوا اور آگ اس جہان کی علامت ہیں اور اس کی ترکیب بلغم، خون، صفرا اور سودا سے ہوئی ہے، جب کہ اس جہان کا نشان جنت، دوزخ اور عرصات ہیں۔ پھر جان اپنی لطافت کی وجہ سے جنت، نفس اپنی آفت اور وحشت کی وجہ سے دوزخ اور جسم عرصات (میدان حشر) کی جگہ ہے — اور ان دونوں کا جمال، غضب اور باہمی اُنس سے ہے، پس بہشت اس کی خوشنودی کی تاثیر ہے اور دوزخ اُس کی ناراضی کا نتیجہ ہے اور اس کا نفس حق تعالیٰ سے حجاب اور گمراہی سے ہے۔ اور مومن قیامت میں جب تک دوزخ سے خلاصی پاکر بہشت میں نہیں پہنچے گا اور رویت کی حقیقت نہیں پائے گا اس وقت تک یقیناً قربِ الٰہی تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اسی طرح دنیا میں بندہ جب تک نفس سے نجات حاصل کر کے حق تک نہیں پہنچتا کہ جس کا اصل وہ روح ہے یقیناً قربت اور معرفت خداوندی تک نہیں پہنچ سکتا — پس جو بندہ دنیا میں اُس کو پہچان لے اور دوسروں سے اعراض کر لے اور شریعت کی راہ پر گامزن رہے وہ قیامت کے دن دوزخ اور پُل صراط کو نہ دیکھے گا۔ غرضیکہ مومن کی روح اس کو بہشت کی طرف بلانے والی ہے کیونکہ وہی دنیا میں بہشت کا نمونہ ہے اور مومن کا نفس اس کو دوزخ کی طرف دعوت دینے والا ہے کہ دنیا میں وہی دوزخ کا نمونہ ہے۔ اُس روح کے لیے تدبیر کرنے والی کامل عقل ہے جب کہ اس نفس کے لیے قائد و رہنما ناقص خواہش ہے۔ وہ ایک یعنی عقل کی تدبیر حق ہے اور یہ ایک یعنی خواہش کی تدبیر خطا ہے۔ پس درگاہِ خداوندی کے طالبوں

کو چاہیئے کہ وہ ہمیشہ اُس نفس کی مخالفت پر کمر بستہ رہیں تاکہ بخلاف اس کے روح اور عقل کی مدد کر سکیں جو سرِّ خداوندی کا مقام ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

فصل

مشائخ کے اقوال

باقی جو کچھ نفس کے بارے میں مشائخ نے فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

اشدّ الحجاب رُویتُ النفس وتدابیرها۔ — بندے کے لیے سخت ترین حجاب یہ ہے کہ وہ نفس کا اور اُس کی تدبیر کا لحاظ رکھے۔

اس لیے کہ اس کی متابعت حق تعالیٰ کی مخالفت ہے اور حق تعالیٰ کی مخالفت تمام حجابوں کی جڑ ہے۔

اور حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ

النفس صفة لا تَسْکُنُ اِلاّ بِالباطل۔ — نفس ایک ایسی صفت ہے جو صرف باطل سے ہی سکون پاتی ہے۔

یعنی وہ ہرگز راہ حق کو اختیار نہیں کرتا۔ حضرت محمد بن علی الترمذی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ

تریدان تعرف الحق مع بقاءِ نفسك فيك ونفسكَ لاتعرفها فكيف تعرف غيرها۔ — تو چاہتا ہے کہ حق تعالیٰ کی معرفت حاصل کرے اور تیرا نفس تیرے اندر موجود بھی ہو۔ حالانکہ تیرا نفس تو اپنے آپ کو بھی نہیں پہچانتا تو پھر اپنے غیر کو کیسے پہچانے گا

یعنی اپنے بقاء کی صورت میں نفس خود اپنے آپ سے حجاب ہے تو اسے مشاہدۂ حق کیسے حاصل ہوگا۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

اساس الکفر قیامك علی مراد نفسك۔ — تیرا اپنے نفس کی مراد پر قائم ہونا ہی کفر کی بنیاد ہے۔

اس لیے کہ نفس کو اسلام کے ساتھ کوئی مقارنت نہیں تو لا محالہ وہ اسلام سے اعراض کرنے میں کوشاں رہے گا۔ اور اسلام سے اعراض کرنے والا منکر ہوتا ہے اور منکر حق سے بیگانہ ہوتا ہے۔ اور حضرت ابو سلیمان دارانی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ

النفس خائنۃ مانعۃ وافضل الاعمال خلافھا۔ — نفس، امانت میں خیانت کرنے والا اور رضاء الٰہی کی جستجو سے روکنے والا ہے۔ اور اس کی مخالفت کرنا ہی افضل عمل ہے۔

اس لیے کہ امانت میں خیانت کرنا بیگانگی ہے اور رضاء الٰہی کا ترک کر دینا گمراہی ہے نفس کے بارے میں مشائخ کے اقوال اتنے زیادہ ہیں کہ اُن تمام کا احاطہ کرنا ممکن نہیں لہٰذا میں اپنے اصل مقصد کی طرف آتے ہوئے نفس کے مجاہدات کی صحت اور اس کی ریاضت سے متعلق مذہب سہلیہ بیان کرتا ہوں اور ساتھ ہی اس کی حقیقت کے بارے میں ان کا طریق ذکر کرتا ہوں۔

مجاہدہ نفس کا بیان

حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ — اور جو لوگ ہمارے بارے میں کوشش کرتے ہیں ہم اُن کو اپنے راستے کی رہنمائی فرما دیتے ہیں۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

المجاھد من جاھد نفسہ فِی اللّٰہِ — مجاہد وہ ہے جس نے اللہ کی راہ میں اپنے نفس سے جہاد کیا۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا ہے کہ

رجعنا من الجھاد الاصغر الی الجھاد الاکبر قیل یا رسول اللّٰہِ ما الجھاد الاکبر قال الا وھی مجاھدۃ النفس۔ — ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ کر آئے ہیں، عرض کیا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ بڑا جہاد کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا آگاہ رہو کہ وہ مجاہدۃ النفس ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدہ نفس کو جہاد پر فضیلت دی اس لیے کہ اس کی تکلیف

زیادہ ہے کیونکہ جہاد دشمن کو ہٹانا ہے اور مجاہدہ نفس کو مغلوب کرنا ہے۔ پس جان لو اللہ تعالیٰ تمہیں عزت دے کہ نفس کا مجاہدہ اور اس کو مغلوب کیے رکھنا بڑا ظاہر اور واضح ہے کہ ہر دین اور ملت کے لوگوں میں یہ پسندیدہ فعل ہے اور اہل طریقت اس کی رعایت رکھنے میں خاص ہیں۔ اہل طریقت کے عوام و خواص میں یہ عبارت مستعمل اور جاری ہے اور مشائخ کے اس معاملے میں کلمات اور رموز بہت سے ہیں۔ خصوصاً حضرت سہل بن عبداللہ تستری اس کی اصل میں بڑا غلو کرتے ہیں اور اُن کے لیے مجاہدات کے اندر براہین بھی بہت ہیں ـــ کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے آپ کو اس طرح کر رکھا تھا کہ پندرہ دن کے اندر صرف ایک بار کھانا کھاتے تھے اور اسی تھوڑی سی غذا پر ہی طویل عمر گزار دی۔ یوں تو تمام محققین نے مجاہدے کا اثبات کیا ہے اور اس کو مشاہدہ کے اسباب میں شمار کیا ہے لیکن حضرت سہل بن عبداللہ تستری نے تو اسے مشاہدۂ حق کی علت قرار دیا ہے اور طالب حق کے لیے اس میں بڑی تاثیر بیان کی ہے، اور آپ حصول مراد کی خاطر دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی پر فضیلت دیتے اور فرمایا کرتے تھے کہ آخرت کی زندگی تو اس دنیا کی زندگی کا ہی ثمرہ ہے کہ جب اس دنیا میں خدمت کرو گے تو آخرت میں قرب الٰہی حاصل کرو گے اور بغیر عمل کے اُس کی قربت حاصل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ حق تعالیٰ تک وصول کی علت بندے کا وہ مجاہدہ ہو جو وہ اُس کی توفیق سے کرتا ہے کہ

المشاهدات مواريث المجاهدات مشاہدۂ حق، مجاہدات کی میراث ہے۔

اور دوسرے مشائخ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ تک پہنچنے کی کوئی علت نہیں، کیونکہ جو کوئی بھی حق تعالیٰ تک پہنچا ہے وہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے پہنچا ہے اور اس کے فضل کا بندوں کے افعال کے ساتھ کیا کام ہے۔ پس مجاہدے نفس کی درستی کے لیے ہیں، قرب کی حقیقت کے لیے نہیں، اس لیے کہ مجاہدے کا رجوع بندے کی طرف ہوتا ہے جب کہ مشاہدے کا تعلق حق تعالیٰ کے ساتھ ہے، پس محال ہے کہ یہ مجاہدہ، مشاہدے کے لیے علت بن سکے یا مشاہدہ اس مجاہدے کے لیے آلہ قرار پائے۔ حضرت سہلؒ کی دلیل حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا یعنی جو کوئی مجاہدہ

کرتا ہے مشاہدہ پالیتا ہے، اور نیز تمام انبیاء کی بعثت، شریعت کا اثبات، کتابوں کا نزول اور تکلیف کے تمام احکام مجاہدہ ہی ہیں۔ اگر مجاہدہ، مشاہدہ کے لیے علّت نہ ہوتا تو ان تمام کا حکم باطل ہو جاتا۔ نیز دنیا و آخرت کے تمام احوال حکمتوں اور علّتوں کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اگر علتوں کی نفی کر دیں تو شریعت اور رسم تمام اُٹھ جائیں، پھر نہ اصل میں تکلیف کا اثبات درست ہوگا اور نہ ہی فرع میں۔ کھانا پیٹ بھرنے کے لیے اور کپڑا پہننا سردی ہٹانے کے لیے علت ہے، اور یہ علّت کی نفی تو تمام امور کو معطل کر دینے کا موجب ہے، پس افعال میں اسباب کا لحاظ رکھنا توحید ہے اور ان کا رد کر دینا تمام امور کو معطل کر دینا ہے، اور مشاہدہ کے اندر اس بات کی دلیلیں موجود ہیں اور مشاہدہ کا انکار تو واضح مکابرہ ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ ایک سرکش گھوڑے کو ریاضت کے ذریعہ حیوانی صفات سے انسانی صفات کی طرف لے آتے ہیں اور اس کے اندر حیوانی صفات کو بدل دیتے ہیں یہاں تک کہ وہ زمین سے چابک کو اٹھا کر اپنے مالک کو دے دیتا ہے اور گیند کو اپنے ہاتھ سے چکر دے دیتا ہے اور اسی طرح بے عقل عجمی لڑکے کو ریاضت کے ذریعہ عربی زبان سکھلا دیتے ہیں اور اس طرح اس کا طبعی نطق اس کے اندر تبدیل کر دیتے ہیں۔ اور ایک وحشی جانور کو ریاضت کے ذریعہ اس درجہ پر پہنچا دیتے ہیں کہ جب اُس کو کھولتے ہیں تو وہ چلا جاتا ہے لیکن پھر جب آواز دیتے ہیں تو لوٹ آتا ہے اور قید کی تکلیف اس کو آزادی اور چھوٹ جانے سے زیادہ عزیز ہو جاتی ہے اور ایک ناپاک کُتّے کو ریاضت کے ذریعہ اس مقام پر پہنچا دیتے ہیں کہ اس کا مارا ہوا شکار حلال ہو جاتا ہے جب کہ مجاہدہ اور ریاضت حاصل نہ کرنے والے آدمی کا مارا ہوا بھی حرام ہو جاتا ہے، پس تمام شریعت اور رسم کا مدار مجاہدے پر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو قرب حق، عاقبت کے مقصود و امن کے حصول اور معصومیت کے متحقق ہونے کے باوجود طویل وقت تک بھوکا رہنے، مسلسل روزے رکھنے اور راتوں کو بیدار رہنے کی صورت میں اس قدر مجاہدے کیے کہ آپ کو حق تعالیٰ کا حکم آیا کہ اے محمد

طٰهٰ مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ ۔ ہم نے آپ پر قرآن اس لیے تو نازل نہیں کیا کہ آپ مشقت

لِتَشْقٰی۔ برداشت کریں۔

حتیٰ کہ اپنے آپ کو ہلاک کر لیں، اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی کی تعمیر کے دوران خود اینٹیں اٹھاتے تھے اور میں دیکھتا تھا کہ آپ تکلیف برداشت کر رہے ہیں تو میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ اینٹیں مجھے دیں کہ آپ کی جگہ میں یہ کام سرانجام دوں، آپ نے فرمایا

یَا اَبَا هُرَیْرَةَ خُذْ غَیْرَهَا فَاِنَّهُ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْاٰخِرَةِ۔ — اے ابوہریرہ تم دوسری اینٹیں اٹھا لو کیوں کہ اچھی زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔

یعنی آرام کا مقام تو آخرت ہے اور یہ دنیا رنج و مشقت اٹھانے کا مقام ہے —

حضرت حیان بن خارجہ بھی روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا کہ غزوے کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا

اِبْدَأْ بِنَفْسِكَ فَجَاهِدْهَا وَابْدَأْ بِنَفْسِكَ فَاغْزُهَا فَاِنَّكَ اِنْ قُتِلْتَ فَارًّا بَعَثَكَ اللّٰهُ فَارًّا وَاِنْ قُتِلْتَ مُرَائِیًا بَعَثَكَ اللّٰهُ مُرَائِیًا وَاِنْ قُتِلْتَ صَابِرًا مُحْتَسِبًا بَعَثَكَ اللّٰهُ صَابِرًا مُحْتَسِبًا۔ — جہاد کی ابتدا اپنے نفس سے کر اور غزوہ کی ابتدا بھی اپنے نفس سے کر کہ اگر تو بھاگتا ہوا قتل کیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تجھے بھاگتا ہوا ہی اٹھائیں گے اور اگر تو ریاکاری کی حالت میں مقتول ہوا تو تجھے اللہ تعالیٰ ریاکار ہی اٹھائیں گے اور اگر ثواب کی نیت سے صبر کرتے ہوئے تو مقتول ہوا تو اللہ تعالیٰ تمہیں صبر کرنے والا اور ثواب کی نیت کرنے والا ہی اٹھائیں گے۔

پس معانی کے بیان میں جس قدر عبارت کی ترکیب و تالیف کا اثر ہوتا ہے اصول معانی کے حصول کے لیے بھی اسی قدر مجاہدات کی تالیف و ترکیب کا اثر ہوتا ہے۔ جس طرح کوئی بیان، عبارت اور اس کی تالیف کے بغیر درست نہیں ہوتا اسی طرح مجاہدہ اور اس کی ترکیب کے بغیر وصول الی اللہ درست نہیں ہوتا۔ اور جو کوئی مجاہدہ کے بغیر حق تعالیٰ تک پہنچنے کا دعویٰ کرے وہ خطاکار ہے اس لیے کہ جہان اور اس کے حادث ہونے کا ثابت کرنا اس کے پیدا کرنے والے کی معرفت کے لیے دلیل ہے اسی طرح

نفس اور مجاہدے کی معرفت بھی وصول الی اللہ کی دلیل ہے، اور دوسرے گروہ کی دلیل یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ تفسیر میں مقدم و مؤخر ہے چنانچہ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا یہ تفسیر کے اعتبار سے یوں ہے کہ

وَالَّذِيْنَ هَدَيْنَاهُمْ سُبُلَنَا جَاهَدُوْا فِيْنَا۔ — کہ جن کو ہم نے اپنے راستے کی ہدایت فرمائی ہے وہ لوگ ہمارے بارے میں کوشش کرتے ہیں۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ

لَنْ يَنْجُوَ احدكم بعمله قيل وَلا انت يا رسول الله قال وَلا اَنَا اِلَّا ان يتغمدنِى الله برحمته۔ — تم میں سے کوئی شخص بھی صرف اپنے عمل کے سبب نجات نہیں پائے گا، عرض کیا گیا یا رسول اللہ! کیا آپ بھی؟ تو آپؐ نے فرمایا ہاں میں بھی نجات نہیں پاسکوں گا سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت کے ساتھ ڈھانپ لے۔

پس مجاہدہ بندے کا اپنا فعل ہے اور یہ محال ہے کہ اس کا اپنا فعل اس کی اپنی ہی نجات کے لیے کافی ہو جائے پس بندے کی نجات اور خلاصی حق تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ متعلق ہے نہ کہ مجاہدہ کے ساتھ۔ اسی لیے تو حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا۔ — پس اللہ تعالیٰ جس کو ہدایت دینے کا ارادہ فرمالیں تو اس کے سینے کو اسلام کے لیے کھول دیتے ہیں اور جس کو گمراہ کرنا چاہیں تو اس کا سینہ تنگ اور سخت کر دیتے ہیں۔

اور نیز فرمایا ہے کہ

تُؤْتِى الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ۔ — اے اللہ تو جس کو چاہتا ہے بادشاہی دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے بادشاہی چھین لیتا ہے۔

تمام اہل عالم کا مکلف ہونا خود اُن کی اپنی حیثیت کی نفی کرتا ہے کہ اگر محض مجاہدہ وصول حق کے لیے علت ہوتا تو ابلیس کبھی مردود نہ ہوتا اور اگر مجاہدے کا ترک راندہ اور مردود ہونے کی علت ہوتا تو حضرت آدم علیہ السلام ہرگز مقبول اور برگزیدہ نہ بنتے۔ پس معلوم ہوا کہ مجاہدے کی کثرت زیادہ کارآمد نہیں بلکہ حق تعالیٰ کی عنایت کی سبقت زیادہ

کارآمد ہے، اور جو کوئی زیادہ مجاہدوں میں مصروف رہے وہ حق تعالیٰ کے مواخذہ سے زیادہ محفوظ نہیں بلکہ جس کو حق تعالیٰ کی زیادہ عنایت نصیب ہو وہ ہی حق تعالیٰ سے زیادہ نزدیک ہوتا ہے، چنانچہ کوئی تو عبادت خانہ میں عبادت کرتا ہوا بھی حق تعالیٰ سے دور ہے اور کوئی خرابات کے اندر گناہوں میں مصروف بھی انجامِ کار کسی وقت گناہوں سے تائب ہو کر، حق تعالیٰ سے نزدیک ہو سکتا ہے، اور تمام معانی سے اشرف ایمان ہے، ایک لڑکا جو ابھی احکام کا مکلف نہیں اور اسی طرح دیوانوں کے لیے بھی مومن کہنا ٹھیک ہے۔ پس جب زیادہ شرف والی حالت یعنی ایمان کے لیے بھی مجاہدہ علّت نہیں ہے تو جو حالتیں اس سے کم درجہ کی ہیں وہ بھی علّت کی محتاج نہ ہوں گی۔ اور میں علی بن عثمان الجلابی کہتا ہوں کہ یہ صرف لفظی اختلاف ہے معنی میں کوئی اختلاف نہیں کیوں کہ ایک کہتا ہے کہ

مَنْ طَلَبَ وَجَدَ۔

جس نے کوشش کی اُس نے پالیا۔

اور دوسرا یہ کہتا ہے کہ

مَنْ وَجَدَ طَلَبَ۔

جس نے پالیا اُس نے کوشش کی۔

لہٰذا پالینے کا سبب طلب کرنا اور طلب کرنے کا سبب پالینا ہوا۔ وہ ایک تو اس لیے مجاہدہ کرتا ہے تاکہ مشاہدہ حاصل کرلے اور یہ دوسرا اس لیے مشاہدہ کرتا ہے تاکہ مجاہدہ پالے۔ اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ مشاہدے کے اندر مجاہدے کا درجہ وہی ہے جو اطاعت خداوندی میں توفیق الٰہی کا ہے اور توفیق تو حق عزّ و جلّ کی عطا ہے پس جب اطاعت کے حصول کی طلب توفیق الٰہی کے بغیر محال ہے تو توفیق بھی اطاعت کے بغیر محال ہی ہے اسی طرح جیسے مشاہدے کے بغیر مجاہدہ موجود نہیں ہوتا، مجاہدے کے بغیر مشاہدہ بھی محال ہے، پس جمال خداوندی کی شعاع آتی ہے تاکہ بندے کو مجاہدہ کی طرف رہنمائی کرے۔ لہٰذا جب وجودِ مجاہدہ کی علّت جمالِ خداوندی کی وہ روشنی ہے تو گویا ہدایت، مجاہدے سے متقدم ہوگی۔ باقی جو کچھ حضرت سہلؒ اور اُن کے ساتھی بطور دلیل پیش کرتے ہیں کہ جو شخص مجاہدے کا اثبات نہیں کرتا وہ تمام انبیاء کے ورود

تمام آسمانی کتابوں اور شریعتوں کا منکر ہونا ہے کیونکہ انسان کے مکلّف ہونے کا مدار تو مجاہدے پر ہے۔ لیکن اس سے بہتر یہ ہے کہ مکلف ہونے کا مدار حق تعالیٰ کی ہدایت پر سمجھا جائے کہ مجاہدات اثبات صحت کے لیے ہیں، حقیقتِ وصول الی اللہ کے لیے نہیں۔ جیسا کہ خداوند عزّ وجلّ فرماتے ہیں کہ

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَا اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ۔

اور اگر ہم اُن پر فرشتوں کو نازل کرتے اور مردے اُن کے ساتھ گفتگو کرتے اور اُن کے سامنے آنے والی ہر چیز کو اُن کے لیے زندہ کر دیتے تو بھی ایمان قبول نہ کرتے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہتے، لیکن اُن کے اکثر تو جاہل ہیں۔

یعنی اس لیے کہ ایمان کی علّت ہماری مشیت ہے، اُن کے مجاہدے اور دلائل کا دیکھنا ایمان کی علّت نہیں۔ اور نیز ارشاد فرمایا ہے

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔

جو لوگ کافر ہیں، برابر ہے کہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

یعنی کافروں کے لیے صحبت کا ظاہر کرنا، دلائل کا پیش کرنا، قیامت کی سختیوں سے ڈرانا اور ان کا ترک دونوں مساوی ہیں وہ ایمان نہ لائیں گے کیونکہ ہم نے ان کو اہلِ ایمان میں شمار نہیں کیا ہے اور ان کی ازلی بدبختی کے سبب اُن کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے، پس انبیاء کا ورود کتابوں کا نازل کرنا اور شریعتوں کا ثبوت حق تعالیٰ تک پہنچنے کے اسباب تو ہیں علّت نہیں ہیں۔ اس لیے کہ مکلف ہونے میں تو حضرت ابوبکرؓ بھی اسی طرح ہیں جس طرح ابوجہل۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ تو عدل اور فضل الٰہی سے حق تعالیٰ تک پہنچ گئے اور ابوجہل اللہ تعالیٰ کے فضل سے محروم ہونے کی وجہ سے رہ گیا۔ پس وصول الی اللہ کی علّت عینِ وصول ہے نہ کہ طلب وصول۔ کیوں کہ اگر طالب اور مطلوب دونوں ایک ہی ہوں تو طالب ہی واجد (پانے والا) ہوگا اور جب وہ واجد ہوگا تو طالب نہ ہوگا کیونکہ جو حق تعالیٰ تک پہنچا ہوا ہے وہ آرام میں ہوتا ہے جب کہ طالب پر آرام درست نہیں

ہوتا۔ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

مَنِ اسْتَوٰی یَوْمَاہُ فَھُوَ مَغْبُوْنٌ۔ جس کے دونوں دن برابر ہوں وہ نقصان زدہ ہوتا ہے۔

یعنی طالبان حق پر اگر دو دن برابر گزریں تو وہ نقصان زدہ ہیں کیونکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ اُس کا ہر دن پہلے دن سے بہتر ہو۔ اور یہ درجہ طالبان حق کا ہے۔ پھر حضور علیہ السلام نے فرمایا

اِسْتَقِیْمُوْا وَلَنْ تُحْصُوْا۔ استقامت اختیار کرو اور ہرگز اُبھارے نہ جاؤ!

پس مشائخ نے مجاہدہ کو سبب کہا ہے اور سبب تو اثبات حجت کو ثابت کرنا اور حقیقتِ خداوندی تک وصول کی نفی کرتا ہے۔ اور باقی جو کہتے ہیں کہ مجاہدہ کے ذریعہ گھوڑے کی صفت میں تبدیلی کر دی جاتی ہے تو جاننا چاہیئے کہ گھوڑے میں ایک صفت پوشیدہ ہوتی ہے کہ مجاہدہ اس کے اظہار کے لیے سبب ہے۔ جب تک گھوڑا ریاضت حاصل نہیں کرتا وہ صفت ظاہر نہیں ہوتی۔ اور گدھے کے اندر چونکہ یہ صفت موجود نہیں ہوتی وہ ہرگز گھوڑا نہیں بن سکتا۔ نہ گھوڑے کو مجاہدہ کے ذریعہ گدھا بنا سکتے ہیں اور نہ ہی گدھے کو ریاضت کے ذریعہ گھوڑا بنا سکتے ہیں کیونکہ یہ ذات کا تبدیل کرنا ہے، پس جس طرح کسی چیز کی ذات کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا اسی طرح اس چیز کا حق تعالیٰ کی جناب کے لیے ثابت کرنا بھی محال ہے۔ اُس پیر یعنی حضرت سہل تستریؒ پر اس طرح کے مجاہدے کی کیفیت گزری تھی کہ وہ اس سے آزاد ہوتے تھے اور اس کے بیان کرتے وقت درحقیقت اُس کی عبارت سے منقطع ہوتے تھے، اُن لوگوں کی طرح نہیں جنہوں نے بغیر معاملہ کے اُن کی عبارت کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔ اور جو کچھ معاملہ مجاہدات میں پیش آتا ہے اُس کو پوری طرح عبارت میں بیان کرنا محال ہے۔ بہر حال اہلِ طریقت کے نزدیک مجاہدہ اور ریاضت بالاتفاق ثابت ہیں۔ لیکن اُن کو وصول الی اللہ کی علت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پس جو شخص مجاہدہ کی نفی کرتا ہے اُس کی مراد عین مجاہدہ کی نفی نہیں بلکہ مجاہدے کو وصول الی اللہ کا مدار سمجھنے اور اپنے افعال پر بارگاہِ اقدس میں مغرور نہ ہونے کی نفی ہے۔ اس لیے کہ مجاہدہ بندے کا فعل ہوتا ہے اور مشاہدہ نعمت الٰہی۔

جب تک خدا تعالیٰ کا فضل شاملِ حال نہ ہو بندے کا فعل کسی قیمت کا نہیں ہوتا

میری جان! کیا تیرا دل خود گرفت محسوس نہیں کرتا کہ اپنے آپ کی تو اتنی آرائش کرتا ہے اور حق تعالیٰ کے فضل کو نہیں دیکھتا کہ اپنے فعل کی اتنی تعریفیں کرتا ہے۔ پس دوستانِ حق کا مجاہدہ تو محض فعلِ حق ہوتا ہے کہ اُن کا اپنا اختیار اس میں موجود نہیں ہوتا۔ اور یہ محبت الٰہی میں مقہور اور گھل جاتا ہے۔ اور یوں گھلنا محض اللہ تعالیٰ کی نوازش ہے اور جاہلوں کا مجاہدہ، اُن کا اپنا فعل ہوتا ہے اور اس میں ان کے اپنے اختیار کا دخل ہوتا ہے اور وہ تشویش اور پراگندگی ہوتی ہے اور جو دل پہلے سے ہی پراگندہ ہو وہ آفت سے زیادہ پراگندہ ہو جاتا ہے۔ پس جہاں تک ہو سکے اپنے کسی فعل کا تذکرہ نہ کرو اور کسی معاملہ میں بھی نفس کی متابعت نہ کرو کیونکہ تمہاری ہستی کا وجود ہی تمہارے لیے حجاب ہے اگر تم کسی ایک فعل سے محجوب ہو گے تو کسی دوسرے فعل سے وہ حجاب اٹھ جائے گا۔ اور اگر تمہارا پورا وجود ہی تمہارے لیے حجاب ہے تو جب تک تم کلی طور فنا نہیں ہو گے بقا کے قابل نہیں بنو گے۔

لِاَنَّ النفس کلب باغ وجلد الکلب لایطھر الا بالدّباغ۔ — کیوں کہ نفس ایک سرکش کُتا ہے اور کتے کی کھال دباغت کے بغیر پاک نہیں ہوتی۔

حکایات میں مشہور ہے کہ حضرت حسین بن منصورؒ نے کوفہ میں حضرت محمد بن الحسین علویؒ کے مکان پر قیام فرما رکھا تھا کہ حضرت ابراہیم خواصی بھی کوفہ میں تشریف لائے، انہوں نے جب آپ کی تشریف آوری کی خبر سنی تو اُن کے پاس آئے۔ حضرت حسین بن منصورؒ نے دریافت کیا کہ اے ابراہیم! چالیس سال سے جو آپ نے اس طریق کے ساتھ تعلق قائم کر رکھا ہے اس سے آپ کو کیا چیز حاصل ہوئی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس سے مجھے توکل حاصل ہوا ہے۔ تو حضرت حسینؒ نے کہا

ضَیَّعْتَ عمرک فی عمران باطنک فاین الفناء فی التوحید۔ — آپ نے اپنے باطن کی تعمیر میں اپنی عمر کو ضائع کر دیا پس فنا فی التوحید کہاں ہے؟

یعنی توکل تو اپنے معاملات کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دینے اور اپنے باطن کی درستی کے لیے

اس پر اعتماد کرنے کا نام ہے لیکن جب کسی نے باطن کے علاج میں ایک عمر صرف کر دی ہو تو اُسے ظاہری معاملات کی درستی کے لیے ایک اور عمر کی ضرورت ہو گی تاکہ اُسے خرچ کر سکے اور یوں دونوں عمریں ضائع ہو جائیں گے۔ لیکن ابھی تک حق تعالیٰ کا اس تک کوئی اثر نہیں پہنچا ہو گا ــــ حضرت شیخ ابوعلی سیاہ مروزیؒ سے حکایت بیان کرتے ہیں کہ میں نے نفس کو خود اپنی ہی شکل و صورت میں دیکھا کہ ایک آدمی نے اُسے بالوں سے پکڑا رکھا ہے اور اس طرح اُسے میری گرفت میں دے دیا۔ میں نے اُسے ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا اور اُس کو ہلاک کرنے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن وہ مجھے کہنے لگا۔ اے بوعلی! مجھے قتل کرنے کی تکلیف نہ کر کیونکہ میں خدا تعالیٰ کا لشکر ہوں تم مجھے گم نہیں کر سکتے ــــ اور حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے ایک بڑے بزرگ ساتھی حضرت محمد بن علیان نسویؒ بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے ابتدائی حالات میں ہی نفس کی مصیبتوں سے آگاہ ہو گیا تھا اور اس کی کمین گاہوں اور چالوں کو جانتے ہوئے اُس کی دشمنی میں لگا رہتا تھا۔ ایک روز لومڑی کے بچے جتنی ایک چیز میرے گلے سے باہر نکلی تو حق تعالیٰ نے مجھے اس سے روشناس کر دیا اور میں نے جان لیا کہ یہ نفس ہے چنانچہ میں نے اُسے پاؤں تلے روندنا شروع کر دیا لیکن میں جو ٹھوکر بھی اُسے لگاتا وہ پہلے سے بڑا ہو جاتا۔ میں نے اُسے کہا" اے فلانے! تکلیف دینے اور زخم لگانے سے دوسری تمام چیزیں ہلاک ہوتی ہیں۔ لیکن تو کس طرح بڑا ہوتا جا رہا ہے؟" وہ کہنے لگا میری پیدائش ہی اُلٹی ہے کہ جو کام دوسری چیزوں کے لیے تکلیف دہ ہو وہ میرے لیے باعثِ راحت ہوتا ہے، اور جو کام دوسروں کے لیے راحت بخش ہو وہ میرے لیے باعث رنج ہوتا ہے ــــ اور اپنے وقت کے امام حضرت شیخ ابوالعباس شقانیؒ فرماتے ہیں کہ ایک دن جب میں اپنے گھر میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک زرد رنگ کا کتا میرے بستر پر سویا ہوا ہے میں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ محلے کا کوئی کتا اندر آ گیا ہے اس کو نکالنے کا ارادہ کیا تو وہ میرے دامن کے نیچے گھس گیا اور غائب ہو گیا ــــ اور اس وقت کے قطب اور مدار علیہ حضرت شیخ ابوالقاسم گرگانی "اللہ تعالیٰ ان کو سلامت رکھے" نے اپنے ابتدائی حال کا حوالہ

دے کر فرمایا کہ میں نے نفس کو ایک سانپ کی شکل میں دیکھا ــــ اور ایک درویش فرماتے ہیں کہ "میں نے نفس کو ایک چوہے کی صورت میں دیکھا اور اس سے پوچھا کہ تو کون ہے؟" کہنے لگا میں غافل لوگوں کی ہلاکت ہوں کہ اُن کے لیے شر اور برائی کا داعی ہوں اور دوستانِ حق کی نجات ہوں کہ میں جس کا وجود ایک آفت ہے اگر ان کے ساتھ نہ ہوتا تو وہ اپنی پاکی پر مغرور اور اپنے افعال پر متکبر ہو جاتے کیوں کہ جب وہ اپنے دل کی طہارت، باطن کی پاکیزگی، ولایت کے نور اور اطاعت پر استقامت کو دیکھتے ہیں تو بڑائی کی خواہش اُن میں پیدا ہونے لگتی ہے لیکن پھر جب مجھے اپنے دونوں پہلوؤں کے درمیان دیکھتے ہیں تو تمام عیب ان سے پاک ہو جاتے ہیں۔

یہ تمام حکایات اس بات کی دلیل ہیں کہ نفس ایک ذات ہے صفت نہیں، اور اس کے لیے الگ ایک صفت ہے اور ہم اس کے اوصاف کو واضح طور پر دیکھتے رہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

اَعْدٰی عدوك نفسك الّتی بین جنبیك ۔ تیرے دشمنوں میں سے سب سے بڑا دشمن تیرا اپنا نفس ہے جو تیرے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے۔

پس جب اُس کی معرفت حاصل ہو جائے تو تم جان لینا کہ ریاضت کے ذریعہ اُس کو قابو میں لایا جا سکتا ہے تاہم اس کی ذات اور ماہیت کو فنا نہیں کیا جا سکتا۔ اور جب اُس کی اچھی طرح شناخت ہو جائے تو طالب اگر اس کا مالک بن کر اس پر قابو رکھے تو اس کے باقی رہنے میں بھی کوئی باک نہیں

لِاَنّ النفس کلبٌ نباحٌ وامساك الکلبِ بعد الریاضة مباحٌ ۔ کیونکہ نفس ایک بھونکنے والا کتا ہے اور کتے کو شکار کی ریاضت کے بعد رکھنا مباح ہے۔

پس نفس کے مجاہدات اوصافِ نفس کو فنا کرنے کے لیے ہیں عین نفس کے فنا کے لیے نہیں۔ اس معاملے میں مشائخ کے اقوال کا سلسلہ بڑا طویل ہے لیکن میں نے اس کتاب کی طوالت کے خوف سے اسی مقدار پر اکتفا کیا ہے۔ اور اب میں "ھویٰ" کی حقیقت اور شہوات کو ترک کرنے سے متعلق گفتگو کروں گا۔ انشاء اللہ عزوجل ــــ اور توفیق اللہ کی طرف سے ہی ہے۔

حقیقتِ ھویٰ

جان لو اللہ تعالیٰ تمہیں عزت نصیب کرے کہ صوفیہؒ کے ایک گروہ کے نزدیک "ہویٰ" نفس کے اوصاف سے عبارت ہے اور ایک دوسرے گروہ کے نزدیک طبیعت کے اس ارادے کا نام ہے جس کا متصرف اور مدبر نفس ہے جس طرح کہ عقل عبارت ہے روح کے ارادے سے۔ اور جس روح کو جسم کے اندر عقل سے قوت حاصل نہ ہو وہ ناقص ہوتی ہے اسی طرح جس نفس کو "ہویٰ" سے قوت حاصل نہ ہو وہ بھی ناقص ہوتا ہے۔ پس روح کا ناقص ہونا عین قربت حق ہے ۔ اور بندہ کو ہمیشہ دو دعوتیں ملتی رہتی ہیں ایک دعوت عقل کی طرف سے اور دوسری ہوی کی طرف سے۔ البتہ جو آدمی عقل کی دعوت کا اتباع کرتا ہے وہ ایمان تک رسائی حاصل کر لیتا ہے لیکن جو شخص ہویٰ کی دعوت پر لبیک کہتا ہے وہ گمراہی اور کفر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پس ہوی حجاب اور گمراہ کن ہے۔ مریدوں کو اس سے بلند رہنا اور طالبوں کو اس سے اعراض کرنا چاہیئے۔ اور بندہ اس کی مخالفت کرنے پر مامور ہے اور اس کا اتباع کرنے سے روکا گیا ہے"۔

لِاَنَّ مَنْ رَكِبَهَا هَلَكَ وَمَنْ خَالفها ملك۔ — کیوں کہ جو اس پر سوار ہوا وہ تباہ ہو گیا اور جس نے اس کی مخالفت کی فرشتہ صفت ہو گیا۔

جیسا کہ حق عزوجلّ نے ارشاد فرمایا ہے کہ

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى۔ — اور باقی جو اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے ڈر گیا اور اپنے نفس کو خواہش سے روک لیا پس اس کا ٹھکانا جنت ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

اخوف ما اخاف علی امتی اتباع الهوٰی وطول الامل۔ — جس چیز سے میں اپنی امت کے بارے میں زیادہ ڈرتا ہوں وہ خواہشات کی پیروی اور لمبی اُمید ہے۔

اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس ارشاد

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰاهُ۔ — کیا تم نے دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا لیا ہے۔

کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کرتے ہیں

اَیْ اِتَّخَذَ ہَواہُ اِلٰھًا معبودًا۔ یعنی خواہش کو اپنا الٰہ اور معبود بنا رکھا ہے

اُس آدمی کے لیے ہلاکت ہے جس نے حق تعالیٰ کی بجائے اپنی خواہشات کو معبود بنا رکھا ہے اور شب و روز کی تمام جد و جہد نفس کو خوش کرنے کے لیے صرف کرتا ہے۔

اور تمام خواہشات کی دو قسمیں ہیں۔ ایک لذت و شہوت کی خواہش ۔ اور دوسری مخلوق میں مرتبہ اور ریاست کی خواہش۔ لذت و شہوت کی خواہشات کا اتباع کرنے والا شراب خانوں میں رہتا ہے اور مخلوق اس کے فتنوں سے محفوظ رہتی ہے لیکن جو شخص جاہ طلبی اور ریاست کی خواہش کا تابع ہو وہ عبادت گاہوں اور خانقاہوں میں رہتے ہوئے مخلوق کے لیے باعثِ فتنہ ہے کہ وہ خود بھی گمراہ ہوتا ہے اور لوگوں کو بھی گمراہی کی طرف دعوت دیتا ہے۔ پس ہم خواہشات کی پیروی سے خدا تعالیٰ کی پناہ گاہ کے طلبگار ہیں۔ پس جس کی تمام حرکات خواہشات نفس کے تابع ہوں اور وہ نفس کی پیروی پر مطمئن ہو وہ اگرچہ مسجد میں تمہارے ساتھ موجود رہتا ہے پھر بھی حق تعالیٰ سے دور ہوتا ہے۔ لیکن جو شخص خواہشات نفس سے بیزار ہو اور اس کی پیروی سے گریزاں ہو وہ بت کدے میں ہی کیوں نہ ہو حق تعالیٰ سے نزدیک ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم خواصؒ فرماتے ہیں "ایک دفعہ میں نے سنا کہ روم کے اندر ایک پادری ہے جو ستر سال سے رہبانیت اختیار کئے ہوئے ایک کلیسا میں بیٹھا ہے، میں بڑا حیران ہوا کہ رہبانیت کی شرط تو چالیس سال ہے یہ شخص کس مشرب پر عمل کرتے ہوئے ستر سال تک کلیسا میں آرام سے بیٹھا ہوا ہے، چنانچہ میں نے اس سے ملاقات کا ارادہ کیا۔ جب میں اس کے کلیسا کے نزدیک پہنچا تو اس نے دریچہ کھول کر مجھے کہا " اے ابراہیم! میں جانتا ہوں کہ تم کس لیے آئے ہو (تو سنو!) میں یہاں ستر سال سے رہبانیت کے لیے نہیں بیٹھا ہوا بلکہ میرے اندر خواہشات سے بھرا ہوا ایک کتا موجود ہے۔ میں اس کلیسا میں بیٹھا اس کی نگرانی کر رہا ہوں اور اُس کا شر مخلوق سے روکے ہوئے ہوں۔ باقی میں ویسا نہیں ہوا جیسا تم نے گمان کیا تھا۔ ابراہیمؒ فرماتے ہیں کہ جب میں نے اس سے یہ بات سنی تو میں نے

کہا" باری خدایا! تو اس پر قادر ہے کہ گمراہی میں بھی کسی آدمی کو سیدھا راستہ دکھا دے اور نیکی کے راستے پر گامزن کر دے"، وہ پادری کہنے لگا "اے ابراہیم! کب تک لوگوں کو تلاش کرتے رہو گے۔ جاؤ! اور اپنے آپ کی جستجو کرو! اور جب اپنے آپ کو پالو تو پھر پاسبانی کرو کیونکہ خواہش نفس روزانہ معبودیت کے تین سو ساٹھ طرح کے لباس پہنتی اور بندے کو گمراہی کی طرف دعوت دیتی ہے ۔۔۔ بہر حال شیطان کو بندے کے دل اور باطن میں گھسنے کی اس وقت تک مجال نہیں ہوتی جب تک اُس کے دل میں نافرمانی کی خواہش پیدا نہ ہو جائے، جب اس خواہش گناہ کا مادہ نفس میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس وقت شیطان اس کو پکڑ لیتا اور اس کو آراستہ کر کے بندے کے دل کے سامنے پیش کر دیتا ہے اور اس حالت کو وسوسہ کہتے ہیں۔ پس گناہ کی ابتداء خواہش نفس سے ہوتی ہے اور ابتداء کرنے والا زیادہ ظالم ہوتا ہے۔ اور حق تعالیٰ کے اُس فرمان کا یہی معنی ہے کہ جب شیطان نے کہا کہ "میں تمام انسانوں کو راہِ راست سے ہٹا دوں گا"، تو حق تعالیٰ نے ابلیس کو فرمایا تھا کہ

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطَانٌ۔ بے شک میرے خاص بندہ پر تیرا کوئی بس نہ چل سکے گا۔

پس در حقیقت بندہ کا نفس اور خواہش ہی شیطان ہیں۔ اسی وجہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

وَمَا مِنْ اَحَدٍ اِلَّا وَقَدْ غلبه شیطانهٗ اِلَّا عمر فانه غَلَبَ شیطانه۔ کوئی آدمی ایسا نہیں جس پر اُس کا شیطان (خواہش نفس) غلبہ حاصل نہ کر لے سوائے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے کہ وہ اپنے شیطان پر غالب ہیں۔

پس خواہشات حضرت آدم کی سرشت میں داخل اور بنی آدم کی جان کی راحت ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

اَلْهَوٰی وَالشّهوة معجونة بطينة ابنِ آدم۔ خواہش اور شہوت ابن آدم کی سرشت میں ملا دی گئی ہیں۔

خواہشات کا ترک بندے کو امیر کرتا ہے اور خواہشات کا ارتکاب امیر کو اسیر بنا دیتا ہے جیسا کہ امیر ہوتے ہوئے جب زلیخا نے خواہش کا ارتکاب کیا تو اسیر بن گئی اور حضرت یوسف ع

علیہ السلام باوجودیکہ اسیر تھے لیکن خواہش کو ترک کر دیا تو امیر بن گئے۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ

مَا الْوَصْلُ۔ وصال حق کیا چیز ہے!

تو آپ نے فرمایا

ترک ارتکاب الھویٰ۔ خواہشات کا ارتکاب ترک کر دینے کا نام وصل حق ہے۔

جو آدمی وصلِ حق سے مشرف ہونا چاہے اُسے چاہیے کہ خواہشات نفس کی مخالفت کرے کہ بندہ خواہشات کی مخالفت سے بڑھ کر کسی بھی بڑی عبادت کے ذریعہ قرب خداوندی حاصل نہیں کر سکتا کیوں کہ آدمی کے لیے ایک پہاڑ کو اپنے ناخن سے کھودنا، نفس کی مخالفت سے زیادہ آسان ہے ـــــ اور حکایات میں میں نے پایا ہے کہ حضرت ذوالنون مصریؒ نے فرمایا کہ میں نے ایک شخص کو ہوا میں اڑتا ہوا دیکھا تو اس سے پوچھا کہ تم نے کس عمل کی بدولت یہ درجہ حاصل کیا ہے! وہ کہنے لگا "میں نے ہوا (خواہش) کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا ہے یہاں تک کہ ہوا میں پرواز کرنے لگا ہوں" ـــــ حضرت محمد بن فضل البلخیؒ سے متعلق آتا ہے کہ انہوں نے فرمایا "میں اس آدمی پر حیران ہوتا ہوں جو اپنی خواہش سے خانہ خدا کی طرف جاتا اور اس کی زیارت کرتا ہے، وہ اپنی خواہش کو پاؤں تلے کیوں نہیں روند دیتا کہ حق تعالیٰ تک پہنچ جائے اور اس کے دیدار سے مشرف ہو" باقی نفس کی سب سے زیادہ ظاہر صفت شہوت ہے، اور شہوت ایک کیفیت ہے جو آدمی کے تمام اجزاء میں پھیلی ہوئی ہے اور تمام حواس اُس کے کاموں میں مصروف ہیں۔ بندہ اِن سب کی حفاظت کا مکلف اور ان میں سے ہر ایک کے کام سے متعلق جوابدہ ہے۔ آنکھ کی شہوت، دیکھنا، کان کی شہوت سُننا، ناک کی شہوت سونگھنا، زبان کی شہوت بولنا، تالو کی شہوت چکھنا، جسم کی شہوت چھونا اور گھِسنا اور سینے کی شہوت سوچنا ہے۔ پس طالب کو اپنا نگران اور حاکم ہونا چاہیے اور دن رات اس کام میں لگے رہنا چاہیے کہ حواس میں پیدا ہونے والے خواہشات کے اسباب کو اپنے آپ سے دور کر دے اور خدا تعالیٰ سے امداد کا طلبگار رہے کہ وہ اس میں ایسی صفت پیدا کر دے کہ اس

کے باطن سے یہ خواہشات دفع ہو جائیں کیونکہ جو آدمی شہوت کے کسی حصے میں بھی مبتلا ہو جائے تمام معانی سے محجوب ہو جاتا ہے۔ پس بندہ اگر بتکلف اس کو اپنے آپ سے دفع کرے تو اس کی تکلیف طویل ہو جائے گی کیونکہ خواہشات کا وجود تو پے در پے ہوتا ہے اور اس کو حق تعالیٰ کے ہی سپرد کر دینا بہتر ہے تاکہ گوہر مقصود حاصل ہو جائے۔ اور حضرت ابو علی سیاہ مروزیؒ سے حکایت بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا "میں ایک دفعہ حمام میں گیا ہوا تھا اور سنت کے مطابق (زیرِ ناف) اُسترہ استعمال کر رہا تھا کہ میں نے اپنے آپ سے کہا" اے ابو علی سرچشمہ شہوات اور تجھے اتنی آفات میں مبتلا رکھنے والے اس عضو کو اپنے وجود سے الگ کر دے تاکہ تو شہوات سے بچا رہے"۔ میرے باطن سے آواز آئی کہ اے ابو علی! تو ہماری مِلک میں تصرف کرنا چاہتا ہے؟ حالانکہ جسم کی ساخت میں کوئی عضو دوسرے عضو سے زیادہ موزوں نہیں۔ ہمیں اپنی عزت کی قسم! اگر تو اس کو اپنے وجود سے جدا کر دے گا تو ہم تمہارے ہر بال میں سینکڑوں گنا شہوت اور خواہش پیدا کر دیں گے۔ اسی معنی میں کسی نے کہا ہے شعر

تبتغِي الاحسانَ دَعْ احسانَكَ　　　اُترك بخشیِ اللهِ ریحانَكَ

(تو نیکی کا متلاشی ہے تو احسان کو چھوڑ دے۔ اللہ تعالیٰ کے خوف سے اپنی راحتوں کو چھوڑ دے۔)

بندہ کو اپنے جسم کی خرابی میں تصرف کرنے کا کوئی اختیار نہیں البتہ اپنی کسی صفت کو حق تعالیٰ کی توفیق اور اُس کے حکم کی تعمیل کے ذریعہ تبدیل کر سکتا ہے، درحقیقت جب بندہ حق تعالیٰ کی تسلیم و رضا کا مرتبہ حاصل کرتا ہے تو اُسے حق تعالیٰ کی عصمت حاصل ہو جاتی ہے، اور بندہ مجاہدے کی بہ نسبت حق تعالیٰ کی تائید و عصمت کے ذریعہ تمام آفات سے زیادہ محفوظ رہ سکتا ہے

لان نفي الذباب بالمكنة　　　کیوں کہ ڈھانپنے والی چیز سے مکھیوں کو روکنا مگس ران

اَیْسَرُ عن نفيه بالمذبّة۔　　　کے ذریعہ ہٹاتے رہنے سے زیادہ آسان ہے۔

پس حق تعالیٰ کی عصمت تمام آفات کو زائل اور تمام برائیوں کو مٹانے والی ہے اور بندہ کو کسی صفت میں بھی حق تعالیٰ کے ساتھ مشارکت حاصل نہیں جیسا کہ اُس نے فرمایا ہے

کہ اُس کی ملک میں کسی کو تصرف کا اختیار نہیں۔ اور جب تک حق تعالیٰ کی حفاظت مقدر میں نہ ہو بندہ اپنی کوشش کی بنیاد پر کسی چیز سے رُک نہیں سکتا کیوں کہ اُس کی اپنی کوشش کوئی کوشش نہیں ہے کہ جب تک حق تعالیٰ کی کوشش بندہ کے شامل نصیب نہ ہو بندے کی اپنی کوشش سودمند نہیں ہو سکتی۔ تاہم محض کوشش سے اطاعت کی قوت ساقط ہو جاتی ہے کیونکہ انسان کی تمام کوششیں دو طرح کی ہوتی ہیں یا تو وہ کوشش کرتا ہے کہ حق تعالیٰ کی تقدیر کو اپنے آپ سے پھیر دے اور یا پھر خود تقدیر کے خلاف کسی چیز کی اپنی طرف نسبت کرتا ہے اور یہ دونوں صورتیں جائز نہیں کیونکہ نہ تو تقدیر جدوجہد کے ذریعہ تبدیل ہو سکتی ہے اور نہ ہی کوئی کام تقدیر کے بغیر وقوع پذیر ہوتا ہے — اور روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ حضرت شبلیؒ ایک دفعہ بیمار ہو گئے تو ایک طبیب آپ کے پاس آیا اور کہا کہ "آپ پرہیز کریں" آپ نے فرمایا "میں کس چیز سے پرہیز کروں! اُس چیز سے پرہیز کروں جو میرا رزق مقدر ہے یا اس چیز سے جو تقدیر میں میرا رزق ہی نہیں! اگر میں اپنے مقدر سے پرہیز کرنا بھی چاہوں تو ہرگز نہیں کر سکتا اور اگر مقدر کے علاوہ سے پرہیز کروں تو وہ تو خود ہی مجھے نہیں دیں گے پھر پرہیز کے کیا معنی! کیوں کہ مشاہدہ مجاہدہ سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس مسئلہ کو انشاء اللہ دوسری جگہ پر پوری احتیاط سے بیان کروں گا۔

فرقہ حکیمیہ

حکیمی حضرات، حضرت ابو عبداللہ محمد بن علی الحکیم الترمذی کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں۔ جو تمام علوم ظاہری و باطنی میں اپنے دور کے ائمہ میں سے تھے۔ آپ کی تصانیف بہت ہیں اور آپ کے کلام اور طریقہ کی بنیاد ولایت پر ہے۔ آپ نے حقیقتِ ولایت کو بیان کیا اور اولیاء کے درجات اور اُن کے مراتب کی رعایت کو واضح کیا جو ایک الگ ناپیدا کنار سمندر ہے جس میں بڑے عجائبات موجود ہیں۔ آپ کے مذہب کو جاننے کے لیے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ اولیاء ہیں جن کو اس نے اپنی مخلوق سے

چُن لیا ہے، اور اُن کے معاملات کو دنیوی تعلقات سے منقطع اور نفس و خواہش کی مقتضیات سے آزاد کر دیا ہے۔ اُن میں سے ہر ایک کے لیے ایک درجے کو متعین کر کے اُن پر تصوف کے اسرار کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اس سلسلے میں کلام بڑا طویل ہے لیکن میں چند اصولوں کی شرح بیان کروں گا کہ تمہیں علم حاصل ہو جائے چنانچہ اب میں اختصار کے ساتھ اس کی تحقیق، اسباب اور اوصاف بیان کرتا ہوں اور اس بارے میں مشائخ کا کلام بھی پیش کروں گا۔ انشاء اللہ عزوجلّ۔

اثباتِ ولایت

جان لو کہ معرفت و تصوّف کے طریق کی اساس اور قاعدہ، ولایت اور اس کو ثابت کرنے پر منحصر ہے۔ اس کو ثابت کرنے کے معاملے میں تمام مشائخ باہم متفق ہیں تاہم ہر ایک نے اس کو الگ عبارت میں بیان کیا ہے۔ حضرت محمد بن علی الحکیمؒ ولایت کو حقیقت کے لیے مطلق چھوڑنے میں مخصوص ہیں۔ باقی ولایت، واؤ کے زبر کے ساتھ لغت کے اعتبار سے تصرف کرنے کو کہتے ہیں اور ولایت، واؤ کی زیر کے ساتھ دولت مندی کے معنی میں مستعمل ہے۔ نیز یہ دونوں فعلِ ولی کے مصدر ہیں۔ جب ایسا ہے تو ضروری ہے کہ دو لغت ہوں جیساکہ دلالت دال کے زبر کے ساتھ رہنمائی کرنے اور دال کے زیر کے ساتھ ناز کرنے کے معنی میں ہے۔ نیز ولایت ربوبیت کے معنی میں بھی آتا ہے جیساکہ خداوند عزوجلّ نے فرمایا ہے کہ

ھُنَالِکَ الْوَلَایَۃُ لِلّٰہِ الْحَقِّ۔ قیامت میں ربوبیت خدائے برحق کے لیے ہے۔

کہ کفار اس کے ساتھ محبت اور گرویدگی کا اظہار کریں گے۔ اور اپنے معبودوں سے بیزاری ظاہر کریں گے۔ اور نیز ولایت محبت کے معنی میں بھی آتا ہے لیکن اس صورت میں ولی، فعل کے وزن پر مفعول کے معنی میں ہو گا۔ جیساکہ ارشادِ ربانی ہے۔

وَھُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیْنَ۔ وہ نیک لوگوں سے محبت کرتا ہے۔

کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو اس کے اوصاف و افعال پر چھوڑ نہیں دیتا بلکہ اپنی نگرانی

اور حفاظت میں لے لیتا ہے۔ اور یہ بھی درست ہے کہ فعیل کے وزن پر فاعل میں مبالغہ کے معنی پر ہو کر بندہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے محبت کرتا اُس کے حقوق کو پورا کرنے پر مداومت کرتا اور غیر اللہ سے اعراض کرتا ہے گویا یہ بندہ مرید اور حق تعالیٰ مراد ہوتا ہے۔ اور یہ تمام باتیں حق تعالیٰ سے بندہ کے لیے اور بندہ سے حق تعالیٰ کے لیے درست ہیں اس لیے کہ یہ جائز ہے کہ وہ حق تعالیٰ اپنے دوستوں کا ناصر ہو کیونکہ خداوند تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے اپنے دوستوں کے ساتھ نصرت کا وعدہ فرمایا ہے اور فرمایا ہے کہ

اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ۔ آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ تعالیٰ کی امداد قریب ہے۔

نیز یہ بھی فرمایا ہے کہ

وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ۔ کہ بے شک کافروں کا کوئی مولیٰ نہیں۔

یعنی اُن کا کوئی مددگار نہیں۔ جب وہ کافروں کا ناصر نہیں تو لا محالہ مومنوں کا ناصر ہو گا کہ اُن کی عقلوں کو آیات سے استدلال کرنے، اُن کے دلوں پر معانی کے بیان کرنے اور اُن کے باطن میں براہین کو کھولنے میں اُن کی امداد کرتا ہے اور نیز نفس اور شیطان کی مخالفت اور اپنے احکام کی موافقت میں اُن کی نصرت کرتا ہے۔ اور نیز یہ بھی جائز ہے کہ وہ اُن کو اپنی دوستی کے لیے مخصوص کر کے اپنی عداوت کے مقامات سے انہیں بچائے رکھے جیسا کہ فرمایا ہے۔

يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ۔ وہ اُن کے ساتھ محبت کرتا ہے اور وہ اس کے ساتھ محبت کرتے ہیں۔

تاکہ وہ اس کے ساتھ اس کی دوستی کی وجہ سے دوستی رکھیں اور مخلوق سے روگرداں ہو جائیں تاکہ وہ اُن کا ولی بن جائے اور وہ بھی اُس کے اولیاء بن جائیں۔ اور یہ بھی درست ہے کہ حق تعالیٰ کسی کو اپنی بندگی پر قائم رہنے کی ولایت عطا فرمائیں اور اس کو اپنی حفاظت اور نگرانی میں رکھیں تاکہ وہ اُن کی اطاعت پر قائم رہے اُن کی مخالفت سے پرہیز کرے اور اُس کے اطاعت پر حُسنِ اقامت سے شیطان دور بھاگ جائے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے

کہ حق تعالیٰ کسی کو ولایت اس لیے دیں تاکہ ملک میں اس کا وجود حل ہو جائے۔ انتظام سلطنت اُسے نصیب ہو، اُس کی دعا مستجاب ہو اور اس کے انفاس مقبول ہوں جیسا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

رُبَّ اشعث اغبر ذی طمرین لا یصبأ یه لو اقسم علی اللہ لأبرّہ۔ — بسا اوقات پریشان بال، غبار آلود، پھٹی چادروں والا جس کو کوئی اہمیت نہ دیتا ہو اگر کسی معاملے میں اللہ کی قسم کھالے تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو پورا کرتے ہیں۔

اور مشہور ہے کہ حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں دریائے نیل کا پانی اپنی عادت کے مطابق رُک گیا اس لیے کہ دورِ جاہلیت میں یہ رسم تھی کہ ہر سال ایک لڑکی خوب آراستہ کر کے اس میں ڈالتے تھے تب وہ جاری ہوتا تھا گورنر مصر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی اطلاع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک کاغذ پر رقعہ لکھا کہ "اے دریا اگر تو اللہ کے حکم سے چلتا تھا تو ہم خدائے واحد و قہار سے درخواست کریں گے کہ تجھے جاری کرے اور اگر تو خود اپنی مرضی سے چلتا تھا تو ہمیں تیری کوئی حاجت نہیں ہے، (اور حضرت عمرو بن العاص کو لکھ بھیجا کہ یہ رقعہ دریا میں ڈال دیا جائے) چنانچہ جب یہ رقعہ دریا میں ڈالا گیا تو پانی فوراً چلنے لگا۔ درحقیقت امارت یہ ہے۔ پس ولایت اور اُس کے ثابت کرنے میں میری مراد یہ ہے کہ تو جان لے کہ ولی اُس شخص کو کہا جا سکتا ہے جس میں ولی کے یہ اوصاف موجود ہوں۔ اور اُس کا حال اس طرح ہو جس طرح میں نے بیان کیا ہے نہ کہ صرف دعویٰ کرتا ہو۔ اس سے پہلے بھی مشائخ نے اس معاملے میں کتابیں تصنیف کی تھیں لیکن وہ جلد ہی ناپید ہو گئیں۔ اب میں صاحب مذہب اور بزرگ پیر حضرت محمد بن علی الحکیم ترمذی کی عبارت پیش کرتا ہوں جیسا کہ میرا اُن پر اعتقاد ہے، تاکہ تجھے بہت فائدہ حاصل ہو اور تیرے علاوہ بھی اس طریقت کے طالبوں میں سے جسے یہ کتاب پڑھنے کا اتفاق ہو وہ اس سے استفادہ کر سکے۔

فصل

ولایت کی تشریح اور درجات

اللہ تعالیٰ تمہیں ہمت بخشے، جان لو کہ لفظ ولی لوگوں کے درمیان مستعمل ہے اور کتاب و سنت بھی اس پر ناطق ہیں، جیسا کہ خداوند عزّ و جلّ فرماتے ہیں کہ

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ہُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ — آگاہ رہو! کہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء کو نہ خوف لاحق ہو گا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔

نیز فرمایا کہ

نَحْنُ اَوْلِیَآءُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ وَفِی الْاٰخِرَۃِ۔ — دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں ہم ہی تمہارے ولی ہیں۔

اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا کہ

اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ — اللہ تعالیٰ مومنوں کا دوست ہے۔

اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

انّ من عبادِ اللّٰہِ لعباداً یغبطھم الاَنبیاءُ والشھداءُ قیل مَنْ ھُمْ یا رسول اللّٰہ صفھُمْ لنا لعلّنا نُحِبُّھُمْ قال قومٌ تحابُوا بروحِ اللّٰہِ غیر اموالٍ ولا اکتسابٍ وجوھھم نورٌ علی منابر من نورٍ لا یخافون اذا خاف النّاسُ ولا یحزنون اذا حزن الناس ثم تلا اَلَا اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ — بے شک اللہ کے بندوں میں سے بعض بندے ایسے ہیں جن پر انبیاء اور شہداء بھی رشک کریں گے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں اُن کے اوصاف بتایئے تاکہ ہم اُن کے ساتھ محبت کریں۔ آپؐ نے فرمایا "وہ لوگ ہیں جو مال اور دنیوی منفعت کے بغیر محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں (قیامت کے دن) اُن کے چہرے نورانی ہوں گے اور وہ نور کے منبروں پر بیٹھے ہوں گے، جب دوسرے لوگ خوف زدہ ہوں گے تو انہیں کوئی خوف لاحق نہ ہو گا اور جب دوسرے لوگ غمگین ہوں گے تو

انہیں کوئی غم نہ ہوگا۔

پھر آپؒ نے یہ آیت کریمہ تلاوت کی

نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ

اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ

جس نے ولی کو ایذا پہنچائی اُس نے میرے ساتھ جنگ کو حلال سمجھا۔

اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ اولیاء ہیں جنہیں اُس نے اپنی دوستی اور ولایت کے لیے مخصوص کر لیا ہے، در حقیقت وہی ملکوں کے والی ہیں کہ اُن کو حق تعالیٰ نے چُن لیا ہے اور ان کو اپنے افعال کے اظہار کی علامت قرار دیا ہے، اُن کو مختلف قسم کی کرامات سے مخصوص کیا اور اُن کے وجود سے طبعی آفات کو پاک کر دیا اور ان کو نفس وہوا کی پیروی سے رہا کر دیا ہے یہاں تک کہ اُن کا مقصود اُس کے علاوہ کچھ نہیں اور اُن کا اُنس بھی کسی کے ساتھ نہیں۔ ایسے لوگ ہم سے پہلے گزشتہ زمانوں میں بھی ہوئے ہیں اب بھی موجود ہیں اور اس کے بعد بھی قیامت تک ہوتے رہیں گے۔ کیوں کہ خداوند تعالیٰ نے اس امت کو دوسری تمام امتوں پر شرف عطا کیا ہے اور اس بات کی ضمانت دی ہے کہ میں خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کا تحفظ کروں گا۔ جس طرح آج بھی علماء کے درمیان نقلی دلائل اور عقلی براہین موجود ہیں اسی طرح اولیاء اور خاصانِ الٰہی کے پاس ایسے عینی دلائل موجود ہونے چاہئیں جن کا مخلوق کے اندر انکار نہ کیا جا سکتا ہو۔ اس معاملے میں ہمارا دو فرقوں "معتزلہ اور عام حشویہ" کے ساتھ اختلاف ہے، معتزلہ اولیاء اللہ میں سے بعض کی دوسرے بعض پر فضیلت کا انکار کرتے ہیں (یعنی سب اولیاء کو فضیلت کے اعتبار سے برابر جانتے ہیں) حالانکہ اولیاء میں تخصیص کی نفی سے انبیاء میں بھی تخصیص کی نفی لازم آتی ہے اور یہ تو کفر ہے ---- اور عام حشوی اولیاء میں ایک دوسرے کی تخصیص کو تو جائز سمجھتے ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ ایسے اولیاء اللہ ماضی میں ہوا کرتے تھے۔ آج موجود نہیں ہیں۔ حالانکہ ماضی اور مستقبل کا انکار دونوں برابر ہیں۔ کیوں کہ ایک طرف کا انکار دوسرے طرف کے انکار کو بطریق اولیٰ لازم ہے۔ پس حق تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے براہین کو آج

تک باقی رکھا ہوا ہے اور اولیاء کو اُن کے اظہار کا سبب کر دیا ہے تاکہ حق تعالیٰ کی نشانیاں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے دلائل ہمیشہ ظاہر ہوتے رہیں اور اللہ تعالیٰ نے ایسے حضرات کو جہان کا والی بنا دیا ہے یہاں تک کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی بات کے لیے وقف ہیں اور نفس کو اُن کا تابع بنا دیا گیا ہے تاکہ اُن ہی کے قدموں کی برکت باعث آسمان سے بارش نازل ہو۔ اُن کے قدموں کی برکت اور اُن کے احوال کی صفائی کے باعث ہی زمین سے فصلیں پیدا ہوں۔ اور انہی کی دعاؤں سے مسلمانوں کو کافروں پر فتح و کامرانی حاصل ہو۔ ایسے لوگ چار ہزار کی تعداد میں ہیں جو ایک دوسرے سے پوشیدہ رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے۔ یہ حضرات اپنے حال کی خوبصورتی بھی نہیں جانتے اور تمام احوال میں اپنے آپ سے اور تمام مخلوق سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ اس بارے میں آثار حدیث وارد ہوئے ہیں اور اولیاء اللہ کا کلام بھی اس پر ناطق ہے نیز خود میرے اوپر الحمدللہ یہ بات عیاں ہو چکی ہے۔

اس کے علاوہ جو حضرات ارباب حل و عقد اور درگاہِ حق کے سردار ہیں وہ تین سو کی تعداد میں ہیں۔ جن کو اخیار کہتے ہیں۔ اور چالیس دوسرے ہیں جنہیں ابدال کہا جاتا ہے۔ اور سات دیگر جو ابرار کہلاتے ہیں۔ اور چار اور ہیں جنہیں اوتار کہتے ہیں۔ اور تین دوسرے ہیں جنہیں نقباء (نقیب کی جمع) کہتے ہیں اور ایک دوسرا ہوتا ہے جس کو قطب اور غوث کہا جاتا ہے۔ یہ تمام ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں، اور معاملات کی انجام دہی میں ایک دوسرے کی اجازت کے محتاج ہوتے ہیں۔ اس پر بھی روایات ناطق ہیں اور تمام اہل سنت کا اس پر اجماع ہے۔ تاہم اس مقام پر اس کی شرح اور تفصیل مقصود نہیں۔ اور اس جگہ میں نے جو کہا ہے کہ ان میں سے تمام حضرات ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک ولی ہے تو اس پر عام لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس طرح تو ان حضرات کو اپنی عاقبت سے متعلق امن میں ہونا چاہیے حالانکہ یہ محال ہے کہ ولایت کی معرفت عاقبت کے بارے میں امن میں ہونے کی مقتضی ہو۔ کہ جب یہ درست ہے کہ ایک مومن اپنے ایمان کے بارے میں جانتے ہوئے بھی اپنی عاقبت کے متعلق امن

میں نہ ہو تو یہ بھی درست ہے کہ ولی اپنی ولایت کو پہچانتا ہو لیکن عاقبت کے متعلق امن میں نہ ہو۔ تاہم یہ جائز ہے کہ حق تعالیٰ کسی ولی کو اس کے حال میں صحت اور اپنی نافرمانی سے محفوظ کر کے اپنے خصوصی فضل و کرم سے عاقبت کے بارے میں امن سے مشرف فرما دیں۔ اس جگہ مشائخ کا آپس میں اختلاف ہے اور میں نے منشاءِ اختلاف واضح کر دیا ہے کہ جو کوئی اُن چھپے ہوئے چار ہزار حضرات میں سے ہیں وہ اپنی ولایت کے بارے میں خود علم ہونے کو جائز نہیں سمجھتے اور جو حضرات ان دوسرے بزرگوں میں سے ہیں وہ اس معرفت کو درست سمجھتے ہیں۔ فقہاء میں سے بہت سے حضرات اُس گروہ کی موافقت کرتے ہیں اور بہت سے فقہاء اس گروہ کے موافق ہیں۔ متکلمین میں سے اُستاد ابو اسحٰق اسفرائی رحمہ اللہ جیسے حضرات اور متقدمین کی ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ ولی اپنے آپ کو نہیں پہچانتا کہ وہ ولی ہے۔ اور استاد ابو بکر بن فورک اور متقدمین کی ایک دوسری جماعت اس بات پر ہے کہ ولی اپنے بارے میں یہ جانتا ہوتا ہے کہ وہ ولی ہے میں اُس پہلے گروہ سے کہتا ہوں کہ ولی کے اپنے آپ کو پہچاننے میں ہرج اور نقصان کیا ہے! وہ کہتے ہیں کہ جب وہ جانتا ہو کہ میں ولی ہوں تو غرور میں مبتلا ہو جائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ ولایت کی شرط تو حق تعالیٰ کی نگہبانی ہے اور جو حق تعالیٰ کی طرف سے محفوظ ہو وہ مغرور کیسے ہو سکتا ہے۔

نیز یہ بات تو بڑی ہی عامیانہ سی ہے کہ کوئی شخص ولی ہو اور اُس پر عام عادت کے خلاف کرامات بھی ظاہر ہوتی ہوں اور وہ یہ بھی نہ جانتا ہو کہ میں ولی ہوں اور میرے اوپر گزرنے والی یہ حالت کرامت۔ عوام میں سے ایک گروہ اس طبقے کی تقلید کرتا ہے اور بعض لوگ اُس دوسرے طبقے کی تقلید کرتے ہیں۔ لیکن عام لوگوں کی باتوں کا کوئی اعتبار نہیں۔

باقی معتزلہ تو اولیاء اللہ میں تخصیص اور کرامات کے بالکل ہی منکر ہیں۔ حالانکہ کرامت اور تخصیص ہی تو ولایت کی حقیقت ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ تمام مسلمان اللہ تعالیٰ کے ولی ہیں۔ بشرطیکہ فرمانبردار ہوں۔ اور جو کوئی بھی ایمان کے جملہ تقاضوں کو پورا کرے،

حق تعالیٰ کی صفات اور رویت باری کا منکر ہو۔ گنہگار مومن کے ہمیشہ دوزخ میں رہنے کا قائل ہو اور انسان کے رسولوں کی بعثت اور آسمانی کتابوں کے نازل نہ ہونے کی صورت میں محض عقل کی بنا پر مکلّف ہونے کا اقرار کرے، وہ ولی ہے، اور تمام مسلمانوں کے نزدیک یہ شخص ولی ہوگا۔ (حضرت علی ہجویریؒ فرماتے ہیں کہ) لیکن وہ شیطان کا ولی ہوگا۔ اور معتزلہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر ولایت کے لیے کرامت واجب ہوتی تو تمام مومنوں کو کرامت حاصل ہوتی اس لیے کہ یہ تمام ایمان کے اندر مشترک ہیں اور جب اصل میں مشترک ہیں تو انہیں فرع میں بھی مشترک ہی ہونا چاہیئے! بلکہ وہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اس طرح جائز ہے کہ مومن اور کافر دونوں کو کرامت حاصل ہو کہ خواہ ان میں سے کوئی دورانِ سفر شدید بھوک محسوس کرتا ہو تو اچانک کوئی میزبان یا دستر خوان ظاہر ہو حتیٰ کہ کوئی اُسے اس دستر خوان پر بٹھا دے (تو یہ چیز تو مومن وکافر ہر شخص کے ساتھ پیش آسکتی ہے) اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص (کرامت کے طور پر) طویل مسافت ایک رات میں طے کر سکتا ہوتا تو یہ چیز تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت حاصل ہوتی جب آپ نے مکہ مکرمہ کا ارادہ کیا تھا کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا

وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ۔ جہاں تم لوگ بڑی مشقت سے پہنچ سکتے ہو وہاں پر چوپائے تمہارا بوجھ اٹھا کر لے جاتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ تمہارا قول غلط اور باطل ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ

سُبْحٰنَ الَّذِىْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا۔ پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے بندے کو رات کے تھوڑے حصہ میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک۔

باقی تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کے جانوروں پر بوجھ لاد کر مکہ کی طرف لے جانے کا تو معنی یہی ہے کہ کرامات خاص ہیں نہ کہ عام۔ ہاں اگر وہ تمام کرامت کے ذریعہ مکہ پہنچ جاتے تو کرامات عام ہوتیں پھر ایمان بالغیب ضروری نہ رہتا اور ایمان بالغیب کے تمام احکام اٹھ جاتے۔ اس لیے کہ ایمان تو نیک اور بدکار سب کے درمیان عمومی محل میں ہے لیکن ولایت محل خصوصی میں ہے۔ پس حق تعالیٰ نے جہاں ایمان کو محل عموم میں رکھا وہاں

حضور علیہ السلام کو اپنا بوجھ جانوروں پر لادنے کے مرا نق حکم دیا اور جس چیز کو محل خصوصی میں رکھا وہاں ایک ہی رات میں مکہ سے بیت المقدس اور پھر وہاں سے قاب قوسین تک لے گیا اور تمام عالم کے اسرار و رموز آپ کو دکھا دیے۔ اور جب آپ واپس تشریف لائے تو ابھی تک رات کا کافی حصہ باقی تھا، بہر حال ایمان کے معاملے میں آپ دوسرے عام لوگوں کے ساتھ عام تھے لیکن کرامت اور خصوصیت کے معاملے میں آپ خاص کے ساتھ خاص تھے اور تخصیص کی نفی تو کھلا مکابرہ ہے۔ جیسا کہ بادشاہ کے دربار میں حاجب، دربان اور وزیر سبھی ہوتے ہیں۔ اور باوجودیکہ یہ تمام حکم برداری میں برابر ہیں لیکن ان میں سے بعض کو دوسرے بعض پر خصوصیت حاصل ہوتی ہے۔ پس ہر چند کہ تمام مومن حقیقتِ ایمان میں برابر ہوتے ہیں تاہم اُن میں سے کوئی گنہگار ہوتا ہے اور کوئی اطاعت شعار اور کوئی عالم ہوتا ہے تو کوئی جاہل! پس یہ بات ثابت ہوئی کہ تخصیص اور فضیلت کا انکار۔ تمام معانی کے انکار کی طرح ہے۔ واللہ اعلم بالصواب!

فصل

مشائخ کے رموز

ولایت کی تحقیق بیان کرنے میں مشائخ میں سے ہر ایک کے رموز موجود ہیں، حتی الامکان اُن کے منتخب رموز کو میں بیان کروں گا تاکہ اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو پوری طرح تمہیں، فائدہ حاصل ہو۔ چنانچہ حضرت ابو علی جرجانی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ

الولی ھو الفانی فی حالہ والباقی فی مشاھدۃ الحق لم یکن لہ عن نفسہ اخبار ولا مع غیر اللہ قرار۔

ولی وہ ہے جو اپنے حال میں فانی ہو اور مشاہدہ حق میں باقی ہو، اُس کے لیے اپنے حال سے خبر دینا ممکن نہ ہو اور نہ ہی حق تعالیٰ کے علاوہ کسی کے ساتھ اسے آرام نصیب ہو۔

کیونکہ بندہ کا خبر دینا اپنے حال سے ہی ہو سکتا ہے۔ جب اُس کے تمام احوال ہی فنا ہو چکے ہوں تو اس کے لیے اپنے آپ سے خبر دینا درست نہ ہوگا اور نہ ہی وہ غیر حق کے

ساتھ آرام پاتا ہے کہ اپنے حال کی اسے اطلاع دے کیوں کہ پوشیدہ حال کی خبر دینا محبوب کے راز کو غیر پر کھولنے کے برابر ہے حالانکہ محبوب کا راز محبوب کے علاوہ کسی پر کھولنا محال ہے۔ اور نیز وہ جب حالت مشاہدہ میں ہے تو مشاہدہ میں تو غیر کی طرف دیکھنا ہی محال ہے۔ لہٰذا جب غیر کو دیکھنا ہی نہ پایا جائے گا تو مخلوق کے ساتھ قرار کس طرح ممکن ہوگا۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ

الولی لا یکون له خوف لان الخوف ترقب مکروه یحل فی المستقبل وانتظار المحبوب یفوت فی المستأنف والولیُّ ابن وقته لَیْسَ لَهٗ وقت مستقبلٌ فیخاف شیئًا وکما لا خوفَ لَهٗ لَا رَجَآءَ لَهٗ لِاَنَّ الرجاءَ انتظار محبوبٍ یَحْصِلُ او مَکْرُوْهٍ یَکْشِفُ وذالك فی الثانی من الوقت وکذالك لا یحزن من حزونةِ الوقت من کان فی ضیاء الرضاء ونور الشکر وروضة الموافقة فانّٰی یکون له حزن۔ قال الله تعالیٰ: اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔

ولی وہ ہے جسے کوئی خوف نہ ہو کیوں کہ خوف مستقبل میں پیش آنے والی اس حالت کو کہتے ہیں جس سے دل پر تکلیف یا جسم پر کسی مصیبت کا اندیشہ ہو یا محبوب کے جدا ہو جانے کا خطرہ لاحق ہو۔ اور ولی اپنے وقت کا پابند ہوتا ہے کہ اُس کے لیے کوئی زمانہ مستقبل نہیں ہوتا کہ وہ کسی چیز سے خوف رکھے۔ اور جس طرح اُسے کوئی خوف نہیں ہوتا اُس کی کوئی اُمید بھی نہیں ہوتی اس لیے کہ امید مستقبل میں محبوب کے حاصل ہونے یا کسی تکلیف کے دور ہونے کے انتظار کا نام ہے اور یہ بھی آنے والے دوسرے وقت کے ساتھ متعلق ہے اسی طرح اُسے کوئی غم بھی لاحق نہیں ہوتا کیونکہ غم بھی تو وقت کی کدورت کا نام ہے۔ جو آدمی رضاء الٰہی کی روشنی اور شکرِ خداوندی کے نور اور موافقتِ حق کے باغ میں ہو پس اُس کو غم کیسے لاحق ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ الآیہ

حضرت جنید کے مذکورہ قول سے عوام کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ جب ولی کو خوف، امید اور حزن کچھ بھی لاحق نہیں ہوتا تو لا محالہ وہ اپنی عاقبت سے امن میں ہوگا حالانکہ یہ امن بھی اُسے حاصل نہیں ہوتا کیونکہ امن غیب کو دیکھنے اور وقت سے اعراض کرنے کے سبب ہوتا ہے اور یہ اُن لوگوں کی صفت ہے جو اپنی بشریت کو نہیں دیکھتے اور نہ ہی کسی صفت سے آرام پاتے ہیں۔ حالانکہ خوف، امید، حزن اور امن یہ تمام نفس کے ساتھ متعلق ہیں۔ اور جب وہ نفس فانی ہو گیا تو حق تعالیٰ کی رضا ہی بندے کی صفت بن

گئی اور جب رضائے الٰہی حاصل ہوگئی تو اپنے احوال سے اعراض ظاہر ہوگیا اور تمام حالات کو بدلنے والے خدا تعالیٰ کی رویت میں تمام احوال درست ہوگئے۔ اس وقت ولایت دل پر ظاہر ہوگئی اور باطن پر اس کا معنی ظاہر ہوگیا۔

اور حضرت ابو عثمان مغربیؒ فرماتے ہیں کہ

اَلْوَلِیُّ قَدْ یکون مشھورًا ولایکون مفتونا۔ ولی مخلوق کے اندر مشہور تو ہوتا ہے لیکن فتنہ پرور نہیں ہوتا۔

اور ایک دوسرے بزرگ فرماتے ہیں کہ

الولی قد یکون مستورا ولایکون مشھورًا ولی پوشیدہ ہوتا ہے اور مشہور نہیں ہوتا۔

اور یہ بات کہ ولی وہ ہوتا ہے جو شہرت سے احتراز کرے کیوں کہ شہرت میں فتنہ ہوتا ہے۔ حضرت ابو عثمان اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ یہ تو جائز ہے کہ وہ مشہور ہو لیکن اُس کی شہرت بے فتنہ ہونی چاہیئے اس لیے کہ فتنہ تو جھوٹ میں ہے اور جب ولی ہوتا ہی وہ ہے جو اپنی ولایت میں سچا ہو تو جھوٹے آدمی پر تو ویسے ہی ولی کا اطلاق نہ ہوگا اور نیز جھوٹے آدمی کے ہاتھ پر کرامت کا ظہور بھی محال ہے تو فتنہ تو اُس کے حالات کے پیشِ نظر ہی ساقط ہو جانا چاہیے۔ درحقیقت یہ دونوں اقوال اُس اختلاف کا شاخسانہ ہیں کہ ولی اپنے آپ کو نہیں پہچانتا کہ وہ ولی ہے کیونکہ اگر اپنی ولایت کو پہچانے گا تو مشہور ہو جائے اور اگر نہ پہچانے تو فتنہ میں واقع ہو جائے گا۔ اور اس کی شرح بڑی طویل ہے۔

اور میں نے حکایات میں دیکھا ہے کہ حضرت ابراہیم ادھمؒ نے ایک شخص سے فرمایا کہ کیا تو چاہتا ہے کہ تو اولیاء اللہ میں سے ایک ولی بن جائے؟ اُس نے کہا "ہاں میں چاہتا ہوں"، آپ نے فرمایا

لا ترغب فی شیٔ من الدنیا و الاخرۃ و فرغ نفسک للہِ و اقبل بوجھک علیہ۔ دنیا اور آخرت کی کسی چیز میں رغبت نہ رکھ، اور اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کے لیے فارغ کردے اور اپنی تمام تر توجہ حق تعالیٰ کی طرف مبذول کردے۔

یعنی دنیا و عقبیٰ کی طرف رغبت نہ کر کیوں کہ دنیا کی طرف رغبت کرنا دراصل حق تعالیٰ سے ایک فانی چیز کی طرف رغبت کرنا ہے اور عقبیٰ کی طرف رغبت کرنا دراصل حق تعالیٰ سے اعراض کر کے ایک باقی چیز کی طرف رغبت کرنا ہے۔ جب کسی فانی چیز کی طرف اعراض ہو گا تو جب فانی چیز فنا ہو گی تو یہ اعراض بھی فنا ہو جائے گا لیکن جب ایک باقی رہنے والی چیز کی طرف رغبت اکرو گے تو باقی چیز پر تو فنا جائز نہیں لہٰذا اُس رغبت پر بھی فنا واقع نہیں ہو گی اس کلمے کا فائدہ یہ ہے کہ دنیا اور عقبیٰ کسی چیز کے بدلے بھی حق تعالیٰ کو نہ چھوڑ! اور آپ نے فرمایا! اپنے آپ کو خداوند تعالیٰ کی دوستی کے لیے فارغ کر دے اور دنیا و عقبیٰ کو اپنے دل میں گزرنے کی اجازت نہ دے اور اپنے دل کو پوری طرح حق تعالیٰ کی طرف متوجہ کرے! جب تیرے اندر یہ اوصاف پیدا ہو جائیں گے تو تُو ولی ہو جائے گا ۔ حضرت بایزید رحمتہ اللہ سے لوگوں نے پوچھا کہ ولی کون ہوتا ہے ! آپ نے فرمایا

الولی ھو الصابر تحت الامر والنھی - خدا تعالیٰ کے حکم اور نہی پر صبر کرنے والا ولی ہوتا ہے۔

اس لیے کہ جس آدمی کے دل میں حق تعالیٰ کی دوستی جتنی زیادہ ہو گی اُس کے دل پر حق تعالیٰ کا حکم اتنا ہی باعظمت ہو گا۔ اور اس کا جسم حق تعالیٰ کی منع کردہ چیزوں سے اتنا ہی دور ہو گا۔ نیز حضرت بایزیدؒ سے حکایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا" ایک دفعہ لوگوں نے مجھ سے بیان کیا کہ فلاں شہر میں اولیاء اللہ میں سے ایک ولی رہتا ہے۔ میں اٹھا اور اس کی زیارت کے ارادہ سے چل پڑا جب میں اس کی مسجد میں پہنچا تو وہ اپنے گھر سے باہر آیا اور مسجد کے اندر اپنے منہ سے تھوک دیا۔ میں اس جگہ سے واپس لوٹ آیا اور اس کو سلام تک نہ کہا۔ میں نے سوچا کہ ولی تو وہ ہوتا ہے جو اپنے اوپر شریعت کی نگرانی رکھے تاکہ حق تعالیٰ اُس کی ولایت پر نگاہ رکھیں۔ اگر یہ شخص ولی ہوتا تو اپنے منہ سے تھوک نکال کر مسجد کی زمین پر نہ پھینکتا اور مسجد کی حرمت کا لحاظ رکھتا تاکہ حق تعالیٰ اس کی کرامت کی صحت کا تحفظ کرے۔ اُسی رات مجھے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی کہ آپ فرما رہے ہیں۔" اے بایزید! جو عمل تو نے کیا ہے اُس کی برکات تمہارے باطن میں پہنچ چکی ہیں۔" اور دوسرے روز میں اس مقام پر پہنچ گیا جس پر تم مجھے دیکھ رہے ہو۔۔۔

میں نے سُنا ہے کہ حضرت شیخ ابوسعید کے پاس ایک شخص آیا اور مسجد میں پہلے اپنا بایاں پاؤں اندر رکھا۔ آپ نے فرمایا "اس کو واپس لوٹا دو کیونکہ جو شخص حق تعالیٰ کے گھر میں داخل ہو رہا ہو اور اپنا بایاں پاؤں پہلے اندر رکھے ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

ملحدین (اللہ اُن پر لعنت کرے) کے ایک گروہ نے اس مقدس طریق کے ساتھ اس طرح تعلق پیدا کر رکھا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ خدمت اس حد تک کرنی چاہیے کہ بندہ ولی ہو جائے جب ولی بن جائے تو عبادت اس سے اٹھالی جاتی ہے اور اس کو نیکیوں کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور یہ کھلی گمراہی ہے کیونکہ راہِ حق میں کوئی ایسا مقام نہیں کہ ارکانِ اسلام میں سے کوئی رکن اٹھ جائے اور اس کی ضرورت باقی نہ رہے۔ میں انشاءاللہ اپنے مقام پر اس کی پوری شرح بیان کروں گا۔

کرامت کا اثبات

جان لو کہ ولی پر تکلیف شرعی کے صحیح ہونے کی حالت میں کرامت کا ظہور بالکل درست ہے۔ اس پر اہل سنت کے دونوں فریق بھی متفق ہیں اور عقلاً بھی یہ امر محال نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ چیز خداوند تعالیٰ کی قدرت میں ہے اور اس کا اظہار اصول شریعت میں سے کسی اصل کے منافی بھی نہیں۔ اس طرح کے امور سے ارادت محض اوہام کی بنیاد پر دور نہیں ہوتی ۔ کرامت، ولی کے سچا ہونے کی علامت ہوتی ہے اور اس کا ظہور کسی جھوٹے سے درست نہیں سوائے اس بات کے کہ اُس کے دعویٰ کے جھوٹا ہونے کی علامت ہو ۔ کرامت وہ خلاف عادت کام ہوتا ہے جو کسی آدمی کے احکام شریعت پر قائم رہنے کی حالت میں اس سے ظاہر ہو۔ اور جو شخص حق تعالیٰ کے جتلانے سے صدق کو کذب سے تمیز کرتا ہو وہ بھی ولی ہے۔ اہل سنت کا ایک طبقہ کہتا ہے کہ کرامت تو درست ہے تاہم معجزہ کی حد سے کم معاملات میں، جیسا کہ دعا کا قبول ہونا اور اس سے مقصد کا حاصل ہونا اور اسی سطح کے دوسرے افعال کہ عادات جن کے خلاف ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ تمہیں شریعت کے احکام پر قائم رہنے والے سچے ولی کے ہاتھ پر خلافِ عادت

کام کے ظاہر ہونے میں کیا قباحت نظر آتی ہے ؟ اگر وہ کہیں کہ یہ چیز خداوند تعالیٰ کی قدرت میں نہیں تو یہ تو خود گمراہی ہے ۔ اور اگر وہ کہیں کہ یہ قسم حق تعالیٰ کی قدرت میں تو ہے لیکن کسی ولی کے ہاتھ پر اس کا ظہور گویا نبوت کو باطل کرنا اور انبیاء کی خصوصیت کو نفی کرنا ہے ۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بھی محال ہے اس لیے کہ ولی کرامات کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے اور نبی معجزات کے ساتھ!

والمعجزة لم تكن معجزة لعينها انما كانت معجزة لحصولها ومن شرطها اقتران دعوى النبوة فالمعجزة تختص للانبياء -

اور معجزہ اپنی ذات کے ساتھ معجزہ نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے حصول کے سبب معجزہ ہوتا ہے ۔ اور اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ مدعی نبوت سے ظاہر ہو ۔ پس معجزہ انبیاء کے ساتھ مختص ہے اور کرامات اولیاء کے ساتھ خاص ہیں ۔

اور جب ولی، ولی ہوتا ہے اور نبی، نبی ۔ تو ان کے درمیان کسی طرح اشتباہ لازم نہیں آتا تاکہ اس سے احتراز کرنا پڑے ۔ اور پیغمبروں (علیہم السلام) کے مرتبے کا شرف اُن کے بلند رُتبے اور عصمت کی صفائی کے سبب ہوتا ہے نہ کہ محض معجزے یا کرامت یا اُن سے خلافِ عادت افعال کے ظاہر ہونے کی وجہ سے ۔ اور اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ تمام انبیاء کرام کے جملہ معجزات خلافِ عادت ہی ہوتے ہیں ۔ اور اصلِ اعجاز میں سب برابر ہوتے ہیں ۔ لیکن درجات اور تفضیل میں ایک کو دوسرے پر فضیلت حاصل ہوتی ہے اور جب انبیاء کرام کے خلافِ عادت افعال کے اصولی طور پر متساوی ہونے کے باوجود اُن میں ایک دوسرے پر فضیلت درست ہے تو اولیاء کرام کے لیے خلافِ عادت کرامت کا ظہور کس طرح درست نہ ہوگا ؟ اور انبیاء کرام تو ان اولیاء سے بہت زیادہ افضل ہوتے ہیں جب وہاں خلافِ عادت فعل اُن میں ایک دوسرے پر فضیلت اور تخصیص کی علت نہیں بن سکے گا ۔ یعنی اولیاء کس طرح بھی انبیاء کے برابر نہیں ہو سکتے ۔ عقلمندوں میں سے جس کو یہ دلیل معلوم ہو جائے اس کے ذہن میں کوئی شبہ باقی نہیں رہے گا ۔ البتہ اگر کسی کو یہ خیال ہو کہ جب کسی ولی کو خلافِ عادت کرامت حاصل ہو جائے تو وہ کہیں دعوائے نبوت ہی نہ کرلے ۔ تو یہ امر محال ہے ۔ اس لیے کہ ولایت کی شرط یہ ہے

کہ وہ اپنے قول میں سچا ہو۔ اور حقیقت کے خلاف دعویٰ کرنا تو کذب ہوتا ہے اور کاذب آدمی ولی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کوئی ولی، نبوت کا دعویٰ کرے تو یہ گویا معجزہ پر تنقید ہو گی اور معجزے پر نکتہ چینی کفر ہے۔ اور کرامت سوائے فرمانبردار مومن کے کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔ اور جھوٹ تو نافرمانی ہے نہ کہ فرمانبرداری۔ اور جب معاملہ اسی طرح ہے تو ولی کی کرامت، نبی کے اثباتِ محبت کے موافق ہو گی اور معجزے اور کرامت کے درمیان طعن کرنے کا کوئی شبہ واقع نہیں ہو گا اس لیے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم معجزے کے ثابت کرنے سے اپنی نبوت کو ثابت کرتے ہیں اور ولی بھی اپنی کرامت سے آپؐ کی نبوت کو ہی ثابت کرتا ہے نیز اس طرح یہ اپنی ولایت کا ثبوت بھی فراہم کر دیتا ہے۔ پس ایک سچا ولی اپنی ولایت کے بارے میں وہی کچھ کہتا ہے جو ایک سچا نبی اپنی نبوت کے بارے میں کہتا ہے۔ اور ولی کی کرامت بعینہٖ نبی کا اعجاز ہوتا ہے۔ اور ایک مومن کو ولی کی کرامت دیکھنے سے نبی کی نبوت پر اور زیادہ یقین حاصل ہوتا ہے نہ کہ اس میں شبہ واقع ہو۔ اس لیے کہ ان کے دعووں میں کوئی تضاد نہیں ہوتا کہ ایک دوسرے کی نفی کرے کیونکہ ایک کا دعویٰ بعینہٖ دوسرے کے دعویٰ کی دلیل ہوتا ہے۔ جیساکہ شریعت کے قانون میں جب ورثار کا ایک گروہ کسی دعوئے میں متفق ہو تو جب اُن میں سے ایک کی حجت ثابت ہو جائے گی تو اس کی حجت دوسروں کے لیے بھی حجت قرار پائے گی کیونکہ وہ سب دعویٰ میں ایک دوسرے کے ساتھ متفق ہیں اور اگر دعوئے مختلف ہوں تو ایک کی حجت دوسروں کے لیے حجت قرار نہیں پائے گی۔ پس جب نبی معجزے کی دلالت کے ساتھ اپنی نبوت کے صحیح ہونے کا مدعی ہو اور ولی اُس کی تصدیق کرتا ہو تو اس کے دعویٰ کے اثبات میں شبہ کا واقع ہونا محال ہے۔ واللہ اعلم۔

معجزے اور کرامت میں فرق

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ جھوٹے آدمی کے ہاتھ پر معجزے اور کرامت کا ظہور محال ہے تو لامحالہ فرق زیادہ ظاہر ہونا چاہیے تاکہ اچھی طرح معلوم اور واضح ہو جائے۔

جان لو کہ معجزوں کے لیے شرط یہ ہے کہ اُن لوگوں پر ظاہر کیا جائے اور کرامات کے لیے شرط اُن کو چُھپانا ہے۔ کیونکہ معجزہ تو دوسروں کے لیے مفید ہوتا ہے اور کرامت صرف صاحبِ کرامت کے لیے ہی ہوتی ہے۔ اور نیز صاحب معجزہ کو یہ کامل یقین ہوتا ہے کہ یہ عین معجزہ ہے لیکن ولی قطعی طور پر نہیں جان سکتا کہ یہ کرامت ہے یا استدراج! اور نیز صاحبِ معجزہ یعنی نبی خدائے عزوجلّ کے حکم سے شریعت میں تصرف کرتا اور احکام و منہیات میں ترتیب دیتا ہے۔ لیکن صاحب کرامت یعنی ولی کو نبی کے احکام کو تسلیم اور قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں اس لیے کہ ولی کی کرامت کسی طرح بھی نبی کے شرعی احکام کی مخالفت نہیں کرتی۔ اور اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ جب تم نے خلاف عادت فعل کو معجزہ اور ولایت کو نبی کی صداقت کی دلیل کہا ہے تو جب اس طرح کا خلاف عادت فعل تم غیر نبی کے لیے بھی جائز سمجھتے ہو تو وہ تو عادت کے موافق ہو جائے گا اور اثباتِ معجزہ پر تمہاری دلیل ہی اثباتِ کرامت کو باطل کر دے گی۔

میں جواب دوں گا کہ صورتِ حال یوں نہیں جس طرح تم نے اعتقاد بنالیا ہے کیونکہ معجزہ مخلوق کی عادت کے خلاف کام کو کہتے ہیں۔ لہٰذا جب ولی کی کرامت بعینہٖ نبی کا معجزہ ہوتا ہے اور جو دلیل نبی کا معجزہ ظاہر کرتا ہے وہی دلیل ولی کی کرامت بھی ظاہر کرتی ہے تو ایک اعجاز دوسرے اعجاز کی مخالفت نہیں کرتا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو مکہ میں جب کافروں نے سولی پر لٹکا دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ کے اندر مسجد میں تشریف فرما اُن کو دیکھ رہے تھے اور کافر جو سلوک ان کے ساتھ کر رہے تھے آپؐ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بتلا رہے تھے۔ خداوند تعالیٰ نے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی آنکھوں کے سامنے سے بھی پردے اٹھا دیئے تاکہ وہ بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کر سکیں۔ چنانچہ انہوں نے آپ کی خدمت میں سلام عرض کیا۔ حق تعالیٰ نے اُن کا سلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کانوں تک پہنچا دیا اور آپؐ کا جواب اُن کو سنوا دیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے لیے دعا فرمائی تھی کہ اُن کا رُخ قبلہ کی طرف پھر گیا اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ پس یہ جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں ہوتے

ہوئے اُن کو دیکھ لیا جب کہ وہ مکہ مکرمہ میں تھے تو یہ ایک ناقضِ عادت فعل ہے اور حضرت خبیبؓ کا مکہ مکرّمہ سے آپ کو دیکھ لینا اُن کی کرامت تھی۔ اس لیے بالاتفاق کسی غائب چیز کو دیکھنا خلافِ عادت فعل ہے۔ پس غیبِ زمانی اور غیب مکانی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ کہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی کرامت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے غیبِ مکانی کی حالت میں تھی اور متاخرین اولیاء کی کرامات آپؐ سے غیب زمانی کی حالت میں ہوئی ہے۔ اور یہ معجزہ اور کرامت کے درمیان فرق بڑا واضح ہے اور اس بات کی بڑی کھلی دلیل ہے کہ معجزے اور کرامت میں تضاد محال ہے کیوں کہ صاحبِ معجزہ کی تصدیق کے بغیر کرامت نہ تو ثابت ہوتی ہے اور نہ ہی فرمانبردار مومن کے علاوہ کسی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتی ہے اس لیے کرامت کی کرامات درحقیقت پیغمبر کا معجزہ ہی ہوتی ہیں کیوں کہ جب آپ کی شریعت باقی ہے تو آپ کی حجت بھی باقی رہنی چاہیے۔ پس اولیاءِ کرام رسولؐ کی رسالت کی سچائی پر گواہ ہوتے ہیں اس لیے یہ درست نہیں کہ شریعتِ رسولؐ بیگانہ آدمی کے ہاتھ پر کرامت ظاہر ہو۔

اس بارے میں حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ کی ایک حکایت بیان کی جاتی ہے جو اُس موقع کے نہایت مناسب ہے۔ کہ حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا کہ میں ایک دفعہ اپنی عادت کے مطابق اکیلا جنگل میں جا رہا تھا۔ اور ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ ایک کونے سے ایک آدمی اٹھا اور مجھ سے مصاحبت کی درخواست کی۔ میں نے اُس کے اندر توجہ کی تو اس کو دیکھنے سے مجھے نفرت سی لاحق ہوئی۔ میں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ کہنے لگا " اے ابراہیم رنجیدہ خاطر نہ ہو کہ میں نصاریٰ کے پادریوں میں سے ایک ہوں اور تیرے ساتھ مصاحبت کی امید پر ملک روم کے ایک دور دراز شہر سے یہاں آیا ہوں"۔ حضرت ابراہیم کہتے ہیں کہ جب مجھے علم ہو گیا کہ یہ بیگانہ آدمی ہے تو میرے دل کو اطمینان ہوا اور اس کو اپنی صحبت میں رکھنا اور اس کے حق کو ادا کرنا میرے لیے آسان ہو گیا۔ میں نے کہا " اے نصاریٰ کے راہب! میرے پاس کھانے پینے کا کوئی انتظام نہیں، میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تمہیں اس جنگل میں تکلیف

نہ پہنچے"۔ اُس نے کہا" اے ابراہیم! دنیا میں تیری اتنی شہرت ہے اور تو ابھی کھانے پینے کے غم میں مبتلا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ اس کی اس خوش دلی سے مجھے تعجب ہوا اور میں نے اُسے اپنی صحبت میں قبول کر لیا تاکہ میں تجربہ کروں کہ وہ اپنے دعوے میں کہاں تک سچا ہے"۔ جب ہم سات رات اور دن تک چلتے رہے تو ہمیں شدید پیاس نے آن گھیرا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا" اے ابراہیم! پوری دنیا میں تیرا اس قدر طوطی بولتا ہے، حق تعالیٰ کی بارگاہ سے کوئی کرامت تو لا کہ پیاس کی شدت سے اب میرے اندر تو چلنے کی طاقت نہیں رہی"۔ آپ کہتے ہیں کہ" میں نے اپنا سر زمین پر رکھ دیا اور کہنے لگا "بار خدایا! مجھ کو اس اجنبی و بیگانہ کے سامنے رسوا نہ کرنا کیونکہ وہ اس بیگانگی کے باوجود میرے بارے میں اچھا گمان رکھتا ہے، تیرے لیے کیا مشکل ہے کہ اس کافر کا گمان میرے بارے میں صحیح کر دے"۔ آپ کہتے ہیں کہ" جب میں نے سر اوپر اٹھایا تو میں نے دیکھا کہ ایک طبق ہے جس میں دو روٹیاں اور دو پیالے شربت کے رکھے ہیں، ہم نے انہیں کھایا اور وہاں سے چل دیئے۔ جب دوسرے سات روز گزر گئے تو میں نے دل میں سوچا" مجھے بھی اس کا تجربہ کرنا چاہیے تاکہ اس سے پہلے کہ وہ کسی دوسری چیز کے ذریعہ میرا امتحان لے اور کسی چیز کے ذریعہ میرے ساتھ معارضہ کرے وہ خود ہی اپنی ذلت کو دیکھ لے"۔ چنانچہ میں نے کہا" اے نصاریٰ کے راہب! آج تیری باری ہے لہٰذا جو کچھ تمہاری ریاضت کا پھل تمہارے پاس موجود ہے اُسے سامنے لا"۔ اُس نے بھی سر زمین پر رکھا اور کچھ کہا تو ایک طبق ظاہر ہوا جس پر چار روٹیاں اور چار پیالے شربت کے رکھے تھے۔ میں بڑا حیران ہوا اور رنجیدہ خاطر ہو کر اپنے حال سے نا امید ہو گیا۔ اور اپنے دل میں سوچا کہ میں تو اس میں سے ہرگز نہیں کھاؤں گا کیونکہ یہ ایک کافر کے لیے ظہور پذیر ہوا ہے اور کسی کی امداد ہے میں یہ کیسے کھا سکتا ہوں؟۔ وہ مجھے کہنے لگا" اے ابراہیم! کھائیے! میں نے کہا" میں نہیں کھاتا"۔ اس نے پوچھا کیا وجہ ہے؟ میں نے کہا اس لیے کہ تو اس کا اہل نہ تھا اور یہ سب کچھ تیری حالت کے مناسب نہیں اور میں تیرے اس کام میں حیران ہوں اگر اس کو کرامت پر محمول کروں تو یہ درست نہیں

کیونکہ تو کافر ہے اور کافر سے کرامت ظاہر نہیں ہو سکتی اور اس کو اعانت کہوں تو مدعی اس شبہ میں مبتلا ہو جائے گا کہ جب اللہ تعالیٰ اس کی اعانت اسلام قبول کیے بغیر کرتا ہے تو اسے اسلام قبول کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اُس نے مجھے کہا "اے ابراہیم! نوش فرمایئے! آپ کو دو باتوں کی بشارت ہو! ایک میرے اسلام قبول کرنے کی۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ — میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں

لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا — وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں

عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ — کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے بندے اور رسول ہیں۔

اور دوسری اس بات کی کہ حق تعالیٰ کے ہاں آپ کا بڑا بلند مقام ہے۔" میں نے پوچھا یہ کیسے! وہ کہنے لگا" اس لیے کہ مجھے کرامات میں سے کوئی حصہ حاصل نہیں لیکن میں نے آپ کے شرم سے سرزمین پر رکھ دیا تھا اور میں نے کہا تھا کہ" بار خدایا! اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دین حق اور تیرا پسندیدہ ہے تو مجھے دو روٹیاں اور شربت کے دو پیالے عطا فرما۔ اور اگر ابراہیم خواص تیرا ولی ہے تو مجھے دو روٹیاں اور دو پیالے شربت مزید عطا فرما۔ چنانچہ جب میں نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو یہ طبق اپنے سامنے موجود پایا۔ حضرت ابراہیم خواص رح نے اس میں سے کھا لیا اور وہ مرد خدا جو پہلے ایک راہب تھا۔ بزرگانِ دین میں سے ایک ہو گیا۔

اور یہ ولی کی کرامت کے ساتھ ملا ہوا نبی کا معجزہ ہی ہے، اور یہ چیز بڑی نادر ہے کہ نبی کی عدم موجودگی میں غیر نبی کو اس نبی کی بُرہان نظر آئے اور ولی کی موجودگی میں غیر ولی کو اس ولی کی کرامت نصیب ہو جائے اور حقیقت یہ ہے کہ ولایت کی انتہا ، اس کے مبتدی کے علاوہ کوئی نہیں جان سکتا۔ اس لیے کہ وہ راہب، فرعون کے جادوگر دل کی طرح چھپا ہوا ولی تھا۔ پس ابراہیم خواص رح نے تو معجزۂ نبی کی صداقت کو ثابت کیا۔ لیکن وہ دوسرا تو نبی کی صداقت کے ساتھ ولی کی عزت کا بھی طلب گار تھا تو خداوند تعالیٰ نے اپنے ازلی حسن عنایت سے اُس کو اُس کا مقصود عطا کر دیا۔ اور کرامت اور معجزہ کے درمیان یہ بڑا ہی واضح فرق ہے۔ اس موضوع پر باتیں تو بہت ہیں لیکن یہ کتاب

اس سے زیادہ کی متحمل نہیں ۔ اور اولیاء پر کرامت کا اظہار ایک دوسری کرامت ہے۔ لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ اس کو پوشیدہ رکھا جائے اور بتکلف ظاہر نہ کیا جائے۔ اور میرے شیخ فرماتے تھے کہ اگر ولی صحیح الحال ہو اور عاجزی وانکساری کے ساتھ اپنی ولایت کو ضرورت کے مطابق ظاہر کر دے تو کوئی نقصان نہیں لیکن اگر تکلف کے ساتھ اُسے ظاہر کرے تو یہ رعونت اور سرکشی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مدعی الوہیت کے ہاتھ پر معجزے جیسے افعال کا ظاہر ہونا

مشائخ صوفیا اور تمام اہل سنت وجماعت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ معجزے اور کرامت کی طرح کا خلافِ عادت فعل کسی کافر کے ہاتھ پر بھی ظاہر ہو سکتا ہے کہ اس کے ظہور میں شبہ کرنے کے تمام اسباب ختم ہو جائیں اور کسی کو اس کے جھوٹا ہونے کا شک نہ ہو۔ لیکن اس طرح کے افعال کا ظاہر ہونا خود اُس کے جھوٹا ہونے کی دلیل ہو گا۔ یہ اسی طرح ہے جیسے فرعون نے چار سو سال عمر پائی کہ اس دوران اُسے کوئی بیماری لاحق نہ ہوئی۔ اور پانی اس کے پیچھے پیچھے بلندی کی طرف بھی جاری رہتا تھا اور جب وہ کھڑا ہوتا تو پانی بھی کھڑا ہو جاتا اور جب وہ چلتا تو پانی بھی اس کے پیچھے جاری ہو جاتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود عقلمندوں کو کوئی شبہ واقع نہیں ہوا کہ وہ خدائی کا جھوٹا دعویٰ کر رہا ہے کیونکہ عقلمند اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ مجسم اور مرکب نہیں ہے ۔ اور اگر اسے یا اس طرح کے اور بہت سے افعال بھی اُس سے ظاہر ہو جاتے تب بھی کسی عقلمند انسان کو اُس کے جھوٹا ہونے میں کوئی شبہ نہ ہوتا۔ اسی طرح باغ ارم کے مالک شداد اور نمرود کے بارے میں جو خلاف عادت افعال کی روایات آتی ہیں اُن کو بھی اسی پر قیاس کر د۔ اور اسی طرح مخبر صادق حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ہمیں خبر دی ہے کہ آخری زمانہ میں دجّال ظاہر ہو گا اور خدائی کا دعویٰ کرے گا۔ دو پہاڑ دائیں بائیں اُس کے ساتھ چلیں گے۔ دائیں طرف کا پہاڑ نعمت کا اور بائیں طرف کا پہاڑ عذاب اور سزا کا ہو گا اور وہ مخلوق کو اپنی الوہیت کی طرف بلائے

گا۔ جو کوئی اُس کی خدائی کو تسلیم نہ کرے وہ اس کو سزا و عذاب میں مبتلا کرے گا۔ اور خدا تعالیٰ اس کی گمراہی کے سبب مخلوق کو ماریں گے اور زندگی دیں گے۔ اور دنیا میں اُس کا حکم مطلق پھیلا دیا جائے گا۔ لیکن اگر اس طرح کے سینکڑوں افعالِ خارقِ عادت بھی اُس سے ظاہر ہو جائیں تو بھی عقلمند انسان کو اس کے جھوٹا ہونے میں کوئی شبہ نہ ہوگا کیونکہ عقلمند آدمی کو اچھی طرح یہ علم ہوگا کہ حقیقی خدا تعالےٰ گدھے پر سوار نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ تغیر پذیر متلون یا بھینگا ہے، لہٰذا اس طرح کے تمام افعال پر استدراج کا حکم لگایا جائے گا۔

نیز جس طرح رسالت کا سچا دعویٰ کرنے والے رسولؐ کے ہاتھ پر خلاف عادت افعال ظاہر ہوتے ہیں جو اس کی صداقت کی دلیل بنتے ہیں اسی طرح رسالت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے شخص کے ہاتھ پر بھی خلاف عادت افعال ظاہر ہو سکتے ہیں لیکن وہ اُس کے جھوٹا ہونے کی دلیل ہوں گے۔ تاہم یہ جائز نہیں کہ کوئی ایسا فعل ظاہر ہو جس میں کسی کو کوئی شبہ واقع ہو کیوں جب شبہے کا اثبات جائز ہوگا تو جھوٹے کو سچے سے اور سچے کو جھوٹے سے پہچان نہ سکیں گے۔ اس وقت طالب نہیں جان سکے گا کہ کس کی تصدیق کرنی چاہیئے اور کس کی تکذیب کرنی چاہیئے! اس جگہ ثبوت کا حکم بالکل ہی باطل ہو جائے گا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ کسی مدعی ولایت کے ہاتھ کرامت کی جنس سے کوئی ایسی چیز ظاہر ہو جو دین میں درست ہو۔ اگرچہ اس کا معاملہ زیادہ اچھا نہ بھی ہو کیونکہ وہ اس سے رسولؐ کی صداقت ثابت کرتا ہے۔ اور اپنے آپ پر حق تعالیٰ کے فضل کو ظاہر کر رہا ہے۔ اور اس فعل کی طاقت اور قوت کو اپنی طرف منسوب نہیں کرتا۔ اور جو آدمی اصل ایمان میں بغیر دلیل کے سچ کہنے والا ہو وہ ولایت کے ساتھ اعتقاد رکھنے میں بھی احوال کے اعتبار سے سچا ہی ہوگا۔ کیوں کہ تمام احوال میں اس کا اعتقاد دلی کے اعتقاد کی طرح ہوتا ہے اگرچہ اس کے اعمال اس کے اعتقاد کے موافق نہیں ہوتے۔ اور نہ ہی دعوئ ولایت اس سے معاملات کو ترک کرنے کے منافی ہے، جس طرح کہ ایمان کا دعوئ اعمال کے ترک کرنے کے منافی نہیں۔ اور در حقیقت کرامت اور ولایت

استدراج: وہ خلاف عادت افعال جو کسی کافر، ملحد یا فاسق و فاجر کے ہاتھ پر ظاہر ہوں۔

حق تعالیٰ کے عطیات میں سے ایک عطیہ ہے یہ بندہ کی کمائی میں سے نہیں ہے۔ پس بندے کا کسب، ہدایت کی حقیقت کے لیے علّت نہیں بنتا۔ اور اس سے پہلے میں بیان کر چکا ہوں کہ اولیاء معصوم نہیں ہوتے کیونکہ معصومیت نبوت کی شرط ہے تاہم اولیاء ان گناہوں سے محفوظ ضرور ہوتے ہیں جو ولایت کی نفی کے مقتضی ہوں۔ اور ولایت کی نفی اُس کے وجود کے بعد اُن چیزوں سے وابستہ ہے جو ایمان کی منافی ہیں اور ایمان کی منافی چیزوں کا ارتکاب تو صرف معصیت ہی نہیں بلکہ اس سے انسان مرتد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت محمد بن علی حکیم ترمذیؒ، حضرت جنید، حضرت ابوالحسن نوریؒ، حضرت حارث محاسبیؒ اور ان کے علاوہ دوسرے بہت سے اہل حقائق کا یہی مذہب ہے لیکن حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ، حضرت ابوسلیمان دارانیؒ، حضرت ابوحمدون قصار اور دوسرے اہل معاملات کا مذہب یہ ہے کہ اطاعت پر ہمیشگی اختیار کرنا۔ ولایت کے لیے شرط ہے لہٰذا جب ولی کا دل کسی گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کرے تو وہ ولایت سے معزول ہو جاتا ہے۔ لیکن میں اس سے پہلے بیان کر چکا ہوں کہ اس امر پر امت کا اجماع ہے کہ گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے کوئی بندہ ایمان سے خارج نہیں ہوتا۔ پس یہ ولایت اس ولایت (ایمان) سے زیادہ فضیلت والی تو نہیں لہٰذا جب ولایت معرفت (ایمان) جو تمام کرامتوں کی بنیاد ہے، معصیت سے ساقط نہیں ہوتی تو یہ محال ہے کہ جو ولایت (طریقت) شرف اور کرامت کے اعتبار سے اُس سے کمتر ہے وہ ارتکابِ معصیت زائل ہو جائے۔ مشائخ کے درمیان یہ بڑا طویل اختلاف ہے جسے یہاں ثابت کرنا میرا مقصد نہیں۔ لیکن اس باب کو سمجھنے میں مشکل ترین چیز یہ ہے کہ تو یقینی علم کے ساتھ جان لے کہ ولی پر کرامت کس حالت میں ظاہر ہوتی ہے۔ صحو کی حالت میں یا سُکر کی حالت میں۔ غلبہ حال میں، یا حال کے قابو میں ہونے کی حالت میں! صحو اور سُکر کی تفصیل حضرت بایزیدؒ کے مذہب میں میں بیان کر چکا ہوں۔ چنانچہ حضرت بایزید، حضرت ذوالنون مصری، حضرت محمد بن حنیف۔ حضرت حسین ابن منصور، حضرت یحییٰ بن معاذ اور صوفیہ کی ایک جماعت (رحمہم اللہ اجمعین) اس مذہب پر ہیں کہ ولی پر کرامت کا ظہور اس کے حالتِ سُکر میں ہوتے

کے علاوہ کسی حالت میں نہیں ہوتا۔ اور جو چیز حالتِ صحو میں ہوتی ہے وہ انبیاء کا معجزہ ہوتا ہے۔ ان کے مذہب میں تو کرامت اور معجزے کے درمیان یہ فرق واضح ہے کہ کرامت کا اظہار ولی پر اُس کے حالتِ سُکر میں ہونے کے وقت ہوتا ہے کہ وہ مغلوب ہو اور دعوت کی پرواہ نہ رکھتا ہو۔ اور نبی پر معجزے کا اظہار اُس کے حالتِ صحو میں ہونے کے وقت ہوتا ہے تاکہ وہ لوگوں کو اس کا چیلنج کرے اور اس کا مقابلہ کر سکنے کی دعوت دے۔ اور صاحب معجزہ کو حکم کے دونوں طرف کا اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ جہاں چاہے معجزے کا اظہار کرے اور جہاں چاہے اُسے چھپائے رکھے۔ لیکن اولیاءؒ کو یہ چیز حاصل نہیں ہوتی کہ انہیں کرامت کے بارے میں اختیار ہو۔ کیوں کہ وہ کبھی کرامت ظاہر کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں لیکن وہ ظاہر نہیں ہوتی اور کبھی وہ ظاہر کرنا نہیں چاہتے اور وہ ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ ولی، دعوت دینے والا نہیں ہوتا کہ اُس کا حال اوصاف کے بقاء کی طرف منسوب ہو بلکہ وہ تو روپوش ہوتا ہے اور اس کا حال صفات کے فناء کی طرف موصوف ہوتا ہے۔ پس ان میں سے ایک (نبی) صاحبِ شریعت ہوتا ہے اور دوسرا (ولی) صاحبِ سِتر! پس یہ ضروری ہوا کہ غیبت، دہشت اور مدہوشی کے علاوہ کسی حالت میں کرامت ظاہر نہ ہو۔ اور اس میں تمام کا تمام تصرّف حق تعالیٰ کی طرف سے ہو۔ اور جس شخص کی حالت یہ ہو اُس کی تمام گفتگو حق تعالیٰ کی ترتیب سے ہوتی ہے۔ اس لیے کہ جس میں بشریت کے خصائل پوری طرح موجود ہوں وہ یا تو غافل ہوتا یا بھولنے والا اور یا پھر اللہ تعالیٰ کو چھوڑ دینے والا ہوتا ہے۔ لیکن انبیاءؑ کرام نہ تو غافل ہوتے ہیں اور نہ ہی بھولنے والے۔ اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑنے والے بیوقوفوں کے سوا کوئی نہیں ہوتے۔ یہاں اس طرح کا تلوّن اور تردّد موجود ہے نہ کہ تحقیق و تمکین! — اور اولیاء کرام جب تک اپنی بشریت کے حال کے ساتھ قائم رہیں۔ حق تعالیٰ سے محجوب رہتے ہیں لیکن جب انہیں مشاہدہ حق نصیب ہو جائے تو وہ مدہوش اور حق تعالیٰ کے انعامات کی حقیقت میں متحیر ہو جاتے ہیں۔ اور کرامت کا اظہار حالتِ کشف کے علاوہ درست نہیں ہوتا کیونکہ وہ قرب الٰہی کا درجہ ہوتا ہے اور یہی وہ

وقت ہوتا ہے کہ اُن کے دل کہاں سونا اور پتھر برابر ہوتے ہیں۔ اور یہ حالت انبیاء کے علاوہ کسی آدمی کی صفت نہیں بنتی البتہ اگر کسی کو حاصل ہوتی تو وہ بالکل عارضی اور غیر مستقل ہوتی ہے اور وہ بھی صرف حالتِ سکر میں ۔ جیسا کہ حضرت حارثہؓ ایک روز دنیا سے کنارہ کش ہوتے ہوئے دنیا میں ہی عقبیٰ کے ساتھ وابستہ ہو گئے اور فرمایا

اعرضت نفسی من الدنیا فاستوت — میں نے اپنے نفس کو دنیا سے کنارہ کش کر لیا تو میرے

عندی حجرھا وذھبھا وفضتھا ومدرھا۔ — لیے سونا اور پتھر اور چاندی اور ڈھیلا سب برابر ہو گئے۔

لیکن دوسرے روز آپ کو لوگوں نے دیکھا کھجور کے درخت پر چڑھے ہوئے کام کر رہے ہیں۔ لوگوں نے پوچھا" اے حارثہ! کیا کر رہے ہو؟" جواب دیا کہ روزی ڈھونڈ رہا ہوں کہ اس کے بغیر چارہ کار نہیں۔ پس اُس وقت اُس حالت میں تھے اور اس وقت اس حالت میں ہیں!۔ پس اولیاء کے صحو کا مقام، عوام کا درجہ ہوتا ہے اور ان کے سُکر کا مقام انبیاء کا درجہ ہوتا ہے۔ اور جب وہ اُس درجے سے واپس آجاتے ہیں تو اپنے آپ کو عام لوگوں کا ایک فرد سمجھتے ہیں۔ اور جب اپنے آپ سے غائب ہو کر حق تعالیٰ کی طرف رجوع کر لیتے ہیں تو ان کا سُکر پاکر، صاف ہو جاتا ہے اور یہ بارگاہِ خداوندی کے لیے مہذب ہو جاتے ہیں اس وقت تمام جہان اُن کے حق میں سونے کی طرح ہو جاتا ہے۔ حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں شعر۔

ذھب اینما ذھبنا ودُرٌ — حیث درنا وفضۃ فی الفضاءِ

(جہاں ہم گئے وہاں سونا اور جدہر ہم گھومے ادھر موتی تھے اور فضاء میں چاندی تھی)

اور میں نے استاد و امام حضرت ابوالقاسم قشیری رحمہ اللہ سے سُنا ہے کہ آپ نے فرمایا" میں نے حضرت لجرانیؒ سے اُن کی ابتدائی حالت سے متعلق دریافت کیا" تو انہوں نے فرمایا" ایک مرتبہ مجھے پتھر کی ضرورت تھی تو سرخس کی ندی سے جو پتھر بھی پکڑتا تھا وہ ایک گوہر (موتی) بن جاتا تھا اور میں اس کو پھینک دیتا۔ اور یہ اس لیے ہوتا تھا کہ پتھر اور موتی اُن کے نزدیک دونوں یکساں تھے بلکہ اس وقت گوہر زیادہ ذلیل تر تھا کیوں کہ انہیں پتھر کی ضرورت تھی نہ کہ موتی کی خواہش۔ اور

حضرت خواجہ امام خزاعی رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے سرخس میں خود سُنا ہے کہ فرماتے تھے: میں بچپن میں ریشم کے کپڑوں کے لیے شہتوت کے پتے لینے ایک محلے میں گیا اور درخت پر چڑھ گیا اور اُس کی شاخ کاٹنے لگا۔ میں درخت پر ہی تھا کہ شیخ ابوالفضل ابن الحسن رحمۃ اللہ علیہ کا اُس گلی سے گزر ہوا۔ نہ تو انہوں نے مجھے دیکھا اور نہ ہی مجھے کوئی شک گزرا کہ وہ حالتِ سُکر میں ہیں اور اُن کا دل حق کی طرف متوجہ ہے۔ پس انہوں نے سر اوپر اٹھایا اور کہنے لگے "بار خدایا! ایک سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے کہ تو نے مجھے ایک پیسہ بھی عنایت نہیں کیا کہ میں سر کے بال ہی منڈوا سکوں۔ اے اللہ! کیا آپ دوستوں کے ساتھ یہی کچھ کیا کرتے ہیں" ! حضرت امام خزاعی فرماتے ہیں کہ "میں نے دیکھا کہ اُسی وقت درختوں کے تمام پتے، ٹہنیاں اور جڑیں سنہری ہو گئیں"۔ تو آپ نے فرمایا "عجیب معاملہ ہے کہ ہمارا مقصد تو دنیا سے اعراض ہے! لیکن دل کی فراخی کے لیے تجھ سے کوئی بات بھی نہیں کر سکتے!۔

حضرت شبلی رحمۃ اللہ کے بارے میں آتا ہے کہ ایک دفعہ چار ہزار دینار دریائے دجلہ میں پھینک دیئے۔ لوگوں نے کہا "آپ یہ کیا کرتے ہیں؛ فرمایا پتھر پانی میں زیادہ بہتر رہتے ہیں،، لوگوں نے کہا "آپ یہ لوگوں میں کیوں تقسیم نہیں کر دیتے؟" تو آپ نے فرمایا "سبحان اللہ! میں اللہ تعالیٰ کے حضور کیا عذر پیش کروں گا کہ حجاب اپنے دل سے اٹھاؤں اور اپنے مسلمان بھائیوں کے دل پر رکھ دوں۔ حالانکہ دین کی شرط یہ نہیں کہ مسلمان بھائیوں کے لیے اپنے سے زیادہ برائی چاہوں اور یہ تمام سُکر کے حالات ہیں۔ جس کی شرح میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ اس جگہ تو میرا مقصد کرامت کا اثبات ہے۔

علاوہ ازیں حضرت جنید۔ حضرت ابوالعباس سیّاری، حضرت ابوبکر واسطی اور حضرت محمد بن علی ترمذی رحمہم اللہ اجمعین جو ارباب طریقت ہیں اُن کا مذہب یہ ہے کہ کرامت صحو اور تمکین کی حالت میں ظاہر ہوتی ہے نہ کہ حالتِ سُکر میں؛ اس لیے کہ اولیاء اللہ ملک کے تدبیر کنندہ اور جہان کے احوال سے آگاہ ہیں۔ اور حق تعالیٰ نے اُن کو جہان کا والی بنایا ہے اور جہان کا حل وعقد اُن کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے اور جہان کے معاملات کو اُن کے ارادوں کے ساتھ ملا دیا ہے۔ پس ہونا یہ چاہیے کہ اُن کی رائے تمام آراء

سے زیادہ صحیح ہو اور مخلوقِ خدا کے لیے تمام دلوں سے زیادہ اُن کے دل ہی شفیق ہوں کیوں کہ وہ بارگاہِ خداوندی میں پہنچے ہوئے حضرات ہیں، جب کہ تلون مزاجی اور سُکر ابتدائی حالات میں ہوتا ہے اور جب بارگاہِ الٰہی میں رسائی حاصل ہو جائے تو تلوین، تمکین کے ساتھ بدل جاتی ہے۔ اس وقت وہ حقیقی ولی بنتا ہے اور اُس کی کرامتیں صحیح ہوتی ہیں ــ اور اربابِ طریقت میں یہ بات معروف ہے کہ اوتار کو چاہیئے کہ وہ ہر رات تمام عالم کے گرد ایک چکر لگائیں اور اگر کوئی ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس وقت اُن کو اپنے وقت کے قطب کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ اپنی توجہ اس طرف مبذول کرے اور اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے وہ خلل زائل فرمادیں۔

باقی وہ حضرات جو یہ کہتے ہیں کہ سونا اور مٹی کا ڈھیلا اُن کے نزدیک یکساں ہے تو یہ سب کچھ سُکر اور مشاہدۂ حق کی نادرستی کی علامت ہے اور اس میں کوئی شرف نہیں کیونکہ شرف اُن مردانِ حق آگاہ کے لیے ہوتا ہے جو صحیح دیکھنے اور درست جاننے والے ہوں کہ سونا اُن کو سونا دکھائی دے اور ڈھیلا اُن کو ڈھیلا ہی نظر آئے تاہم اُن کی آفات سے انہیں آگاہ ہونا چاہیے تاکہ وہ کہہ سکیں کہ

يَا صَفْرَاءُ يَا بيضاءُ غِرِّيْ غَيْرِيْ لَا بِيْ ۔ — اے زرد سونے! اور اے سفید چاندی! میرے علاوہ کسی اور کو دھوکہ دو، تم مجھے دھوکہ نہیں دے سکتے۔

اس لیے کہ میں نے تمہاری خرابیوں کو دیکھ رکھا ہے، پس جو شخص اُس کی خرابیوں کو دیکھ لیتا ہے وہ اس کو محل حجاب سمجھتا ہے اور جب اس کو ترک کر دیتا ہے تو اس کا ثواب حاصل کر لیتا ہے۔ پھر جب کسی آدمی کو سونا بھی ڈھیلا ہی معلوم ہوتا ہے تو اس کا ڈھیلے کو چھوڑ دینا تو درست نہ ہوا۔ تم نے دیکھا نہیں کہ جب حضرت حارثہ حالتِ سُکر میں تھے تو انہوں نے کہا کہ سونا، پتھر، چاندی اور ڈھیلا سب میرے نزدیک برابر ہیں ــ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ صاحبِ صحو تھے انہوں نے دنیا کا مال سنبھال رکھنے کی آفت دیکھ لی اور اس کو ترک کرنے کی روش اختیار کرنے کا ثواب بھی انہیں معلوم ہو گیا تو انہوں نے اپنا ہاتھ اُس سے کھینچ لیا حتیٰ کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے دریافت

کیا کہ "اے ابوبکر! اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑ آئے ہو"؟ تو آپؓ نے عرض کی "اللہ اور اس کے رسول کی محبت چھوڑ آیا ہوں" ـــــ حضرت ابوبکر وراق ترمذی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت محمد بن علی رحمۃ اللہ نے ایک دن مجھے فرمایا "اے ابوبکر! آج میں تمہیں ایک جگہ لے جانا چاہتا ہوں" میں نے عرض کی "جو میرے شیخ کا حکم ہو۔ میں تعمیل کروں گا" چنانچہ میں اُن کے ساتھ چل پڑا ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ میں نے سخت دشوار جنگل دیکھا جس کے درمیان ایک سبز درخت کے نیچے ایک سنہری تخت بچھا ہوا تھا، پاس ہی پانی کا چشمہ جاری تھا اور تخت پر ایک آدمی بیٹھا تھا جس نے بڑا ہی عمدہ لباس زیبِ تن کر رکھا تھا۔ جب حضرت محمد بن علیؒ اُس کے قریب پہنچے تو وہ اٹھا اور آپ کو تخت پر بٹھا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد تمام اطراف سے کچھ حضرات آنے شروع ہو گئے یہاں تک چالیس حضرات وہاں جمع ہو گئے۔ اُس بزرگ نے ایک اشارہ کیا تو اُسی وقت آسمان سے کھانے کی چیزیں اترنے لگیں، ہم سب نے اُن میں سے کھایا۔ پھر حضرت محمد بن علی نے اُس بزرگ سے ایک سوال کیا جس کے جواب میں اُس نے بہت سی گفتگو کی۔ جس کا ایک جملہ بھی میں سمجھ نہ سکا۔ جب کچھ دیر گزری تو حضرت محمد بن علی نے اجازت لی اور واپس لوٹ آئے اور مجھ سے کہا "چلو تم سعادت مند ہو گئے ہو"، تھوڑی دیر میں ہم ترمذ واپس پہنچ گئے۔ تو میں نے آپ سے دریافت کیا "شیخ! وہ کون سی جگہ تھی اور وہ بزرگ کون تھے؟ آپ نے جواب دیا "وہ بنی اسرائیل کا جنگل تھا اور وہ بزرگ قطب مدار علیہ تھے" میں نے عرض کی "شیخ! ہم ذرا سی دیر میں کس طرح ترمذ سے بنی اسرائیل کے جنگل میں پہنچ گئے؟" تو آپ نے فرمایا "ابوبکر! تمہیں وہاں پہنچنے سے غرض ہے نہ کہ پوچھنے سے اور اس کی کیفیت معلوم کرنے سے"ـــــ اور حال کے صحیح ہونے کی علامت ہے نہ کہ سکر کی ـــــ میں نے اس سلسلے کو مختصر کر دیا ہے کیوں کہ اس کی تفصیل میں مشغول ہو جاؤں اور ان معاملات کی شرح بیان کروں تو کتاب طویل ہو جائے گی اور میں اصل مقصد سے قاصر رہ جاؤں گا۔ پس کرامات اور حکایات میں سے بعض وہ دلائل جو اس کتاب سے متعلق ہیں اب میں اُن کو بیان کرتا ہوں تاکہ اگر اللہ تعالیٰ

کی مشیت شاملِ حال ہو تو ان کے پڑھنے سے مریدوں کو تنبیہہ، علماء کو راحت، محققین کے لیے یاد دہانی اور عوام کے لیے یقین کی زیادتی اور شبہات کو رفع کرنے کا باعث ہو۔ وباللہ التوفیق

کراماتِ اولیاء کا بیان،

جان لو کہ جب صحتِ کرامات پر عقلی حجت ثابت ہو چکی اور اس کے ثبوت پر دلائل قائم ہو چکے تو اب نقلی دلائل بھی معلوم ہو جانے ضروری ہیں۔ چنانچہ صحیح آثار میں وارد ہے کہ کرامت کی صحت اور اہلِ ولایت کے ہاتھوں پر خلاف سنت افعال کے ظاہر ہونے پر کتاب و سنت ناطق ہیں اور ان تمام کا انکار نصوصِ قطعیہ کا انکار ہو گا۔ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ہمیں اپنی کتاب میں خبر دی ہے کہ

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ۔ اور ہم نے تم پر بادل کا سایہ کیا اور تم پر من وسلویٰ نازل کیا۔

بادل اُن کے سروں پر سایہ کیے رکھتا تھا اور ہر رات تازہ من وسلویٰ اُن کے لیے اترتا تھا۔ اگر کوئی شخص اعتراض کرے کہ وہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا تو میں جواب دوں گا کہ یہ درست ہے اس لیے کہ اولیاء کی کرامات سب کی سب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہی تو ہیں۔ اور اگر کوئی کہے کہ وہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی موجودگی میں تھا لیکن یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غیبت میں ظاہر ہونے والی کرامت ہے یہ کس طرح آپؐ کا معجزہ ہو گی۔ تو میں جواب میں کہوں گا کہ "وہاں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اُن سے غائب ہو کر کوہ طور پر تشریف لے گئے تو یہ سلسلہ اس وقت بھی جاری رہا، پس غیبت مکانی اور غیبت زمانی میں کیا فرق ہے کہ جب وہاں غیبت مکانی کی صورت میں حضرت موسیٰ کا معجزہ درست ہے تو یہاں حضور علیہ السلام کی غیبت زمانی کے باوجود آپؐ کا معجزہ درست ہو گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں آصف بن برخیا کی کرامت کی خبر دی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ ضرورت درپیش آئی کہ

بلقیس کا تخت اُس کے یہاں پہنچنے سے پہلے یہاں موجود ہو اور حق تعالیٰ نے بھی آصف بن برخیاء کا شرف لوگوں کو دکھانے اور اس کی کرامات کو ظاہر کرنے کا ارادہ فرمایا اور اہلِ زمانہ کو دکھانا چاہا کہ اولیاء کی کرامات جائز ہیں تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا "کون ہے جو بلقیس کے یہاں پہنچنے سے قبل اُس کا تخت یہاں حاضر کر دے"! تو حق تعالیٰ ہمیں بتاتے ہیں کہ

قَالَ عِفْرِيتٌ مِّنَ الْجِنِّ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ تَقُومَ مِنْ مَّقَامِكَ - جنات میں سے ایک دیو نے کہا میں اس کو آپ کے پاس آپ کے دربار سے اٹھنے سے پہلے لا سکتا ہوں"۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا "میں تو اس سے بھی زیادہ جلدی چاہتا ہوں" تو آصف نے عرض کی

أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ يَرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ فَلَمَّا رَآهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهُ - میں آپ کے پاس اس کو آپ کی پلک جھپکنے سے بھی قبل لے آؤں گا۔ پس جب اُس کو دیکھا تو اُن کے پاس رکھا تھا۔

آصف کی اس گفتگو سے حضرت سلیمان نہ تو اس پر ناراض ہوئے، نہ انکار کیا اور نہ ہی اس کو محال قرار دیا۔ اور یہ کسی طرح بھی معجزہ نہ تھا کیونکہ آصف پیغمبر نہ تھے، لامحالہ اسے کرامت ہی ہونا چاہیے کیونکہ اگر معجزہ ہوتا تو اس کا اظہار حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ پر ہوتا، علاوہ ازیں حق تعالےٰ نے ہمیں حضرت مریم سلام اللہ علیہا کے بارے میں بھی خبر دی ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام جب آپ کے حجرے میں آتے تو گرمی کے موسم میں سردیوں کے اور سردی کے موسم میں گرمیوں کے پھل آپ کے پاس موجود پاتے، یہاں تک کہ پوچھتے

أَنَّىٰ لَكِ هَٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ - اے مریم، یہ پھل تمہارے پاس کہاں سے آئے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ "یہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے آئے ہیں۔

حالانکہ بالاتفاق حضرت مریمؑ پیغمبر نہ تھیں ــــ نیز خداوند تعالیٰ نے ہمیں بڑے واضح بیان کے ذریعہ ان کی حالت کی خبر دی ہے کہ

وَهُزِّيٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا۔
اے مریم! تو کھجور کے اس تنے کو اپنی طرف ہلا، تجھ پر یہ تازہ کھجوریں گرائے گا۔

نیز اصحاب کہف کے احوال، کتے کا اُن کے ساتھ گفتگو کرنا، اُن کا سونا اور غار کے اندر اُن کو دائیں بائیں کروٹ بدلوانا، جیسا کہ قرآن میں ہے

وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ۔
اور ہم دائیں بائیں اُن کی کروٹ بدلتے رہتے ہیں اور ان کا کتا بازو پھیلائے بیٹھا ہے۔

یہ تمام افعال عادت کے خلاف ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ معجزہ نہیں ہیں تو لا محالہ کرامت ہیں۔ اور یہ بھی درست ہے کہ یہ کرامتیں زمانہ تکلیف میں امور موہومہ کے لیے مانگی جانے والی دعاؤں کی قبولیت کا نتیجہ ہوں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ایک ساعت میں بہت سے مسافت طے کراتا ہو، اور یہ بھی روایت ہے کہ نامعلوم جگہ سے طعام ظاہر کرنے کی صورت میں ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ لوگوں کے اندیشوں پر آگاہ ہو جانے کی صورت میں ہو ـــــ صحیح احادیث میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے "حدیث نماز" مروی ہے کہ ایک دن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! گذشتہ اُمتوں کا کوئی عجیب واقعہ ہمیں سنائیے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا "تم سے پہلے ایک امت کے تین افراد کسی جگہ جا رہے تھے، جب رات ہوئی تو انہوں نے ایک غار میں ٹھہرنے کا ارادہ کیا اور اُس کے اندر جا کر سو رہے جب رات کا کچھ حصہ گزر گیا تو پہاڑ سے ایک بڑا پتھر لڑھکا اور اُس غار کا منہ بند ہو گیا وہ پریشان ہو کر ایک دوسرے سے کہنے لگے "ہمیں اب اس سے کوئی رہائی نہیں دے سکتا ہاں یہ صورت ہے کہ اپنے اپنے کسی پر خلوص عمل کو خداوند تعالیٰ کے حضور بطور سفارش پیش کریں۔ چنانچہ ایک نے کہا "میرے ماں باپ زندہ تھے اور میرے پاس چند بکریوں کے علاوہ دنیا کی کوئی دولت نہ تھی کہ انہی کا دودھ میں اپنے ماں باپ کو پلاتا تھا، اور میں روزانہ جنگل سے ایندھن کا ایک گٹھر لایا کرتا تھا جس کی قیمت اُن کی اور اپنی خوراک پر خرچ کرتا تھا۔ ایک رات میں ذرا دیر سے گھر آیا تو میرے بکریوں کا

دودھ دوہنے اور اُن کی غذا کو اس میں بھگونے سے پہلے ہی وہ سو گئے، میں وہ پیالہ اپنے ہاتھ میں لیے اپنے پاؤں پر کھڑا رہا حتی کہ صبح ہو گئی تو وہ بیدار ہوئے اور جب وہ کھانا کھا چکے تو پھر میں بیٹھا!۔ وہ کہنے لگا "بار خدایا" اگر میں اس معاملے میں سچا ہوں تو ہمارے لیے کشادگی پیدا فرما اور ہماری فریاد رسی کر"۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اُسی وقت اُس پتھر نے ایک جُنبش لی اور ایک شگاف ظاہر ہو گیا۔ دوسرے آدمی نے کہا" میرے چچا کی ایک خوبصورت بیٹی تھی، میرا دل اس پر فریفتہ ہو گیا تھا، میں اُس کو اپنی طرف دعوت دیتا تھا لیکن وہ مانتی نہ تھی۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ بڑے بہانوں سے ایک سو بیس دینار میں نے اس کی طرف بھیجے تا کہ ایک رات میرے ساتھ خلوت کرے، وہ راضی ہو گئی۔ لیکن جب وہ میرے پاس پہنچ گئی تو میرے دل میں حق تعالیٰ کا ڈر پیدا ہو گیا اور میں نے اُس سے ہاتھ کھینچ لیا اور وہ دینار بھی اس کے پاس ہی رہنے دیے۔ پس اُس نے کہا" بار خدایا اگر میں نے جو کچھ کہا ہے وہ درست ہے تو ہمیں رہائی نصیب فرما" پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس وقت اس پتھر میں ایک دفعہ پھر جُنبش پیدا ہوئی اور وہ شگاف زیادہ ہو گیا لیکن ابھی تک وہ اس سے باہر نہ نکل سکتے تھے۔ چنانچہ تیسرے آدمی نے بیان کیا" میرے پاس مزدوروں کی ایک جماعت کام کرتی تھی، جب کام ختم ہو گیا تو تمام مزدوروں نے اپنی اُجرت مجھ سے وصول کر لی لیکن ایک اُن میں سے غائب تھا۔ میں نے اُسی کی مزدوری کے پیسوں سے ایک بکری خرید لی، دوسرے سال بکریاں دو ہو گئیں اور تیسرے سال وہ چار ہو گئیں اسی طرح ہر سال اُن میں اضافہ ہوتا چلا گیا حتی کہ چند سال گزرنے پر بہت سا مال جمع ہو گیا۔ وہ مزدور میرے پاس آیا اور کہنے لگا" آپ کو یاد ہو گا کہ ایک دفعہ میں نے آپ کے ہاں کام کیا تھا، مجھے اب اُس اُجرت کی ضرورت ہے وہ مجھے دے دیجئے! میں نے اُسے کہا جاؤ! یہ تمام بکریاں تمہارا مال اور ملکیت ہیں، انہیں لے جاؤ! وہ کہنے لگا آپ میرے ساتھ تمسخر کرتے ہیں۔ میں نے کہا نہیں! میں تم سے سچ کہہ رہا ہوں! میں نے وہ مال اُس کو دے دیا اور وہ لے گیا۔

اب اُس نے کہا" بار خدایا! اگر میں اس معاملے میں سچ کہہ رہا ہوں تو ہمارے لیئے کشادگی بھیج"! ۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اب وہ پتھر غار کے دھانے سے دور ہٹ گیا یہاں تک کہ وہ تینوں باہر نکل آئے! ۔ یہ فعل بھی ناقض عادت تھا ۔ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث جریج مشہور ہے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" بچپن میں گہوارے کے اندر تین افراد کے علاوہ کسی نے کلام نہیں کی ۔ ان میں سے ایک تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، اُن کے متعلق تم سب جانتے ہو ۔ اور دوسرے بنی اسرائیل میں جریج نام کے ایک راہب تھے، وہ خود بڑے صاحب مجاہدہ تھے اور اُن کی والدہ بھی پردہ دار خاتون تھیں ۔ ایک دن وہ بیٹے کو دیکھنے آئیں، تو وہ نماز میں مشغول تھے اس لیے عبادت خانے کا دروازہ نہ کھولا ۔ دوسرے پھر تیسرے دن بھی اسی طرح ہوا تو ماں نے تنگدل ہو کر کہا" اے میرے رب! میرے بیٹے کو رسوا کر اور میرے حق کے بدلے اس کی گرفت کر! ۔ اس زمانے میں ایک فاحشہ عورت تھی اُس نے ایک گروہ کے سامنے کہا کہ میں جریج کو گمراہ کر دوں گی ۔ چنانچہ وہ اُن کے عبادت خانے میں آئی لیکن جریج نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی ۔ اس نے واپسی پر راستے میں ایک چرواہے کے ساتھ صحبت کی اور حاملہ ہو گئی ۔ شہر میں آکر اُس نے لوگوں سے کہا کہ یہ حمل مجھے جریج سے قرار پایا ہے ۔ چنانچہ جب اُس عورت نے بچہ جنا تو لوگ جریج کے عبادت خانے کی طرف آئے اور اُنہیں پکڑ کر قصرِ بادشاہی کے دروازے پر لے آئے، جریج نے سب کے سامنے اُس بچے کو کہا" اے لڑکے! تمہارا باپ کون ہے؟ اس بچے نے بول کر کہا اے جریج! میری ماں آپ پر جھوٹا بہتان لگا رہی ہے، میرا باپ تو فلاں چرواہا ہے ۔ اور تیسرا بچہ وہ کہ اُس کی ماں اُسے گود میں لیے اپنے گھر کی دہلیز پر بیٹھی تھی کہ ایک بڑا ہی خوبصورت اور خوش لباس نوجوان گھوڑے پر سوار وہاں سے گزرا عورت نے دعا کی! اے میرے رب! تو میرے اس بچے کو اس سوار کی سی شان و شوکت عطا کرنا" اُس بچے نے کہا" اے اللہ! مجھے اس جیسا ہرگز نہ کرنا" تھوڑی

دیر گزری تو ایک بدنام عورت کا وہاں سے گزر ہوا۔ بچے کی ماں نے دعا کی یا اللہ! میرے بچے کو اس عورت کی طرح نہ کر دینا" اُس بچے نے کہا "یا رب! مجھے اس عورت کی طرح بنا دے"۔ ماں بڑی حیران ہوئی اور کہنے لگی! بیٹے! تم اس طرح کیوں کہتے ہو!" اس بچے نے جواب دیا "ماں! وہ سوار آدمی ظالموں میں سے ایک ظالم تھا اور یہ ایک نیکوکار عورت تھی لیکن لوگ خواہ مخواہ اس کو بُرا کہتے ہیں اور اس کی نیکی سے ناواقف ہیں۔ میں ظالموں میں سے نہیں ہونا چاہتا بلکہ میں چاہتا ہوں کہ نیکوکار لوگوں میں سے ہو جاؤں ــــــ اسی طرح حضرات زاہدہ رضی اللہ عنہا سے متعلق ایک حدیث مشہور ہے جو امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی باندی تھیں کہ وہ ایک دن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپ کو سلام عرض کیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا" اے زاہدہ تم ہمارے یہاں دیر۔ دیر سے کیوں آتی ہو؟ تیرا انتظار ہوتا ہے اور ہم تمہیں اچھا جانتے ہیں۔ انہوں نے عرض کی "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آج میں ایک عجیب خبر لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ آپؐ نے پوچھا" وہ کیا خبر ہے"؟ وہ کہنے لگیں" میں صبح ایندھن کی تلاش میں جنگل کی طرف گئی۔ جب ایک گٹھا باندھ کر میں نے ایک پتھر پر رکھ لیا تاکہ میں اُسے اٹھالوں۔ تو اچانک میں نے دیکھا کہ آسمان سے ایک سوار زمین پر آیا۔ اور مجھے سلام کہہ کر کہنے لگا" محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو میری جانب سے سلام عرض کرنا اور کہنا کہ جنت کے داروغہ رضوان نے کہا ہے کہ آپ کو خوشخبری ہو کہ آپ کی امت کے لیے بہشت کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ آپ کی امت کا ایک گروہ حساب وکتاب کے بغیر اس میں چلا جائے گا۔ دوسرے گروہ کے لیے حساب آسان کر دیں گے اور تیسرے گروہ کو آپ کی شفاعت کے طفیل بخش دیں گے"۔ یہ کہہ کر وہ آسمان کی طرف روانہ ہو گیا۔ اور زمین و آسمان کے درمیان پہنچ کر اُس نے میری طرف توجہ کی تو مجھے اس حالت میں پایا کہ میں وہ لکڑیوں کا گٹھا اٹھانا چاہتی ہوں لیکن اٹھا نہیں سکتی" اُس نے آواز دی" اے زاہدہ! اس گٹھے کو پتھر پر ہی چھوڑ دے" اور اس پتھر سے کہا" اے پتھر! اس گٹھے کو زاہدہ کے ہمراہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گھر کے دروازے تک لے جاؤ! چنانچہ وہ پتھر لکڑیوں

کے اس گٹھے کو اٹھا کر میرے ساتھ حضرت عمرؓ کے گھر کے دروازے تک لایا ہے"۔ یہ سُن کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہمراہ حضرت عمرؓ کے گھر کے دروازے پر تشریف لائے، اور اُس پتھر کے آنے اور جانے کے نشانات دیکھے تو فرمایا "اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر ہے کہ مجھے اس دنیا سے اٹھانے سے قبل ہی رضوان کے ذریعے مجھے میری امت کے بارے میں بشارت دی ہے اور میری امت کی ایک عورت کو حضرت مریم کے درجے تک پہنچا دیا ہے ___ اور مشہور ہے کہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علاء ابن الحضرمی رضی اللہ عنہ کو ایک غزوے پر بھیجا۔ راستے میں دریا کا پانی آپ کے سامنے آگیا۔ آپؓ نے قدم پانی کے اوپر رکھا اور تمام لشکر اس طرح پار گزر گیا کہ کسی کا پاؤں تک پانی سے تر نہ ہوا۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق آتا ہے کہ ایک راستے پر تشریف لے جا رہے تھے کہ ایک گروہ کو دیکھا جو راستے کے درمیان رُکا ہوا ہے کہ ایک شیر نے اُن کی راہ روک رکھی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا "اے کُتے! اگر تو حق تعالیٰ کے حکم سے یہاں بیٹھا ہے تو بیٹھا رہ لیکن اگر ایسا نہیں تو ہمیں راستہ دے تاکہ ہم گزر جائیں۔ شیر یہ سُن کر اٹھا اور حضرت ابن عمر کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار کر کے وہاں سے چلا گیا ___ حضرت ابراہیم نخعیؒ کے متعلق معروف ہے کہ آپ نے ایک آدمی کو دیکھا جو ہوا میں بیٹھا ہوا تھا۔ آپ نے پوچھا "بندہ خدا تم نے کس عمل سے یہ مقام حاصل کیا ہے؟" اُس نے کہا "معمولی سی چیز سے یہ مرتبہ نصیب ہو گیا ہے"، آپ نے پوچھا "وہ کیا چیز ہے؟" تو اس نے جواب دیا "میں نے اپنا منہ دنیا سے موڑ کر حق تعالیٰ کے فرمان کی طرف کر لیا تو مجھ سے پوچھا گیا کہ "اب کیا چاہتے ہو؟" میں نے کہا میری خواہش ہے کہ ہوا کے اندر میرا ٹھکانہ بنا دیا جائے تاکہ میرا دل مخلوق سے الگ ہو جائے ___

یوں ہی جب وہ عجمی جوانمرد مدینہ منورہ میں آیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات کا ارادہ کیا تو لوگوں نے اُسے بتایا کہ امیر المومنین اس وقت جنگل میں کسی جگہ سو رہے ہوں گے۔ وہ گیا اور دیکھا کہ آپ اپنا دُرّہ سر کے نیچے رکھ مٹی پر سو رہے ہیں۔ اپنے آپ سے کہنے لگا۔ ساری دنیا میں اسی کی وجہ سے تو فتنہ بپا ہے اس وقت اس کو قتل کرنا میرے

لیے بڑا ہی آسان ہے، یہ سوچ کر جونہی اُس نے تلوار کھینچی، دو شیر نمودار اور اُس پر حملہ آور ہونے لگے، اس صورت حال کو دیکھ وہ چیخنے اور فریاد کرنے لگا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیدار ہو گئے۔ اُس نے تمام واقعہ آپ کے سامنے بیان کیا اور پھر اسلام قبول کر لیا — یوں ہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس عراق کے علاقہ میں کچھ تحفے آئے جن میں ایک ایسی ڈبیہ بھی تھی جس میں ایسا زہر قاتل تھا کہ کسی بادشاہ کے خزانے میں اتنا خطرناک زہر موجود نہ تھا۔ حضرت خالد بن ولید نے اس ڈبیہ کو کھول کر اُس زہر کو اپنی ہتھیلی پر رکھا اور بسم اللہ پڑھ کر اپنے منہ میں ڈال لیا لیکن آپ کو کوئی نقصان نہ ہوا لوگ بڑے حیران ہوئے اور ان میں سے بہت سے افراد یہ دیکھ کر ایمان لے آئے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ عبادان کے علاقہ میں ایک سیاح تھا جو ویرانے میں رہتا تھا۔ ایک روز میں نے بازار سے کوئی چیز خریدی اور اس کے پاس لے گیا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا "یہ کیا ہے"! میں نے کہا یہ کھانا ہے اور میں اس لیے لے کر آیا ہوں کہ شاید تمہیں اس کی ضرورت ہو! اُس نے اپنے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے ہنس دیا۔ میں نے اُس ویرانے کی دیواروں کے پتھروں اور ڈھیلوں کو دیکھا کہ وہ سب سونا ہو گئے تھے۔ میں اپنے کیے پر بڑا پشیمان ہوا اور جو کچھ لے کر گیا تھا وہیں چھوڑ کر فوراً واپس آ گیا — حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ میں ایک دفعہ ایک چرواہے کے پاس سے گزرا اور اُس سے پانی طلب کیا۔ وہ کہنے لگا "میرے پاس دودھ بھی ہے اور پانی بھی۔ تم کیا پینا چاہتے ہو؟ - میں نے کہا میں پانی پینا چاہتا ہوں۔ وہ اٹھا اور اپنا عصا ایک پتھر پر مارا۔ تو اس میں سے بڑا عمدہ اور شفاف پانی بہہ نکلا۔ میں اس پر بڑا متعجب ہوا تو وہ مجھ سے کہنے لگا حیران ہونے کی ضرورت نہیں کیوں کہ جب کوئی بندہ حق تعالیٰ کا مطیع و فرمانبردار بن جاتا ہے تو سارا جہان اُس کا فرماں بردار بن جاتا ہے۔

حضرت ابودرداء اور حضرت سلیمان فارسی رضی اللہ عنہما ایک دفعہ اکٹھے بیٹھ کر کھانا

کھا رہے تھے کہ اُن کا برتن تسبیح پڑھ رہا تھا جو انہیں سنائی دے رہی تھی۔

اور حضرت ابوسعید خراز رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا کہ ایک عرصہ تک میرا معمول یہ رہا کہ میں ہر تین دن کے بعد ایک دفعہ کھانا کھایا کرتا تھا میں ایک دفعہ جنگل میں جا رہا تھا کہ تین دن کے بعد اور تین دن گزر گئے۔ لیکن مجھے کھانا نہ ملا اور میرے جسم میں ضعف پیدا ہو گیا۔ طبیعت عادت کے مطابق کھانے کا تقاضہ کر رہی تھی کہ میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اتنے میں ہاتف نے آواز دی کہ "اے ابوسعید نفس کی تسکین کے لیے کچھ کھانا چاہتے ہو یا بغیر طعام کے ہی سستی اور ضعف کو ختم کرنے کے لیے کوئی اور ذریعہ چاہتے ہو!" میں نے کہا "الہی میں اپنے اندر چلنے کی قوت چاہتا ہوں (خواہ کسی طرح بھی ہو جائے)" بس فوراً ہی میرے اندر قوت پیدا ہو گئی میں اٹھ کھڑا ہوا اور مزید بارہ منزل بغیر کچھ کھائے پیئے طے کر لیں ـــــ اور مشہور ہے کہ تستر میں حضرت سہل ابن عبداللہ تستری کے گھر کو لوگ آج کل "درندوں کا گھر" کہتے ہیں۔ اور تستر کے رہنے والے اس بات پر متفق ہیں کہ بہت سے درندے اور شیر آپ کے گھر میں آیا کرتے تھے اور آپ اُن کو کھانا کھلاتے اور اُن سے پیار کیا کرتے تھے۔

حضرت ابوالقاسم مرزدی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابوسعید خراز کے ہمراہ کہیں جا رہا تھا کہ دریا کے کنارے ایک نوجوان نظر آیا جو گدڑی پہنے ہوئے تھا اور ایک توشہ دان اُس نے اپنے کندھے کے ساتھ لٹکا رکھا تھا۔ حضرت ابوسعید کہنے لگے، "اس جوان کے چہرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے معاملہ میں کوئی چیز ضرور ہے کہ جب میں اس کے اندر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بارگاہ خداوندی تک پہنچا ہوا ہے لیکن جب اس کے توشہ دان کو دیکھتا ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ ابھی طالبِ راہ ہے! آؤ اس سے پوچھیں تو سہی کہ وہ کیا چیز ہے! چنانچہ حضرت ابوسعید نے پوچھا" اے جوان خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ کون سا ہے؟"۔ اس نے جواب دیا "خدا تک پہنچنے کے دو راستے ہیں! ایک عوام کا راستہ اور دوسرا خواص کا راستہ۔ خواص کے راستے کے بارے میں تو تمہیں کچھ پتہ نہیں، تاہم عوام کا راستہ وہی ہے جس پر تو چل

رہا ہے! اور اپنے معاملہ کو وصول حق کی علت سمجھے بیٹھا ہے اور توشہ دان کو حجاب کا سبب سمجھتا ہے ـــــ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں مصر سے جدہ پہنچنے کے لیے مسافروں کی ایک جماعت کے ہمراہ ایک کشتی میں سوار ہوا۔ کشتی میں ہمارے ساتھ ایک گدڑی پوش نوجوان بھی شریکِ سفر تھا۔ میرے دل میں اس کے ساتھ دوستی کرنے کی خواہش تو تھی لیکن اس کا رعب مجھے اُس کے ساتھ بات چیت کرنے سے روکے ہوئے تھا۔ کیوں کہ وہ اپنے معمولات میں بڑا سخت تھا اور کوئی وقت بھی عبادت سے خالی نہ رہنے دیتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دن ایک سوداگر کا قیمتی موتی گم ہو گیا اور موتی کے مالک نے اسی جوان پر چوری کا الزام لگا دیا۔ کشتی والوں نے اس جوان پر تشدد کرنے کا ارادہ بھی کر لیا لیکن میں نے انہیں سمجھایا کہ محض شبہے کی بنا پر اُس کے ساتھ ایسا سلوک کرنا اچھا نہیں۔ مجھے اُس سے اچھی طرح پوچھ لینے دو! چنانچہ میں اُس کو ایک طرف لے گیا اور بڑی نرمی سے اُسے بتایا کہ ان لوگوں نے اس طرح تجھے چور گردانا ہوا ہے لیکن میں ابھی تک اُن کو سختی اور تشدد سے روکے ہوئے ہوں۔ اب تم بتاؤ کیا کرنا چاہیئے! میری یہ گفتگو سُن کر اُس نے اپنا چہرہ آسمان کی طرف کیا اور کچھ کہا میں نے دیکھا کہ اچانک بہت سی مچھلیاں پانی کی سطح پر نمودار ہوئیں کہ اُن میں سے ہر ایک کے منہ میں ایک قیمتی موتی موجود تھا۔ اُس جوان نے اُن میں سے ایک موتی لیا اور اس سوداگر کو دے دیا۔ جب کشتی والوں نے دیکھا تو وہ نوجوان کشتی سے اُترا اور پانی کی سطح پر پاؤں رکھ روانہ ہو گیا۔ پس جس نے واقعی وہ موتی چُرایا تھا وہ کشتی والوں میں سے ہی تھا اُس نے وہ موتی اُٹھا کر مالک کے سامنے پھینک دیا اور پھر تمام کشتی والے بڑے ہی شرمسار ہوئے ـــــ حضرت ابراہیم اتی رحمۃ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا "میں نے اپنے ابتدائی حالات میں حضرت مسلم مغربیؒ کی زیارت کا ارادہ کیا۔ جب میں اُن کی مسجد میں داخل ہوا وہ نماز کی امامت کرا رہے تھے لیکن "الحمد للہ" غلط پڑھ رہے تھے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا "میری محنت ضائع ہو گئی، تاہم اس رات میں وہیں ٹھہر گیا۔ صبح میں طہارت کے لیے فرات کے کنارے کی طرف چل پڑا، ابھی تھوڑی دیر

ہی گیا تھا کہ ایک شیر میرے راستے میں سویا پڑا تھا۔ یہ دیکھ کر میں واپس مڑا تو ایک اور شیر میرے پیچھے چلا آرہا تھا۔ میں عاجز و لاچار ہو کر شور مچانے لگا۔ یہاں تک کہ حضرت مسلم، عبادت کے حجرہ سے باہر تشریف لے آئے۔ جب شیروں نے اُن کو آتے ہوئے دیکھا تو ان کی تعظیم کی۔ حضرت مسلم نے اُن میں سے ہر ایک کے کانوں کو پکڑا اور انہیں مروڑا اور فرمایا" اے خدا کے کتو! میں نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ ہمارے مہمانوں کو چھیڑا نہ کرو! پھر مجھے مخاطب ہوئے اور کہا " اے ابو اسحٰق! تم مخلوق کی خاطر ظاہر کو درست کرنے میں مشغول ہو گئے ہو یہاں تک کہ مخلوق سے ڈرنے لگے ہو اور ہم حق تعالیٰ کے لئے اپنے باطن کو درست کرنے میں اس حد تک مشغول ہو گئے ہیں کہ تمام مخلوق ہم سے ڈرنے لگی ہے۔

میرے شیخ رحمۃ اللہ نے ایک دن بیت الجن سے دمشق جانے کا ارادہ کر لیا۔ میں بھی ہمراہ تھا۔ کہ بارش برسنا شروع ہو گئی۔ میں کیچڑ میں بڑی ہی مشکل کے ساتھ چل رہا تھا لیکن میں نے دیکھا کہ شیخ کی جوتیاں اور کپڑے بالکل خشک ہیں۔ میں نے حیران ہو کر اس کی وجہ پوچھی تو شیخ رحمۃ اللہ نے فرمایا" ہاں! جب سے میں نے توکل کی راہ سے تمام توہمات کو اٹھا دیا اور اپنے دل کو حرص کی وحشت سے محفوظ کر لیا ہے اس وقت سے خداوند عزوجل نے مجھے کیچڑ سے بچا لیا ہے۔

میں جو علی بن عثمان ہوں ایک دفعہ مجھے ایک ایسا واقعہ درپیش آیا کہ اُس کو حل کرنا میرے لیے دشوار ہو گیا۔ میں نے طوس میں جا کر حضرت شیخ ابوالقاسم گرگانی کی زیارت کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ وہاں پہنچ کر میں انہیں کے گھر کے پاس والی مسجد میں پایا کہ آپ اکیلے وہی میرا واقعہ ایک ستون سے بیان فرما رہے ہیں۔ میں نے کہا " اے شیخ آپ یہ کس سے بیان کر رہے تھے"! تو آپ نے فرمایا" بیٹے! حق تعالیٰ نے اس ستون کو ابھی ابھی میرے سامنے بولنے کی طاقت دی تھی اور اس نے مجھ سے یہ سوال کیا تھا۔

فرغانہ کے قرب و جوار میں ایک گاؤں ہے جسے سلا تک کہتے ہیں، وہاں زمین کے اوتاد حضرات میں سے ایک بزرگ رہتے تھے جنہیں " باب عمر" کہا جاتا تھا۔ اس علاقے

کے تمام درویش بزرگ مشائخ کو "باب" ہی کہتے ہیں۔ اُن کے پاس ایک فاطمہ نام کی بڑھیا بھی رہتی تھی۔ میں اُن کی زیارت کے ارادہ سے روانہ ہوا اور جب ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے پوچھا "تم کس لیے آئے ہو؟" میں نے عرض کی "میں اس لیے حاضر ہوا ہوں تاکہ میں شیخ کی زیارت کر سکوں اور شیخ مجھ پر شفقت کی نظر کریں۔" آپ نے فرمایا "اے بیٹے! میں تو فلاں دن سے مسلسل تم پر نظر کیے ہوئے ہوں۔ اور جب تک مجھے تم سے غائب نہ کر دیا جائے میں برابر تمہیں دیکھتا رہوں گا۔ حضرت ہجویری فرماتے ہیں کہ جب میں نے دنوں اور سالوں کو شمار کیا تو یہ وہی دن تھا جب میری توبہ کی ابتداء ہوئی تھی۔ پھر انہوں نے فرمایا "اے بیٹے! مسافتیں طے کرنا تو بچوں کا کام ہے لہذا اس زیارت کے بعد ہمت کرو کہ تمہیں حضور قلب نصیب ہو جائے کیونکہ کوئی چیز اُس سے بڑی نہیں۔ پھر اُس بڑھیا فاطمہ سے فرمایا "اے فاطمہ! جو کچھ تمہارے پاس ہے لے آؤ تاکہ یہ درویش کھالے، وہ تازہ انگوروں کا ایک طباق لے کر آئیں۔ حالانکہ انگوروں کا وہ موسم نہ تھا۔ اور اُن پر چند تازہ کھجوریں رکھی تھیں حالانکہ فرغانہ میں تازہ کھجوروں کا ملنا ناممکن تھا۔

مہنہ نامی گاؤں میں ایک دفعہ حضرت شیخ ابوسعیدؒ کی قبر کے سرہانے اپنی عادت کے مطابق تنہا بیٹھا تھا کہ میں نے ایک سفید کبوتر کو دیکھا کہ وہ آیا اور اس کپڑے میں چھپ گیا جو قبر پر پڑا ہوا تھا۔ میں سمجھا کہ شاید یہ کسی کے ہاتھ سے چھوٹ کر آیا ہو گا کہ یہاں چھپ گیا ہے۔ لیکن میں نے اٹھ کر غلاف کے نیچے دیکھا تو کوئی چیز وہاں موجود نہ تھی۔ دوسرے اور پھر تیسرے روز بھی اسی طرح مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا اور حیران ہو کر اس کی حقیقت سے میں عاجز آگیا۔ حتیٰ کہ ایک رات میں نے حضرت شیخ ابوسعید کو خواب میں دیکھا تو وہ واقعہ اُن سے پوچھا۔ انہوں نے فرمایا "وہ کبوتر میرے معاملہ کی صفائی ہے جو ہر روز قبر میں میرے ساتھ مصاحبت کرتا ہے۔

حضرت ابوبکر وراقؒ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت محمد بن علی حکیم ترمذیؒ نے اپنی تصانیف کے کچھ اوراق مجھے دیئے اور فرمایا کہ انہیں دریائے جیحون میں پھینک

آؤ! میں نے جب باہر نکل کر انہیں دیکھا تو وہ لطائف و معارف سے پُر تھے، میرے دل نے دریا میں پھینک آنے کی اجازت نہ دی۔ چنانچہ میں نے اپنے گھر میں انہیں رکھ دیا اور واپس آکر کہہ دیا کہ میں دریا میں ڈال آیا ہوں۔ انہوں نے پوچھا تو پھر تم نے کیا دیکھا! میں نے کہا میں نے تو کچھ بھی نہیں دیکھا۔ انہوں نے فرمایا "اس کا مطلب ہے کہ تم پھینک کر نہیں آئے۔ میں نے سوچا کہ مشکلیں دو ہو گئیں۔ ایک یہ کہ حضرت پانی میں ڈال آنے کا حکم کیوں دے رہے ہیں اور دوسری یہ کہ وہ کون سی بُرہان ہے جو ان کو دریا میں ڈالنے سے ظاہر ہو گی۔ بہر حال میں نے واپس آکر اُن اوراق کو اٹھایا اور درد دل کے ساتھ جیحون کے کنارے کھڑے ہو کر اُن اجزاء کو دریا میں ڈال دیا۔ میں نے دیکھا کہ پانی دو حصوں میں بٹ گیا اور اُس میں سے ایک صندوق نمودار ہوا جس کا ڈھکنا کھُلا ہوا تھا۔ یہ اوراق اس صندوق کے اندر جا پڑے تو اس کا ڈھکنا برابر ہو گیا اور پانی اپنی پہلی حالت پر جاری ہو گیا۔ میں نے واپس آکر تمام صورتِ حال بیان کی تو حضرت نے فرمایا "ہاں اب تم واقعی ڈال کر آئے ہو"! میں نے کہا "اے شیخ آپ کو خداوند عزوجلّ کی عزت کی قسم! مجھے یہ راز ضرور بتائیے! آپ نے فرمایا "جان لو کہ میں نے اہل تصوف کے علوم پر مشتمل ایک کتاب تصنیف کی تھی جس کی تحقیق اور سمجھنا تمام عقلوں کے لیے مشکل تھا اس لیے میرے بھائی حضرت خضر علیہ السلام نے وہ مجھ سے مانگ لی تھی۔ چنانچہ اس صندوق کو مچھلیاں اٹھا کر لائی تھیں اور خداوند تعالیٰ نے پانی کو حکم دیا تھا کہ وہ اس کو حضرت خضر علیہ السلام تک پہنچا دے۔

اس طرح کی بہت سی حکایات بھی میں بیان کر دوں تو بھی وہ ختم نہ ہوں لیکن اس کتاب سے میرا ارادہ فروع اور معاملات میں طریقت کے اصولوں کو ثابت کرنے کا ہے۔ نقل کرنے والوں نے خود بہت سی کتابوں میں ان حکایات کو جمع کر دیا ہے اور واعظ لوگ بر سر منبر اُس کو نشر بھی کرتے رہتے ہیں ــــــ اس لیے اب اس کتاب میں مضمون کی پیروی کرتے ہوئے وہ فصلیں لاتا ہوں جو اس علم طریقت کے ساتھ تعلق رکھتی

ہیں تاکہ اس راز کو حاصل کرنے کے لیے کسی اور جگہ جانے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ انشاء اللہ عزوجلّ۔

انبیاء کی اولیاء پر فضیلت کا بیان

جان لو کہ جملہ احوال و اوقات میں تمام مشائخ طریقت اس بات پر متفق ہیں کہ اولیاء کرام انبیاء علیہم السلام کے تابع اور اُن کی دعوت کے تصدیق کنندہ ہیں اور انبیاء علیہم السلام اولیاء سے افضل ہیں۔ اس لیے کہ ولایت کی انتہاء نبوت کی ابتداء ہوتی ہے تمام انبیاء علیہم السلام ولی بھی ہوتے ہیں لیکن اولیاء میں سے کوئی نبی نہیں ہوتا۔ انبیاء صفات بشریت کی نفی میں ہمیشہ متمکن رہتے ہیں لیکن اولیاء کو اس میں عارضی عمل دخل حاصل ہوتا ہے کہ اس گروہ پر نفی صفاتِ بشریت کی حالت طاری ہوتی ہے جب کہ گروہ انبیاء کے لیے ایک مخصوص مقام ہے۔ اور جو مرتبہ اولیاء کو حاصل ہوتا ہے انبیاء کے لیے تو وہ حجاب ہوتا ہے۔ علمائے اہل سنت اور محققین طریقت میں سے کسی نے اس معاملے میں کبھی اختلاف نہیں کیا ـــ سوائے حشوی گروہ کے جو اہل خراسان میں سے خدا تعالیٰ کے جسم کے قائل ہیں اور اصول توحید میں متناقض کلام کرتے ہیں کیوں کہ وہ اس طریقت کی اصل کو ہی نہیں پہچانتے لیکن پھر بھی اپنے آپ کو ولی کہتے ہیں۔ ٹھیک ہے وہ ولی ہوں گے لیکن شیطان کے ولی ـــ وہ کہتے ہیں کہ اولیاء کرام کو انبیاء پر فضیلت حاصل ہے، ان کے لیے یہ گمراہی کافی ہے کہ وہ ایک جاہل کو محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل جانتے ہیں ـــ اسی طرح ایک دوسرا گروہ مشبہین میں سے بھی ہے جو اس طریقت کے ساتھ اپنی وابستگی کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی دوسری شے میں حلول کر سکتے ہیں۔ اوپر سے نیچے نازل ہوتے ہیں۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتے ہیں اور حق تعالیٰ کا مختلف حصوں میں تقسیم ہو جانا بھی جائز ہے۔ اور ان باتوں کی تفصیل انشاء اللہ میں ان دونوں بُرے مذاہب کے بیان میں پیش کروں گا۔ خلاصہ کلام یہ کہ دونوں گروہ اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود انبیاء کی فضیلت

کی نفی میں برہمنوں کے ساتھ متفق ہیں۔ اور جو کوئی انبیاء کی تخصیص و فضیلت کا انکار کرے وہ کافر ہوتا ہے۔ پس انبیاء علیہم السلام داعی اور امام ہیں اور اولیاء کرام تمام نیک کام کرنے میں اُن کے فرمانبردار ہیں۔ اور مقتدی کا امام سے افضل ہونا محال ہے، خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جان لو کہ اگر تمام اولیاء کے جملہ احوال و انفاس اور رتبوں کو ایک سچے نبی کے ایک قدم کے مقابلے میں بھی لایا جائے تو وہ تمام احوال و انفاس ہیچ اور کمتر ہوں گے کیونکہ اولیاء حق تعالیٰ کے طالب اور اس کی رضا کے مرتبے کی طرف چلنے والے ہوتے ہیں لیکن انبیاء کرام حق تعالیٰ تک پہنچے ہوئے اور منزلِ مقصود کو حاصل کیے ہوتے ہیں اور حق تعالیٰ کی طرف سے مخلوق کے لیے دعوت الی اللہ کا حکم لے کر آتے اور اس دعوت کے ذریعہ ایک قوم کو حق تعالیٰ کی طرف لے جاتے ہیں۔

اگر ان مذکورہ بے دین گروہوں میں سے (اللہ اُن پر لعنت کرے) کوئی شخص یہ اشکال کرے کہ عادت اور طریقِ کار تو اس طرح ہے کہ جب کسی بادشاہ کی طرف سے کوئی قاصد آتا ہے تو جس کی طرف اُس کو بھیجا جا رہا ہے وہ اس قاصد سے افضل ہوتا ہے۔ جیسا کہ انبیاء کرام علیہم السلام، جبرئیل علیہ السلام سے افضل ہیں کہ جبرئیل علیہ السلام کو قاصد بنا کر انبیاء کی طرف بھیجا جاتا ہے۔ لیکن ان کا یہ اشکال بالکل غلط ہے کیوں کہ میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی فرشتہ پیغام لے کر کسی ایک فردِ واحد کی طرف آئے تو اس فردِ واحد "مرسل الیہ" کو اُس فرشتے سے افضل ہی ہونا چاہیئے جیسا کہ جبرئیل علیہ السلام کو انبیاء میں سے ایک ایک کے پاس بھیجا گیا اور اُن میں سے ہر ایک حضرت جبرئیل سے افضل تھا لیکن جب کوئی رسول اور پیغامبر کسی جماعت یا پوری قوم کی طرف بھیجا جائے تو لامحالہ وہ رسول اس جماعت سے افضل ہوگا۔ جیسا کہ پیغمبروں کا اُمتوں کے مقابلے میں معاملہ ہے۔ اور اس بارے میں کسی بھی عقلمند کو کوئی اشکال واقع نہیں ہوتا۔ پس انبیاء کرام کا ایک فرد تمام اولیاء سے افضل ہوگا۔ کیوں کہ اولیاء جب عادت اور عرف کے مطابق انتہائی مقام تک پہنچ جاتے ہیں تو مشاہدے کی خبر دیتے ہیں اور بشریت کے حجاب سے خلاصی پا جاتے ہیں باوجودیکہ وہ عینِ بشر ہی ہوتے ہیں۔ لیکن رسول کا تو پہلا قدم ہی مشاہدۂ حق میں ہوتا ہے۔ جب رسول کی ابتدا ہی ولی کی انتہا

ہے تو ولی کو نبی پر قیاس کرنا درست نہیں ہو سکتا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اولیاء میں سے تمام طالبانِ حق اس بات پر متفق ہیں کہ تمام کثرتوں کا ایک وحدت میں گم ہو جانا ولایت کا کمال ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جب بندہ دوستی کے غلبہ میں اس درجے تک پہنچ جائے کہ اُس کی عقل اپنے افعال کو دیکھنے میں مغلوب ہو جائے اور محبت الٰہی کے جذبہ میں تمام جہان کے فاعل کو ہو بہو وہی جاننے لگے۔ جیسا کہ حضرت ابو علی رودباری رح کہتے ہیں کہ

لَوْ زَالَتْ عَنَّا رُؤْیَتُہ مَا عَبَدْنَاہُ اگر ہم سے اس کا دیدار زائل ہو جائے تو ہم اُس کی عبادت ہی نہ کر سکیں۔

یعنی ہم سے عبودیت کا نام ہی ساقط ہو جائے کیونکہ ہم اُس کے دیدار کے بغیر عبادت کا شرف حاصل نہیں کر پاتے۔ لیکن انبیاء کرام کے لیے یہ صورت ابتدائی حالات میں ہی موجود ہوتی ہے کیونکہ اُن کے معاملہ میں تفرقہ کوئی صورت اختیار نہیں کر سکتا کہ وہ نفی و اثبات، سلوک و عدم سلوک، توجہ و اعراض اور ابتداء و انتہاء ہر معاملے میں عین جمع کے مقام پر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب ابتدائے حال سورج کو دیکھا تو فرمایا

هٰذَا رَبِّیْ ۔ یہ میرا رب ہے۔

اور چاند اور ستارے کو دیکھا تو بھی فرمایا "هٰذَا رَبِّیْ" اس لیے کہ وہ اپنے دل پر محبتِ الٰہی کے غلبہ اور تمام احوال کے عین مقام جمع میں ثابت ہونے کی وجہ سے کسی غیر کو نہ دیکھتے تھے اور اگر دیکھا تو اسی مقامِ جمع کی آنکھ سے دیکھا اور عین دیدار میں اپنے دیدار سے بیزاری کا اظہار کر دیا اور فرمایا

لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ ۔ میں ڈوب جانے والوں سے محبت نہیں کرتا۔

گویا آپ کے حال کی ابتداء بھی جمع اور انتہاء بھی جمع کیونکہ ولایت کی ایک ابتداء ہوتی ہے اور ایک انتہاء لیکن نبوت کے لیے ابتداً و انتہاً نہیں ہوتی کہ وہ نبی جب سے ہوتا ہے نبی ہوتا ہے اور جب تک رہتا ہے نبی ہی رہتا ہے۔ اور دنیا میں موجود ہونے سے

پہلے بھی وہ اللہ تعالیٰ کے علم اور ارادے میں نبی ہوتا ہے۔

حضرت بایزید رحمۃ اللہ سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ انبیاء کے حال سے متعلق کیا کہتے ہیں تو آپ نے جواب دیا" انبیاء کے معاملے میں ہمارے علم کا کوئی دخل نہیں کہ ہم جس قدر بھی ان کے بارے میں تصور کرتے ہیں وہ آخر ہماری طرف سے ہی تو ہو گا لیکن حق تعالیٰ نے انبیاء کرام کو نفی و اثبات کے اُس درجے میں رکھا ہوا ہے کہ مخلوق کی نگاہ وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔ پس جس طرح اولیاء کا مرتبہ و مقام مخلوق کے ادراک سے بالا تر ہے اسی طرح انبیاء کا مرتبہ اولیاء کے ادراک سے بہت بلند ہے"۔ اور حضرت بایزیدؒ جو کہ زمانہ کی حجت ہوئے ہیں، فرماتے ہیں کہ

اول ما سرتُ الی الوحدانیۃ فصرت طیرا جسمہ من الاحدیۃ وجناحہٗ من الدیمومیہ فلم ازل الطیر فی ھواء الھویۃ حتّٰی الی ھَوَاء التنزیۃ ثم اشرفت علی میدان الازلیۃِ ورایتہٗ شجر الاحدیۃ فنظرتُ فعلمتہٗ ان ھذا کُلّہٗ غیرہ۔

یعنی پہلے جب میں نے وحدانیت کی طرف سیر کی تو میں نے دیکھا کہ میرے باطن کو آسمان پر لے گئے ہیں اور اس نے کسی چیز کی طرف توجہ نہ کی۔ اُسے دوزخ و بہشت دکھائی لیکن اُس نے اُن کی طرف التفات نہ کیا اور مجھے کائنات اور پردوں کے اوپر لے گئے تو میں ایک پرندہ بن گیا جس کا جسم احدیت سے اور بال و پر دوام سے بنے ہوئے تھے پس وہ مسلسل اڑتا ہوا تنزیہہ کی ہوا کے دوش پر میدان ازلیت پر مشرف ہو گیا۔ اس میدان میں میں نے احدیت کے درخت کو دیکھا جب اس میں غور کیا تو وہ سب کچھ میں خود ہی تھا۔

میں نے کہا "بار خدایا! مجھے اپنی خودی سے چھٹکارا حاصل نہیں ہوا اور اپنی خودی کے ہوتے ہوئے مجھے تجھ تک رسائی حاصل نہیں ہو سکتی اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ تو حکم آیا کہ اے بایزید! تیرا اپنی خودی سے خلاصی پانا ہمارے دوست حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اپنی آنکھوں کو اُن کے قدموں کی خاک کے سُرمہ سے روشن کر اور ان کی پیروی پر مداومت کر" تو تُو اپنی خودی سے نجات پالے گا"۔ یہ حکایت بڑی طویل ہے اور اہل طریقت، اس کو حضرت بایزیدؒ کی معراج قرار دیتے ہیں۔ اور معراج حق تعالیٰ

کے قرب سے عبارت ہے۔ پس انبیاء کی معراج تو جسم اور بدن کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے لیکن اولیاء کی معراج ارادے اور باطن کے ساتھ ہوتی ہے۔ اور پیغمبروں کا جسم، پاکیزگی صفائی اور قرب کے اعتبار سے اولیاء کے دل اور باطن کی طرح ہوتا ہے، اور یہ فضیلت بڑی واضح ہے، اور یہ اس طرح ہے کہ ولی کو اپنے حال میں مغلوب کرتے ہیں تاکہ وہ مست ہو جائے پھر اس کے باطن کو اس سے غائب کر دیتے ہیں اور اُس کو قرب الٰہی کے لیے آراستہ کر دیتے ہیں۔ اور جب وہ صحو کی حالت میں واپس آجاتا ہے تو وہ تمام دلائل اُس کے دل پر نقش ہو چکے ہوتے ہیں اور اُس کا علم ولی کو حاصل ہو چکا ہوتا ہے۔ پس یہ ان کے درمیان بڑا فرق ہے کہ نبی کے تو جسم کو قربِ الٰہی میں لے جایا جاتا ہے لیکن ولی کے صرف فکر کو وہاں تک پہنچایا جاتا ہے ــــ واللہ اعلم بالصّواب۔

انبیاء اور اولیاء کی فرشتوں پر فضیلت

جان لو کہ اہل سنت وجماعت اور جمہور مشائخ طریقت اس بات پر متفق ہیں کہ تمام انبیاء کرام اور وہ اولیاء جو گناہوں سے محفوظ ہیں، فرشتوں سے افضل ہیں۔ بخلاف معتزلہ کے کہ وہ فرشتوں کو انبیاء سے افضل سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فرشتے مرتبے کے اعتبار سے بلند تر، پیدائش کے اعتبار سے زیادہ لطیف اور حق تعالیٰ کے سب سے زیادہ فرمانبردار ہیں" ہم کہتے ہیں کہ حقیقت تمہارے خیال کے خلاف ہے کیوں کہ فرمانبردار جسم، رتبۂ بلند اور خِلعتِ لطیف افضلیت کی علّت نہیں ہو سکتے کہ فضیلت اُس کو حاصل ہوتی ہے جس کو حق تعالیٰ نے عطا فرمائی ہو کیونکہ یہ سب امور جو معتزلہ بیان کرتے ہیں وہ ابلیس کو بھی حاصل تھے لیکن سب کا اتفاق ہے کہ وہ ملعون اور رسوا ہو گیا۔ پس فضیلت اُس کے لیے ہوتی جس پر حق تعالیٰ اپنا فضل فرمائیں اور دوسری مخلوق پر اُس کو بزرگی عطا فرمائیں۔ اور انبیاء کرام کی فضیلت کی دلیل یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا کہ وہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں اور یہ بات ثابت ہے کہ جس کو سجدہ کیا جائے اُس کا مرتبہ سجدہ کرنے والے سے زیادہ بلند ہوتا ہے۔ اور اگر وہ اعتراض کریں کہ خانہ کعبہ پتھر اور جماد ہے اور مومن اس سے افضل

ہے پھر بھی وہ اس کو سجدہ کرتا ہے تو اسی طرح یہ بھی درست ہے کہ ملائکہ حضرت آدم علیہ السلام سے افضل ہوتے ہوئے بھی اُن کو سجدہ کریں۔ تو میں جواب دوں گا کہ کوئی شخص بھی یہ نہیں کہتا کہ مومن، خانہ کعبہ یا محراب یا دیوار کو سجدہ کرتے ہیں بلکہ تمام حضرات یہی کہتے ہیں کہ مومن حق تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں۔ لیکن حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں کلامِ الٰہی کی موافقت میں سب لوگ یہی کہتے ہیں کہ فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے ذکر کیا کہ

اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ۔ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو۔

لیکن جب حق تعالیٰ نے مومنوں کے سجدے کا ذکر کیا تو فرمایا۔

وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ۔ اپنے رب کو سجدہ کرو، اسی کی عبادت کرو اور نیک کام کرو۔

پس خانہ کعبہ، حضرت آدم علیہ السلام کی طرح نہیں ہو سکتا۔ نیز یہ کہ کوئی مسافر اپنی سواری پر بیٹھے ہوئے خدا تعالیٰ کی عبادت کرنا چاہے تو اگرچہ اُس کا رُخ خانہ کعبہ کی طرف نہ ہو وہ عبادت کر سکتا ہے اور اسی طرح جس آدمی پر خانہ کعبہ کی سمت گم ہو جائے کہ جنگل یا بیابان کے اندر اُس پر قبلہ کے دلائل واضح نہ ہو سکیں تو وہ جس سمت بھی منہ کر کے نماز پڑھ لے درست ہو گا اور وہ فرمانِ خداوندی کو پورا کرنے والا ہو جائے گا۔ لیکن حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے میں فرشتوں کے لیے کوئی عذر نہ تھا۔ وہ ایک جس نے خود عذر پیدا کیا وہ ملعون اور رسوا ہو گیا صاحبِ بصیرت کے لئے یہ دلائل بڑے واضح ہیں۔ نیز یہ بھی جان لو کہ ملائکہ اگر معرفتِ حق میں برابر ہو بھی جائیں تو بھی وہ مرتبے اور مقام میں انبیاء کے برابر کیسے ہو سکتے ہیں۔ کیوں کہ اُن کی خلقت اور پیدائش میں شہوت نہیں، اسی طرح نہ اُن کے دل میں حرص اور فساد ہے اور نہ ہی اُن کی طبیعت میں حیلہ اور بہانہ۔ حق تعالیٰ کی اطاعت اُن کی غذا ہے اور حق تعالیٰ کے فرمان پر قائم رہنا اُن کا طریقہ۔ لیکن آدمی کی سرشت میں شہوت ملی ہوئی ہے۔ اُس کے وجود میں ارتکاب معاصی کا احتمال موجود ہے، اُس کے دل میں دنیا کی زینت اثر انداز ہے، لالچ اور حیلہ سازی اُس کی طبیعت میں منتشر ہے اور پھر یہ کہ شیطان کو اُس کے جسم میں اس قدر غلبہ حاصل ہے کہ وہ اس کی رگوں میں خون کی طرح گردش کرتا ہے، اور مزید برآں تمام گناہوں کو دعوت

دینے والا نفس اُس کے ساتھ ملا ہوا ہے ۔ پس جس کسی کے وجود میں یہ تمام وصف موجود ہوں وہ اگر غلبہ شہوت کے امکان کے باوجود فسق و فجور سے پرہیز کرے اور حرص کی موجودگی کے باوجود دنیا سے اعراض کرے۔ اور دل میں شیطانی وسوسوں کے باوجود گناہوں سے اجتناب کرے اور نفسانی فسادات سے روگرداں ہو کر عبادت پر اقامت کرنے اور اطاعت پر ہمیشگی کرنے اور نفس پر مجاہدہ کرنے اور شیطان کے ساتھ مقابلہ کرنے میں مشغول ہو جائے تو در حقیقت یہ شخص اُس فرشتے سے افضل ہو گا جس کی صفت میں شہوت کی معرکہ آرائی نہ ہو اور جس کی طبیعت میں غذا اور لذتوں کا ارادہ نہ ہو۔ نہ اُسے بیوی بچوں کا غم ہو اور نہ خویش و اقارب کی فکر، نہ اُسے اسباب و آلات کی احتیاج ہو اور نہ ہی وہ امیدوں اور آرزوؤں میں مستغرق ہو۔ مجھے اپنی زندگی کی قسم ہے میں اُس آدمی پر بڑا حیران ہوتا ہوں جو اعمال میں فضیلت دیکھتا ہے یا عزت، حسن و جمال میں دیکھتا ہے، یا بزرگی جذب و منال میں دیکھتا ہے ۔ ایسا آدمی بہت جلد اپنے آپ سے وہ بزرگی اور نعمت زائل دیکھے گا ۔ وہ فضیلت، حق تعالیٰ کے فضل و کرم میں اور عزت، حق تعالیٰ سبحانہ کی رضا میں اور بزرگی حق تعالیٰ کی معرفت اور اُس پر ایمان لانے میں کیوں نہیں دیکھتا تاکہ وہ اپنے آپ پر اس نعمت کو ہمیشہ پائے اور اپنے دل کو دونوں جہان میں اُسی کے ساتھ خوش اور شادمان دیکھے ۔ جبرئیل علیہ السلام جنہوں نے کئی ہزار سال خلعت کے انتظار میں عبادت کی بالآخر انہیں خلعت، محمد مصطفےٰ صلوات اللہ علیہ کی غاشیہ برداری کی صورت میں عطا ہوئی کہ معراج کی رات وہ آپ کی سواری کی خدمت کرتے رہے۔ وہ اُس ذاتِ پاک سے کس طرح افضل ہو سکتے ہیں جنہوں نے دنیا میں نفس کو ریاضت میں مبتلا کر رکھا، روز و شب مجاہدہ کرتے رہے اور حق تعالیٰ نے اُن پر اپنی عنایت کرتے ہوئے انہیں اپنے دیدار کا شرف نصیب کیا اور انہیں ہر قسم کے وساوس سے سلامت رکھا۔ نیز یوں بھی ہوا کہ جب فرشتوں کی نخوت اپنی حد سے بڑھ گئی اور اُن میں سے ہر ایک نے اپنی صفائی کے نور اور اپنے معاملہ کو حجت بنا کر انسان کے بارے میں اپنی زبان ملامت دراز کی تو حق تعالیٰ نے اُن کے حال کو اُن پر ظاہر کرنا چاہا اور فرمایا کہ تم اپنے میں سے لیے

تین افراد کو منتخب کرو جو تم میں زیادہ بزرگ ہیں اور تمہیں ان پر اعتماد ہو تاکہ وہ تینوں زمین پر جا کر زمین کے خلیفہ بنیں اور مخلوق کی اصلاح کریں اور لوگوں کے درمیان عدل والصاف قائم کریں۔ فرشتوں نے اپنے میں سے تین فرشتوں کو منتخب کیا لیکن ایک نے تو اُن میں سے زمین پر آنے سے پہلے ہی زمین کی آزمائش دیکھ کر خداوند قدوس کے حضور درخواست کی کہ اُسے واپس کر دیا جائے، باقی دو زمین پر آئے، خداوند تعالیٰ نے اُن کی خلقت کو تبدیل کر دیا یہاں تک کہ اُن میں کھانے، پینے کی آرزو اور شہوت کی طرف توجہ پیدا ہوگئی۔ تو وہ زمین پر آتے ہی کھانے پینے کے آرزو مند ہو گئے۔ اور شہوت کی طرف انہوں نے میلان کیا۔ حتیٰ کہ حق تعالیٰ نے انہیں اُن کے افعال کی بدولت سزا سے دوچار کیا۔ اور فرشتوں نے اپنے اوپر انسانوں کی فضیلت کو واضح طور پر جان لیا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ مومنوں میں سے خواص، فرشتوں کے خواص سے زیادہ افضل ہیں اور عوام مومنوں کو عام فرشتوں پر فضیلت حاصل ہے۔ پس مومنوں میں سے جو حضرات معصوم اور محفوظ ہیں، وہ جبرئیل و میکائیل جیسے خاص فرشتوں سے افضل ہیں اور جو مومن معصوم و محفوظ نہیں وہ محافظ اور کراماً کاتبین جیسے فرشتوں سے افضل ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اس موضوع پر کلام بہت ہے اور مشائخ میں سے ہر ایک نے اس پر کچھ نہ کچھ کہا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جس کو جس پر چاہتے ہیں فضیلت نصیب فرماتے ہیں اور توفیق اللہ ہی کی جانب سے ہوتی ہے۔

تصوف اور صوفیاء کے ایک دوسرے کے ساتھ اختلاف میں فرقہ حکیمیہ کے یہی متعلقہ امور تھے جنہیں میں نے اختصار کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ جان لو کہ ولایت، اسرار خداوندی میں سے ایک سِرّ ہے جو تربیت کے بغیر ظاہر نہیں ہوتا اور ولی کو ولی کے علاوہ کوئی نہیں پہچان سکتا۔ کیوں کہ اگر اس حقیقتِ ولایت کا تمام عقلمندوں پر اظہار جائز ہوتا تو دوست، دشمن سے اور واصل الی اللہ، غافل سے ممتاز نہ ہو سکتا۔ پس خداوند تعالیٰ نے یوں ہی چاہا کہ دوستی کے موتی کو مخلوق کی رسوائی کے صدف میں رکھ کر آزمائشوں کے دریا میں ڈال دے تاکہ طالبِ حق، حق تعالیٰ کی محبت میں اپنی

جان خطرے میں ڈال کر اس مہلک دریا کو عبور کرے اور دریا کی گہرائی میں غوطہ زن ہو کر یا تو گوہر مراد حاصل کرے یا اسی حالت میں دنیا سے ختم ہو جائے ۔

میں اس مضمون کو طول دینا چاہتا تھا لیکن تمہارے دلی ملال اور طبعی نفرت کا خوف رکاوٹ بن گیا ۔ تاہم مرید حق کے لیے اس طریقت میں اتنا ہی بیان کافی ہے ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

فرقہ خرازیہ

خرازی فرقہ کے حضرات حضرت ابو سعید خراز رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں جن کی تصانیف طریقت کے بیان میں بڑی واضح ہیں، تجرید و انقطاع کے اندر آپ بڑی بلند شان کے مالک تھے اور بقاء و فنا کی اصطلاحیں آپ نے ہی جاری کی ہیں اور آپ اپنی طریقت کو انہی دو اصطلاحوں میں مضمر کر دانتے تھے ۔ اب میں ان کے معنی بیان کروں گا اور ساتھ ہی اُن غلطیوں کی نشاندھی بھی کروں گا جو بعض لوگوں نے اس بارے میں اختیار کر رکھی ہیں، تاکہ تمہیں علم ہو جائے کہ اُن کا مذہب کیا ہے اور اس گروہ کا مقصد ان مستعمل اصطلاحوں سے کیا ہے ۔

بقا اور فنا کا بیان

خدا تعالیٰ عزوجل فرماتے ہیں کہ

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللهِ بَاقٍ۔

جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے ۔

اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا ہے کہ

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔

جو کچھ زمین پر ہے فنا ہونے والا ہے اور تیرے پروردگار کی ذات باقی رہ جائے گی جو بڑی شان اور عزت والا ہے ۔

جان لو کہ علم لغت کی رو سے فنا اور بقا کے معنی اور ہیں اور اہل طریقت کے بیان

میں ان کے معنی کچھ اور ہیں۔ اہل ظواہر، فرقہ خرازیہ کی کسی عبارت میں اس قدر حیران نہیں جتنا کہ اس عبارت میں حیران ہیں۔ پس علمی زبان اور لغت کی رو سے بقا کی تین قسمیں ہیں ——— (۱) ایسی بقا کہ اس کی طرفِ اول بھی فنا میں ہو اور طرفِ آخر بھی فنا میں ہو، جیسے یہ جہان کہ ابتدار میں موجود نہ تھا اور انتہار میں بھی موجود نہ رہے گا تاہم اس وقت یہ باقی ہے۔

(۲) وہ بقا کہ جو شروع میں ہرگز موجود نہ تھی۔ پھر وہ موجود ہو گئی اور اب وہ ہرگز فنا نہیں ہوگی۔ جیسے جنت، دوزخ، آخرت اور اہل آخرت! کہ ابتدار میں ان کا وجود نہ تھا، عدم سے وجود میں آئے اور اب ان پر کبھی فنا طاری نہ ہوگی۔

(۳) اور وہ بقا کہ کبھی بھی اُس پر عدم نہ تھا اور کبھی اُس پر فنا نہ ہوگی اور یہ حق تعالیٰ اور اُس کی ازلی وابدی صفات کا بقا ہے کہ وہ اپنی صفات کے ساتھ قدیم ہے اور بقائے دوام سے اُسی کا وجود مراد ہوتا ہے۔ اور کسی کو بھی اُس کے اوصاف میں مشارکت حاصل نہیں ——— پس فنار کا علم یہ ہے کہ تم جان لو کہ دنیا فانی ہے، اور بقار کا علم یہ ہے کہ تم یہ جان لو کہ عُقبیٰ باقی رہنے والی ہے جیسا کہ خدائے عزوجل نے فرمایا ہے کہ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى۔ آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے۔

اس جگہ "ابقیٰ" مبالغے کے طور پر کہا گیا ہے اس لیے کہ آخرت کی عمر کے بقا کے لیے کوئی فنا نہیں ——— باقی اربابِ طریقت کے ہاں بقار حال اور فنار حال کے معنی یہ ہیں کہ جب جہالت فنا ہو جائے تو لامحالہ علم باقی ہو گا اور جب معصیت فانی ہو جائے تو اطاعت کو بقا مل جائے گی کہ جب بندہ اپنی بندگی کا علم حاصل کر لیتا ہے تو غفلت فانی ہو جاتی ہے اور وہ خود ذکرِ حق سے باقی ہو جاتا ہے۔ یعنی جب بندہ حق تعالیٰ کی معرفت کا علم حاصل کر لیتا ہے اور اُس کے علم کے ساتھ باقی ہو جاتا ہے تو جہالت اُس سے فنا ہو جاتی ہے اور جب غفلت سے فانی ہو جاتا ہے تو اس کو یاد رکھنے سے باقی ہو جاتا ہے۔ گویا اہل طریقت کے ہاں بُری خصلتوں کے زائل ہونے اور اچھے اوصاف کے پیدا ہو جانے کو فنا اور بقا سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن اہل طریقت کے خاص حضرات، فنا و بقا سے وہ مراد نہیں لیتے

جو ابھی ہم نے بیان کیا ہے بلکہ وہ ولایت کے درجہ کمال کے علاوہ کسی جگہ بھی فنا اور بقا کی اصطلاحوں کا استعمال نہیں کرتے۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو مجاہدات کی تکلیف سے چھوٹ چکے ہیں۔ اور مقامات وتغیر احوال کی قید سے خلاصی حاصل کر چکے ہیں اور اپنی منزل مقصود پر پہنچ چکے۔ اور دیکھنے کے قابل تمام چیزوں کو دیکھ چکے اور سننے کے قابل تمام باتوں کو سن چکے اور دل کے جاننے کے لائق تمام معاملات کو جان چکے اور حاصل کرنے کے قابل تمام مقامات کو حاصل کر چکے ہیں — اپنے مقصود کو پانے میں اس کے حصول کی آفتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے۔ اور تمام چیزوں سے منہ موڑ چکے ہیں۔ اس طرح کہ اپنے مقصود کا مقصد بھی فانی ہو چکا ہو اور وہ راہِ راست پر پہنچ چکے ہوں۔ اور وہ ہر قسم کے دعووں سے بیزار ہو کر معنی سے الگ ہو گئے ہوں۔ ان کی کرامات اُن کے لیے حجاب اور مقامات مشاہدہ ہو گئے ہوں۔ اُن کے احوال نے آفت کا لباس پہن لیا ہو اور عین مراد میں اپنی مراد سے بے مراد ہو گئے ہوں اور اُن کا طریق تمام مخلوق سے منقطع ہو کر حق تعالیٰ سے اپنی محبت قائم کر چکا ہو۔ جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰي مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ۔ تاکہ ہلاک ہو جو دلیل سے ہلاک ہوا اور زندہ رہے جو دلیل سے زندہ رہا۔

اور اسی مفہوم میں میں کہتا ہوں کہ۔ شعر

فنسیت فنائی بفقدِ ھوائی   فصار ھوائی فی الامور ھواک

میری خواہشات کے گم ہونے کی وجہ سے میری فنا فانی ہو گئی۔ پس تمام معاملات میں میری خواہش بس تیری محبت ہو گئی۔

فاذا فنی العبد عن اوصافہ   ادرکَ البقاء بتمامِہٖ

پس جب بندہ اپنے اوصاف سے فانی ہو جاتا ہے تو پوری کی پوری بقا حاصل کر لیتا ہے۔

جب بندہ اوصاف کے موجود ہوتے ہوئے اوصاف کی آفتوں سے فانی ہو چکا ہو تو وہ اپنی بقائے مراد کے سبب اپنی مراد کے فنا میں باقی ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ نہ اُس کو قرب اور بعد رہتا ہے نہ وحشت و اُنس۔ نہ صحو و سکر رہتی ہے نہ فراق و وصال کا

خوف، نہ نا امیدی پیدا ہوتی ہے نہ زمین سے اکھاڑ پھینکنے کا جذبہ اور نہ تو نام و مرتبے کی طلب رہتی اور نہ نقش و نشان کی خواہش۔ مشائخ میں سے ایک بزرگ نے اسی مفہوم میں یوں کہا ہے کہ: شعر

وطاح مقامی والرسوم کلاهما فلست اری فی الوقت قرباً ولا بعدا

میرا مقام اور نشان دونوں مٹ گئے ۔ پس میں اب نہ قرب کو دیکھتا ہوں اور نہ دوری کو

فنیت بہ عنی فبان لی الھدی فھذا ظھور الحق عند الفناء قصدا

میں نے اُسے اپنے سے فنا کردیا پس میرے لیے ہدایت واضح ہوگئی۔ پس یہ حق کا ظہور قصداً فنا کے وقت ہی ہوا ہے۔

بہر حال کسی چیز کی آفت کو دیکھے بغیر اور اس کو فانی کرنے کے ارادے کے بغیر اُس سے فنا درست نہیں ہوتا۔ جس شخص کا خیال یہ ہے کہ کسی چیز سے فنا اُس چیز سے حجاب کے بغیر درست ہو جاتا ہے وہ غلطی پر ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ جب آدمی کسی چیز کو پسند کرتا ہو تو کہہ دے کہ میں اُس کے ساتھ باقی ہوں یا کسی چیز کے ساتھ دشمنی رکھتا ہو تو کہہ دے کہ میں اس سے فانی ہوں کیونکہ یہ دونوں صفتیں طالب کی ہیں اور فنا کے اندر تو محبت اور عداوت نہیں ہوتی اور نہ ہی بقا کے اندر جمع اور تفرقہ دیکھنا ہوتا ہے۔ ایک گروہ کو اس معاملے میں غلطی واقع ہوئی اور انہوں نے سمجھا کہ یہ فنا، ذات کے معدوم ہونے اور شخصیت کے نیست و نابود ہو جانے کے معنی میں ہے اور بقا حق تعالیٰ کی بقاء کے بندہ کے ساتھ پیوست ہو جانے کا نام ہے۔ لیکن یہ دونوں امر محال ہیں۔ میں نے ہندوستان میں ایک آدمی کو دیکھا جو تفسیر، تذکیر اور علم کا مدعی تھا۔ میرے ساتھ اس نے اس معاملے میں مناظرہ کیا۔ جب میں نے غور کیا تو وہ خود فنا اور بقا کو نہیں پہچانتا تھا اور قدیم و حادث کے درمیان فرق نہیں جانتا تھا۔ اس گروہ کے بہت سے جاہل ایسے ہیں جو فنا کلی کو روا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ کھلا مکابرہ (ایک دوسرے پر بڑائی ظاہر کرنا) ہے کیوں کہ فطری اجزاء کا فنا اور منقطع ہو جانا ہرگز درست نہیں۔ میں ان خطا کار جاہلوں سے پوچھتا ہوں کہ تمہاری اس فنا سے کیا مراد ہے!۔ اگر وہ کہیں کہ ہماری مراد فناء عین ہے تو یہ تو بالکل محال ہے اور اگر کہیں کہ صفت کا فنا

ہونا ہماری مراد ہے۔ تو ہم بھی بندہ کی دو صفتوں میں سے ایک صفت کے فنا ہونے اور دوسری کے باقی ہونے کے قائل ہیں۔ لیکن یہ محال ہے کہ کوئی آدمی کسی دوسرے آدمی کی صفت کے ساتھ باقی رہے۔

روم کے نسطوریوں اور دوسرے عیسائیوں کا مذہب یہ ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کثرت مجاہدات کی وجہ سے تمام جسمانی اوصاف سے فانی ہوگئی ہیں۔ اور ابدی بقا اُن کے ساتھ پیوست ہوگئی ہے۔ اور انہیں اس حد تک بقا حاصل ہوگئی ہے کہ وہ بقاء الٰہی کے ساتھ باقی ہوگئیں ہیں۔ اور عیسیٰ علیہ السلام اسی بقاء کا نتیجہ ہیں۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اجزائے ترکیبی کا اصل انسانی مادے میں سے نہیں کیونکہ اُن کی بقاء درحقیقت بقاءِ الٰہی کے ساتھ تھی۔ پس وہ، ان کی والدہ اور خداوند تعالیٰ تینوں ایک ہی بقاء کے ساتھ باقی ہیں جو قدیم اور حق تعالیٰ کی صفت ہے۔ یہ سب کچھ مجسمین (حق تعالیٰ کے لیے جسم ثابت کرنے والا گروہ) اور مشبہین (حق تعالیٰ کی تشبیہہ ثابت کرنے والا) میں سے حشویہ فرقہ کے قول کے مطابق ہے، جو ذاتِ باری تعالیٰ حوادث کا محل قرار دیتے ہیں۔ اور قدیم ذات کے لیے حادث کی صفت کو روا سمجھتے ہیں۔ میں ان سب سے کہتا ہوں کہ کوئی حادث قدیم کا اور کوئی قدیم کسی حادث کا محل کیسے ہو سکتا ہے۔ اور کسی قدیم کے لیے کوئی حادث اور کسی حادث کے لیے کوئی قدیم کس طرح صفت بن سکتا ہے۔! اور اس مذہب کو جائز سمجھنا تو دھریت ہے اور حدوثِ عالم کی دلیل کو باطل کرنا ہے۔ پھر اس طرح یا مصنوع اور صانع دونوں کو قدیم کہنا چاہیئے یا پھر دونوں کو حادث! نیز مخلوق کے غیر مخلوق کے ساتھ امتزاج اور غیر مخلوق کے مخلوق میں حلول کو درست کہنا پڑے گا۔ حالانکہ ان کے لیے یہ نقصان کافی ہے کہ جب قدیم محلِ حادث کہتے ہیں یا حادث کو محلِ قدیم کہتے ہیں تو مصنوع اور صانع کو قدیم ہی کہنا پڑے گا۔ لیکن جب منطقی دلیل مصنوع اور صانع کے درمیان گھومے گی تو مصنوع کے صانع کو بھی حادث کہنا ضروری ہوگا کیونکہ جب کسی چیز کا محل عین وہی چیز ہو تو جب محل حادث ہوگا تو یہ ضروری ہے کہ حال بھی حادث ہو۔ پس اس جملہ سے لازم آئے گا کہ حادث کو قدیم کہیں، یا قدیم کو حادث! ہر یہ دونوں صورتیں گمراہی

کی ہیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب کوئی چیز کسی دوسری چیز کے ساتھ متصل، پیوستہ، متحد یا مرکب ہو گی تو ان دونوں کا حکم ایک طرح ہوگا۔ پس ہماری بقا خود ہماری صفت ہے اور ہماری فناء خود ہماری صفت ہے، اور ہمارے اوصاف کی تخصیص میں ہماری فنا، ہماری بقاء کی طرح ہے اور ہماری بقاء، ہماری فنا کی طرح ہے، پس فنا ہونا ایک وصف ہے دوسرے وصف کے بقاء کے ساتھ ــــ پھر اگر کوئی شخص فناء کی تعبیر اس طرح کرے کہ اس کے ساتھ بقاء کا تعلق نہ ہو تو یہ درست ہے۔ اسی طرح اگر بقا کی تعبیر یوں کرے کہ فنا کا اس کے ساتھ تعلق نہ ہو تو یہ بھی درست ہے۔ کیونکہ اس فنا سے مراد غیر اللہ کے ذکر کا فنا ہوگا اور بقاء سے ذکر الٰہی کا بقاء مراد ہوگا کہ جو کوئی اپنی مراد سے فانی ہو جاتا ہے وہ حق تعالیٰ کی مراد سے باقی ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ تمہاری مراد فانی ہے اور حق تعالیٰ کی مراد باقی ہے۔ لہذا جب تم اپنی فانی مراد کے ساتھ قائم رہو گے تو تمہارا قیام بھی فناء کے ساتھ ہوگا لیکن اگر تم مرادِ حق کی طرف پھر جاؤ گے۔ مرادِ حق بھی باقی رہے گی اور تمہارا قیام بھی بقا کے ساتھ رہے گا۔ اس کی مثال اس طرح ہو سکتی ہے کہ جو چیز بھی آگ کی حدود میں گرتی ہے آگ کے غلبہ کی وجہ سے وہ بھی آگ ہی بن جاتی ہے، پس جس طرح آگ کا غلبہ کسی چیز کے وصف کو دوسری چیز میں تبدیل کر سکتا ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ کی محبت کا غلبہ تو آگ کے غلبہ سے بھی اولیٰ تر ہے۔ البتہ آگ کا تصرف تو لوہے کے وصف میں واقع ہوتا ہے لیکن لوہے کی ذات تو وہی رہتی ہے کیوں کہ لوہا ہرگز آگ نہیں بن سکتا۔ واللہ اعلم۔

فصل

فنا و بقا میں مشائخ کے رموز

اس معاملے میں تمام مشائخ کے بڑے لطیف رموز ہیں۔ حضرت ابو سعید خرازؒ جو صاحب مذہب ہیں فرماتے ہیں کہ

الفناء فناء العبد عن رؤية العبودية ‏ بندہ کا اپنی عبودیت کے دیکھنے سے فانی ہو جانے کا نام فنا اور بندے

والبقاء بقاء العبد عن مشاهدة الالٰهية۔ ‏ کا مشاہدہ الٰہی میں باقی ہو جانے کا نام بقا ہے۔

یعنی عمل میں اپنی بندگی کو دیکھنا آفت ہے اور بندہ درحقیقت بندگی میں اس جگہ پہنچ جاتا ہے کہ اپنے کردار کی طرف دیکھتا ہی نہیں اور اپنے فعل کو دیکھنے سے فانی اور حق تعالیٰ کے فضل کو دیکھنے سے باقی ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اُس کے تمام اعمال کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف ہو جاتی ہے نہ کہ اپنی طرف۔ کیوں کہ افعال میں سے جو کچھ بندہ کے ساتھ متصل ہوگا۔ وہ سب ناقص ہوگا اور جو کچھ حق تعالیٰ کے ساتھ موصول ہوگا وہ سب کامل ہوگا۔ پس جب بندہ اپنے ذاتی متعلقات سے فانی ہو جاتا ہے تو اُس وقت حق تعالیٰ کے کمال الوہیت کے ساتھ باقی ہو جاتا ہے ـــــ حضرت ابو یعقوب نہر جوری رحمۃ اللہ سے مروی ہے

صحة العبودية فی الفناء والبقاء۔ ‏ بندگی کرنے کی صحت فنا اور بقا میں ہے۔

اس لیے کہ بندہ جب تک ہر چیز سے برأت کا اظہار نہ کرے حق تعالیٰ کی خالص خدمت کے قابل نہیں ہوتا۔ پس آدمیت کے اوصاف سے تبرّا فنا ہے اور عبودیت میں اخلاص بقا ہے ـــــ حضرت ابراہیم شیبانیؒ فرماتے ہیں کہ

علم الفناء والبقاء یدور علی ‏ فنا اور بقا کا علم اخلاص، وحدانیت اور صحت عبودیت

الاخلاص والوحدانية وصحة العبودية ‏ پر منحصر ہے اور جو کچھ اس کے علاوہ ہے وہ یا مغالطہ

وما کان غیر هذا فهو المغالیط والزندقة۔ ‏ ہے یا الحاد!

یعنی بندہ جب حق تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کر لیتا ہے تو اپنے آپ کو حق تعالیٰ کے حکم کے سامنے مقہور اور مغلوب تصور کرتا ہے، اور مغلوب، غالب کے غلبہ میں فانی ہوتا ہے۔ اور جب اس کا فنا اس پر درست ہو جاتا ہے تو وہ اپنی عاجزی کا اقرار کر لیتا ہے اور بندگی کے بغیر کوئی چارہ نہیں دیکھتا تو حق تعالیٰ کی رضا کے حلقۂ درگاہ کو مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے۔ اور جو کوئی اس کے علاوہ فناء اور بقا کی تعریف کرتا ہے یعنی وہ فناء کو ذات کا فنا اور بقاء کو حق تعالیٰ کے ساتھ بقاء سمجھتا ہے تو یہ بے دینی اور نصاریٰ کا مذہب ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

میں علی بن عثمان الجلابیؒ کہتا ہوں کہ یہ تمام اقوال معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے کے نزدیک ہیں اگرچہ عبارت کے اعتبار سے ان میں اختلاف ہے، اور ان سب کی حقیقت یہی ہے کہ بندے کو فنا، حق تعالیٰ کے جلال کو دیکھنے اور حق تعالیٰ کی عظمت کے اس کے دل پر ظاہر ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے تاکہ حق تعالیٰ کے غلبہ جلال میں دنیا و عقبیٰ اُس کے دل سے فراموش ہو جائیں اور احوال و مقام اس کے ارادے کی نظر میں حقیر نظر آئیں اور اُس کے حال میں کرامات کا ظہور لاشیئ ہو کر عقل اور نفس سے فانی ہو جائے بلکہ فنا سے بھی فانی ہو جائے۔ اور عین اس فناء کے اندر اُس کی زبان کا فنا حق تعالیٰ کے ساتھ ناطق ہو جائے اور اُس کا دل اور جسم حق تعالیٰ سے خشوع و خضوع کرنے والا ہو جائے۔ جیسا کہ آفات کی ترکیب کے بغیر جب شروع میں حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے اُن کی اولاد کو نکالا گیا تو تمام بنی آدم نے بندگی کا عہد کیا تھا ــــ مشائخ رحمہم اللہ میں سے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ۔ شعر

لکنتُ اِن کنت ادری کیف السبیل الیک فنیتُنِی عن جمیع فصرت ابکی علیکَ

اگر مجھے علم ہوتا کہ تجھ تک پہنچنے کا راستہ کون سا ہے۔ تو میں اپنے آپ سے فنا ہو کر تیرے لیے روتا رہتا۔

اور ایک دوسرے بزرگ نے فرمایا ہے ۔ شعر

فَفِی فنائیٔ فناء فنائِیٔ وفی فنائی وجدتُ اَنتَ

محوت اسمی و رسم جسمی سالت عنی فقلتُ اَنتَ

میری فناء میں میری فناء کا فنا ہے، اور میں نے تجھے اپنی فنا میں ہی پایا ہے۔

میں نے اپنے نام اور جسم کو مٹا دیا۔ تو نے مجھ سے میرے بارے میں پوچھا تو میں نے کہہ دیا کہ تو ہی ہے۔

فقر اور تصوف کے باب میں فناء و بقاء کے یہی احکام ہیں جنہیں میں نے مختصراً بیان کر دیا ہے۔ اب اس کتاب میں جہاں کہیں میں فناء و بقاء کا ذکر کروں گا اس سے میری مراد یہی ہو گی۔ مذہب خرازیاں کی یہی اصل ہے اور تمام خرازی حضرات اسی اصل پر گامزن ہیں ۔ یہ بہت ہی اچھی اصل ہے۔ اور جو فصل فصل کی دلیل ہو وہ بے اصل نہیں ہوتی اور اس فرقہ کے کلام میں یہ جملہ بڑا مشہور ہے ـــ واللہ اعلم بالصواب ۔

فرقہ خفیفہ

فرقہ خفیفہ کے لوگ حضرت ابو عبداللہ محمد بن خفیف شیرازی رحمۃ اللہ کے ساتھ اپنا روحانی تعلق قائم کرتے ہیں جو صوفیا کے مشائخ اور سادات میں سے تھے اور اس طبقہ کے عزیز تھے۔ آپ ظاہری اور باطنی علوم کے عالم تھے اور علم طریقت کے فنون میں آپ کی معروف تصانیف موجود ہیں۔ آپ کے مناقب اتنے مشہور ہیں کہ انہیں شمار کرنا مشکل ہے۔ غرضیکہ آپ اپنے دور کے پسندیدہ حضرات میں سے تھے اور بڑے پاکباز تھے، آپ نیک نفس اور شہواتِ نفسانی کی تابعداری سے منہ موڑے ہوئے تھے ۔ میں نے سُنا ہے کہ آپ نے چار سو نکاح کیے تھے، اور یہ اس لیے تھا کہ آپ بادشاہوں کی اولاد میں سے تھے اور جب آپ نے توبہ کرلی تو شیراز کے رہنے والوں نے آپ کے ساتھ بڑا تقرب حاصل کیا تھا۔ جب آپ کا حال بزرگ ہوگیا تو بادشاہوں اور رئیسوں کی بیٹیاں تبرک کے حصول کے لیے آپ کے ساتھ نکاح کی خواہاں ہوا کرتی تھیں۔ اور آپ ایسا کرلیا کرتے تھے لیکن دخول (جماع) سے پہلے ہی طلاق دے دیا کرتے تھے۔ تاہم آپ کی عمر میں چالیس عورتیں تو دو۔ دو اور تین تین کرکے باقاعدہ آپ کے بستر کی خادم رہیں جو پراگندہ حال تھیں، اور ان میں سے ایک کو تو چالیس سال تک آپ کی صحبت کا شرف حاصل رہا جو ایک وزیر کی بیٹی تھی۔

میں نے ابوالحسن علی بن بکران شیرازیؒ سے سُنا ہے کہ ایک دن آپ کے نکاح میں رہنے والی تمام عورتیں ایک جگہ جمع ہوئیں اور ان میں سے ہر ایک نے آپ کے متعلق اپنا تاثر بیان کیا۔ وہ سب اسی امر پر متفق تھیں کہ انہوں نے خلوت میں شیخ کو اسباب شہوت کا تابع کبھی نہیں دیکھا۔ ان میں سے ہر ایک کے دل میں وسوسہ پیدا ہوا اور وہ بڑی متعجب ہوئیں کیوں کہ اس سے پہلے اُن میں سے ہر ایک یہی سمجھتی تھی کہ شاید یہ معاملہ صرف میرے ساتھ اس طرح ہے۔ چنانچہ سب نے اس بات پر اتفاق پر کیا کہ شیخ کی صحبت کا راز وزیر کی بیٹی کے علاوہ کوئی نہیں جان سکتا کیوں کہ وہی سالہاسال ۔

سے آپ کی صحبت میں ہے، اور عورتوں میں سے وہی آپ کی محبوب ترین بیوی ہے۔ انہوں نے اپنے میں سے دو عورتوں کو منتخب کر کے اُس کے پاس روانہ کیا کہ شیخ کو تیرے ساتھ بڑی محبت رہی ہے تمہیں چاہیے کہ ہم سے شیخ کی صحبت کا راز بیان کر دا! اس نے بیان کیا کہ جب شیخ نے مجھے اپنے نکاح میں قبول کیا تو مجھے کسی نے کہا "شیخ آج رات تمہارے کمرے میں تشریف لائیں گے،" میں نے بڑے عمدہ کھانے تیار کئے۔ اور اپنے آپ کو زیب و زینت کے ساتھ خوب آراستہ کیا، جب شیخ تشریف لائے اور کھانا آپ کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے مجھے بلوایا۔ آپ کچھ دیر مجھے اور پھر کچھ دیر کھانے کو دیکھتے رہے۔ اس کے بعد آپ نے میرے ہاتھ کو پکڑا اور اپنی آستین کے اندر لے گئے۔ تو مجھے محسوس ہوا کہ آپ کے سینے سے ناف تک کے حصے میں پندرہ گرہیں پڑی ہوئی ہیں۔ آپ نے فرمایا " اے وزیر کی بیٹی! مجھ سے دریافت کر کہ یہ گرہیں کیسی ہیں! وہ کہتی ہیں میں نے آپ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا "یہ سب صبر کی شدت اور تکلیف ہے کہ گرہیں بندھ گئی ہیں۔ میں نے اس طرح کے حسین چہروں اور اس طرح کے عمدہ کھانوں سے صبر کیا ہے"۔ بس یہ کہا اور اٹھ کر چلے گئے میری سب سے پہلی گستاخی آپ کے ساتھ یہی تھی ۔ تصوف میں آپ کے مذہب کی خوبی " غیبت و حضور ہے، اور وہ اسی کو بیان کرتے ہیں۔ میں ان شاء اللہ امکانی حد تک اس کو بیان کروں گا۔

غیبت و حضور کا بیان

غیبت و حضور دو ایسی عبارتیں ہیں جو کسی مقصودی معنی کو بیان کرنے میں اس طرح ہیں جیسے آنکھ میں اصل چیز کا عکس پڑتا ہے تو اصل چیز اور عکس آپس میں متضاد نظر آتے ہیں۔ یہ دونوں الفاظ ارباب لغت اور اہل طریقت دونوں کے درمیان مستعمل اور متبادل ہیں۔ پس حضور سے مراد وہ حضور قلب ہے جو یقینی دلالت کے ساتھ حاصل ہو تاکہ غیبی حکم اُس کے لئے عینی حکم کی طرح ہو جائے۔ اور غیبت سے مراد، ماسوی اللہ سے دل

کا اس طرح غائب ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ سے بھی بلکہ اپنی غیبت سے بھی غائب ہو جائے تاکہ وہ اپنی غیبت سے خود اپنا بھی نظارہ نہ کر سکے۔ اور اس کی علامت یہ ہے کہ رسمی احکام سے بھی اس طرح کنارہ کش ہو جائے جس طرح انبیاء علیہم السلام حرام کاموں سے معصوم ہوتے ہیں۔ پس اپنے آپ سے غائب ہونا ہی حق تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا ہے اور حق تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا ہی اپنے آپ سے غائب ہونا ہے چنانچہ جو کوئی اپنے آپ سے غائب ہوتا ہے۔ پس دل کا مالک خداوند تعالیٰ ہے، جب اللہ تعالیٰ کی کششوں میں سے کوئی کشش طالب حق کے دل کو مقہور و مغلوب کر لیتی ہے تو دل کی غیبت بھی اُس کے نزدیک حضور کی طرح ہو جاتی ہے اور اُس کے دل سے حق تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کی شرکت اور حق تعالیٰ کی محبت کی تقسیم اُٹھ جاتی ہے اور اپنے آپ سے ہر قسم کی نسبت منقطع ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ مشائخ میں سے ایک بزرگ نے فرمایا ہے کہ۔ شعر:

وَلِیْ فوادٌ وانتَ مَالِکُہٗ   بلا شریك فکیف ینقسِمٗ

میرا ایک دل ہے اور تو ہی اکیلا اُس کا مالک ہے، پس وہ تقسیم کیسے ہو سکتا ہے۔

• جب اُس کے علاوہ دل کا کوئی مالک نہیں ہے تو پھر غائب رکھے یا حاضر، اُسی کے تصرف اور اُسی کے حکم میں رہے گا۔ تمام احباب طریقت کی روش یہی ہے تاہم فرق یہ ہے کہ مشائخ رحمہم اللہ نے اس بات میں کلام کیا ہے کہ ان میں سے کون سا امر مقدم ہے۔ ایک گروہ حضور کو غیبت پر مقدم سمجھتا ہے اور دوسرا گروہ غیبت کو حضور پر مقدم رکھتا ہے جیسا کہ صحو اور سُکر کے بیان میں میں نے ذکر کر دیا ہے البتہ صحو اور سُکر اوصاف کی بقا پر دلالت کرتے ہیں لیکن غیبت و حضور اوصاف کی فنا کا پتہ دیتے ہیں۔ پس درحقیقت یہ غیبت و حضور کا اعزاز ہے۔ اور جو حضرات حضور پر غیبت کو مقدم شمار کرتے ہیں وہ حضرت ابن عطاء، حضرت حسین بن منصور، حضرت ابوبکر شبلی حضرت بندار بن حسین، حضرت ابوحمزہ بغدادی اور حضرت سمنون محب رحمہم اللہ اجمعین ہیں۔ اور عراقی حضرات کی ایک جماعت کہتی ہے کہ "راہِ حق میں سب سے بڑا حجاب تو خود تیری

ذات ہے۔ جب تو خود اپنے آپ سے غائب ہو جائے گا تو تیری ہستی کو ثابت کرنے والی آفات تیرے اندر فنا ہو جائیں گی۔ اور زمانے کے قاعدے بدل جائیں گے، مریدوں کے تمام مقامات تیرے لیے حجاب بن جائیں گے۔ طالبانِ حق کے تمام احوال تیرے لیے آفت بن جائیں گے۔ تمام اسرار انا ر بن جائیں گی۔ اور تیری آنکھ خود اپنے سے اور اپنے غیر سے بند ہو جائے گی۔ بشریت کے اوصاف تیرے اندر قرب الٰہی کی آگ سے جل جائیں گے، اور صورت حال اس طرح ہو جائے گی کہ خداوند تعالیٰ تیری غیبت کی حالت میں تجھے حضرت آدمؑ کی پشت سے باہر لائیں گے۔ اور اپنا کلام عزیز تجھے سنوائیں گے اور تجھے لباسِ توحید اور خلعتِ مشاہدہ سے سرفراز فرمائیں گے تاکہ تو اپنے آپ سے غائب ہو اور بغیر کسی حجاب کے بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہو۔ اور اگر تو اپنی صفات کے ساتھ حاضر رہا تو قرب الٰہی سے غائب رہے گا۔ پس تیرا اپنے اندر حاضر رہنا تیرے لیے باعثِ ہلاکت ہے۔ اور یہی معنی ہے حق تعالیٰ کے اس ارشاد کا کہ"

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۙ	بلاشبہ تم ہمارے پاس تنہا حاضر ہوئے جیساکہ ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا۔

باقی حضرات، حارثِ محاسبی، جنید، سہل ابن عبد اللہ، ابوحفص حداد، ابوحمدون قصار، ابومحمد جریری، حصری، صاحب مذہب محمد بن خفیف رحمہم اللہ کے علاوہ صوفیہ کی ایک بڑی جماعت کا مؤقف یہ ہے کہ حضور غیبت سے مقدم ہے، اس لیے کہ سب خوبیاں تو حضور میں ہی ہیں اور غیبت تو گویا حضورِ حق کا ایک ذریعہ ہے، جب منزل حاصل ہو جاتی ہے تو ذریعہ ایک آفت ہو جاتا ہے، پس جو کوئی بھی اپنے آپ سے غائب ہوگا لامحالہ بارگاہِ حق میں حاضر ہوگا۔ اور غیبت کا فائدہ حضور کے ساتھ ہی ہے کیونکہ بغیر حضور کے غیبت دیوانگی ہوتی ہے۔ لہٰذا طالب کو چاہیے کہ وہ غفلت کو چھوڑ دے تاکہ غیبت سے بھی مقصود حضور ہی ہو اور جب مقصود حاصل ہو جائے تو علّت ساقط ہو جاتی ہے۔ شعر

لیس الغائب من غاب من البلاد   انما الغائب من غاب من المراد

ولیس الحاضی من لیس لہ مراد　　　انما الحاضِر من لیس لہ الفواد

حتی استقر فیہ المراد

غائب وہ نہیں جو شہروں سے غائب ہو بلکہ غائب وہ ہے جو اپنی مراد سے غائب ہو اور حاضر وہ نہیں جس کی کوئی مراد ہی نہ ہو بلکہ حاضر وہ ہے جس کا دل ہی نہ ہو کہ اس میں کوئی مراد قرار حاصل کر سکے۔

یعنی غائب وہ نہیں ہے جو شہروں اور آبادیوں سے غائب ہو بلکہ غائب وہ ہے جو تمام ارادوں کو ترک کر دے تاکہ حق تعالیٰ کا ارادہ اُس کا ارادہ بن جائے۔ اور نہ ہی حاضر وہ ہے جسے دنیوی اشیاء کا ارادہ نہ ہو بلکہ حاضر وہ ہے جس کا خواہش کرنے والا دل ہی نہ ہو تاکہ نہ اُس میں دنیا و آخرت کی فکر پیدا ہو اور نہ خواہشات کا اُس میں گزر ہو۔ اسی معنی میں مشائخ میں سے ایک بزرگ نے فرمایا ہے کہ "جو آدمی اپنے نفس اُس کی خواہشات اور دوستوں سے اُنس کرنے سے فانی نہیں ہوا تو گویا وہ مراتب کے درمیان ٹھہرا ہوا ہے تاکہ یا اُسے حظ نفس حاصل ہو یا اچھا انجام۔

مشہور ہے کہ حضرت ذوالنون کے ایک مرید نے حضرت بایزیدؒ کی زیارت کا ارادہ کیا جب عبادت خانے پر پہنچ کر اُس نے دروازے پر دستک دی تو بایزیدؒ نے پوچھا "تو کون ہے اور کس سے ملنا چاہتا ہے"؟ اُس نے کہا "میں بایزیدؒ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں، انہوں نے فرمایا "بایزید کون ہے! کہاں رہتا ہے! اور وہ کیا چیز ہے! میں تو خود ایک مدت سے بایزید کی جستجو میں ہوں لیکن اُسے پا نہیں سکا"۔ جب اس مرید نے واپس آکر حضرت ذوالنون سے ماجرا بیان کیا تو انہوں نے فرمایا

اخی بویزید ذھب فِی الذاھبین اِلَی اللّٰہِ۔ میرا بھائی بایزید فنا فی اللہ لوگوں میں چلا گیا ہے۔

ایک شخص حضرت جنیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا "تھوڑی دیر کے لیے میری طرف توجہ فرمائیے تاکہ میں آپ سے چند باتیں عرض کر سکوں" حضرت جنیدؒ نے کہا "اے جوالمرد! تو مجھ سے وہ چیز مانگ رہا ہے بڑی مدت سے میں خود جس کا متلاشی ہوں، کئی سال سے میں خود یہ چاہتا ہوں کہ گھڑی بھر کے لیے اپنی طرف سے خاص ہو جاؤں۔ مگر

ایسا نہیں ہو سکا۔ تو اس صورت میں میں تیری طرف کس طرح حاضر ہو سکوں گا — پس غیبت میں حجاب کی وحشت ہوتی ہے اور حضور میں کشف و مشاہدہ کی راحت، اور تمام احوال میں کشف حجاب کی طرح نہیں ہوتا۔ اسی معنی میں شیخ ابو سعید رحمۃ اللہ کہتے ہیں۔

تقشع غیم الھجر عن حضو الحبیب　　وا سفر نور الصبح عن ظلمة الغیب

جدائی کا بادل محبوب کے چہرے سے چھٹ گیا۔ اور غیبت کے اندھیرے سے صبح کا اُجالا خوب ظاہر ہو گیا۔

اور اس معنی کا فرق بیان کرنے میں ایک لطیفہ ہے جو بظاہر قال کے ساتھ متعلق نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں اس کا تعلق حال کے ساتھ ہے، اور یہ عبارتیں باہم نزدیک نظر آتی ہے۔ یعنی کیا حق تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا اور کیا اپنے آپ سے غائب ہونا۔ کیونکہ غیبت سے مراد خود بخود حضور ہی ہے۔ اور جو کوئی اپنے آپ سے غائب نہیں وہ حاضر بحق نہیں ہو سکتا اور جو کوئی حاضر بحق ہے وہ لامحالہ اپنے آپ سے غائب ہے۔ جیسا کہ جب حضرت ایوب علیہ السلام کی فریاد اپنے آپ پر مصیبت کے ورود کی وجہ سے نہ تھی بلکہ وہ تو اس حالت میں اپنے آپ سے غائب تھے تو یقیناً حق تعالیٰ نے اُن کی اس فریاد کو اُن کے صبر کے مخالف قرار نہیں دیا" چنانچہ جب انہوں نے عرض کی

رَبِّ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ　　میرے رب مجھے سخت تکلیف پہنچی ہے

تو خداوند تعالیٰ نے فرمایا

اِنَّهٗ كَانَ صَابِرًا۔　　بلاشبہ وہ صبر کرنے والا تھا۔

اس قصہ سے یہ حکمت اس معنی میں بڑی واضح ہے۔ اچھی طرح غور کرو تاکہ تم جان لو۔

حضرت جنیدؒ کے متعلق آتا ہے کہ انہوں نے کہا" ایک وقت تھا کہ زمین و آسمان والے میری حیرانی پر روتے تھے، پھر ایسا ہوا کہ اُن کی اس رغبت پر میں روتا تھا لیکن اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ نہ مجھے اُن کی کوئی خبر ہے اور نہ اپنا کچھ پتہ۔ حضورِ حق کی طرف یہ بڑا اچھا اشارہ ہے۔

غیبت و حضور کے یہ معنی تھے جو میں نے مختصراً بیان کر دیئے تاکہ پورا مسلک خفیفاں تجھے معلوم ہو جائے، نیز تمہیں یہ علم بھی ہو جائے کہ حضور و غیبت سے اس گروہ کی مراد کیا ہے۔

اس کی مزید شرح اور تفصیل اس کتاب کو طویل کر دے گی حالانکہ اس کتاب میں میں اختصار کا انداز اپنائے ہوئے ہوں ـــ وباللہ العون والتوفیق۔

فرقہ سیّاریہ

سیّاری فرقہ کے حضرات کی عقیدت و نسبت حضرت ابوالعباس سیّاری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ہے جو مرو کے پیشوا، تمام علوم کے عالم اور حضرت ابوبکر واسطیؒ کے ہم نشین تھے۔ لسا اور مرو میں آج بھی آپ کے طبقہ کے لوگ کافی تعداد میں موجود ہیں، آپ کے مذہب کے علاوہ کوئی مذہب بھی تصوف میں اپنی حالت پر باقی نہیں رہا۔ مرو اور لسا میں کوئی زمانہ اس مذہب کے پیشوا سے خالی نہیں رہا اور وہ پیشوا آپ سے متعلق لوگوں کو آپ کے مذہب پر قائم رکھنے کے لیے آج تک اُن کی حفاظت کرتا رہا ہے۔ لسا میں رہنے والے آپ کے اصحاب کے نام اہل مرو کے بڑے لطیف رسائل ہیں۔ اور ان کے درمیان خط و کتابت کی صورت میں کلام ہوتی رہی ہے۔ میں نے مرو میں اُن میں سے بعض مکتوبات دیکھے ہیں جو بڑے عمدہ ہیں ـــ ان کی عبارات جمع اور تفرقہ کی بنیاد پر ہیں۔ یہ ایک ایسا لفظ ہے جو تمام اہل علم میں مشترک ہے اور ہر طبقہ اپنی عبارتوں کا مفہوم واضح کرنے کے لیے اس لفظ کو استعمال کرتا ہے تاہم اس سے ہر طبقے کی مراد مختلف ہوتی ہے۔ چنانچہ محاسبی فرقہ کے حضرات جمع اور تفریق سے کسی چیز کے اعداد کا جمع ہونا اور علیحدہ ہونا مراد لیتے ہیں۔ نحوی حضرات لفظوں کا لغوی اور رسمی طور پر اتفاق اور معانی کے اعتبار سے افتراق مراد لیتے ہیں ـــ فقہاء، قیاس کا جمع ہونا اور صفاتِ نص کا علیحدہ ہونا یا نص کا جمع ہونا اور قیاس کا علیحدہ ہونا ـــ اور اصولی حضرات، ذاتی صفات کا جمع اور فعلی صفات کا افتراق مراد لیتے ہیں۔ لیکن سیاری حضرات کے نزدیک ان میں سے کوئی معنی بھی مراد نہیں۔ اس لیے اب میں ان عبارات سے اس گروہ کا مقصد اور ان کے مشائخ کا اختلاف اس کتاب میں بیان کروں گا تاکہ تمہیں اس کی حقیقت معلوم ہو جائے اور جمع و تفرقہ سے مشائخ کے ہر طبقے کی مراد کا تجھے علم حاصل ہو جائے ـــ وباللہ التوفیق

جمع اور تفرقہ کا بیان

حق تعالیٰ نے تمام لوگوں کو اپنی "دعوت" میں جمع کیا ہے جیسا کہ فرمایا

وَاللّٰہُ یَدۡعُوۡۤا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ   اللہ تعالیٰ سب کو جنت کی طرف دعوت دیتا ہے۔

پھر ہدایت کے معاملے میں ان میں تفریق کر دی اور فرمایا

وَیَھۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ۔   اور وہ جس کو چاہتا ہے صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

یعنی دعوت کے اعتبار سے سب کو بلایا ہے لیکن اظہار مشیت کے طور پر ایک گروہ کو ہدایت نصیب کرتا ہے، گویا حکم دینے میں سب کو جمع کیا اور پھر ایک گروہ کو مردود بنا کر اور اپنے بعض بندوں کو اپنی توفیق سے مقبول بنا کر ان میں تفریق کر دی۔ نیز اسی طرح برائیوں سے بچنے کے لیے نہی کرنے میں سب کو جمع کیا لیکن پھر ایک گروہ کو عصمت عطا کی اور دوسرے کو گناہوں کی طرف میلان دے کر تفریق کر دی۔ پس اس معنی کے لحاظ سے جمع ایک حقیقت اور خاص راز اور حق تعالیٰ کی مراد ہو گا جب کہ اُس کے حکم اور نہی کا اظہار تفرقہ ہو گا۔ جیسا کہ اُس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تو حکم دیا کہ اسماعیل کا گلا کاٹ دو لیکن خود یہ چاہا کہ نہ کاٹے، اور ابلیس کو حکم دیا کہ حضرت آدمؑ کو سجدہ کر لیکن خود یہ چاہا کہ وہ سجدہ نہ کرے اور حضرت آدمؑ سے کہا کہ گندم نہ کھانا لیکن خود چاہا کہ وہ کھائے، اس طرح کی بہت سی مثالیں موجود ہیں ــــ پس "جمع وہ ہے جو اس کے اوصاف سے جمع ہو اور تفرقہ وہ ہے جو اُس کے افعال کی بدولت جدا ہو"۔ اور یہ سب کچھ حق تعالیٰ کے ارادے کے اثبات میں مخلوق کے ارادے کا منقطع ہونا اور مخلوق کے تصرف کا ختم ہو جانا ہے ــــ جمع اور تفرقہ کے متعلق جتنا کچھ میں نے بیان کیا ہے مشائخ طریقت کے ساتھ اس میں معتزلہ کے علاوہ تمام اہل سنت کا اتفاق ہے تاہم بعد ازیں ان عبارتوں کے استعمال میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ ان کو توحید پر استعمال کرتا ہے اس گروہ کے حضرات کہتے ہیں کہ جمع کے دو درجے ہیں ایک حق تعالیٰ کے اوصاف اور دوسرا بندے

کے اوصاف ہیں - جو درجہ اوصاف حق تعالیٰ میں ہے وہ توحید کا راز ہے اور بندے کا کسب اس سے منقطع ہے، اور جو درجہ بندہ کے اوصاف میں ہے وہ توحید کے مسئلہ پر سچے عقیدے اور صحیح ارادے سے عبارت ہے، اور یہ قول حضرت ابو علی رودباری رحمۃ اللہ علیہ کا ہے — اور دوسرا گروہ وہ ہے جو ان کو صفات باری تعالیٰ پر استعمال کرتا ہے یہ حضرات کہتے ہیں کہ جمع حق تعالیٰ کی صفت ہے اور تفرقہ حق تعالیٰ کا فعل ہے۔ اور اس کے ساتھ بندے کے کسب کا کوئی تعلق نہیں کیوں کہ حق تعالیٰ کے ساتھ خدائی میں کوئی بھی تنازع کرنے والا نہیں۔ پس ذات اور صفات کا جمع اُسی کی ذات کے لیے ہے اس لیے کہ

الجمع التسویة فی الاصل - جمع اصل میں برابر کرنے کا نام ہے۔

اور اس کی ذات وصفات کے علاوہ کوئی چیز بھی اُس کے ساتھ مساوی نہیں اور ان کے افتراق میں مخلوق کی تفصیل اور عبارت جمع نہیں ہوسکتی۔ اس بات کا معنی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی صفات قدیم ہیں اور وہ اُن کے ساتھ موصوف ہے اور اُن کا قیام اُس کی ذات کے ساتھ ہے اور ان کا وجود اُس کے ساتھ مخصوص ہے، اور وہ اور اُس کی صفات دو مختلف چیزیں نہیں کیوں کہ اُس کی وحدانیت میں فرق اور تعداد جائز نہیں ہے۔ اس حکم کے اعتبار سے جمع کا اطلاق اس معنی کے بغیر درست نہیں ہوگا۔

احکام میں تفرقہ

یہ خداوند جل جلالہ کے افعال ہیں جو سب حکم میں متفرق ہیں۔ ایک کے لیے وجود کا حکم ہے تو دوسرے کے لیے عدم کا — باقی جو عدم ممکن الوجود ہو اس میں ایک کے لیے فنا کا اور دوسرے کے لیے بقا کا حکم ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور گروہ ان الفاظ کا علم پر اطلاق کرتا ہے وہ حضرات کہتے ہیں کہ

الجمع علم التوحید والتفرقة علم الاحکام۔ جمع، اللہ کی توحید کا علم اور تفرقہ اللہ کے احکام کا علم ہے۔

پس علمِ عقائد جمع ہوگا اور علم احکام تفرقہ — مشائخ میں سے ایک بزرگ نے

بھی اسی طرح کی بات کی ہے کہ

الجمع ما اجتمع علیہ اھل العلم جمع وہ ہے جس پر اہل علم متفق ہوں اور تفرقہ وہ ہے
والتفرقۃ ما اختلفوا فیہ۔ جس میں اہل علم کا اختلاف ہو

پھر جمہور محققین صوفیہ (اللہ تعالیٰ اُن کے چہروں کو تروتازہ رکھے) عبارات اور رموز میں لفظ تفرقہ سے مراد بندے کے اعمال اور کسب ہے اور جمع سے مراد حق تعالیٰ کے مواہب وعطیات ہیں۔ یعنی مجاہدہ اور مشاہدہ مراد ہیں۔ پس بندہ اپنے مجاہدے اور محنت سے جو چیزیں حاصل کرتا ہے وہ سب تفرقہ ہیں اور جو چیزیں بندہ کو محض حق تعالیٰ کی عنایت اور ہدایت سے حاصل ہوتی ہیں وہ سب جمع ہیں ــ اور بندے کی عزت اس میں ہے کہ وہ اپنے افعال کے وجود اور مجاہدات کے امکان میں حق تعالیٰ کے جمال کی بنا پر اپنے فعل کی آفت سے خلاصی پا جائے، اور اپنے افعال کو حق تعالیٰ کے فضل وکرم میں مستغرق پائے اور مشاہدہ کو ہدایت الٰہی کے پہلو میں معدوم پائے۔ پس اس طرح اس کا پورا قیام حق تعالیٰ کے ساتھ ہوگا اور حق تعالیٰ اُس کے اوصاف کا وکیل وکارساز ہوگا۔ اور اُس کے تمام افعال کی اضافت اُسی کی طرف ہوگی یہاں تک کہ وہ اپنے فعل کی نسبت سے بھی چھوٹ جائے گا۔ جیسا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں جبرئیل سے اور جبرئیل نے خداوند تعالیٰ سے خبر دی کہ حق تعالیٰ نے فرمایا

لَا یَزَالُ عَبْدِی یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّہٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُہٗ کُنْتُ سَمْعًا وَبَصَرًا وَیَدًا وَلِسَانًا فَبِیْ یَسْمَعُ وَبِیْ یُبْصِرُ وَبِیْ یَنْطِقُ وَبِیْ یَبْطِشُ۔

میرا بندہ مسلسل نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا ہے حتیٰ کہ میں اُس کو دوست بنا لیتا ہوں، پس جب میں اُس کو دوست بنا لیتا ہوں تو میں اُس کے لیے کان، آنکھ، ہاتھ اور زبان بن جاتا ہوں کہ وہ مجھ سے ہی سُنتا مجھ سے ہی دیکھتا میرے ساتھ ہی بولتا اور میرے ذریعے ہی پکڑتا ہے۔

یعنی جب ہمارا بندہ مجاہدہ کے ذریعے ہم سے قریب ہوتا ہے تو ہم اُس کو اپنی دوستی کی منزل تک پہنچا کر اُس کی ہستی کو اس میں فنا کر دیتے اور اُس کے افعال کی نسبت اُس کی طرف سے اٹھا دیتے ہیں تا کہ وہ جو کچھ سُنے ہمارے ذریعے سے سُنے، جو کچھ کہے ہمارے ذریعے

سے کہے، جو کچھ دیکھے ہمارے سبب سے دیکھے اور جو کچھ پکڑے ہمارے سبب سے ہی پکڑے ۔ یعنی ہمارے ذکر میں ہمارے ذکر سے مغلوب ہو کر اُس کا کسب اُس کے ذکر سے فنا ہو جاتا ہے اور ہماری یاد اُس کے ذکر پر اس طرح غالب آجاتی ہے کہ اُس کے ذکر سے آدمیت کی نسبت منقطع ہو جاتی ہے ۔ پس اُس کا ذکر ہمارا ذکر ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ غلبہ کی حالت میں اس طرح ہو جاتا ہے کہ حضرت بایزیدؒ نے کہا

سبحانی مَا اَعْظَمُ شَانِی۔ میری ذات پاک ہے، میری شان کتنی بلند ہے۔

اور آپ جو کچھ کہہ رہے تھے اس کا نشانہ ویسے تو ان کی اپنی زبان ہی تھی لیکن کہنے والی حق تعالیٰ کی ذات تھی ــــ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

الحق ینطق علیٰ لِسانِ عُمَرَ۔ عمر فاروقؓ کی زبان پر حق بولتا ہے ۔

اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب حق تعالیٰ کا اقتدار، آدمیت پر اپنا غلبہ ظاہر کرتا ہے تو اُس کی ہستی کو اُس سے چھین لیتا ہے حتیٰ کہ اس کا بولنا اُس کا بولنا ہو جاتا ہے۔ وہ محال لازم آئے بغیر کہ حق تعالیٰ مخلوقات کے ساتھ امتزاج پائے یا متحد ہو جائے یا تمام چیزوں میں حلول کرے کیوں کہ اللہ تعالیٰ اُن تمام باتوں سے پاک اور بہت بلند ہے جو ملحد اور بے دین لوگ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں ــــ پس یہ جائز ہے کہ حق تعالیٰ کی دوستی بندے کے دل پر غالب ہو جائے اور اس کے غلبہ اور دوستی کی زیادتی کو برداشت کرنے سے عقل اور طبیعت عاجز آجائے اور اُس کا معاملہ اپنے اکتساب سے ساقط ہو جائے اس وقت اس مرتبہ و مقام کو جمع کہتے ہیں ــــ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ کی یاد میں مستغرق اور حق تعالیٰ کی دوستی میں مغلوب تھے تو اُن سے ایک فعل صادر ہوا لیکن خدا تعالیٰ نے اُس کی نسبت اُن کی طرف سے اُٹھا دی اور فرمایا کہ وہ فعل تو میرا فعل تھا نہ کہ تمہارا۔ باوجودیکہ اُس فعل کا محل اور نشانہ حضورؐ کی ذات تھی ۔

وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی۔ اے محمدؐ! وہ مٹھی بھر خاک دشمنوں کے چہروں پر تم نے نہیں ہم نے پھینکی تھی ۔

اور جب اس طرح کا ایک فعل حضرت داؤد علیہ السلام سے حاصل ہوا تو حق تعالیٰ

نے کہا۔

وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوْتَ۔ اور داؤدؑ نے جالوت کو قتل کیا

کیوں کہ داؤد علیہ السلام اس وقت حالتِ تفرقہ میں تھے ـــ اور ان دلو آدمیوں کے درمیان بڑا فرق ہے جن میں سے ایک کے فعل کی اضافت تو حق تعالیٰ اُس بندے کی طرف ہی کریں اور وہ محل آفت وحوادث بھی ہے۔ اور دوسرے آدمی کے فعل کی نسبت اپنی ذات کی طرف کریں جب کہ حق تعالیٰ خود قدیم اور آفات وحوادث سے پاک ذات ہے۔ پس جب کسی آدمی سے ایسا فعل ظاہر ہو جو انسانوں کے افعال کی جنس میں سے نہ ہو تو لامحالہ اُس کا فاعل حق جل جلالہ خود ہوگا۔ معجزے اور کرامتیں سب اسی کے ساتھ مقرون ہیں۔ پس جو افعال عام عادت کے مطابق ہوں وہ سب تفرقہ ہوں گے اور جو افعال خلاف عادت ہوں وہ سب جمع ہوں گے۔ اس لیے ایک رات میں "قابِ قوسین" کے مقام تک پہنچ جانا عادت کے مطابق نہیں ہے اور یہ حق تعالیٰ کے فعل کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح کسی پوشیدہ چیز کے بارے میں صحیح خبر دے دینا بھی عادت کے مطابق نہیں اور یہ بھی فعل خداوندی کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اور آگ سے نہ جلنا بھی خلافِ عادت ہے یہ بھی فعلِ خداوندی کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ پس حق تعالیٰ اپنے انبیاء اور اولیاء کو معجزے اور کرامتیں عطا کرتا ہے اور اپنے فعل کو اُن سے اور اُن کے فعل کو اپنے سے منسوب کرتا رہتا ہے۔ کیونکہ اُس کے دوستوں کا فعل خود اس کا اپنا فعل ہوتا ہے اور اُن کی بیعت اس کی بیعت اور ان کی اطاعت خود اس کی بیعت ہوتی ہے جیسا کہ اُس نے خود ہی ارشاد فرمایا ہے کہ

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ۔ بے شک جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ سے بیعت کر رہے ہیں۔

نیز ارشاد فرمایا کہ

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ جس نے رسولؐ کی اطاعت کی تو گویا اُس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔

پس اولیاء اللہ اسرار و باطن میں تو حق تعالیٰ کے ساتھ حالتِ جمع میں ہوتے ہیں لیکن اپنے اعمال میں اور ظاہری طور پر حالتِ تفرقہ میں ہوتے ہیں تاکہ باطن کے حق تعالیٰ کے ساتھ جمع ہونے سے اُن کی دوستی مستحکم ہو اور ظاہری طور پر افتراق میں بندگی کو قائم رکھنا صحیح ہو۔ جیسا کہ حالتِ جمع میں مشائخ میں سے ایک بڑے بزرگ نے فرمایا کہ "شعر

تو میرے باطن میں ثابت ہو گیا تو میری زبان نے تیرے ساتھ سرگوشی کی، پس ہم بعض معانی کے اعتبار سے تو جمع ہیں اور بعض معانی کے اعتبار سے تفرقہ میں ہیں — پس تیری بلند شان نے اگر تجھ کو میری آنکھ سے غائب بھی کر دیا تو میرے جذبہ محبت نے پھر بھی تجھے میرے لیے پناہ بنا دیا —

اس میں اس بزرگ نے باطن کے حق تعالیٰ کے ساتھ ملنے کو جمع اور زبان کی مناجات کو تفرقہ کہا ہے، اور پھر جمع اور تفرقہ دونوں کو اپنے اندر علامت بنایا ہے اور اس کی اصل اپنے آپ کو قرار دیا ہے — اور یہ کلام بڑا ہی لطیف ہے ۔ وباللہ التوفیق ۔

فصل

جمع اور تفرقہ میں اختلاف

یہاں اسی طرح کا ایک ، اور اختلاف ہمارے اور اس گروہ کے درمیان ہے جو یہ کہتے ہیں کہ جمع کا اظہار تفرقہ کی نفی کو لازم ہے کیوں کہ یہ دونوں متضاد ہیں لہٰذا جب ہدایت خداوندی کی حکومت حاوی ہو جائے گی تو کسب اور مجاہدہ کی ولایت ختم ہو جائے گی۔ حالانکہ یہ تعطیل محض ہے جو ہرگز جائز نہیں —— میں کہتا ہوں کہ یہ تو تمہارے عقیدہ کے خلاف ہے کیوں کہ جب تک ایک انسان میں عمل کرنے کی قوت اور امکان موجود ہو اس سے کسب اور مجاہدہ ساقط نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ جس طرح سورج سے روشنی، جوہر سے عرض اور موصوف سے صفت جدا نہیں اسی طرح جمع بھی تفرقہ سے جدا نہیں ہے۔ پس مجاہدہ ہدایت سے شریعت، حقیقت سے اور مقصود کا حاصل کرنا اُس کی جستجو سے نیز جدا

نہیں ہوگا۔ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ مجاہدہ حق تعالیٰ کی ہدایت کے حصول سے مقدم ہو یا مؤخر ہو، لیکن جس انسان کو مجاہدہ پہلے کرنا پڑے اسے مشقت زیادہ درپیش ہو گی کیونکہ وہ حق تعالیٰ سے غیبت میں ہے۔ اور جس آدمی کو مجاہدہ، ہدایت الٰہی کے حصول کے بعد کرنا پڑے اُسے رنج اور کلفت نہ ہو گی کیوں کہ وہ حق تعالیٰ کے حضور میں ہے۔ اور جس آدمی کو حضورِ حق میں ہونے کی وجہ سے اعمال کی مشقت محسوس نہ ہوتی ہو، وہ اگر اس کو عین اعمال کی نفی میں سمجھنے لگے تو یہ بہت بڑی غلطی پر ہے۔ اور یہ جائز ہے کہ بندہ مجاہدہ و ریاضت کے سبب ایسے مقام پر پہنچ جائے کہ اپنے تمام اوصاف کو معیوب اور ناقص سمجھنے لگے کیوں کہ جب وہ اپنے اچھے اوصاف کو بھی عیب کی نگاہ سے اور ناقص دیکھے گا تو اُسے اپنے بڑے اوصاف تو اور بھی زیادہ بڑے اور ناقص نظر آئیں گے ——— میں نے یہ بات یہاں اس لئے بیان کر دی ہے کہ جاہلوں کا ایک طبقہ اس معاملے میں غلطی میں پڑ گیا ہے جو حقیقت سے بیگانگی کی دلیل ہے وہ کہتے ہیں کہ "جب مقصود کا حصول ہماری کسی بھی کوشش اور جدوجہد کا نتیجہ نہیں کہ ہمارے افعال اور اطاعات سب عیب دار ہیں تو پھر ناقص مجاہدے کا اختیار نہ کرنا ہی اُسے اختیار کرنے سے زیادہ بہتر ہوگا ———

میں اُن سے کہتا ہوں کہ "انسان کے لئے عمل کو ہم اور تم فعل کہنے پر متفق ہیں اور افعال کو محل عیب اور شر" و آفت کا سرچشمہ کہتے ہیں تو لا محالہ فعل کا نہ کرنا بھی ایک فعل ہوگا جب کرنا اور نہ کرنا دونوں فعل ہوئے اور فعل محل عیب ہوتا ہے تو پھر تم نہ کرنے کو کرنے سے کس طرح زیادہ بہتر جانتے ہو؟ یہ تو ظاہر خسارہ اور واضح نقصان ہے پس مومن اور کافر کے درمیان یہ بڑا ہی اچھا فرق ہے اس لئے کہ مومن اور کافر سب متفق ہیں کہ بندوں کے افعال محلِ عیب ہوتے ہیں۔ پس مومن تو حق تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے کرنے کو نہ کرنے سے بہتر جانتا ہے اور کافر تعطل کی وجہ سے نہ کرنے کو کرنے سے بہتر جانتا ہے ——— پس جمع یہ ہے کہ رویت و مشاہدہ کی حالت میں تفرقہ کی آفت کے لئے اُس سے تفرقہ کا حکم ساقط نہ ہو جائے۔ اور تفرقہ یہ ہے

کہ جمع کے حجاب میں بھی تفرقہ کو جمع ہی سمجھے ـــــ حضرت مزین کبیر اس معنی میں فرماتے ہیں کہ

"الجمع الخصوصیۃ۔ والتفرقۃ العبودیۃ موصول احدھما بالآخر غیر مفعول عنہ"

(حق تعالیٰ کے مشاہدہ سے خاص ہونا بندے کے لئے جمع ہے اور اُس کی عبودیت بندہ کے لئے تفرقہ ہے اور یہ دونوں آپس میں ملے ہوئے ایک دوسرے سے جدا نہیں) کیونکہ مشاہدہ سے مخصوص ہونے کی علامت خود عبودیت کی حفاظت ہے، جب معاملات کا دعویٰ کرنے والا اپنے معاملات میں قائم نہ ہو تو وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہوتا ہے۔ پس یہ تو جائز ہے کہ حق تعالیٰ کے احکام کو پورا کرنے میں مجاہدے کا بوجھ اور تکلیف کا رنج اُس سے اُٹھ جائے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بغیر کسی واضع عذر کے جو شریعت کے حکم میں عام ہو احکام کا بجالانا اُس کے ساتھ جمع ہی رہے گا ـــــ اور میں اس کی ذرا وضاحت کرتا ہوں تاکہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہو جائے چنانچہ جان لو کہ جمع دو قسم کی ہوتی ہے ـــــ پہلی جمع سلامت اور دوسری جمع تکسیر!۔ جمع سلامت تو یہ ہے کہ احوال کے غلبہ وجد کی قوت اور عشق کے اضطراب میں حق تعالیٰ سامنے آئیں اور ان حالتوں میں اپنے بندے کے نگہبان بن جائیں اور اس بندے کے ظاہر پر اپنے احکام کو جاری کر کے اُسے ان پر عمل کرنے میں اپنی پناہ میں لئے رکھیں اور اُس کو مجاہدہ کے ساتھ آراستہ کر دیں۔

جیسا کہ حضرات سہل بن عبداللہ، ابو حفص حداد، ابوالعباس سیاری مرزوی صاحب مذہب بایزید بسطامی، ابوبکر شبلی، ابوالحسن حصری اور کبار مشائخ کی ایک جماعت رحمہم اللہ اجمعین جو ہمیشہ مغلوب الحال رہتے تھے لیکن جب نماز کا وقت آجاتا تو یہ اپنی اصلی حالت پر لوٹ آتے اور جب نماز ادا کر چکتے تو پھر مغلوب الحال ہو جاتے اس لئے کہ جب تک تم محل تفرقہ میں رہو گے تم، تم ہی ہو گے اور احکام بجالاؤ گے لیکن جب حق تعالیٰ تمہیں جذب کر کے مغلوب بنا دے گا تو وہ اپنے احکام کی زیادہ بہتر طریقے سے تجھ پر نگاہ رکھے گا اور دونوں جہت محفوظ کرے گا ایک یہ کہ بندگی کی علامت تجھ سے نہ اُٹھے اور دوسری یہ کہ وہ اپنے اس وعدے کو بھی قائم رکھے کہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو کبھی بھی منسوخ نہیں کروں گا ـــــ اور جمع تکسیر یہ ہے کہ بندہ احکام کے معاملہ میں دیوانہ اور بے ہوش ہو جائے اور اس کا حکم پاگلوں کی

طرح ہو جائے۔ پس یہ تو اس معاملہ میں معذور قرار پائے گا لیکن پہلا بندہ مشکور ہو گا اور ظاہر ہے کہ مشکور کا معاملہ معذور سے زیادہ مضبوط ہی ہوتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ تم جان لو جمع کے لئے کوئی مخصوص مقام نہیں ہے اور نہ ہی کوئی الگ حال ہے کیوں کہ جمع نام ہے اپنے مطلوب کے حصول کے لئے ہمت کو جمع کرنے کا۔ چنانچہ کسی جماعت کو تو اس معنی کا کشف مقامات میں ہوتا ہے اور کسی کو احوال میں۔ اور ان دونوں اوقات میں صاحب جمع کی مراد مراد کی نفی سے حاصل ہوتی ہے کیوں کہ "تفرقہ جدائی ہے اور جمع ملاپ ہے" اور یہ جملہ تمام چیزوں میں درست آتا ہے جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا ارادہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ جمع تھا کہ ان کے ارادے کے علاوہ آپ کو کوئی ارادہ نہ سوجھتا تھا اور مجنوں کے ارادہ کا جمع لیلیٰ کے ساتھ تھا کہ پوری دنیا میں وہ اُس کے علاوہ کسی کو نہ دیکھتا تھا اور اس کے لئے تو تمام موجودات لیلیٰ کی ہی صورت تھیں، اس طرح کی مثالیں بہت سی ہیں جیسا کہ حضرت بایزید ایک دن اپنے عبادت خانے میں تھے کہ ایک آدمی آیا اور پوچھا کہ "ھل بویزید فی البیت" (کیا بایزید گھر میں ہیں ؟) تو آپ نے جواب دیا کہ "ھَلْ فی البیتِ الا اللہ" (گھر میں تو اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے) یعنی حضرت بایزید کمرے میں ہی موجود تھے لیکن جواب یہ دیا کہ میرے گھر میں حق تعالےٰ کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے ——— مشائخ میں سے ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ ایک درویش مکہ مکرمہ میں آیا اور خانہ کعبہ کے سامنے ایک سال تک اس طرح بیٹھا رہا کہ نہ اُس نے کھانا کھایا، نہ پانی پیا، نہ نیند کی اور نہ رفع حاجت کی اُس نے اپنی حبس، ہمت و ارادہ کو خانہ کعبہ کی رویت کی طرف منسوب کیا تھا وہی گویا اُسی کے لئے جسم کی غذا اور جان کا پانی ہو گیا ———

ان تمام باتوں کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ اپنی محبت کے خمیر کو جو کہ ایک جوہر ہے، ٹکڑے ٹکڑے کر کے تقسیم کرتے ہیں اور اپنے دوستوں میں سے ہر ایک کے لئے اُس کی محبت میں گرفتاری کی مقدار اُن ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑا مخصوص کر دیتے ہیں، اس وقت انسانیت کا جوش، طبیعت کا لباس، مزاج کا پردہ اور روح کا حجاب اُس سے اُٹھ جاتا ہے یہاں تک کہ محبت کا وہ ایک ٹکڑا اپنے ساتھ ملنے والی قوتوں کے اجزاء کو اپنی

صفت میں ڈھال لیتا ہے حتیٰ کہ وہ مجسم محبت بن جاتا ہے اور اس کی تمام حرکتیں اسی کے ساتھ مربوط ہو جاتی ہیں۔ یہ وہ حالت ہے جس کو ارباب تصوف اور اہل زبان جمع کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس معنی میں حضرت حسین بن منصور کہتے ہیں کہ

"میں حاضر ہوں اے میرے آقا و مولا میں حاضر ہوں۔ میں حاضر ہوں اے میرے مقصد و معنی میں حاضر ہوں ــ اے میری ذات اور وجود کی اصل اور اے میری ہمتوں کے منتہی۔ اور اے میری کلام اور میرے اشارے اور کنائے ـــــ اے میرے کل کے کل اور اے میرے کان اور میری آنکھ۔ اور اے میرے تمام جسم اور میرے اعضاء و اجزاء ـــــ (میں تیری بارگاہ میں حاضر ہوں) ـــــ"

پس جو کوئی اپنے اوصاف میں مستعار اور عارضی ہوتا ہے اُس کا اپنے وجود کو ثابت کرنا بھی اس کے لئے باعثِ ننگ و عار ہوتا ہے۔ کہ دونوں جہاں کی طرف اُس کی توجہ کفر ہوتی ہے اور موجودات اُس کی ہمت میں ذلیل و رسوا ہوتے ہیں۔ پھر اہل زبان حضرات کا ایک گروہ کلام کرتے وقت عبادت کو تعجب انگیز بنانے کے لئے یہ کہہ دیتا ہے کہ یہ جمع الجمع ہے، یہ کلمہ عبارت کے اعتبار سے تو اچھا ہے تاہم معنی کے اعتبار سے بہتر یہ ہی ہے کہ جمع کی جمع نہ کہا جائے۔ کیوں کہ پہلے تفرقہ ہو گا تو پھر ہی اُس پر جمع کا وارد جائز ہو گا۔ اور جب جمع کی جمع ہو گی تو وہ تو تفرقہ بن جائے گا اور جمع کو اپنے حال سے گرا دے گا اور یہ عبارت محل تہمت بن جائے گی کیوں کہ جو شخص حالتِ جمع میں ہو اُس کو اپنے اوپر، نیچے یا اِدھر اُدھر کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ معراج کی رات پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو دونوں جہان اور پوری کائنات دکھائے گئے لیکن آپ نے کسی چیز کی طرف بھی توجہ نہ کی کیوں کہ آپؐ جمع کے ساتھ جمع تھے اور جمع ہونے والے کے لئے تفرقہ، مشاہدہ نہیں بن سکتا یہاں تک کہ حق تعالےٰ نے فرمایا کہ "مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی۔ (پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ نہ بھٹکی اور نہ حد سے گزری)

میں نے ابتداء ہی میں اس مضمون پر ایک کتاب تصنیف کر کے اُس کا نام "کتاب البیان لِاَہل العیان" رکھ دیا تھا اور اپنی کتاب "بحر القلوب" میں بھی جمع کے باب میں چند واضح فصلیں لکھ دی تھیں۔ اب میں نے ضرورت کے مطابق اتنی مقدار لکھ دی ہے۔

صوفیہ کے مذہب بیارسیاں کا یہی طریق تھا جو میں نے بیان کر دیا جو کہ صوفیہ کے مقبول اور محقق فرقوں میں سے ایک ہے:۔ ——— اب میں بے دینوں کے اُس گروہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو صوفیہ کے ساتھ اپنی وابستگی کا دعویٰ کرتا ہے اور اُن کی عبارتوں کو اپنے الحاد و بے دینی کے لئے استعمال کرتا ہے اور اُن کی عزت میں اپنی ذات کا چھپائے ہوئے ہے تاکہ اس گروہ کی غلطیاں ظاہر ہو جائیں اور مرید حضرات ان کے مکر و فریب اور اُن کے دعوؤں سے محفوظ ہو جائیں اور اگر اللہ چاہیں تو اپنے آپ کو اُن سے بچالیں۔

اور معاملہ تو تمام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

فرقہ حلولیہ

حلولی فرقہ کے لوگوں کے اللہ تعالیٰ اُن پر لعنت کرتے۔ "فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ فَأَنَّىٰ تُصْرَفُونَ"۔ (حق کے بعد گمراہی کے علاوہ کیا ہے؟ پس تم کہاں بھٹک رہے ہو) دو مردود گروہ ہیں، جو اہل تصوف کے ساتھ اپنی نسبت کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن وہ اپنی گمراہی میں ایک دوسرے سے بڑھے ہوئے ہیں —— ان میں سے ایک گروہ تو حضرت ابو حلمان دمشقی کے ساتھ اپنی عقیدت ظاہر کرتا ہے اور ان سے ایسی روائتیں منسوب کرتا ہے جو اُن روایات کے خلاف ہیں جنہیں مشائخ نے اپنی کتابوں میں اُن سے نقل کیا ہے، اہل تصوف نے تو اُس بزرگ کو ارباب ولایت میں شمار کیا ہے لیکن یہ بے دین لوگ، حلول، امتزاج اور نسخ ارواح کے عقائد اُن کی طرف منسوب کرتے ہیں —— اور میں نے متقدمین کی کتابوں میں دیکھا ہے کہ انہوں نے اس عقیدے میں اُن پر طعن کیا ہے اور علماء اصولین سے بھی اسی طرح کی صورت سامنے آئی ہے، اس معاملے میں اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں —— اور دوسرا گروہ اپنے مقولوں کی نسبت فارس کے ساتھ کرتا ہے اور وہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ مذہب حضرت حسین بن منصور کا ہے، حالانکہ اُس بے دین گروہ کے علاوہ حضرت حسین بن منصور کے ساتھیوں میں سے کسی کا یہ مذہب نہیں۔ اور میں نے ابو جعفر صیدلانی کو عراق میں دیکھا کہ وہ اپنے چار ہزار حلاتی ساتھیوں کے ہمراہ پریشان حال موجود تھا اور وہ سب ان

مقولوں کی وجہ سے فارس پر لعنت کر رہے تھے۔ اور اس کی اپنی لکھی ہوئی کتابوں میں بھی جو کچھ ہے وہ تحقیق پر مبنی ہے — اور میں علی بن عثمان ہجویری کہتا ہوں کہ "میں یہ نہیں جانتا کہ فارس اور ابو حلمان کون تھے اور کیا کہتے تھے؛ لیکن جو کوئی بھی کسی ایسے قول کا قائل ہو جو توحید کے منافی اور تحقیق شرعی کے خلاف ہو اُس کے لئے دین میں کوئی حصّہ نہیں ہے اور جب دین ہی، جو کہ اصل اور بنیاد ہے" مستحکم نہ ہو تو تصوف میں جو کہ اس کا ثمرہ اور فرع ہے" تو اس سے بھی زیادہ خلل ہو گا اس لئے کہ کرامتوں کے اظہار اور دلائل کے کشف کا اہلِ دین اور توحید پرستوں کے علاوہ کسی پر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا — ان عقائد کے قائل لوگوں کو تمام غلطیاں روح کے بارے میں لاحق ہوتی ہیں۔ اب میں ان سب کو بیان کرتا ہوں اور قانونِ سنت کے مطابق اس کے احکام بیان کرتا ہوں اور اسی بیان میں ملحدوں کے مقالات، مغالطے اور شبہے بھی پیش کروں گا تا کہ تمہیں" اللہ تعالےٰ تمہیں توفیق دے"۔ اس سے قوت حاصل ہو کیوں کہ اس میں فساد بہت زیادہ ہے — "وباللہ التوفیق"۔

روح کا بیان

جان لو کہ روح کے وجود کے بارے میں جاننا ضروری ہے حالانکہ اس کی اصل حقیقت معلوم کرنے سے عقل عاجز ہے، اُمت کے علماء و حکماء میں سے ہر شخص نے اپنے علم و قیاس کے مطابق اس بارے میں کچھ نہ کچھ کہا ہے، نیز کافر گروہوں نے بھی اس میں گفتگو کی ہے اور جب یہود کے سکھانے پر کفارِ قریش نے نضر بن حارث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا تا کہ وہ آپؐ سے روح کی کیفیت اور ماھیت سے متعلق سوال کرے تو خداوند تعالےٰ نے اولاً تو اس کے وجود کو ثابت کرتے ہوئے فرمایا کہ وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ "(اور وہ مشرک آپ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں) اور پھر اس کے قدیم ہونے کی نفی کی اور فرمایا "قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ" (آپ کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کے امور میں سے ایک امر ہے) اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا کہ "اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَۃٌ وَمَا تَعَارَفَ مِنْہَا اِئْتَلَفَ وَمَا تَنَاکَرَ مِنْہَا اخْتَلَفَ" (روحیں جمع کیا گیا لشکر ہیں پس جنہوں

عالم ارواح میں ایک دوسرے کو پہچانا اُن میں الفت پیدا ہو گئی اور جن کی آپس میں وہ شناسائی نہ ہو سکی وہ مختلف رہے، اسی طرح کی بہت سی دلیلیں روح کے وجود پر موجود ہیں لیکن اس کی کیفیت اور حقیقت کا کہیں بیان نہیں پس ایک گروہ کا کہنا ہے۔ الروحُ هُوَ الحیوة التی یحیی بہ الجسد (روح وہ زندگی ہے کہ جس کے سبب جسم زندہ رہتا ہے) متکلمین کا ایک گروہ بھی اسی کا قائل ہے اس حصر کے اعتبار سے روح ایک ایسا عرض ہے کہ جس کے ذریعہ حق تعالیٰ کے حکم سے جاندار زندہ رہتا ہے اور اس جاندار میں تالیف، حرکت اور مختلف اجزاء کا باہم اجتماع اسی روح کی وجہ سے ہے اسی طرح وہ اعراض بھی اسی کی وجہ سے ہیں جن کے ساتھ وہ جسم ایک حالت سے دوسری کی طرف لوٹتا ہے —— اور ایک دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ "روح زندگی کے علاوہ کوئی چیز ہے لیکن زندگی اس کے بغیر پائی نہیں جاتی۔ جس طرح کہ روح بغیر جسم کے نہیں پائی جاتی۔ اور یہ کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی دوسرے کے بغیر نہیں پایا جا سکتا جس طرح کہ درد اور اس کا علم ہے۔ اس لیے کہ یہ دونوں مختلف چیز ہیں لیکن ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہوتیں۔ اس معنی کے اعتبار سے بھی روح ایک عرض ہوگی جس طرح کہ زندگی ایک عرض ہے۔ پھر جمہور مشائخ اور اہل سنت وجماعت کی اکثریت کا کہنا یہ ہے کہ "روح ایک ذات ہے، صفت نہیں کہ جب تک وہ جسم کے ساتھ پیوست رہے اُس وقت تک حق تعالیٰ اپنی عادت کے مطابق اس میں زندگی کر دیتے ہیں۔ اور انسان کی زندگی بھی ایک صفت ہے اور انسان اس سے زندہ ہے لیکن روح انسان کے جسم میں ایک امانت ہے۔ اور یہ ہو سکتا ہے کہ وہ آدمی سے الگ ہو جائے اور آدمی زندگی کی وجہ سے زندہ رہے جیسا کہ نیند کی حالت میں روح تو چلی جاتی ہے لیکن زندگی باقی رہتی ہے تاہم یہ نہیں ہو سکتا کہ روح کے چلے جانے کے بعد علم اور عقل سلامت رہے اس لیے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ "شہداء کی روحیں ایک جوہر ہیں جو قائم بذاتہٖ ہیں۔ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "الارواح جنودٌ مجندةٌ (ارواح جمع کئے گئے لشکر ہیں) لامحالہ لشکر تو باقی رہتے ہیں لیکن عرض پر نہ بقا درست ہوتی ہے اور نہ ہی وہ اپنی ذات کے ساتھ قائم ہوتا ہے پس روح اس لطیف جسم کا نام ہو گا جو خدا تعالیٰ کے حکم

سے آتا ہے اور اُسی کے حکم سے جاتا ہے، اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا ہے کہ میں نے معراج کی رات حضرات آدم صفی اللہ، یوسف صدیق، موسٰی کلیم اللہ، ہارون حلیم اللہ، عیسٰی روح اللہ اور ابراہیم خلیل اللہ صلوات اللہ علیہم اجمعین کو آسمانوں میں دیکھا ہے تو لامحالہ وہ اِن حضرات کی ارواح ہوں گی اور اگر روح عرض ہوتی تو اپنی ذات کے ساتھ قائم نہ ہوتی تاکہ اُس کے وجود کی حالت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس کو دیکھ سکتے کیوں کہ اگر عرض ہوتی تو اُس کے وجود کے لئے ایک محل ہونا چاہئے تھا جس محل کے ساتھ وہ عارض ہوتی اور اُس کا محل جوہر ہوتا کیوں کہ جواہر مرکب اور کثیف ہوتے ہیں۔ (حالانکہ پیغمبر علیہ السلام نے انبیاء کی رُوحوں کو جسموں کے ہمراہ نہیں دیکھا) پس معلوم ہو گیا کہ روح ایک لطیف شئی ہے اور اس کا جسم بھی ہے، جب وہ جسم ہے تو اس کو دیکھنا درست ہوا خواہ یہ دیکھنا دل کی آنکھ کے ساتھ ہی ہو۔ اور یہ بھی درست ہوا کہ وہ پرندوں کے قالب میں ہوں اور یہ بھی درست ہوا کہ وہ ایسا لشکر ہوں جن کا آنا اور جانا ثابت ہو۔ جیسا کہ احادیث اس پر ناطق ہیں چنانچہ فرمایا کہ "قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي" (کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کا ایک امر ہے) گویا اس کا جسم میں آنا اور اس سے نکلنا سب حق تعالٰے کے حکم سے ہے۔

باقی یہاں رہا اختلاف ملحدین کا کہ وہ روح کو قدیم کہتے ہیں اس کی پرستش کرتے ہیں اور اس کے علاوہ اشیاء کا فاعل اور مدبر کسی اور کو نہیں مانتے اور وہ ارواح کو معبود ازلی مدبر کہتے ہیں اور اُن کا کہنا ہے کہ روح ایک جسم سے دوسرے جسم کی طرف پلٹ بھی جاتی ہے ـــــ اس شبہے کے علاوہ مخلوق کو پیش آنے والے شبہات میں سے کسی شبہے پر اتنا اتفاق نہیں ہے اس لئے کہ تمام نصارٰی اگرچہ بیان اس کے خلاف کرتے ہیں لیکن درحقیقت ان کا عقیدہ یہی ہے، نیز تمام ہندو، اہل تبت، اہل چین اور چین سے اُدھر رہنے والے بھی اسی پر متفق ہیں۔ اسی طرح شیعوں، قرامطیوں اور باطنی فرقہ کے لوگوں کا بھی اسی عقیدے پر اجماع ہے اور وہ دونوں باطل فرقے بھی اسی قول کے قائل ہیں ـــ ہمارے بیان کردہ گروہوں میں سے ہر گروہ اسی قول کو زیادہ مقدم سمجھتا ہے اور دلائل کے ساتھ اس کا دعوٰی کرتا ہے

ہم ان تمام فرقوں سے پوچھتے ہیں کہ تمہاری اس لفظ قدیم سے کیا مراد ہے؟ کیا ایسا حادث مراد

ہے جو صرف اپنے وجود میں قدیم ہو یا ایسا قدیم جو ہمیشہ سے اور ہر اعتبار سے قدیم ہو؟ اگر وہ کہیں کہ ہماری مراد اس سے ایسا حادث ہے جو صرف اپنے وجود میں قدیم ہو تو اس صورت میں تو ہمارے درمیان سے اختلاف ختم ہو جائے گا کیوں کہ ہم بھی روح کو ایسا حادث کہتے ہیں جو اپنے وجود کے اعتبار سے جسم کے وجود سے قدیم ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "اِنَّ اللّٰہَ تعالیٰ خلق الارواح قبل الاجساد بالفی عام" (بلاشبہ اللہ تعالے نے ارواح کو جسموں سے کئی ہزار سال پہلے پیدا کر دیا تھا) اور جب اس کا حادث ہونا درست ہو گیا تو جب لامحالہ ہر حادث کسی پیدا کرنے والے کے پیدا کرنے کا محتاج ہوتا ہے تو یہ روح بھی خدائے عزوجل کی مخلوق میں سے ایک جنس ہوگی جو دوسری جنس کے ساتھ پیوست ہوتی ہے اور ان دونوں کے ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہونے میں حق تعالے اپنی تقدیر سے زندگی پیدا کر دیتے ہیں — یعض ارواح مخلوق میں سے ایک جنس اور جسم دوسری جنس ہیں - جب کسی جاندار کی زندگی مقدر ہوتی ہے تو حق تعالے روح کو حکم دیتے ہیں تو وہ جسم کے ساتھ پیوست ہو جاتی ہے اور اس طرح اس میں زندگی حاصل ہو جاتی ہے — باقی روح کا ایک جسم سے دوسرے جسم کی طرف منتقل ہو جانا بھی درست نہیں کیوں کہ جس طرح ایک شخص کے لئے دو زندگیاں درست نہیں اسی طرح ایک روح کے لئے بھی دو شخصیتیں درست نہیں ہیں - اگر اس بات پر احادیث ناطق نہ ہوتیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سچی خبروں میں ہمیں اس کی اطلاع نہ بھی دیتے تو محض عقل کی رو سے بھی روح کا مفہوم سوائے زندگی کے اور کچھ نہ ہوتا اور یہ صفت یہی ہوتی نہ کہ جوہر جو قائم بذاتہ ہوتا ہے —— اور اگر وہ کہیں کہ اس قول سے ہماری مراد ایسا ازلی قدیم ہے جو ہر اعتبار سے قدیم ہو۔ تو ہم اُن سے دریافت کریں گے کہ اچھا یہ قدیم بذاتہ قائم ہے یا اپنے قیام میں کسی کا محتاج ہے؟ اگر وہ کہیں کہ روح ایسا قدیم ہے جو قائم بذاتہ ہے تو ہم پوچھتے ہیں کہ پھر کیا وہی خداوند عالم ہے یا کوئی اور؟ اگر وہ کہیں کہ خداوند عالم تو وہ نہیں ہے تو اس صورت میں حق تعالے کے علاوہ ایک دوسرے قدیم کا اثبات لازم آئے گا جو عقل کے مطابق نہیں ہے کیوں کہ قدیم محدود نہیں ہوتا (یعنی اُس کی ابتداء وانتہاء نہیں ہوتی) لیکن یہاں تو ایک ذات کا وجود دوسرے

کے لئے ضد بن رہا ہے (یعنی ان کی ابتداء اور انتہا کی حد موجود ہے) اور یہ امر محال ہے کہ قدیم تو ہو لیکن خداوند عالم نہ ہو۔ اور اگر وہ کہیں کہ وہ خداوند عالم ہے، تو ہم کہیں گے کہ اس طرح وہ روح تو قدیم ہوئی تاہم مخلوق تو حادث ہے اور ایک حادث کا قدیم کے ساتھ امتزاج بالکل محال ہے اسی طرح حادث کا قدیم کے ساتھ اتحاد، حادث کا قدیم میں حلول یا حادث کا قدیم کے لئے مکان ہونا یا قدیم کا حادث کے لئے حامل ہونا بھی محال ہے کیوں کہ جو چیز بھی کسی دوسری چیز کے ساتھ پیوست ہوتی ہے اور اس طرح جس چیز کے لئے ملنے اور جدا ہونے کی صفت موجود ہو وہ حادث ہی ہوتی ہے کیوں کہ حادث اشیاء ایک دوسرے کی جنس ہوتی ہیں؛ اور اللہ تعالےٰ اس چیز سے بہت ہی زیادہ ہے" ——— اور اگر وہ کہیں کہ وہ قدیم تو ہے لیکن بذاتہٖ قائم نہیں ہے بلکہ اس کا قیام غیر کے ساتھ ہے ——— تو یہ دعویٰ بھی دو صورتوں سے خالی نہیں۔ یا تو وہ صفت ہوگی یا عرض! اگر اس کو عرض کہیں تو لامحالہ یا اُسے کسی محل میں ماننا پڑے گا یا لا محل میں، اگر وہ محل میں کہیں تو وہ محل بھی تو اس کی طرح اپنے قیام میں کسی دوسرے کا محتاج ہوگا۔ اس صورت میں ان دونوں میں سے کسی پر بھی قدیم کا اطلاق کرنا باطل ہوگا۔ اور اگر وہ کہیں کہ وہ عرض لا محل میں ہے تو یہ بھی محال ہے کیوں کہ جب عرض اپنی ذات میں قائم ہی نہیں رہ سکتا تو لا محل میں اس کا قیام کسی طرح بھی معقول نہ ہوگا ——— اور اگر وہ یوں کہیں کہ روح ایک قدیم صفت ہے جیسا کہ حلولیہ اور تناسخیہ فرقہ کے لوگ کہتے ہیں — تو یہ بھی محال ہے کہ حق تعالےٰ کی ایک صفتِ قدیم۔ مخلوق کے لئے صفت بن جائے۔ اور اگر یہ درست مان لیا جائے کہ حق تعالےٰ کی حیات مخلوق کی صفت بن جاتی ہے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ حق تعالےٰ کی قدرت مخلوق کی قدرت بن جائے (حالانکہ یہ محال ہے تو وہ بھی محال ہی ہوگی) اور جب کہ صفت موصوف کے ساتھ قائم ہوتی ہے تو یہ کس طرح جائز ہوگا کہ صفت قدیم کا موصوف حادث ہو۔ پس لامحالہ قدیم کو حادث کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اور ملحدین کا قول اس بارے میں باطل ہے۔ اور روح حق تعالےٰ کے فرمان سے ایک مخلوق ہے اور جو کوئی اس کے علاوہ کسی اور عقیدے کا قائل ہو اُس کا مکابرہ واضح ہے اور وہ حادث کو قدیم سے

ممتاز ہی نہیں کر سکتا اور یہ ہرگز جائز نہیں کہ کوئی ولی اپنی ولایت کے درست ہوتے ہوئے حق تعالےٰ کے اوصاف سے جاھل ہو۔ اللہ تعالےٰ کا بے حد شکر ہے کہ اُس نے ہمیں بدعت اور نفسانی خطرہ سے محفوظ رکھا ہے اور ہمیں عقل نصیب فرمائی کہ اُس کے ساتھ ہم اُس کی ذات میں غور اور اس کی وحدانیت پُر استدلال کرتے ہیں اور ایمان عطا فرمایا تاکہ ہم اُسے پہچان سکیں۔ وہ ایسی حمد وثنا کے لائق ہے جس کی کوئی انتہا نہ ہو۔ کیوں کہ ہمارا تعریف کرنا متناھی ہے لیکن اُس کے انعام واکرام لامتناھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ متناہی حمد اُس کے لامتناھی انعامات کے مقابلے میں مقبول نہیں ہوتی ۔ جب اہل ظاہر نے اہل اصول سے یہ حکایات سُن لیں تو انہوں نے سمجھا کہ شاید تمام ارباب تصوف کے یہی عقائد ہیں یہاں تک کہ وہ اس سنگین غلطی اور واضح نقصان کی بدولت ان باتوں کے جمال سے ہی حجاب میں ہو گئے۔ اور ولایت حق کی لطافت اور تجلیاتِ ربانی کی روشنی اُن پہ پوشیدہ ہو گئی کیونکہ اس راہِ طریقت کے بزرگوں اور سرداروں کے لئے لوگوں کا انہیں رد کر دینا یا قبول کر لینا دونوں برابر ہیں کہ انہیں اس کی ذرہ برابر پرواہ نہیں ہوتی۔ واللہ اعلم بالصواب

فصل

مشائخ میں سے ایک بزرگ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ "الروح فی الجسد کالنار فی الحطب فالنار مخلوقة والفحم مصنوعة" (روح جسم میں اس طرح ہے جیسے لکڑی میں آگ کہ آگ مخلوق ہے اور کوئلہ مصنوع!) اور قدیم ہونا خداوند تعالےٰ کی ذات اور صفات کے علاوہ کسی کے لئے جائز نہیں۔ اور مشائخ میں سے حضرت ابوبکر واسطی رحمۃ اللہ نے ہی روح کے بارے میں زیادہ تفصیلی کلام کیا ہے ان کے بارے میں روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا "الارواح علی عشرِ مقامات (روحوں کے دس مقام ہیں)

اوّل ۔ مفسدوں اور خطا کاروں کی روحیں جو تاریکی میں قید کی گئیں ہیں اور انہیں کچھ علم نہیں کہ اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔

دوم ۔ پرہیزگار انسانوں کی روحیں جو اپنے اچھے اعمال کے نیتجہ میں پہلے آسمان میں

خوش وشادمان ہیں اور اپنی اطاعت گذاری کی بدولت خوش ہیں اور اعمال کی قوت سے سیر کرتی ہیں۔

سوم ۔مریدانِ حق کی روحیں جو چوتھے آسمان میں ہیں اور اپنے صدقِ معاملہ اور اچھے اعمال کے سائے میں فرشتوں کے ساتھ رہتی ہیں۔

چہارم :۔ دوسروں پر احسان کرنے والوں کی روحیں جو نور کی قندیلوں میں عرشِ الٰہی کے ساتھ لٹکی ہوئی ہیں۔ اُن کی غذا رحمت الٰہی اور ان کا شربت لطف وقربِ الٰہی ہے

پنجم :۔ اہلِ وفا کی روحیں جو صفا کے پردوں میں اور برگزیدگی کے مقام پر خوش ہیں۔

ششم :۔ شہیدوں کی روحیں جو جنت میں جنتی پرندوں کے قالب میں رہتی ہیں اور جنت کے باغوں میں جہاں اور جس وقت چاہیں چلی جاتی ہیں۔

ہفتم :۔ خدا تعالےٰ کے عاشقوں کی روحیں جو صفاتِ حق تعالےٰ کے نوری پردوں میں ہیں اور ادب کے بچھونے پر قیام پذیر ہیں۔

ھشتم :۔ حق تعالےٰ کے عارفوں کی روحیں جو بارگاہِ الٰہی میں رہتی ہیں اور صبح شام کلامِ الٰہی سنتی اور دنیا وجنت میں اپنے مکانوں کو دیکھتی رہتی ہیں۔

نہم :۔ حق تعالےٰ کے اولیاء کی روحیں جو جمالِ الٰہی کے مشاہدہ اور مقام کشف میں مستغرق ہیں۔ نہ اُس کے علاوہ کسی کو جانتی ہیں اور نہ اُس کے علاوہ کسی چیز میں انہیں آرام نظر آتا ہے۔

دھم :۔ درویشوں کی روحیں جو محل فناء میں قربِ الٰہی سے مشرف ہیں۔ اُن کے اوصاف و احوال تبدیل کئے جا چکے ہیں اور وہ حق تعالےٰ کے قرب سے لطف اندوز ہو رہی ہیں۔

مشائخ کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے ارواح کو اپنے اپنے مقام پر دیکھا ہے اور یہ درست ہے کیوں کہ ہم نے بیان کر دیا ہے کہ روح کا وجود ہے اور وہ ایک لطیف جسم ہے جسے دیکھا جا سکتا ہے اور جب حق تعالےٰ چاہتے ہیں کسی بندے کو دکھا دیتے ہیں —— اور میں علی بن عثمان ہجویری کہتا ہوں کہ ہماری زندگی کا وجود خداوند تعالےٰ کے ساتھ ہے اور

باقی رہنا بھی اُسی کے سبب ہے۔ ہمیشہ زندہ رکھنا بھی اُسی کا فعل ہے اور ہم اُسی کے حکم سے زندہ ہیں نہ کہ اُس کی ذات باصفات کے ساتھ ۔ اور روحی فرقہ کے تمام اقوال باطل ہیں۔ اور لوگوں کے درمیان ایک عظیم گمراہی یہ ہے کہ وہ روح کو قدیم کہتے ہیں اگرچہ انھوں نے عبارتوں کو تبدیل کر دیا ہے تاہم ایک گروہ اسے نفس اور ھیولیٰ کا نام دیتا ہے اور دوسرا گروہ نور اور ظلمت کہتا ہے ۔ اور راہ تصوف کے جھوٹے دعوے دار اس کو فنا و بقا یا جمع و تفرقہ یا اسی طرح کی اور ملمع کی ہوئی عبارتوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اپنے اس کفر کی تحسین کرتے ہیں۔ حالانکہ صوفیاء کرام اس گروہ سے بیزار ہیں کیوں کہ ولایت کا اثبات اور خداوند تعالےٰ کی محبت کی حقیقت، اس کی معرفت کے بغیر درست نہیں ہو سکتی۔ اور جب کوئی آدمی قدیم اور حادث کے درمیان فرق ہی نہ کر سکتا ہو تو وہ جو کچھ بھی کہے گا اپنے قول میں جاہل ہی ہو گا اور عقلمند لوگ جاہلوں کی باتوں پر توجہ نہیں دیا کرتے۔

ان دونوں باطل فرقوں کا جو کچھ مقصود تھا پہلی دو فصلوں میں بیان ہو چکا ہے اگر اس سے زیادہ کی تلاش ہو تو میری دوسری تصنیفات میں اُس کو ڈھونڈنا چاہیئے کہ یہاں طوالت کا میرا ارادہ نہیں ہے ۔ اب میں پردوں کے کھلنے۔ طریقت و معاملات کے ابواب اور اہل تصوف کے حقائق کا اس کتاب میں واضح دلائل کے ساتھ بیان کروں گا تاکہ مقصود کو جاننے کا راستہ تم پر آسان ہو جائے اور اس کے منکروں میں سے جس کو کچھ بصیرت حاصل ہو وہ اس کی طرف لوٹ آئے اور یہ کام میرے لئے دعائے خیر اور ثواب کا باعث بن جائے (اگر اللہ تعالےٰ چاہیں)

پہلا کشفِ حجاب

معرفتِ الٰہی

اللہ عزوجل فرماتے ہیں کہ "وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ" (انہوں نے حق تعالےٰ کی قدر نہیں پہچانی جیسا کہ اس کا حق تھا) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "لَوْ عَرَفْتُمُ اللّٰہَ حَقَّ مَعْرِفَتِہٖ لَمَشَیْتُمْ عَلَی الْبُحُوْرِ وَلَزَالَتْ بِدُعَائِکُمُ الْجِبَالُ (اگر تم اللہ تعالےٰ کو اس طرح پہچان لیتے جس طرح اُس کی معرفت کا حق ہے تو تم سمندروں کی سطح پر پیدل چلتے اور تمہارے بُلانے پر پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جاتے)

حق تعالےٰ کی معرفت دو طرح کی ہے۔ ایک علمی اور دوسری حالی۔ معرفت علمی دنیا و آخرت کی تمام بھلائیوں کی بنیاد ہے۔ اور بندے کے لئے تمام اوقات و احوال میں اپنے خداوند تعالےٰ کی معرفت ہی تمام چیزوں سے اہم اور ضروری ہے۔ اور اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے کہ "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ" (میں نے جنوں اور انسانوں کو اپنی عبادت یعنی اپنی معرفت کے لئے پیدا کیا ہے) حالانکہ مخلوق کی اکثریت اس سے روگردان ہے سوائے ان حضرات کے جنہیں خداوند تعالےٰ نے چن لیا اور انہیں دنیا کی تاریکیوں سے رہائی نصیب کر دی ہے اور اُن کے قلوب کو اپنی معرفت سے زندہ کر دیا ہے۔ جیسا کہ حق تعالےٰ تمہیں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے حال سے متعلق خبر دیتا ہے کہ "وَجَعَلْنَا لَہٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِہٖ فِی النَّاسِ"۔ (ہم نے اس کے لئے ایک روشنی پیدا کر دی ہے جس کے ذریعے وہ لوگوں میں چلتا ہے) اور ابوجہل ملعون کے بارے میں خبر دی ہے کہ "کَمَنْ مَّثَلُہٗ فِی الظُّلُمٰتِ لَیْسَ بِخَارِجٍ مِّنْھَا۔" (اس کی حالت اس شخص کی طرح ہے جو ظلمتوں میں گھرا ہوا ہے کہ اُن سے نکل نہیں سکتا) پس معرفتِ الٰہی دل کی زندگی ہے اور حق تعالےٰ سے اعراض اس کی موت! اور ہر شخص کی قدر و قیمت معرفتِ حق کے باعث

ہی ہے کیوں کہ جس کو یہ معرفت حاصل نہیں اس کی کوئی قیمت نہیں — پس علماء فقہا اور دوسرے بزرگ حضرات، خداوند تعالےٰ کے متعلق صحیح علم کو معرفت کہتے ہیں اور مشائخ طریقت خداوند تعالےٰ کے ساتھ حال کے صحیح ہونے کو معرفت کہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ معرفت کو علم پر فضیلت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صحبتِ حال، صحبتِ علم کے بغیر نہیں ہو سکتا جب کہ صحبتِ علم کو صحبتِ حال کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ یعنی ایسا کوئی عارف نہیں ہوتا جو حق تعالےٰ کا صحیح علم نہ رکھتا ہو لیکن ایسا عالم ہو سکتا ہے جو ابھی تک حق تعالےٰ کا عارف نہ ہوا ہو ——— صوفیا اور اہل علم دونوں طبقوں میں سے جو لوگ پوری طرح اس حقیقت سے واقف نہ تھے انہوں نے اس مسئلہ میں لاحاصل مناظرے کئے ہیں اور علماء کے گروہ نے صوفیہ پر اور صوفیہ کے گروہ نے علماء پر اعتراضات کئے ہیں۔ میں اب اس مسئلہ کا راز کھول کر بیان کرتا ہوں تاکہ اللہ چاہیں تو دونوں طبقوں کو فائدہ حاصل ہو۔

فصل

اللہ تعالےٰ تمہیں سعادت مند کرے جان لو کہ لوگوں کا حق تعالےٰ کی معرفت اور اُس کے صحیح علم میں بہت سا اختلاف ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ حق تعالےٰ کی معرفت عقلی ہے اور عقلمند کے علاوہ کسی کو اُس کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ قول باطل ہے اس لئے کہ دارالاسلام میں رہنے والے دیوانے معرفت کے حکم میں داخل ہیں نیز جو بچے ابھی عاقل نہیں ہوتے اُن کا حکم بھی ایمان کا حکم ہوتا ہے کیوں کہ معرفت کا حکم اگر عقلی ہوتا تو جن کو عقل نہیں انہیں معرفت کا حکم نہ ہوتا اور اُن کافروں پر جو عقل رکھتے ہیں کفر کا حکم نافذ نہ ہوتا نیز اگر عقل، معرفت کے لئے علت ہوتی تو ہونا یہ چاہئے تھا کہ ہر عقلمند، عارف ہوتا اور تمام بے عقل جاہل ہوتے حالانکہ یہ کھلا مکابرہ ہے — اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ حق تعالےٰ کی معرفت کی علت استدلال ہے، اور جس آدمی کے سامنے حق تعالےٰ کے دلائل نہ ہوں اسے معرفت حاصل نہیں ہو سکتی لیکن ابلیس کے واقعہ کی بنا پر یہ قول بھی باطل ہے کیوں کہ اُس نے تو دلائل بہت دیکھے ہیں، لیکن جب اُس نے جنت دوزخ، عرش اور کرسی کو دیکھا تو ان تمام دلائل کی رویت بھی اُس کے لئے معرفت کی علت نہ

بن سکی۔ خداوند تعالےٰ نے بھی کہا ہے کہ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ۔ (اور اگر ہم ان کافروں پر فرشتوں کو نازل کرتے، اور مردے اِن کے ساتھ باتیں کرتے اور ہم ہر چیز کو ان کے سامنے جمع کر دیتے تو بھی یہ ایمان نہ لاتے سوائے اس کے کہ اللہ چاہے) اگر دلائل کی رویت اور ان کا استدلال معرفت کی علّت ہوتا تو حق تعالےٰ اسی کو معرفت کی علت قرار دیتے نہ کہ اپنی مشیت کو — اور اہل سنت وجماعت کے نزدیک عقل کا صحیح ہونا اور کسی دلیل کا دیکھنا معرفت کے لئے سبب ہوتا ہے۔ علت نہیں۔ جان لو کہ معرفت کی علت۔ حق تعالےٰ کی مشیت اور عنایت کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں بن سکتی اس کی عنایت کے بغیر عقل تو نابینا ہوتی ہے اس لئے کہ عقل تو خود اپنے بارے میں بھی جاہل ہے تو اپنے علاوہ کسی چیز کو کیسے پہچان سکتی ہے، نیز حق تعالےٰ کی عنایت کے بغیر دلائل کی رویت میں تفکر اور استدلال بھی غلط ہے کیوں کہ اہل ہوا اور ملحدوں کے سب گروہ بھی استدلال ہی تو کیا کرتے ہیں لیکن ان میں سے اکثر عارف نہیں ہوتے — پھر جس شخص پر حق تعالےٰ کی عنایت ہے اس کی تمام حرکات معرفت کی علامت ہیں — اور استدلال ایک طلب ہے جب کہ ترکِ استدلال، تسلیم ہے اور معرفت کے صحیح ہونے میں تعلیم، طلب سے بہتر نہیں ہوتی کیوں کہ طلب ایک ایسی اصل ہے جس کا ترک جائز نہیں اور تسلیم ایک دوسری اصل ہے جس میں اضطراب کا گزر جائز نہیں اور ان دونوں کی حقیقت، معرفت نہیں ہے، درحقیقت یہ جاننا چاہئے کہ بندہ کے لئے رہنما اور دل کو کھولنے والا خدا تعالےٰ کے علاوہ کوئی نہیں، اور عقل و دلائل کے وجود کے لئے ہدایت کا امکان نہیں اس کی دلیل اسے زیادہ واضح اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ خداوند تعالےٰ نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ "وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ"۔ (اور اگر کفار قیامت سے دنیا کی طرف لوٹا دئے جائیں تو پھر بھی وہی کام کریں جن سے انہیں روکا گیا تھا) اسی طرح جب امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لوگوں نے معرفت کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا "عَرَفْتُ اللّٰهَ بِاللّٰهِ وَعَرَفْتُ مَا دُوْنَ اللّٰهِ بِنُوْرِ اللّٰهِ (میں نے اللہ تعالےٰ کو اس کی عنایت سے اور غیر اللہ کو اللہ کے نور سے

پہچانا ہے) پس حق تعالےٰ نے جسم کو پیدا کیا اور اُس کی زندگی روح کے سپرد کر دی اور دل کو پیدا کیا تو اس کی زندگی کو اپنی ذات کے ساتھ متعلق کر دیا۔ پس جب عقل اور دلیل میں جسم کو زندہ کرنے کی قدرت موجود نہیں تو محال ہے کہ وہ دل کو زندہ کر سکیں ۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اَوَمَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰهُ۔ (کیا وہ آدمی مردہ نہ تھا کہ پھر ہم نے اُس کو زندہ کیا) یعنی حق تعالےٰ نے زندگی کو اپنی ذات سے متعلق کیا۔ اور اسی جگہ فرمایا۔ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِهٖ فِی النَّاسِ۔ (اور ہم نے اُس کے لئے ایک روشنی پیدا کی جس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا ہے) نور کو پیدا کرنا جو مومنوں کے دل میں روشنی ہے وہ بھی اپنی ذات سے متعلق کیا۔ نیز فرمایا۔ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ۔ (وہ شخص جس کا سینہ حق تعالےٰ نے اسلام کے لئے کھول دیا ہے پس اپنے رب سے روشنی پر ہے) یعنی دلوں کو کھولنے کی نسبت بھی اپنی طرف کی۔ اور اُن کو بند کرنے کو بھی اپنا فعل قرار دیا اور یوں فرمایا۔ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ۔ (اور مہر لگا دی اللہ نے اُن کے دلوں اور کانوں پر اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ہے) نیز فرمایا۔ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِکْرِنَا۔ (اور اُس کی اطاعت نہ کر جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے) پس جب دل کا قبض کرنا۔ کشادہ کرنا، کھولنا اور مہر لگانا سب کچھ حق تعالےٰ کی طرف سے ہوتا ہے تو یہ محال ہے کہ اُس کے علاوہ کسی کو رہنما سمجھا جائے۔ کیوں کہ جو کچھ بھی اُس کے علاوہ ہے وہ سب علت اور سبب کے درجے میں ہی ہے جب کہ کوئی علت اور سبب، مسبب کی عنایت کے بغیر راہ نہیں دکھا سکتا کیوں کہ حجاب راہزن ہوتا ہے نہ کہ رہنما!۔ نیز خدا تعالےٰ کا فرمان ہے کہ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ (لیکن اللہ تعالےٰ تمہارے لئے ایمان کو محبوب بنا دیا اور اُس کو تمہارے دلوں میں آراستہ کر دیا) اس آیت میں ایمان کو محبوب بنانے اور اس کو دلوں میں آراستہ کرنے کی نسبت بھی اپنی ذات کی طرف کی ہے۔ اور تقویٰ کا لازم کرنا جو عینِ معرفت حق ہے وہ بھی حق تعالےٰ کی طرف سے ہی ہے اور جس پر تقویٰ لازم ہوا ہو اُس کو اپنے اوپر لازم کرنے یا اُس کو دور کرنے کا اختیار نہیں ہوتا۔ پس حق تعالےٰ کی توفیق کے بغیر مخلوق اُس کی معرفت سے عاجز ہی رہے گی۔

حضرت ابوالحسن نوری رحمہ اللہ کا قول ہے کہ "اللہ تعالےٰ کی معرفت پر اُس کے فضل کے علاوہ کوئی دلیل نہیں ہے ہم علم تو اس لئے حاصل کرتے ہیں تاکہ اُس کی عبادت کے آداب ہمیں معلوم ہو جائیں" ——— اور مخلوقات میں سے کسی کو اس چیز کی قدرت حاصل نہیں کہ وہ کسی کو خدا تعالےٰ تک پہنچا دے، ورنہ استدلال میں کوئی ابو طالب سے زیادہ عقلمند نہیں ہو سکتا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود سے بڑی کوئی دلیل نہیں ہو سکتی لیکن ابو طالب کے لئے نفع بخش ثابت نہ ہو سکی — اور یہ یاد رکھو کہ استدلال کا درجہ حق تعالےٰ سے اعراض کرنے کا ہے اس لئے کہ استدلال نام ہی غیر میں سوچ و بچار کرنے کا ہے جب کہ معرفت کی حقیقت غیر اللہ سے اعراض کرنا ہے — عادت کے مطابق دوسرے تمام مطلوبات کا وجود استدلال سے ہوتا ہے لیکن حق تعالےٰ کی معرفت عادت کے برعکس ہے۔ پس جب اُس کی معرفت، عقل کے ہمیشہ حیرت میں رہنے کا نام ہے اور اُس کی عنایت بھی بندہ کے اپنے اختیار میں نہیں ہے تو بندہ کے کسب کا اُس کی معرفت میں کیا دخل ہو سکتا ہے۔ اور بندہ کے لئے اُس کے فضل کے سوا کوئی دلیل نہیں ہو سکتی — اور وہ حق تعالےٰ دلوں کو کھولنے والا اور ایک چھپا ہوا خزانہ ہے اس لئے کہ جو کچھ اُس کے علاوہ ہے وہ سب حادث ہے۔ اور ایک حادث کا اپنے جیسے حادث تک خود بخود پہنچ جانا تو جائز ہے لیکن یہ جائز نہیں کہ کوئی حادث اپنے پیدا کرنے والے تک خود بخود پہنچ جائے، ورنہ وہ پیدا کرنے والا اس حادث کے کسب کا نتیجہ ہو جائے گا اور جو کوئی کسی کے کسب کے تحت آ جائے کسب کرنے والے کا کسب اُس پر غالب اور اس کا کسب کیا ہوا مغلوب ہوتا ہے (اور یہ حق تعالےٰ کے بارے میں جائز نہیں) ——— پس کرامت یہ نہیں کہ عقل، کسی فعل کی دلیل سے فاعل کے وجود کو ثابت کرے بلکہ کرامت یہ ہے کہ وہ حق تعالےٰ کے نور سے اپنے وجود کی نفی کر دے، اس طرح اُس پہلے کو (جو فعل کی دلیل سے فاعل کا اثبات کرتا ہے) محض معرفت قولی حاصل ہو گی لیکن جو نور حق سے اپنا وجود نفی کر دے اس کو معرفت حالی یعنی اصل معرفت حاصل ہو جائے گی اور جو گروہ عقل کو معرفت کی علت سمجھتا ہے اُس سے دریافت کرو کہ "عقل دل میں حقیقی معرفت میں سے کسی چیز کو ثابت کرتی ہے؟ کیوں کہ عقل جس چیز کو ثابت کرتی ہے معرفت

الٰہی تو اُس کی نفی کا تقاضہ کرتی ہے، یعنی عقل کی دلالت سے جو کچھ دل میں صورت پیدا ہوتی ہے کہ خداوند تعالےٰ یہ ہے درحقیقت اس کی ذات کے خلاف ہے۔ اور اگر اس کے خلاف کوئی اور صورت دل میں پیدا ہو تو حق تعالےٰ اس صورت کے بھی خلاف ہے، پس اس مقام پر عقل کی کیا مجال ہے کہ وہ استدلال کے ذریعہ معرفت حاصل کر سکے اس لئے کہ عقل اور وہم دونوں کی جنس ایک ہی ہے اور جس جگہ جنس ثابت ہو جائے وہاں معرفت منفی ہو جاتی ہے پس عقل سے استدلال کے ذریعہ اثبات، تشبیہ ہو گی اور اس کی نفی تعطیل ہو گی۔ اور عقل کی مجال ان دو اصلوں کے علاوہ کچھ نہیں جب کہ یہ دونوں اصلیں فکر و معرفت میں ناکام ہیں، کیونکہ مشتبہ اور معطلہ میں سے کوئی بھی موحد نہیں ہو سکتا۔ پس جب عقل اپنی امکانی حد تک پہنچ کر بھی اپنے وہم کے علاوہ کچھ حاصل نہیں کر سکتی تو دوستانِ حق کے دلوں کو طلب عنایت کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ وہ عاجزی کی چوکھٹ پر بغیر کسی سبب کے آرام پذیر ہو گئے بلکہ اپنے آرام میں بھی بے آرام ہو گئے۔ اور اپنے دلوں کے لئے مرہم تلاش کر لیا اور اپنی راہ کو طلب عنایت کے اقسام اور اپنی قدرت کے درمیان پوشیدہ کر لیا تو حق تعالےٰ کی قدرت اس جگہ ان کی اپنی قدرت بن گئی۔ یعنی انہوں نے قدرتِ حق کے ذریعہ راہِ معرفتِ حق کو پالیا اور اس طرح وہ غیبت کی تکلیف سے آسودہ ہو گئے اور محبت کے باغیچہ میں جگہ پا کر اُس میں آرام پذیر ہو گئے اور راحت و سرور میں قرار حاصل کر لیا۔ یوں جب عقل نے دلوں کو منزلِ مراد تک پہنچا ہوا دیکھا تو اُس نے بھی اپنا تصرف شروع کیا لیکن وہ معرفت کے حصول سے عاجز رہی، جب عاجز رہی تو حیران ہو گئی اور جب حیران ہوئی تو معزول ہو گئی اور جب معزول ہو گئی تو اب حق تعالےٰ نے اُس کے اندر اطاعت کا لباس پہن لیا اور کہا "اے عقل! جب تک تو اپنی خودی میں رہی اپنے اسباب و تصرفات کی بنا پر حجاب میں رہی۔ اور جب تصرف کے آلات خالی ہو گئے تو باقی صرف تو رہ گئی۔ جب صرف تو باقی رہ گئی تو تجھے رسائی حاصل ہو گئی۔ پس دل کے حصے میں حق تعالےٰ کا قرب آیا اور عقل کے حصے میں خدمت و اطاعت! باقی رہی معرفت! وہ تو خود معرفت ہے! پس اللہ تعالےٰ نے بندے کو اپنی تعریف اور معرفت سے شناسا کیا تا کہ اُس کو اسی کے ذریعہ

پہچانیں۔ ایسی پہچان نہیں جو کسی سبب اور آلے کے واسطے سے ہو بلکہ ایسی پہچان جس میں خود بندے کا وجود عارضی ہوتا کہ عارف کو انانیت اور غرور ہر اعتبار سے ایک خیانت نظر آئے یہاں تک کہ اس کا ذکر اس طرح ہو کہ اس میں نسیان نہ ہو اور معاملہ ایسا ہو کہ اس میں کوتاہی نہ ہو۔ یعنی اس کی معرفت واقعی اور یقینی ہو صرف زبانی دعویٰ نہ ہو —— نیز ایک اور گروہ کا کہنا یہ ہے کہ "حق تعالےٰ کی معرفت ایک الہامی چیز ہے" لیکن یہ بھی محال ہے اس لئے کہ معرفت کے صحیح یا غلط ہونے کے لئے ایک دلیل ہے جب کہ اہل الہام کے لئے صحیح اور خطا پر کوئی دلیل نہیں۔ کیوں کہ جب ایک شخص دعویٰ کرے کہ مجھے الہام ہوا ہے کہ خدا تعالےٰ کے لئے مکان ہے اور دوسرا یہ دعویٰ کہ مجھے الہام ہوا ہے کہ اس کے لئے مکان نہیں لامحالہ ان دو متضاد دعوؤں میں حق تو ایک کی طرف ہی ہو گا۔ حالانکہ یہ دونوں اپنے اپنے الہام کی بنیاد پر دعویٰ کر رہے ہیں۔ چنانچہ ان دونوں مدعیوں کے درمیان صدق اور کذب کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک دلیل کی ضرورت ہو گی۔ اس صورت میں فیصلہ تو دلیل پر ہو گا۔ اور الہام کا حکم باطل ہو جائے گا — یہ برہمنوں اور الہامی لوگوں کا قول تھا۔ میں نے اس دور میں ایک قوم کو دیکھا ہے جو اس بارے میں بڑا غلو کرتی ہے اور اپنے طریق کار کی نسبت نیک و پارسا بزرگوں کی طرف کرتی ہے حالانکہ یہ سب لوگ گمراہی پر قائم ہیں اور اس کا قول اہلِ کفر اور اہلِ اسلام کے تمام عقلمندوں کے خلاف ہے اس لئے کہ الہام کے دس مدعی ایک ہی معاملے میں دس باہم متضاد اقوال کا دعویٰ کرتے ہیں تو وہ سب باطل ہوتے ہیں۔ اور اُن میں سے کوئی بھی حق پر نہیں ہوتا — اگر کوئی کہنے والا یہ کہے کہ جو کچھ شریعت کے خلاف ہو وہ تو الہام ہی نہیں ہوتا، تو میں کہتا ہوں کہ تم اپنے اصل میں خطا کار اور غلطی پر ہو کہ شریعت کو اپنے الہام پر قیاس کرتے اور کہتے ہو کہ الہام کا اثبات، شریعت کی وجہ سے ہے، پس معرفت ایک شرعی، ثبوتی اور ہدایتی شئے ہو گی۔ نہ کہ الہامی! اور معرفت کے معاملہ میں الہام کا فیصلہ ہر اعتبار سے باطل ہے — ایک اور گروہ کے لوگ کہتے ہیں کہ "معرفتِ حق سب کے لئے ضروری ہے" لیکن یہ بھی محال ہے اس لئے کہ ہر وہ چیز جس کا علم بندے کے لئے ضروری ہو اس میں تمام عقلمندوں کو مشترک ہونا چاہئے جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ عقلمندوں کا ایک گروہ

معرفت کا انکار کرتا اور تشبیہہ و تعطیل کو روا سمجھتا ہے تو یہ ثابت ہو گیا کہ معرفت ضروری امر نہیں نیز اگر حق تعالےٰ کی معرفت ضروری ہوتی تو اس کے ساتھ مکلف کرنا درست نہ ہوتا کیوں کہ ایسی معرفت کا مکلف قرار دینا جس کا علم ضروری ہو محال ہے، جیسا کہ بندے کے لئے خود اپنی معرفت اور آسمان و زمین، دن و رات اور درد و لذت وغیرہ کی معرفت کہ کوئی عقلمند اپنے آپ کو ان چیزوں کے وجود میں شک میں نہیں ڈال سکتا کہ ان چیزوں کے بارے میں بیقرار ہو جائے اور اگر ان کو پہچاننا نہ بھی چاہے تو ایسا نہیں کر سکتا کہ ان کو نہ پہچانے تاہم صوفیہ کا ایک گروہ جو اپنے یقین کی صحت میں نگاہ ڈالتے ہوئے کہتا ہے کہ ہم اس کو ضروری سمجھتے ہیں کیوں کہ ہم اپنے دل میں کوئی شک و شبہہ نہیں پاتے اور وہ یقین کو ضرورت کا نام دیتے ہیں تو وہ اس معنی میں تو سچے ہیں لیکن عبارت میں وہ خطا کار ہیں کیوں کہ ضروری علم میں صحیح کی تخصیص درست نہیں اس لئے کہ سب عقلمند لوگ یکساں ہوتے ہیں۔ نیز علم ضروری ایک ایسا علم ہوتا ہے جو دل میں کسی سبب اور دلیل کے بغیر پیدا ہو جائے۔ جب کہ خداوند تعالےٰ کے متعلق علم اور اس کی معرفت کے لئے سبب ہوتا ہے۔ البتہ حضرت استاد ابو علیؒ دقاق، شیخ بو سہلؒ صعلوکی اور بدر بن ابی سہلؒ جو کہ نیشاپور کے امام اور سردار ہیں۔ یہ سب حضرات اہلسنت و جماعت کے اس ایک قول پر متفق ہیں کہ معرفت کی ابتدا استدلال ہے جب کہ انتہا ضرورت! اور وہ کہتے ہیں کہ بہشت کے اندر خداوند تعالےٰ کے متعلق ضروری ہو گا تو جب وہاں اس کا ضروری ہونا روا ہے تو یہاں بھی ضروری ہونا روا ہو گا۔ نیز یہاں دنیا میں انبیا علیہم السلام اس حال میں کہ حق تعالیٰ کا کلام کسی واسطہ کے بغیر، یا کسی فرشتہ یا وحی کے ذریعہ سے سنتے ہیں تاکہ اس کو ضروری طور پر پہچان لیں۔ اور ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ جنتی لوگ جنت میں حق تعالےٰ کو ضروری طور پر پہچان لیں گے کیوں کہ جنت دار تکلیف نہیں اور پیغمبران خدا مامون العاقبت اور حق تعالےٰ کی جدائی سے حفاظت میں ہوتے ہیں اور جو کوئی حق تعالیٰ کو ضروری پہچان لیتا ہے اُس کو بھی گمراہی کا کوئی خوف یا جدائی کا اندیشہ نہیں رہتا۔ ایمان اور معرفت کو حق تعالےٰ کا فضل ہی سمجھنا چاہیئے کیوں کہ یہ ایک پوشیدہ حقیقت ہے، جب یہ ظاہر ہو جائے تو پھر ایمان ایک خبر بن جائیگا

اور اس کے وجود میں اختیار اُٹھ جائے گا۔ اور شریعت کے اصول مضطرب ہو جائیں گے اور ارتداد کا حکم باطل ہو جائے گا اس طرح بلعم باعورء ابلیس اور برصیصا پر کفر کا حکم لگانا درست نہیں رہے گا۔ کیوں کہ اس پر اتفاق ہے کہ یہ عارفِ حق تعالےٰ تھے جیسا کہ حق تعالےٰ نے ابلیس کے بارے میں ہمیں اطلاع دی ہے کہ اس نے کہا فبعزتک لاغوینھم اجمعین (مجھے آپ کی عزت کی قسم میں اولادِ آدم کو گمراہ کر کے رہوں گا) درحقیقت حق تعالےٰ سے بات کرنا اور جواب سننا معرفت کا تقاضہ کرتا ہے اور عارف جب تک عارف رہتا ہے حق تعالےٰ کی جدائی سے امن میں رہتا ہے۔ اور حق تعالےٰ سے کٹنا معرفت کے زوال سے ہی حاصل ہوتا ہے اور علم ضروری زوال پذیر نہیں ہوا کرتا۔ یہ مسئلہ لوگوں کے درمیان بڑا ہی مشکل اور بڑا آفت ہے لہٰذا اس میں اُلجھنے کی بجائے اتنا جان لینا شرط ہے کہ حق تعالےٰ کے بارے میں بندے کا علم اور معرفت حق تعالےٰ کے ازلی فضل اور اُس کی رہنمائی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔ تاہم یہ جائز ہے کہ حق تعالےٰ کی معرفت میں بندوں کا یقین کبھی زیادہ ہو اور کبھی کم! لیکن اصلِ معرفت میں کمی یا زیادتی نہیں ہوتی کیوں کہ اس کی زیادتی اور کمی دونوں ہی نقصان دہ ہیں۔ اور حق تعالیٰ کی پہچان میں کسی کی تقلید کرنے کی بجائے اس کو اُس کی صفاتِ کمالیہ کے ذریعہ پہچاننا چاہئے۔ اور یہ چیز حق تعالیٰ کی حسین حفاظت اور اُس کی عنایت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ تمام دلائل اور تمام عقلیں اُسی کی ملکیت ہیں اور اُسی کے تصرف میں ہیں وہ چاہے تو اپنے افعال میں سے کسی ایک فعل کو دلیل بنا کر اُس کے ذریعہ بندے کو اپنی طرف رہنمائی کر دے تاکہ وہ اُس فعل کے ذریعہ اُس تک پہنچنے سے محروم رہے۔ جس طرح کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام ایک قوم کے لئے تو معرفتِ حق کی دلیل بن گئے لیکن دوسری قوم کے لئے معرفت سے حجاب کا سبب بن گئے یہاں تک کہ ایک گروہ نے تو آپ کو حق تعالےٰ کا بندہ کہا لیکن دوسرے گروہ نے کہا کہ آپ حق تعالےٰ کے بیٹے ہیں، اسی طرح بُت، سورج اور چاند ایک گروہ کے لئے حق کی دلیل بن گئے لیکن دوسرے گروہ کے لئے حق سے محروم رہنے کا ذریعہ بن گئے۔ لہٰذا اگر دلائل، معرفتِ حق کی علت ہوتے تو ہونا یہ چاہئے تھا کہ ہر استدلال کرنے والا عارف ہوتا۔ اور یہ کھلا مکابرہ ہے ———— پس اللہ تعالےٰ

کسی ایک کو اپنی معرفت کے لئے چُن لیتے ہیں۔ اور پھر تمام چیزوں کو اس کے لئے دلیل و رہبر بنا دیتے ہیں تاکہ اُن کے ذریعہ سے وہ حق تعالےٰ تک رسائی حاصل کرے اور حق تعالےٰ کو جان لے۔ پس دلیل اُس کے لئے سبب ہوتی ہے علت نہیں ہوتی اور کوئی سبب، کسی دوسرے سبب سے زیادہ اولیٰ نہیں ہوتا کہ وہ مسبب کے حق میں دوسرے سبب سے زیادہ مفید ہو۔ مجھے اپنی زندگی کی قسم ہے کہ معرفت میں عارف کے لئے سبب کا ثابت کرنا زنار ہونا ہے اور غیر حق کی طرف التفات کرنا شرک ہے "اور جس کو اللہ تعالےٰ گمراہ کردیں اُس کے لئے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ جب لوحِ محفوظ میں بلکہ حق تعالےٰ کے علم و ارادہ میں کسی کے حصے میں شقاوت ہو تو دلیل، استدلال اُس کے لئے کس طرح ہادی بن سکتے ہیں، کیوں کہ جو شخص قہر خداوندی میں مستغرق اور سرگرداں ہے حق تعالےٰ کے علاوہ کون ہے جو اس کا گریبان پکڑ کر اُسے وہاں سے نکال لے:۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب غار سے باہر تشریف لائے تو دن کا وقت تھا لیکن آپ نے کچھ بھی نہ دیکھا حالانکہ دن کے وقت میں دلائل زیادہ اور عجائب قدرت واضح ہوتے ہیں لیکن جب رات ہوئی تو آپ نے" رائ کوکبا" (ستارہ دیکھا) اگر دلیل، آپ کے لئے معرفتِ حق کی علت ہوتی تو یہ دن کو حاصل ہوتی کیوں کہ دن کے وقت دلائل زیادہ واضح اور عجائب قدرت زیادہ روشن ہوتے ہیں۔ پس حق تعالےٰ جب چاہتے ہیں اور جس ذریعہ سے چاہتے ہیں بندے کو اپنی طرف راہ دکھا دیتے ہیں اور اپنی معرفت کا دروازہ اُس کے لئے یہاں تک کھول دیتے ہیں کہ وہ عین معرفت میں اس درجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ عین معرفت بھی اس کو غیر نظر آتی ہے اور معرفتِ حق اس کی اپنی صفت بن جاتی ہے اور معرفتِ حق کے ذریعہ تمام چیزوں سے حجاب میں ہو کر اس مقام تک پہنچ جاتا ہے کہ اُس کی معرفت اس کا دعویٰ ہو جاتی ہے ۔۔۔ حضرت ذوالنون مصریؒ کہتے ہیں کہ "ایاکَ اَنْ لاَ تکون بالمعرفۃِ مدعیًا" (اپنے آپ کو بچا کہیں تو معرفت کے مدعیوں میں سے نہ ہو جائے"۔) شعر

یدعی العارفون معرفتہ ، اُقتوا بالجہلِ ذالک معرفتی

عارف لوگ تو اُس کی معرفت کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن میری معرفت یہی ہے
کہ میں اپنی جہالت کا اقرار کرتا ہوں۔
غرضیکہ تیرے لئے ضروری ہے کہ تو معرفت کا دعویٰ نہ کرے کیوں کہ اس میں
ہلاکت ہے ہاں اس کے معنی سے تعلق پیدا کرنا کہ تجھے نجات حاصل ہو۔ پس جو کوئی
حق تعالےٰ کے کشف اور جلال سے مشرف ہو جائے یہ اُس کے لئے "آزمائش" بن
جاتی ہے اور اُس کی تمام صفات امتحان گاہ بن جاتی ہیں۔ اور جو آدمی حق تعالےٰ کا
ہو رہے اور حق تعالےٰ اس کے ہو جائیں پھر کوئی چیز ایسی نہیں رہتی کہ جس کی طرف
اس کی نسبت درست ہو۔ اور معرفت کی حقیقت، خدا تعالےٰ کی ملکیت کو جاننا ہے
جب کوئی آدمی تمام جہان میں اُسی کا تصرف جان لے اُس کو مخلوق کے ساتھ کیا
تعلق رہ جاتا ہے کہ اپنے یا مخلوق کی وجہ سے وہ حجاب میں رہے کیوں کہ حجاب تو جہالت
میں سے ہے جب جہالت فانی ہو جائے تو حجاب لاشی ہو جاتا ہے اور دنیا بھی اُس کے
لئے بمنزلہ آخرت کے ہو جاتی ہے۔

فصل

مشائخ کے رموز

معرفتِ الٰہی کے متعلق مشائخ رحمہم اللہ کے رموز بہت زیادہ ہیں میں انشاء اللہ ان
میں سے بعض اقوال، حصولِ فائدہ کی غرض سے بیان کرتا ہوں ـــــ حضرت عبداللہ
بن مبارک رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ المعرفۃ اَن لَا تتعجّبُ من شیءٍ " (معرفت یہ ہے
کہ کسی چیز سے تو تعجب میں مبتلا نہ ہو) اس لئے کہ تعجب اُس فعل سے ہونا چاہیئے جو کوئی
اپنی طاقت سے اُس میں اضافہ کرلے۔ لیکن جب حق تعالےٰ ہی ہر کمال پر قادر ہیں
تو عارف کے لئے اُس کے افعال پر تعجب کرنا محال ہوتا ہے اور اگر تعجب کی صورت پیدا
بھی ہو تو وہاں ہونی چاہیئے کہ حق تعالےٰ نے ایک مٹھی خاک کو اس مقام پر پہنچا دیا کہ
وہ اُس کی فرمانبردار بن گئی اور خون کے دو قطروں کو اس درجہ تک پہنچا دیا کہ وہ اُس

کی دوستی اور معرفت کی بات کرتا اور اُس کے دیدار کی خواہش اور اُس کے قرب کا ارادہ کرتا ہے ـــــ اور حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ "معرفت کی حقیقت یہ ہے کہ حق تعالےٰ لطیف انوار کے ساتھ دلوں پر اپنا جلوہ طلوع فرمائیں"۔ یعنی حق تعالےٰ جب تک بندے کے دل کو اپنے نور سے آراستہ نہ کردیں اس وقت تک اس کا دل تمام برائیوں سے رہائی نہیں پا سکتا۔ چنانچہ جب بندہ کے دل میں دنیا کی موجودات اور مخلوقات کا وزن ایک رائی کے دانے کے برابر بھی موجود ہو تو ظاہری اور باطنی اسرار کا مشاہدہ اُس پر غلبہ نہیں کرتا اور جب تمام موجودات کا اُس کے دل پر کوئی وزن نہ رہے تو اس کا دیکھنا مشاہدہ کی صورت اختیار کرلیتا ہے ـــــ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ "المعرفۃ دوام الحیرۃ" (معرفت ہمیشہ کی حیرانی ہے) اور حیرانی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک وجود کے اندر اور دوسری اُس کی کیفیت کے اندر ـــ حق تعالےٰ کے وجود میں حیرانگی کفر و شرک ہے لیکن اس کی کیفیت میں حیرانی معرفت ہے، اس لئے کہ عارف کو اُس کے وجود میں کبھی شک نہیں ہوتا اور اس کی کیفیت کو سمجھنے میں عقل کی کوئی مجال نہیں۔ لہٰذا اب یہی چیز باقی رہ گئی کہ حق تعالےٰ کے وجود کے بارے میں یقین ہو اور اُس کی کیفیت کے بارے میں حیرانی ہو۔ اسی طرح کی وہ بات ہے جو ایک عارف نے کہی ہے کہ "یا دلیل المتحیرین زدنی تحیراً" (اے متحیروں کے رہنما! میری حیرانی میں اضافہ کر!) پہلے تو اُس کے وجود کی معرفت اور اوصاف کے کمال کو ثابت کیا اور یہ جان لیا کہ حق تعالےٰ ہی کائنات کا مقصود اور لوگوں کی دعاؤں کو قبول کرنے والا ہے اور متحیروں کو اُس کے کیفیت کے سوا کسی چیز میں تحیر نہیں اور پھر حیرت کی زیادتی کی دعا مانگی اور یہ جان لیا کہ اس مطلوب کو حاصل کرنے میں عقل کو حیرت و سرگردانی کے سوا کسی چیز کی شرکت اور وقعت حاصل نہیں ہے۔ اور یہ بات بڑی لطیف ہے ـــــ نیز یہ احتمال بھی موجود ہے کہ حق تعالےٰ کے وجود کی معرفت خود اپنی ذات کے بارے میں حیرانی کا تقاضہ کرے کیوں کہ بندہ جب حق تعالےٰ کو پہچان لیتا ہے تو اپنے پورے وجود کو اُس کے اقتدار کے جال میں

دیکھتا ہے، جب بندہ کا وجود بھی اُس کے سبب سے ہے اور عدم بھی اُسی کے حکم سے ہے اور بندہ کا حرکت کرنا اور ساکن ہونا بھی اُسی کی قدرت سے ہے تو بندہ متحیر ہو جاتا ہے کہ جب میرے پورے وجود و نظام کا قیام اس کے ساتھ ہے تو میں خود کیا ہوں اور میری حقیقت کیا ہے؟ — اسی معنی میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ" (جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا) یعنی جو کوئی اپنے آپ کو فنا کے ساتھ پہچان لیتا ہے وہ اپنے رب کو بقا کے ساتھ پہچان لیتا ہے۔" اور فنا سے عقل اور صفت باطل ہو جاتی ہے اور جب کسی چیز کی ذات عقل میں نہ آتی ہو تو اس کی معرفت حیرانی کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔ — اور حضرت بایزید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "اَنْ تَعْرِفَ اَنَّ حَرَکَاتِ الْخَلْقِ وَ سَکَنَاتِهِمْ بِاللّٰہِ" (معرفت یہ ہے کہ تو جان لے کہ مخلوق کی حرکات اور ان کا سکون سب حق تعالےٰ کی وجہ سے ہے، اور اُس کی اجازت کے بغیر کسی کو اس کی ملک میں تصرف کرنے کا اختیار نہیں، کوئی ذات اُسی کی وجہ سے ذات ہے اور اثر اُسی کی بدولت اثر، صفت اسی کی وجہ سے صفت، متحرک اسی کے حکم سے متحرک اور ساکن اسی کی مرضی سے ساکن ہے کہ اگر اللہ تعالےٰ کسی جسم میں طاقت پیدا نہ کریں اور اُس کے دل میں ارادہ نہ رکھیں تو بندہ کوئی فعل بھی نہیں کر سکتا۔ اور بندے کا فعل پھر بھی مجازی ہے اور فعل حقیقی خدا تعالےٰ کے لئے ہی ہے۔

اور حضرت محمد بن واسع عارف کی صفت میں کہتے ہیں کہ "مَنْ عَرَفَ اللّٰہَ قَلَّ کَلَامُهٗ وَدَامَ تَحَیُّرُهٗ۔" (جس نے حق تعالےٰ کو پہچان لیا اُس کی کلام کم اور حیرت دائمی ہو گئی) اس لئے کہ کلام تو اُس کے بارے میں کی جاتی ہے جو عبارت کے تحت بیان کیا جا سکتا ہو اور اصولاً عبارت کے لئے ایک حد بھی ہوتی ہے چنانچہ جب معبر اعبارت سے مقصود) محدود نہ ہو کہ اُس پر عبادت کی بنیاد رکھی جائے اور عبارت کے لئے ایک متعین حد ہو تو اس غیر محدود معبر کو عبارت کے ذریعہ کیسے بیان کیا جا سکتا ہے؟ اور جب مقصود عبارت سے واضح نہ کیا جا سکے اور بندے کو اس میں کوئی چارہ نہ ہو تو دائمی حیرت کے سوا کیا کیا جا سکتا ہے —— حضرت شبلی رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ "العجز عن المعرفۃ"

معرفت کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اُس کی معرفت سے عاجز رہے) جس چیز کے بارے میں بندہ اپنی عاجزی کے علاوہ کچھ نہ کر سکے اُس کے ادراک کے متعلق زیادہ دعویٰ نہیں کرنا چاہئے اس لئے کہ عاجزی اُس کے لئے جستجو ہوتی ہے اور طالب جب تک اپنے اوصاف اور اسباب کے اندر قائم رہتا ہے اس پر عجز کا اطلاق درست نہیں ہوتا اور جب ان اسباب و اوصاف سے گزر جاتا ہے اُس پر فنا طاری ہو جاتی ہے نہ کہ عاجزی! ـــــ اور مدعیوں کا ایک گروہ" باوجودیکہ ان کی آدمیت کی صفات ثابت ہیں، احکام شریعت کی تکلیف کا خطاب ان پر درست ہے اور حق تعالےٰ کی صحبت بھی ان پر قائم ہے" کہتا ہے کہ معرفت، عجز کا نام ہے اور ہم عاجز ہیں اور تمام چیزوں سے باز آچکے ہیں ــ لیکن یہ بھی گمراہی اور نقصان ہے کیوں کہ میں کہتا ہوں کہ تم کس چیز کی طلب سے عاجز آچکے ہو؟ جب کہ عجز کی دو علامتیں ہیں اور اُن میں سے کوئی علامت بھی تمہارے اندر نہیں پائی جاتی۔ ایک علامت طلب کے اسباب کا فنا ہو جانا اور دوسری علامت تجلیِ الٰہی کا ظہور ہے۔ جس جگہ اسباب کا فنا ہو وہاں عبارت لاشئی، ہو جاتی ہے اور اگر اپنے عجز کو عبارت میں بیان کریں تو بھی عجز کا لفظ عجز کے بغیر عبارت میں بیان نہیں کیا جا سکتا ــ اور جہاں تجلّی ربانی کا ظہور ہو وہاں علامتیں ختم ہو جاتی ہیں اور تمیز کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی حتیٰ کہ عاجز وہاں یہ بھی نہیں جان سکتا کہ وہ عاجز ہے یا جس چیز کو اس کے ساتھ منسوب کیا جا رہا ہے اس کو عجز کہتے ہیں ــ اس لئے کہ عجز، حق تعالےٰ کا غیر ہے اور غیر کی معرفت کا اثبات معرفتِ حق نہیں ہوتا ــ اور جب تک دل میں غیر حق کے لئے بھی گنجائش ہے یا عارف کے لئے غیر حق کو بیان کرنے کی قوت ہے۔ معرفت درست نہیں ہو سکتی اور جب تک عارف غیر حق سے کنارہ کش نہیں ہو جاتا اُس وقت وہ عارف نہیں ہو سکتا ـــــ اور حضرت ابو حفص حداد رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ "مذ عرفت اللّٰہ ما دخل فی قلبی حق ولا باطل۔" (میں نے جب سے اللہ تعالےٰ کو پہچانا ہے میرے دل میں نہ حق کا خیال گزرا ہے نہ باطل کا) اس لئے کہ جب لوگوں کو کوئی کام یا خواہش درپیش ہوتی ہے تو وہ دل کی طرف رجوع کرتے ہیں اور دل اُس کو نفس کے حوالہ کر دیتا ہے جو کہ باطل کا محل ہے، اور اگر ان کا عزم پختہ ہو تو وہ

دِل کی طرف لوٹ آتے ہیں اور دل اُن کو روح کی طرف رہنمائی کر دیتا ہے جو حق اور حقیقت کا سرچشمہ ہے۔ اور جب دل میں غیرِ حق کا تصور موجود ہو تو عارف کے لئے اُس کی طرف رجوع کرنا معیوب محسوس ہوتا ہے۔ پس دوسرے تمام لوگ تو معرفت کی دلیل بھی دل سے طلب کرتے ہیں اور کام و خواہشات کی طلب بھی دل سے ہی کرتے ہیں لیکن جن اہل اللہ کی کوئی ذاتی خواہش ہی نہیں ہوتی وہ دل کی طرف رجوع نہیں کیا کرتے۔ انہیں حق تعالےٰ کے سوا آرام ہی نہیں ملتا کہ وہ حق کو دل سے طلب کریں۔ جب انہیں کسی بُرہان کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ حق تعالےٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں نہ کہ دل کی طرف پس جس بندے کا رجوع دل کی طرف ہو اور جس بندے کا رجوع حق تعالےٰ کی طرف ہو ان دونوں میں بڑا واضح فرق ہے —— اور حضرت ابوبکر واسطیؒ کہتے ہیں کہ "جس آدمی نے حق تعالےٰ کو پہچان لیا وہ ہر چیز سے منقطع ہو گیا بلکہ وہ گونگا اور تمام چیزوں سے کنارہ کش ہو گیا" ——

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "لَا اُحصِی ثَنَاءً عَلَیکَ" (تیری حمد و ثناء کرنا میرے بس کی بات نہیں)، یعنی جو آدمی خدا کو پہچان لیتا ہے وہ تمام چیزوں سے کنارہ کش ہو جاتا ہے بلکہ تمام عبارتوں سے گنگ اور تمام اوصاف سے خود فنا ہو جاتا ہے، جیسا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کہ جب تک آپ مقامِ غیبت میں تھے تمام عرب میں زیادہ فصیح تھے کہ آپ نے خود فرمایا ہے "انا افصح العرب والعجم" (میں عرب و عجم میں سب سے زیادہ فصاحت والا ہوں) لیکن جب آپؐ کو غیبت سے حضورِ حق میں لے جایا گیا تو آپؐ کہہ اُٹھے کہ میری زبان کے لئے تیری حمد و ثناء کے کمال کا احاطہ کرنا ممکن نہیں، میں کیا کہوں کہ اپنے قال سے بے قال اور اپنے حال سے بے حال ہو گیا ہوں، تو وہی ہے جو خود ہے، میری گفتار تو یا مجھ سے ہو گی یا تجھ سے، اگر اپنی ذات کی وجہ سے کچھ کہوں تو اپنی گفتار کی بدولت محجوب ہو جاؤں گا اور اگر تیری ذات کی وجہ سے کہوں تو اپنے کسب کی بدولت تیرے قرب کی تحقیق میں معیوب ہوں گا۔ اس لئے میں کچھ بھی نہیں کہتا۔" تو حق تعالےٰ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ اے محمدؐ! اگر تم کچھ نہیں کہتے تو پھر ہم کہتے ہیں کہ " لَعَمرُکَ اِذَا سَکَتَّ عَن ثَنَائِی فَاَنکَ مِنکَ

ثنائی"۔ (مجھے تیری زندگی کی قسم! جب تم اپنے آپ کو میری حمد و ثنا کرنے والوں میں سے نہ جانو گے تو میں جہان کے تمام اجزاء کو تیرا نائب کر دیتا ہوں تاکہ وہ سب میری ثناء کریں اور پھر تیرے حوالہ کر دیں تو یوں تمام کائنات کی ثناء، دراصل آپ کی طرف سے ہی میری ہی ثنا ہو گی ——

دوسرا کشفِ حجاب

توحید کا بیان

خداوند تعالےٰ فرماتے ہیں کہ "وَاِلٰـھُکُمْ اِلٰـہٌ وَّاحِدٌ" (اور تمہارا معبود ایک ہی ہے)، اور نیز فرمایا کہ "قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ" (تم کہہ دو کہ وہ اللہ اکیلا ہے) نیز حق تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ "لَا تَتَّخِذُوْا اِلٰـھَیْنِ اثْنَیْنِ اِنَّمَا ھُوَ اِلٰـہٌ وَّاحِدٌ" (تم دو معبود نہ بناؤ بیشک وہ معبود برحق اکیلا ہی ہے) —— اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے کہ "تم سے پہلے ایک شخص گزرا ہے جس نے عقیدۂ توحید کو درست کرنے کے علاوہ کوئی نیک عمل نہیں کیا تھا، جب اُس کی موت کا وقت قریب آیا تو اُس نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ جب میں مر جاؤں تو مجھے جلا دینا اور میری راکھ کو باریک کر لینا۔ اور پھر جس دن تیز ہوا چلے میری نصف راکھ کو دریا میں اور نصف کو بیابان میں اُڑا دینا"۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اللہ تعالےٰ نے ہوا اور پانی کو حکم دیا کہ جو کچھ تمہارے اندر پھیلایا گیا ہے اس کی حفاظت کرنا اور اسے جمع کر رکھنا۔ ہوا اور پانی قیامت تک اُسے سنبھالے رکھیں گے۔ پھر حق تعالےٰ اُس کو قیامت کے دن پیدا کریں گے اور کہیں گے کہ تجھے کس خیال نے اپنے آپ کو اس طرح جلوانے پر آمادہ کیا تھا۔ وہ عرض کرے گا بارِ خدایا! میں بڑا سخت گنہگار تھا اور مجھے تیری بارگاہ سے شرم آتی تھی —— حق تعالےٰ "صرف توحید کے عقیدے کی بناء پر اُس کی بخشش فرما دیں گے"۔

توحید کی حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کے اکیلا ہونے کا حکم لگایا جائے اور اُس کے اکیلا ہونے

کا صحیح علم حاصل ہو۔ چونکہ اللہ تعالےٰ اکیلا ہے کہ اُس کی ذات وصفات میں اُس کا کوئی ثانی نہیں، اور اُس کے افعال میں کوئی اُس کے برابر اور شریک نہیں" اور موحدوں نے اُس کو اسی طرح جانا ہے لہٰذا موحدوں کے اُس کو اس طرح اکیلا جاننے کو توحید کہتے ہیں —— اور توحید کی تین قسمیں ہیں —— اول حق تعالےٰ کی توحید حق تعالےٰ کے لئے۔ اور یہ حق تعالےٰ کا اپنی یکتائی کے بارے میں علم ہے —— دوم، حق تعالےٰ کی توحید مخلوق کے لئے، یہ حق تعالےٰ کا اپنے بندوں کو توحید کا حکم اور بندوں کے دل میں توحید کا جذبہ پیدا کرنا ہے —— سوم، مخلوق کا، حق تعالےٰ کی توحید کو ماننا اور یہ خداوند تعالےٰ کی توحید کے بارے میں اِن کا علم ہے —— پس بندہ جب حق تعالےٰ کا عارف ہو جاتا ہے تو اُس کی وحدانیت پر اس طرح کا عقیدہ رکھتا ہے کہ "حق تعالےٰ اکیلا ہے جو وصل اور فصل کو قبول نہیں کرتا (یعنی نہ کوئی اس کے ساتھ متصل و پیوست ہو سکتا ہے۔ اور نہ اُس سے کوئی ٹکڑا جدا ہو سکتا ہے) اُس کی ذات میں دوئی جائز نہیں۔ اُس کی یکتائی عددی نہیں کہ دوسرے عدد کے اثبات سے وہ "دو" ہو جائیں اور اُس کی وحدانیت عددی ہو جائے یعنی وہ ان دو کا عدد واحد ہو —— اور وہ محدود نہیں کہ اُس کے لئے جہات کا تعین کیا جا سکے —— اس کے لئے مکان نہیں اور نہ وہ مکان کے اندر ہے کہ مکان کے اثبات کی ضرورت ہو۔ کیوں کہ اگر وہ مکان کے اندر متمکن ہوتا تو مکان کے لئے بھی تو ایک مکان ہوتا اس صورت میں فعل و فاعل اور قدیم و حادث کا حکم باطل ہو جاتا —— وہ عرض بھی نہیں کہ کسی جوہر کا محتاج ہو اور اس میں حال ہو کر اپنے محل میں باقی نہ رہے۔ وہ جوہر بھی نہیں کہ اس کا وجود اپنے جیسے جواہر کے بغیر درست نہ ہو۔ وہ طبعی نہیں کہ حرکت وسکون کا مبدا قرار پائے۔ وہ روحی بھی نہیں کہ نیستی (فنا) کا محتاج ہو۔ وہ جسمی بھی نہیں کہ اُس کے ساتھ اجزا ملے ہوئے ہوں۔ وہ چیزوں میں قوت اور حال بھی نہیں کہ ان چیزوں کی جنس سے ہو —— وہ کسی چیز کے ساتھ پیوند نہیں کہ اُس چیز کو اُس کا جزء کہا جا سکے —— وہ تمام نقائص سے بری اور تمام عیوب سے پاک بلکہ تمام عیوب سے بہت بلند ہے۔ کوئی اُس کا مثل نہیں کہ وہ اپنی مثل کے ساتھ مل کر "دو" وجود ہو جائیں —— اس کا کوئی

فرزند نہیں کہ اُس کی نسل اپنے اصل کا تقاضہ کرے۔ اُس کی ذات وصفات پر تغیر روا نہیں کہ کسی چیز سے اُس کا وجود متغیر ہو جائے اور متغیر کے حکم میں تغیر کی طرح ہو جائے۔ وہ اُن تمام صفاتِ کمالیہ سے موصوف ہے جو مومن اور موحد پوری بصیرت کے ساتھ اُس کے لئے ثابت کرتے ہیں کہ اُس نے خود اپنے آپ کو ان صفات سے موصوف کیا ہے۔ وہ اُن صفات سے بری ہے جو ملحد و بے دین لوگ اپنی خواہشات کے ساتھ اُس کے لئے بیان کرتے ہیں کیوں کہ اُس نے اپنے آپ کو اُن کے ساتھ موصوف نہیں کیا ہے۔۔۔ وہ ہمیشہ سے زندہ اور سب کچھ جاننے والا ہے۔۔۔ وہ بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے وہ ارادہ کرنے والا اور ہر شے پر قادر ہے۔ وہ سب کچھ سننے والا اور ہر چیز کو دیکھنے والا ہے وہ کلام کرنے والا اور ہمیشہ کے لئے باقی رہنے والا ہے ۔۔۔ اُس کا علم اس کے اندر حال نہیں اور اس کی قدرت اُس کے اندر منجمد نہیں ۔ اس کا دیکھنا اور سُننا اس کے اندر متجدد (ہر بار نیا پیدا ہونا) نہیں اور اس کا کلام اُس میں ایسا نہیں کہ اُس کے اجزاء ہو سکیں اور وہ نو پیدا شدہ ہو۔۔۔ وہ ہمیشہ سے اپنی صفات کے ساتھ قدیم ہے۔ کائنات کی معلومات اُس کے علم سے باہر نہیں ۔ اور موجودات کے لئے اس کے ارادے کے بغیر چارہ نہیں ۔۔۔ وہ وہ کرتا ہے جو چاہتا ہے اور وہ جو چاہتا ہے اُسے جانتا ہے ۔۔ مخلوق کا اُس پر کوئی زور نہیں۔ اُس کے احکام سب حق ہیں کہ اُس کے دوستوں کو سوائے تسلیم چارہ نہیں، اُس کا فیصلہ اٹل ہے کہ اُس کے دوستوں کو اُس پر عمل کئے بغیر مجال نہیں ۔۔۔ خیر اور شر کا مقدر کرنے والا اُس کے سوا کوئی نہیں۔ اُس کے علاوہ کوئی امید اور خوف کے لائق نہیں ۔۔۔ نفع کا پیدا کرنے اور نقصان کا فیصلہ کرنے والا اُس کے سوا کوئی نہیں ۔۔۔ اُس کا ہر حکم حکمت پر مبنی ہے اور اس کا پورا ہونا ضروری ہے۔ کسی کو بھی اُس کے اصل کی خوشبو نہیں ملی اور اُس تک رسائی کی کوئی سبیل نہیں اُس کا دیدار بہشتیوں کے لئے جائز ہے۔ اُس کے لئے نہ کوئی تشبیہ ہے نہ جہت ۔ تقابل اور مواجہہ اُس کی ذات پر متصور نہیں۔ اور دنیا میں اُس کے دوستوں کے لئے اُس کا مشاہدہ جائز ہے ۔ اور اس کا انکار شرط نہیں ۔۔۔ جو شخص اُس کو اس طرح جانتا ہے وہ ملحد اور بے دین لوگوں میں سے نہیں اور جو اُس کو اِسکے

خلاف جانتا ہے اُس کا کوئی دین اور ایمان نہیں ——— اُس معاملے میں اصولی اور فصولی طور پر کلام بہت ہے لیکن میں نے طوالت کے خوف سے اسی پر اختصار کیا ہے۔

میں نے جو کہ علی بن عثمان ہجویریؒ ہوں اس فصل کے آغاز میں کہہ دیا تھا کہ توحید کسی چیز پر وحدانیت کا حکم لگانے کو کہتے ہیں اور یہ حکم۔ علم کے بغیر نہیں لگایا جا سکتا۔ پس اہل سنت بھی حق تعالےٰ کی یکتائی کا حکم کرتے ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے لطیف کاریگری اور عجیب افعال کو دیکھا ہے اور اُن بے شمار لطائف و عجائب میں غور کیا ہے اور اُن کا خود بخود موجود ہونا محال جانا ہے۔ اور انہوں نے ہر چیز میں حادث ہونے کی علامات پائی ہیں۔ لامحالہ اُن کے لئے کوئی فاعل ہونا چاہیئے جو اُن کو عدم سے وجود میں لے آئے۔ یعنی جہان کو زمین و آسمان۔ آفتاب و ماہتاب، خشکی و تری اور پہاڑ و صحرا کے ساتھ اور ان صورتوں اور شکلوں کو حرکت و سکون علم و گویائی اور موت و حیات کے ساتھ پیدا کرے۔ پس اُن تمام چیزوں کا صانع کے بغیر چارہ نہیں۔ اور پھر یہ چیزیں دو یا تین کاریگروں سے بھی مستغنی ہوں اور ایک ہی کامل۔ حیی۔ قائم قادر۔ مختار اور دوسرے شرکا کی شرکت سے بے نیاز صانع ان کو پیدا کرنے والا ہو ——— اور جب کسی ایک فعل کے لئے ایک فاعل کے بغیر چارہ کوئی نہیں کیوں کہ اگر ایک ہی فعل کے لئے دو فاعل ہوں تو ان میں سے ہر ایک کے لئے دوسرے کا محتاج ہونا ضروری ہے۔ تو لامحالہ بغیر کسی شک و ریب کے یقینی علم کے ساتھ یہی ہونا چاہیئے کہ فاعل ایک ہی ہو ——— اس معاملے میں مثنویوں (دو خدا ماننے والوں) نے نور اور ظلمت کو ثابت کرے۔ آتش پرستوں نے یزدان و اہرمن (خالق خیر اور خلق شر) کو ثابت کر کے۔ طبیعی فلاسفہ نے طبیعت اور قوت کو ثابت کر کے فلکیوں نے سات ستاروں کو ثابت کر کے اور معتزلہ نے بہت سے خالق اور صانع ثابت کر کے ہمارے ساتھ اختلاف کیا ہے۔ میں نے ایک چھوٹی سی دلیل کے ذریعہ ان سب کو رد کر دیا ہے یہ کتاب ان کے باطل دعوؤں کی تردید کی گنجائش اپنے اندر نہیں پاتی۔ البتہ اس علم کے طالب کو یہ مسئلہ میری دوسری تصنیف میں تلاش کرنا چاہیئے جو میں نے اسی موضوع پر لکھی ہے اور اس کا نام "الرعایۃ بحقوق اللّٰہ" رکھا ہے یا پھر متقدمین اہل اصول رحمہم اللّٰہ کی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ اب میں انشاء اللّٰہ توحید کے بارے میں مشائخ کے بیان کردہ رموز کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ ——— "والامر بیدہٖ"

فصل

حضرت جنید رحمۃ اللہ کے بارے میں روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا "التوحید اِفراد القدم عن الحدث"۔ (قدیم کو حادث سے جدا کرنے کا نام توحید ہے) یعنی یہ کہ تو قدیم کو حوادث کا اور حوادث کو قدیم کا محل نہ جانے اور یہ بھی جان لے کہ حق تعالیٰ قدیم ہے اور تو حادث! اور تیری جنس سے کوئی چیز اُس کے ساتھ پیوست نہیں ہو سکتی اور اُس کی صفات سے کوئی چیز تیرے اندر مل نہیں سکتی کیوں کہ قدیم کے لئے حادث کے ساتھ کوئی مجانست نہیں ہوتی اس لئے کہ قدیم تو حادث چیزوں کے وجود سے پہلے موجود ہوتا ہے۔ جب حوادث کے وجود سے پہلے بھی قدیم تھا اور ان حوادث کا محتاج نہ تھا تو اِن حوادث کے پیدا ہونے کے بعد بھی وہ ان کا محتاج نہ ہوگا۔ یہ اُن لوگوں کا اختلاف ہے جو روح کو قدیم کہتے ہیں اور ان کا تذکرہ گزر چکا ہے۔ جب کوئی شخص قدیم کو حادث میں اُترنے یا حلول کرنے والا کہے یا حادث کو قدیم کے ساتھ متعلق مانے تو پھر حق تعالیٰ کے قدیم ہونے اور دنیا کے حادث ہونے کی کوئی دلیل باقی نہیں رہے گی۔ اور یہ مذہب دہریوں کا ہے۔ ہم اس طرح کے بُرے عقائد سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ حادث چیزوں کی تمام حرکات حق تعالیٰ کی توحید کے دلائل ہیں اور خداوند عزوجل کی قدرت پر گواہ اور اُس کے قدیم ہونے کا ثبوت ہیں۔ لیکن انسان اس سے بڑا غافل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ماسویٰ کو چاہتا ہے اور حق تعالیٰ کی یاد کے بغیر آرام کا متلاشی ہے حالانکہ جب تیرے نیست اور ہست کرنے میں اُس کا کوئی شریک نہیں تو یہ بھی محال ہے کہ تیری تربیت میں اُس کا کوئی شریک ہو سکے ——— حضرت حسین بن منصورؒ کہتے ہیں کہ "اوّل قدم فی التوحید فناء التفرید" (توحید میں پہلا قدم تفرید کا فنا ہے) اس لئے کہ تفرید کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو عیوب و آفات سے جدا کرنے کا حکم لگایا جائے۔ اور توحید کسی چیز پر وحدانیت کا حکم لگانے کو کہتے ہیں۔ پس تفرید میں غیر کا ثابت کرنا بھی لازم آتا ہے کہ اس کے بغیر ان صفات کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اور وحدانیت کے ساتھ غیر کا اثبات درست نہیں اور حق تعالیٰ کے علاوہ کسی کو بھی اس صفت کے ساتھ نہ موصوف کیا جا سکتا ہے نہ جانا جا سکتا ہے۔ پس تفرید ایک مشترک لفظ ہے جو ممکن اور واجب دونوں پر بولا جا سکتا ہے جب کہ

توحید شرکت کی نفی کرنے والا لفظ ہے۔ پس توحید کا پہلا قدم ہی شریک کی نفی کرنا اور راستے سے اپنے مزاج کو دفع کرنا ہے کیوں کہ راستے میں مزاج کا عمل دخل ایسے ہی ہے جیسے چراغ کے ذریعہ راستے کو تلاش کرنا ہوتا ہے ——— حضرت حضری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ "اُصولنا فی التوحید خمسۃ اشیاء رفع الحدث واثبات القدم وھجر الامکان و مفارقۃ الاخوان ونسیان ماعلم وجھل" (توحید میں ہمارے پانچ اصول ہیں۔ حق تعالیٰ سے حادث ہونے کی نفی کرنا ——— قدیم ہونا ثابت کرنا۔ اپنے وطنوں کا چھوڑ دینا۔ بھائیوں سے جُدا ہو جانا۔ اور معلوم و نا معلوم کو، بھول جانا۔) رفع حدث کے معنی یہ ہیں کہ توحید کی مکارنت سے محدثات کی نفی کی جائے اور حق تعالیٰ کی ذات سے حادث ہونے کو محال سمجھا جائے۔ اور اثباتِ قدم سے مراد خدا تعالیٰ کے ہمیشہ سے ہونے کا اعتقاد رکھنا ہے جس کی تشریح اس سے قبل حضرت جنید رحمۃ اللہ کے قول میں میں بیان کر چکا ہوں۔ اور ہجر اوطان سے مراد، نفس کی پسندیدہ چیزوں، دل کی راحتوں اور طبیعت کی قرارگاہوں کو چھوڑ دینا اور راہ حق کا ارادہ کرنے والے کا دنیا کی رسومات۔ بلند مقامات بہتر حالات اور بڑی عزتوں سے کنارہ کش ہو جانا ہے ——— اور مفارقتِ اخوان کے معنی مخلوق کی صحبت سے اعراض اور حق تعالیٰ کی صحبت کی طرف متوجہ ہونا ہے کیوں کہ موحد کے دِل پر غیر حق کے خیالات میں سے جو خیال بھی گزرتا ہے۔ اُس کے لئے حجاب ہوتا ہے اور اسی مقدار میں وہ آفت ہوتا ہے جس مقدار میں موحد کا اس کے ساتھ تعلق ہوتا ہے اس لئے کہ اس پر سب امتوں کا اتفاق ہے کہ توحید حق تعالیٰ پر ارادوں کے جمع ہونے کو کہتے ہیں جب کہ غیر کے ساتھ آرام پانا ارادوں کے تفرقے کی علامت ہے۔ اور نسیان ماعلم وجھل کے معنی یہ ہیں کہ مخلوق کا علم یا تو ماہیت و کیفیت کے بارے میں ہوتا ہے یا پھر جنس و طبیعت کے بارے میں۔ اس طرح مخلوق کا علم توحید کے بارے میں جو کچھ بھی ثابت کرتا ہے خود توحید اُس کی نفی کرتی ہے اور جو چیز مخلوق کی جہالت ثابت کرتی ہے۔ خود ان کا اپنا علم اس کے خلاف ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جہالت توحید نہیں ہے اور توحید کا تحقیق پر مبنی علم، غیر کے تصرف کی نفی کے بغیر درست نہیں ہوتا۔ جب کہ مخلوق کے علم اور جہالت میں تصرف کے

سوا کچھ نہیں کہ ایک ان میں سے بصیرت پر مبنی ہوتا ہے اور دوسرا غفلت پر ——— مشائخ میں سے ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت خضرؑ کی محفل میں بیٹھا تھا کہ مجھے نیند آگئی اور میں نے خواب کی حالت میں دیکھا کہ دو فرشتے آسمان سے زمین پر آئے ہیں اور کچھ دیر وہ حضرت خضرؑ کا بیان سنتے رہے۔ پھر اُن میں ایک دوسرے سے کہنے لگا کہ جو کچھ یہ بزرگ کہتا ہے یہ توحید کا علم ہے عینِ توحید کا علم نہیں۔ جب میں بیدار ہوا تو آپ توحید کا ہی بیان کر رہے تھے۔ آپ نے رُخ میری طرف کر کے فرمایا "اے فلاں! توحید کے بارے میں علم کے علاوہ کچھ بھی بیان نہیں کیا جا سکتا۔"

حضرت جنید رحمۃ اللہ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے فرمایا ——— توحید یہ ہے کہ بندہ حق تعالیٰ کے حضور ایک ایسا جسم بن جائے کہ اس میں اپنے نفس کے تصرفات فنا ہو جائیں اور توحید کے سمندر اور حق تعالیٰ کے احکامِ قدرت کے جاری ہونے میں صرف حق تعالیٰ کا تصرف ہی کارفرما ہو۔ اور وہ حق تعالیٰ کے حقیقی قرب میں اور اُس کی توحید سے پوری طرح آگاہ ہو جانے کی وجہ سے اپنے احساس اور ارادے سے اس طرح بے خبر ہو جائے کہ وہ صرف حق تعالیٰ کو پکارے اور صرف اُسی کی دعوت کا جواب دے۔ اور یہ اس طرح ہو جائے کہ گویا بندے کی آخری حالت اُس کی پہلی حالت کی طرف راجع ہو یعنی یوں ہو جائے جیسے وجود میں آنے سے پہلے تھا۔" مراد اس سے یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے اختیار میں موحد کا اپنا اختیار نہ رہے اور حق تعالیٰ کی وحدانیت میں اپنی ذات کی طرف توجہ ہی نہ رہے کیوں کہ قربِ حق کے محل میں اس کا اپنا نفس فانی ہو جاتا ہے اور اس کی حس چلی جاتی ہے اور صرف حق تعالیٰ کے احکام ہی اس پر جاری ہوتے ہیں جس طرح کہ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ بندہ اپنے تصرف کے فنا میں اس طرح ہو جائے کہ جس طرح ازل میں توحید کا عہد کرتے وقت ایک ذرّہ تھا کہ کہنے والے بھی حق تعالیٰ اور اس کی طرف سے جواب دینے والے بھی حق تعالیٰ ہی تھے حالانکہ بظاہر نشانہ وہ ذرّہ تھا۔ اور جو بندہ اس طرح ہو جائے اُس کے ساتھ مخلوق کو کوئی تعلق نہیں رہتا نہ اُس کو کسی کے ساتھ کوئی اُنس رہتا ہے کہ اُن کی دعوت کو قبول کرے اور اس قول میں صفاتِ بشریت کے فنا اور جلالِ الٰہی کے غلبۂ کشف کی حالت میں جذبۂ تسلیم و رضا

کے صحیح ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ وہ بندہ کو اس کے اوصاف سے فانی کردے تاکہ وہ محض ایک آلہ اور ایک ایسا لطیف جوہر بن جائے کہ اگر اس کے جگر میں نیزہ ماریں تو بلاتمیز پار ہو جائے اور اگر اس کی صحیح و سلامت پیٹھ پر ماریں تو بے تصرف اُس کو کاٹ دے۔ خلاصہ یہ کہ وہ تمام اوصاف سے فانی ہو جائے اُس کا جسم اسرارِ الٰہی کا مرکز بن جائے حتیٰ کہ اس کا نطق حوالۂ حق ہو جائے اور اس کے فعل کی نسبت بھی حق تعالےٰ کی طرف ہو اور اس کی صفت کا قیام بھی حق تعالےٰ کے ساتھ ہو اور صرف حجت کے اثبات کے لئے شریعت کے احکام اُس پر باقی رہیں ورنہ وہ تمام امور کے دیکھنے سے فانی ہو چکا ہو اور یہی صفت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی کہ جب آپ کو معراج کی رات مقام قرب تک پہنچایا گیا تو مقام کے لئے تو فاصلہ تھا لیکن آپ کے قرب کے لئے کوئی فاصلہ نہ تھا۔ آپ کا حال لوگوں کے عقل میں آنے والے حال سے بہت بلند اور انسانی وہم و گمان سے بھی بہت بعید ہو گیا یہاں تک کہ جہاں نے آپ کو کھو دیا اور آپ نے بھی اپنے آپ کو فنائے صفت میں اس حد تک کھو دیا کہ طبقوں کی ترتیب حیران ہو گئی اور مزاج کا اعتدال پریشان ہو گیا۔ نفس، دل کے مقام پر پہنچ گیا اور دل جان کے مقام پر اور جان، باطن کے درجہ پر پہنچ گئی اور باطن قربِ الٰہی کی صفت سے مکمل طور پر موصوف ہو کر سب احوال سے جدا ہو گیا آپ نے چاہا کہ وجود معدوم ہو کر جسم کو چھوڑ دے لیکن چونکہ حق تعالےٰ کا مقصد اس سے حجت قائم کرنا تھا اس لئے حکم ہوا "اپنے حال پر قائم رہئے" آپ نے اس حکم سے تقویت پائی اور یہ تقویت آپ کے لئے قوت بن گئی اور اپنی ہستی کے فناء سے حق تعالےٰ کی بقاء آپ پر ظاہر ہوئی چنانچہ آپ نے فرمایا کہ "اِنِّیْ لَسْتُ کَاَحَدِکُمْ اِنِّیْ اَبِیْتُ عِنْدَ رَبِّیْ فَیُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِیْ" (میں تم میں سے کسی ایک جیسا نہیں ہوں میں تو اپنے رب کے ہاں رات گزارتا ہوں وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے) یعنی میری زندگی اور پائندگی حق تعالےٰ کی طرف سے ہے اور نیز فرمایا کہ "لِیْ مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ لَا یَسَعُنِیْ فِیْہِ مَلَکٌ مُقَرَّبٌ وَلَا نَبِیٌّ مُرْسَلٌ" (میرے لئے اللہ تعالےٰ کے ساتھ ایک ایسا وقت مخصوص ہے کہ اس میں نہ کسی مقرب فرشتے کی گنجائش ہے اور نہ کسی نبی مرسل کی) ——— حضرت سہل بن عبد اللہ تستریؒ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "اللہ تعالےٰ کی ذات علم کے ساتھ موصوف ہے۔ نہ تو ادراک کے احاطے میں آسکتی ہے اور نہ ہی دنیا میں

آنکھوں سے اُس کو دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ ایمان کی حقیقتوں میں حد اور حلول کے بغیر موجود ہے۔ البتہ آخرت میں آنکھیں اُس کو اس کی ملک اور قدرت میں ظاہری و باطنی طور پر دیکھ لیں گی۔ اور اللہ تعالےٰ نے مخلوق کو اپنی ذات کی حقیقت کی معرفت سے حجاب میں رکھا ہے اور اپنی ذات پر آیات و براہین سے مخلوق کو رہنمائی کی ہے۔ قلوب اُس کی معرفت حاصل کر لیتے ہیں لیکن عقلیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں۔ آنکھیں اُس کا احاطہ اور اس کی نہایت کا ادراک کئے بغیر قیامت کے دن اُس کے دیدار سے مشرف ہونگی" ——— توحید کے جملہ احکام کے لئے یہ کلام جامع حیثیت رکھتا ہے۔ ——— اور حضرت جنید رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ "اشرف کلمۃٍ فی التوحید قول ابی بکر رضی اللہ عنہ" سبحان مَنْ لَمْ یَجْعَلْ لخلقہٖ سبیلاً الیٰ معرفتہ الا بالعجز عن معرفتہ۔" (توحید سے متعلق سب سے بہترین اور بزرگ جملہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہے کہ "پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندوں کے لئے اپنی معرفت میں کوئی راہ نہیں رکھی سوائے معرفت سے اعتراف عجز کے) کچھ لوگ اس کلمہ کے سمجھنے میں غلطی میں پڑے ہوئے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ اُس کی معرفت سے عاجز ہونا گویا معرفت کا معدوم ہونا ہے حالانکہ یہ محال ہے کیونکہ عجز کسی چیز کے موجود ہونے کی صورت میں ہی ہوتا ہے کسی چیز کے معدوم ہونے کی حالت میں تو عجز متصور ہی نہیں ہوتا۔ جیسا کہ مردہ زندگی سے عاجز نہیں ہوتا کیونکہ وہ موت میں موت سے عاجز ہوتا ہے کہ اُس کی قوت کے لئے عجز کا اطلاق ہی محال ہے اور اندھا۔ بینائی سے عاجز نہیں ہوتا بلکہ وہ نابینا ہونے کی حالت میں نابینائی سے عاجز ہوتا ہے اسی طرح اپاہج۔ کھڑا ہونے سے عاجز نہیں ہوتا کہ بیٹھنے میں بیٹھنے سے عاجز ہو۔ جیسا کہ عارف، معرفت کے موجود ہونے کی حالت میں معرفت سے عاجز نہیں ہوتا بلکہ یہ اس کے لئے گویا ضروری ہوتا ہے پس حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اس قول کو ہم اُس بات پر محمول کریں گے جو حضرت ابو سہل صعلوکی اور استاد ابو علی دقاق رحمہما نے فرمائی ہے کہ معرفت تو ابتداء میں ہوتی ہے انتہاء میں جاکر وہ ضروری ہو جاتی ہے۔ اور علم ضروری وہ ہوتا ہے کہ صاحب علم اُس کی موجودگی کی حالت میں ہر قسم کے نفع یا نقصان سے مضطر اور عاجز ہو ـــ پس اس قول کے مطابق توحید، بندے کے دل میں حق تعالےٰ کا فعل ہوگا۔ پھر حضرت شبلی رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ "التوحید حجاب الموحد عن جمال الاحدیۃ" (توحید، موحد

کے لئے حق تعالیٰ کی احدیت کے جمال سے حجاب ہوتی ہے) اس لئے کہ وہ توحید کو بندے کا فعل کہتے ہیں اور بندے کا فعل مشاہدۂ حق کے لئے ہرگز علت نہیں بن سکتا۔ اور جو چیز عین کشف میں کشف کے لئے علت نہ بن سکے وہ حجاب ہی ہوتی ہے اور بندہ اپنے تمام تر اوصاف کے ساتھ غیرِ حق ہوتا ہے کیوں کہ اگر اپنی صفت کو وہ حق شمار کرنے لگے تو لامحالہ اس صفت کا موصوف بھی حق ہی شمار ہوگا۔ جو کہ یہ خود ہے اس وقت موحد، توحید اور واحد تینوں ایک دوسرے کے وجود کے لئے علت بن جائیں گے اور یہ تو بعینہٖ "ثالثُ ثلاثہ" والا فلسفہ بن جائے گا (جو کہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے) اور جو صفت توحید میں طالب کے لئے اپنے آپ کو فناء کرنے میں مانع ہو وہ ابھی تک اُس صفت کی بدولت محجوب قرار پائے گی موقد نہیں! "اِلَّا اَنَّ ما سواہُ من الموجودات باطل"۔ (اس لئے کہ موجودات میں حق تعالیٰ کے سوا جو کچھ بھی ہے باطل ہے) جب یہ درست ہے کہ جو کچھ بھی حق تعالیٰ کے علاوہ ہے وہ باطل ہے تو طالب بھی تو حق تعالیٰ کا ماسویٰ ہے لہٰذا طالب کی صفت حق تعالیٰ کے جمال کے کشف میں باطل ہوگی۔ یہی "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کی تفسیر ہے۔

حکایات میں مشہور ہے کہ جب حضرت ابراہیم خواصؒ کوفہ میں حضرت حسین بن منصور کی زیارت کے لئے آئے تو آپ نے دریافت کیا کہ اے ابراہیم تم نے اپنا وقت کس چیز کی تلاش میں گزارا ہے؟ انہوں نے کہا "اپنے لئے توکل کو درست کرنے میں مصروف رہا ہوں۔ تو حضرت حسین بن منصور نے کہا "ضیعتَ عُمرکَ فی عمران باطنکَ فاینَ انت فی افناء فی التوحید (تم نے اپنی تمام عمر اپنے باطن کی تعمیر میں ضائع کردی ہے تو فناء فی التوحید کا مقام تجھے کیسے حاصل ہوسکتا ہے۔) توحید کے بیان میں مشائخ کے اقوال بہت ہیں۔ ایک گروہ نے تو اس کو فناء سے تعبیر کیا ہے کیوں کہ فناء پر صحت درست نہیں ہوتی۔ جب کہ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اپنے فناء کے علاوہ کوئی چیز توحید کی صفت نہیں بن سکتی۔ ان تمام اقوال کو جمع اور تفرقہ کے معنوں پر ہی قیاس کرنا چاہیئے تاکہ اس کی حقیقت معلوم ہو جائے۔

اور میں علی بن عثمان الجلابیؒ کہتا ہوں کہ توحید، حق تعالیٰ کی طرف سے بندہ کے لئے وہ اسرار ہیں جو عبارت سے بیان نہیں کئے جا سکتے کہ کوئی شخص ان کو عبارت سے مزین کرکے بیان کر سکے کیوں کہ عبارت اور جس کو اس عبارت میں بیان کیا جا رہا ہے آپس میں غیر ہوتے ہیں۔

اور توحید کے معاملے میں غیر کا اثبات بجائے خود شرک کا اثبات ہے اس طرح یہ ایک لہو اور کھیل ہو گا جب کہ موحد اللہ والا ہوتا ہے لہو و لعب میں مشغول ہونے والا نہیں ہوتا۔ یہ تھے مختصر اً احکام توحید اور اہل معرفت کے اقوال اور مسلک جو میں نے بیان کر دئیے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تیسرا کشف حجاب - ایمان کی حقیقت

حق تعالےٰ کا ارشاد ہے" یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ (اے ایمان والو! اللہ پر اور اُس کے رسول پر ایمان لاؤ) نیز دوسرے کئی مقامات پر فرمایا ہے" یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ" الایمان اَن تومِن باللہِ و مَلٰٓئِکتِہٖ و کُتُبِہٖ"۔ (الحدیث) (ایمان یہ ہے کہ تو اللہ پر اس کے فرشتوں پر اور اُس کی کتابوں پر ایمان لائے) ایمان لغت کے اعتبار سے تصدیق کا نام ہے اور اصطلاح شریعت میں اس کا حکم اور معنی بیان کرنے میں اہل علم کے بہت سے اقوال اور بہت سا اختلاف ہے۔ چنانچہ معتزلہ تمام علمی اور عملی عبادات کو ایمان قرار دیتے ہیں اور اسی لئے وہ انسان کو گناہِ کبیرہ کے ارتکاب پر ایمان سے خارج سمجھتے ہیں۔ خارجیوں کا بھی یہی قول ہے اور وہ بھی انسان کو اُس کی گناہ کی وجہ سے جس کا اُس نے ارتکاب کیا ہو کافر قرار دیتے ہیں ——— ایک دوسرا گروہ محض زبانی قول کو ہی ایمان کہتا ہے اور ایک تیسرا گروہ ہے جو صرف معرفت پر بھی ایمان کا اطلاق کرتا ہے ——— متکلمین اہل سنت کی ایک جماعت مطلقاً" تصدیق کو ہی ایمان قرار دیتی ہے میں نے اس کے بیان میں ایک مستقل کتاب تصنیف کی تھی تاہم اس جگہ میری مراد مشائخ صوفیہ کے اعتقاد کو ثابت کرنا ہے چنانچہ ایمان کی تعریف کے مسئلہ پر جمہور مشائخ کے دو گروہ ہیں حضرات فضیلؒ بن عیاض۔ بشر حافیؒ، خیر النساجؒ سمنون المحبؒ، ابوحمزہ بغدادیؒ، ابو محمد جریریؒ اور اسی ذوق کے دوسرے حضرات رحمہم اللہ اجمعین پر مشتمل گروہ یہ کہتا ہے کہ قول، تصدیق اور عمل تینوں کے مجموعے کا نام ایمان ہے۔ فقہا اور اہل یقین کی ایک جماعت بھی ان کی

تائید کرتی ہے. جب کہ حضرات ابراہیم بن ادھم ۔ ذوالنون مصری بایزید بسطامی ابوسلیمان دارانی، حارث محاسبی ، جنید بغدادی، سہل بن عبداللہ تستری، شفیق بلخی، صائم اصم، محمد بن فضل البلخی رحمہم اللہ اجمعین کا قول یہ ہے کہ ایمان، قول اور تصدیق سے عبارت ہے، ان کے علاوہ فقہائے امت کی ایک جماعت "جو امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل وغیرہ رحمہم اللہ اجمعین پر مشتمل ہے۔" پہلے قول کے مطابق خیال رکھتی ہے جب کہ حضرت امام ابو حنیفہ، حسین بن فضل البلخی اور امام ابو حنیفہ کے اصحاب مثلاً محمد بن الحسن داؤد طائی اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ اجمعین اس دوسرے قول کے مطابق رائے رکھتے ہیں۔ تاہم درحقیقت یہ اختلاف محض لفظی ہے معنی میں کوئی اختلاف نہیں۔ اب میں اختصار کے ساتھ ایمان کے معنی کو انشاء اللہ بیان کرتا ہوں تاکہ حقیقت کا علم ہو جائے۔ اور میں اس اختلاف میں کسی کو ایمان کے بارے میں اصل عقیدے کا مخالف نہیں سمجھتا ——— وباللہِ التوفیق ۔

فصل

جان لو کہ اہل سنت وجماعت اور اہل تحقیق و معرفت کا اس بارے میں اتفاق ہے کہ ایمان کی ایک اصل ہے اور ایک فرع۔ ایمان کی اصل تو یہ ہے کہ دل کے ساتھ تصدیق کی جائے اور حق تعالےٰ کے احکام کی تعمیل کرنا اور ان کی رعایت رکھنا ایمان کی فرع ہے۔ عرف عام اور عادت میں کسی چیز کی فرع کو ہی استعارہ کے طور پر اصل کے نام کے ساتھ پکارتے ہیں۔ جیسا کہ تمام لغات میں آفتاب کی روشنی کو آفتاب ہی کہتے ہیں۔ اسی معنی کے لحاظ سے وہ گروہ اطاعت کو ہی ایمان کا نام دیتا ہے کہ اس اطاعت کے بغیر بندہ عذاب سے مامون نہیں ہو سکتا۔ اور محض تصدیق اس وقت تک عذاب سے نہیں بچا سکتی جب تک احکامِ الٰہی کو بجا نہ لایا جائے پس جو بندہ جتنی زیادہ اطاعت کرے گا وہ اتنا ہی زیادہ عقوبت سے محفوظ قرار پائے گا۔ لہٰذا جب یہ اطاعت، تصدیق اور قول کے ساتھ مل کر عقوبت سے امن کا سبب بنتی ہے تو ان حضرات نے اسی کو ہی ایمان سے تعبیر کر دیا ——— ایک دوسرے گروہ کا کہنا یہ

ہے کہ عقوبت سے امن کی علت معرفت ہے نہ کہ اطاعت۔ کیونکہ کسی بندے کو اگرچہ اطاعت حاصل ہو لیکن جب تک اُسے معرفت حاصل نہ ہو محض اطاعت اس کے لئے قطعاً مفید نہیں لیکن اگر معرفت حاصل ہو تو اطاعت اگرچہ حاصل نہ بھی ہو تو بالآخر بندہ نجات پالے گا کیونکہ اس کا معاملہ مشیتِ الٰہی کے سپرد ہے کہ حق تعالےٰ خواہ اس کو اپنے فضل سے معاف کر دیں۔ یا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے نتیجہ میں بخش دیں۔ اور یا پھر اس کو اُس کے گناہوں کی مقدار سزا دے کر پھر دوزخ سے نجات دے دیں اور جنت میں منتقل کر دیں۔ پس جب اصحاب معرفت (حق تعالےٰ کے وجود اور توحید کو پہچاننے والے) گنہگار ہونے کے باوجود معرفت کی بنیاد پر دوزخ میں ہمیشہ نہ رہیں گے۔ اور اصحاب عمل معرفت کے بغیر محض عمل کی بنیاد پر بہشت میں داخل نہ ہو سکیں گے تو معلوم ہو گیا کہ اس جگہ عذاب سے محفوظ رہنے کی علت اطاعت نہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لن ینجوا احدکم بعملہ قیل ولا انت یا رسول اللہ قال ولا انا الا ان یتغمدنی اللہ برحمتہ" (تم میں سے کوئی بھی محض اپنے عمل کے سبب نجات حاصل نہیں کر سکے گا۔ صحابہؓ نے پوچھا "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ بھی اپنے اعمال کی وجہ سے نجات نہیں پا سکیں گے؟ تو آپؐ نے فرمایا "ہاں میں بھی محض اپنے اعمال کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف اسی صورت میں خلاصی پا سکوں گا کہ اللہ تعالےٰ مجھے اپنی رحمت کے ساتھ ڈھانپ لے) پس تحقیق اور حقیقت کے اعتبار سے اور اُمت کے اتفاق کے ساتھ یہ بات ثابت ہوئی کہ حق تعالےٰ کی معرفت کا نام ایمان ہے اور اس کا اقرار یہ ہے کہ عمل کو قبول کیا جائے ——

اور جو شخص بھی حق تعالےٰ کو پہچانتا ہے اُس کے اوصاف میں سے کسی وصف کی وجہ سے ہی پہچانتا ہے۔ اُس کے حُسنِ اوصاف تین طرح کے ہیں، اُن میں سے بعض کا تعلق اُس کے جمال کے ساتھ ہے۔ بعض کا جلال کے ساتھ اور بعض وہ ہیں جن کا تعلق اس کے کمال کے ساتھ ہے پس مخلوق کے لئے اس کے کمال سے متعلق اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اس کے کمال کا اثبات کریں اور اس سے ہر قسم کے نقصان کی نفی کریں اسی طرح جلال اور جمال کے متعلق بھی تمام خوبیوں کو اُسی کے لئے ثابت کرنے اور تمام نقائص کو اُس سے نفی کرنے کے

علاوہ کوئی چارہ نہیں —— لہٰذا جس بندے کا شاھد معرفت میں حق تعالے کا جمال ہو وہ ہر وقت حق تعالے کے دیدار کا مشتاق رہتا ہے —— اور جس بندے کا شاہد حق تعالیٰ کا جلال ہو وہ ہر وقت اپنے اوصاف سے نفرت کرنے میں مشغول رہتا ہے اور اس کا دل خوفِ الٰہی میں مبتلا رہتا ہے، پس شوقِ دیدار، محبت کی تاثیر ہے اور اسی طرح نفرت بشریت کے اوصاف میں سے ہے۔ لہٰذا اوصافِ بشریت سے پردہ عین محبت کے علاوہ نہیں اُٹھ سکتا —— پس اب ایمان اور معرفت، محبت کا نتیجہ ہیں اور محبت کی علامت، اطاعت ہے۔ اس لئے کہ جب دل محلِ مشاہدہ ہے آنکھ محلِ دیدار اور جان جسم کے لئے محل عبرت ہے اور دل مشاہدے کا مقام ہے تو جسم کو چاہئے کہ حکم کی خلاف ورزی نہ کرے اور جس آدمی کا جسم حق تعالے کے حکم کا تارک ہو اُس کو معرفتِ الٰہی کی کوئی خبر نہیں ہوتی —— اس دور کے صوفیوں میں یہ مصیبت ظاہر ہو چکی ہے کہ بے دینوں کے ایک گروہ نے اُن کے جمال کو دیکھ کر اُن کی قدر و منزلت کو معلوم کر لیا ہے اور اپنے آپ کو اُن جیسا بنا کر کہنے لگا ہے کہ احکام شرح کی یہ تکلیف تو اُسی وقت تک ہے جب تک معرفت حاصل نہ ہو، لیکن جب معرفت حاصل ہو جائے تو پھر اطاعت کی تکلیف جسم سے اُٹھ جاتی ہے اور اعمال و اطاعت کی ضرورت نہیں رہتی — لیکن یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ کیوں کہ میں کہتا ہوں کہ جب تو نے حق تعالے کو پہچان لیا تو تیرا دل شوق کا محل ہو گیا اب اُس کے فرمان کی تعظیم اور تعمیل زیادہ ہونی چاہئے، البتہ میں یہ جائز سمجھتا ہوں کہ اطاعت کرنے والا اس مقام تک پہنچ جائے کہ حق تعالے اُس سے اطاعت کا رنج اٹھالیں اور اُن احکام کو بجا لانے کی اُس کو زیادہ توفیق مرحمت فرما دیں۔ یہاں تک کہ دوسرے لوگ تو اُن احکام کو ذرا رنج کے ساتھ بجا لائیں اور اس کو ان میں کوئی رنج محسوس نہ ہو۔ لیکن یہ مقام کمال شوق، محبت کی تڑپ اور عشق کے اضطراب کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا ——

پھر ایک جماعت ایمان کو تمام کا تمام حق تعالے کی طرف سے کہتی ہے اور دوسری جماعت تمام کا تمام بندہ کی طرف سے سمجھتی ہے اور ماوراء النہر کے علاقہ میں یہ اختلاف لوگوں کے درمیان بہت طویل ہو چکا ہے، پس تمام ایمان کو حق تعالےٰ کی طرف سے کہنا تو جبر محض ہے کیوں کہ بندہ

کو اسطرح مجبور اور مضطر ہونا پڑتا ہے۔ اور جملہ ایمان کو بندہ کی طرف سے ماننا قدر محض ہے کیوں کہ بندہ تو حق تعالےٰ کی اطلاع کے بغیر اسے نہیں جان سکتا۔ جبکہ طریق توحید تو جبر سے نیچے اور قدر سے اوپر ہے اور درحقیقت ایمان بندے کا ایسا فعل ہے جس کے ساتھ حق تعالےٰ کی ہدایت ملی ہوئی ہو کیوں کہ اُس کا گمراہ کیا ہوا انسان راہِ راست پر نہیں آ سکتا اور اس کا راہِ راست پر لایا ہوا انسان گمراہ نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ حق عزوجل کا ارشاد ہے فَمَنۡ یُّرِدِ اللّٰهُ اَنۡ یَّهۡدِیَهٗ یَشۡرَحۡ صَدۡرَهٗ لِلۡاِسۡلَامِ‌ۚ وَمَنۡ یُّرِدۡ اَنۡ یُّضِلَّهٗ یَجۡعَلۡ صَدۡرَهٗ ضَیِّقًا حَرَجًا "(اللہ تعالےٰ جس کو ہدایت دینے کا ارادہ کر لیتے ہیں اُس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتے ہیں اور جس کو گمراہ کرنے کا ارادہ کر لیں اس کا سینہ تنگ اور سخت کر دیتے ہیں) اس اصل کے مطابق چاہیئے کہ ایمان کی طرف میلان حق تعالےٰ کی ہدایت سے ہو اور مائل ہونا بندے کا اپنا فعل ہو۔ پس ایمان کی طرف مائل ہونے کی علامت یہ ہو گی کہ دل پر توحید کا اعتقاد ہو، آنکھ منع کی چیزوں کو دیکھنے سے محفوظ رہے اور حق تعالےٰ کی نشانیوں اور آیات کو دیکھ کر عبرت حاصل کرے، کان اس کے کلام کو غور سے سننے پر لگے رہیں۔ معدہ حرام کھانے سے خالی رہے، زبان پر ہمیشہ تسبیح جاری رہے اور بدن منع کردہ افعال سے اجتناب کرے تاکہ عمل دعوے کے موافق ہو جائے۔ اسی لئے یہ گروہ معرفتِ ایمان میں کمی اور زیادتی کو جائز سمجھتا ہے۔ حالانکہ سب کا اس پر اتفاق ہے کہ معرفت ایمان میں کمی اور اضافہ درست نہیں کیوں کہ اگر معرفت میں زیادتی اور نقصان ہو سکتی ہو تو معروف میں بھی کمی اور زیادتی ممکن ہونی چاہیئے (اور یہ درست نہیں ہے) لہٰذا جب معروف پر زیادتی اور نقصان روا نہیں ہے تو معرفت پر بھی روا نہیں ہو گا کیوں کہ ناقص معرفت، معرفت ہی نہیں ہوتی۔ پس ہونا یہ چاہئے کہ زیادتی اور نقصان، فرع اور عمل میں واقع ہو اور بالاتفاق اطاعت پر کمی اور زیادتی کا واقع ہونا روا ہے ——— اور حشوی فرقہ کے لوگ جو مذکورہ بالا دونوں گروہوں کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں اُن کے دل پر یہ مسئلہ بڑا دشوار گزرے گا کیوں کہ حشویوں کا ایک گروہ اطاعت کو منجملہ ایمان سے کہتا ہے اور دوسرا گروہ ایمان کو قول کے بغیر کچھ نہیں سمجھتا۔ حالانکہ یہ دونوں اقوال ناانصافی پر مبنی ہیں۔ بہرحال درحقیقت ایمان یہ ہے کہ

بندے کے تمام اوصافِ حق تعالیٰ کی جستجو میں مستغرق ہو جائیں۔ اور تمام طالبانِ حق کو اِس بات پر اتفاق کر لینا چاہئے کہ معرفت کی بادشاہی کا غلبہ عدمِ معرفت کے اوصاف کے نقصانات کو مغلوب کرنے والا ہے اور جس جگہ کہ ایمان موجود ہو عدمِ معرفت کے اسباب وہاں سے دور ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ کہا جاتا ہے کہ "اِذَا طَلَعَ الصَّبَاحُ عَطَلَ الْمِصْبَاحُ" (جب صبح طلوع ہو گئی تو چراغ کا جمال گم ہو گیا) اور دن کو کسی بیان یا دلیل سے واضح نہیں کیا جاتا جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ روزِ روشن کے نمودار ہونے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی — اور حق عزوجل کا ارشاد ہے کہ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا۔" الآیہ" (بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اُس کو برباد کر دیتے ہیں) یعنی جب عارف کے دل میں معرفت کی حقیقت حاصل ہو جاتی ہے تو گمان، شک اور عدمِ معرفت کی حکمرانی فنا ہو جاتی ہے اور معرفت کی بادشاہت اس کے حواس اور خواہشات کو اپنا مسخر کر لیتی ہے تاکہ وہ جس چیز میں دیکھے جو کچھ کرے اور جو کچھ کہے سب حق تعالیٰ کے دائرہ حکم میں ہو — اور میں نے حکایات میں پایا ہے کہ لوگوں نے حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ سے دریافت کیا کہ ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ تو آپ نے جواب دیا: "ابھی میرے پاس اس کا جواب نہیں ہے کیوں کہ میں اس وقت جو کچھ کہوں گا وہ ایک عبارت ہو گی حالانکہ مجھے اپنے عمل سے اس کا جواب دینا چاہیئے! البتہ میں مکہ مکرمہ جانے کا ارادہ رکھتا ہوں، تم بھی اسی ارادے سے سفر میں میرے ساتھ رہو تاکہ تمہیں اپنے سوال کا جواب مل جائے، راوی کہتا ہے کہ میں نے ایسا ہی کیا۔ چنانچہ میں اُن کے ہمراہ جنگل میں پہنچا تو معاملہ یوں ہوا کہ ہر روز دو روٹیاں اور شربت کے دو پیالے نمودار ہوتے حضرت ابراہیم خواص اُن میں سے ایک مجھے عنایت فرماتے اور ایک کو خود اٹھا لیتے یہاں تک کہ جنگل میں ہی ایک دن ایک بزرگ گھوڑے پر سوار تشریف لائے جب انہوں نے حضرت ابراہیم کو دیکھا تو اپنے گھوڑے سے اُتر آئے اور دونوں نے ایک دوسرے کا حال پوچھا۔ کچھ دیر دونوں آپس میں باتیں کرتے رہے اور پھر وہ بزرگ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر واپس تشریف لے گئے ——— میں نے عرض کی اے شیخ! مجھے بھی بتلائیے وہ بزرگ کون تھے؟ آپ نے فرمایا "وہ تمہارے اُس سوال کا جواب تھا" میں نے عرض کی "وہ کس طرح"؟

آپ نے فرمایا "وہ حضرت خضر علیہ السلام تھے اور میری صحبت و ہمنشینی کے طالب تھے لیکن میں نے قبول نہیں کیا" ـــــ میں نے پوچھا کیوں؟ آپ نے کہا' اس لئے کہ میں اس بات سے ڈرا کہ کہیں اُن کی صحبت میں رہتے ہوئے حق تعالےٰ پر اعتماد کرنے کی بجائے اُن پر بھروسہ نہ کر بیٹھوں اور اس طرح میرا توکل تباہ ہو جائے، کیوں کہ ایمان کی حقیقت توکل کی حفاظت کرنا ہے" جیسا کہ حق عزوجل نے فرمایا ہے کہ "وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" (اور اللہ پر ہی بھروسہ کرو اگر تم مومن ہو)

اور حضرت محمد بن خفیف رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ "الایمانُ تصدیق القلب بما عُلّم بہ الغیوب" (ایمان، دل کے اُس یقین کا نام ہے جو اُس پر غیب سے منکشف ہوا ہے) اور غیب سے اُسے سکھایا جائے۔ کیوں کہ ایمان ہوتا ہی غیب پر ہے اور خداوند تعالےٰ جو غائب ہے، سر کی آنکھوں سے حق تعالےٰ کی اپنی ہی تائید و تقویت کے بغیر بندے کے یقین میں نہیں آسکتا۔ اور یہ ایمان بالغیب حق تعالیٰ کی اطلاع سے ہی ممکن ہو سکتا ہے جیسا کہ جو معرفت اور علم، عارفوں اور علماء کو حاصل ہوتا ہے وہ حق تعالےٰ کی ہی معرفت ہوتی ہے کہ اُس نے ان کے دلوں میں اس معرفت اور علم کو پیدا کیا ہوتا ہے، علم اور معرفت کا تعلق ان کے اپنے کسب سے منقطع ہوتا ہے، پس جو کوئی اپنے دل کو حق تعالےٰ کی معرفت سے یقین آور کر لیتا ہے وہی مومن اور واصل بحق ہوتا ہے ـــــ چونکہ اس کتاب کے علاوہ دیگر مقامات پر بھی اس معنی کو بیان کرنے میں میرا کلام بہت ہے اس لئے اس جگہ اتنی مقدار ہی پر اکتفا کرتا ہوں تاکہ یہ کتاب طویل نہ ہو جائے اور اہل بصیرت کے لئے یہ مقدار کافی بھی ہے اب میں معاملات کے اسرار کی طرف توجہ کرتا ہوں اور اُن کے پردوں کو انشاء اللہ عزوجل کھولتا ہوں ـــــ وباللہ التوفیق

چوتھا کشف حجاب۔ نجاست سے پاک ہونے کا بیان

ایمان قبول کرنے کے بعد بندہ کے لئے جو اولین فریضہ ہے وہ طہارت ہے جو نماز ادا کرنے کے لئے ضروری ہے اور وہ شریعت کے مطابق بدن کا نجاست اور جنابت سے پاک کرنا اور تین اعضاء (منہ

ہاتھ اور پاؤں) کو دھونا اور سر کا مسح کرنا ہے۔ اور یا پھر پانی کے نہ پانے یا سخت بیماری کی صورت میں تیمم کرنا ہے، اور اس کے احکام اپنی جگہ پر معلوم اور واضح ہیں — جان لو کہ طہارت دو طرح کی ہوتی ہے ایک طہارتِ باطن اور دوسری طہارت ظاہر، چنانچہ جسم کی طہارت کے بغیر نماز درست نہیں ہوتی اور دل کی طہارت کے بغیر معرفت درست نہیں ہوتی۔ پس جسم کی پاکی کے لئے خالص پانی کی ضرورت ہے اور یہ ناپاک اور استعمال شدہ پانی سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ اور دل کی طہارت کے لئے توحیدِ خالص کا پانی ضروری ہے اور یہ دل کی طہارت مخلوط اور پراگندہ اعتقاد سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ پس یہ صوفیہ کا گروہ ہر وقت اپنے ظاہر کو طہارت کے ساتھ اور اپنے دل کو توحید کے ساتھ پیوستہ رکھتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا کہ "دُمْ علی الوضوءِ یحِبُّکَ حافظاکَ" (تو ہمیشہ باوضو رہا کر تیرے دونوں محافظ فرشتے تجھ سے محبت کریں گے) اور خداوند عزوجل کا ارشاد ہے کہ "اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَھِّرِیْنَ" (بے شک اللہ تعالےٰ توبہ کرنے اور خوب پاک صاف رہنے والوں کے ساتھ محبت کرتا ہے) پس جو شخص ظاہر میں طہارت پر مداومت کرتا ہے ملائکہ اُس کو دوست رکھتے ہیں۔ اور جو کوئی باطن میں ہر وقت حق تعالےٰ کی توحید پر قائم رہتا ہے۔ حق تعالےٰ خود اُس کو دوست رکھتے ہیں ——

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ "اَللّٰھُمَّ طَھِّرْ قلبِی مِنَ النِّفاقِ"۔ (بار خدایا! میرے دل کو نفاق سے پاک کردے۔) حالانکہ آپ کے قلبِ مبارک میں کسی حالت میں بھی نفاق کا تصور تک نہیں ہوسکتا تھا تاہم اپنی بزرگیوں کو دیکھنا ہی آپ کو غیر حق کا اثبات محسوس ہوتا تھا اور محل توحید میں غیر حق کا اثبات نفاق ہوتا ہے باوجودیکہ مشائخ نے اپنی کرامات کے ایک ذرے کو بھی مریدوں کی آنکھ کا سرمہ قرار دیا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ صورت محل کمال میں بہت بڑا حجاب ہی ہوتی ہے اس لئے کہ جو کچھ بھی حق تعالےٰ کے علاوہ ہے اس کا دیکھنا آفت ہی ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ "نفاق العارفین افضل مِن اخلاص المریدین" (عارفوں کا نفاق مریدوں کے اخلاص سے افضل ہے) یعنی جو کچھ مرید کا مقام ہوتا ہے وہ کامل کے لئے حجاب ہوتا

ہے۔ مرید کا ارادہ تو یہ ہوتا ہے کہ وہ کرامات حاصل کرے جب کہ کامل کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کرامت عطا کرنے والے خدا تعالےٰ کو حاصل کرے، خلاصہ کلام یہ ہے کہ کرامات کا ثابت کرنا اہل حق کے لئے نفاق نظر آتا ہے کیوں کہ یہ غیرِ حق کا دیکھنا ہے۔ پس حق تعالےٰ کے دوستوں کی آفت یہ ہے کہ تمام اہل معصیت، معصیت سے خلاصی پالیں اور اہل معصیت کی آفت یہ ہے کہ تمام گمراہ لوگ اپنی گمراہی سے نجات حاصل کر لیں، کیوں کہ جس طرح گنہگاروں کو علم ہے اگر اسی طرح کافروں کو بھی علم ہوتا کہ اُن کی معصیت خداوند تعالےٰ کو سخت ناپسند ہے تو وہ کفر سے نجات حاصل کر لیتے۔ اور جس طرح حق تعالےٰ کے دوست جانتے ہیں اگر اسی طرح گنہگاروں کو یہ علم ہوتا کہ اُن کے تمام معاملات نقصان کا باعث ہیں تو وہ تمام معصیتوں سے خلاصی پا لیتے اور ہر قسم کی آفتوں سے پاک ہو جاتے۔ پس ظاہری طہارت باطنی طہارات کے موافق ہونی چاہئے۔ یعنی انسان جب ہاتھوں کو دھوئے تو اُسے چاہئے کہ دِل کو بھی دنیا کی محبت سے دھو ڈالے۔ اور جب استنجا کرے تو اسے چاہئے کہ جس طرح اُس نے ظاہری نجاست سے نجات ڈھونڈھی ہے اسی طرح باطن کے لئے غیر کی دوستی سے نجات تلاش کر لے اور جب منہ میں پانی ڈالے تو اُسے چاہئے کہ اپنے منہ کو غیر اللہ کے ذکر سے بھی پاک کرے اور جب ناک صاف کرے تو تمام لذات کو اپنے اوپر حرام کر لے اور جب منہ دھوئے تو اُسے چاہئے کہ اپنی تمام پسندیدہ چیزوں سے کنارہ کش ہو کر حق تعالےٰ کی طرف متوجہ ہو جائے اور جب اپنے ہاتھوں کو دھوئے تو اُسے چاہئے کہ تمام دنیوی خواہشات سے دستبردار ہو جائے اور جب سر کا مسح کرے تو اُسے اپنے تمام امور کو حق تعالےٰ کے سپرد کر دینا چاہئے۔ اور جب پاؤں دھوئے تو اسے چاہئے کہ فرمانِ خداوندی کے بغیر کہیں کھڑے ہونے کی نیت نہ کرے۔ تاکہ اس طرح اُسے دونوں طہارتیں حاصل ہو جائیں کیوں کہ شریعت کے تمام ظاہری معاملات باطن کے ساتھ پیوستہ ہیں۔ جیسا کہ ایمان کے معاملہ میں زبان کا ظاہری قول۔ دل کی تصدیق کے ساتھ وابستہ ہے اسی طرح شریعت میں اطاعت کے احکام جسم پر اور دل کی نیت کے ساتھ پیوستہ ہیں۔ پس دل کی طہارت کا طریق یہ ہے کہ بندہ دنیا کی آفتوں میں تدبر اور تفکر کرے اور یہ دیکھ کہ دنیا ایک

بے وفا مقام اور فنا ہونے والی جگہ ہے، دِل کو اس سے خالی کرلے — اور یہ چیز بہت سے مجاہدے کئے بغیر حاصل نہیں ہوتی اور مجاہدات میں سے سخت ترین مجاہدہ یہ ہے کہ ظاہری آداب کی حفاظت کرے اور تمام احوال میں اس پہ مداومت اختیار کرے — حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ کے متعلق آتا ہے کہ آپ نے فرمایا: "حق تعالےٰ کے حقوق پورے کرنے لئے ہمیشہ کی زندگی درکار ہے تاکہ جب تمام لوگ دنیا کی نعمتوں میں مشغول ہو کر حق تعالےٰ کو فراموش کریں۔ تو میں دنیا کی مصیبتوں میں مبتلا رہ کر شریعت کے آداب کی حفاظت پر قائم رہوں اور حق تعالےٰ کو ہمیشہ یاد رکھوں"۔ حکایات میں آتا ہے کہ حضرت ابوبکر طاہر رحمۃ اللہ چالیس سال تک مکہ مکرمہ میں مجاور رہے اور اس عرصہ میں کبھی بھی مکہ مکرمہ کے اندر طہارت نہیں کی بلکہ طہارت کے لئے ہر مرتبہ حرم کی حدود سے باہر آجاتے اور کہتے کہ جس زمین کی حق تعالیٰ نے اپنی طرف نسبت کی ہے میں یہ پسند نہیں کرتا کہ طہارت میں استعمال شدہ پانی اس پر گراؤں" اور حضرت ابراہیم خواصؒ کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ آپ اُبی کی جامع مسجد میں پیٹ کی بیماری میں مبتلا تھے تو آپ نے ایک دن رات میں ساٹھ مرتبہ غسل کیا حتیٰ کہ آپ کی وفات بھی پانی میں ہوئی —— حضرت ابوعلی اودباری ایک عرصہ تک طہارت کے بارے میں وسوسہ میں مبتلا ہو گئے تھے چنانچہ آپ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ سحری کے وقت میں دریا پہ چلا گیا اور سورج کے طلوع ہونے کے وقت تک وہیں رہا۔ اس حالت میں میرا دل سخت رنجیدہ ہو گیا اور میں نے عرض کی! بارِ خدایا! "العافیۃ العافیۃ۔" (مجھے آرام دے مجھے عافیت نصیب کر) تو دریا میں سے ہاتف نے آواز دی کہ "العافیۃ فی العلم" (عافیت تو علم میں ہے— حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ کے بارے میں روایت ہے کہ آپ نے اپنی وفات کے دن سخت بیماری کے باوجود ہر نماز کے لئے ساٹھ ساٹھ مرتبہ طہارت کی اور فرمایا یہ اس لئے ہے تاکہ جس وقت بھی موت کے لئے پیغام الٰہی آئے میں اُس وقت طہارت کے ساتھ تیار رہوں— کہتے ہیں کہ حضرت شبلی رحمۃ اللہ نے ایک دن مسجد میں داخل ہونے کے ارادے سے وضو کیا تو ایک غیبی آواز آئی کہ "تم نے ظاہر کو تو طہارت سے آراستہ کر لیا ہے باطن کی صفائی کہاں ہے"؟ آپ فوراً لوٹ آئے اور تمام مال و میراث راہِ خدا میں بانٹ دیا اور ایک سال تک

صرف اتنا ہی لباس اپنے جسم پر پہنا جس سے نماز درست ہو جائے اس وقت آپ حضرت جنیدؒ کے پاس حاضر ہوئے تو حضرت جنیدؒ نے فرمایا "اے ابوبکر! وہ بڑی ہی نفع بخش طہارت تھی جو تو نے کی، اللہ تمہیں ہمیشہ طہارت کے ساتھ رکھے۔ کہتے ہیں کہ اس کے بعد آپ کبھی بھی بے وضو نہیں رہے یہاں تک کہ جب آپ اس دنیا سے رخصت ہو رہے تھے تو آپ کا وضو ٹوٹ گیا۔ اور آپ نے ایک مرید کو اشارہ کیا کہ مجھے طہارت کرا دو! چنانچہ مرید نے آپ کا وضو کرایا لیکن ڈاڑھی کا خلال کرنا بھول گیا۔ حضرت شبلی کی اس حالت میں زبان بند ہو چکی تھی تاہم آپ نے مرید کا ہاتھ پکڑ کر داڑھی کے خلال کی طرف اشارہ کیا تو مرید نے داڑھی کا خلال بھی کر دیا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے کسی وقت بھی وضو کے آداب میں سے کوئی ادب ترک نہیں کیا۔ سوائے اس کے کہ جب میرے دل میں ذرا سا غرور پیدا ہو گیا ہو۔ حضرت بایزید رحمۃ اللہ کے بارے میں روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب کبھی بھی میرے دل پر دنیا کا خیال گزرتا ہے میں طہارت کرتا ہوں اور جب آخرت کا خیال گزرتا ہے میں غسل کرتا ہوں کیوں کہ دنیا پلید ہے اور اس کا اندیشہ حدث (بے وضو ہونے) کا باعث ہے اور عقبیٰ غیبت اور آرام کا محل ہے اور اس کا اندیشہ جنابت (ایسی ناپاکی جس سے غسل واجب ہوتا ہے)

کے حکم میں ہے لہٰذا حدث سے وضو اور جنابت سے غسل واجب ہو جاتا ہے — اور حضرت شبلی رحمۃ اللہ کے متعلق آتا ہے کہ ایک دن جب آپ وضو کر کے مسجد میں داخل ہوئے تو اُن کے دل سے ندا آئی۔ کہ اے ابوبکر کیا تم نے اتنی اچھی طہارت کر لی ہے کہ اس بیباکی سے ہمارے گھر میں چلے آئے؟ آپ یہ ندا سُنکر لوٹ کر جانے لگے تو ندا آئی "ہماری درگاہ سے لوٹ کر کہاں جانا چاہتے ہو؟ یہ سُن کر آپ نے نعرہ بلند کیا تو آواز آئی ہم پر طعن و تشنیع کرتے ہو؟ یہ آواز سُنکر آپ بالکل خاموش ہو کے اُسی جگہ کھڑے ہو گئے تو ندا آئی "کیا ہماری آزمائشوں کو برداشت کرنے کا دعویٰ کر رہے ہو؟ حضرت شبلی پکار اُٹھے "المستغاث منک الیک" (مولا! تیری آزمائشوں سے تیری ہی بارگاہ میں فریاد ہے)۔

مشائخ صوفیہ رحمہم اللہ اجمعین کے طہارت کی تحقیق میں بہت سے اقوال ہیں اور وہ اپنے مریدوں کو ظاہری و باطنی طہارت پر مداومت کا حکم فرمایا کرتے تھے، جب کوئی شخص ظاہری احکام پر عمل کرنے کا ارادہ کرے تو اُسے چاہیئے کہ اپنے ظاہر کو پاک کرلے اور جب باطن میں قربِ الٰہی کا ارادہ کرے تو اُسے چاہیئے کہ اپنے باطن کو پاک کرے۔ ظاہر کی طہارت پانی سے اور اس باطن کی طہارت، توبہ اور حق تعالیٰ کی بارگاہ کی طرف رجوع کرنے سے عمل میں آتی ہے ۔ اب میں انشاءاللہ توبہ اور اس کے متعلقات کو تفصیل سے بیان کروں گا تاکہ اُس کی حقیقت تمہیں معلوم ہو جائے۔

باب

توبہ اور اُس کے متعلقات

جان لو کہ جس طرح احکام پر عمل پیرا ہونے والوں کا پہلا درجہ طہارت ہے اسی طرح راہِ حق کے سالکوں کا پہلا مقام توبہ ہے اسی لئے خداوند عزّ اسمہٗ کا ارشاد ہے کہ۔ "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا" (اے ایمان والو! حق تعالےٰ کی بارگاہ میں سچی توبہ کرو!) نیز فرمایا ہے کہ "تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ جَمِیْعًا اَیُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ" (اے مومنو! تم سب اللہ کی طرف توبہ کرو تا کہ تمہیں فلاح نصیب ہو) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ "مَا مِنْ شَیْءٍ اَحَبَّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ شَابٍ تَائِبٍ" (اللہ تعالےٰ کے نزدیک توبہ کرنے والے نوجوان سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہیں ہے) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ ثُمَّ قَالَ اِذَا اَحَبَّ اللّٰهُ عَبْدًا لَمْ یَضُرَّهٗ ذَنْبٌ ثُمَّ تَلَا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ" (گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہو جاتا ہے جیسے اس پر کوئی گناہ نہیں تھا پھر آپؐ نے فرمایا "جب اللہ تعالےٰ کسی بندے کو محبوب بنا لیتے ہیں تو کوئی گناہ اُس کو ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ پھر آپؐ نے آیت کا یہ ٹکڑا تلاوت کیا کہ بلاشبہ اللہ تعالےٰ توبہ کرنے اور طہارت کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں)

صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی "یا رسول اللہ توبہ کی علامت کیا ہے؛ تو آپ نے فرمایا۔ "اپنے گناہوں پر ندامت محسوس کرنا۔ باقی آپ نے جو یہ فرمایا کہ گناہ حق تعالےٰ کے دوستوں کے لئے نقصان دہ نہیں ہوتا تو اس کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ بندہ گناہ کی بدولت کافر نہیں ہو جاتا اور نہ ہی اُس کے ایمان میں گناہ سے خلل واقع ہوتا ہے —— جب گناہ ایمان کو نقصان نہیں پہنچاتا تو جس گناہ کا نقصان انجام کار باعثِ نجات بن جائے

حقیقت میں وہ نقصان ہوتا ہی نہیں۔ اور جان لو کہ، توبہ کے لغوی معنی رجوع کرنے کے ہیں، جیسا کہ اہل لغت کہتے ہیں کہ تَابَ اَیْ رَجَعَ۔ پس حکم الٰہی کے خوف سے حق تعالےٰ کے منع کردہ کاموں سے باز آجانا ہی توبہ کی حقیقت ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "الندمُ التوبۃ" (ندامت و پشیمانی ہی توبہ ہے) یہ ایک ایسا قول ہے جس میں توبہ کی تمام شرائط موجود ہیں اس لئے کہ توبہ کی ایک شرط تو یہ ہے کہ حق تعالےٰ کی مخالفت پر افسوس ہو۔ دوسری یہ کہ لغزش کو فوراً ترک کر دے اور تیسری اس بات کا عزم کہ آئندہ معصیت کا ارتکاب نہیں کروں گا۔ اور یہ تینوں شرطیں ندامت کے ساتھ پیوستہ ہیں کیوں کہ جب اپنے کئے ہوئے گناہ پر ندامت و شرمندگی حاصل ہو جاتی ہے تو یہ دونوں باقی شرطیں دل میں خودبخود آجاتی ہیں۔ جس طرح توبہ کی تین شرطیں ہیں اسی طرح ندامت کے تین اسباب ہوتے ہیں۔ پہلا سبب یہ کہ جب دل پر سزا کا خوف غالب ہو جائے اور اپنی بداعمالیوں کا غم دل پر متصور ہو جائے تو ندامت حاصل ہو جاتی ہے دوسرا یہ کہ کسی نعمت کی خواہش دل میں پیدا ہو اور یہ بھی یقین ہو جائے کہ بُرے افعال اور حق تعالےٰ کی نافرمانی کی حالت میں یہ نعمت حاصل نہ ہو سکے گی تو اس وجہ سے پشیمانی پیدا ہو جاتی ہے اور تیسرا سبب یہ ہے کہ حق تعالےٰ کی شرم اس کے سامنے آجاتی ہے اور وہ مخالفتِ حق سے پشیمان ہو اٹھتا ہے۔ پس ان تینوں میں سے ایک تو تائب (توبہ کرنے والا) کہلائے گا۔ دوسرا منیب (اللہ کی طرف رجوع کرنے والا) ہوگا اور تیسرا توّاب (بہت رجوع کرنے والا) ہوگا۔ پس توبہ کے بھی تین ہی مقام ہوں گے، پہلی توبہ، دوسرا انابت اور تیسرا اوّابت۔ پھر توبہ تو سزا کے خوف سے ہوگی اور انابت ثواب کی جستجو پر ہوگی جب کہ اوّابت حق تعالےٰ کے فرمان کی رعایت کرنے پر حاصل ہوگی۔ اس لئے کہ توبہ عام مومنوں کا مقام ہے اور وہ گناہِ کبیرہ پر ہوتی ہے جیسا کہ حق تعالےٰ کا ارشاد ہے کہ "یا ایھا الذین آمنوا توبوا الی اللہِ توبۃً نصوحًا"۔ اور انابت اولیاءؒ مقربین کا مقام ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: "مَنْ خَشِیَ الرحمٰن بالغیبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ منیبٍ"۔ (جو شخص خدائے رحمان سے ڈرتے ہوئے رجوع کرنے والا دل

لے کر آیا) اور اولیت انبیاء و مرسلین کا مقام ہے جیسا کہ حق تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ "نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ"۔ (سلیمانؑ بہت ہی اچھا بندہ ہے کہ وہ حق تعالےٰ کی طرف خوب رجوع کرنے والا ہے) پس حق تعالےٰ کی اطاعت کے ذریعہ کبیرہ گناہوں سے رجوع کا نام توبہ ہوگا اور اُس کی محبت میں صغیرہ گناہوں سے بھی رجوع انابت ہوگا جب کہ اپنے آپ سے بالکل ہی رجوع کر کے حق تعالےٰ کی طرف توجہ کا نام اوابت ہوگا۔ پس اگر کوئی حق تعالےٰ کے حکم سے فواحش سے رجوع کرتا ہے اور دوسرا اُس کی محبت میں فاسد سوچوں سے بھی رجوع کر لیتا ہے جب کہ تیسرا اپنی خودی سے بھی حق تعالےٰ کی طرف ہی رجوع کر لیتا ہے تو ان تینوں میں بڑا واضح فرق ہے ۔ توبہ کی اصل تو حق تعالےٰ کی زجر و تنبیہۂ خوابِ غفلت سے دل کی بیداری اور اپنے چھپے ہوئے حال پر غور کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور جب بندہ اپنے بُرے احوال اور ناپسندیدہ افعال پر تفکر کرتا ہے تو ان سے چھٹکارے کی راہیں تلاش کرتا ہے اب حق تعالےٰ اُس پر توبہ کے اسباب آسان فرما دیتے ہیں اور اس کو اُس کے گناہوں کی بدبختی سے رہائی دیتے ہیں اور اس طرح اپنی اطاعت کی حلاوت تک اُسے رسائی نصیب کر دیتے ہیں ۔

علماء اہلسنت وجماعت اور جملہ مشائخ کے نزدیک یہ صورت جائز ہے کہ کوئی شخص کسی ایک گناہ سے توبہ کر لے جب کہ دوسرے کئی گناہوں کا ارتکاب کر رہا ہو جس گناہ سے وہ باز آ چکا ہے خداوند تعالےٰ اس کا اُسے ثواب نصیب کریں گے اور ہو سکتا ہے کہ اس کی برکت سے ہی وہ دوسرے گناہوں سے بھی باز آ جائے ۔ مثلاً اگر ایک آدمی اگر شراب خور بھی ہے اور زنا کار بھی اور وہ زنا سے تو توبہ کرتا ہے لیکن شراب خوری پر ابھی مُصر ہے تو اس کی اُس ایک گناہ سے توبہ درست ہوگی باوجود اس دوسرے گناہ کے ارتکاب کے معتزلیوں سے بہشمی لوگ کہتے ہیں کہ جب تک کوئی آدمی تمام کبیرہ گناہوں سے اجتناب نہ کرے اس پر توبہ کا اسم درست نہیں ہوگا۔ لیکن یہ قول محال ہے کیوں کہ بندہ جتنے بھی گناہ کرتا ہے اُس کو اُن کی وجہ سے حق تعالےٰ سزا دیں گے اور جب وہ ایک قسم کے گناہوں سے رُک جائے تو اُس قسم کے گناہوں کی سزا سے تو وہ محفوظ ہو جائے تو لامحالہ وہ ان گناہوں سے

تائب ہی قرار پائے گا۔ نیز اگر کوئی بندہ بعض فرائض تو بجالاتا ہے اور بعض سے دستبردار رہتا ہے تو لامحالہ جو کچھ وہ بجالا رہا ہے اُس کا اُسے ثواب ملے گا جیسا کہ جو وہ بجا نہیں لاتا اُن پر سزا کا مستحق ہوگا ——— اور اگر کسی بندہ کو معصیت کی طاقت اور اُس کے اسباب میسر نہ بھی ہوں تو بھی وہ اُن سے توبہ کرے تو وہ تائب کہلائے گا۔ اس لئے کہ توبہ کا ایک رُکن ندامت بھی ہے اور اس بندہ کو اپنی اس توبہ سے گزشتہ پہ ندامت حاصل ہو جائے گی اور باوجودیکہ وہ موجودہ حالت میں جنس معصیت کے ارتکاب کی ہمت ہی نہیں پاتا لیکن وہ گویا اس عزم کا اظہار کرتا ہے کہ اگر کبھی معصیت کے اسباب میسر بھی ہو جائیں تو میں پھر بھی اُس معصیت کی طرف قدم نہیں بڑھاؤں گا ———

پھر توبہ کے وصف اور اس کی صحت میں مشائخ کے مختلف اقوال ہیں، چنانچہ حضرت سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ اور ایک جماعت کا موقف یہ ہے کہ "التوبة اَنْ لاَ تنسیٰ ذنبکَ" (توبہ یہ ہے کہ تو اپنے گناہ کو فراموش نہ کرے) اور ہمیشہ اس کی تشویش میں مبتلا رہے تاکہ اگرچہ تمہارے اعمال زیادہ بھی ہو جائیں تو بھی تو اُن پر مغرور نہ ہو جائے کیوں کہ برے کردار پر ندامت اعمالِ صالحہ سے مقدم ہوتی ہے اور جو آدمی اپنے گناہ کو یاد رکھتا ہے وہ اپنی نیکیوں پر ہرگز مغرور نہیں ہوتا ——— اور حضرت جنید رحمۃ اللہ کے ہمراہ ایک جماعت کا خیال یہ ہے کہ "التوبة اَنْ تنسیٰ ذنبکَ" (توبہ یہ ہے کہ تو اپنے گناہ کو بھول جائے) اس لئے کہ توبہ کرنے والا حق تعالیٰ سے محبت کرنے والا ہوتا ہے اور محب مقام مشاہدہ میں ہوتا اور مشاہدہ کی حالت میں گناہ کا یاد رکھنا ظلم ہے، کچھ وقت تو شقاوت کے ساتھ ہو گا اور پھر کچھ وقت وفا کی حالت میں جفا کے ساتھ ہو گا جب کہ وفا کی حالت میں جفا کا ذکر بھی حجاب کا باعث ہوتا ہے، یہ اختلاف دراصل مجاہدہ اور مشاہدہ کے اختلاف کی طرف راجع ہے اور اس کا ذکر سہیلی فرقہ کے مذہب میں تلاش کرنا چاہیئے! جو حضرات توبہ کرنے والے کو قائم بذاتہٖ جانتے ہیں وہ اس کے گناہ کو بھول جانے کو غفلت جانتے ہیں اور جو حضرات اُس کو قائم بحق کہتے ہیں وہ اُس کے لئے گناہ کی یاد کو شرک سمجھتے ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ توبہ کرنے والا اگر باقی الصفت ہو تو اُس کے اسرار کی گرہ کھلتی نہیں

اور جب فانی الصفت ہو تو صفت کا ذکر اُس کے حق میں درست نہیں ہوتا چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی صفت کے بقا کی حالت میں "تُبتُ الیکَ" (میں نے تیری طرف رجوع کیا) کہا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صفت کے فنا کی حالت میں فرمایا "لا اُحصی ثناءً علیکَ" (میں تیری ثنا بیان نہیں کر سکتا) غرضیکہ قرب کے محل میں وحشت کا ذکر وحشت ہی ہوتا ہے۔ توبہ کرنے والے کو تو چاہیئے کہ اس کو اپنی ذات بھی یاد نہ آئے تو اُس کو اپنا گناہ کس طرح یاد آئے گا۔ درحقیقت گناہ کی یاد بذاتِ خود ایک گناہ ہے کیوں کہ یہ محلِ اعراض ہے جس طرح گناہ محل اعراض ہے اسی طرح گناہ کی یاد بھی محل اعراض ہی ہے بلکہ اس کے غیر کا ذکر بھی اسی طرح گناہ ہے اور جیسا کہ جرم کا ذکر خود ایک جرم ہے اس جرم کا بھول جانا بھی ایک جرم ہی ہے اس لئے کہ ذکر اور نسیان دونوں کا تعلق توبہ کے ساتھ ہے ——— حضرت جنید رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے بہت سی کتابیں پڑھی ہیں مجھے اُن میں سے کسی چیز نے اتنا فائدہ نہیں دیا جتنا کہ اس شعر نے دیا ہے ———

اِذَا قُلْتُ مَا اَذْنَبْتُ قَالَتْ مُجِیبَۃً

حَیَاتُکَ ذَنْبٌ لَا یُقَاسُ بِہٖ ذَنْبٌ

(جب میں نے کہا کہ میں نے تو کوئی گناہ نہیں کیا تو میرا محبوب کہنے لگا۔ تمہاری زندگی خود ایک ایسا گناہ ہے کہ کوئی دوسرا گناہ اس کے برابر نہیں ہو سکتا) ——— گویا جب محبوب کی نگاہ میں دوست کا وجود خود ایک جرم ہے تو اُس کے وصف کی کیا قیمت باقی رہ جاتی ہے بہرحال توبہ حق تعالیٰ کی تائید ہے اور گناہ جسمانی فعل ہیں جب دل پر ندامت ظاہر ہو جائے تو جسم پر کوئی ایسا آلہ موجود نہیں جو دل کی ندامت کو دور کر سکے اور اگر فعل کی ابتداء میں ہی اُس کی ندامت توبہ کو واقع نہ کرے تو پھر یہ آ بھی جائے تو انجام کار توبہ کی حفاظت کرنے والی نہ ہوگی ——— حق تعالیٰ کا ارشاد ہے "فَتَابَ عَلَیْہِ اِنَّہٗ ھُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیمُ" (پس اللہ تعالیٰ نے اُس پر توجہ کی بلاشبہ وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا رحیم ہے) اور اس امر کے لئے حق تعالیٰ کی کتاب میں اس قدر مثالیں موجود ہیں کہ اس معاملے

کو ثابت کرنے کی ضرورت ہی نہیں ——— پس توبہ تین قسم کی ہوتی ہے، ایک گناہ سے نیکی کی طرف رجوع دوسری نیکی سے نیکی کی طرف میلان اور تیسری، اپنی ذات اور وجود سے حق تعالیٰ کی طرف جھک جانا ـ گناہ سے نیکی کی طرف رجوع تو اس طرح ہے جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ ذَکَرُوا اللّٰہَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِھِمْ" (الآیہ) (اور وہ لوگ کہ جب انہوں نے کوئی بُرا کام کر لیا یا اپنے آپ پر ظلم کر لیا تو اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے لگے پس اپنے گناہوں کے لئے مغفرت کے طلب گار ہوئے) ـ اور نیکی سے نیکی کی طرف میلان اس طرح کہ جیسا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا "تُبْتُ اِلَیْکَ" اور اپنی ذات سے حق تعالیٰ کی طرف توجہ یوں کہ جیسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "وَاِنَّہٗ لَیُغَانُ عَلٰی قَلْبِیْ وَاِنِّیْ کُنْتُ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ فِیْ کُلِّ یَوْمٍ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً" (اور وہ توبہ میرے دل پر آسان کر دی گئی ـ چنانچہ میں اپنے اللہ سے روزانہ ستر مرتبہ بخشش مانگتا ہوں) معصیت اور غلطی کا ارتکاب بُرا اور قابلِ مذمت ہے جب کہ غلطی سے درستی کی طرف رجوع اچھا اور قابلِ تعریف ہے، اور اس طرح کی توبہ عام ہے اور اس کا حکم بھی بڑا واضح ہے اور جب تک زیادہ نیکی ہو عام نیکی کے ساتھ اُس کا قرار پکڑنا، راستہ میں ٹھہر جانا اور حجاب ہے اور عام نیکی سے بڑی نیکی کی طرف رجوع کرنا اہلِ ہمت کے درجہ میں قابل تعریف ہے، اور یہ توبہ خاص ہے اور یہ محال ہے کہ اللہ کے نیک بندے معصیت سے توبہ کریں کیوں کہ وہ معصیت کا تو ارتکاب ہی نہیں کرتے تم نے غور نہیں کیا کہ تمام مخلوقات تو حق تعالیٰ کی زیارت کی خواہشمند ہے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام اس سے توبہ کرتے ہیں اس لئے کہ وہ اپنے اختیار سے یہ رویت حاصل کر لیا کرتے تھے جبکہ دوستی میں اپنا اختیار چلانا ایک آفت ہے اور اُن کے اختیار کی آفت کا ترک کرنا مخلوق کے لئے رویت کا ترک نظر آئے گا اور اپنے آپ سے حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا یہ محبت کے درجہ میں ہے جیسا کہ بلند مقام کی آزمائشوں کی وجہ سے بلند مقام پر ٹھہرنے سے توبہ کرے، اور بلند مقامات اور احوال کو دیکھنے سے بھی توبہ کرے جیسا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامات ہر لمحہ ترقی کی راہ پر گامزن تھے چنانچہ جب آپ پہلے سے زیادہ بلند مقام پر پہنچتے تو نچلے درجے کے مقام سے استغفار کرتے اور دوبارہ اس مقام کے دیکھنے

سے بھی توبہ بجالایا کرتے تھے ——— واللہ اعلم بالصواب

فصل

جان لو کہ معصیت کا ارتکاب نہ کرنے کا پختہ ارادہ صحیح ہونے کے بعد توبہ پر ہمیشہ قائم رہنا آئندہ توبہ کے لئے شرط نہیں چنانچہ اگر توبہ کرنے والے کی توبہ میں کوئی فتور واقع ہو جائے کہ پھر معصیت کا ارتکاب کر بیٹھے تو گزشتہ دنوں میں گناہ نہ کرنے کا جو اُس نے پختہ ارادہ کیا تھا اُس کا اُسے ثواب ضرور ملے گا۔ گروہِ صوفیہ کے مبتدی حضرات اور توبہ کرنے والوں میں سے ایسے لوگ گزرے ہیں کہ جنہوں نے توبہ کی لیکن پھر کسی فتور کے واقع ہو جانے کی وجہ سے بُرائی کی طرف لوٹ گئے لیکن پھر کسی تنبیہ کی وجہ سے دوبارہ درگاہِ خداوندی میں حاضر ہو گئے۔ مشائخ میں سے ایک بزرگ کا بیان ہے کہ میں نے ستر مرتبہ توبہ کی اور پھر گناہ کی طرف رجوع کیا یہاں تک کہ اکہتّرویں مرتبہ کی توبہ پر مجھے استقامت نصیب ہوئی۔ حضرت ابو عمرو نے حضرت جنید رحمۃ اللہ کے سامنے بیان کیا کہ میں نے ابتدا میں حضرت ابو عثمان حیری کی مجلس میں توبہ کی اور کچھ عرصہ تک اس پر قائم رہا پھر میرے دل میں گناہ کا شدید تقاضہ پیدا ہو گیا اور میں نے اس تقاضے کی متابعت کر لی اور اس بزرگ کی صحبت سے اعراض کرنے لگا اور جہاں کہیں میں شیخ کو دیکھتا تو ندامت محسوس کرتے ہوئے بھاگ جاتا۔ تاکہ وہ مجھے دیکھ نہ پائیں ایک دن اچانک میری اُن سے ملاقات ہو گئی۔ آپ نے مجھے فرمایا "بیٹے! اپنے دشمنوں کے ساتھ اس وقت صحبت اختیار کر جب تو گناہوں سے بالکل پاک ہو اس لئے کہ دشمن تیرے عیب نہ دیکھیں اور اگر تو عیب دار ہوا تو تیرے دشمن خوش ہوں گے اور جب تو گناہوں سے پاک ہوگا تو دشمن غمگین ہوں گے اور اگر تو گناہ کرنا چاہتا ہے تو میرے پاس آ جا تاکہ تیری مصیبت میں خود برداشت کر لوں اور تیرا دشمن خوش نہ ہو سکے"۔ ابو عمر کہتے ہیں کہ میرا دل گناہ سے بھر چکا تھا چنانچہ میں نے توبہ کی اور میری توبہ درست ہو گئی۔ نیز میں نے سنا ہے کہ ایک شخص نے گناہوں سے توبہ کی لیکن پھر اُس نے توبہ کو توڑ ڈالا اور گناہ کا ارتکاب کر لیا اس وقت اُسے پشیمانی ہوئی اور ایک دن اپنے دل سے کہنے لگا اگر اب میں پھر حق تعالےٰ کی بارگاہ

میں جاؤں تو میرا کیا حال ہوگا؟ ھاتف نے اُسے آواز دی کہ اَطَعتَنَا فشکرناك ثم ترکتنا فامھلناك فان عدت الینا قبلناك" (تونے ہماری اطاعت کی تو ہم نے تجھے قبول کیا پھر تو نے ہمیں چھوڑ دیا تو ہم نے تمہیں مہلت دی۔ اب اگر تو لوٹ کر ہمارے پاس آئے گا تو ہم تمہیں پھر قبول کریں گے۔)

"اب میں پھر مشائخ کے اقوال کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

فصل :-

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ "توبۃ العوام من الذنوب وتوبۃ الخواص من الغفلۃ"۔ (عوام کی توبہ، گناہوں سے ہوتی ہے لیکن خواص کی توبہ غفلت سے ہوتی ہے) اس لئے کہ عوام سے تو اُن کے ظاہری حال کی باز پرس ہوگی اور خواص سے اُن کے دلی معاملہ کی تحقیق! کیوں کہ غفلت عوام کے لئے تو نعمت ہے لیکن خواص کے لئے حجاب ہے ۔ ــــــ حضرت ابو حفص حداد رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ لَیسَ للعبد فی التوبۃ شیٔ لِاَنّ التوبۃ الیہ لا مِنہ" (بندہ کو توبہ کے معاملے میں کوئی دخل حاصل نہیں کیوں کہ توبہ کی توفیق حق تعالیٰ کی طرف سے بندہ کو نصیب ہوتی ہے نہ کہ بندہ کو اپنی ذات کی طرف سے) اس قول کے مطابق توبہ بندے کے اکتساب سے نہ ہوگی بلکہ وہ حق تعالےٰ کے انعامات میں سے ایک وہبی انعام ہوگی اور یہ قول حضرت جنید رحمۃ اللہ کے مذہب کے مطابق ہوگا ــــــ حضرت ابوالحسن بوشنج رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ "التوبۃ اذا ذکرت الذنب ثم لا تجد حلاوۃ عند ذکرہ فھو التوبۃ" (صحیح توبہ یہ ہے کہ جب تو گناہ کو یاد کرے تو اُس کے ذکر سے تجھے کوئی لذت حاصل نہ ہو) کیوں کہ گناہ کا ذکر یا تو افسوس کے طور پر ہوگا یا دلی ارادے کے طور پر اور جو شخص افسوس اور ندامت کے ساتھ اپنے گناہ کو یاد کرتا ہے۔ تو وہ توبہ کرنے والا ہوتا ہے اور جو کوئی دلی خواہش کے ساتھ گناہ کو یاد کرتا ہے وہ گنہگار ہوتا ہے۔ اس لئے کہ گناہ کے ارتکاب میں اتنی آزمائش نہیں ہوتی جتنی کہ اس کے ارادے اور دلی خواہش میں ہوتی ہے کیوں کہ گناہ کا فعل تو ایک ہی وقت میں ہوتا ہے لیکن اس کا ارادہ ہمیشہ قائم رہتا ہے

پس جو کوئی وقتی طور پر جسم کے ہمراہ گناہ کے ساتھ صحبت کرتا ہے وہ اُس شخص کی طرح نہیں ہوتا جو روز و شب دلی طور پر گناہ کے ساتھ صحبت کرتا رہتا ہے ـــــ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ التوبۃ توبتان. توبۃ الانابۃ و توبۃ الاستحیاء فتوبۃ الانابۃ ان یتوب العبد خوفاً من عقوبتہٖ و توبۃ الاستحیاء ان یتوب حیاءً من کرمہٖ" (توبہ دو طرح کی ہوتی ہے، توبۂ انابت اور توبہ استحیاء۔ توبہ انابت یہ ہے کہ بندہ حق تعالےٰ کی سزا کے خوف سے توبہ کرے اور توبہ استحیاء یہ ہے کہ بندہ حق تعالےٰ کے کرم سے شرم کرتے ہوتے توبہ کرے) پس خوف والی توبہ تو جلال خداوندی کے کشف کی وجہ سے ہوتی ہے لیکن وہ توبہ حیاء جمال الٰہی کے نظارہ سے ہوتی ہے۔ پس ایک جلال خداوندی میں خوف کی آگ سے جلتا ہے اور دوسرا جمال الٰہی میں حیاء کے نور سے روشن ہو رہا ہوتا ہے۔ گویا اِن دونوں میں سے ایک تو حق تعالےٰ کی محبت کے نشہ سے سرشار ہوتا ہے اور دوسرا خشیت الٰہی سے مدہوش! چنانچہ اہل حیاء اصحاب سُکر ہوتے ہیں جب کہ اہل خوف اصحاب صحو۔

اس مضمون میں گفتگو تو بہت طویل ہے لیکن میں نے اس کو مختصر انداز میں پیش کر دیا ہے ـــــ وباللہ التوفیق ـــــ واللہ اعلم

پانچواں کشف حجاب ـــ نماز کا بیان

حق تعالےٰ کا ارشاد ہے "وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" (اور نماز قائم کرو!) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "اَلصَّلٰوۃَ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ" (نماز اور اپنے زیردست ماتحتوں کا خیال رکھو) لغت کے اعتبار سے صلوٰۃ۔ ذکر اور اطاعت کے معنی میں ہے اور فقہاء کے درمیان رائج فقہی اصطلاح میں یہ مخصوص احکام کے ساتھ ادا کی جانے والی ایک مخصوص عبادت کا نام ہے، اور وہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے کہ پانچ اوقات میں

پانچ نمازیں ادا کرو! اور اس سے قبل اس میں داخل ہونے کے لئے کچھ شرائط ہیں ایک اُن میں سے طہارت ہے کہ ظاہری جسم کو نجاست سے اور دل کو خواہشات سے پاک کرے، دوسری یہ کہ لباس ظاہری طور پر ناپاکی سے اور باطنی طور پر حرام مال سے پاک ہو۔ تیسری یہ کہ نماز کی جگہ ظاہر میں ناپاکی اور معصیت سے اور باطن میں فساد اور معصیت سے پاک ہو۔ چوتھی شرط استقبالِ قبلہ ہے کہ ظاہر کا قبلہ، خانہ کعبہ ہے اور باطن کا قبلہ عرشِ الٰہی ہے اور اس کا باطنی مقصود مشاہدہ ہے، پانچویں شرط۔ ظاہر شریعت میں وقت کے داخل ہونے کے ساتھ قدرت ہونے کی صورت میں ظاہری قیام اور باطنی حقیقت کے درجہ میں وقت کے دوام کے ساتھ باطنی طور پر قرب الٰہی کے باغیچہ میں قیام! چھٹی۔ حق تعالٰے کی طرف پوری توجہ کے ساتھ اخلاصِ نیت! ساتویں۔ مقام ہیبت اور مقام فنا میں تکبیر کہنا" وصل کے محل میں قیام کرنا صحتِ لفظی اور تعظیم کے ساتھ قرأت کرنا۔ خشوع کے ساتھ رکوع اور عاجزی کے ساتھ سجدہ کرنا، دلجمعی کے ساتھ تشہد پڑھنا اور فناء صفت کے ساتھ سلام کہنا — احادیث میں آیا ہے کہ "کان رسولُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم یُصلّی وفی جوفہٖ ازیزٌ کازیزِ المرجل۔" (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز ادا کرتے تو آپ کے دل میں اس طرح جوش ہوتا جس طرح اُس دیگ میں ہوتا ہے جس کے نیچے آگ جل رہی ہو) اور جب امیرالمومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نماز ادا کرنے کا قصد کرتے تو آپ پر لرزہ طاری ہو جاتا۔ اور آپ کہتے "اس امانت کی ادائیگی کا وقت آگیا ہے جس کو اٹھانے سے زمین و آسمان عاجز آگئے تھے۔ مشائخ میں سے ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت حاتم اصم رحمۃ اللہ سے دریافت کیا کہ آپ نماز کس طرح ادا کرتے ہیں" انہوں نے فرمایا "جب نماز کا وقت شروع ہوتا ہے میں ایک ظاہری وضو کرتا ہوں اور ایک باطنی! ظاہری وضوء تو پانی سے کرتا ہوں اور باطنی توبہ سے۔ اب میں مسجد میں داخل ہوتا ہوں اور مسجد حرام کا مشاہدہ کرتا ہوں۔ مقام ابراہیمؑ کو اپنے دونوں ابروؤں کے درمیان رکھتا ہوں۔ بہشت کو اپنے دائیں طرف جانتا اور دوزخ کو اپنے بائیں طرف دیکھتا ہوں اور پلصراط کو اپنے پاؤں کے نیچے لاتا ہوں اور ملک الموت کو اپنی پشت کے پیچھے تصور کرتا ہوں۔

اس طرح میں پوری تعظیم کے ساتھ تکبیر کہتا ہوں۔ حرمت کے ساتھ قیام کرتا ہوں۔ ہیبت کے ساتھ قرأت کرتا ہوں۔ رکوع تواضع کے ساتھ، سجدہ عاجزی کے ساتھ، قعدہ پورے حلم و وقار کے ساتھ اور اس طرح آخر میں حق تعالےٰ کے شکر کے ساتھ سلام پھیرتا ہوں ——— وباللہ التوفیق۔

فصل

جان لو کہ نماز ایک ایسی عبادت ہے جس میں ابتداء سے انتہا تک مریدانِ حق اللہ تعالےٰ کی طرف راہ پاتے ہیں اور طریقت کے مقامات ان پر منکشف ہوتے ہیں چنانچہ مریدانِ حق کے لئے طہارت بمنزلۂ توبہ کے ہے قبلہ کی طرف رُخ کرنا اپنے مرشد کے ساتھ تعلق کے قائم مقام ہے۔ نماز میں قیام کرنا۔ مجاہدہ نفس کے لئے قرأت، دوامِ ذکر کے رکوع، تواضع کے لئے سجدہ، نفس کی معرفت کے لئے تشہد، مقامِ امن کے ——— اور سلام پھیرنا، دنیا سے کنارہ کشی اور مقامات کی پابندی سے باہر آنے کے قائم مقام ہے، اور یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کھانے پینے سے فارغ ہو جاتے تو کمالِ حیرت کے محل میں محبتِ الٰہی کے طالب ہو جاتے اور کھلانے، پلانے والے کے ساتھ تعلق جوڑ لیتے اس وقت آپ فرماتے" ارحنا یا بلال بالصلوٰۃ (اے بلال نماز (کی اذان) سے ہمیں خوش کر) اس معاملے میں مشائخ کے بہت سے اقوال ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا ایک مقام ہے چنانچہ ایک گروہ تو یہ کہتا ہے کہ نماز بارگاہِ الٰہی میں حاضری کا ذریعہ ہے اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ غیبت کا ذریعہ ہے اور ایک جماعت جو غائب ہوتی ہے نماز میں حاضر ہو جاتی ہے اور کچھ لوگ جو حاضر ہوتے ہیں نماز میں غائب ہوتے ہیں، جیسا کہ اس دنیا میں مقامِ مشاہدۂ حق کے اندر جو جماعت کہ حق تعالیٰ کا مشاہدہ کرتی ہے پہلے غائب ہوتی ہے تو اس وقت حاضر ہو جاتی ہے اور جو لوگ پہلے حاضر ہوتے ہیں اس وقت غائب ہو جاتے ہیں ——— میں علی بن عثمان ہجویریؒ کہتا ہوں کہ نماز ایک حکم ہے نہ کہ ذریعہ حضور یا آلہ غیبت، کیوں کہ حکم کسی چیز کے لئے ذریعہ قرار نہیں پاتا کیوں کہ حضور کا آلہ عین حضور ہے اور غیبت کا ذریعہ عین غیبت۔ جبکہ امرِ الٰہی کو کسی چیز کے سبب کے ساتھ تعلق

نہیں۔ اس لیئے کہ اگر نماز ہی حضور کا سبب ہوتی تو ہونا یہ چاہیئے تھا کہ نماز کے علاوہ کسی طرح بھی بارگاہِ خداوندی کی حاضری نصیب نہ ہوتی۔ اور اگر غیبت کا آلہ ہوتی تو چاہیئے تھا کہ ایک غائب شخص نماز کو ترک کرنے سے قاصر ہو جاتا۔ لیکن جب حاضر اور غائب کو نماز کے ادا کرنے یا اس کو ترک کرنے سے کوئی عذر نہیں تو معلوم ہوا کہ نماز کو نفس کے اندر خود ایک غلبہ حاصل ہے اور یہ غیبت اور حضور دونوں کے اندر موجود ہے پس اہل مجاہدہ اور ارباب استقامت نماز بہت زیادہ ادا کرتے ہیں اور کثرت سے نماز ادا کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ چنانچہ مشائخ اپنے مریدوں کے جسم کو عبادت کا عادی بنانے کے لیئے دن رات میں چار سو رکعت نماز ادا کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ نیز ارباب استقامت خود بھی کثرت سے نماز ادا کرتے ہیں تاکہ بارگاہِ الٰہی میں قبولیت کا شکر ادا کر سکیں۔ باقی اس جگہ ارباب احوال کے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے کہ اُن کی نماز طریقت کے کمال میں مقام جمع میں ہوتی ہے اور وہ اپنی نمازوں میں مجتمع ہوتے ہیں اور دوسرا گروہ وہ ہے جن کی نمازیں مشرب سے انقطاع کی وجہ سے مقام تفرقہ میں ہوتی ہیں اور وہ نمازوں سے تفرقہ کا مقام حاصل کرتے ہیں۔ جو حضرات اپنی نمازوں میں مجتمع ہوتے ہیں وہ دن رات نمازوں میں مصروف رہتے ہیں اور فرائض و سنن کے علاوہ نوافل کی ادائیگی کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جو حضرات مقام تفرقہ میں ہوتے ہیں وہ فرض اور سنت نماز کے علاوہ بہت کم نفلی نماز پڑھتے ہیں — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جُعِلَتْ قُرَّۃُ عَینِیْ فِی الصَّلٰوۃ (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے) یعنی میری تمام تر راحت نماز میں ہے اس لئے کہ اہل استقامت کی طریقت ہی نماز میں ہے اور یہ اس طرح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب معراج پر لے جایا گیا اور مقامِ قرب تک پہنچا دیا گیا تو آپ کا نفسِ مبارک دنیا کے تعلقات سے منقطع ہو گیا اور آپ اس درجہ پر پہنچ گئے کہ آپ کا نفس دل کے درجہ پر اور دل، جان کے درجہ پر اور جان باطن کے درجہ پر پہنچ گیا اور یہ باطن تمام درجات سے فانی اور مقامات سے محو ہو گیا اور تمام نشانیوں سے بے علامت اور مجاہدہ میں مشاہدہ سے غائب اور معائنہ کی حالت میں معائنہ سے الگ ہو گیا۔ آپ کے انسانی خواص معدوم ہو گئے اور نفسانی مادہ جل کر ختم ہو گیا آپ کے طبعی قویٰ فنا ہو گئے۔

اور آپ کے ولایت میں حق تعالےٰ کے شواہد ظاہر ہو گئے۔ یوں آپؐ اپنے آپ سے رہ گئے۔ اپنے معنی سے دوسرے معنی تک پہنچ گئے اور خدائے لم یزل کے مشاہدے میں محو ہو گئے چنانچہ محبتِ الٰہی میں اپنے آپ سے بے اختیار ہو کر پکار اُٹھے کہ "بار خدایا! مجھے پھر اس آزمائش کے سرا خانے (دنیا) میں نہ لے جانا اور خواہشات وطبیعت کے قید خانے میں نہ ڈال دینا۔" حق تعالےٰ کی طرف سے فرمان آیا کہ "میرا حکم اسی طرح ہے کہ شریعت کو قائم کرنے کے لئے تم دنیا کی طرف لوٹ کر جاؤ تاکہ جو کچھ ہم نے یہاں آپ کو عطا کیا ہے وہ وہاں دنیا میں بھی عطا کریں۔" چنانچہ جب آپ دنیا میں واپس تشریف لے آئے تو جب کبھی آپ کا دل اُس مقام بلند کا مشتاق ہوتا آپ فرماتے "اَرِحنا یا بلال بالصلوٰۃ"۔ (بلال ہمیں نماز سے راحت پہنچاؤ) پس ہر نماز آپ کے لئے معراج قربِ الٰہی کا ذریعہ ہوتی۔ لوگ آپؐ کو نماز میں مشغول دیکھتے۔ حالانکہ آپ کے جسم نماز میں ہوتی لیکن آپ کا دل نیاز مندی میں مبتلا ہوتا آپ کا باطن راز میں اور آپ کا جسم مبارک سوز وگداز میں مشغول ہوتا یہاں تک نماز آپ کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک بن جاتی آپ کا جسم تو دنیا میں ہوتا لیکن آپ کی جان ملکوت میں ہوتی اسی طرح آپ کا جسم تو انسانوں کے ہمراہ ہوتا۔ لیکن آپ کی جان حق تعالےٰ کی محبت کے مقام ارفع پر موجود ہوتی۔

حضرت سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ "علامۃ الصدق اَن یکون لہ تابعٌ من الحقِ اِذا دَخَلَ وقتُ الصلوٰۃ بعثہٗ علیھا وَ ینبّھہٗ اِن کانَ نائمًا" (صدق کی علامت یہ ہے کہ صاحب صدق کے لئے حق تعالےٰ کی طرف سے ایک تابع فرمان فرشتہ مقرر ہو جو نماز کا وقت داخل ہونے پر اُسے نماز پر آمادہ کرے اور اگر وہ نیند میں ہو تو اُسے بیدار کر دے) اور یہ چیز خود حضرت سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ میں ظاہر تھی اس لئے کہ آپ بوڑھے اور ضعیف ہو چکے تھے لیکن جب نماز کا وقت آتا تو آپ تندرست ہو جاتے اور جب نماز ادا کر چکتے تو پہلے کی طرح اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکتے ——— مشائخ رحمہم اللہ علیہم میں سے ایک بزرگ کہتے ہیں کہ یحتاجُ المصلّی اِلیٰ اربعۃِ اَشیاء فناء النفس، وَذھابُ الطبع وصفاء السّرِ وکمال المشاھدۃ۔ (نمازی کو چار چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے نفس کا فناء ہونا طبیعت کا معدوم ہو جانا۔ باطن کا پاک ہونا اور مشاہدہ کا کامل ہونا)

نماز ادا کرنے والے کے لئے فنائے نفس کے بغیر چارہ نہیں، اور یہ ارادے کو ایک پہلو پر مجتمع کئے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ جب ارادہ مجتمع ہو جائے تو نفس کا غلبہ ختم ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ نفس کا وجود تفرقہ میں سے ہے جو عبادت کے تحت نہیں آتا۔ اور طبیعت کا معدوم ہونا، جلال الٰہی کے اثبات کے بغیر حاصل نہیں ہوتا کیوں کہ جلالِ حق غیر کے لئے باعثِ زوال ہوتا ہے۔ اور باطن کی صفائی محبتِ خداوندی کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اور مشاہدہ کا کمال باطن کی صفائی کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ اور روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ حضرت حسین بن منصور نے دن رات میں چار سو رکعت نماز اپنے اوپر لازم کر رکھی تھی۔ لوگوں نے عرض کیا کہ آپ تو بلند درجہ پر پہنچے ہوئے ہیں پھر یہ سب تکلیفیں کیوں برداشت کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا "یہ تمام تکلیفیں اور راحتیں تو تمہارے اپنے حال میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اولیاء اللہ جو فانی الصفت ہوتے ہیں نہ اُن پر کوئی تکلیف اثر کرتی ہے اور نہ راحت دیکھنا کہیں ایسا نہ ہو کہ تم سستی کا نام پہنچا ہوا ہونا اور لالچ کا نام طلب حق نہ رکھ لو"! ایک صاحب بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ذوالنون رحمۃ اللہ کے پیچھے ایک نماز ادا کی جب آپ نے تکبیر اولیٰ کہتے ہوئے "اللہ اکبر" کہا تو یوں بیہوش ہو کر گر پڑے کہ گویا آپ کے جسم میں احساس تک باقی نہیں رہا۔۔۔ حضرت جنیدؒ نے بڑھاپے میں بھی اپنی جوانی کے وظائف و اوراد میں سے کوئی ورد، وظیفہ چھوڑا نہیں۔ لوگوں نے عرض کی "اے شیخ! آپ ضعیف ہو گئے ہیں، ان نوافل میں سے کچھ سے دستبردار ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا: یہ وہ چیزیں ہیں کہ ابتدائے طریقت میں میں نے جو کچھ پایا ہے انہی کی بدولت پایا ہے تو اب انتہائے تصوف میں ان سے دست بردار ہو جاؤں یہ محال ہے۔۔۔۔ مشہور ہے کہ فرشتے ہر وقت عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ اطاعتِ الٰہی اُن کا پانی اور عبادت ان کا کھانا ہے اس لئے کہ وہ روحانی ہیں اُن میں نفسِ سرکش موجود نہیں۔ جب کہ بندے کو اطاعت سے یہ نفسِ امارہ ہی روکتا ہے، یہ نفس جتنا مغلوب ہوتا ہے بندگی اُتنی ہی زیادہ آسان ہو جاتی ہے اور جب نفس بالکل فنا ہو جاتا ہے فرشتوں کی طرح عبادت ہی اس بندے کی غذا اور پانی بن جاتی ہے بشرطیکہ یہ فنائے نفس صحیح طریقہ سے ہو۔۔۔۔

——حضرت عبداللہ بن مبارکؒ بیان کرتے ہیں کہ بچپن میں میں نے ایک عبادت گزار خاتون کو دیکھا مجھے اب بھی یاد ہے کہ نماز کی حالت میں ایک بچھو نے اُسے چالیس جگہ پر زخم کیا لیکن اس عابدہ عورت میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئی تو میں نے اس سے کہا "اے اماں! آپ نے اُس بچھو کو اپنے آپ سے دُور کیوں نہ کیا؟ تو اس نے کہا "بیٹے! تم ابھی بچے ہو! میرے لئے یہ کس طرح درست تھا کہ حق تعالےٰ کے کام کے دوران میں اپنا کوئی کام کرتی"—— حضرت ابوالخیر اقطع رحمۃ اللہ تعالےٰ کے پاؤں میں گوشت خورہ کی بیماری لگ گئی۔ طبیبوں نے کہا کہ اس پاؤں کو کاٹ دینا چاہیئے! لیکن آپ کسی طرح راضی نہ ہوتے تھے۔ مریدوں نے کہا "نماز کی حالت میں ان کا یہ پاؤں کاٹ دیا جائے کیوں کہ نماز میں انہیں کچھ خبر نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو پاؤں کٹا ہوا پایا——

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ آپ رات کی نماز میں قرأت دھیمی آواز سے کرتے تھے جب کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بلند آواز سے قرأت کرتے تھے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا اے ابوبکرؓ نرم آواز سے تلاوت کیوں کرتے ہو؟ تو انہوں نے جواب دیا۔ "السمیع من اناجیہ" (جس سے میں مناجات کرتا ہوں وہ تو سنتا ہے، یعنی جو کچھ میں کہتا ہوں وہ آہستہ کہوں یا بلند۔ وہ تو ہر حالت میں سنتا ہے پھر پیغمبر علیہ السلام نے حضرت عمرؓ سے دریافت کیا "تم بلند آواز سے کیوں قرأت کرتے ہو؟ تو انھوں نے عرض کی "اوقظ الوسنان واطرد الشیطان" (میں سوئے ہوؤں کو جگاتا اور شیطان کو بھگاتا ہوں)، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے ابوبکر! تم ذرا بلند پڑھا کرو اور اے عمر تم ذرا آہستہ تلاوت کیا کرو! تاکہ عادت ترک ہو جائے۔

پس بعض صوفیہ تو فرائض کھلے عام ادا کرتے ہیں لیکن نوافل خلوت میں ادا کرتے ہیں اور اس طریقہ سے اُن کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ ریاکاری سے چھوٹے رہیں کیوں کہ جب کوئی شخص معاملات میں ریاکاری سے کام لیتا ہے اور لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتا ہے تو وہ ریاکار بن جاتا ہے، چنانچہ یہ حضرات کہتے ہیں کہ اگرچہ معاملات کو ہم نہیں دیکھتے

لیکن لوگ تو دیکھتے ہیں اور یہ بھی دکھلاوا ہی ہے اور صوفیہ کا ایک دوسرا طبقہ فرائض کے علاوہ نوافل بھی کھلے طور پر ادا کرتا ہے۔ اور وہ حضرات کہتے ہیں کہ ریا تو باطل ہے اور عبادت حق ہے۔ ہم ایک باطل کے لئے حق کو چھپائیں یہ نہیں ہوسکتا، پس ریا کو دل سے نکال دینا چاہئیے پھر جہاں تم چاہو عبادت کرلو!۔ مشائخ صوفیہ رحمہم نے خود بھی نماز کے حقوق اور آداب کو ملحوظ رکھا اور مریدوں کو بھی اس کا حکم دیا۔ چنانچہ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں چالیس سال تک سفر میں رہا۔ اور اس دوران میں نے ایک نماز بھی جماعت کے بغیر نہیں پڑھی اور ہر جمعہ کو میں ایک دوسرے گاؤں میں ہوتا تھا"۔ نماز کے تمام احکام اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ اُن تمام کو بیان کیا جائے تاہم مقامات میں سے جو چیز نماز سے وابستہ ہے وہ محبت الٰہی ہے۔ اب ہم انشاءاللہ اس کے جملہ احکام کو بیان کریں گے۔

باب

محبّت اور اُس کے متعلقات

اللہ عزوجل فرماتے ہیں "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ" (اے ایمان والو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے (تو) پس عنقریب اللہ تعالیٰ ایسی قوم پیدا کریں گے جس سے وہ محبت کرے گا اور وہ اللہ سے محبت کریں گے) اور نیز فرمایا "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَنْدَادًا یُّحِبُّوْنَھُمْ کَحُبِّ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ" (اور لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو اللہ کے علاوہ دوسروں کو اُس کا شریک بناتے ہوئے اُن سے اس طرح محبت کرتے ہیں جیسے اللہ سے کرنی چاہیئے اور جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ کے ساتھ محبت میں بڑے سخت ہیں) اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے جبرئیلؑ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ "مَنْ اَھَانَ لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ بَارَزَنِیْ بِالْمُحَارَبَۃِ مَا تَرَدَّدْتُ فِیْ شَیْءٍ کَتَرَدُّدِیْ فِیْ قَبْضِ نَفْسِ عَبْدِ الْمُؤْمِنِ مَنْ یَّکْرَہُ الْمَوْتَ وَاَکْرَہُ مَسَاءَتَہٗ وَلَا بُدَّ لَہٗ مِنْہُ وَمَا یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّہٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُہٗ کُنْتُ لَہٗ سَمْعًا وَّبَصَرًا وَّیَدًا وَّرِجْلًا وَّلِسَانًا" (الحدیث) جس نے میرے ولی کی توہین کی اُس نے میرے ساتھ جنگ کا اعلان کیا۔ مجھے کسی چیز میں اتنا تردد نہیں ہوتا جتنا کہ ایک بندہ مومن کی روح قبض کرنے میں، وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں اُس کو تکلیف دینا پسند نہیں کرتا حالاں کہ موت سے اُسے چارہ نہیں، میرا کوئی بندہ جن اعمال سے میرا قرب حاصل کرتا ہے اُن میں سے زیادہ پسندیدہ وہ احکام ہیں جو میں نے اُس پر فرض کئے ہیں۔ اور میرا بندہ نفلی عبادات کے ذریعہ میرے قریب ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ میں اُس سے محبت کرنے لگتا ہوں پھر جب میں اُس سے محبت کر لیتا ہوں تو میں خود ہی اُس کے کان، آنکھ، پاؤں اور زبان ہو جاتا

ہوں) نیز حضور علیہ السلام نے فرمایا "مَنْ اَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰہِ اَحَبَّ اللّٰہُ وَمَنْ کَرِہَ لِقَاءَ اللّٰہِ کَرِہَ اللّٰہُ لِقَاءَہٗ" (جو شخص اللہ سے ملاقات کرنا پسند کرتا ہے اللہ بھی اس سے ملنا پسند کرتے ہیں اور جو شخص اللہ سے ملنا ناپسند کرتا ہے اللہ بھی اس سے ملاقات کرنا پسند نہیں کرتے) نیز فرمایا: اِذَا اَحَبَّ اللّٰہُ عَبْدًا قَالَ لِجِبْرِیْلَ یَا جِبْرِیْلُ اِنِّیْ اُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبَّہٗ فَیُحِبُّہٗ جِبْرَائِیْلُ ثُمَّ یَقُوْلُ جِبْرَائِیْلُ لِاَھْلِ السَّمٰوٰتِ اللّٰہُ تَعَالٰی قَدْ اَحَبَّ فُلَانًا فَاَحِبُّوْہُ فَیُحِبُّہٗ اَھْلُ السَّمَاءِ ثُمَّ یَضَعُ لَہُ الْقَبُوْلَ فِی الْاَرْضِ فَیُحِبُّہٗ اَھْلُ الْاَرْضِ۔ وَفِیْ بَعْضِ الرِّوَایَاتِ مِثْلُ ذٰلِکَ"۔ (اللہ تعالیٰ جب اپنے کسی بندے کو دوست بنا لیتے ہیں تو جبرئیل سے فرماتے ہیں اے جبرئیل! میں فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں تو اُس کو دوست رکھ۔ پس جبرئیل بھی اُس سے دوستی کرنے لگتے ہیں۔ پھر جبرئیل آسمان والوں سے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے محبت کرتے ہیں۔ سو آسمان والے بھی اُسے دوست بنا لیتے ہیں۔ پھر زمین میں اُس کے لئے قبولیت رکھ دی جاتی ہے چنانچہ زمین والے بھی اُس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ اور بعض روایات میں ہے کہ زمین والے بھی آسمان والوں کی طرح محبت کرنے لگتے ہیں)

اور جان لو کہ حق تعالیٰ کی محبت بندے کے ساتھ اور بندہ کی محبت حق تعالیٰ کے ساتھ دونوں درست ہیں، کتاب و سنّت میں اس کا بیان ہے اور پوری اُمت کا اس پر اجماع ہے۔ اور خداوند تعالیٰ ایسے اوصاف کے مالک ہیں، کہ اولیاء اُس کو دوست رکھتے ہیں اور وہ اپنے دوستوں کو دوست رکھتا ہے۔ لغت کے اعتبار سے کہتے ہیں کہ محبت "حِبۃٌ" (حاء کی زیر) سے ماخوذ ہے اور یہ اس بیج کو کہتے ہیں جو صحراء میں زمین پر پڑتا ہے پس محبت کا نام حب رکھ دیا گیا کیوں کہ زندگی کی اصل یہی ہے جس طرح کہ نباتات کی اصل بیج ہیں۔ جس طرح بیج صحراء میں بکھرتے ہیں پھر وہ مٹی میں چھپ جاتے ہیں۔ اس پر بارشیں ہوتی ہیں۔ سورج اُس پر چمکتا رہتا ہے، سردی اور گرمی کے موسم اُس پر گزرتے ہیں اور وہ زمانوں کے بدلنے سے متغیر نہیں ہوتا لیکن جب اس کا وقت آجاتا ہے تو وہ پیدا ہو جاتا ہے اور

پھول اور پھل لاتا ہے، اسی طرح جب محبت کسی دل میں ٹھکانہ بنا لیتی ہے تو حضور وغیبت آزمائش ومحنت، راحت ولذت اور فراق وصل کسی حالت میں متغیر نہیں ہوتی ایک شاعر نے اس کو یوں بیان کیا ہے۔

یَا مَنْ سَقَامُ جُفُوْنِہٖ لِسِقَامِ عَاشِقِہٖ طَبِیْبٌ

حارثُ المودة فاستوی عندی حضورك والمغیبُ

اے وہ شخص جس کی پلکوں کی بیماری اپنے عاشق کی بیماریوں کے لئے طبیب ہے اس نے میرے دل میں محبت کا بیج بو دیا ہے، پس میرے لئے تیرا حاضر ہونا یا غائب ہونا برابر ہے)

اہل لغت یہ بھی کہتے ہیں کہ محبت اُس حَبّ سے ماخوذ ہے جو اُس گڑھے کے معنی میں ہے جس میں پانی بہت زیادہ ہو، اور وہ پھیلا ہوا ہو کہ نگاہ کو اُس میں گزر نہ ہوا اور وہ اُس کے لئے روکنے والا ہو کہ اسی طرح محبت جب کسی طالب کے دل میں جمع ہو جاتی اور اُس کے دل کو اپنے وجود سے بھر دیتی ہے تو پھر دوست کی بات کے علاوہ اس کے دل میں کسی چیز کے لئے گنجائش نہیں رہتی۔ چنانچہ حق تعالےٰ نے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دوستی کی خلعت سے نوازا اور وہ حق تعالےٰ کی بات کے سوا ہر چیز سے کنارہ کش ہو گئے تو یہ جہان اور جہان والے اُن کے لئے حجاب بن گئے اور وہ حق تعالےٰ کی دوستی میں ان حجابوں کے دشمن بن گئے۔ اُن کی اس حالت اور گفتگو کو حق تعالےٰ نے ہمارے لئے بیان کیا کہ انھوں نے کہا" فانھم عدوّ لی اِلّا ربّ العالمین (رب العالمین کے علاوہ وہ سب میرے دشمن ہیں) اور اسی معنی میں حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا۔" سُمّیتِ المحبة لانھا تمحو من القلب ماسوی المحبوب " (اس کا نام محبت رکھا گیا ہے کیوں کہ یہ دل سے محبوب کے سوا ہر چیز کو مٹا دیتی ہے) نیز اہل لغت یہ بھی کہتے ہیں کہ حب اُس چارچوبہ کو کہتے ہیں جو چار لکڑیاں جوڑ کر کوزہ رکھنے کے لئے بنایا جاتا ہے، اس لئے محبت کو حب کہتے ہیں کہ محب، عزت وذلت، خوشی وغم، آزمائش ومحنت اور دوست کی جفا ووفا، ہر چیز کو برداشت کرتا ہے اور یہ چیزیں اس پر گراں نہیں گزرتیں کیوں کہ جس طرح اُس چارچوبہ کا کام ہی بوجھ اٹھانا ہے اسی طرح اس محب کا کام بھی ان چیزوں کو برداشت کرنا ہے۔ پس محب کی تخلیق اور ترکیب ہی دوست کا بوجھ برداشت

کرنے کے لئے کی گئی ہے۔ اسی معنی میں شاعر کہتا ہے۔

اِنْ شئتِ جُودی وَاِنْ شئتِ فامتنعِی

کلاھُما منکِ منسوبٌ الی الکرمِ

(اے محبوبہ چاہے تو سخاوت کر اور چاہے روک لے۔ تیری یہ دونوں ادائیں تیرے کرم کی طرف ہی منسوب ہوں گی)

نیز یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ حب سے ماخوذ ہے جو حبہ کی جمع ہے اور یہ دل کے درمیانی نقطہ کو کہتے ہیں۔ جبہ دل۔ محل لطیفت ہے اور دل کا تمام انتظام اسی کے ساتھ وابستہ ہے۔ نیز محبت کا محل بھی یہی جگہ ہے پس محبت کو اس کے محل کے نام سے موسوم کر دیا کیوں کہ اس کا قرار اسی حبہ دل میں ہوتا ہے اور عرب والے کسی چیز کو اُس کے محل کے نام سے موسوم کرتے رہتے ہیں۔ نیز یہ بھی کہتے ہیں کہ محبت۔ "حباب الماء وَ غلیانہ عند المطر الشدید" سے ماخوذ ہے اور وہ اُس گہرے پانی کو کہتے ہیں جو شدید بارش کے وقت جوش کرتا ہے۔ پس محبت کا نام حب رکھ دیا کیوں کہ محبت بھی دل کے اُس جوش کا ہی نام ہے جو محبوب کی ملاقات کے اشتیاق کے وقت پیدا ہوتا ہے دوست کا دل اپنے دوست کے شوقِ دیدار میں مضطرب اور بیقرار رہتا ہے جس طرح کہ جسم اور روح کے مشتاق ہوتے ہیں۔ اور جس طرح جسموں کا قیام روح کے ساتھ وابستہ ہے اسی طرح نقطۂ دل کا قیام بھی محبت کے ساتھ وابستہ ہے اور محبت کا قیام محبوب کے وصل اور دیدار کے ساتھ وابستہ ہے۔ اسی معنی میں شاعر کہتا ہے کہ

اِذا تمنی الناس روحًا وّراحۃ

تمنیتُ ان القاک تعرف حالیا

جب لوگ آرام اور راحت کی آرزو کرتے ہیں تو میں تیری ملاقات کی تمنا کرتا ہوں تاکہ میری حالت تجھ پر واضح ہو۔

اور بعض اہل لغت کہتے ہیں کہ حب نام ہے محبت کی صفائی کا۔ کیوں کہ عرب لوگ انسانی آنکھ کی سفیدی کے خوب اُجلے پن کو "حبۃ الانسان" کہتے ہیں۔ جس طرح کہ دل کے سیاہ درمیانی

نقطے کی صفائی کو حبۃ القلب کہتے ہیں۔ پس یہ ایک (دل) محبت کا محل ہے اور وہ دوسرا (آنکھ) محلِ دیدار۔ اسی لئے تو دل و دیدہ۔ دوستی میں متصل ہی ہوتے ہیں، اس معنی میں شاعر کہتا ہے کہ

۵ القلب یحسد عینی لذت النظر والعین یحسد قلبی لذۃ الفکر

میرا دل، میری آنکھ سے حسد کرتا ہے کہ اُس نے دیدار محبوب کی لذت پائی ہے اور میری آنکھ میرے دل سے حسد کرتی ہے کہ اُسے محبوب کے بارے میں فکر کی لذت حاصل ہے۔

فصل

جان لو کہ محبت کا لفظ علماء کے ہاں تین طرح استعمال ہوا ہے۔ ایک اس معنی میں کہ نفس کے اضطراب، میلان، خواہش اور دل کی تمنا و طلب اُس کے ساتھ محبوب کی طرف ارادہ کرے، لیکن ان تمام امور کو حق تعالٰے کے ساتھ متعلق نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ یہ تمام باتیں مخلوقات کے ایک دوسرے کے ساتھ اور ایک جنس کے دوسرے جنس کے ساتھ تعلق میں درست ہوتی ہیں جب کہ خداوند تعالٰی ان سب سے مستغنی اور بہت زیادہ بلند و برتر ہے، محبت کا دوسرا معنی، احسان اور بندہ کو اپنی عنایات کے لیے خاص کر لینے کا ہے کہ حق تعالٰے اُس کو برگزیدہ کر کے ولایت کے درجۂ کمال تک پہنچا دیتے ہیں اور اُس کو طرح طرح کی عزتوں سے مخصوص کر دیتے ہیں۔ اور محبت کا تیسرا استعمال بندے پر اچھی حمد و ثنا کرنے کے معنی میں ہوتا ہے۔ متکلمین کا ایک گروہ کہتا ہے کہ حق تعالٰے کی جس محبت کی ہمیں خبر دی گئی ہے وہ حق تعالٰی کی سماعی صفات میں سے ایک صفت ہے جیسا کہ حق تعالٰے کے لئے آنکھ، چہرہ اور سیدھے ہو کر بیٹھنے کی صفات ہیں کہ اگر کتاب و سنت نے ہمارے سامنے بیان نہ کی ہوتیں تو حق تعالٰی کی ذات کے لئے ان کا اثبات از روئے عقل محال ہوتا پس ہم اسی طرح کی محبت کا اثبات کرتے ہیں اور اسی کو بیان کرتے ہیں لیکن اس کے استعمال میں توقف کرتے ہیں۔ اور گروہِ صوفیہ کی مراد یہ ہے کہ اس لفظِ محبت کا حق تعالٰے کے لئے اطلاق کرنا درست نہیں سمجھتے اور انہی کے یہ تمام اقوال تھے جو ہم نے ابھی بیان کر دئے

اور میں انشاء اللہ تیرے سے لئے اس کی حقیقت کو بیان کروں گا۔

جان لو کہ بندہ کے لئے حق تعالےٰ کی محبت کے معنی یہ ہیں کہ وہ بندے کے لئے بھلائی کا ارادہ کرے اور اُس پر اپنی رحمت کا اظہار کرے، اور جس طرح رضا و سخط رحمت و رأفت اور دوسرے نام حق تعالےٰ کے ارادے سے متعلق ہیں اسی طرح محبت بھی ارادے کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور ان ناموں کو حق تعالےٰ کے ارادے کے علاوہ کسی چیز پر محمول نہیں کرنا چاہئے۔ اور یہ ارادہ حق تعالےٰ کی ایک قدیم صفت ہے کہ وہ اس کے ذریعے اپنے افعال کو پورا کرتا ہے، پس مبالغے اور فعل کے اظہار میں ان صفات میں سے بعض صفتیں بعض سے زیادہ خاص ہیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ بندہ کے ساتھ حق تعالےٰ کی محبت اس چیز کا نام ہے کہ وہ اس پر بہت زیادہ نعمتیں نازل کرے اس کو دنیا و آخرت میں ثواب مرحمت کرے اس کو سزا کے محل سے بچاتے رکھے گناہوں سے اُسے محفوظ رکھے، اس کو بلند احوال اور اعلےٰ مقامات سے مشرف کرے اس کے باطن کو غیروں کی توجہ سے ہٹا دے اور اپنی ازلی عنائتوں کو اُس کے ساتھ وابستہ کر دے تا کہ وہ سب سے کنارہ کش ہو جائے اور صرف حق تعالےٰ کی رضا جوئی کے لئے تنہا رہ جائے چنانچہ حق تعالیٰ جب بندے کو ان معانی کے ساتھ مخصوص کر دیتے ہیں تو ان کے ارادے کی اس تخصیص کا نام محبت رکھتے ہیں۔ یہ مذہب حضرات حارث محاسبی۔ جنید بغدادی اور مشائخ رحمہم اللہ کی ایک جماعت کا ہے جب کہ فقہاء کی دونوں جماعتوں اور متکلمین اہل سنت کی اکثریت کا مسلک بھی یہی ہے ۔۔ اور جو یہ کہتے ہیں کہ حق تعالےٰ کی محبت، بندہ پر اُس کی ثناء جمیل کا نام ہے تو یہ درست نہیں کیوں کہ حق تعالےٰ کی تعریف تو اُس کا کلام ہی ہوگی اور اس کا کلام، قدیم اور غیر مخلوق ہے تو پھر غیر مخلوق کا مخلوق کے ساتھ تعلق کس طرح صحیح ہو سکے گا۔ اور جو کہتے ہیں کہ محبت بمعنی احسان ہے تو اُس کا احسان خود اُس کا اپنا ہی فعل ہوگا اور یہ معنی کے اعتبار سے زیادہ قریب ہے باقی بندہ کی محبت حق تعالےٰ کے ساتھ تو یہ ایک صفت ہے جو تعظیم اور تکبیر کے طور پر ایک فرمانبردار بندے کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے تا کہ وہ اپنے محبوب کی خوشنودی طلب کرے اور خواہش دیدار میں ہر چیز سے بے خبر ہو جائے

اور اُس کی قربت کی آرزو میں بیقرار ہو جائے کہ محبوب کے علاوہ کسی چیز سے اُسے قرار نصیب نہ ہو۔ اور اُس کی یاد کو اپنی عادت بنا لے اس طرح کہ اس کے علاوہ ہر کسی کے ذکر سے بیزار ہو جائے۔ آرام اُس پر حرام ہو جائے اور قرار اُس سے بھاگ جائے۔ اور دنیا کی تمام دلچسپیوں اور مرغوبات سے منقطع ہو جائے اور خواہشات سے اعراض کرے اور غلبہ دوستی کی طرف متوجہ ہو جائے اور محبوب کے حکم کے سامنے اپنی گردن جھکا دے اور حق تعالےٰ کو اُس کی صفاتِ کمالیہ سے پہچانے۔ اور یہ جائز نہیں کہ اُس کے لئے خالق کی محبت اس طرح ہو جس طرح مخلوق کی ایک دوسرے کے ساتھ محبت ہوتی ہے کیوں کہ یہ تو محبوب کو پالینے اور اس کا احاطہ کر لینے کی رغبت کا نام ہے اور یہ اجسام کی صفت ہے۔ پس محبانِ حق تعالےٰ اُس کے قرب میں ہلاکت کے طالب ہوتے ہیں نہ کہ اس کی کیفیت کے طلب گار کیوں کہ طالب اپنی ذات کے ساتھ قائم ہوتا ہے جب کہ ہلاکت چاہنے والا اپنے محبوب کے ساتھ قائم ہوتا ہے اور معرکہ گاہِ محبت میں سب سے زیادہ پسندیدہ محب وہ ہوتے ہیں جو کُشتہ تیغ محبت اور محبت کے ہاتھوں مغلوب ہوں کیوں کہ کسی حادث کے لئے ذاتِ قدیم کے ساتھ توصل، قدیم کے غلبہ کے ساتھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور جو شخص محبت کی اصل حقیقت کو معلوم کر لے اُس کے لئے کوئی ابہام باقی نہیں رہتا، مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں اور تمام شبہات دور ہو جاتے ہیں — پس محبت کی دو قسمیں ہیں، ایک یہ کہ جنس کی ہمجنس کے ساتھ محبت ہو اور یہ نفس کا جھکاؤ اور خواہش ہے اور محبوب کے ساتھ جسمانی طور پر ملنے اور چمٹ جانے کا نام ہے۔ اور دوسری محبت کسی جنس کی اپنی غیر جنس کے ساتھ۔ اور یہ محبت بڑی جدوجہد کا تقاضہ کرتی ہے تاکہ محب اپنے محبوب کی صفات میں سے کسی صفت کے ساتھ آرام پائے اور اُس سے اُنس کرے مثلاً کانوں کو محبوب کے کلام سے اور آنکھوں کو محبوب کے دیدار سے ہی آرام نصیب ہوتا ہو۔ پھر محبت کرنے والے جو حق تعالےٰ کی محبت کے گرویدہ ہوں وہ بھی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ پہلے وہ لوگ جو حق تعالےٰ کے احسان و انعام کو اپنے اوپر دیکھتے ہیں اور یوں انعام و احسان کا دیکھنا اُن کے لئے منعم اور محسن کے ساتھ محبت کا تقاضہ کرتا ہے۔ اور دوسرے وہ حضرات جو تمام انعامات کو غلبۂ

دوستی کی وجہ سے محل حجاب میں رکھتے ہیں اور ان کی راہ انعامات کی رویت سے منعم حقیقی کی طرف ہوتی ہے اور یہ راہ پہلے قسم کے لوگوں کے طریق سے بہت عالی اور بلند مرتبہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فصل:-

غرضیکہ محبت ایک ایسا لفظ ہے جو مخلوق کی تمام اصناف میں معروف تمام زبانوں میں مشہور اور تمام لغات میں مرّوج ہے اور عقلمند لوگوں کی کسی صنف نے بھی اس کو اپنے آپ سے مخفی رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ مشائخ صوفیہ میں سے حضرت سمنون المحب رحمۃ اللہ علیہ محبت کے معاملے میں ایک خاص مشرب رکھتے ہیں کہ راہِ حق تعالےٰ کی اصل اور بنیاد محبت ہے اور احوال و مقامات اس کی منزلیں ہیں اور طالب جس منزل اور مقام میں بھی ہو۔ اُس پر زوال ممکن ہے لیکن خداوند تعالےٰ کی ذات کے ساتھ محبت ایک ایسی نعمت ہے کہ جب تک یہ قائم رہے کسی حال میں بھی اس پر زوال روا نہیں۔ اور دوسرے مشائخ اس معنی میں تو آپ کے ساتھ موافقت کرتے ہیں لیکن اس وجہ سے کہ یہ ایک عام ہے اور ظاہر اسم ہے وہ چاہتے ہیں کہ اس معنی کا حکم مخلوق کے درمیان پوشیدہ رکھیں اور اس کے معنی کو اپنے مقام پر قائم رکھتے ہوئے اس کے نام کو بدل دیں پس انھوں نے خالص محبت کا نام صفوت رکھ دیا اور محب کو صوفی کا نام دے دیا اور ایک گروہ نے محبوب کے اختیار کو ثابت کرنے اور محب کے اپنے اختیار کو ترک کر دینے کا نام فقر رکھ دیا اور محبِ الٰہی کو فقیر کا نام دے دیا کیوں کہ محبت میں کم سے کم درجہ محبوب کے ساتھ موافقت ہوتا ہے اور محبوب کی موافقت اور اس کی محبت محبوب کی مخالفت کا غیر ہوتی ہے۔ میں کتاب کی ابتداء میں فقر و صفوت کا حکم کھول کر بیان کر چکا ہوں۔ اور اس معنی میں وہ بزرگ پیر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ "الحُبُّ عند الزھادِ اظھر من الاجتہاد" (زاہدوں کے ہاں محبت، اجتہاد سے زیادہ ظاہر چیز ہے) وعند التائبین اَوْجَبُ من انینِ وَحنینٍ" (اور اہل توبہ کے ہاں نالہ و فغاں سے زیادہ پائی جاتی ہے) وَعند الاتراکِ اشھَرُ من الفراكِ" (اور ترکوں کے نزدیک اُن کی سواری کے اسباب سے زیادہ

مشہور ہے" وصیتی الحب عند الھنود اظھر من جبیہ المحمود" اور ہندوؤں کے نزدیک محبت کا غلام بننا محمود کا غلام بننے سے زیادہ ظاہر ہے" و قصتی الحب ثا الحبیب عند الروم اشھر من الصلیب" اور رومی عیسائیوں کے ہاں محبت اور محبوب کا قصہ صلیب سے بھی زیادہ مشہور ہے" وقصتہ الحب فی العرب ادب ذی کلِّ حبی منہ لحوب او ویل و ھرب او حزن" اور محبت کا قصہ عرب کے ہر جاندار میں ایک ادب ہے، خوشی کی حالت ہو یا غم کی اور جنگ کی صورت ہو یا کچھ پانے اور کھونے کی، ان تمام اقوال سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کی کوئی جنس ایسی نہیں جس کو محبت کے ساتھ واسطہ نہ پڑا ہو کہ وہ اپنے دل میں محبت سے کشادگی اور خوشی میں محسوس نہ کرے یا اس کا دل شراب محبت سے مست اور یا غلبۂ محبت سے مخمور ہی نہ ہوا ہو۔ اس لئے کہ دل کی ترکیب ہی بیقراری اور اضطراب سے ہے اور دوستی میں عقل ایک شراب کا سمندر ہے اور دل کی زندگی کے لئے محبت بمنزلہ کھانے اور پینے کے ہے اور جو دل بھی محبت سے خالی ہے وہ خراب ہے اور اس محبت کو ہٹانے اور دور کرنے میں تکلف کا کوئی اختیار نہیں اور محبت کے جو لطائف دل پر گزرتے ہیں نفس اُن سے ہرگز آگاہ نہیں ہے۔

حضرت عمرو بن عثمان مکی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "محبت" میں کہتے ہیں کہ حق تعالےٰ نے دلوں کو جسموں سے سات ہزار سال قبل پیدا کیا اور اُن کو اپنے مقام قرب میں رکھا اور روحوں کو دلوں سے بھی سات ہزار سال قبل پیدا کیا اور اُن کو اپنے درجہ اُنس میں رکھا اور باطنوں کو روحوں سے بھی سات ہزار سال پہلے پیدا کیا اور اُن کو اپنے درجۂ وصل میں رکھا اور روزانہ تین سو ساٹھ مرتبہ اپنے جمال کو کھول کر باطنوں پر تجلی فرمائی اور تین سو ساٹھ مرتبہ کرامت کی نظر فرمائی۔ اور روحوں کو محبت کا کلمہ سنوایا اور دلوں پر تین سو ساٹھ لطیفہ ہائے محبت ظاہر کئے۔ حتیٰ کہ اِن سب نے جہان میں نگاہ کی تو کسی کو بھی اپنے آپ سے زیادہ باعزت نہ دیکھا یوں اُن کے اندر فخر اور غرور پیدا ہو گیا تو حق جل جلالہٗ نے اس وجہ سے اُن کو آزمائش میں مبتلا کیا اور باطن کو روح میں گرفتار کر دیا اور روح کو دل میں محسوس کر دیا اور دل کو جسم کے اندر قیدی بنا دیا پھر عقل کو ان کے اندر ترکیب عطا کی اور انبیاء کرام علیہم السلام کو

بھیجکر اپنے احکام اِن کو دیئے اس وقت اِن میں سے ہر ایک اپنے اُس مقام کا متلاشی ہو گیا۔ چنانچہ حق تعالےٰ نے نماز کا حکم دیا تو جسم نماز میں مشغول ہو گیا، دل محبت کے ساتھ پیوست ہو گیا۔ روح قربِ الٰہی میں پہنچ گئی اور باطن نے وصلِ الٰہی میں قرار پکڑ لیا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ محبت جیسی لطیف کیفیت کو الفاظ و عبارات میں بیان نہیں کیا جا سکتا اس لئے محبت کہ محبت ایک حال ہے اور حال ہرگز قال نہیں بن سکتا۔ اگر جہان والے محبت کو کھینچ کر اپنے اندر پیدا کرنا چاہیں تو ہرگز ایسا نہیں کر سکتے اور اگر بتکلف اس کو اپنے آپ سے دور کرنا چاہیں تو دور بھی نہیں کر سکتے کیوں کہ "حال" خدا تعالےٰ کی طرف سے ایک وہبی کیفیت ہوتی ہے نہ کہ کسبی! اور اگر تمام اہل جہاں اکٹھے ہو کر کسی محبت کے طلب گار شخص کے لئے محبت حاصل کرنا چاہیں تو وہ ہرگز نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اگر وہ سب مل کر کسی ایسے شخص سے اُسے دور کرنا چاہیں جو محبت کا اہل ہے تو وہ عاجز آ جائیں گے۔ کیوں کہ محبت عطیۂ خداوندی ہے اور انسان لہو و لعب کا مرتکب ہونے والا۔ اور لہو و لعب والا عطیۂ الٰہی کا ادراک نہیں کر سکتا۔ (واللہ اعلم)

فصل

تاہم عشق کے بارے میں مشائخ کا کلام طویل ہے چنانچہ صوفیہ میں سے ایک جماعت بندہ کی طرف سے حق تعالےٰ کے ساتھ عشق کو تو جائز سمجھتی ہے لیکن حق تعالےٰ کی طرف سے بندہ کے ساتھ عشق کو روا نہیں سمجھتی اُن کا کہنا ہے کہ عشق اپنے محبوب سے رُکنے کی صفت ہے اور بندہ تو حق تعالےٰ سے روکا گیا ہے لیکن حق تعالےٰ بندہ سے منع نہیں کئے گئے۔ پس بندہ پر تو عشق کا اطلاق جائز ہے لیکن حق تعالےٰ پر درست نہیں۔ پھر ایک اور گروہ کا کہنا ہے کہ بندہ کے لئے حق تعالےٰ پر عشق بھی جائز نہیں۔ کیوں کہ عشق نام ہے حد سے تجاوز کر جانے کا، جب کہ حق تعالےٰ لامحدود ہیں۔ پھر متاخرین صوفیہ کہتے ہیں کہ عشق دونوں جہان میں ذاتِ حق تعالےٰ کے ادراک کی طلب کے سوا کسی پر درست نہیں آتا اور حق تعالےٰ کی ذات تو احاطۂ ادراک میں آ ہی نہیں سکتی لہٰذا محبت کا اطلاق تو اس جگہ درست ہو سکتا ہے لیکن بندہ کے لئے حق تعالےٰ کے ساتھ عشق کا اطلاق درست نہیں ہونا چاہئیے!

نیز یہ حضرات کہتے ہیں کہ رویت اور دیدار کے بغیر عشق متصور نہیں ہو سکتا جب کہ محبت صرف سننے سے ہی ہو جانا درست ہے۔ لہٰذا جب عشق کا تعلق نظر کے ساتھ ہے تو یہ ذاتِ باری تعالیٰ پر درست نہیں ہو سکتا کیوں کہ دنیا میں کسی نے بھی حق تعالےٰ کو نہیں دیکھا۔ اور چونکہ حق تعالےٰ کے متعلق یہ خبر تھی کہ وہ ایسا ہے اس لئے ہر ایک نے اس کا دعویٰ کر لیا کیوں کہ خطاب میں تو سب برابر ہیں۔ پس حق تعالےٰ اپنی ذات میں مدرک اور محسوس نہیں ہیں کہ مخلوق کا اُن کے ساتھ عشق درست ہو سکے، البتہ جب وہ اپنے افعال وصفات کی وجہ سے اولیاء کرام کا محسن اور کرم فرما ہے تو اُس کی صفات کے ساتھ محبت، درست ہو گی، کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کو یوسف علیہ السلام کی محبت میں متغرق کر دیا گیا تو اُن کے فراق کی حالت میں ہی جب آپ نے اُن کے پیراھن کی بُو محسوس کی تو آپ کی آنکھیں روشن ہو گئیں اور بینائی لوٹ آئی لیکن زلیخا کو جب حضرت یوسف علیہ السلام کے عشق نے ہلاکت کی طلب گار بنا دیا تو جب تک اُسے وصل نصیب نہ ہوا اُسے آنکھیں دوبارہ نہ مل سکیں۔ یہ طریق بڑا ہی عجیب ہے کہ ایک تو خواہشات کی پرورش کرتا ہے اور دوسرا خواہشات کو چھوڑ دیتا ہے۔ نیز یہ بھی کہتے ہیں کہ عشق کی بھی کوئی ضد نہیں اور حق تعالےٰ کی بھی کوئی ضد نہیں اس لئے اس کا اطلاق ذاتِ باری پر روا ہونا چاہیئے اس مضمون میں لطائف بہت ہیں لیکن میں نے طوالت کے خوف سے اسی مقدار پر اکتفا کیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فصل:۔

محبت کی تحقیق میں مشائخ صوفیہ کے رموز شمار سے زیادہ ہیں۔ میں انشاء اللہ اُن کے اقوال میں سے اس کتاب میں تبرک کے طور پر چند اقوال پیش کرتا ہوں — اُستاد ابوالقاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ المحبۃ محو المحب بصفاتہٖ واثبات المحبوب بذاتہٖ (محب کے اپنی تمام صفات کو محو کرنے اور محبوب کی ذات کو ثابت کرنے کا نام محبت ہے) یعنی محبت وہ ہوتی ہے کہ محب اپنے محبوب حقیقی کی طلب میں اپنے جملہ اوصاف کی نفی کر دے اور ذاتِ حق تعالےٰ کا اثبات کرے۔ کیوں کہ جب محبوب

باقی اور محب فانی ہو گا تو دوستی کی غیرت کو محبوب کے بقاء کے ساتھ نفی کرے گا. تاکہ اُس کو مطلق غلبہ حاصل ہو جائے اور محب کی صفت کا فناء ذاتِ محبوب کے اثبات کے بغیر نہیں ہو سکتا، اور یہ جائز نہیں کہ محب اپنی صفات کے ساتھ قائم ہو کیوں کہ اگر وہ اپنی صفت کے ساتھ قائم ہو گا تو جمالِ محبوب سے بے نیاز ہو گا. البتہ جب وہ یہ سمجھتا ہو کہ اس کی زندگی جمالِ محبوب کے ساتھ وابستہ ہے تو اپنے اوصاف کے اثبات کی نفی کا ضرور طالب ہو گا کیوں کہ اُسے معلوم ہو گا کہ وہ ایسی صفات کی وجہ سے محبوب سے حجاب میں ہے. پس دوست کی وجہ سے اپنے آپ کا دشمن ہو جائے گا۔ مشہور ہے کہ حضرت حسین بن منصور رحمۃ اللہ کو تختہ دار پر لٹکایا گیا تو اُن کا آخری جملہ یہ تھا کہ حُبُّ الواجد اقرار الواحِدْ (اللہ کی توحید کا اقرار ہی صاحبِ حال کی محبت ہے) محبت کے لئے یہی کافی ہے کہ اس کا وجود راہِ محبت میں قربانی ہو جائے اور ولائت نفس محبوب کے پانے اور اُس کی جستجو میں فنا ہو جائے ۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ "المحبۃ استقلال الکثیر من نفسِك واستکثار القلیلِ من حبیبك". (محبت یہ ہے کہ اپنے بہت سے کو تھوڑا سمجھے اور محبوب کے تھوڑے سے کو بھی بہت زیادہ سمجھے) اور اللہ تعالےٰ کا بندے کے ساتھ معاملہ یوں ہی ہے کہ دنیا کی تمام نعمتوں اور دنیا میں جو کچھ بندے کو دے رکھا ہے اُسے "بہت تھوڑا" کہا ہے چنانچہ فرمایا "قُل متاع الدنیا قلیلٌ" (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہہ دیں کہ دنیا کا متاع بہت تھوڑا ہے جو کچھ میں نے تمہیں دے رکھا ہے) لیکن اس تھوڑی عمر، تھوڑی سی جگہ اور قلیل سامان کی موجودگی میں اُن کے تھوڑے سے ذکر کو بہت کیا ہے کہ "والذٰکرین اللہ کثیراً والذٰکراتِ" (اور اللہ تعالےٰ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور بہت یاد کرنے والی عورتیں) تاکہ جہاں کی تمام مخلوق میں درست نہیں آتی۔ اس لئے کہ حق تعالےٰ کی طرف سے جو کچھ بھی بندہ کو نصیب ہوتا ہے اس میں کوئی چیز بھی تھوڑی نہیں لیکن مخلوق کی طرف سے جتنا بھی ہے وہ تھوڑا ہی ہے۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "المحبۃ معانقۃ الطاعاتِ ومُباینۃ المخالفاتِ" (محبت یہ ہے کہ محبوب کی اطاعتوں کے ساتھ تو بغلگیر ہو جائے اور

اور اُس کی مخالفتوں سے اعراض کرے، اور نافرمانیوں سے الگ ہو جائے۔ کیوں کہ جس آدمی کے دل میں محبت جتنی زیادہ مضبوط ہوتی ہے دوست کا حکم بجالانا اتنا ہی دوست پر آسان ہوتا ہے۔ اور یہ ملحدین کے اس گروہ کا اَمر ہے جو کہتے ہیں کہ بندہ دوستی میں اس درجے پر پہنچ جاتا ہے کہ اطاعت اُس سے اُٹھالی جاتی ہے حالانکہ یہ محض زندیقیت (بے دینی) ہے کیونکہ یہ بالکل محال امر ہے کہ عقل کے صحیح ہوتے ہوئے کسی بندہ سے احکام کے مکلف ہونے کا حکم ساقط ہو جائے۔ اس لئے کہ پوری امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت ہرگز منسوخ نہ ہوگی۔ اگر عقل کے درست ہوتے ہوئے کسی ایک شخص سے احکام کی تکلیف کا اُٹھ جانا درست اور جائز مان لیا جائے تو پھر تمام لوگوں سے اُٹھ جانا بھی جائز ہوگا جب کہ محض زندقہ (بے دینی) ہے البتہ مغلوب الحال اور بے ہوش آدمی کا حکم مختلف ہے اور اس کا عذر بھی دوسرا ہے، تاہم یہ روا ہے کہ حق تعالےٰ کسی بندے کو اپنی محبت میں اس مقام پر پہنچا دیں کہ اطاعت و فرمانبرداری کرنے میں جو رنج ہوتا ہے وہ اُس سے اُٹھالیں کیوں کہ کسی چیز کا رنج اس چیز کی محبت کی مقدار کے مطابق صورت اختیار کرتا ہے چنانچہ جس قدر محبت قوی ہوتی جائے گی فرمانبرداری کرنے کا رنج اُس پر آسان ہوتا چلا جائے گا۔ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حال میں بھی یہ معنی ظاہر ہے کہ جب حق تعالےٰ نے آپ کی زندگی کی قسم اٹھاتے ہوئے "لَعَمْرُكَ" کے الفاظ کہے تو آپ نے روز و شب اس قدر عبادت کرنا شروع کر دی کہ آپ تمام کاموں سے رُک گئے اور آپ کے پاؤں مبارک پر ورم آگیا یہاں تک کہ حق تعالےٰ نے فرمایا" طٰهٰ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى "(اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے آپ پر قرآن اس لئے تو نازل نہیں کیا کہ آپ مشقت میں مبتلا ہو جائیں) نیز یہ بھی جائز ہے کہ حکم بجالانے کی حالت میں کام کرنے کی فکر بندے سے اُٹھالی جائے۔ جیسا کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اِنَّهٗ لَيُغَانُ عَلٰى قَلْبِىْ وَاِنِّىْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِىْ كُلِّ يَوْمٍ سَبْعِيْنَ مَرَّةً" (بے شک میرے دل پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے اور میں اپنے اللہ سے روزانہ ستر مرتبہ اپنے کردار پر استغفار کرتا ہوں) اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آپ کو اور اپنے کردار کو نہیں دیکھتے تھے کہ اپنی اطاعت پر مغرور

ہو جائیں بلکہ حق تعالیٰ کے حکم کی تعظیم کو دیکھتے اور فرمایا کرتے تھے کہ "میرا یہ عمل بارگاہِ الٰہی کے سزاوار ہی نہیں" — حضرت سمنون محب رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ "ذھب المحبون للہ بشرف الدنیا والآخرۃ لِاَنَّ النبیّ صلّی اللہ علیہ وسلم قال المرءُ مع مَنْ اَحَبَّ" (اللہ عزوجل کے محب تو دنیا و آخرت کا شرف لے گئے کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہر انسان اُس کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ وہ محبت کرتا ہے) پس محبان حق دنیا اور آخرت میں حق تعالیٰ کے ساتھ ہوتے ہیں اور جس کے ساتھ حق تعالیٰ ہوں اُس سے غلطی نہیں ہوتی۔ پس دنیا کی بزرگی تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ اُن کے ساتھ ہوتے ہیں اور آخرت کا شرف یہ ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے ساتھ ہوں گے۔

حضرت یحییٰ بن معاذ الرازی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ "حقیقۃ المحبۃ لا ینقص بالجفاء ولا یزید بالبرّ والعطاء"۔ (سچی محبت نہ جفاء سے کم ہوتی ہے اور نہ ہی احسان و عطاء سے زیادہ ہوتی ہے) کیوں کہ یہ دونوں محبت میں سبب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور چیزوں کی ذات کی موجودگی میں اسباب معدوم ہوتے ہیں" اور دوست اپنے دوست کی آزمائش سے خوش ہوتے ہیں۔ اور جفاء و وفا دوستی کی راہ میں برابر ہوتے ہیں، جب محبت حاصل ہو تو وفاء مثل جفاء کے ہوتی ہے اور جفاء مثل وفاء کے ہوتی ہے — اور حکایات میں مشہور ہے کہ جب حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کو پاگل پنے کی تہمت میں پاگل خانے لے جایا گیا اور وہاں بند کر دیا گیا تو کچھ لوگ آپ کی زیارت کے لئے وہاں آئے آپ نے دریافت کیا مَنْ اَنتُم؟ (تم لوگ کون ہو؟) انہوں نے جواب دیا "احباؤک (ہم آپ کے دوست ہیں)" فرماھم بالحجارۃ فھربوا" (آپ نے اُن کو پتھر مارنے شروع کر دئے تو وہ بھاگ اُٹھے) تب آپ نے فرمایا۔ لوکنتم احبائی لما فررتم مِن بلائی فاصبروا مِنْ بلائی" (اگر تم لوگ میرے دوست ہوتے تو میری اس مصیبت سے ہرگز نہ بھاگتے کیوں کہ دوست تو دوستوں کی مصیبت سے بھاگا نہیں کرتے)۔ اس معاملہ میں گفتگو بہت زیادہ ہے تاہم میں اسی مقدار پر اکتفا کرتا ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

چھٹا کشفِ حجاب

زکوٰۃ کا بیان

اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ "وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ" (اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو) اسی طرح زکوٰۃ کے متعلق آیات اور احادیث بہت ہیں۔ اور ایمان کے فرض احکام میں زکوٰۃ ایک ہے اور یہ جس پر واجب ہوتی ہے اُس کے لئے اس سے اعراض ہرگز جائز نہیں۔ تاہم زکوٰۃ نعمت کے اتمام پر واجب ہوتی ہے مثلاً دو سو شرعی درہم کو یہ اُن پر نعمت پوری ہوتی ہے اگر مالکانہ حیثیت میں کسی کے تصرف میں ہوں (اور اُن پر ایک سال گزر جائے) تو اس پر پانچ درہم بطور زکوٰۃ واجب ہو جاتے ہیں۔ اور بیس دینار پر بھی نعمت پوری ہو جاتی ہے لہٰذا ان میں سے نصف دینار واجب ہو جاتا ہے نیز پانچ اونٹ بھی پوری نعمت ہیں لہٰذا ان پر ایک بکری بطور زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دوسرے اموال پر بھی زکوٰۃ ہوتی ہے۔ پھر جس طرح مال پر زکوٰۃ ہے۔ اسی طرح جاہ عزت پر بھی زکوٰۃ ہوتی ہے کیوں کہ یہ بھی تو ایک مکمل نعمت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ تعالیٰ فرض علیکم زکوٰۃ جاھِکُمْ کَمَا فرض علیکم زکوٰۃَ مَالِکُمْ (اللہ تعالےٰ نے تم پر تمہارے مرتبے کی زکوٰۃ اسی طرح فرض کی ہے جس طرح تم پر تمہارے مال کی زکوٰۃ فرض ہے) اور نیز فرمایا ہے کہ "اِنَّ لِکُلِّ شَیْءٍ زکوٰۃً وزکوٰۃ الدار بیت الضیافۃ"۔ (بے شک ہر چیز کی ایک زکوٰۃ ہے اور گھر کی زکوٰۃ مہمان خانہ ہے) اور زکوٰۃ کی حقیقت یہ ہے کہ نعمت پر خدا تعالےٰ کا شکر ادا کیا جائے، نعمت کی جنس میں سے تندرستی بھی بہت بڑی نعمت ہے اس لئے ہر عضو کی ایک زکوٰۃ ہوگی اور وہ یہ ہے کہ اپنے تمام اعضاء کو عبادت میں مشغول رکھیں اور کسی طرح کے لہو و لعب میں ان کو نہ لگائیں تاکہ نعمت کی زکوٰۃ کا حق ادا کر سکیں پھر باطنی نعمتوں کی بھی زکوٰۃ ہے لیکن اُن کی کثرت کی وجہ سے اُن کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اس میں بھی زکوٰۃ

ہے لیکن اُن کی کثرت کی وجہ سے ان کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اس میں بھی اپنی ذات میں ایک زکوٰۃ ہے اور وہ یہ ہے کہ ظاہری و باطنی نعمتوں کا پہچان لینا ہے —— بندہ جب یہ جان لیتا ہے کہ اُس پر حق تعالےٰ کی نعمتیں بیکراں ہیں۔ تو وہ شکر بھی بے حساب ہی کرتا ہے اور یہ بے حساب شکر ادا کرنا ہی بے حساب نعمتوں کی زکوٰۃ ادا کرنا ہے۔ بہر حال صوفیائے کرام کے نزدیک دنیا کی نعمت کی زکوٰۃ کوئی پسندیدہ چیز نہیں کیوں کہ انسان کے لئے بخل ایک ناپسندیدہ چیز ہے اور یہ کامل درجے کا بخل ہی تو ہے کہ کوئی شخص دو سو درہم اپنے قبضے میں جمع رکھے اور اُن کو ایک سال تک اپنے تصرف میں محبوس رکھے اور پھر اُن میں سے پانچ درہم کسی کو دے دے۔ پس جب مال کا خرچ کرنا اور سخاوت کا اپنا ہی اہل کرم کا طریق اور سیرت ہے تو پھر زکوٰۃ واجب ہی کس طرح ہو سکتی ہے — میں نے حکایات میں پایا ہے کہ علمائے ظاہر میں سے ایک نے آزمائش کے طور پر حضرت شبلیؒ سے زکوٰۃ کے متعلق دریافت کیا کہ کتنی ادا کرنی چاہیئے؟ آپ نے فرمایا جب بخل موجود ہو اور مال حاصل ہو تو ہر دو سو درہم میں سے پانچ درہم اور ہر بیس دینار میں سے نصف دینار زکوٰۃ ادا کرنا تمہارا مذہب ہے لیکن میرا مذہب یہ ہے کہ کوئی چیز بھی ملکیت میں نہیں ہونی چاہیئے تاکہ زکوٰۃ کے مشغلہ سے چھٹکارا ملا رہے" اس نے کہا "اس مسئلہ میں آپ کا امام کون ہے؟" آپ نے جواب دیا "حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو جو کچھ آپ کے پاس تھا راہِ خدا میں دے دیا اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے پوچھا کہ ما خلفت لعیالك" (گھر والوں کے لئے کیا چھوڑ آئے ہو؟) تو انہوں نے عرض کی "اللہ ورسولہٗ" (اللہ اور اس کا رسولؐ) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ آپ نے ایک قصیدے میں کہا:"

~ فما وجبت علیّ زکوٰۃ مالٍ
وھل تجب الزکوٰۃ علی الجواد

مجھ پر تو مال کی زکوٰۃ واجب ہی نہیں۔ اور کیا سخی آدمی پر زکوٰۃ واجب بھی ہوتی ہے؟ پس اہل کرم کا مال راہِ خدا میں خرچ ہو جاتا ہے اور وہ نہ تو مال میں بخیلی کرتے ہیں اور نہ ہی کسی

پر کوئی دعویٰ کیوں کر اُن کی ملکیت ہی نہیں ہوتی — باقی اگر کوئی جہالت کا ارتکاب کرتے ہوئے یہ کہے کہ جب میرے پاس مال ہی نہیں تو میں زکوٰۃ کے علم سے ہی مستغنی ہوں تو یہ محال ہے علم کا سیکھنا فرض ہے اور اپنے آپ کو علم سے مستغنی دکھانا کفرِ محض ہے اور اس دور کے فتنوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ صلاح و فقر کے مدعی لوگ جہالت کی وجہ سے علم کو ترک کر دیتے ہیں ۔ مصنفؒ کہتے ہیں کہ ایک وقت میں میں صوفیہ کی ایک مبتدی جماعت کے سامنے مسائل زکوٰۃ بیان کر رہا تھا کہ وہاں ایک جاہل شخص بھی آ گیا جب کہ میں اُس وقت اونٹوں کی زکوٰۃ کا باب بیان کر رہا تھا اور بنتِ لبون (اونٹ کا تین سالہ بچہ) اور بنتِ مخاض (دو سالہ اونٹ) اور حقہ (چار سالہ اونٹ) کا حکم ظاہر کر رہا تھا۔ اُس جہالت کے مرتکب کا دل ان باتوں کے سننے سے تنگ آ گیا اور یہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا کہ میرے پاس تو کوئی اونٹ ہی نہیں کہ بنتِ لبون وغیرہ کا علم میرے کسی کام آئے۔ میں نے کہا اے فلانے! جتنا کہ زکوٰۃ کے ادا کرنے کا علم ہونا چاہیئے اتنا ہی زکوٰۃ لینے کا علم بھی ہونا چاہیئے کہ اگر کوئی شخص تجھے بنت لبون دینا چاہے تو اُس وقت علم کے ترک کی وجہ سے بنت لبون بھی تجھے نہیں لینا چاہیئے! اور اگر کسی کے پاس مال نہ ہو بلکہ اُسے مال کی ضرورت بھی نہ ہو پھر بھی اُس سے علم کی فرضیت ساقط نہیں ہوتی۔ پس ہم جہالت سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

فصل :-

اور مشائخ صوفیہ میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے زکوٰۃ وصول کی ہے اور بعض وہ ہیں جنہوں نے زکوٰۃ نہیں لی۔ جن حضرات کا فقر اُن کا اپنا اختیار کردہ ہے انہوں نے زکوٰۃ نہیں لی کہ ہم مال جمع نہیں کرتے تاکہ زکوٰۃ نہ دینی پڑے اور اربابِ دنیا سے بھی نہیں لیتے تاکہ اُن کا ہاتھ اونچا اور ہمارا اُن سے نیچے نہ ہو — اور وہ حضرات جن کا فقر اضطراری ہے انہوں نے زکوٰۃ لی ہے لیکن اپنے فائدے کے لئے نہیں بلکہ انہوں نے یہ ارادہ کیا کہ اس طرح ایک مسلمان بھائی کی گردن کا بوجھ خود اٹھالیں۔ اور جب ان حضرات کی نیت یہ ہوئی تو اوپر والا ہاتھ بھی ان کا ہی ہوگا نہ کہ اہل دنیا کا۔ کیوں کہ اگر دینے والے کا ہاتھ یدِ علیا اور لینے والے کا ہاتھ یدِ سفلی ہی ہو تو حق تعالےٰ کے اس ارشاد کا معنی باطل ہو جائے گا کہ "ویاخذ الصدقات" (وہ

صدقات وصول کرتا ہے) اور پھر یہ ہونا چاہئیے تھا کہ زکوٰۃ دینے والا، زکوٰۃ لینے والے سے زیادہ افضل قرار پاتا۔ حالانکہ یہ اعتقاد بالکل گمراہی ہے۔ پس اوپر والا ہاتھ وہ ہوگا جو کسی چیز کے واجبی حکم کو اپنے مسلمان بھائی سے لے لے تاکہ اس کا بوجھ اپنی گردن پر اٹھالے۔ اور درویش لوگ اہلِ دنیا کی گردن سے بوجھ خود نہ اٹھالیں تو فرض حکم اس پر لازم موجود رہے اور وہ اس کی وجہ سے قیامت میں پکڑا جائے گا۔ پس حق تعالےٰ نے اہل عقبیٰ کا آسان طریقے سے امتحان لیا ہے تاکہ دنیا والے اُس فریضہ کا بوجھ اپنی گردن سے اتار سکیں۔ اور لامحالہ اوپر والا ہاتھ تو فقراد کا ہاتھ ہی ہوگا کہ وہ حق شریعت کے مطابق اپنا حق اُس شخص سے وصول کرتے ہیں جس پر حق تعالےٰ نے واجب کر رکھا ہے۔ اور اگر حشویہ فرقہ کے لوگوں کے بقول لینے والا ہاتھ یدِ سفلیٰ ہو جائے تو پیغمبروں کا ہاتھ بھی یدِ سفلیٰ ہونا چاہیئے۔ کیوں کہ انہوں نے بھی حق تعالےٰ کا حق بندوں سے وصول کیا ہے اور شرائط کے مطابق صحیح جگہ پر اُسے خرچ کیا ہے۔ ایسے لوگ غلطی پر ہیں اور وہ جانتے نہیں کہ پیغمبروں نے حکم الٰہی سے زکوٰۃ وصول کی ہے اور انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد دین کے پیشوا بھی اسی طریق پر رہے ہیں کہ انہوں نے بیت المال کا حق وصول کیا ہے۔ لہٰذا وہ شخص سخت غلطی پر ہے جو لینے والے ہاتھ کو یدِ سفلیٰ کہتا ہے اور زکوٰۃ دینے والے کو یدِ علیا جانتا ہے اور تصوف میں یہ دونوں چیزیں بڑی اہم اور بنیادی ہیں۔ چونکہ اس جگہ یہ مضمون باب الجود والسخاء کے ساتھ گہرا وابستہ ہے اس لئے میں ساتھ ہی اس کو بیان کئے دیتا ہوں۔ وباللّٰہِ التوفیق والعصمۃ۔

باب

جودوسخاوت کا بیان

حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "السخی قریبٌ من الجنۃِ وبعیدٌ من النارِ والبخیلُ قریبٌ من النارِ وبعیدٌ من الجنۃ۔" (سخی آدمی جنت کے قریب اور دوزخ سے دور ہے اور بخیل آدمی دوزخ کے قریب اور جنت سے دور ہے) علماء کے نزدیک مخلوق کی صفات میں تو جود اور سخا دونوں کا ایک ہی معنی ہے لیکن ذاتِ باری تعالیٰ کو جواد تو کہتے ہیں سخی نہیں کہتے اور اس کا سبب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے خود اپنے مقدس ناموں کو وحی کے ذریعہ متعین کیا ہے اور اپنا نام سخی بیان نہیں کیا۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حق تعالےٰ کے لئے اس نام کی خبر نہیں دی۔ جب پوری امت اور خصوصاً اہل سنت کا اجماع ہے کہ جب تک کتاب و سنت نے حق تعالےٰ کا کوئی نام نہ بتایا ہو عقل اور لغت کی بنیاد پر حق تعالےٰ کا کوئی نام رکھنا کسی کے لئے بھی جائز نہیں۔ جیساکہ حق تعالےٰ کا ایک نام "عالم" ہے اور اجماعِ امت کے ساتھ اُس کو عالم تو کہنا چاہئیے لیکن "عاقل اور فقیہہ" نہیں کہنا چاہئے، حالانکہ یہ تینوں ایک معنی میں استعمال ہوتے ہیں، عالم کے اسم کا ذاتِ باری تعالیٰ پر اطلاق اس لئے کرتے ہیں کہ یہ توقیفی (وحی کے تعین) طور پر ثابت ہے۔ اور بعض حضرات نے جود اور سخا کے درمیان فرق کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ سخی وہ ہوتا ہے جو عطا کرنے میں اپنے اور پرائے کی تمیز کرے اور اس کی بخشش کسی غرض اور سبب کے ساتھ متعلق ہو اور سخاوت میں یہ ابتدائی مقام ہے جب کہ "جواد" وہ ہوتا ہے جو اپنے اور غیر میں کوئی امتیاز روا نہ رکھے اُس کی عطا بے غرض اور اس کا فعل بغیر کسی سبب کے ہو یہی حال اللہ تعالےٰ کے دو پیغمبروں صلوات اللہ علیہما والسلام یعنی حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام اور حبیب خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا کہ صحیح روایات میں موجود ہے کہ حضرت

ابراہیم علیہ السلام اس وقت کھانا نہ کھاتے جب تک کوئی مہمان نہ آ جائے ایک دفعہ تین دن گزر گئے اور کوئی مہمان نہ آیا پھر ایک آتش پرست، آپ کی رہائش کے دروازے پر سے گزرا حضرت ابراہیمؑ نے اس سے پوچھا "تیرا مذہب کیا ہے"؟ اُس نے کہا "میں آتش پرست ہوں"۔ آپ نے فرمایا پھر تو تو میری مہمانی اور عزت کے قابل نہیں ہے۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ کی طرف سے آپ کو عتاب ہوا کہ جس شخص کی میں ستر سال سے پرورش کر رہا ہوں تجھ سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ ایک روٹی ہی اُسے دے دے۔ لیکن جب حاتم طائی کا بیٹا سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں حاضر ہوا تو آپؐ نے اپنی چادر اٹھائی اور اُس کے لئے زمین پر بچھا دی اور فرمایا۔" اِذَا اَتَاکُمْ کَرِیْمُ قَوْمٍ فَاَکْرِمُوْہُ " (جب تمہارے پاس کسی قوم کا صاحب عزت شخص آئے تو اس کی عزت کرو) جس نبی نے اپنے اور غیر میں تمیز کی اس نے ایک روٹی بھی کافر کو دینے سے دریغ کیا لیکن جس نے امتیاز نہ برتا اُس نے نبوت کی چادر ایک کافر کے لئے بچھونا بنا دی کیوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام، مقام سخاوت تھا لیکن ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام مقام جود تھا۔ اس بارے میں سب سے بہتر مذہب وہ جو کہا گیا ہے کہ دل میں پیدا ہونے والے پہلے خیال کی متابعت کرنا جود ہے لیکن جب پہلے خیال پر دوسرا خیال غالب آ جائے تو یہ بخل کی علامت ہے اور نیکی حاصل کرنے والوں نے اُسی پہلے خیال کو ترجیح دی ہے کیوں کہ لامحالہ پہلا خیال حق تعالیٰ کی طرف سے ہوگا۔ میں نے نیشاپور میں ایک سوداگر کو پایا جو شیخ ابوسعید کی مجلس میں بیٹھا کرتا تھا۔ ایک دن شیخ نے کسی درویش کے لئے کچھ طلب کیا اُس شخص نے کہا میرے پاس ایک دینار تھا اور ایک قراضہ (چاندی کا ایک سکہ) پہلے میرے دل میں آیا کہ دینار اُس درویش کو دے دوں لیکن دوبارہ خیال آیا کہ قراضہ دینا چاہیئے چنانچہ میں نے قراضہ دے دیا۔ شیخ جب باتوں میں مصروف ہوئے تو میں نے پوچھا "کیا کسی کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ حق تعالیٰ سے تنازعہ کرے"؟ شیخ نے کہا تو نے تو خود حق تعالیٰ کے ساتھ تنازعہ کیا ہے کہ اس نے تجھے کہا "دینار دو لیکن تم نے قراضہ دیا۔ اور میں نے حکایات میں یہ بھی پایا ہے کہ شیخ ابوعبداللہ رودباری ایک مرید کے گھر میں تشریف لے گئے لیکن وہ گھر میں موجود نہ تھا۔ آپ نے

اُس کے گھر کا تمام سامان بازار میں لے جا کر فروخت کرنے اور راہِ خدا میں خرچ کر دینے کا حکم دیا۔ جب مرید گھر آیا تو اس بات پر بڑا خوش ہوا تاہم شیخ کی خوشنودی کی خاطر منہ سے کچھ بھی نہ کہا۔ اور جب اُس کی بیوی گھر میں آئی تو یہ کیفیت دیکھ کر گھر کے اندر گئیں اور اپنے تمام کپڑے بھی لا کر سامان میں ڈال دئے اور کہا کہ "یہ سب کچھ گھر کے سامان میں ہی شامل ہے اور اس کا بھی وہی حکم ہے۔ شوہر نے پکار کر اُسے کہا "جو کچھ تو نے کیا ہے یہ تکلف ہے اور اپنے اختیار سے تو نے کیا ہے۔ عورت نے جواب دیا "اے میرے خاوند! جو کچھ شیخ نے کیا وہ ان کا "جود" تھا اس لئے ہمیں بھی اپنے نفس کی ملکیت میں تکلف کرنا چاہئے تا کہ ہمارا "جود" بھی ظاہر ہو جائے"۔ خاوند نے کہا "ہاں یہ تو درست ہے لیکن جب ہم نے اپنے لئے شیخ کو تسلیم کر لیا ہے تو اُن کا یہ کام خود ہمارے لئے جود ہی ہے —— اور جود آدمی کی صفت میں تکلف سے اور مجازاً ہی ہوتا ہے۔ اور مرید کو چاہئے کہ وہ اپنی ملک اور اپنا نفس امرالہٰی کی موافقت میں خرچ کر ڈالے —— اسی لئے تو حضرت سہل بن عبداللہؒ نے کہا ہے کہ الصوفی دَمُہٗ ھَدَرٌ و مِلکُہٗ مباحٌ۔" (صوفی کا خون معاف اور اُس کی ملک مباح ہوتی ہے) اور میں نے شیخ ابو مسلم فارسیؒ سے سُنا ہے کہ انہوں نے بیان کیا" ایک دفعہ میں نے ایک جماعت کے ہمراہ حجازِ مقدس کا سفر اختیار کیا۔ حلوان کے نواحی علاقہ میں کُردوں نے ہماری راہ روک لی اور جو گدڑیاں ہمارے پاس تھیں ہم سے چھین لیں۔ لیکن ہم نے اُن کے ساتھ کوئی مزاحمت نہ کی بلکہ اُن کی دلجوئی کی کوشش کرتے رہے، البتہ ہمارے اندر ایک شخص تھا جو اضطراب کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ایک کرد نے تلوار کھینچ لی اور اُس کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ہم سب نے اُس کرد کے سامنے اُس کی سفارش کی۔ وہ کہنے لگا میں اس جھوٹے شخص کو زندہ چھوڑ دوں یہ درست نہیں میں اس کو ضرور قتل کر دوں گا۔ ہم نے اُس کو قتل کرنے کا سبب اُس سے دریافت کیا تو وہ کہنے لگا میں اس لئے اس کو قتل کرنا چاہتا ہوں کہ یہ صوفی نہیں اور اولیاء کی صحبت میں خیانت کا ارتکاب کرتا ہے اِس طرح کے شخص کا دنیا سے نابود ہو جانا ہی بہتر ہے میں نے پوچھا یہ کیسے؟ تو اس نے کہا" یہ اس لئے کہ صوفیہ کا کم از کم درجہ جود ہے جب کہ اس کی گدڑی میں اتنے ٹکڑے بندھے ہوئے ہیں یہ کس طرح صوفی ہو

سکتا ہے جو اپنے یاروں کے ساتھ اتنا جھگڑا کر رہا ہے کیوں کہ ہم تو کئی سال سے تمہارا ہی کام کر رہے ہیں کہ تمہاری راہ لوٹتے ہیں اور تم کو دنیا کی آلائشوں سے منقطع کرتے ہیں ــــــــ

کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن جعفر ایک نخلستان میں کچھ لوگوں پر سے گزرے تو ایک حبشی غلام کو دیکھا جو بکریوں کی نگرانی کر رہا تھا کہ ایک کتا آیا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے ایک روٹی نکالی اور کتے کے آگے ڈال دی۔ پھر دوسری اور اس کے بعد تیسری روٹی بھی اس کے سامنے ڈال دی۔ حضرت عبداللہ اُس غلام کے سامنے چلے گئے اور کہا "اے غلام تمہاری روزانہ خوراک کتنی ہے؟" اس نے کہا "بس جتنی آپ نے ابھی دیکھی ہے" آپ نے پوچھا وہ ساری تو نے کتے کو کیوں دے دی؟ کہنے لگا اس لئے کہ یہ کتوں کی جگہ نہیں اور یہ کتا کہیں دور سے اسی امید پر آیا ہے اس لئے میں نے یہ پسند نہیں کیا کہ اُس کی تکلیف کو ضائع کروں۔ حضرت عبداللہؓ کو اس کی یہ بات بڑی اچھی لگی اور اس غلام کو بکریوں اور نخلستان سمیت خرید کر غلام کو آزاد کر دیا اور اُسے کہا کہ یہ بکریاں اور کھجوروں کا باغ میں نے تجھے بخش دیا۔ غلام نے آپ کو بڑی دعا دی اور تمام بکریوں کو صدقہ اور سارے مال کو راہِ خدا میں خیرات کر دیا اور وہاں سے چلا گیا ــــــــ

ایک شخص حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے درِ دولت پر آیا اور کہنے لگا "اے پیغمبر زادے! میرے ذمہ چار سو درہم قرض ہے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے چار سو درہم اس کو دینے کا حکم دیا اور خود روتے ہوئے گھر کے اندر تشریف لے گئے۔ لوگوں نے پوچھا "اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے! آپ کیوں رو رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا" اس لئے کہ میں نے اس شخص کا حال جاننے میں کوتاہی کی ہے حتیٰ کہ اُسے سوال کرنے کی ذلت اٹھانی پڑی ہے۔

حضرت ابو سہل صعلوکی، صدقہ کسی درویش کے ہاتھ پر ہرگز نہ رکھا کرتے بلکہ جب کوئی چیز کسی کو دینا ہوتی تو اس کے ہاتھ پر رکھنے کی بجائے زمین پر رکھ دیتے تاکہ وہ وہاں سے اُٹھا لے۔ آپ سے لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا "دنیا کی اتنی قدر و قیمت نہیں کہ اس کو کسی مسلمان کے ہاتھ میں دیا جائے تاکہ میرا ہاتھ ید علیا اور اُس ید سفلی ہو جائے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں روایت ہے کہ حبشہ کے بادشاہ نے دو من مشک آپ کی خدمت میں بھیجا آپ نے تمام کا تمام ایک بار ہی پانی میں ڈال دیا اور اپنے

دوستوں کے جسموں پر مَل دیا۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو پہاڑوں کے درمیان کی بکریوں سے بھری ہوئی پوری وادی اُسے بخش دی۔ جب وہ اپنی قوم کے پاس گیا تو کہنے لگا "اے میری قوم! مسلمان ہو جاؤ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اتنی بخشش کرتے ہیں کہ انہیں اپنی مفلسی کی کوئی پرواہ نہیں — نیز حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی بیان کرتے ہیں کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک دفعہ اسی ہزار درہم لائے گئے آپ نے وہ سب اپنی چادر پر ڈال دئے اور جب تک وہ سب راہِ خدا میں خرچ نہ کردئے اس جگہ سے نہ اُٹھے — اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ بیان کرتے ہیں کہ میں نے پیغمبر علیہ السلام کو دیکھا کہ آپؐ نے بھوک کی وجہ سے اپنے پیٹ پر پتھر باندھ رکھا تھا۔

اور میں نے متاخرین میں سے ایک درویش کو دیکھا ہے کہ بادشاہ نے تین سو درہم کی مقدار خالص سونا اُن کو بھیجا کہ اُسے قبول کر لیجئے! وہ اُسے لے کر حمام میں تشریف لے گئے۔ اور سب کا سب حمام والوں کو دے دیا اور وہاں سے چلے گئے — اور قبل ازیں نوری فرقہ کے بیان میں ایثار کا بیان کرتے ہوئے اس مضمون کی کچھ باتیں بیان کی تھیں لہٰذا اس جگہ اتنے پر ہی اکتفاء کرتا ہوں — واللہ اعلم بالصواب۔

ساتواں کشفِ حجاب

روزے کا بیان

حق عزوجل فرماتے ہیں "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ (الآیہ) (اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے) پیغمبر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ... علیہ السلام نے مجھے بتایا ہے کہ حق تعالٰے فرماتے ہیں "اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ" (یعنی روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اُس کی بہتر جزا دوں گا) اس لئے کہ روزہ ایک باطنی عبادت ہے جو کہ ظاہر کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتی اور اس میں غیر کا کوئی حصہ اور دخل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی

جزا بہت زیادہ ہوگی۔ کہا گیا ہے کہ لوگ جنت میں داخل تو خدا کی رحمت سے ہوں گے جب کہ درجات اُن کی عبادت کی بدولت اور جنت میں ہمیشگی روزے کی جزا کے طور پر ہوگی کیونکہ حق تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ" انا اجزی بہ" —— حضرت جنیدؒ کہتے ہیں کہ" الصوم نصف الطریقۃ" (روزہ آدھی طریقت ہے) اور میں نے مشائخ میں سے بعض حضرات کو دیکھا ہے کہ مسلسل روزہ رکھا کرتے تھے جب کہ بعض حضرات کو دیکھا ہے کہ رمضان کے علاوہ کوئی روزہ نہ رکھتے تھے اُن کا رمضان میں روزے رکھنا اجر و ثواب کی طلب کے طور پر تھا اور غیر رمضان میں روزے نہ رکھنا اپنے اختیار اور ریا کاری کو ترک کرنے کی وجہ سے تھا اور میں نے بعض بزرگوں کو دیکھا ہے کہ وہ روزہ رکھتے تھے لیکن کسی کو علم نہیں ہوتا تھا اور جب ان کے سامنے کھانا لایا جاتا تو تناول کر لیا کرتے تھے اور یہ عمل سنت کے زیادہ موافق ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے پاس تشریف لے گئے تو انہوں نے عرض کی۔ اِنَّا قَدْ خبئنا لک حیسًا قال علیہ السلام امّا انی کُنتُ أُرِیدُ الصومَ ولکن قربیہ سأصوم یومًا مکانہ۔" (ہم نے آپ کے لئے حریسہ (کھجور کا حلوہ) پکایا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے تو روزے کا ارادہ کر لیا تھا تاہم اسے میرے پاس لے آؤ عنقریب میں اس کی جگہ کسی اور دن روزہ رکھ لوں گا۔) اور میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ بعض صوفیہ کو دیکھا کہ وہ ہر ماہ کی تیرہویں، چودہویں اور پندرھویں کو اور ماہ محرم کے عشرے کے روزے رکھا کرتے تھے اسی طرح رجب، شعبان اور رمضان کے مہینوں میں روزہ رکھتے اور بعض حضرات کو میں نے دیکھا کہ وہ صوم داؤدؑ بھی رکھا کرتے تھے کہ پیغمبر علیہ السلام نے اس کو سب روزوں سے بہتر قرار دیا ہے اور یہ ایک دن روزہ رکھنا اور ایک دن افطار کرنا ہے ——

دوسرے ایک وقت میں میں شیخ احمد بخاری رحمۃ اللہ کے ہاں حاضر ہوا تو اُن کے سامنے مٹھائی کا ایک طباخ پڑا ہوا تھا۔ آپ خود بھی اس میں سے کھا رہے تھے اور مجھے بھی کھانے کا اشارہ کیا۔ میں نے اپنے بچپنے کی وجہ سے کہہ دیا کہ میں نے روزہ رکھا ہوا ہے۔ آپ نے پوچھا "کیوں؟" میں نے عرض کی "فلاں بزرگ کی موافقت میں!" آپ نے فرمایا" دیکھو،

مخلوق کے لئے مخلوق کی موافقت کرنا درست نہیں۔ چنانچہ میں نے روزہ کھول دینے کا ارادہ کر لیا۔ تو آپ نے فرمایا "جب تم اُس بزرگ کی موافقت چھوڑنے لگے ہو تو پھر میری موافقت بھی نہ کرو کیوں کہ میں بھی تو ایک مخلوق ہی ہوں اور یہ دونوں مخلوق ہونے میں یکساں ہیں ——

روزہ کی حقیقت، اپنے نفس کو روکنا ہے" اور پوری کی پوری طریقت اسی حقیقت میں مضمر ہے اور روزہ میں سب سے کم درجہ بھوکا رہنا ہے کہ الجوع طعامُ اللہِ فی الارض (بھوک زمین میں اللہ کا کھانا ہے) اور بھوکا رہنا تمام زبانوں کے لوگوں میں ایک قابل تعریف عمل ہے شریعت کے اعتبار سے بھی اور عقلی طور پر بھی —— پھر ہر عاقل، بالغ، صحت مند اور مقیم مسلمان پر ایک ماہ کے لئے روزہ واجب ہے اور اس کی ابتداء ماہِ رمضان کا چاند دیکھنے سے ہوتی ہے اور اختتام ماہِ شوال کا چاند دیکھنے پر ہوتا ہے۔ اور ہر روزے کے لئے صحیح نیت اور سچی شرط ضروری ہے، تاہم نفس کو روکنے کی شرائط بہت سی ہیں، چنانچہ کوئی شخص اُسی وقت حقیقی طور پر روزہ دار ہو گا جب وہ اپنے پیٹ کو کھانے پینے سے بچائے اور اپنی آنکھ کو شہوت کی نظر سے، کان کو غیبت کی گفتگو سننے سے زبان کو بیہودہ اور فضول گفتگو کرنے سے اور جسم کو دنیا کی متابعت اور شریعت کی مخالفت سے محفوظ رکھے کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے فرمایا تھا کہ "اِذَا صُمْتَ فَلْیَصُمْ سَمْعُکَ وَبَصَرُکَ وَلِسَانُکَ وَیَدُکَ وَکُلُّ عُضْوٍ مِنْکَ" (جب تو روزہ رکھے تو ضروری ہے کہ تیرا کان، تیری آنکھ، تیری زبان، تیرا ہاتھ اور تیرا ہر عضو روزہ رکھے) اور نیز فرمایا کہ "رُبَّ صَائِمٍ لَیْسَ لَہٗ مِنْ صَوْمِہٖ اِلَّا الْجُوْعُ وَالْعَطَشُ" (بہت سے روزہ دار ایسے ہیں جنہیں روزے سے بھوکا اور پیاسا رہنے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا) اور میں یعنی علی بن عثمان الجلابی نے خواب میں سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی تو میں نے عرض کی "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کوئی وصیت فرمائیے۔ آپ نے فرمایا اِحْبِسْ حَوَاسَّکَ" (اپنے حواس کو قابو میں رکھ) کیوں کہ اپنے حواس کو بند رکھنا ہی مکمل مجاہدہ ہے اس لئے کہ تمام کے تمام عُلوم انہی پانچ دروازوں سے حاصل ہوتے ہیں۔ پہلا۔ دیکھنا، دوسرا۔ سننا، تیسرا، چکھنا، چوتھا، سونگھنا اور پانچواں، چھونا۔ اور یہ پانچوں حواس، علم اور عقل کے سپہ سالار ہیں۔ ان میں سے چار حواس کا مقام

تو مخصوص ہے لیکن ایک ایسا ہے جو تمام اعضاء کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، آنکھ مقام نظر ہے کہ وہ جہان اور اُس کے رنگوں کو دیکھتی ہے۔ کان محل سماعت ہے کہ وہ خبر اور آواز سنتا ہے زبان محل ذوق ہے کہ مزہ اور بدمزہ کو جانتی ہے اور ناک سونگھنے کا محل ہے کہ وہ خوشبو اور بدبو کو محسوس کرتا ہے البتہ چھونے کے لئے کوئی عضو مخصوص نہیں اور یہ تمام اعضاء میں پایا جاتا ہے کہ وہ گرمی، سردی اور سختی وغیرہ کو جانتے ہیں۔ اور کوئی ایسی چیز نہیں جو آدمی کے احاطۂ علم میں نہ آسکے اسی طرح بدیہی اور الہامی علوم کے علاوہ کوئی ایسا علم نہیں جو پانچ دروازوں کے علاوہ کسی طرح حاصل ہو سکے۔ کیوں کہ حق تعالےٰ کے الہام میں کوئی نقص نہیں جب کہ ان حواس میں سے ہر حاسہ میں صفائی بھی ہے اور کدورت بھی کہ جس طرح ان میں علم وعقل اور روح کا عمل دخل ہے اسی طرح نفس اور خواہشات کا عمل دخل بھی ہے کیوں کہ اطاعت و معصیت اور سعادت و شقاوت تمام امور میں یہ حواس آلۂ مشترک ہیں۔ پس آنکھ اور کان میں صحیح دیکھنا اور سچی خبر سننا تو حق تعالےٰ کی ولایت ہے جب کہ جھوٹ سننا اور بُری نگاہ سے دیکھنا یہ نفس کی ولایت ہے اسی طرح چھونے، چکھنے اور سونگھنے میں حکم خداوندی کی متابعت اور سنت کی پیروی ولایت حق ہے جب کہ فرمان الٰہی کی نافرمانی اور شریعت کی مخالفت یہ نفس کی ولایت ہے پس روزہ دار کو چاہیئے کہ وہ ان تمام دروازوں کو بند کرے تاکہ مخالفتِ حق سے موافقت کی طرف آجائے اور یوں حقیقی روزہ دار ہو جائے ورنہ صرف کھانے اور پینے سے رُکے رہنا تو بچوں اور بوڑھی عورتوں کا روزہ ہے جب کہ روزہ دراصل خواہشات، لہو ولعب اور غیبت سے بچنے کا نام ہے کیوں کہ خداوند تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُوْنَ الطَّعَامَ" (ہم نے اُن کے جسم اس طرح نہیں بنائے کہ وہ کھانا ہی نہ کھائیں) اور یہ بھی ارشاد فرمایا "اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا" (کیا تم نے سمجھ لیا ہے کہ ہم نے تمہیں بیکار پیدا کیا ہے) یعنی ہم نے ہر شخص کو کھانے کا ضرورت مند بنایا ہے اور مخلوق کو کھیل کود کے لئے پیدا نہیں کیا۔ پس فضول اور حرام کاموں کے ارتکاب سے رکنا چاہیئے نہ کہ حلال خوری سے۔ مجھے اُس شخص پر بڑا تعجب ہوتا ہے جو کہتا ہے کہ میں نے نفلی روزہ رکھا ہوا ہے اور فرض کی ادائیگی بجا نہیں لاتا کیوں کہ معصیت کا ارتکاب نہ کرنا ایک فرض ہے اور ہمیشہ

نفلی روزہ سے رہنا ایک سنت! پس ہم دل کی سختی سے اللہ تعالےٰ کی پناہ مانگتے ہیں البتہ جو کوئی اپنے آپ کو معصیت سے بچائے رکھتا ہے اُس کے تمام احوال روزہ ہی ہوتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ جس دن پیدا ہوئے اُس دن بھی روزہ دار تھے اور جس دن دنیا سے رخصت ہوئے اُس دن بھی روزہ سے تھے۔ لوگوں نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تو انہوں نے بیان کیا کہ جس دن آپ کی ولادت ہوئی وہ صبح کا وقت تھا اور انہوں نے شام کی نماز تک ذرہ بھی دودھ نہیں پیا۔ اور جب دنیا سے رخصت ہوئے تو اُس دن بھی روزہ دار تھے۔ یہ روایت حضرت ابوطلحہ المالکی رحمۃ اللہ نے نقل کی ہے۔

لیکن بغیر افطار کے مسلسل روزہ رکھے چلے جانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے منع کیا گیا ہے کہ جب آپؐ صوم وصال (بغیر افطار کے مسلسل روزے) رکھا کرتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی آپؐ کی موافقت کی تو آپؐ نے انہیں فرمایا کہ تم صوم وصال نہ رکھا کرو کہ "اِنِّی لَسْتُ کَاَحَدِکُمْ اِنِّی اَبِیْتُ عِنْدَ رَبِّیْ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِیْ" "میں تم میں سے کسی ایک جیسا نہیں ہوں میں تو تمہارے رب کے پاس رات گزارتا ہوں وہ مجھے کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی" پس ارباب مجاہدہ کہتے ہیں کہ یہ نہی شفقت کے طور پر ہے نہ کہ حرمت کے طور پر، اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ روزوں میں وصال کے خلاف سنت ہے باقی درحقیقت وصال کرنا خود محال ہے کیوں کہ جب دن گزرتا ہے تو رات کو روزہ نہیں ہوتا اور جب کسی نے رات کو روزے کا ارادہ کر لیا تو وصال نہیں ہو گا ——

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ کے بارے میں حکایت بیان کرتے ہیں کہ وہ ہر پندرہ دن میں ایک مرتبہ کھانا کھاتے تھے اور جب رمضان کا مہینہ آتا تو عید تک کوئی خوراک نہ کھاتے تھے اور ہر رات چار سو رکعت نفل نماز ادا کیا کرتے تھے۔ پس یہ بات انسانی طاقت سے تو باہر ہے اور توفیق الٰہی کے بغیر ایسا نہیں کر سکتے۔ درحقیقت یہ بات تائید خداوندی ہوتی ہے کہ جو خود ہی کسی شخص کی غذا بن جاتی ہے اور کسی کی غذا تو دنیا کا طعام ہے جب کہ کسی کی غذا حق تعالیٰ کی تائید ہوتا ہے ———— صاحب لمع، طاؤس الفقراء شیخ ابونصر سراج رحمۃ اللہ نے ایک مرتبہ رمضان کا مہینہ بغداد میں گزارا مسجد شونیزیہ میں آپ کے لئے ایک

حجرہ مخصوص کر دیا گیا اور وہاں کے درویشوں کی امامت بھی آپ کے سپرد کر دی گئی چنانچہ عید تک اُن حضرات کی امامت کرتے رہے اور تراویح میں آپ نے پانچ قرآن مکمل کیے خادم روزانہ ایک روٹی لے کر آپ کے حجرے میں آتا اور آپ کو پیش کرتا۔ جب عید کا دن آیا اور آپ اس حجرہ سے تشریف لے گئے اور خادم نے آپ کے خلوت کدے کو دیکھا تو وہ تمام تیس روٹیاں اندر موجود تھیں ـــــ حضرت علی بن بکار رحمۃ اللہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت حفص مصیص رحمۃ اللہ کو میں نے خود دیکھا ہے کہ رمضان کے مہینہ میں پندرہ دن تک کوئی خوراک نہ کھاتے تھے ـــــ اور حضرت ابراہیم ادہم رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں حکایت بیان کرتے ہیں کہ آپ نے ماہِ رمضان میں ابتداء سے انتہا تک کوئی چیز نہ کھائی جب کہ وہ گرمیوں کا مہینہ تھا اور آپ روزانہ گندم کاٹنے کی مزدوری کرتے تھے۔ اس میں سے جو کچھ کماتے درویشوں میں تقسیم کر دیتے اور خود پوری رات، صبح ہونے تک نماز میں مشغول رہتے اُن کو مجبور بھی کیا گیا لیکن پھر بھی آپ نے نہ کچھ کھایا اور نہ ہی نیند کی ـــ حضرت شیخ ابو عبداللہ خفیف رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق آتا ہے کہ جب آپ سے رخصت ہوئے لگاتار چالیس چلے آپ کاٹ چکے تھے۔ ـــــ میں نے خود ایک بزرگ کو دیکھا ہے جو بیابان میں ہی رہتا تھا اور ہر سال دو چلے ضرور کرتا تھا ـــــ حضرت ابو محمد دانشمند بالفری رحمۃ اللہ جب اللہ کو پیارے ہونے لگا تو میں خود وہاں موجود تھا اسی دن گزر چکے تھے کہ آپ نے کچھ نہیں کھایا تھا اور کوئی نماز بھی جماعت سے نہ چھوٹی تھی ـــــ متاخرین میں سے بھی ایک درویش تھے کہ اسّی دن تک روز و شب اُس نے کچھ نہیں کھایا تھا اور کوئی نماز با جماعت اُس سے ضائع نہ ہوئی تھی ـــــ مرو میں دو بزرگ تھے ایک کا نام مسعود اور دوسرے کا شیخ ابو علی سیاہ تھا۔ کہتے ہیں کہ حضرت مسعودؒ نے ایک آدمی شیخ ابو علی سیاہؒ کے پاس بھیجا کہ یہ تصوف کا دعویٰ کب تک رہے گا۔ آؤ تاکہ ہم چالیس روز تک کچھ کھائے پیئے بغیر بیٹھیں تاکہ فیصلہ ہو جائے کہ صوفی کون ہے؟ شیخ ابو علی نے جواب میں کہلا بھیجا (یہ بھی کوئی کمال ہے) آؤ کہ ہم ہر روز تین مرتبہ کھانا کھائیں اور اس کے باوجود چالیس دن تک ایک ہی وضو میں رہیں۔

اس مسئلہ میں پیدا ہونے والا اشکال ابھی تک اپنی جگہ پہ موجود ہے کہ جاہل لوگ اس سے

صومِ وصال کے جائز ہونے کی دلیل پکڑیں گے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے اور طبیب بھی اس کے اصل کا انکار کرتے ہیں۔ اس لئے میں اس کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہوں تاکہ اشکال رفع ہو جائے اور اصل مسئلہ واضح ہو جائے۔ چنانچہ جان لو کہ یہ کرامت ہے کہ کوئی شخص روزوں میں وصال کرے اور کسی فرمانِ الٰہی میں کوئی خلل واقع نہ ہو اور کرامت مخصوص لوگوں کو حاصل ہوتی ہے نہ کہ عوام کو۔ جب اس کا حکم عام نہیں ہے تو کسی کو اس کا امر کرنا بھی درست نہیں ہو گا کیوں کہ اگر کرامت کا اظہار عام ہوتا تو ایمان قبول کرنا ایک جبر ہوتا اور عارفوں کی معرفت کا انہیں کوئی ثواب نہ ملتا۔ پس چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صاحبِ معجزہ تھے اس لئے آپ نے اپنا وصال ظاہر کر دیا اور اہلِ کرامت کے لئے اس کے اظہار کو منع کر دیا کیوں کہ چھپانا کرامت کی شرط ہے جب کہ معجزہ کی شرط یہ ہے کہ اُسے کھول کر بیان کیا جائے معجزے اور کرامت کے درمیان یہ فرق بڑا واضح ہے اور جس کے لئے ہدایت مقدر ہے اس کے لئے اتنا بیان ہی کافی ہے۔ اور صوفیہ کے چلّہ کی اصل۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حال سے متعلق ہے اور مقام کی حالت میں مکالمہ درست ہوتا ہے اور جب ان کی خواہش ہو کہ حق تعالیٰ کا کلام روحانی طور پر سنیں تو چالیس روز بھوکے رہتے ہیں اور جب تیس روز گزر تے ہیں تو مسواک کرتے ہیں اور پھر اس کے بعد دس دن مزید بھوکے رہتے ہیں تو حق تعالےٰ ضرور اُن کے ساتھ باطنی طور پر گفتگو کرتے ہیں کیوں کہ جو کچھ انبیاء کرام کے لئے ظاہری طور پر درست ہے وہی کچھ باطنی طور پر اولیاء کرام کے لئے جائز ہے ——— پس طبیعت کے اپنے حال پر رہتے ہوئے حق تعالیٰ کا کلام سننا جائز نہیں اس لئے طبقوں کے لئے چالیس روز تک کھانے اور پینے کی نفی کرنی چاہئے تاکہ وہ مغلوب ہو جائیں اور محبت کی صفائی کو پوری ولایت اور روح کو پوری طرح لطافت حاصل ہو جائے ——— چونکہ بھوک کی حقیقت اسی مضمون کے ساتھ متعلق ہے اس لئے اب میں انشاء اللہ اس کو کھول کر بیان کرتا ہوں۔

باب

بھوک اور اُس کے متعلقات

اللہ عزوجل فرماتے ہیں کہ "وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ" (اور ہم تمہیں کچھ خوف اور بھوک اور مال۔ جان اور پھلوں کا نقصان دے کر آزمائیں گے) اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے "بَطْنٌ جَائِعٌ أَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى مِنْ سَبْعِينَ عَابِدًا آكِلٍ" (ایک بھوکا پیٹ اللہ تعالیٰ کو خوب کھانے والے ستر عابدوں سے زیادہ محبوب ہے) - جان لو کہ تمام امتوں اور ملتوں کے ہاں بھوکا رہنا بڑے شرف کا اور قابل تعریف فعل ہے، کیوں کہ ظاہری اعتبار سے بھوکے انسان کا دل زیادہ تیز اور طبیعت زیادہ تہذیب یافتہ اور تندرست ہوتی ہے خصوصاً ایسے آدمی کے لیے جس میں شر کا مادہ زیادہ نہ ہو اور اس نے ریاضت کے ذریعہ اپنے آپ کو مہذب بنا لیا ہو۔ "لِأَنَّ الْجُوعَ لِلنَّفْسِ خُضُوعٌ وَلِلْقَلْبِ خُشُوعٌ" (کیوں کہ بھوک نفس کے لئے انکساری اور دل کے لئے عاجزی کا باعث ہے) کیوں کہ بھوک کی وجہ سے نفسانی قوت ختم ہو جاتی ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "أَجِيعُوا بُطُونَكُمْ وَأَظْمِئُوا أَكْبَادَكُمْ وَأَعْرُوا أَجْسَادَكُمْ لَعَلَّ قُلُوبَكُمْ تَرَى اللّٰهَ عِيَانًا فِي الدُّنْيَا" (اپنے پیٹوں کو بھوکا، جگروں کو پیاسا اور جسموں کو برہنہ رکھو شاید تمہارے دل دنیا میں ہی اللہ کو سامنے دیکھ سکیں) اگرچہ بھوک سے جسم کو تکلیف ہوگی لیکن اس سے دل کو روشنی ملے گی روح کو صفائی اور باطن کو بقائے حق نصیب ہوگا تو جب باطن کو بقائے حق نصیب ہو اور روح کو صفائی حاصل ہو اور دل کو روشنی مل جائے تو جسم کو اگر کچھ تکلیف بھی برداشت کرنا پڑی ہو تو کیا نقصان ہے؟ کیوں کہ پیٹ بھر کر کھانا کوئی قیمتی بات نہیں کہ اگر ایسا ہوتا تو جانوروں کو پیٹ بھر کر نہ کھلائے۔ اس لئے کہ سیر ہو کر کھانا جانوروں کا کام ہے جب کہ بھوکا رہنا بیماروں کے لئے علاج ہے نیز بھوک روح کے لئے تعمیر کا کام دیتی ہے

جب کہ سیر خوری محض پیٹ کی تعمیر کا ذریعہ ہے۔ کوئی شخص تو اپنے پیٹ کی پرورش میں ہی اپنی زندگی خرچ کر دیتا ہے اور اپنے جسم کی خواہش پوری کرتا رہتا ہے اور کوئی روح کی پرورش میں عمر گزارتا ہے تاکہ دنیا کے تمام علائق سے مجرد ہو کر حق تعالیٰ کے لئے تنہا ہو جائے۔ یہ دونوں برابر کیسے ہو سکتے ہیں؟ کہ ایک کے لئے تو جہان کھانے پینے کے لئے ہے اور دوسرے کے لئے کھانا صرف عبادت کرنے کے لئے قوت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان بڑا ہی فرق ہے۔ لِاَنَّ المتقدمون یاکلون لیعیشوا فانتم تعیشون لتاکلوا (پہلے لوگ تو صرف اس لئے کھاتے تھے تاکہ زندہ رہیں اور تم کھانے پینے کے لئے ہی زندہ رہو) اَلجوعُ طعامُ الصدیقین وَ مسلک المریدین و قید الشیاطین (بھوک صدیقوں کا کھانا، مریدانِ حق کا مسلک اور شیطانوں کے لئے قید ہے) حق تعالیٰ کی قضا اور تقدیر سے حضرت آدم علیہ السلام کے بہشت سے باہر آنے اور حق تعالیٰ کے قرب سے دور ہونے کی وجہ بھی ایک لقمہ کھانا ہی تھا۔ درحقیقت جو آدمی بھوک میں پریشان ہو وہ بھوکا نہیں ہوتا اس لئے کہ کھانے کا طلب گار خود کھانے والا ہوتا ہے۔ پس جس شخص کو بھوک میں درجہ حاصل ہو وہ کھانے کو ترک کرنے والا ہوتا ہے نہ کہ کھانے سے روکا گیا۔ اور جو شخص کھانے کی موجودگی میں اُس کو ترک کر دے اور بھوک کی تکلیف برداشت کرے وہ بھوکا ہوتا ہے اور بھوکا رہے بغیر شیطان کو قید اور خواہشاتِ نفس کو پابند نہیں کیا جا سکتا ــــــ کتانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "وَمِن حُکمُ المریدِ اَن یکون فیہِ ثلثۃُ اشیاءَ نومہُ غلبۃٌ وَکلامہُ ضرورۃٌ واکلہ فاقۃٌ" (مرید کی شرط یہ ہے کہ اُس میں تین چیزیں موجود ہوں، اُس کی نیند شدید غلبہ کی وجہ سے، اُس کی گفتگو ضرورت کے مطابق اور اُس کا کھانا، فاقہ کی وجہ سے ہو) فاقہ بعض حضرات کے نزدیک دو رات دن بھوکا رہنا ہے۔ بعض کے نزدیک تین رات، دن۔ بعض کے نزدیک ایک ہفتہ اور بعض کے نزدیک چالیس دن تک بھوکا رہنا ہے۔ کیوں کہ محققین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ چالیس دن رات میں ایک دفعہ سچی بھوک ہوتی ہے اور وہ محض جان بچانے کے لئے ہوتی ہے اور اس کے دوران جو کچھ بھی ظاہر ہو وہ طبیعت کا شر اور غرور ہے اللہ تعالیٰ ہمیں

اس سے بچائے رکھے۔ ــــــــ جان لو کہ اہل معرفت کی تمام رگوں پر حق تعالیٰ کے اسرار ہوتے ہیں۔ اُن کے دل حق تعالیٰ کی نگاہ میں ہوتے ہیں اور ان کے دلوں سے اُن کے سینوں میں دروازے کھلے ہوتے ہیں اور اُن کی بارگاہ میں عقل اور خواہشات بیٹھی ہوتی ہیں پس روح تو عقل کی امداد کرتی ہے اور نفس خواہشات کی مدد کرتا ہے۔ اور طبیعتیں جس قدر غذاؤں سے پرورش پاتی ہیں اور اس کا دبدبہ سارے اعضاء میں زیادہ پراگندہ ہو جاتا ہے اور ہر رگ میں اس کے انتشار سے ایک اور حجاب ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اور جب غذاؤں کا طلب گار نفس سے اپنا ہاتھ اُٹھا لیتا ہے اور نفس بہت ضعیف اور عقل زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے اور نفس کی قوت رگوں سے چھوٹ جاتی اور اسرار و دلائلِ قدرت اُس پر خوب واضح ہو جاتے ہیں اور جب نفس اپنی حرکتوں سے عاجز آ جاتا ہے اور اپنے وجود سے فانی ہو جاتا ہے تو باطل کا ارادہ بھی حق کے ظاہر کرنے میں محو ہو جاتا ہے۔ اس وقت مرید کی تمام مراد حاصل ہو جاتی ہے ــــــــ اور حضرت ابوالعباس قصاب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا "میری عبادت اور معصیت کا ارتکاب دو نکتوں سے وابستہ ہے کہ جب میں کچھ کھاتا ہوں تو تمام گناہوں کا مادہ اپنے اندر پاتا ہوں اور جب کھانے سے دست کش رہوں تو تمام اطاعات کی اصل اپنے اندر دیکھتا ہوں ــــــــ باقی بھوک کا ثمرہ مشاہدہ الٰہی ہے کیوں کہ مجاہدہ تو خود مشاہدہ کی طرف رہنما ہے، پس ایسی شکم پری جس کے ساتھ مشاہدہ حاصل ہو وہ اُس بھوک سے بہتر ہے جس میں محض مجاہدہ ہی ہو کیوں کہ مشاہدہ حق تو مردوں کا معرکہ گاہ ہے جب کہ مجاہدہ بچوں کے کھیلنے کی جگہ" فالشبع بشاھدِ الحق خیرٌ من الجوع بشاھدِ الخلق" (پس سیر خوری مشاہدہ حق کے ساتھ اُس بھوک سے بہتر ہے جس میں مخلوق کا مشاہدہ ہو) ــــ اس بارے میں کلام تو بہت سا ہے لیکن کتاب کی طوالت کے خوف سے اسی پر اکتفا کر رہا ہوں اور توفیق اللہ تعالیٰ کے ہی قبضہ میں ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

آٹھواں کشف حجاب

حج کے بیان میں

خداوند جل جلالہ ارشاد فرماتے ہیں کہ "وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا ط اور اللہ کے لئے بندوں پر بیت اللہ کا حج ضروری ہے جس میں اُس کی طرف جانے کی طاقت موجود ہو) بندے پر عاقل، بالغ، مسلمان اور طاقت ہونے کی صورت میں دوسرے فرائض کی طرح حج بھی ایک فرض ہے۔ تمام علماء کا اتفاق ہے کہ میقات میں پہنچ کر احرام باندھنا۔ میدانِ عرفات میں ٹھہرنا اور خانہ کعبہ کا طوافِ زیارت کرنا۔ اس کا نام حج ہے۔ اور اس میں اختلاف ہے کہ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا بھی بنیادی ارکان میں شامل ہے یا نہیں؟ تاہم احرام باندھے بغیر حرم کعبہ میں داخل نہ ہونا چاہئے ——

اور حرم کو حرم اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں مقامِ ابراہیمؑ ہے اور یہ محل امن و سلامتی ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو مقام ہیں ایک آپ کے جسم کا مقام اور دوسرا آپ کے دل کا مقام! آپ کے جسم کا مقام تو حرمِ مکہ ہے جب کہ آپ کے دل کا مقام خلت (دوستی حق) ہے۔ جو کوئی آپ کے جسمانی مقام کا ارادہ کر رہا ہو اُسے چاہئے کہ ہر قسم کی شہوتوں اور لذتوں سے اعراض کر کے احرام باندھے گویا کفن سا پہن کر حلال شکار سے بھی ہاتھ کھینچ لے اور تمام حواس کو بند کر لے اور میدانِ عرفات میں حاضر ہو جائے اور وہاں سے مزدلفہ اور مشعر حرام کی طرف روانہ ہو، حجر اسود سے آغاز کر کے مکہ مکرمہ میں خانہ کعبہ کا طواف کرے منیٰ میں آئے اور وہاں تین روز قیام کرے۔ شرط کے مطابق کنکریاں مارے اور اسی جگہ سر کے بالوں کا حلق کرے، قربانی کرے اور صحیح لباس پہن لے۔ لیکن جو شخص آپ کے مقامِ دل کا ارادہ کرے اُسے چاہئے کہ پسندیدہ چیزوں سے اعراض کرے، لذتوں اور راحتوں کو ترک کرے اور غیروں کی یاد سے کنارہ کش ہو جائے کیوں کہ اس صورت میں اس کا دنیا کی طرف

توجہ کرنا ممنوع ہے۔ اب اُسے چاہئے کہ وہ معرفتِ حق کے عرفات میں قیام کرے۔ وہاں سے محبتِ الٰہی کے مزدلفہ کی طرف سفر کرے، وہاں سے اپنے باطن کو تنزیہہ حق تعالٰی کے حرم کا طواف کرنے کے لئے روانہ کرے خواہشات کے سنگریزوں اور فاسد وسوسوں کو منیٰ میں پھینک آئے نفس کو مجاہدہ کے تسخیر کدہ میں قربان کر دے اور یوں مقامِ خلّت تک رسائی حاصل کر لے۔ پس اس مقامِ امن میں داخل ہونا دشمنوں اور اُن کی تلواروں سے مامون ہونے کا اور حضرت ابراہیمؑ کے مقامِ دل میں داخل ہونا خدا سے دوری اور اس طرح کی دوسری برائیوں سے مامون و محفوظ ہونے کا باعث ہے ——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ "الحاجّ وفدُ اللہِ یُعطیھم ما سألوا ویستجیبُ لھُمْ ما دعوا۔" (حاجی حضرات اللہ کا اپنا قافلہ ہیں۔ وہ جو مانگتے ہیں اللہ انہیں عطا کرتا ہے اور جو دعا کرتے ہیں اُسے قبول کرتا ہے) اور جو کچھ وہ چاہتے اور آرزو کرتے ہیں وہ پوری کرتا ہے۔ کچھ لوگ تو اللہ تعالیٰ سے پناہ کا سوال کرتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو نہ تو کسی خواہش کا اظہار کرتے ہیں اور نہ ہی کچھ مانگتے ہیں بلکہ اللہ کے ہر حکم کے سامنے سرِ تسلیم جھکا دیتے ہیں جیسا کہ حضرت ابراہیم صلوات اللہ وسلامہ نے کہا کہ "اِذْ قَالَ لَہٗ رَبُّہٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" (اور جب اسکے رب نے اُس سے کہا کہ فرمانبردار ہو جاؤ تو اُسنے کہا میں جہانوں کے رب کے لئے تابع فرمان ہوتا ہوں) اور حضرت ابراہیم علیہ السلام جب مقامِ خُلّت تک پہنچ کر دنیا کے تمام بندھنوں سے آزاد ہو گئے اور دل کو غیر اللہ سے الگ کر لیا تو حق تعالیٰ نے تمام مخلوق کے سامنے آپ کا جلوہ ظاہر کرنے کا ارادہ کیا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نمرود کو آپ پر مقرر کیا یہاں تک کہ اُس نے آپ کے اور آپ کے والدین کے درمیان جدائی ڈال دی اور آگ جلائی۔ ابلیس نے آکر ایک منجنیق تیار کی اور لوگوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو گائے کے چمڑے میں سی کر منجنیق کے ایک پلڑے میں رکھ دیا۔ جبرئیلؑ حاضر ہوئے اور منجنیق کا پلڑا پکڑ کر کہنے لگے۔ "ھَلْ لَکَ اِلَیَّ مِنْ حَاجَۃٍ" (آپ کو میری ضرورت ہے؟) آپ نے جواب دیا "اَمَّا اِلَیْکَ فَلَا۔" (تمہاری طرف تو کوئی حاجت نہیں) انہوں نے پوچھا کیا اللہ تعالیٰ کی طرف بھی آپ کوئی حاجت نہیں رکھتے؟ تو فرمایا "حَسْبِیْ مِنْ سُؤَالِیْ عِلْمُہٗ بِحَالِیْ"

(میرے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اس کو میری حالت کا علم ہے کہ یہ لوگ مجھے اُسی کی خاطر آگ میں ڈال رہے ہیں) اللہ تعالٰی کو میری حالت کا جو علم ہے اُس نے زبان سے سوال کرنے سے مجھے منقطع کر دیا ہے ______

محمد بن الفضل رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مجھے اس بات پر بڑا تعجب ہے کہ لوگ دنیا میں تو اُس کا گھر بیت اللہ تلاش کرتے ہیں لیکن اپنے دل میں اس کے مشاہدے کی جستجو کیوں نہیں کرتے حالانکہ بیت اللہ کبھی تو زمین پر موجود ہوتا ہے اور کبھی معدوم ہوتا ہے کہ اس کی عمارت گر چکی ہوتی ہے جب کہ اُس کا مشاہدہ ہر حال میں موجود ہوتا ہے، اگر اُس عمارت کے پتھروں کی زیارت فرض ہے جس پر سال میں ایک دفعہ اُس کی نظر ہوتی ہے تو دل جو دن رات میں تین سو ساٹھ مرتبہ اس کی نگاہ رحمت کا مرکز بنتا ہے اس کی زیارت تو زیادہ بہتر ہوگی ______ تاہم مکہ مکرمہ کے راستہ میں اہل تحقیق کے لئے ہر قدم پر قدرت کی ایک نشانی موجود ہے اور جب وہ حرم پاک میں پہنچ جاتے ہیں تو ہر ایک سے خلعت پاتے ہیں ______ اور حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس کسی کی عبادت کی جزا اور ثواب کل پر موقوف ہو۔ اُسے کہہ دو کہ تم نے تو آج کوئی عبادت ہی نہیں کی کیوں کہ ہر شخص کو عبادت اور مجاہدے کا ثواب زمانۂ حال میں ہی حاصل ہوتا ہے نیز آپ ہی کہتے ہیں کہ میں نے پہلی دفعہ حج کے موقع پر خانہ کعبہ کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا دوسری مرتبہ گھر بھی دیکھا اور گھر والے کو بھی دیکھا اور تیسری مرتبہ گھر کے مالک کو ہی دیکھا۔ گھر کو ہرگز نہیں دیکھا ______ خلاصہ یہ کہ حرم وہاں نہیں ہوتا جہاں صرف مجاہدہ ہو بلکہ وہاں ہوتا ہے جہاں پُر عظمت مشاہدہ ہوتا ہے اور جس شخص کے لئے سارا جہان قربِ الٰہی کی جلوہ گاہ اور محبتِ خداوندی کا خلوت کدہ نہ ہو وہ دوستی کے مفہوم سے بالکل بے خبر ہوتا ہے اور جب بندہ پر تمام بھید کھل جائیں تو سارا جہان ہی اس کے لئے بمنزلہ حرم ہوتا ہے لیکن اگر وہ حجاب میں ہو تو حرم بھی اُس کے لئے تمام جہان سے زیادہ تاریک مقام ہوتا ہے۔

ع "اَظْلَمُ الْاَشْیَاءِ دَارُ الْحَبِیْبِ بِلَا حَبِیْبٍ"

(عاشق کے لئے محبوب کے بغیر محبوب کا گھر سب سے زیادہ ظلمت کدہ ہوتا ہے) پس

خلوت کے محل میں مشاہدے کی قیمت اپنی ذات کو فناء کرنے سے ہی ادا ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ نے دیدارِ کعبہ کو اُس کا سبب قرار دیا ہے نہ کہ یہ قیمت محض کعبہ کی ہے، تاہم سبب کے ساتھ سبب کی حد تک ہی تعلق ہونا چاہئے تاکہ یہ پتہ چلے کہ حق تعالےٰ کی عنایت کون سی کمین گاہ سے ظہور پذیر ہوتی ہے اور طالب کی مراد کہاں سے بر آتی ہے! پس جنگلوں اور بیابانوں کا سفر کرنے سے مردانِ خدا کی مراد محض حرم نہیں ہوتا کہ حق تعالےٰ کے دوست کے لئے محض حرم کو ہی دیکھنا تو حرام ہے بلکہ اُن کا مقصود تو وہ مجاہدہ ہوتا ہے جس میں بیقرار کر دینے والا شوق اور حق تعالےٰ کی محبت میں ہمیشہ حاصل ہونے والا ایک سرور موجود ہو —— ایک شخص حضرت جنید رحمۃ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے دریافت کیا کہ تم کہاں سے آئے ہو؟ اُس نے جواب دیا "میں حج پر گیا ہوا تھا" —— حضرت جنید نے پوچھا "کیا تو نے حج کیا ہے؟ اس نے کہا "جی ہاں!" آپ نے پوچھا "ابتداء میں جب تو گھر سے روانہ ہوا اور وطن سے تو نے رحلت کی تو کیا اُس وقت تمام گناہوں سے بھی تو نے رحلت اختیار کر لی تھی؟ اس نے کہا" ایسا تو نہیں ہوا۔" آپ نے فرمایا "گویا تو نے سفر ہی اختیار نہیں کیا پھر آپ نے پوچھا گھر سے روانہ ہونے کے بعد جس جس منزل پر تو نے رات گزاری ہے کیا ہر مقام پر تو نے طریق حق کا بھی ایک مقام طے کیا ہے؟ اس نے جواب دیا" ایسا تو نہیں ہو سکا" آپ نے فرمایا "تو گویا تو نے منزلیں ہی طے نہیں کیں"۔ پھر آپ نے دریافت کیا" جب تو میقات سے احرام کی حالت اختیار کی تو کیا صفاتِ بشریت سے اسی طرح تو جُدا ہو گیا تھا جس طرح تو پہلے لباس اور پہلی عادات سے جدا ہوا تھا؟ اس نے کہا" ایسا نہیں ہوا" آپ نے کہا" تو گویا تو محرم ہی نہیں ہوا" آپ نے سوال کیا" جب تو نے وقوفِ عرفات کیا تو کیا تمہیں مشاہدہ حق میں بھی کھڑا ہونا نصیب ہوا یا نہیں"؟ اس نے جواب دیا" نہیں" —— آپ نے فرمایا" تو پھر تو نے وقوفِ عرفات ہی نہیں کیا" پھر آپ نے پوچھا "جب تو مزدلفہ میں تھا اور تیری مراد تجھے حاصل ہو رہی تھی تو کیا تو نے نفس کی تمام خواہشات کو ترک کر دیا تھا؟ اس نے کہا" نہیں" —— آپ نے فرمایا" پھر تو مزدلفہ میں بھی نہیں پہنچا" پھر آپ نے دریافت کیا" جب تو نے خانہ کعبہ کا طواف کیا تو کیا دل کی آنکھ سے مقام تنزیہہ

تقدیس میں جمالِ خداوندی کے لطائف کا نظارہ بھی کیا؟ اس نے کہا "نہیں" تو آپ نے فرمایا" پھر تو نے گویا طواف ہی نہیں کیا"۔ پھر آپ نے سوال کیا" جب تو نے صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی تو کیا مقامِ صفا اور درجۂ مروہ کا ادراک بھی کیا"؟ اس نے کہا "نہیں" آپ نے فرمایا" تو گویا تو نے ابھی تک سعی نہیں کی" آپ نے پوچھا" جب تو منیٰ میں پہنچا تو کیا تیری ہستی تجھ سے ساقط ہو گئی تھی؟ کہنے لگا "نہیں" آپ نے کہا" تو ابھی تک تو منیٰ میں نہیں پہنچا" پھر آپ نے پوچھا" جب تو نے قربان گاہ میں پہنچ کر جانور کی قربانی پیش کی تو کیا نفسانی خواہشات کو بھی وہاں قربان کر دیا تھا؟ اس نے کہا "نہیں" آپ نے فرمایا" پس تو نے قربانی ہی نہیں کی" آپ نے دریافت کیا" اور جب تو کنکریاں مار رہا تھا تو کیا تو نے اپنے تمام نفسانی معاملات کو بھی وہاں پھینک دیا تھا؟ اُس نے کہا "نہیں" تو آپ نے فرمایا" پس ابھی تک تو نے کنکریاں نہیں پھینکیں اور حج ادا نہیں کیا۔ لہٰذا لوٹ جا اور ان صفات کے ساتھ حج ادا کرتا کہ تو مقامِ ابراہیم تک رسائی حاصل کر سکے۔

میں نے سُنا ہے کہ بزرگوں میں سے ایک شخصیت کعبۃ اللہ کے سامنے بیٹھے رو رہے تھے اور یہ اشعار پڑھ رہے تھے ——— اشعار

وَاَصبحتُ یومَ النحرِ والعیسُ ترحلُ ـ وکان حدیُ الحادی بِنا وَمُعجِلُ

اور قربانی کے دن جب سفید اونٹ کوچ کر رہے تھے اور حُدی خوان نے آواز لگادی تھی اور وہ جلدی کر رہا تھا۔

وَسائلٌ عن سلمٰی فَھل من مخبرٍ بانّ لہٗ علماً بھا این تنزلُ،

میں اپنی محبوبہ سلمیٰ کے بارے میں دریافت کرنے لگا کہ ہے کوئی جس کو اس کے بارے میں علم ہو کہ وہ کہاں اُترے گی؟

لقد اُفسدتْ حجّی وَنُسکی وَعُمرتی وَفی البین لِی شغلٌ من الحج اشغل

محبوبہ نے تو میرا حج، میری قربانی اور میرا عمرہ سب فاسد کر دیئے اور میں حج سے بھی زیادہ اُس کے فراق کے شغل میں مشغول ہوں۔

سَارجِعُ من معاصِتی لِحجّۃٍ قابلٍ   فانَّ الذّی قد کان لا یتقبّلُ

عنقریب میں اپنے گناہوں سے ایک قبول ہونے والے حج کی طرف لوٹ جاؤں گا کیوں کہ جو حج ہو چکا وہ تو قبول نہیں ہوا۔

حضرت فضل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک جوان کو دیکھا جو موقفِ حج میں سر جھکائے بالکل خاموش کھڑا تھا۔ تمام لوگ تو دعاؤں میں مشغول تھے لیکن وہ چپ چاپ کھڑا تھا" میں نے کہا" اے جوان! تو بھی دعا اور خوشی میں کیوں مشغول نہیں ہو جاتا؟ وہ کہنے لگا "مجھ پر وحشت سی طاری ہو گئی ہے اور دعا و انبساط کا جو وقت تھا وہ مجھ سے فوت ہو چکا ہے اب میرے لئے دعا کرنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی" میں نے کہا "تم دعا کرو تاکہ اللہ تعالٰی اس مجمع حج کی برکت سے تمہیں تمہاری مراد تک پہنچا دے"۔ حضرت فضیلؒ کہتے ہیں کہ اس نے چاہا کہ ہاتھ اٹھائے اور دعا کرے لیکن اس کے اندر سے ایک نعرہ بلند ہوا اور اس نعرہ کے ساتھ ہی اُس کی جان نکل گئی ——— اور حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ تعالٰے بیان کرتے ہیں کہ "میں نے منیٰ میں ایک جوان کو دیکھا جو سکون کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جب کہ تمام لوگ اپنی اپنی قربانیوں میں مصروف تھے، میں نے اُس پر نگاہ رکھی کہ وہ کیا کرتا ہے اور وہ ہے کون! (تھوڑی دیر کے بعد) وہ کہنے لگا "بار خدایا! اس وقت تمام لوگ اپنی قربانیوں میں مشغول ہیں لہٰذا میں بھی چاہتا ہوں کہ اپنے آپ کو تیری بارگاہ میں قربان کر دوں تو میری قربانی قبول کرنا" یہ کہا اور اپنی انگشتِ شہادت کے ساتھ اپنی گردن کے درمیان ایک اشارہ کیا اور گر پڑا۔" میں نے جو غور سے دیکھا تو حق تعالٰے اُس پر رحم نازل کرے وہ مر چکا تھا۔"

پس حج دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک غیبت میں اور دوسرا حضور میں، جو کوئی مکہ مکرمہ میں پہنچ کر بھی غیبت میں ہو وہ ایسا ہی ہے جیسے اپنے گھر میں وہ غیبت میں تھا۔ کیوں کہ ایک غیبت دوسری غیبت سے بہتر نہیں ہوتی۔ اور جو کوئی اپنے گھر میں ہوتے ہوئے بھی بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہو وہ ایسے ہی ہے جیسے مکّہ مکرّمہ میں حاضر ہے کیوں کہ کوئی حضور دوسرے حضور سے مختلف نہیں ہوتا۔ پس حج

مجاہدات کے کشف کے لئے ایک مجاہدہ ہے اور کوئی مجاہدہ ، مشاہدہ کے لئے علت نہیں بن سکتا۔ کیوں کہ یہ ایک سبب ہے اور کسی سبب کو معانی حقیقت میں کوئی زیادہ تاثیر نہیں ہوتی۔ پس حج سے مقصود خانہ کعبہ کی زیارت نہیں ہوتا بلکہ مقصود مشاہدہ حق کا ظہور ہے ــــــ انشاء اللہ اب میں مشاہدہ حق کے متعلق ایک باب بیان کرتا ہوں جو انہی معانی کے ساتھ متضمن ہے تاکہ تیرے مقصد کا حصول قریب تر ہو جائے۔ ـــــ

والله اعلم بالصواب

باب

مشاہدہ کا بیان

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "اجیعوا بطونکم، دعوا الحرص۔ واعروا اجیادکم۔ تصروا الامل، واظمأ واکبادکم دعوا الدنیا لعلکم ترون اللہ بقلوبکم" اپنے شکموں کو بھوکا رکھو، حرص کو چھوڑ دو، اور اپنے جسموں کو ننگا رکھو، امیدیں کم کرلو۔ اور اپنے جگروں کو پیاسا رکھو، دنیا چھوڑ دو تاکہ تم اللہ کو اپنے دل سے دیکھ سکو، نیز آپ نے جبرئیل کی طرف سے احسان کے بارے میں سوال پر فرمایا "اَن تعبدَ اللہ کانّک تراہُ فاِن لَمْ تکن تراہُ فانّہٗ یراك" (یہ کہ تو اللہ کی عبادت بایں طور کرے کہ گویا تو اللہ کو دیکھ رہا ہے اور اگر تو اُسے نہیں دیکھ سکتا تو وہ تو تمہیں یقیناً دیکھ رہا ہے) اور حق تعالٰے نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی تھی کہ "یا داؤد اتدری ما معرفتی، قال لا، قال ھِیَ حیاۃ القلب فی مشاھدتی" اے داؤدؑ کیا تم جانتے ہو کہ میری معرفت کیا ہے؟ انہوں نے کہا "نہیں! تو ارشاد ہوا" میرے مشاہدہ میں دل کا زندہ رہنا میری معرفت ہے) اور صوفیہ کے ہاں عبادت سے مراد دل کی آنکھوں سے مشاہدہ حق ہے۔ یعنی خلاء و فضا میں ہر وقت دل سے حق تعالٰی کو ہی دیکھیں ــ اور حضرت ابو العباس بن عطاء رحمۃ اللہ حق تعالٰے کے اس ارشاد "اِنّ الذین قالو ربنا اللہ ثم استقاموا" کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ "اِنّ الذین قالوا ربنا اللہ یا لمجاھدۃ، ثمّ استقاموا علی بساط المشاھدۃ" (جن لوگوں نے مجاہدہ کی حالت میں کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر مشاہدہ کے بچھونے پر مضبوطی سے قائم رہے) ـــــــ حقیقتِ مشاہدہ دو طرح پر ہے ــ ایک یقین کی صحت ــ اور دوسرے یہ کہ غلبۂ محبت میں یہاں تک پہنچ جائے کہ اُس کا پورا وجود حدیث یار بن کر رہ جائے اور دوست کے علاوہ اُسے کچھ نظر نہ آئے۔

حضرت محمد بن واسعؒ کہتے ہیں کہ "مَا رَأَیْتُ شَیْئاً قَطُّ اِلَّا وَرَأَیْتُ اللّٰہَ فِیْہِ اَیْ بِصِحَّۃِ الْیَقِیْنِ" (میں نے جس چیز کو بھی دیکھا اُسی میں مجھے صحتِ یقین کے ساتھ حق تعالیٰ جلوہ گر نظر آیا) ـــــ مشائخ میں سے ایک بزرگ کہتے ہیں کہ "مَا رَأَیْتُ شَیْئاً اِلَّا وَرَأَیْتُ اللّٰہَ قَبْلَہٗ" (میں نے ہر چیز کے سامنے حق تعالیٰ کو دیکھا) اور یہ مخلوق میں حق تعالیٰ کے دیدار کی کیفیت ہے ـــــ اور حضرت شبلی رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ "مَا رَأَیْتُ شَیْئاً قَطُّ اِلَّا اللّٰہَ یعنی بِغَلَبَاتِ الْمَحَبَّۃِ وَغَلَیَانِ الْمُشَاھَدَۃِ" (محبتِ الٰہی کے غلبہ اور جوشِ مشاہدہ میں مَیں نے اللہ کے سوا کسی چیز کو دیکھا ہی نہیں) گویا ایک شخص تو کسی فعل کو دیکھتا ہے اور وہ اس فعل کی دید میں اپنے سر کی آنکھوں سے فاعل کو دیکھتا ہے اور دوسرا سر کی آنکھ کے ساتھ فعل کو دیکھتا ہے لیکن فاعل کی محبت اُس کو ہر چیز سے بے نیاز کر دیتی ہے اور وہ صرف فاعل کو ہی دیکھتا ہے۔ پس اس پہلے شخص کا طریقہ تو استدلالی ہے لیکن اس دوسرے کا جذبی ہے۔ یعنی ایک تو مستدل ہے

دلائل کے اثبات سے حق اس پر عیاں ہوتا ہے جب کہ دوسرا مجذوب ہے کہ حق تعالیٰ کی محبت میں بیخود ہوتا ہے یعنی دلائل اور حقائق اس کے نزدیک سب حجاب ہوتے ہیں "لِاَنَّ مَنْ عَرَفَ شَیْئاً لَا یَطْمَئِنُّ بِغَیْرِہٖ وَمَنْ اَحَبَّ شَیْئاً لَا یُطَالِعُ غَیْرَہٗ نَیتْرُکُ الْمُنَازَعَۃَ مَعَہٗ وَالْاِعْتِرَاضَ عَلَیْہِ فِیْ اَحْکَامِہٖ وَاَفْعَالِہٖ"۔ (کیوں کہ جو شخص کسی چیز کی معرفت حاصل کر لیتا ہے وہ اس کے بغیر مطمئن ہی نہیں ہوتا اور جو کسی چیز کے ساتھ محبت رکھتا ہے وہ اُس کے سوا کسی کو دیکھتا تک نہیں پھر وہ اُس کے کام پر اُس سے تنازع نہیں کرتا اور اُس کے کردار پر کوئی اعتراض بھی نہیں کرتا) تاکہ اُس کے حکم کو رد کرنے والا نہ بنے اور حق تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی معراج کے متعلق ہمیں خبر دی ہے کہ "مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی"۔ (آپؐ کی نگاہ نہ تو تجلیاتِ الٰہی سے ہٹی اور نہ حد سے آگے بڑھی) یعنی دیدارِ الٰہی کے شدتِ شوق میں آپؐ نے نگاہ کسی چیز سے ہٹائی نہیں حتیٰ کہ جو کچھ بھی تجلیاتِ ربانی سے سامنے آیا آپؐ نے اُسے دل کی آنکھوں سے دیکھا۔ کیوں کہ جب کبھی بھی انسان آنکھ کی محبت موجودات سے ہٹا لیتا ہے لامحالہ اپنے دل سے اپنے خدا کا دیدار

کر لیتا ہے ــــــــــــ اور اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں "لَقَدۡ رَاٰی مِنۡ اٰیَاتِ رَبِّہِ الۡکُبۡرٰی"۔ (یقیناً آپؐ نے اپنے پروردگار کی بڑی نشانیوں کو دیکھا) اور نیز ارشاد ربانی ہے کہ "قُلۡ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ یَغُضُّوۡا مِنۡ اَبۡصَارِھِمۡ، اَیۡ ابصار لعیون مِنَ الشھواتِ وابصار القلوب عن المخلوقات" (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم! مومنوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی آنکھیں نیچی رکھا کریں، یعنی آنکھوں کی بصارت کو شہوات کے دیکھنے سے اور دل کی بصارت کو پوری مخلوقات کو دیکھنے سے) پس جو کوئی سر کی آنکھوں کو خواہشات کے دیکھنے سے روک لیتا ہے لامحالہ وہ سر کی آنکھوں سے ہی حق تعالےٰ کو دیکھ لیتا ہے "فَمَنۡ کان اخلص مجاھدۃ کان اصدق مشاھدۃ" (جو کوئی مجاہدے میں جتنا مخلص ہوگا وہ مشاہدہ حق میں اتنا ہی زیادہ سچا ہوگا) پس باطنی مشاہدہ، ظاہری مجاہدے کے ساتھ ہوا کرتا ہے" ــ حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ فرماتے ہیں "مَنۡ غضّ بَصَرَہٗ عن اللّٰہِ طرفۃ عین لم یَھۡتَدِ طول عمرہٖ" (جو کوئی ایک لمحے کے لئے بھی حق تعالےٰ کو دیکھنے سے غافل ہو گیا وہ اپنی طویل زندگی میں راہ راست پر نہیں آسکتا) اس لئے کہ غیر کی طرف التفات کرنا حق تعالےٰ سے غیر کی طرف لوٹنا ہے اور حق تعالےٰ جس کو بھی غیر کے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ پس ارباب مشاہدہ کے نزدیک زندگی وہ ہوتی ہے جس میں وہ مشاہدہ حق میں رہیں، اور جو وقت غیبت میں بسر ہو اُسے وہ زندگی میں شمار ہی نہیں کرتے کہ وہ وقت اُن کے لئے درحقیقت بمنزلہ موت کے ہوتا ہے ــ چنانچہ حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ کی عمر کتنی ہے؟ آپ نے جواب دیا "چار سال" ــ وہ کہنے لگے "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" ــ آپ نے فرمایا "ستر سال تو ایسے ہیں کہ زندگی حجاب میں گزری ہے، تاہم چار سال اب اس طرح ہیں کہ میں اس کے سوا کسی کو نہیں دیکھتا اور حجاب کا زمانہ عمر میں شمار نہیں ہوتا ــ حضرت شبلیؒ دعا کی حالت میں کہا کرتے تھے کہ اَللّٰھُمَّ اخبأ الجنۃ والنار فی خبا یا غیبک حتی نعبدک بغیر واسطۃ "اے اللہ! جنت اور دوزخ کو اپنے غیب کے پردوں میں چھپا دے تاکہ ہم بغیر کسی واسطے کے تیری عبادت کریں" یعنی جنت و دوزخ کی یاد لوگوں کے

دل سے بھلادے تاکہ وہ اُن کی وجہ سے تیری پرستش نہ کریں کیوں کہ جب بہشت میں طبیعت کے لئے ایک کشش ہے تو آج عقلمند آدمی یقیناً اُسی کے حصول کے لئے عبادت کرتا ہے اور اگر دل کو محبتِ خداوندی کا کوئی حصہ حاصل نہیں ہے تو لامحالہ غافل انسان مشاہدۂ حق سے حجاب میں رہے گا۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج کے متعلق حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ سلام اللہ علیہا کو بتلایا کہ "میں نے حق تعالےٰ کو نہیں دیکھا"۔ جب کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ "میں نے حق تعالےٰ کو دیکھا ہے"۔ ـــــ پس لوگ اس معاملے میں اختلاف کرنے لگے، حالانکہ بہتر طریق وہ تھا جو درمیانہ ہے کہ آپ نے جو فرمایا کہ میں نے دیکھا ہے تو اس سے باطن کی آنکھوں سے دیکھنا مراد ہے اور جو یہ فرمایا کہ نہیں دیکھا تو یہ ظاہری آنکھ سے نہ دیکھنے کو بیان فرمایا ہے چونکہ ان دونوں میں سے ایک اہل باطن میں سے تھے اور ایک اہل ظاہر میں سے، اس لئے ان میں سے ہر ایک کے ساتھ اس کے مرتبے کے مطابق گفتگو فرمائی ـــــ پس جب آپ نے باطن کی آنکھ سے دیکھ لیا تو یہ اگر ظاہری آنکھوں کے واسطہ سے نہ بھی ہو تو کیا فرق پڑتا ہے ـــــ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ اگر اللہ تعالےٰ نے مجھ سے کہا کہ "مجھے دیکھو!" تو میں عرض کروں گا کہ "میں نہیں دیکھتا" کیوں کہ محبت میں آنکھیں بھی غیر اور بیگانہ ہیں جب کہ غیریت کی غیرت مجھے دیدار سے باز رکھتی ہے کیوں کہ دنیا میں بھی میں حق تعالےٰ آنکھوں کے واسطے کے بغیر دیکھتا رہا ہوں تو آخرت میں اس واسطے کو میں کیا کروں گا ـــــ واللہ الہادی واللہ اعلم بالصواب ـــــ شعر

وَاَغُضُّ طَرْفِی اِذَا نَظَرْتُ اِلَیْكَ   وَاِنِّی لَاَحْسُدُ نَاظِرِیْنَ اِلَیْكَ

(میں تیری طرف دیکھنے والوں سے حسد کرتا ہوں اور جب خود تجھے دیکھتا ہوں تو آنکھیں بند کر لیتا ہوں)

کہ دوست کو اپنی نگاہوں سے دیکھنا بھی مناسب نہیں سمجھتے کیوں کہ آنکھ بھی بیگانہ ہوتی ہے اُس بزرگ سے لوگوں نے پوچھا کہ کیا آپ اللہ تعالےٰ کو دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا "نہیں" ـــــ لوگوں نے پوچھا "آخر کیوں؟" تو انہوں نے فرمایا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھنا چاہا تو دیکھ نہ سکے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دیدار کی درخواست نہ کی۔

تو دیدار سے مشرف ہوئے، پس ہمارا چاہنا ہمارے لئے دیدارِ خداوندی سے حجابِ اعظم ہے اس لئے کہ محبت میں اپنے ارادے کا وجود بھی ایک طرح کی مخالفت ہوتی ہے۔ اور مخالفت حجاب ہوتی ہے، جب دنیا میں اپنا ارادہ ختم ہو جاتا ہے تو مشاھدہ حاصل ہو جاتا ہے اور جب مشاہدہ ثابت ہو جاتا ہے تو دنیا آخرت کی طرح اور آخرت دنیا کی طرح ہو جاتی ہے ـــــ حضرت بایزیدؒ کہتے ہیں کہ "اِنَّ لِلّٰہِ عِبَادًا لَوْ حُجِبُوْا عَنِ اللّٰہِ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ لَارْتَدُّوْا" (بلاشبہ اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں کہ اگر وہ دنیا و آخرت میں دیدارِ الٰہی سے حجاب میں رکھے جائیں تو وہ مرتد ہو جائیں) یعنی حق تعالےٰ ہر وقت اپنے مشاہدہ سے اُن کی پرورش کرتا رہتا ہے، اور محبت کی زندگی سے اُن کو زندہ رکھتا ہے۔ پس لامحالہ صاحبِ مشاہدہ اگر محجوب ہو کر مشاہدہ سے محروم ہو جائے تو وہ راندۂ درگاہ ہو جاتا ہے

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ایک دن میں مصر میں جا رہا تھا کہ بچوں کو دیکھا کہ ایک نوجوان پر پتھر برسا رہے ہیں، میں نے اُن لڑکوں سے کہا "تم اُس سے کیا چاہتے ہو؟ وہ کہنے لگے" یہ ایک دیوانہ ہے" میں نے پوچھا" آخر دیوانگی کی کونسی علامت اُس سے ظاہر ہو رہی ہے؟ انہوں نے کہا" یہ کہتا ہے کہ میں خدا تعالیٰ کو دیکھتا ہوں" ـــــ میں نے اُس نوجوان سے پوچھا" اے جوانمرد کیا تو یہ کہتا ہے یا یہ تجھ پر الزام لگاتے ہیں؟ اس نے جواب دیا" نہیں! بلکہ میں ہی یہ کہتا ہوں کیوں کہ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی میں حق تعالےٰ کو نہ دیکھوں تو میں محجوب ہو جاؤں اور اُس کی فرمانبرداری نہ کر سکوں" ـــــ باقی اہل طریقت کے ہی ایک گروہ کو اس معاملے میں غلطی واقع ہوئی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ دلوں کے دیکھنے اور اُس کے مشاہدے کی کوئی صورت ہوتی ہے کہ ذکر و فکر کی حالت میں "وہم" دل کے اندر اُس کو ثابت کرتا ہے حالانکہ یہ تشبیہہ محض اور کھُلی گمراہی ہے کیوں کہ حق تعالےٰ کی کوئی مقدار یا اندازہ نہیں ہے۔ کہ دل میں وہم کے ذریعہ اندازہ کیا جا سکے یا عقل اُس کی کیفیت سے مطلع ہو سکے جو کچھ موہوم ہو گا۔ وہ بھی وہم کی جنس سے ہی ہو گا اور جو کچھ عقل میں آئے گا وہ عقل کی ہی جنس سے ہو گا، اور حق تعالےٰ جنسوں کا ہم جنس نہیں ہے اور تمام لطیف و کثیف چیزیں ایک دوسرے کی جنس ہوتی ہیں اور یہ محلِ ضدین ایک دوسرے کے ساتھ ہم جنس ہوتی ہیں، اس لئے کہ توحید کی تحقیق

میں قدیم کے مقابلے میں ضد بھی ایک جنس ہو گی۔ کیوں کہ اضداد حادث ہوتے ہیں اور تمام حادث ایک جنس ہیں، ملحدین جن چیزوں کو حق تعالےٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں حق تعالےٰ اُن سے بہت زیادہ بلند ہے پس دنیا میں مشاہدہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسے آخرت میں رویت باری تعالیٰ۔ جب تمام اصحاب طریقت و معرفت کے اجماع و اتفاق سے آخرت میں رویت حق روا ہے تو پھر دنیا میں مشاہدہ بھی جائز ہو گا۔ پس اُس مخبر میں جو آخرت کے مشاہدہ کی خبر دیتا ہے اور اُس مخبر میں جو مشاہدۂ دنیا کی خبر دیتا ہے کوئی فرق نہیں ہو گا وہ ان دونوں باتوں کی خبر دیتا ہے۔ دعویٰ نہیں کرتا یعنی وہ یہ کہتا ہے کہ دیدار اور مشاہدہ جائز ہے یہ ہرگز نہیں کہتا کہ مجھے دیدار حاصل ہوا ہے یا اس وقت حاصل نہیں ہے۔ اس لئے کہ مشاہدہ تو باطن کی صفت ہے جب کہ خبر دینا زبان کی عبادت ہے اور اگر زبان کو باطن کی خبر ہو کہ وہ اُس کو بیان کر سکے تو یہ مشاہدہ نہ ہو گا بلکہ ایک دعویٰ ہو گا کیوں کہ جس چیز کی حقیقت عقول کے اندر ثبات نہیں پاتی زبان اُس کو عبارت میں کس طرح بیان کرنے کی تاب رکھتی ہے سوائے مجاز کے" لٰکنّ المشاھدۃ قصر اللسان بحضور الجنان"۔ پس اس معاملے میں سکوت کا درجہ نطق سے زیادہ برتر ہے کیوں کہ سکوت مشاہدہ کی علامت ہے جب کہ نطق شہادت کا نشان ہے اور کسی چیز پر شہادت دینے اور کسی چیز کے مشاہدے کے درمیان بڑا واضح فرق ہے — یہی وجہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ مقام قرب میں اور اُس بلند محل میں تھے جو حق تعالےٰ نے آپ کے لئے مخصوص کر دیا ہے اس لئے آپ نے کہا "لَا اُحْصِی ثَنَاءً عَلَیْکَ"۔ (میں تیری تعریفوں کا احاطہ نہیں کر سکتا) کیوں کہ آپ مشاہدہ میں تھے اور مشاہدہ مقام محبت میں کمال درجے کی یگانگی ہوتا ہے اور یگانگی میں عبارت سے بیان کرنا بھی ایک بیگانگی ہوتا ہے چنانچہ اس جگہ آپ نے کہا " اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ (تو ایسا ہی ہے جیسا کہ تو نے خود اپنی ثنا بیان کی ہے) یعنی اس مقام پر تیرا کہا ہوا میرا کہا ہوا ہو گیا ہے اور تیری ثنا میری ثناء ہو گئی ہے کہ میں زبان کے لئے اس بات کی اہلیت نہیں سمجھتا کہ میری حالت کی تعبیر کر سکے نیز میں بیان کو اس بات کا مستحق بھی نہیں سمجھتا کہ وہ میرا حال ظاہر کرے — اور اس معنی میں ایک کہنے والے نے کہا ہے۔ شعر

تمنیتُ من اھویٰ فلمّا اٰتیتُہٗ بُھِتُّ فلَمْ املِکْ لِسَانًا وّلا طرفًا

میں اپنے محبوب سے ملاقات کی تمنا کرتا تھا لیکن جب میں نے اسے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ پھر میری زبان اور میری آنکھ میرے قابو میں نہ رہے۔

اختصار کے طور پر یہ تھے مشاہدہ کے تمام احکام جو بیان کر دیئے گئے۔ وباللہ التوفیق

نواں کشفِ حجاب

صحبت، اس کے آداب اور احکام

اللہ عزّ وجل کا ارشاد ہے کہ "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا۔ —اَیْ اَدِّبُوْھُمْ۔" (اے ایمان والو اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ سے بچاؤ۔ یعنی ان کو ادب سکھاؤ") اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "حسن الآداب مِن الایمان" (اچھے اداب، ایمان کا حصہ ہیں) نیز یہ بھی فرمایا "اَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَادِیْبِیْ" (مجھے میرے رب نے ادب سکھایا اور اچھا ادب سکھایا) پس جان لو کہ دین اور دنیا کے تمام امور کا حسن ادب کے ساتھ ہی متعلق ہے اور اصنافِ خلق کے مقامات میں سے ہر مقام کے لیے ایک اَدب ہے اور کافر و مسلمان، ملحد و توحید پرست اور سنی و بدعتی سب اس بات پر متفق ہیں کہ تمام معاملات میں حسن اداب ایک پسندیدہ امر ہے اور جہان میں ادب کے استعمال کے بغیر کوئی رسم بھی ثابت نہیں ہو سکتی۔ لوگوں میں مروّت کی حفاظت، دین میں سنت کے تحفظ اور دنیا میں حرمت و عزت کی حفاظت کا نام ادب ہے اور یہ تینوں امور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ ہیں اس لیے کہ جس کسی میں مروّت نہیں اس میں سنت کا اتباع نہیں ہو سکتا اور جس کسی میں سنت کا جذبہ نہیں اس میں حرمت و ناموس کا بھی کوئی لحاظ نہیں، اور معاملات میں، ادب کی حفاظت دل میں مطلوب کی تعظیم کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور حق تعالےٰ اور اس کے شعائر کی تعظیم کرنے سے حاصل ہوتی

ہے اور حق تعالیٰ اور اُس کے شعائر کی تعظیم راہِ تصوف میں تقویٰ سے ہے اور جو کوئی بے حرمتی سے شواہدِ حق کی تعظیم کو پامال کرتا ہے اُس کو صوفیہ کے طریق سے کوئی حصہ حاصل نہیں ہوتا۔ اور طالبِ حق اور سُکر اور غلبہ میں سے کوئی حالت بھی آداب کا لحاظ رکھنے سے نہیں روکتی اس لئے کہ ادب کرنا اُن کی عادت ہوتی ہے اور عادت طبیعت کا قرینہ ہوتی ہے اور جان دار چیز سے طبیعتوں کا ساقط ہو جانا کسی حالت میں بھی متصور نہیں ہو سکتا کہ جب تک زندگی موجود ہے طبیعت کا سقوط محال ہے، پس جب تک انسانی تشخص موجود ہے اُس وقت تک کبھی تکلف کے ساتھ اور کبھی تکلف کے بغیر تمام احوال میں آداب کی متابعت انسانوں میں جاری رہے گی۔ جب اُن کی حالت صحو کی ہوگی وہ بتکلف آداب کی حفاظت کریں گے اور جب اُن کا حال سُکر کا ہوگا حق تعالیٰ خود اُن پہ ادب کی نگہداشت کریں گے اور ادب کو ترک کرنے والا کسی طرح بھی ولی نہیں ہو سکتا۔ " لِاَنَّ الْمَوَدَّةَ عِنْدَ الْاٰدَابِ وَحُسْنَ الْاٰدَابِ صِفَةُ الْاَحْبَابِ " (اس لئے کہ آداب کی موجودگی میں ہی محبت ہوتی ہے اور حسن ادب دوستوں کی صفت ہے) اور اللہ تعالیٰ جس شخص کو عزت و کرامت عطا فرماتے ہیں اُس کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ احکام دین کے آداب سے متعلق اُس کی نگہداری کرتے ہیں، بخلاف بے دینوں کے گروہ کے اللہ تعالیٰ اُن پہ لعنت کرے جو یہ کہتے ہیں کہ جب بندہ صحبت میں مغلوب ہو جاتا ہے تو اتباعِ شریعت کا حکم اُس سے ساقط ہو جاتا ہے۔۔۔ انشاء اللہ اس مسئلے کو دوسری جگہ پوری وضاحت کے ساتھ میں بیان کروں گا تاہم آداب تین طرح کے ہیں ایک یہ کہ حق تعالیٰ کے ساتھ توحید کے معاملہ میں ادب کا لحاظ رکھے اور وہ اس طرح ہے کہ خلوت و جلوت میں اپنے آپ کو بے ادبی سے بچائے رکھے اور معاملہ ایسا اختیار کرے جیسا بادشاہوں کے سامنے اختیار کیا جاتا ہے، صحیح احادیث میں موجود ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن پاؤں پھیلائے تشریف فرما تھے کہ جبرئیلؑ حاضر ہوئے اور کہا یا محمدؐ اِجْلِسْ جِلْسَةَ الْعَبِیْدِ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم خداوند تعالیٰ کے حضور غلاموں کی طرح بیٹھئے

بیان کرتے ہیں کہ حضرت حارث محاسبی رحمۃ اللہ علیہ نے چالیس سال تک دن رات میں کسی وقت بھی اپنی پشت دیوار کے ساتھ نہیں لگائی اور دو زانوں ہی بیٹھے رہے لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ اس طرح آپ اپنے کو تکلیف میں کیوں رکھتے ہیں؟ آپ نے فرمایا "مجھے شرم آتی ہے کہ بارگاہِ خداوندی میں غلاموں کے علاوہ کسی اور حالت میں بیٹھوں"۔۔۔ میں (علی بن عثمان ہجویری رحمۃ

دیارِ خراسان کے ایک گاؤں میں گیا جو بلند کے نام سے مشہور تھا وہاں میں نے ایک شخص کو دیکھا جسے لوگ مردِ بلندی کہتے تھے اور اُس میں تمام فضیلتیں موجود تھیں، یہ شخص بیس سال پاؤں پر ہی کھڑا رہا تھا اور نماز میں تشہد کی حالت کے علاوہ بالکل نہ بیٹھا تھا میں نے اُس سے اس کی وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگا میں ابھی اُس درجہ پر نہیں پہنچا کہ حق تعالٰے کے سامنے بیٹھ جاؤں

حضرت بایزید سے لوگوں نے دریافت کیا "بِمَ وَجدتَ مَا وَجدتَ" (آپ نے جو مقام پایا ہے وہ کس طرح حاصل کیا ہے؟) قَالَ بِحُسنِ الصحبۃِ مَعَ اللہِ عزّوجلّ" (جواب دیا: حق تعالٰے کے ساتھ اچھی ہم نشینی اختیار کرنے کی وجہ سے) یعنی با ادب اور اچھی صحبت سے کہ میں خلوت میں بھی اسی طرح رہا جس طرح جلوت میں"۔ اور جہان والوں کو چاہیئے کہ اپنے معبود کے مشاہدے میں آداب کی حفاظت کا سبق زلیخا سے سیکھیں، کہ جب وہ حضرت یوسفؑ کے ساتھ خلوت میں ہوئی اور حضرت یوسفؑ سے اپنی خواہش پوری کرنے کی درخواست کی تو پہلے اپنے بُت کا چہرہ کسی کپڑے سے ڈھانپ دیا۔ حضرت یوسف نے پوچھا تم یہ کیا کرتی ہو؟ کہنے لگی " اپنے معبود کا منہ ڈھانپ رہی ہوں تاکہ وہ مجھے تمہارے ساتھ اس بے حرمتی کی حالت میں نہ دیکھے کیونکہ یہ ادب کے خلاف ہے" اور پھر جب حضرت یوسفؑ سے مشرف کیا تو زلیخا کو جوان کرکے اُسے اسلام کی توفیق نصیب فرمائی اور اُسے حضرت یوسفؑ کی زوجیت (نکاح) میں دے دیا پھر جب حضرت یوسفؑ نے اُس کے قریب جانے کا ارادہ کیا تو وہ پیچھے ہٹ گئی، حضرت یوسفؑ نے کہا" زلیخا! میں تیرا دہی دلربا نہیں ہوں؟ تو مجھ سے گریز کیوں کررہی ہے کیا تمہارے دل سے میری صحبت ختم ہوچکی ہے؟" اُس نے عرض کی، نہیں، اللہ کی قسم! محبت اپنی جگہ موجود ہے بلکہ اُس میں اضافہ ہوچکا ہے لیکن میں نے ہمیشہ اپنے معبود کے آداب کا خیال رکھا ہے اُس روز کہ جب میں تمہارے ساتھ خلوت میں تھی میرا معبود ایک بت تھا جس کی دو بے دیدار آنکھیں تو تھیں لیکن وہ اُن سے دیکھ نہ سکتا تھا پھر بھی میں نے اُس پر کوئی چیز ڈال دی تھی تاکہ بے ادبی کی تہمت مجھ سے اُٹھ جائے، اور اب ... میں ایک ایسا معبود رکھتی ہوں آلات و اسباب کے بغیر سب کچھ جانتا اور دیکھتا ہے اور میں جس حالت میں ہوں" مجھے دیکھتا ہے، میں ہرگز نہیں چاہتی کہ تارکِ ادب بنوں ... اور جب حق تعالٰے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج پر لے گئے تو آپ نے

محض ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے کونین کی کسی چیز کو نہ دیکھا یہاں تک کہ خداوند تعالےٰ نے فرمایا مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى۔۔۔ مَازَاغَ الْبَصَرُ اَیْ بِرُؤْیَتِ الدُّنْیَا وَمَا طَغٰى اَیْ بِرُؤْیَتِ الْعُقْبٰى۔ (آپ کی نگاہ نہ ہٹی اور نہ بڑھی یعنی نہ تو دنیا کو دیکھنے کے لئے نظارہ حق سے ہٹی اور نہ ہی عقبیٰ کو دیکھنے کے لئے حد سے متجاوز ہوئی)

اور ادب کی دوسری قسم اعمال میں اپنے ساتھ ادب کرنا ہے اور یوں یہ ہے کہ تمام احوال میں اپنے نفس کے ساتھ مروّت کی رعایت رکھے حتیٰ کہ جو چیز لوگوں کی صحبت اور حق تعالےٰ کے سامنے بے ادبی ہے اُسے اپنی صحبت (تنہائی) میں بھی استعمال نہ کرے اور اس کا بیان اس طرح ہو سکتا ہے کہ سچائی کے علاوہ کچھ نہ بولے اور اس طرح رہے کہ جس چیز کو اپنے لئے خلاف سمجھتا ہو اُس کو اپنی زبان پر بھی نہ لائے کیوں کہ یہ بھی بے مروّتی ہے دوسری بات یہ کہ کم کھائے تاکہ اُسے طہارت خانے میں کم جانا پڑے۔۔۔ تیسری بات یہ ہے کہ" اپنے جسم کے جس حصے کو دوسروں کے سامنے دکھانا جائز نہیں اُس حصے کو خود بھی نہ دیکھئے کیوں کہ امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق آتا ہے کہ آپ نے اپنی شرم گاہ کو ہرگز نہیں دیکھا تھا جب لوگوں نے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا مجھے اپنے آپ سے شرم آتی ہے کہ میں وہ چیز دیکھوں جس کا دیکھنا دوسروں کے لئے حرام ہے۔" اور ادب کی تیسری قسم مخلوق کے ساتھ صحبت میں ادب کا لحاظ رکھنا ہے اور مشکل ترین آداب، لوگوں کی صحبت کے ساتھ متعلق ہیں اور وہ یہ ہیں کہ سفر و حضر میں اُن کے ساتھ حسن سلوک اور اچھا معاملہ ہو اور سنت کا اتباع بھی پیش نظر رہے، آداب کی ان تینوں اقسام کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا

اب میں انشاء اللہ امکانی حد تک اس کو ترتیب دیتا ہوں تاکہ تجھ پر اور اس طریق کو پڑھنے والوں پر یہ بہت زیادہ آسان ہو جائے۔۔۔ واللہ اعلم بالصواب۔

صحبت اور اُس کے متعلقات

اللہ عز و جل فرماتے ہیں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا۔۔۔ اَیْ یَجْعَلُ دعا یہم الاخوان (بے شک جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالحہ کئے تو عنقریب خدائے رحمٰن اُن کے لئے محبت پیدا کر دے گا۔۔ یعنی اس لئے کہ اُنھوں نے اپنے دوستوں

سے حُسنِ معاملہ کیا) یعنی جن مومنوں کا کردار اچھا ہوتا ہے حق تعالےٰ اُن کو دوست بنا لیتے ہیں اور اُن کو دوستی کے قابل بنا دیتے ہیں اس لئے کہ وہ دلوں کا پاس کرتے ہیں اپنے بھائیوں کے حق پورے کرتے ہیں اور اُن کو اپنے اوپر فضلیت دیتے ہیں۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "ثَلٰثٌ یُّثْبِتْنَ لَکَ وُدَّاخِیْکَ تُسَلِّمُ عَلَیْہِ اِنْ لَقِیْتَہٗ وَتُوَسِّعُ لَہٗ فِی الْمَجْلِسِ وَتَدْعُوْہُ بِاَحَبِّ اَسْمَآئِہٖ۔ (تین صفتیں تیرے لئے تیرے بھائی کی محبت کا باعث ہیں، یہ کہ جب اُس سے ملاقات کرے تو اُس پر سلام کہہ اور مجلس میں اُس کے لئے جگہ وسیع کر دیئے اور اُس کو پسندیدہ اور خوبصورت ناموں کے ساتھ بلائے) جو کچھ آپؐ نے فرمایا یہ حُسنِ رعایت اور حفظ ناموس کی وجہ سے ہے کہ مسلمان بھائیوں کی دوستی ان تین صفات سے مصفی اور پاکیزہ ہو جاتی ہے۔۔۔ اور حق تعالےٰ ارشاد فرماتے ہیں، "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ" (بے شک تمام مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں، پس بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ!) گویا تمام مسلمانوں کو دو بھائیوں میں مہربانی اور نرمی پیدا کرنے کا حکم دیا تاکہ آپس میں ان کے دل رنجیدہ نہ ہوں"۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اَکْثِرُوْا مِنَ الْاِخْوَانِ فَاِنَّ رَبَّکُمْ حَیٌّ کَرِیْمٌ یَّسْتَحْیِیْ اَنْ یُّعَذِّبَ عَبْدَہٗ بَیْنَ اِخْوَتِہٖ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ"۔ (اپنے بھائی زیادہ بناؤ کیونکہ تمہارا رب حیادار اور سخی ہے وہ قیامت کے دن اپنے بندے کو اُس کے بھائیوں کے درمیان عذاب دینے سے حیا کرے گا) تاہم یہ ضروری ہے کہ کسی کے ساتھ محبت محض حق تعالےٰ کے لئے ہو نہ کہ نفسانی خواہش اور کسی غرض اور مراد کے حصول کے لئے ہو تاکہ اُس ادب کی حفاظت سے بندہ مشکور رہو۔

اور حضرت مالک بن دینارؒ نے اپنے داماد مغیرہ سے فرمایا تھا۔ "یَا مُغِیْرَۃُ کُلُّ اَخٍ وَّصَاحِبٍ لَّمْ تَسْتَفِدْ مِنْہُ فِیْ دِیْنِکَ خَیْرًا فَانْبِذْ عَنْ صُحْبَتِہٖ حَتّٰی تَسْلَمَ" (اے مغیرہ! اپنے جس بھائی اور دوست سے تجھے تیرے دین میں بہتر فائدہ نہ ہو اُس کی صحبت سے کنارہ کش ہو جا تاکہ تو سلامت رہے) یعنی جس بھائی یا دوست کی صحبت سے تجھے آخرت کا فائدہ نہ ہو اُس کے ساتھ صحبت نہ کر کہ ایسے آدمی کی ہمنشینی تجھ پر حرام ہے، اُس کا معنی یہ ہے کہ صحبت یا تو اپنے سے بہتر کے ساتھ اختیار کر یا اپنے سے کمتر کے ساتھ۔ کہ اگر اپنے

سے بہتر کے ساتھ صحبت رکھے گا تو تجھے اُس سے فائدہ حاصل ہوگا اور اگر اپنے سے کمتر کے ساتھ رکھے گا تو اُس کو تجھ سے فائدہ حاصل ہوگا۔

اس طرح دونوں صورتوں میں فائدہ ہی ہوگا کہ اگر وہ تجھ سے کوئی چیز سیکھے گا تو تجھے بھی اور اُسے بھی دینی فائدہ ہوگا اسی طرح اگر تو اُس سے کوئی چیز سیکھے گا تو بھی تم دونوں کو دینی فائدہ ہوگا۔ یہی توجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اِنَّ مِنْ تَمَامِ التقویٰ اَنْ تُعَلِّمَ مَنْ لَا یَعْلَمُ (کمالِ تقویٰ یہ ہے کہ تو اُسے دین کا علم سکھائے جو کچھ نہیں جانتا) حضرت یحییٰ بن معاذ رضی اللہ عنہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ اُنھوں نے فرمایا بِئْسَ الصدیق صدیق تحتاج اَنْ تقولُ لَہٗ اذکرنی فی دعائک وَبِئْسَ الصدیق صدیقٌ تحتاج اَنْ تعیشَ مَعَہٗ بالمدارات وَبِئْسَ الصدیق صدیقٌ یُلجِئُکَ الی الاعتذار فی زلّۃٍ کانت مِنْکَ" (وہ شخص بُرا دوست ہے جس کو دعا کرنے کی تجھے درخواست کرنی پڑے اور بُرا ہے وہ دوست جس کے ساتھ تجھے خاطر و مدارات سے زندگی گزارنا پڑے اور بُرا ہے وہ دوست جسے کے سامنے تجھے اپنی کسی لغزش پر معذرت کرنی پڑے) کیونکہ ایک لمحے کی صحبت کا حق یہ ہے کہ وہ ہمیشہ تیرے لئے خود ہی دعا کرتا رہے" اور صحبت کا اصل سرمایہ انبساط و شادمانی ہے نہ کہ خاطر و مدارات۔ اور معذرت کرنا بیگانوں کا کام ہوتا ہے جبکہ سچی محبت و صحبت میں بیگانگی ایک جفا ہے"۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ المرءُ علیٰ دین خلیلہٖ فلینظر احدُکم مَن یخالل" (ہر شخص اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے پس تم میں سے ہر ایک کو سوچنا چاہیئے کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے) کیوں کہ انسان وہی دین اور راستہ اختیار کرتا ہے جس پر اُس کے دوست گامزن ہوتے ہیں لوگ دیکھتے ہیں کہ فلاں دوستی اور صحبت کن کے ساتھ رکھتا ہے، اگر نیک لوگوں سے صحبت رکھتا ہو، خود اگرچہ بُرا ہو نیک ہی شمار ہوتا ہے اس لئے کہ وہ صحبت اس کو نیک کردے گی اور اگر بُرے لوگوں کے ساتھ صحبت رکھتا ہے خود اگرچہ نیک ہی ہوگا اس لئے کہ وہ اس لئے کہ وہ اُن کے بُرے اطفال پر راضی ہے لہٰذا جب بُرائی پر راضی ہے تو اگرچہ ابھی خود نیک ہے بالآخر خود بھی بُرا ہو جائے گا۔

حکایات میں آتا ہے کہ ایک شخص کعبہ کے اندر طواف کر رہا تھا اور یوں دعا کر رہا تھا اللھم اصلح اخوانی فقیل لہ لم لم تدع لک فی ھذا المقام (اے اللہ میرے بھائیوں کی اصلاح فرما ! اُس سے پوچھا گیا اس مقدس مقام پر پہنچ کر تو خود اپنے لئے کیوں دعا نہیں کر رہا ؟) اس نے جواب دیا انّ لی اخوانا ارجع الیھم فان صلحوا صلحت معھم وان فسدوا فسدت معھم (میرے کچھ بھائی ہیں جن کی طرف میں لوٹ کر جاؤں گا اگر وہ درست ہوں گے تو میں بھی اُن کے ساتھ درست ہو جاؤں گا جب میری اصلاح کا دارومدار مصلح لوگوں کی صحبت پر ہے تو میں اپنے بھائیوں کے لئے بھی دعا کرتا ہوں تاکہ میرا مقصود اُن سے حاصل ہو جائے ... اس تمام گفتگو کی بنیاد یہ ہے کہ نفس کو اپنے یاروں کی عادتوں سے سکون ملتا ہے اور انسان جس گروہ کے درمیان رہتا ہے اُن کی عادات اور افعال کو اپنا لیتا ہے کیونکہ تمام معاملات اور ارادے جو حق اور باطل سے ہیں وہ دوسروں کے معاملات و ارادوں سے ہی پرورش پاتے ہیں اور انسان کے ارادے پر دوسرے کے ارادے کا غلبہ ہو ہی جاتا ہے اور دوسروں کی صحبت کا بڑا اثر ہوتا ہے اور عادات کو بڑا غلبہ حاصل ہوتا ہے یہاں تک کہ ایک باز آدمی کی صحبت میں رہ کر بہت کچھ جان جاتا ہے اور طوطا انسان کے سکھلانے پر بولنے لگتا ہے اور گھوڑا بھی ریاضت اور مشق کے ذریعہ جانوروں کی عادت سے نکل کر انسان کی عادت اختیار کر لیتا ہے اس طرح کی تمام چیزوں میں صحبت کی تاثیر موجود ہوتی ہے کہ اُن کی پوری عادت ہی تبدیل ہو کر رہ جاتی ہے ... اور اہلِ طریقت کے مشائخ پہلے ایک دوسرے سے صحبت کا حق ہی مانگتے ہیں اور مریدوں کو بھی اس کی ترغیب دلاتے ہیں یہاں تک ان کے درمیان صحبت ایک فریضہ کا درجہ حاصل کر گئی ہے .. اس سے پہلے مشائخ نے اس گروہ کے آداب صحبت میں بڑی تفصیلی کتابیں لکھی ہیں ، چنانچہ حضرت جنیدؒ نے ایک کتاب لکھی جس کا نام تصحیح الارادت تھا ایک کتاب حضرت احمد بن خضرویہ البلخیؒ نے تصنیف کی جس کا نام الرعایہ بحقوق اللہ تھا . حضرت محمد علی ترمذیؒ نے بھی ایک کتاب لکھی اُس کا نام " آداب المریدین رکھا تھا . حضرات ابوالقاسم الحکیم ، ابوبکر وراق ، سہل بن عبداللہ ، ابو عبدالرحمٰن السلمی اور ابوالقاسم قشیری رحمہم اللہ اجمعین نے بھی اس عنوان پر بڑی کافی کتابیں لکھی ہیں اور

یہ تمام حضرات اس فن کے امام ہوئے ہیں۔ میرا مقصود اس کتاب میں یہ ہے کہ جس کسی کے پاس یہ کتاب موجود ہو وہ دوسری کتابوں کی ضرورت محسوس نہ کرے اور قبل ازیں کتاب کے مقدمہ میں اور تیرے پوچھنے پر میں کہہ چکا ہوں کہ یہ کتاب تیرے لئے اور دیگر طالبان راہِ حق کے لئے ایک غنیمت ہے۔۔۔ اب میں انشاء اللہ تعالیٰ صوفیہ کے آداب معاملات کی اقسام کو ترتیب وار بیان کرتا ہوں۔۔۔ واللہ اعلم بالصواب۔

صحبت کے آداب

جب تو نے جان لیا کہ مرید کے لئے اہم ترین چیز صحبت ہے تو لامحالہ صحبت کے حقوق کی رعایت بھی ایک فریضہ ہو گیا کیوں کہ تنہائی مرید کے لئے ہلاکت کا باعث ہوتی ہے اسی لئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے الشیطان مَعَ الواحِدِ وھُوا منَ الاثنینِ الابعَدُ۔ (شیطان اُس کے ساتھ ہوتا ہے جو تنہا ہو اور وہ دو سے بہت دُور ہوتا ہے) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مَایکونُ مِن نجوٰیٰ ثلٰثۃِ اِلّا ھُوَ رابعھم" (کوئی تین آدمی بھی سرگوشی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن کے چوتھے ہوتے ہیں) پس تنہا رہنے جیسی کوئی مصیبت مرید کے لئے نہیں" اور میں نے حکایات میں دیکھا ہے، حضرت جنیدؒ کے مریدوں میں سے ایک کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ میں درجہ کمال تک پہنچ چکا ہوں، لہٰذا میرے لئے تنہا رہنا صحبت سے زیادہ بہتر ہے چنانچہ وہ گوشہ نشین ہو گیا اور دل کو جماعت صوفیہ کی صحبت سے کنارہ کش کر لیا ہے جب رات ہوتی تو کچھ لوگ اُس کے پاس اونٹ لے کر آتے اور اُس سے کہتے کہ آپ کو تو بہشت میں ہونا چاہیئے تھا۔ وہ اُس اونٹ پر بیٹھ جاتا اور چل پڑتا یہاں تک کہ ایک ایسا مقام نمودار ہوتا جس میں خوبصورت کھانے اور نہریں جاری ہوتیں، وہ اُس کو صبح ہوتے تک اُس جگہ رکھتے اور سحری کے قریب وہ سو جاتا اور جب بیدار ہوتا تو اپنے آپ کو خلوت کرنے کے دروازے پر پاتا، یہاں تک کہ آدمیت کی رعونت اور غرور اُس میں پیدا ہو گیا اور جوانی کی نخوت نے اُس کے دل میں اپنی تاثیر ظاہر کی اور اُس نے دعویٰ کی زبان کھولی اور کہنے لگا کہ مجھے اس طرح کی حالت پیش آتی ہے لوگوں نے یہ خبر حضرت جنیدؒ تک پہنچائی تو وہ اُٹھے اور اُس کی عبادت گاہ کے دروازے پر تشریف لائے تو اُس کو خواہشات میں

مست اور غرور و تکبر میں مبتلا پایا۔ آپ نے اُس سے حال دریافت کیا تو اُس نے سب کچھ حضرت جنیدؒ سے بیان کر دیا۔ حضرت جنیدؒ نے فرمایا، دیکھ جب آج رات تو وہاں پہنچے تو یاد رکھ اور تین مرتبہ "لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ" پڑھنا، چنانچہ رات ہوئی اور وہ اُسے لے گئے، تو وہ دل میں حضرت جنیدؒ کا انکار کر رہا تھا تاہم جب کچھ وقت گذرا تو اُس نے تجربہ کے طور پر تین مرتبہ لَاحَوْلَ پڑھ لیا، جونہی اُس نے یہ پڑھا وہ سب چیخنے لگے اور بھاگ گئے اور اُس نے اپنے آپ کو ایک کوڑے کے ڈھیر میں بیٹھا ہوا پایا کہ چند مردار جانوروں کی ہڈیاں اس کے گرد پڑی ہوئی تھیں، وہ اپنی خطا پر واقف ہو گیا اور توبہ کی طرف متوجہ ہوا اور دوبارہ صحبت اختیار کر لی۔۔۔

مرید کے لئے تنہائی سے زیادہ کوئی بڑی آفت نہیں۔ اور صوفیہ کی صحبت کے لئے شرط یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا درجہ پہچانے یعنی بوڑھوں کے ساتھ عزت و ادب کا معاملہ کرے، ہم جنسوں کے ساتھ عشرت کی زندگی گزارے اور بچوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرے۔۔۔ چنانچہ بوڑھوں کو اپنے باپ کے درجہ میں رکھے، ہم جنسوں کو اپنے بھائی کے درجہ میں اور بچوں کو اپنے بیٹوں کے درجہ میں رکھے۔ اور برائی سے برأت کریں، حسد سے پرہیز کریں، کینہ سے اعراض کریں اور کسی کو بھی نصیحت کرنے سے دریغ نہ کرے، صحبت میں ایک دوسرے کی غیبت کرنا، خیانت کا ارتکاب کرنا اور ایک دوسرے کی بات ماننے سے انکار کرنا ہرگز جائز نہیں کیوں کہ جب شروع سے ہی یہ صحبت حق تعالیٰ کے لئے ہے تو ہونا یہ چاہیئے کہ بندے سے جو بھی قول اور فعل ظاہر ہوا اُس کو رد نہ کریں اور مصنف (شیخ ہجویری) کہتا ہے کہ میں نے شیخ المشائخ حضرت ابو القاسم گورگانی سے دریافت کیا کہ صحبت کی شرط کیا ہے؟۔ اُنہوں نے فرمایا "یہ کہ صحبت کے اندر تو اپنا حصہ نہ مانگے کیوں کہ صحبت کی تمام آفات یہی ہیں کہ ہر شخص اس سے اپنا حصہ طلب کرتا ہے۔ اور حصہ مانگنے والے کے لئے صحبت کی بجائے تنہائی زیادہ بہتر ہے، اور جب اپنے حصے کو چھوڑ کر اپنے ساتھی کے حصے کی رعایت کرے تو صحبت میں یہی راہ صواب پر ہے۔۔۔ ایک درویش بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے مکہ مکرمہ جانے کا ارادہ لے کر کوفہ سے روانہ ہوا تو راستہ میں حضرت ابراہیم خواصؒ کو پایا۔ میں نے اُن سے صحبت میں قبول کرنے کی درخواست کی۔ تو انہوں نے فرمایا۔" دیکھو! صحبت کے لئے ایک امیر ہونا چاہیئے اور ایک فرمانبردار۔ تم کیا چاہتے ہو،

امیر تم ہو گے یا میں ؟ میں نے عرض کیا۔ "امیر آپ ہو جائیں تو آپ نے فرمایا" تو اب تم میرے حکم کی خلاف ورزی نہ کرنا" میں نے کہا ٹھیک ہے" درویش کہتے ہیں کہ جب ہم منزل پر پہنچے تو آپ نے مجھے کہا" یہاں بیٹھ جاؤ" ! میں نے ایسا ہی کیا۔ تو آپ نے کنوئیں سے پانی کھینچا۔ وہ ٹھنڈا تھا چنانچہ آپ نے ایندھن فراہم کیا اور آگ جلائی اور مجھے تپش پہنچائی، اور میں جس کام کے کرنے کا ارادہ کرتا آپ مجھے بیٹھ جانے کا حکم دے دیتے اور کہتے میری فرمانبرداری کرو ! جب رات ہوئی تو بڑی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ آپ نے اپنی گدڑی نکالی اور اپنے بازوؤں پر ڈالے صبح تک میرے سر پر کھڑے رہے۔ اور میں شرمندہ ہوتا رہا لیکن اپنی شرط کے مطابق کچھ بھی نہ کر سکتا تھا چنانچہ جب صبح ہوئی تو میں نے کہا" شیخ آج امیر میں ہوں گا"۔

آپ نے کہا" درست ہے"۔ جب ہم منزل پر پہنچے تو آپ نے وہی کام اور خدمت سرانجام دینا شروع کر دی میں نے کہا دیکھیئے ! آپ میرے حکم سے باہر نہ نکلیں، آپ نے جواب دیا" فرمان سے تو وہ شخص باہر نکلتا ہے جو اپنی خدمت اپنے امیر کے سپرد کر دے ! یہاں تک کہ مکہ مکرمہ پہنچنے تک آپ نے اسی طرح میرے ساتھ صحبت قائم رکھی۔ مکہ پہنچ کر میں شرم کے مارے آپ سے بھاگ گیا حتیٰ کہ منیٰ میں مجھے دیکھ لیا اور فرمایا" اے بیٹے ! تیرے لئے یہ ضروری ہے کہ درویشوں کے ساتھ اس طرح صحبت اختیار کرو جس طرح میں نے تمہارے ساتھ کی ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ "صحبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعشر سنین وخدمته فواللہ ما قال لی اف قط وما قال لی بشیٔ فعلته لم فعلت کذا ولا بشیٔ لم افعله لم لا فعلت کذا" (میں دس سال رسول اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت میں رہا اور آپ کی خدمت کی، اللہ کی قسم آپ نے کبھی مجھے اُف تک نہیں کی اور نہ میرے کسی کام پر آپؐ نے کہا کہ یہ تم نے کیوں کیا اور نہ کوئی کام سرانجام نہ دینے پر آپ نے یہ کہا کہ تم نے یہ کیوں نہیں کیا") پس تمام درویش دو طرح کے ہیں ایک مقیم اور دوسرے مسافر ! مشائخ کا طریقہ یہ ہے کہ مسافر حضرات کو چاہیئے کہ وہ مقیم حضرات کو اپنے اوپر فضیلت دیں کیونکہ یہ تو اپنے حصّہ کو حاصل کرنے جا رہے ہیں اور مقیم حضرات خدمت خلق میں بیٹھے ہوئے ہیں، اس لئے کہ مسافروں میں طلب کی علامت ہوتی ہے جبکہ مقیم حضرات میں پا چکنے کی نشانی ! پس جو لوگ حاصل کر چکے اور بیٹھ گئے

اُنہیں اُن پر فضیلت ہے جو ابھی طلب و جستجو میں ہیں، اور مقیم حضرات کو بھی چاہیئے کہ مسافروں کو اپنے اوپر ترجیح دیں اس لئے کہ وہ خود علائق دنیا والے ہیں کہ مسافران علائق سے مفرد اور مجرّد ہیں اور مسافر حضرات تلاش میں مصروف ہیں جب کہ مقیم دنیا میں توقف کئے ہوئے ہیں، اور بوڑھوں کو چاہیئے کہ جوانوں کو اپنے اوپر فضیلت دیں، کیونکہ وہ زمانہ قریب میں ہی دنیا میں وارد ہوئے ہیں اور اُن کے گناہ بھی ابھی کم ہیں اور نوجوانوں کو چاہیئے کہ وہ بوڑھوں کو اپنے اوپر ترجیح دیں کیونکہ وہ عبادت میں سبقت لے جانے والے اور خدمت میں مقدم ہیں۔ اگر ایسا ہوگیا جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے تو دونوں گروہ ایک دوسرے کی وجہ سے نجات پا جائیں گے ورنہ ہلاک ہو جائیں گے۔

فصل

آداب کی حقیقت، نیک خصائل کا جمع ہو جانا ہے دسترخوان کو اسی لئے "مادبہ" کہتے ہیں کہ اُس پر جو چیز آتی ہے سب خیر ہی ہوتی ہے۔ فالذی اجتمع فیہ خصال الخیر فھو ادیب (پس جس آدمی میں بھلائی کی خصلتیں جمع ہو جائیں وہ ادیب (ادب والا) ہے لوگوں کے عرف عام میں ادیب اُس کو کہتے ہیں جو لغت اور صرف و نحو کا علم جانتا ہو، لیکن گروہ صوفیہ کے نزدیک "الادب، الوقوف مع المستحسنات، ومعناہ ان تعامل اللہ فی الادب سراً وعلانیۃ واذا کنت کذالک کنت ادیباً وان کنت اعجمیا وان لم تکن کذالک تکون علی ضدہ" (ادب نام ہے اچھے کردار کو اپنانے کا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ تو پوشیدہ اور علانیہ طور پر اللہ کے ساتھ ادب کا معاملہ کرے، اگر تو ایسا ہوگیا تو تو ادیب ہے اگرچہ تو عجمی ہی کیوں نہ ہو اور اگر تو اس طرح نہ ہو سکا تو اس کے برعکس ہے) کیونکہ معاملات میں عبارت اور زبان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور تمام احوال میں اچھے عمل کرنے والے بے عمل عالموں سے زیادہ افضل ہوتے ہیں۔ مشائخ میں سے ایک بزرگ سے لوگوں نے پوچھا کہ ادب کی شرط کیا ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا میں تجھے ایک بات کے اندر اس کا جواب دیتا ہوں جو میں نے سُنی ہے اور وہ یہ ہے کہ ادب اسے کہتے ہیں کہ جب تو بولے تو تمہاری گفتگو سچائی پر مبنی ہو اور اگر عمل کرے تو تیرا عمل حق کے مطابق ہو۔ اور سچی گفتگو اگرچہ تلخ ہوتی ہے لیکن اچھی رہی ہے، اور اچھا عمل

اگرچہ دشوار ہوتا ہے لیکن بہتر وہی ہوتا ہے پس جب تو کچھ کہے تو تجھے اپنی گفتار میں صداقت پر قائم ہونا چاہیئے اور جب تو خاموش رہے تو تجھے اپنی خاموشی میں بھی حق پر قائم رہنا چاہیئے۔

لمع کے مصنف حضرت شیخ ابُو نصر سراج ؒ نے اپنی کتاب میں آداب کے متعلق بڑا اچھا فرق بیان کیا ہے چنانچہ آپ کہتے ہیں۔ آداب میں لوگ تین طرح کے ہوتے ہیں پہلے اہل دُنیا کہ ان کے ہاں فصاحت و بلاغت، حفظ علوم، بادشاہوں کے قصوں اور اشعار وغیرہ کو یاد کر لینے کا نام ادب ہے۔ دوسرے اہل دین ہیں کہ اُن کے نزدیک نفس کی ریاضت، اعضاء کی تادیب، شرعی حدود کی نگہداشت اور شہوتوں کو ترک کرنے کا نام ادب ہے جبکہ تیسرے اہل حدیث ہیں کہ ادب اُن کے نزدیک دل کی طہارت، بھید کی اعانت ایفاءِ عہد، وقت کی نگہداشت، پراگندہ خیالات کو کم کرتے، مقام طلب میں نیک کردار اور اوقات حضور و مقامات قرب میں اچھے عمل کا نام ہے" یہ کلام بڑا ہی جامع ہے اور اس کی تفصیل اس کتاب میں پھیلی ہوئی ہے۔ واللّٰہ ولی التوفیق۔

اقامت میں آدابِ توفیق

جب کوئی درویش سفر کی بجائے اقامت اختیار کرے تو اُس کے لئے ادب کی شرط یہ ہے کہ جب کوئی مسافر اُس کے ہاں آئے تو اُس کی حرمت کا لحاظ رکھتے ہوئے خندہ پیشانی کے ساتھ اسے پیش آئے، اُس کو عزت کے ساتھ قبول کرے اور یوں جانے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں میں سے ایک ہے اور اُس کے ساتھ وہی برتاؤ کرے جو حضرت ابراہیم نے اپنے مہمانوں کے ساتھ کیا تھا یعنی جو کچھ گھر میں موجود ہو بلا تکلف سامنے پیش کر دیئے جیسا کہ حق تعالےٰ نے بیان کیا فجاءَ بعجلٍ سمینٍ"۔ (پس آپ موٹا تازہ بھُنا ہوا بچھڑا لے آئے) اور ادب کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ نہ پُوچھے کہ تم کس طرف سے آئے ہو اور کہاں جانا ہے یا تمہارا نام کیا ہے؛ بس اُن کے آنے کو حق تعالےٰ کی طرف سے اور اُن کا جانا حق تعالےٰ کی طرف اور اُن کا نام بندۂ خدا سمجھے اور غور کرے کہ اُس کی راحت خلوت میں ہے یا صحبت میں! اگر اُس کو تنہائی پسند ہے تو کسی تکلف کو بروئے کار لائے بغیر محبت و معاشرت کے مطابق اُس کے ساتھ صحبت اختیار کرے اور جب رات کو وہ اپنا سر سرہانے پر رکھے تو مقیم کو چاہیئے اپنے ہاتھوں اُس کے پاؤں دبائے اگر

وہ ایسا نہ کرنے دے اور کہے کہ مجھے عادت نہیں ہے تو اُسے چھوڑ دے تاکہ اُس پر گراں نہ گورے، دوسرے روز صاف ستھرے غسل خانہ میں اُسے لے جائے اور غسل خانہ کی گندی جگہوں سے اُس کے کپڑوں کو بچائے، کوئی اجنبی خادم اُس کی خدمت پر مامور نہ کرے، اور اُس کی خدمت اس پورے اعتماد کے ساتھ کرے تاکہ اُس کے پاک کرنے سے وہ شخص تمام آفات سے پاک ہو جائے کہ اُس کی پشت کھجلائے اُس کے گھٹنوں، پاؤں کے تلووں اور ہتھیلیوں کی مالش کرے، البتہ اس سے زیادہ ضروری نہیں ہے، اور اگر اس مقیم میں نیا لباس بنوا کر دینے کی استطاعت ہو تو ہرگز کوتاہی نہ کرے، اور اگر استطاعت نہ ہو تو تکلیف بھی نہ کرے بلکہ اُس کے اُنہی کپڑوں کو پاک وصاف کر دے تاکہ وہ غسل خانہ سے باہر آئے تو اُنہیں پہن لے۔ جب وہ غسل خانہ سے واپس اپنی آرام گاہ میں پہنچ جائے اور دو تین روز نہ گذرے ہوں تو اگر اس شہر میں کوئی بزرگ ہو یا طالبانِ حق کی جماعت ہو یا ائمۂ اسلام میں سے کوئی امام ہو تو اُس مسافر سے کہے کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اُن کی زیارت کرائیں۔ اگر وہ ساتھ چلے تو ٹھیک اور اگر وہ کہے کہ "جی نہیں چاہتا" تو اصرار نہ کرے کیوں کہ طالبانِ حق تعالےٰ پر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ اُن کا دل خود اُن کے بس میں نہیں ہوتا۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ حضرت ابراہیم خواص رح سے جب لوگوں نے عرض کی کہ اپنے سفروں کے عجائب میں سے کوئی واقعہ ہمیں سنائیے! تو آپ نے بیان کیا کہ سب سے عجیب واقعہ تو وہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک دفعہ میرا ہمنشین ہونا چاہا، لیکن میں نے اُسے قبول نہ کیا کیونکہ میرے دل نے اس کی اجازت نہ دی اور اس وقت میں نے مناسب نہ سمجھا کہ حق تعالےٰ کے علاوہ کسی کے لئے میرے دل میں کوئی وقعت اور قدر وقیمت پیدا ہو کہ مجھے اس کا لحاظ کرنا پڑے۔۔۔ البتہ یہ درست نہیں کہ وہ میزبان مقیم اس مسافر کو اہل دنیا کی سلام گوئی اُن کی مہمانوں اور بیمار پرسیوں کے لئے لے جائے۔ اور جس مقیم کو مسافروں سے یہ طمع ہو کہ اُن کی اپنی گدائی کے لئے آلہ بناتے ہوئے ایک گھر سے دوسرے گھر کی طرف پھراتا رہے اس کے لئے اس سے بہتر تو یہ ہے کہ وہ بالکل اُن کی خدمت ہی نہ کرے کیونکہ اس طرح کرنا اُن کے جسم پر ذلت و رسوائی کو ڈالنے کے لئے مترادف ہے۔۔۔ مجھ علی بن عثمان ہجویری رح کو خود اپنے سفروں میں اس سے زیادہ کوئی مشقت اور تکلیف در پیش نہیں آئی کہ جاہل خادم اور ناپاک

مقیم کبھی کبھی مجھے اپنے ساتھ لے لیتے اور ایک سردار کے گھر سے دوسرے زمیندار کے گھر لئے پھرتے
میں دل میں اس کو بہت ناگوار محسوس کرتا اور مجبوراً اُن کے ساتھ چلا جاتا اور بظاہر درگذر سے
کام لیتا اور مقیم لوگ میرے ساتھ جس طرح کی بے قاعدگیاں کرتے رہے میں انہیں معاف کرتا ہوں اگر
کسی وقت میں مقیم ہو گیا تو مسافروں کے ساتھ ہرگز ایسا نہ کروں گا۔ اور بے ادب لوگوں کی صحبت میں
اس سے زیادہ کوئی فائدہ نہیں حاصل ہوتا کہ اُن کی حرکتیں تجھے ناپسند ہوں تو خود اُن کا ارتکاب نہ
کرے۔ پھر اگر وہ مسافر درویش خوش ہو اور چند روز مزید صحبت میں رہنا چاہئیے اور اپنی کسی ضرورت
کا اظہار کرے تو مقیم کے لئے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ اُس کی ضرورت پوری کر دے یعنی فی الحال
جو کچھ اُس کو چاہئیے وہ حاضر کر دے اور اگر یہ مسافر جھوٹا مدعی اور بے ہمت ہو تو مقیم کو بھی اُس
کے ساتھ بے ہمت اُس کی محال خواہشات میں اُس کا تابع نہیں ہو جانا چاہئیے کیوں کہ دنیا سے
کنارہ کش لوگوں کا یہ طرز عمل نہیں ہوتا اور اگر اُس کی کوئی ضرورت بازار یا شاہی دربار سے متعلق
ہو تو گریز کرنا چاہئیے کیونکہ تارک الدنیا حضرات کا بادشاہوں کے ہاں کیا کام ہے۔ کہتے ہیں
کہ حضرت جنیدؒ اپنے اصحاب کے ہمراہ ریاضت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک مسافر مہمان آ گیا،
آپ نے اُس کے لئے تکلف کیا اور کھانا اُس کے سامنے پیش کیا وہ کہنے لگا مجھے تو اُن کے علاوہ
فلاں فلاں چیز درکار ہے۔ آپ نے اُس کے لئے تکلف کیا اور کھانا اُس کے سامنے پیش کیا
آپ نے فرمایا تمہیں تو مسجدوں اور خانقاہوں کی بجائے بازار میں جانا چاہئیے تھا۔ کیوں
کہ تم ایک بازاری آدمی معلوم ہوتے ہو۔ ایک دفعہ میں درویشوں کے ہمراہ دمشق سے حضرت ابن
المعلاؒ کی زیارت کے لئے گیا وہ رملہ نامی گاؤں میں رہائش پذیر تھے۔ راستے میں ہم نے ایک
دوسرے سے کہا ہم سب کو اپنے اپنے دل میں کسی درپیش واقع کا خیال رکھنا چاہئیے۔ تاکہ وہ
بزرگ ہمارے باطن سے ہمیں مطلع کریں اور ہمارا وہ مسئلہ بھی حل ہو جائے، چنانچہ میں نے اپنے
آپ سے کہا "مجھے تو اُن سے حسین بن منصورؒ کی منظوم مناجات چاہئیے! دوسرے نے کہا" میں
اُن سے اپنی تلی کے تندرست ہو جانے کی دعا کرانا چاہتا ہوں اور تیسرے نے کہا" میں اُن سے
صابونی حلوے کا خواہشمند ہوں" جب ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ کے حکم
سے ایک کاغذ پر حسین بن منصور کی مناجات کے اشعار لکھے ہوئے پڑے تھے آپ نے وہ

میرے سامنے رکھ دیئے پھر ایک دوسرے کے پیٹ پر ہاتھ پھیرا تو اُس کی مرضِ تلی ختم ہو گئی اور بعد ازاں اُس تیسرے سے کہا صابونی حلوہ تو شاہی غلاموں اور نوکروں کی خوراک ہے تم اولیاء کا لباس پہنے ہوئے ہو، اولیاء کا لباس پہننے والوں کو شاہی غلاموں کا سا مطالبہ کرنا درست نہیں ہے لہٰذا ان میں سے کسی چیز کو اختیار کرو... خلاصہ یہ کہ مقیم پر اُس کی ضروریات کے علاوہ کوئی چیز نا جب نہیں ہے، کیونکہ وہ حق تعالٰے کی رعایت میں مشغول ہے اور لذتوں کو چھوڑے ہوئے ہے، البتہ اگر کوئی اپنی لذتوں کے حصول پر قائم ہو تو محال ہے کہ دوسرا اُس کی لذتوں کے حصول میں اُس کے ساتھ موافقت کرے، کیونکہ درویش لوگ ایک دوسرے کے راہبر ہوتے ہیں راہزن نہیں، چنانچہ اگر کوئی اپنے نفس کی لذتوں پر قائم رہے تو دوسرے کو چاہیئے کہ اُس کی مخالفت کرے، اور جب وہ نفسانی لذتوں کو چھوڑ دے تو یہ اُس کی راحت میں اُس کی موافقت کرے تاکہ دونوں حالتوں میں یہ اُس کے لئے راہبر ہو نہ کہ راہزن!

احادیث میں مشہور ہے کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت سلمان فارسی اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہما کے درمیان بھائی چارہ قائم کر دیا تھا یہ دونوں اہلِ صفہ اور اربابِ باطن کے سردار اور پیشوا تھے، ایک دن حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے ملنے اُن کے گھر تشریف لائے تو اُن کی اہلیہ نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہا کے سامنے شکایت کی کہ آپ کے یہ بھائی نہ دن کو کچھ کھاتے ہیں اور رات کو سوتے ہیں، حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا کوئی کھانے والی چیز تو لے آؤ وہ لائیں تو آپ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے کہا بھائی کھانے میں میرے ساتھ موافقت کرنی چاہیئے کیونکہ یہ روزہ تم پر فرض تو نہیں ہے حضرت ابوذر نے آپ کے ساتھ موافقت نہ کی۔ اور جب رات ہوئی تو حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا "بھائی تمہیں چاہیئے کہ نیند میں بھی میری موافقت کرے، کیوں کہ " اِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا " (تیرے جسم کا بھی تجھ پر حق ہے اور جب حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تو پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا " ہم بھی وہی کچھ کہتے ہیں جو کچھ کل سلمان نے کہا تھا کہ " اِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا " چنانچہ جب حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اپنے نفس کی لذات کو چھوڑ رکھا تھا تو حضرت

سلمان رضی اللہ عنہ نے بھی آپ کے معاملات پر اقامت کی اور اپنے اوراد کو چھوڑ دیا۔ اسی اصل پر جو کچھ بھی تم کرو گے وہ صحیح اور مستحکم ہی ہوگا۔ میں ایک دفعہ عراق میں دنیا کی طلب اور اُس کے فنا کرنے میں جرأت کر رہا تھا اور مجھ پر بہت سا قرض ہو گیا تھا اور جو بھی لوگ جس کو ضرورت ہوتی میرے پاس بھیج دیتے تھے، اور میں اُن کی ضروریات کے حصول میں تکلیف و رنج میں مبتلا ہو جاتا تھا کہ وقت کے سادات میں سے ایک سید نے مجھے لکھا کہ اے بیٹے دیکھو تو سہی کہ اپنے دل کو خدا تعالےٰ کی یاد میں ہمہ وقت مشغول رکھنے کی بجائے خواہش پرست لوگوں کے کاموں میں مشغول رکھے ہوئے ہو۔ اگر تم اپنے دل سے زیادہ پیارا کسی کا دل پاتے ہو پھر تو اُس کے دل میں اپنے دل کو مشغول رکھنا تمہارے لئے درست ہے ورنہ اُن کے کاموں سے ہاتھ کھینچ لے کہ بندگان خدا کیلئے خدا خود ہی کافی ہے۔ اسی وقت مجھے اس پیغام کی وجہ سے فراغت حاصل ہو گئی۔ یہ تھے اختصار کے طور پر مقیم لوگوں کے مسافروں کی صحبت میں رہنے کے احکام!

سفر میں آداب صحبت

اور جب کوئی درویش اقامت چھوڑ کر سفر اختیار کرے تو اُس کے لئے ادب کی شرط یہ ہے کہ اولاً تو وہ سفر محض رضائے الٰہی کے لئے کرے نہ کہ خواہشات کے اتباع میں! پھر جس طرح کہ ظاہری طور پر سفر کرتا ہے باطنی طور پر بھی اپنی خواہشات سے گریز کا راستہ اختیار کرے ہمیشہ باوضو رہے اور اوراد و وظائف کو ضائع نہ کرے اور اس سفر سے اس کی مُراد حج بیت اللہ یا جہاد یا کسی مقدس مقام کی زیارت یا فائدے کا جستجو یا کسی بزرگ، شیخ اور قبر کی زیارت ہونا چاہیئے ورنہ وہ اس سفر میں خطا وار قرار پائے اور اس کے لئے سفر میں گدڑی۔ جائے نماز، لوٹا، رسی جوتا یا نعلین اور لاٹھی کے بغیر چارہ نہیں تاکہ گدڑی سے اپنا ستر ڈھانپے، مصلے پر نماز ادا کرے، لوٹے سے وضو کرے، لاٹھی کے ذریعہ نقصان دہ چیزوں کو اپنے سے دور کرے نیز اس میں اور بھی فوائد ہیں اور جوتے یا نعلین وضو کی حالت پاؤں میں پہن لے تاکہ مصلے پر اس حالت میں آجائے، اگر کوئی شخص اس سے زیادہ سامان اپنے پاس رکھے اور سنت کے اتباع میں مثلاً کنگھی، ناخن گیر، سوئی اور سرمہ وغیرہ ساتھ لے تو یہ بھی جائز ہے، اگر کوئی شخص اس سے زیادہ سامان زیب و

ذہنیت اپنے ہمراہ لیتا ہے تو ہم دیکھیں گے کہ یہ کس مقام میں ہے اگر وہ مقام ارادت میں ہے تو ان میں سے ہر چیز اُس کے لئے ایک رکاوٹ، ایک بُت، ایک قید اور ایک حجاب اور اُس کے نفس کا سامان اظہار رعونت ہوگا اور اگر وہ تمکین واستقامت کے مقام میں ہوا تو اُس کے لئے یہ سامان اور اس سے زیادہ سامان بھی ساتھ رکھنا درست ہوگا۔ میں نے فارس میں شیخ ابومسلم غالب الفارسی رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے کہ اُنھوں نے کہا "میں ایک دن شیخ ابوسعید ابوالخیر فضل اللہ بن محمد رحمۃ اللہ کی زیارت کے ارادہ سے حاضر ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک تخت پر چار تکیوں کے درمیان پاؤں پر پاؤں عجیب انداز میں رکھے بیٹھے ہوئے تھے، اور ایک قیمتی مصری چادر اوڑھ رکھی تھی جبکہ میں نے ایسے کپڑے پہن رکھے تھے جو میل کچیل سے چمڑے کی طرح سخت ہو گئے تھے، اور میرا جسم تکلیف اور پگھلا ہوا تھا اور تقریباً زرد پڑ چکا تھا اُن کو دیکھنے سے میرے دل میں انکار سا پیدا ہو گیا اور میں نے اپنے آپ سے کہا" یہ بھی درویش ہے اور میں بھی درویش ہوں جبکہ یہ اتنے آرام میں ہے اور میں اتنی تکلیف میں۔ پھر کہتے ہیں کہ وہ فوراً میرے باطن پر مطلع ہو گئے اور میری نخوت کو دیکھتے ہوئے فرمایا "اے ابومسلم! تم نے کس دیوان میں یہ دیکھا ہے کہ خود بین انسان درویش ہوتا ہے" میں نے چونکہ صرف حق کو ہی دیکھا ہے اس لئے حق تعالےٰ نے مجھے تخت نشین کر دیا اور تو محض اپنی ذات کو دیکھتا ہے اس لئے حق تعالےٰ تجھے نیچے ہی رکھتے ہیں، میرا حصہ تو مشاہدۂ حق ہے اور تیرا نصیب محض مجاہدہ۔ اور یہ مقاماتِ طریقت کے یہ دونوں الگ الگ مقام ہیں، حق تعالےٰ ان سے پاک ہے اور درویش ان مقامات سے فانی اور کنارہ کش ہوتا ہے، شیخ ابومسلم کہتے ہیں یہ سُن کر میرے ہوش گم ہو گئے اور جہان مجھ پہ تاریک ہو گیا، جب میری ہوش ٹھکانے آئی میں نے اپنے خیال سے توبہ کی اور اُنھوں نے میری معذرت قبول کر لی، اس وقت میں نے عرض کی اے شیخ مجھے اجازت مرحمت فرمائیے تاکہ میں یہاں سے چلا جاؤں کیونکہ میری حالت آپ کے مقام کو دیکھنے کی متحمل نہیں، آپ نے فرمایا۔ صَدَقْتَ یا اَبا مسلم! اے ابومسلم! تم نے سچ کہا اور تمثیل کے طور پر یہ شعر پڑھا۔ ؎

آنچہ گوشم نتوانست شنیدن بخبر
ہمہ چشم بعیان یکسرہ دید آں ببصر

(میری آنکھ نے وہ سب کچھ ظاہری طور پر دیکھ لیا جو کچھ خبر کے طور پر میرا کان نہ سن سکا تھا

پس مسافر کو چاہیئے کہ سنت کی حفاظت کرتا رہے اور جب کسی مقیم کے پاس پہنچے تو عزت و احترام کے ساتھ اُس کے یہاں داخل ہو اور سلام کہے اور پہلے بایاں پاؤں اپنی جوتی سے باہر نکالے کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہی ہے اور جب پاؤں اندر ڈالنے لگے تو پہلے دایاں پاؤں دھوئے پھر بایاں پاؤں اور نفل تحیۃ کی دو رکعت ادا کرے اور اب درویشوں کے حقوق کی رعایت میں مشغول ہو جائے اور کسی حال میں بھی مقیم لوگوں پر اعتراض نہ کرنا چاہیئے، اور نہ ہی کسی کے ساتھ معاملات میں زیادتی کرے اور نہ ہی اپنے سفر کی سختیوں کو اُن کے سامنے بیان کرے اور نہ ہی اپنی معلومات یا حکایات و روایات بیان کرے کیوں کہ یہ سب کچھ اپنی رعونت کا اظہار ہوگا اور چاہئیے کہ جاہلوں کا رنج برداشت کرے اور رضائے الٰہی کے لئے اُن کا بوجھ اٹھائے کہ اس میں بڑی برکات ہیں اور اگر مقیم حضرات یا اُن کا کوئی خادم کوئی حکم کرے اور اس کو سلام کرنے یا کسی کی زیارت کے لئے چلنے کی دعوت دیں تو جہاں تک ہو سکے انکار نہ کرے۔ تاہم دل سے اہل دنیا کی رعایت کرنے سے منکر رہے اور ان بھائیوں کے اُن افعال کے لئے کوئی عذر اور کوئی تاویل ڈھونڈتا رہے کہ جو کچھ بھی رنج ہے خود برداشت کرنے اور اُن کے دل پر اس رنج کو نہ ڈالے اور خود اُن کو کسی راحت طلبی کے لئے بادشاہوں کے درباروں میں نہ لے جائے۔ اور مسافر و مقیم سب کو صحبت میں حق تعالیٰ کی رضا مطلوب ہونی چاہئے اور ایک دوسرے کے ساتھ حسن اعتقاد رکھنا چاہئے اور ایک دوسرے کو ایک جیسا سمجھنا چاہئے۔ اور کسی کے پیچھے اس کی غیبت نہ کرنی چاہئے کیوں کہ طالب حق کے لئے کسی کی بُرائی کرنا بہت ہی بُرا ہے اس لئے کہ محقق لوگ فعل کے دیکھنے میں فاعل کو دیکھتے ہیں اور جب مخلوق، جیسی بھی ہے خداوند تعالیٰ کی ہی پیدا کردہ ہے تو وہ اگرچہ معیوب ہو یا بے عیب اور محجوب ہو یا مکاشف اس کے فعل پر جھگڑا اس کے فاعل کے ساتھ خصومت کرنا ہے۔ اور جب نگاہ آدمیت سے مخلوق میں دیکھے گا تو ہر ایک سے باز رہے گا اور جان لے گا کہ تمام مخلوق مجبور، مقہور مغلوب اور عاجز ہے اور کوئی بھی اس حالت کے علاوہ کسی حالت پر نہیں ہو سکتا جس پر اُسے پیدا کیا گیا ہے اور مخلوق کو حق تعالیٰ کی ملکیت میں کوئی حق تصرف حاصل نہیں اور نہ ہی حق تعالیٰ کے علاوہ کسی کو کسی کی ذات تبدیل کرنیکا اختیار ہے۔

- وباللہ التوفیق -

کھانے کے آداب

جان لو کہ آدمی کے لئے غذا کے بغیر چارہ نہیں کیونکہ کھائے پیئے بغیر طبیعتوں کی ترکیب کو قائم نہیں رکھا جاسکتا تاہم مروّت کا تقاضہ یہ ہے کہ کھانے پینے کی طلب میں مبالغہ نہ کرے اور دن رات اپنے آپ کو اُسی کی سوچ میں ہی مصروف نہ رکھے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ کہتے ہیں "مَنْ کَانَ ھِمَّتُہٗ مَا یَدْخُلُ فِیْ جَوْفِہٖ کَانَ قِیْمَتُہٗ مَا یَخْرُجُ مِنْہُ"۔ (جس شخص کی مصروفیت صرف اس چیز میں ہو جو اُس کے پیٹ میں داخل ہوتی ہے تو اُسکی قیمت صرف وہ ہے جو پیٹ سے نکلتا ہے) راہِ حق کے مرید کیلئے زیادہ کھانے سے زیادہ کوئی چیز نقصان دہ نہیں، اس سلسلے میں اسی کتاب کے اندر میں بھوک کے بیان میں کچھ بیان کر چکا ہوں باقی یہاں اتنا ہی مناسب ہے۔ میں نے حکایات میں پایا ہے کہ لوگوں نے حضرت بایزید رحمۃ اللہ سے دریافت کیا کہ آپ بھوک کی بہت زیادہ تعریف کیوں کرتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا "اسلئے کہ اگر فرعون بھوکا ہوتا تو "اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی" کا دعویٰ ہرگز نہ کرتا۔ قارون اگر بھوکا ہوتا تو ہرگز سرکشی اختیار نہ کرتا اور ثعلبہ جب تک بھوکا تھا تمام لوگ اسکی تعریف کرتے تھے لیکن جب سیر ہو گیا تو اُسنے منافقت کا اظہار کیا۔ اللہ تعالےٰ نے کفار کے بارے میں فرمایا ہے "ذَرْھُمْ یَاْکُلُوْا وَیَتَمَتَّعُوْا وَیُلْھِھِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ" (انہیں چھوڑ دیجئے کہ کھاتے رہیں، دنیا سے فائدہ حاصل کرتے رہیں اور اپنی امیدیں دراز کریں، پھر عنقریب جان لینگے) اور نیز فرمایا "وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًی لَّھُمْ"۔ (جو لوگ کافر ہیں وہ دنیا میں فائدہ حاصل کرتے ہیں اور کھاتے ہیں جس طرح جانور کھاتے ہیں اور اُن کا ٹھکانہ دوزخ ہے)۔ حضرت سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں شراب سے بھرے ہوئے پیٹ کو اُس پیٹ سے زیادہ اچھا سمجھتا ہوں جو حلال کھانے سے بھرا ہوا ہو"۔ لوگوں نے پوچھا "یہ کیوں"؟ تو فرمایا "اس لئے کہ جب پیٹ شراب سے پُر ہوتا ہے تو عقل سو جاتی ہے شہوت کی آگ مر جاتی ہے اور لوگ اس کے ہاتھ اور زبان سے محفوظ ہو جاتے ہیں لیکن جب یہ حلال کھانے سے بھرتا ہے تو فضول آرزوئیں کرتا ہے شہوت زور پکڑتی ہے۔ اور نفس اپنا حصہ حاصل کرنے کیلئے سر اُٹھاتا ہے کہ مشائخ رحمہم اللہ نے ایسے لوگوں کے بارے میں ہی کہہ رکھا ہے "اکلھم کاکل المرضٰی ونومھم کنوم الغرقٰی وکلامھم ککلام الثکلٰی" (ان کا کھانا بیماروں کا سا کھانا، اُن کی نیند غرق شدہ کی نیند جیسی اور اُن کی گفتگو اُن عورتوں کی سی ہے جن کا بچہ مر گیا ہو)

پس کھانے کے آداب کی ایک شرط یہ ہے کہ تنہا نہ کھائے اور جو کچھ کھائیں ایکدوسرے پر اُس میں ایثار کریں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "شَرُّ النَّاسِ مَنْ اَکَلَ وَحْدَہٗ وَضَرَبَ عَبْدَہٗ وَمَنَعَ رِفْدَہٗ"

(سب سے بُرا وہ انسان ہے جو اکیلا کھائے، اپنے غلام کو پیٹے اور اپنے ایلچی کو روکے)۔ اور جب دسترخوان پر بیٹھیں تو خاموش نہ بیٹھیں، خدا کا نام لے کر کھانے کی ابتدا کریں اور چیزوں کو اوپر نیچے نہ کریں کہ اس سے احباب کو کراہت ہوتی ہے، پھر پہلے نمکین لقمہ اٹھائیں اور اپنے رفیق طعام کے ساتھ انصاف کریں ـــــ حضرت سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ اس آیت کریمہ "اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ۔ (بلاشبہ اللہ تعالیٰ عدل و احسان کا حکم دیتے ہیں) کا کیا معنی ہے؟" تو آپ نے فرمایا عدل یہ ہے کہ کھانے میں اپنے شریک ساتھی کے ساتھ انصاف کرے اور احسان یہ ہے کہ اس کو کھانے میں اپنے سے بہتر سمجھے")۔ ـــــ میرے شیخ رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ "مجھے ہر وقت کھانے کی سوچ میں مبتلا رہتا ہے"۔ پھر کھانا ہاتھ سے کھانا چاہیئے اور اپنے لقمہ کے علاوہ کسی چیز پر نظر نہ رکھے، اور کھانا کھانے کے دوران پانی کم پیئے اور وہ بھی صحیح پیاس کے وقت، اور جب پیئے تو اتنا تھوڑا پیئے کہ اس سے بس جگر تر ہو جائے، اور لقمہ بہت بڑا نہ بنائے، اور کھانے اور چبانے میں جلدی نہ کرے کہ یہ بدہضمی کا باعث ہوتا ہے۔ اور خلاف سنت بھی ہے اور جب کھانے سے فارغ ہو جائے تو "الحمد للہ" کہے، اور ہاتھ دھولے! اور اگر پوری جماعت میں سے دو یا تین یا زیادہ آدمی پوشیدہ طور پر کسی دعوت پر چلے جائیں اور وہاں کچھ کھالیں تو بعض مشائخ کہتے ہیں کہ یہ حرام ہے اور صحبت میں خیانت کے مترادف ہے، "اُولٰٓئِکَ مَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ" (یہ لوگ اپنے پیٹوں میں کھانا نہیں آگ کھا رہے ہیں) اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ اگر کوئی جماعت دعوت کر رہی ہے تو ایک دوسرے کی موافقت میں یہ جائز ہے اور ایک اور گروہ کا کہنا ہے کہ اگر ایک آدمی ہو تو بھی جائز ہے کیونکہ اکیلا ہونے کی صورت میں اس پر انصاف کا اطلاق ہی نہیں، انصاف تو صحبت کی حالت میں لازم آتا ہے چنانچہ جب یہ تنہا ہوگا تو اس وقت حکم صحبت اس سے اُٹھ جائے گا اور اس پر اس کی گرفت نہ ہوگی ـــــ اور اس مذہب میں مشکل اور اہم ترین اصل یہ ہے کہ کسی درویش کی دعوت رد نہ کرے اور کسی دنیا دار کی دعوت قبول نہ کرے اور دنیا داروں کے گھر نہ جائیں اور نہ اُن سے کسی چیز

کا سوال کریں کیوں کہ اس میں اہلِ طریقت کی کمزوری ہے کہ اہل دنیا درویش کے محرم نہیں ہیں اور اصل بات یہ ہے کہ کوئی شخص دولت کی کثرت سے دنیا دار اور اس کی کمی سے درویش نہیں بن جاتا، بلکہ جو بھی دولتمندی پر فقر کی فضیلت کا قائل ہو وہ دنیادار نہیں ہوتا اگرچہ بادشاہ ہی کیوں نہ ہو، اور جو کوئی فقر کا منکر ہو وہ دنیا دار ہوتا ہے اگرچہ مجبور و مفلس ہی کیوں نہ ہو۔ اور جب دعوت میں حاضر ہو تو کسی چیز کے کھانے یا نہ کھانے میں تکلیف نہ کرے بلکہ وقت کے تقاضے کے مطابق جو ملے کھالے۔ اور جب دعوت کرنے والا محرم راز ہو تو یہ بھی درست ہے کہ وہ بچا کھچا اُٹھالے جائے اور اگر نا محرم ہو تو اُس کے گھر جانا تو جائز ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ کھانا بچایا نہ جائے، کیوں کہ حضرت سہل بن عبداللہؒ نے کہا ہے کہ الفضلة هي الذلة (پس خوردہ، بچانا، ذلت ہے) وبااللہ التوفیق واللہ اعلم بالصواب۔

چلنے کے آداب

خدا تعالےٰ فرماتے ہیں وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا ؕ اور خدائے رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر انکساری کے ساتھ چلتے ہیں) طالب حق کو اپنا ہر قدم زمین پر رکھتے وقت یہ خیال رکھنا چاہیے کہ یہ قدم اپنے نفس کے لیے ہے یا خدا تعالےٰ کے لیے ؛ اگر اپنی ذات کے لیے ہے تو اس پر استغفار کرے اور اگر حق تعالےٰ کی رضا کے لیے ہے تو خدا کا شکر ادا کرے تا کہ حق تعالےٰ کی زیادہ خوشنودی حاصل ہو ــــ حضرت داؤد طائیؒ رحمۃ اللہ کے بارے میں آتا ہے کہ ایک دن آپ نے دوائی کھائی ہوئی تھی تو لوگوں نے آپ سے عرض کی کہ تھوڑی دیر اس صحن میں ٹہل لیں تا کہ دوائی کا پورا اثر ظاہر ہو جائے، آپ نے کہا مجھے شرم آتی ہے کہ اگر قیامت کے دن خدا تعالیٰ مجھ سے سوال کر لیں کہ اپنے نفس کی خواہش کے مطابق کیوں اتنے قدم تم نے رکھے تھے ؛ تو میں کیا جواب دوں گا، چنانچہ خداوند بزرگ وجبار کا ارشاد ہے۔ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۔ (اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے کہ کیا کماتے رہے ہیں)۔ پس درویش کو چاہیے کہ بیداری کی حالت میں سر جھکائے ہوئے مراقبے کی صورت میں چلے اور اِدھر، اُدھر ہرگز نہ دیکھے بلکہ بالکل سامنے دیکھتا ہوا

چلے، اگر کوئی شخص اُس کے سامنے آئے تو اپنے کپڑوں کو سمیٹتا ہوا اپنے آپ کو اُس سے بچانے کی کوشش نہ کرے کیونکہ مومن اور اُن کے کپڑے سب پاک ہی ہوتے ہیں، لہٰذا یہ چیز اپنی رعونت اور خودنمائی کے علاوہ اور کچھ نہ ہوگی، البتہ اگر وہ سامنے آنے والا شخص کافر ہو یا کوئی گندگی اُس پر ظاہری طور پر دیکھے تو جائز ہے کہ اپنے آپ کو اُس سے بچائے اور دور رکھے۔ اور اگر کسی جماعت کے ہمراہ جا رہا ہو تو آگے آگے چلنے کا ارادہ نہ کرے کیونکہ بڑائی چاہنا تکبّر کی علامت ہے، نیز بالکل پیچھے چلنے کی کوشش بھی نہ کرے کہ تواضع میں اتنا مبالغہ بھی ایک طرح کا تکبّر ہی ہے، اور دن کے وقت اپنے نعلین اور جوتوں کو جہاں تک ممکن ہو ناپاک جگہوں سے بچائے رکھے تاکہ خداوند تعالےٰ اس کی برکت سے رات کے وقت اس کے کپڑوں کو ناپاک ہونے سے بچائے، اور اگر کوئی جماعت یا ایک درویش ہمراہ ہو تو راستے میں کسی کے ساتھ باتیں کرنے کے لیے کھڑا نہ ہونا چاہیے اور یوں اُس کو انتظار نہیں کرانا چاہیے اور آہستہ رفتار سے چلے، تیز نہ چلے کہ تیز چلنا حریص لوگوں کی رفتار ہے، اور بہت آہستہ آہستہ بھی نہ چلے کہ یہ متکبروں کی چال ہے، اور پاؤں زمین پر پورا رکھے۔ خلاصہ یہ کہ ایک طالبِ حق کی رفتار اس طرح ہونی چاہیے کہ اگر کوئی اُس سے پوچھے کہ کہاں جا رہے ہو؟ تو وہ چلتے چلتے ہی کہہ سکے' انی ذاھبٌ الیٰ ربی سیھدین - میں اپنے پروردگار کی طرف جا رہا ہوں وہ جلد ہی میری رہنمائی کرے گا'، اور اگر اس کا چلنا ان آداب کے خلاف ہوگا تو اُس کی رفتار اُس کے لیے وبال ہوگی۔ اس لیے کہ قدموں کا صحیح ہونا سوچوں کے صحیح ہونے سے ہوتا ہے، بس جس کی سوچ مجتمع ہوگی، حق کی طرف اس کا اقدام اس کی سوچ کے تابع ہوگا۔ حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق روایت بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا، مراقبے کے بغیر درویش کی رفتار غفلت کی علامت ہے کیونکہ خود جو کچھ ہے دو قدموں میں حاصل ہو جاتا ہے کہ ایک تو اپنی خواہشات پر قدم اُٹھاتا ہے اور ایک حق تعالےٰ کے فرمان کے مطابق۔ اس ایک قدم کو اُٹھائے اور اس دوسرے کی جگہ پر رکھ دیئے۔ اور طالب کی روش مسافت کو طے کرنے کی علامت ہوتی ہے جب کہ قربِ حق، مسافت سے متعلق نہیں، چنانچہ جب حق تعالےٰ کا قرب، فاصلوں کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا تو

طالب حق کے لیے محل سکون میں پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنے کے سوا کیا چارہ ہو سکتا ہے؟۔
واللہ ولی التوفیق۔

سفر و حضر میں سونے کے آداب

جان لو کر اس معاملے میں مشائخ کا بہت اختلاف ہے، ایک گروہ کے نزدیک یہ ہے کہ مرید حق کے لیے غلبۂ نیند کی حالت کے بغیر سونا درست نہیں۔ اور اس وقت سوئے جب خود کو نیند سے باز نہ رکھ سکتا ہو کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ النوم اخ الموت (نیند موت کا بھائی ہے) پس زندگانی اللہ تعالٰے کی نعمت ہے اور موت ایک مصیبت! لامحالہ نعمت، مصیبت سے زیادہ بزرگ ہے ــــ حضرت شبلی رحمۃ اللہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا۔ اطلع الحق علیّ فقال مَن نامَ غَفَلَ وَمَن غَفَلَ حُجِبَ (اللہ تعالٰے نے مجھ پر نگاہ کی اور فرمایا، "جو سو گیا وہ غافل ہو گیا اور جو غافل ہوا وہ حجاب میں ہو گیا) اور ایک گروہ کے نزدیک جائز ہے کہ مرید اپنے اختیار سے سوئے اور حق تعالٰے کے احکام بجالانے کے بعد نیند میں تکلیف کرے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ رفع القلم عن ثلاث عن النائم حتی استیقظ وعن الغلام حتی یحتلم وعن المجنون حتی یفیق (تین آدمیوں سے (حساب کی) قلم اٹھالی گئی ہے، سونے والے سے جب تک وہ بیدار نہ ہو بچے سے یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائے اور مجنون سے یہاں تک کہ اُسے افاقہ ہو جائے) اور جب سوئے ہوئے آدمی سے قلم اُٹھالیا جاتا ہے جب تک وہ بیدار نہ ہو جائے تو مخلوق اس کے شر سے محفوظ ہو جاتی ہے اور مخلوق سے اُس کا اختیار ختم ہو جاتا ہے اور اس کا نفس اپنی خواہشات سے معزول ہو چکا ہوتا۔ اور کراماً کاتبین اس کے اعمال لکھنے سے فارغ ہو چکے ہوتے ہیں اور اس کی زبان دعووں سے رُکی ہوئی اور جھوٹ و غیبت سے بچی ہوئی ہوتی ہے اور اس کا ارادہ خود بینی اور ریاکاری سے باہر ہو چکا ہوتا ہے کہ لا یملک لنفسہٖ ضرًّا ولا موتًا ولا حیٰوۃً ولا نشورًا (وہ اپنے نفس کے لیے نقصان، فائدے، موت، زندگی اور دوبارہ زندہ ہونے کسی چیز کا بھی مالک نہیں ہوتا) اس لیے تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے

ہیں کہ " لاشیئ اشدّ علی ابلیس مِن نوم العاصی فاذ ا نام العاصِی یقول متی ینتبہ ویقوم حتی یعصِ اللہ" (ابلیس پر گنہگار آدمی کی نیند سے زیادہ سخت کوئی چیز نہیں کہ گنہگار جب سو جاتا ہے تو ابلیس کہتا ہے یہ کب بیدار ہوگا اور اُٹھ کر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے گا) حضرت جنیدؒ کا حضرت علی بن سہل الاصفہانیؒ سے یہی اختلاف ہے اور اس معاملہ میں وہ خط کافی ہے جو حضرت علی بن سہلؒ نے حضرت جنیدؒ کو لکھا تھا۔ اور وہ امت میں بڑا مقبول ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت علی بن سہل نے اپنے اس خط میں لکھا تھا کہ "نیند ایک غفلت اور آرام ہے لہٰذا اس سے اعراض کرنا چاہیے کہ محب کے لیے دن رات میں غفلت اور آرام نہیں ہوتا کیونکہ اگر غنودگی اور غفلت میں رہے گا تو اس حالت میں اس کا مقصود اس سے کھو جائے گا اور اپنے آپ سے اور اپنے معاملہ میں غافل اور حق تعالیٰ سے دور رہ جائے گا جیسا کہ حق تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو وحی بھیجی تھی کہ " یا داؤد کذب من ادعیٰ محبتی فاِذا جنّہ اللیل نام عنّی" (اے داؤد علیہ السلام) اس نے جھوٹ بولا جس نے میری محبت کا دعویٰ کیا لیکن جب رات آئی تو سو گیا اور میرے ذکر سے غافل ہو گیا۔ اس خط کے جواب میں حضرت جنیدؒ نے تحریر فرمایا: جان لو کہ ہماری بیداری ہمارا اپنا معاملہ ہے جب کہ ہماری نیند ہم پر ہمارے خدا کا فضل ہے۔ پس جو کچھ ہمارے اختیار کے بغیر حق تعالیٰ کی طرف سے ہم پر طاری ہوتا ہے وہ اس سے زیادہ کامل ہے جو محض ہمارے اپنے اختیار سے ہم پر ہوتا ہے۔" النوم موھبۃ من اللہِ تعالیٰ علی المحبّین" نیند، محب لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک انعام ہے) اس مسئلے کا تعلق صحو اور سُکر کے ساتھ ہے۔ جس کے متعلق پوری طرح ہم کلام کر چکے ہیں، لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ حضرت جنیدؒ صاحب صحو بزرگ تھے لیکن اس مقام پر سُکر کو ترجیح دیئے رہے ہیں شاید اس وقت آپ مغلوب الحال ہوں گے اور ان کی زبان سے اس وقت وہ خود بول رہا ہوگا۔ نیز یہ بھی درست ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہو گیا نیند عین صحو ہے اور بیداری عین سُکر! اس لیے کہ نیند آدمی کی صفت ہے اور آدمی جب تک اپنے اوصاف کی تاریکی میں ہو صحو کی طرف منسوب ہوتا ہے، اور نہ سونا، حق تعالیٰ کی صفت ہے اور جب انسان

حق تعالےٰ کی صفت کے سایہ میں ہو سب کی طرف منسوب ہوتا ہے اور مغلوب الحال ہوتا ہے ۔ میں نے مشائخ کے ایک گروہ کو دیکھا ہے کہ وہ حضرت جنیدؒ کی موافقت میں نیند کو بیداری پر افضل سمجھتے ہیں کیونکہ اولیاء و بزرگانِ دین اور بہت سے پیغمبروں کا مکاشفہ خواب میں ہی ہوا ہے ۔ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالےٰ کے بارے میں فرمایا ہے کہ " اِنّ اللّٰہ تعالیٰ یباھی بالعبد الذی نام فی سجودہٖ و یقول للملٰئکۃ انظروا الی عبدی روحہٗ فی محلِ النجویٰ و بدنہ علیٰ بساط العبادۃ " بے شک اللہ تعالےٰ اپنے اس بندے پر فخر کرتا ہے جو سجدے کی حالت میں سو جائے اور حق تعالےٰ فرشتوں سے کہتے ہیں ، میرے اس بندے کی طرف دیکھو کہ اس کی روح میرے ساتھ سرگوشی کے محل میں ہے اور اس کا بدن عبادت کے بچھونے پر ہے) نیز پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا " من نام علی الطہارۃ یؤذن سی روحہٖ ان یطوف بالعرش و یسجد اللہ تعالیٰ " جو شخص باوضو سو جائے حق تعالےٰ اُس کی روح کو اجازت دیتے ہیں کہ وہ عرشِ الٰہی کا طواف کرے اور اپنے اللہ کو سجدہ کرے) اور میں نے حکایات میں یہ پایا ہے کہ حضرت شاہ شجاع کرمانیؒ چالیس سال تک بیدار رہے ۔ جب ایک رات سوئے تو حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا ۔ پھر اس کے بعد وہ ہمیشہ اسی امید سے سویا کرتے تھے ، اس معنی میں قیس عامری کہتے ہیں ۔

وانی لَاَستنعِسُ ومالی نعیسۃ

لعلّ خیالاً منکَ یلقیٰ خیالیا

(مجھے نیند تو نہیں آ رہی لیکن پھر بھی میں ابھی سو جاؤں گا کہ شاید اس طرح تیرا خیال میرے خیال سے آملے)

اور میں نے ایک گروہ کو دیکھا ہے جو حضرت علی بن سہلؒ کی موافقت میں نیند پر بیداری کو فضیلت دیتے ہیں کیونکہ رسولوں کی وحی اور اولیاء کی کرامات بیداری سے ہی متعلق ہیں ۔۔۔۔ اور مشائخ میں سے ایک بزرگ کہتے ہیں " لو کان فی النوم خیراً لکان فی الجنۃ نوم " (اگر نیند میں کوئی بھلائی یا محبت و قربِ الٰہی کے لیے نیند علت ہوتی تو جنت میں بھی نیند ہونی چاہیے تھی) جو کہ قربِ الٰہی کا مقام ہے ۔ جب بہشت میں نہ حجاب ہوگا

اور نہ نیند ہوگی تو ہم جان گئے کہ نیند ایک حجاب ہے اور ارباب لطائف کہتے ہیں کہ جب حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام جنت میں سوئے تو ان کے بائیں پہلو سے حضرت حوا ظاہر ہوئیں اور آپ کی تمام آزمائشیں حضرت حوا سے ہی تھیں" اور نیز کہتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے کہا۔ اِنی اریٰ فی المنام انی اذبحک "(میں نے نیند میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں) تو حضرت اسماعیل علیہ السلام نے عرض کی ابا جان! ھٰذا جزاءُ من نامَ عن حبیبہٖ ولَمْ تنَمْ لَمَا اُمُوتَ بالذبح جو شخص اپنے محبوب سے غافل ہو کر سو جائے اس کا یہی بدلہ ہے اگر آپ نہ سوتے تو آپ کو ذبح کرنے کا حکم نہ دیا جاتا) آپ کی نیند آپ کو بیٹے سے محروم اور زندگی سے محروم کر دے گی تاہم میرا درد تو ایک لمحہ کے لیے ہوگا لیکن آپ کا درد ہمیشہ رہے گا حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق آتا ہے کہ آپ ہر رات نمکین پانی کا ایک پیالہ اور ایک سلائی اپنے سامنے رکھتے تھے، جب نیند آنے لگتی تو ایک سلائی پانی میں ڈبو کر آنکھ میں لگا لیتے) اور یوں نیند ختم ہو جاتی)

میں (حضرت علی بن عثمان ہجویریؒ) نے ایک بزرگ کو دیکھا ہے کہ جب وہ فرائض کی ادائیگی سے فارغ ہو جاتے تو سو جایا کرتے۔ اور شیخ احمد سمرقندیؒ کو میں نے دیکھا جو بخارا میں تھے کہ چالیس سال ہو چکے تھے لیکن رات کو کبھی نہ سوئے تھے البتہ دن کو تھوڑی دیر کے لیے سو جایا کرتے تھے۔ بہر حال اس مسئلے کا رجوع اس بات کی طرف ہوگا کہ اگر کسی کے نزدیک موت، زندگی سے زیادہ عزیز ہو تو وہ نیند کو بیداری سے زیادہ عزیز سمجھے گا اور اگر زندگی کو موت سے زیادہ عزیز رکھے گا تو اُس کے نزدیک بیداری نیند سے زیادہ عزیز ہونی چاہیے۔ پس اس چیز کی کوئی قدر و قیمت نہیں کہ تکلف کے ساتھ بیدار رہے بلکہ قیمت اس بات کی ہے کہ حق تعالےٰ اُس کو بیدار رکھیں جیسا کہ حق تعالےٰ نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو برگزیدہ کہا اور بلند درجہ پر پہنچایا تھا آپ نہ تو نیند میں تکلف کرتے تھے نہ بیداری میں، تو حق تعالےٰ کا فرمان آیا۔

"قُم اللیلَ الاّ قلیلاً نصفہ اوانقص منہ قلیلاً" (رات کو عبادت میں قیام کیجئے، مگر رات

کا تھوڑا حصہ نصف یا اس سے بھی کچھ کم، نیز اس بات کا بھی کوئی جواز نہیں کہ تکلف سے سو جائے بلکہ وقعت اس بات کی ہے کہ حق تعالیٰ خود اس کو سلا دیں، جیسا کہ حق تعالیٰ نے اصحاب کہف کو چن لیا اور اعلیٰ مقام پہ پہنچایا اور کفر کا لباس اُن کی گردن سے اتار دیا تو وہ نہ نیند میں تکلف کرتے تھے نہ بیداری میں یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے ان پر نیند طاری کردی اور ان کے اختیار کے بغیر اُن کی پرورش کرتا ہے چنانچہ فرمایا "وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ" (اور تم اُن کو بیدار سمجھو گے حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں اور ہم ان کی دائیں اور بائیں پہلو پر کروٹ بدلتے ہیں) اور یہ دونوں حالتیں اُن کے اختیار کے بغیر ہیں۔ غرضیکہ جب بندہ اس درجے پر پہنچ جائے کہ اس کا اپنا اختیار ختم ہو جائے اور سب سے اُس کا ہاتھ منقطع ہو جائے اور اس کا ارادہ غیر سے اعراض کرے تو وہ نیند یا بیداری جس حالت پر بھی ہو عزیز ہی ہوتا ہے۔ پس مرید حق کی نیند کے لیے شرط یہ ہے کہ اپنی ابتدائی عمر کی نیند کو اپنے آخری دور کی نیند کی طرح سمجھے اپنے گناہوں سے توبہ کرے۔ ناراض لوگوں کو راضی کرے۔ اچھی طرح وضو کرے اور داہنے پہلو پر قبلہ رخ ہو کر سوئے دنیا میں کئے ہوئے اچھے کاموں اور اسلام کی نعمت پر خدا کا شکر ادا کرے اور عہد کرے کہ اگر بیدار ہوا تو گناہوں کا ارتکاب نہ کروں گا۔ پس جس شخص نے بیداری میں اپنے یہ کام کر لیے ہوں اسے نیند یا موت سے کوئی خوف نہیں ہوتا۔

حکایات میں مشہور ہے کہ ایک بزرگ، ایک امام کے پاس گئے جو مرتبہ و عزت اور نفس کی رعونت میں مبتلا تھا اور اس سے کہا "اے فلاں! مر جانا چاہیے! اس امام کو اس بات سے رنج ہوا کرتا تھا کہ یہ گدا گر ہر وقت مجھے یہی بات کہتا ہے، ایک دن اس نے سوچا کل میں یہ بات کہنے میں سبقت کروں گا۔ چنانچہ دوسرے روز جب وہ بزرگ اندر آیا تو اس امام نے کہا "اے فلاں! مرنا چاہیے!" اس بزرگ نے یہ سن کر مصلیٰ بچھایا اور اس پر سر رکھا اور کہنے لگا لو! میں تو مر گیا اور اسی وقت اس کی جان نکل گئی۔ اس سے اس امام کو تنبیہ ہوئی کہ یہ بزرگ اُس سے یہی کہا کرتا تھا کہ موت کی تیاری اس طرح کرنی چاہیے جس طرح میں نے کی ہوئی ہے۔ اور ارادہ نہ کرو۔ اور جب بیدار ہو

جاؤ تو دوبارہ بھی مت سوؤ کر مریدانِ حق کے لیے دوسری نیند حرام ہوتی ہے اور بیکاری و نیند بندہ کے لیے فراموش اور غفلت پیدا کرتی ہے اور اس بارے میں طویل کلام موجود ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بولنے اور خاموش رہنے کے آداب

خداوند تعالےٰ فرماتے ہیں "وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا" پ۲۴ اس آدمی سے زیادہ اچھا گفتگو کے اعتبار سے کون ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے) نیز خداوند تعالےٰ نے فرمایا ہے "قول معروف" (اچھی بات) نیز فرمایا قولوا آمنا "کہو کہ ہم ایمان لائے) جان لو کہ اچھی بات کہنے کا حق تعالیٰ کی طرف سے بندے کو ایسے ہی حکم دیا گیا ہے جیسا کہ خداوند تعالیٰ کی خدائی کے اقرار، اُس کی حمد و ثنا کہنے اور مخلوق کو اُس کی بارگاہ کی طرف بلانے کا حکم دیا گیا ہے۔ نطق (بولنا) حق تعالیٰ کی طرف سے بندے کو ملنے والی ایک بہت بڑی نعمت ہے اور انسان اس کے ذریعہ دوسری مخلوقات سے ممتاز ہے اور خداوند تعالےٰ نے فرمایا ہے وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (ہم نے بنی آدم کو بزرگی عطا فرمائی) مفسرین کرام نے اس کا ایک معنی نطق کیا ہے۔ پس ہر گاہ کہ نطق کا حق تعالیٰ کی طرف سے بندہ پر نعمت ہونا ظاہر ہے تاہم اس کی مصیبت بھی بہت بڑی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ "اخوف ما اخاف علیٰ امتی اللسان" (جس چیز کے متعلق میں اپنی امت پر سب سے زیادہ ڈرتا ہوں وہ زبان ہے) غرضیکہ گفتار شراب کی طرح ہے۔ کہ وہ عقل کو مست کرتی ہے اور انسان جب اس کے پینے میں پڑ جاتا ہے تو ہر گز اُس سے نکل نہیں سکتا اور اپنے آپ کو اس سے باز نہیں رکھ سکتا۔ جب اہلِ طریقت کو اس کا علم ہو گیا کہ بولنا ایک آفت ہے تو انہوں نے ضرورت کے بغیر گفتگو ہی نہیں کی۔ یعنی اپنی گفتگو کی ابتداء اور انتہاء پر نگاہ رکھی ہے اگر وہ سب کی سب حق کے لیے ہو تو اُسے ادا کیا ہے ورنہ خاموش رہے ہیں۔ کیونکہ اُن کا اعتقاد تھا کہ اللہ تعالیٰ رازوں کو جاننے والے ہیں، اور وہ لوگ

قابلِ مذمت ہیں جو حق تعالےٰ کو ایسا نہیں جانتے بقول خدائے عزوجل "اَمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰهُمْ بَلٰی وَ رُسُلُنَا لَدَیْهِمْ یَكْتُبُوْنَ" (کیا وہ گمان کرتے ہیں کہ ہم اُن کے رازوں اور سرگوشیوں کو نہیں سنتے، ہاں ہم سنتے ہیں۔ اور ہمارے فرشتے ان کے پاس سے لکھتے بھی ہیں) اور ہم خود عالم الغیب بھی ہیں۔ اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے۔ "مَنْ صَمَتَ نَجٰی" جو خاموش ہوا، نجات پا گیا، پس خاموشی میں بڑے فائدے اور کامیابیاں ہیں جب کہ بولنے میں بہت مصیبتیں ہیں۔ مشائخ کا ایک گروہ تو خاموش رہنے کو بولنے پر فضیلت دیتا ہے اور دوسرا گروہ بولنے کو خاموش رہنے پر افضل سمجھتا ہے، انہی میں سے حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ "یہ الفاظ اور عبارات تمام محض دعوے ہیں، جہاں حقیقت کا اثبات ہو وہاں تمام دعوے بے کار ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ کوئی وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ اختیار کے باوجود انسان قول کے ساقط ہو جانے پر معذور ہو جاتا ہے یعنی کسی خوف کے وقت اس حالت کے برقرار رہنے کی صورت میں گفتگو کی قدرت پر اختیار کے باوجود نہ بولنے کا عذر پیدا ہو جاتا ہے اور یوں بولنے سے انکار کرنا۔ حقیقتِ معرفت کے لیے نقصان دہ نہیں ہوتا اور کسی وقت بھی بندہ معنی کے بغیر محض دعویٰ سے معذور نہیں ہوتا اس کا حکم منافقوں کا سا ہوتا ہے۔ پس معنی کے بغیر دعویٰ ایک نفاق ہے جب کہ معنی تو ہو لیکن دعویٰ نہ ہو تو یہ اخلاص ہے۔ "لِاَنَّ مَنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰی بَیَانٍ لَا یَسْتَغْنِیْ عَنِ اللِّسَانِ وَمَنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰی عِیَانٍ اسْتَغْنٰی فِیْمَا بَیْنَهٗ وَبَیْنَ رَبِّهٖ مِنَ اللِّسَانِ" (جس شخص نے اپنی بنیاد محض بیان پر رکھی وہ زبان سے مستغنی نہیں ہو سکتا جب کہ جس نے اپنی بنیاد حقیقت اور مشاہدہ پر رکھی وہ اپنے اور اپنے رب کے درمیان معاملہ کی وجہ سے زبان سے مستغنی ہو جاتا ہے) یعنی جب بندے پر طریقت کی راہ کھل جائے تو وہ گفتار سے مستغنی ہو جاتا ہے کیونکہ الفاظ تو غیر کی اطلاع کے لیے ہوتے ہیں اور حق تعالیٰ احوال کی تفسیر سے بے نیاز ہیں اور غیر اللہ اس قابل نہیں کہ اس میں مشغول ہوا جائے، حضرت جنیدؒ کے قول کا بھی یہی معنی ہے جو انہوں نے فرمایا تھا کہ "مَنْ عَرَفَ اللّٰهَ كَلَّ لِسَانُهٗ" (جو اللہ کو پہچان لیتا ہے، اُس کی

زبان گنگ ہو جاتی ہے، کیونکہ مشاہدہ میں بیان ایک حجاب ہوتا ہے۔ اور شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں روایت آتی ہے کہ آپ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں ایک مرتبہ اُٹھے اور زور سے نعرہ لگایا۔ "یاھوادی" (اے میری مراد) اور اس سے اشارہ حق تعالیٰ کی طرف کیا۔ حضرت جنیدؒ نے کہا: اے ابوبکر! اگر اس سے تیری مراد حق تعالیٰ ہے تو یہ نعرہ لگانے کی کیا ضرورت تھی کہ وہ تو بلند آواز سے مستغنی ہے اور اگر اس کا غیر مراد تھا تو تو نے خلاف کیوں کیا؟ کہ حق تعالیٰ تو تمہارے قول کا جاننے والا ہے، تو حضرت شبلیؒ نے اپنے کہے ہوئے پر استغفار کیا۔ اور جو گروہ گفتگو کو خاموشی پر ترجیح دیتا ہے وہ حضرات کہتے ہیں کہ اپنے احوال کو بیان کرنے کا ہمیشہ حق تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا گیا ہے کیونکہ دعویٰ تو معنی کے ساتھ قائم ہے کہ اگر کوئی شخص ہزار سال تک بھی دل اور باطن سے عارف باللہ ہو اور اس کو بیان کرنے سے کوئی ضرورت مانع بھی نہ ہو تو جب تک یہ معرفت زبان سے اقرار کے ساتھ پیوست نہ ہو گی اُس کا حکم کافروں کا سا ہو گا۔ اور حق تعالیٰ نے تمام مومنوں کو نعمتوں پر شکر اور بزرگی پر اس کی حمد و ثنا کا حکم دیا ہے اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ہے " واما بنعمۃ ربک فحدث " (اور اپنے رب کی نعمتوں کو بیان کر)، اور تحریف و تحدیث آپ کی گفتار ہی ہے پس ہماری کلام حق تعالیٰ کے احکام ربوبیت کی تعظیم سے متعلق ہے۔ اور خداوند تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ " ادعونی استجب لکم " (مجھے پکارو! میں تمہاری پکار کو قبول کروں گا) اور نیز فرمایا ہے " اجیب دعوۃ الداعِ اذا دعانِ (میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں وہ جب بھی پکارتا ہے) اور اسی طرح کی دوسری بہت سی آیات ہیں جن میں یہی مضمون پایا جاتا ہے۔ مشائخ میں سے ایک بزرگ کہتے ہیں جو شخص اپنے حال کو بیان نہیں کر سکتا اس کا کوئی حال ہی نہیں ہوتا کہ تیسرے درجے کو بیان کرنے والا خود تیسرا درجہ ہی ہے۔ جیسا کہ ایک شاعر کہتا ہے،

لسانُ الحال افصح من لسانی

وصمتی عن سوالی ترجمانی

میرے حال کی زبان میری اپنی زبان سے زیادہ فصیح ہے اور میری خاموشی میرے سوال کی ترجمان ہے۔

حکایات میں میں نے دیکھا ہے کہ حضرت ابوبکر شبلیؒ ایک دن بغداد کے ایک محلے سے گزر رہے تھے کہ ایک مدعیٔ طریقت کو دیکھا جو کہہ رہا تھا۔ السکوت خیر من الکلام فقال الشبلی سکوتکَ خیرٌ من کلامکَ لِاَنّ کلامکَ لغوٌ وَ سکوتکَ ھزلٌ وَ کلامی خیرٌ من سکوتی لِاَنّ سکوتی حلم و کلامی علم (خاموشی بہتر ہے کلام سے۔ پس حضرت شبلیؒ نے کہا تمہاری خاموشی واقعی تمہارے بولنے سے بہتر ہے کیونکہ تمہارا بولنا فضول ہے اور چپ رہنا بے ہودہ گی جب کہ میرا بولنا میری خاموشی سے بہتر ہے کیونکہ میرا سکوت میری بردباری ہے اور میرا کلام میرا علم) کہ اگر اپنا علم بیان نہ کروں تو اس میں میری بردباری ہے اور اگر اپنا بیان کروں تو یہ میرا علم ہے، جب خاموش رہوں گا تو حلیم ہوں گا اور جو بولوں گا تو علیم ہوں گا۔" اور میں یعنی علی بن عثمان ہجویری (رحمۃ اللہ علیہ) کہتا ہوں کہ تمام کلام بھی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ اور تمام سکوت بھی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک کلام حق ہے اور دوسرا باطل۔ اور ایک سکوت حصولِ مقصد اور مشاہدہ کی وجہ سے ہوتا ہے اور دوسرا غفلت کی وجہ سے۔ پس کلام کرتے اور خاموش رہتے کے وقت ہر شخص کو اپنے گریبان میں جھانک لینا چاہیے کہ اگر اُس کا کلام حق کے لیے ہے تو اس کی گفتار اس کی خاموشی سے بہتر ہے اور اگر کلام باطل ہے تو پھر سکوت، کلام سے بہتر ہے، اسی طرح سکوت اگر غفلت اور حجاب کی وجہ سے ہے تو پھر گفتار، خاموشی سے بہتر ہے۔ لوگ اس معاملے میں یوں ہی سرگرداں ہیں اور تصوف کے دعویداروں میں سے ایک گروہ نے نفسانی خواہشات اور معانی سے خالی چند عبارات کو ہاتھ میں لے رکھا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ گفتار سکوت سے افضل ہے اور جاہلوں کا ایک گروہ جو مینار اور کنوئیں میں تمیز نہیں کر سکتا اپنی جہالت کی وجہ سے خاموش رہتا ہے اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ خاموشی، گفتار سے بہتر ہے۔ جب یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کی طرح ہیں تو کس کو بولنے دیں گے اور کس کو خاموش رہنے دیں گے۔ "من نطق اصاب او غلط و من انطق عصم من الشطط"

جو کوئی اپنی مرضی سے بولتا ہے وہ یا صحیح بولے گا یا غلط لیکن جس کو حق تعالےٰ بلوائیں گے وہ خطاء اور خلل سے محفوظ رہے گا۔) جیسا کہ ابلیس (اللہ اس پر لعنت کرے) خود بولا کہ "أنا خیر منہ" (میں آدم سے بہتر ہوں) اور حضرت آدم کو حق نے بلوایا تو انہوں نے عرض کیا "ربنا ظلمنا انفسنا" (ہمارے رب ہم نے اپنے نفسوں پر زیادتی کر لی ہے پس اس راہ کے داعی اپنے بولنے میں مامور اور مجبور ہوتے ہیں اور اپنی خاموشی میں حیاداً اور بے بس ہوتے ہیں کہ من کان سکوتہ حیاءً کان کلامہ حیوۃ" (جس شخص کی خاموشی حیا کی وجہ سے ہو اس کا بولنا اس کے دل کے لیے پیغام زندگی ہوتا ہے) کیونکہ ان کی گفتار دیدارِ الٰہی کی وجہ سے ہوتی ہے اور بغیر دیدار کے بولنا ان کے ہاں ذلت کا باعث ہوتا ہے۔ اور جب تک وہ باہوش ہوتے ہیں نہ بولنا، بولنے سے زیادہ اچھا سمجھتے ہیں اور جب اپنے آپ سے بے خود ہو جاتے ہیں تو لوگ ان کے کلام کو اپنی جان پر لکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس بزرگؒ نے کہا تھا کہ "من کان سکوتہ لہ ذھبا کان کلامہ لغیرہٖ مذھباً (جس کی خاموشی خود اپنے لیے سونا ہوتی ہے اس کا کلام دوسروں کے لیے کیمیا (سونا بنانے والا "پارس") ہوتا ہے۔ پس طالب ربانی کو چاہیے۔ کہ اُس کی جو سوچ بندگی میں مصروف ہے اُسے خاموش ہی کر دے تاکہ وہ زبان بولنے لگے جس کا نطق اقرار ربوبیت ہے اور اُس کی عبادت مریدوں کے دلوں کے لیے شکاری بن جائے۔

اور گفتگو کے آداب یہ ہیں کہ حکمِ خداوندی کے بغیر کچھ نہ کہے اور حق بات کے سوا بھی کچھ نہ کہے جب کہ خاموشی کے آداب یہ ہیں کہ خاموش رہنے والا نہ تو جاہل ہو اور نہ جہالت پر راضی ہو اور نہ ہی غفلت میں مبتلا ہو۔ اور مرید کو چاہیے کہ وہ مرشدوں کی کلام میں نہ دخل دے نہ ہیر پھیر کرے۔ اور نہ اوپری اور الجھی ہوئی عبارت استعمال کرے اور جس زبان کے ساتھ شہادت دی ہے اور توحید کا اقرار کیا ہے اُس کے ساتھ پھر جھوٹ اور غیبت نہ کرے، مسلمانوں کو رنج نہ پہنچائے۔ درویشوں کو اچھے القاب کے بغیر صرف نام لے کر نہ پکارے اور جب تک اُس سے کچھ پوچھا نہ جائے خود نہ بولے یعنی گفتگو کرنے میں ابتداء نہ کرے۔ اور درویش کی خاموشی کے لیے

شرط یہ ہے کہ باطل اور برائی کو دیکھ کر خاموش نہ رہے، اور بولنے کی شرط یہ ہے کہ حق کے سوا کچھ نہ بولے ــــ اس اصل کے فروع بہت ہیں اور لطائف بے شمار ہیں تاہم میں نے اسی مقدار کو پسند کیا ہے تاکہ کتاب طویل نہ ہو جائے۔ واللہ اعلم بالصواب

سوال کرنے کے آداب

اللہ عزوجل کا فرمان ہے لا یسألون الناس الحافا (وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے) اور جب کوئی ان سے سوال کرے تو وہ روکتے نہیں جیسا کہ حق تعالیٰ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہیں واما السائل فلا تنھر (اور باقی سوال کرنے والے کو مت جھڑکیں) اور جب تک ہو سکے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی سے سوال نہ کرے اور غیر اللہ کو سوال کے قابل نہ سمجھیں کیونکہ حق تعالیٰ سے غیر حق کی طرف اعراض ہے اور جب بندہ حق تعالیٰ سے روگردانی کرے تو اندیشہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی اس سے منہ موڑ لیں۔ میں نے حکایات میں پایا ہے کہ ایک دنیادار نے حضرت رابعہ عدویہ رحمۃ اللہ عنہا سے کہا "مجھ سے کوئی چیز مانگ لو تاکہ میں تیری خوشی حاصل کر لوں" انہوں نے جواب دیا مجھے تو دنیا کے خالق سے بھی دعا مانگتے ہوئے شرم آتی ہے تو کیا اپنے جیسے ایک انسان سے مانگتے ہوئے مجھے شرم نہ آئے گی؟۔ کہتے ہیں کہ ابومسلم کے دور میں ایک صاحب دعوت درویش کو چوری کے جھوٹے الزام میں بے گناہ گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ جب آدھی رات ہوئی تو ابومسلم نے خواب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ کو دیکھا جو اس سے فرمارہے تھے۔

"اے ابومسلم! مجھے خداوند تعالےٰ نے تیری طرف بھیجا ہے کہ میرے دوستوں میں سے ایک دوست کو بغیر کسی جرم کے تمہاری جیل میں ڈال دیا گیا ہے۔ اس کو رہائی دو"۔ یہ سُن کر ابومسلم فوراً نیند سے اٹھا اور برہنہ سر، برہنہ پاؤں دوڑتا ہوا جیل خانے کے دروازے پر پہنچا اور جیل کا دروازہ کھول دینے کا حکم دیا اور اس درویش کو باہر نکال کر اس سے معذرت کی اور کہا "اگر کوئی ضرورت ہو تو مجھے بتائیے"۔ درویش نے کہا "اے امیر! جو شخص ایسا آقا رکھتا ہے جو ابومسلم کو آدھی رات کے وقت بستر سے اٹھا کر بھیجے اور اُسے

مصیبت سے نجات دلائے تو کیا اس کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ دوسروں سے سوال کرے اور حاجت مانگے؟ یہ سُن کر ابو مسلم رونے لگے اور وہ درویش ان کے سامنے سے چلے گئے پھر ایک دوسرا گروہ کہتا ہے کہ درویش کے لیے لوگوں سے سوال کرنا بھی جائز ہے کہ حق تعالیٰ نے "لا یسألون الناس الحافا" فرمایا ہے یعنی وہ لوگوں سے سوال تو کرتے ہیں لیکن اس میں زاری اور ضد نہیں کرتے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اپنے صحابہ کی ضروریات کے لیے سوال کیا ہے اور ہمیں بھی کہا ہے کہ "اطلبوا الحوائج عند حسان الوجوہ" (اچھے انداز میں اپنی حاجتیں طلب کرو!) اور دوسرے مشائخ نے تین صورتوں میں سوال کرنا جائز قرار دیا ہے۔ پہلی صورت یہ کہ دل کی فراغت کے لیے سوال کرے کہ یہ ایک ضروری امر ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم دو روٹیوں کو اتنی اہمیت نہیں دیتے کہ دن، رات اُن کے انتظار میں ہی گزار دیں اور اس مجبوری کی حالت میں اللہ تعالےٰ کے ہاں روٹیوں کے علاوہ پیش کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی حاجت ہی نہ ہو اس لیے کہ طعام اور اس کے انتظار سے زیادہ کوئی چیز حق تعالیٰ کی یاد سے روکنے والی نہیں اسی لیے تو جب حضرت شفیق رحمۃ اللہ کا ایک مرید حضرت بایزید رحمۃ اللہ کی زیارت کے لیے حاضر ہوا اور آپ نے حضرت شفیق کا حال اُس سے پوچھا اور اس نے بتایا کہ وہ مخلوق سے بالکل فارغ ہو کر اللہ تعالےٰ پر توکل کی حالت میں بیٹھے ہوئے ہیں تو حضرت بایزیدؒ نے فرمایا جب تم لوٹ کر جاؤ تو اس سے کہنا کہ دیکھو! آئندہ اللہ تعالےٰ کو دو روٹیوں کے لیے نہ آزماؤ بلکہ جب بھوک لگے تو اپنے ہم جنسوں سے دو روٹیاں مانگ کر کھا لو اور توکل کی کتاب ایک طرف اُٹھا رکھو تاکہ تمہارے ایک عمل کی نحوست سے وہ شہر اور ملک زمین میں نہ دھنس جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ریاضتِ نفس کے لیے سوال کو جائز قرار دیا ہے تاکہ اس کی ذلت برداشت کریں اور دل پر اس کا رنج رکھیں یوں اپنی قیمت کا اندازہ لگائیں کہ دوسروں کی نظروں میں ان کی کیا حیثیت ہے تاکہ تکبر میں اور کسی کو تکلیف دینے میں مبتلا نہ ہو جائیں، کیا تو نے نہیں دیکھا جب حضرت شبلیؒ، حضرت جنیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت جنیدؒ نے ان سے کہا اے

ابوبکر! تمہارے ذہن میں ٹیڑھی نخوت بھری ہوئی ہے کہ میں خلیفہ اور امیر سامرہ کے دربانوں کے افسر کا بیٹا ہوں، تم اس وقت تک کوئی کام نہیں کر سکتے جب تک تم بازار میں نکلو تو نظر آنے والے ہر آدمی سے سوال نہ کرو تاکہ تمہیں اپنی قیمت کا علم ہو۔ حضرت شبلی نے ایسا ہی کیا اور ہر روز آپ کا بازار سست ہوتا گیا حتیٰ کہ چھ سال کے عرصہ میں یہاں تک پہنچ گئے کہ سارے بازار میں گشت کیا لیکن کسی نے کوئی چیز بھی آپ کو نہ دی چنانچہ واپس آئے اور حضرت جنیدؒ سے اپنی حالت بیان کی۔ حضرت جنیدؒ نے فرمایا "اے ابوبکر! اپنی قیمت جان لے کہ لوگوں کے ہاں تیری کوئی حیثیت نہیں لہٰذا اب تو بھی دل ان میں نہ لگا اور کسی قیمت پر بھی انہیں اختیار نہ کر۔ یہ سوال ریاضت کے لیے تھا نہ کہ دنیا کمانے کے لیے۔ حضرت ذوالنون مصریؒ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا، میرا ایک دوست تھا جو ہر معاملے میں میرے ساتھ موافقت کرتا تھا۔ حق تعالیٰ نے اس کو اپنے پاس بلا لیا اور دنیا سے نعمتِ عقبیٰ کی طرف پہنچا دیا۔ میں نے اُسے خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ حق تعالیٰ نے تیرے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ اس نے کہا حق تعالیٰ نے مجھے بخش دیا ہے میں نے پوچھا کس خصلت کی وجہ سے؟ تو اس نے بیان کیا کہ حق تعالیٰ نے مجھے اپنے سامنے کھڑا کیا اور کہا "میرے بندے! تم نے کمینوں اور بخیلوں سے بڑے رنج اور بڑی ذلت اٹھائی ہے کہ ان کے سامنے ہاتھ پھیلائے ہیں اور پھر اس پر صبر کیا ہے اس لیے میں تجھے بخش رہا ہوں"۔ اور تیسری اس صورت میں سوال کو جائز قرار دیا ہے کہ جب حق تعالیٰ کی حرمت و عظمت کا لحاظ رکھتے ہوئے لوگوں سے سوال کرے کہ وہ دنیا کا تمام مال حق تعالیٰ کی ملکیت سمجھتے ہیں اور مالدار لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا وکیل سمجھتے ہیں، چنانچہ جو چیز ان کے نفس کے حصہ کی طرف لوٹتی ہے وہ حق تعالیٰ سے نہیں مانگتے بلکہ اس کے کسی وکیل سے مانگ لیتے ہیں اور اپنی بات اس وکیل سے کر لیتے ہیں۔ اور ایک شاہد کی نظر میں جو بندہ حق تعالیٰ کی حرمت و اطاعت کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کے کسی وکیل کے سامنے اپنی حاجت پیش کرے وہ اس سے زیادہ بہتر ہے جو خدا تعالیٰ کے سامنے اپنی ضرورت پیش کرتا ہو پس

غیر سے ان کا سوال کرنا ان کے بارگاہِ الٰہی میں حضور اور کامل توجہ کی علامت ہے نہ کہ غیب اور حق سے روگردانی کی ۔ میں نے سُنا ہے کہ حضرت یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ تعالٰے کی ایک بیٹی تھی ایک دن اُس نے اپنی ماں سے کہا مجھے فلاں چیز کی ضرورت ہے ماں نے کہا" بیٹی! خدا سے مانگو! بیٹی نے عرض کی اماں جان! مجھے شرم آتی ہے کہ اپنی ذاتی ضرورت حق تعالٰے سے طلب کروں ، اور جو کچھ آپ مجھے دیں گی وہ بھی تو خدا کے مال سے ہی دیں گی جو میرے لیے اُس نے مقدر کر رکھا ہوگا ۔

پس سوال کرنے کے آداب یہ ہیں کہ اگر تمہارے سوال کا مقصود تمہیں حاصل نہ ہو تو بھی زیادہ غمگین نہ ہو ۔ اور لوگوں کو تو اپنے درمیان نہ دیکھے اور عورتوں سے اور بازاری لوگوں سے سوال نہ کر ۔ اور اپنا سوال صرف اس کے سامنے پیش کر جس کے مال کے حلال ہونے کا تمہیں یقین ہو ۔ اور جہاں تک ہو سکے صرف اپنی ضرورت کے مطابق سوال کر ۔ اور اس سے سامانِ آرائش و خانہ داری نہ بنا اور اس کو اپنی ملکیت نہ سمجھ ۔ صرف وقت کی ضرورت کا خیال رکھ آئندہ کل کا اندیشہ دل پر نہ لاتا کہ ہمیشہ کی ہلاکت میں گرفتار نہ ہو جائے اور حق تعالٰے کو اپنی دریوزہ گری کا جال نہ بنا اور اپنی طرف سے تکلفاً پارسائی پیدا نہ کر کہ لوگ تیری پارسائی کو دیکھ کر تجھے کچھ دیں ۔ میں نے ایک بزرگ کو دیکھا جو باحشمت صوفیہ میں سے تھے کہ وہ جنگل سے فاقے کی حالت میں سفر کی تکلیف اُٹھاتے ہوئے کوفہ کے بازار میں آئے اور ایک چڑیا کو اپنے ہاتھ پر بٹھائے ہوئے کہا کوئی اس چڑیا کی خاطر مجھے کچھ دیدے لوگوں نے کہا اے فلاں! تم یہ کیا کہتے ہو؟ انہوں نے فرمایا! محال ہے کہ میں یہ کہوں کہ مجھے خدا کے واسطے کچھ دو کیونکہ حقیر دنیا کے لیے ایک حقیر چیز کے سوا کسی کی سفارش ہم پیش نہیں کرتے ۔

یہ تھوڑا سا بیان اس عنوان پر میں نے اختصار کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہا ہے حالانکہ اس میں تفصیل کی گنجائش موجود تھی ۔

(واللہ اعلم بالصواب)

نکاح کرنے اور مجرد رہنے کے آداب

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے "ھُنّ لباس لکم وَانتم لباس لھن " (عورتیں تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تناکحوا تکثروا فانی اباھی بکم الامم یومَ القیٰمۃ وَلَو بالسقط (آپس میں نکاح کرو تاکہ تم میں اضافہ ہو بے شک میں قیامت کے دن تمہاری کثرت کی وجہ سے تمام امتوں پر فخر کروں گا اگرچہ اضافہ ادھورے بچے سے ہی ہو۔ نیز فرمایا انّ اعظم النساء برکۃً اقلھُنّ مئونۃ وَاحسنھُنّ وجوھا واحسنھن فروجًا" (عورتوں میں برکت کے لحاظ سے عظیم عورت وہ ہے جو تھوڑا خرچ کرے، خوبصورت ہو اور پاکدامن ہو) صحیح احادیث سے ثابت ہے نکاح تمام مردوں اور عورتوں کے لیے مباح ہے اور جو شخص حرام کاری سے پرہیز نہ کر سکے اس پر فرض ہے اور جو شخص اہل وعیال کے حقوق پورے کر سکتا ہو اس کے لیے سنت ہے، مشائخ طریقت میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ نکاح، شہوت کو دور کرنے کے لیے کرنا چاہیے اور مال دل کی فراغت کے لیے کمانا چاہیے، اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ نکاح افزائش نسل کے لیے کرنا چاہیے تاکہ اولاد ہو اور جب اولاد ہو تو وہ اگر باپ سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو جائے تو باپ کے لیے شفاعت کا ذریعہ بنے اور اگر باپ، اولاد سے پہلے فوت ہو جائے تو اس کے لیے دعا کرتی رہے احادیث میں ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے سیدہ فاطمہؓ بنت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی سیدہ اُمّ کلثومؓ کے لیے ان کے والد حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کے پاس پیغام نکاح بھیجا اور ان سے درخواست کی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا "وہ بہت کم سن ہے اور آپ بوڑھے آدمی ہیں جب کہ میں سیدہ اُمّ کلثومؓ کا نکاح اپنے بھتیجے حضرت عبداللہ بن جعفرؓ سے کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کے ذریعہ پیغام بھیجا کہ "اے ابوالحسن! دنیا میں بوڑھی عورتیں بہت ہیں، ام کلثوم کے ساتھ نکاح سے میرا مقصد شہوت کا دور کرنا نہیں بلکہ نسل کا جاری کرنا

ہے کہ میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا کلُّ حسبٍ ونسبٍ ینقطعُ بالموتِ الّا نسبی وحسبی ویروی سبب ونسب ینقطع الاّ حسبی ونسبی" ہر حسب ونسب موت کے ساتھ منقطع ہو جاتا ہے سوائے میرے نسب وحسب کے۔ ایک روایت میں یوں ہے کہ "میرے حسب ونسب کے علاوہ ہر سبب اور نسبت منقطع ہو جائے گی) اب میرا سبب آپ ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا نسب بھی قائم رہے تاکہ میں قرابت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں دونوں جانب محکم کرنے والا ہو جاؤں" چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی سیدہ ام کلثوم سلام اللہ ورضوانہ علیہا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نکاح میں دے دیں۔ اور انہی سے زید بن عمر رضی اللہ پیدا ہوئے۔ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے" تنکح النساء علی اربعۃ علی المال والحسب والحسن والدین فعلیکم بذات الدین فانہ ما استفاد امرؤ بعد الاسلام خیرٌ من زوجۃ مومنۃ موافقۃ یُسَرّ بھا اذا نظر الیھا" (عورتوں کے ساتھ چار وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے مال یا حسب ونسب یا حسن یا پھر دین کی وجہ سے پس تم دین کی بنیاد پر نکاح کرو کیونکہ کوئی شخص اسلام کے بعد کسی چیز سے استفادہ نہیں کرتا جو ایک موافقت کرنے والی مومنہ بیوی سے زیادہ بہتر ہو کہ جب وہ بیوی کو دیکھے تو اُسے خوشی حاصل ہو) یعنی اسلام کے بعد بہترین فوائد اور اضافے ایک موافقت کرنے والی مومنہ بیوی سے ہی حاصل ہوتے ہیں تاکہ اس سے محبت حاصل کرے، دین کے معاملے میں اُس سے قوت حاصل کرے اور دنیا میں اس سے باہمی محبت وتعلق پائے کیونکہ تمام وحشتیں تنہائی میں ہیں اور تمام راحتیں صحبت میں ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے" الشیطان مع الواحد (اکیلے آدمی کے ساتھ شیطان ہوتا ہے) درحقیقت مرد یا عورت جب تنہا ہوتے ہیں تو شیطان ان کا ساتھی ہوتا ہے اور ان کے دل میں شہوت کو ابھارتا ہے۔ اگر میاں بیوی میں مجانست اور موافقت ہو تو حرمت وپاکدامنی کے معاملہ میں اس سے بہتر کوئی صحبت نہیں۔ اسی طرح اگر عورت ناموافق ہو تو اُس کے ساتھ رہنے میں جو رنج اور ذہنی کوفت ہے اُس جیسی کوئی دوسری تکلیف نہیں۔ پس درویش کو چاہیے

کہ پہلے وہ اپنے معاملے میں غور کرے اور نکاح کرنے اور مجرد رہنے کے فتنوں کو اپنے دل کے سامنے پیش کرے تاکہ وہ اندازہ کرسکے کہ کون سی آفت کو دور کرنا اس کے لیے زیادہ آسان ہے پھر اس پر عمل کرے۔ خلاصہ یہ کہ مجرد رہنے میں دو آزمائشیں ہیں۔ پہلی، حضور علیہ وسلم کی سنتوں میں سے ایک سنت کا ترک اور دوسری اپنے دل میں نفسانی شہوت کی پرورش اور حرام کاری میں مبتلا ہونے کا خطرہ اور نکاح کرنے میں بھی دو آفتیں ہیں ایک دل کا غیر حق میں مشغول ہونا اور دوسری جسم کا نفسانی لذت میں مشغول ہونا۔ اس مسئلہ کی اصل خلوت نشینی اور صحبت پسندی کی طرف راجح ہے یعنی جو شخص لوگوں کے ساتھ اختلاط کو اختیار کرتا ہے اس کے لیے نکاح ضروری ہے اور جو شخص مخلوق سے کنارہ کشی کا متلاشی ہے اُس کے لیے مجرد رہنا زیادہ خوب ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے "سیروا سبق المفردون" (سیاحت کرو کہ تنہا رہنے والے سبقت لے گئے) حضرت حسن بصری کہتے ہیں "نجا المخفقون وھلک المثقلون" (ہلکے لوگ نجات پاگئے اور بوجھ والے ہلاک ہو گئے) حضرت ابراہیم خواصؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا "میں ایک دیہات میں موجود ایک بزرگ کی زیارت کے لیے گیا، جب ان کے گھر میں داخل ہوا تو میں نے اُسے اس طرح صاف ستھرا پایا جس طرح اولیاء کرام کے عبادت خانے ہوتے ہیں، اس میں دو محراب بنے ہوئے تھے ایک میں وہ بزرگ تشریف فرما تھے اور دوسرے میں ایک پاکیزہ اور روشن اخلاق بڑھیا بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں کثرت عبادت سے بہت زیادہ کمزور ہو چکے تھے، وہ دونوں میری آمد پر بڑے خوش ہوئے، میں تین روز تک وہاں رہا اور جب واپس جانا چاہا تو اس بزرگ سے دریافت کیا "یہ پاکدامنہ آپ کی کیا لگتی ہیں"؟ انہوں نے کہا ایک طرف سے میرے چچا کی بیٹی ہیں اور ایک طرف سے میری بیوی ہیں" میں نے کہا میں نے آپ کی صحبت میں گزارے ہوئے ان تین دن میں آپ میں سخت بیگانگی دیکھی ہے انہوں نے کہا "ہاں پینسٹھ برس سے یہی کیفیت ہے، میں نے کہا مجھے اس کا سبب بتائیے" انہوں نے کہا - جان لو کہ ہم بچپن میں ایک دوسرے کے عاشق تھے اور

اس کا باپ میرے ساتھ اس کا نکاح نہ کرتا تھا کیونکہ ہماری آپس کی محبت اس کے علم میں آچکی تھی۔ ہم نے کافی عرصہ اس بات کا رنج برداشت کیا یہاں تک کہ اسکا والد فوت ہوگیا میرے والد اس کے چچا بھی تھے انہوں نے میرے ساتھ اس کا نکاح کر دیا۔ جب ہم پہلی رات ایک دوسرے کے پاس پہنچے تو یہ مجھے کہنے لگی "تم جانتے ہو کہ خدائے تعالےٰ نے ہمیں کس نعمت سے سرفراز فرمایا ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ ملادیا اور ہمارے دلوں کو آزمائشوں اور مصیبتوں سے نجات دے دی۔ میں نے کہا "ہاں! تو اس نے کہا" تو پھر ہم آج کی رات اپنے آپ کو نفسانی خواہشات سے باز رکھیں گے اور اپنی مراد کو پاؤں تلے کچلتے ہوئے اس نعمت کے شکریہ میں اپنے اللہ کی عبادت کریں گے" میں نے کہا "ٹھیک ہے"۔ دوسری رات بھی اس نے یوں ہی کہا اور پھر تیسری رات میں نے کہا "دیکھو! دو راتیں ہم نے تمہارے کہنے پر نعمتِ خداوندی کے شکرانے میں گزار لیں ہیں۔ آج کی رات میرے کہنے پر آؤ کہ اللہ کی عبادت کریں آج ساٹھ اور پانچ سال ہو چکے ہیں کہ ہم نے ایک دوسرے کو چھونے کی نیت سے دیکھا تک نہیں اور تمام عمر نعمت کے شکر میں گزار دی ہے"۔

پس جب کوئی درویش کسی عورت سے نکاح کرے اور اس کی صحبت اختیار کرے تو جب تک اس پردہ نشین عورت کی روزی رزقِ حلال سے نہ بنالے اور اس کا مہر مالِ حلال سے ادا نہ کرے اور جب تک حق تعالےٰ کے احکام الٰہی کو پوری طرح ادا نہ کر چکے اپنے نفس کی لذت میں مشغول نہ ہو اور جب اپنے اوراد و وظائف مکمل کر کے اُس کے ساتھ صحبت کا ارادہ کرے تو اپنی مراد کو اپنے اندر قتل کر دے اور مناجات کے طور پر خداوند تعالیٰ کے حضور عرض کرے " اے میرے پروردگار! آپ نے جہان کو آباد کرنے کے لیے بنی آدم کی مٹی میں شہوت کی سرشت رکھ دی ہے اور آپ نے اپنے علم میں یہ چاہا کہ یہ صحبت مجھے حاصل ہو، اے میرے پروردگار میری یہ ہمبستری دو چیزوں کے لیے بنا دے۔ ایک تو اس حلال کے ذریعے مجھے حرام بھی ارتکاب سے محفوظ رکھ اور دوسرے یہ کہ مجھے اپنے اندر مشغول کر لے۔

حضرت سہیل بن عبد اللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق آتا ہے کہ اُنہیں ایک فرزند نصیب ہوا وہ جب بھی اپنی ماں سے کھانے کے لیے طعام مانگتا تو ماں اُسے کہتی خدا تعالےٰ سے مانگو! وہ محراب میں جاکر سجدہ ریز ہو جاتا تو ماں اس طرح کھانا اُس کے سامنے رکھ دیتی کہ اُسے یہ احساس نہ ہوتا کہ یہ ماں نے رکھا ہے اور یوں اس لیے تھا کہ حق تعالےٰ سے مانگنا اُس کی طبیعت بن جائے۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ مدرسہ سے واپس آیا تو ماں گھر میں موجود نہ تھی اُس نے حسبِ معمول سر سجدہ میں رکھا تو اللہ تعالےٰ نے اُسی کی ضرورت اُس کو فراہم کر دی ماں گھر آئی اور اس نے اس کے ساتھ کھانا دیکھا تو پوچھا "بیٹے یہ کہاں سے آیا ہے؟ اس نے کہا" ماں! جہاں سے روزانہ آیا کرتا ہے" حضرت ذکریا علیہ السلام جب سیدہ مریم رضی اللہ عنہا کے پاس حجرہ میں داخل ہوئے تو گرمی کے موسم میں سردیوں کے اور سردی کے موسم میں گرمیوں کے پھل موجود پاتے حیران ہو کر دریافت کرتے "انی لکِ ھذا" (اے مریم! یہ تمہیں کہاں سے ملے ہیں) وہ کہتیں "ھذا من عند اللہ" (یہ اللہ کی طرف سے ہیں) پس ہونا یوں چاہیے کہ اس سنت کا استعمال درویش کے دل کو طلبِ دنیا اور مالِ حرام کی خواہش میں مشغول نہ کر دے، کیونکہ دل کی خرابی میں ہی درویش کی ہلاکت ہے جس طرح کہ دولتمند آدمی کی خرابی اس کے گھر اور گھریلو سامان کی خرابی میں ہوتی ہے۔ پس جو کچھ درویش کا بگڑ جائے اس کا کوئی عوض نہیں ہو سکتا۔ ہمارے زمانے میں یہ ممکن نہیں رہا کہ کسی کو ایسی عورت نصیب ہو جائے جو زیادہ مطالبات اور فضول و محال امور کو طلب کیے بغیر اس کے ساتھ موافقت کرے، اسی لیے ایک گروہ نے مجرد اور ہلکا رہنا اختیار کر لیا ہے اور اس حدیثِ مبارکہ پر عمل کر لیا ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "خیر الناسِ فی آخر الزمان خفیف الحال، قیل یا رسول اللہ وما خفیف الحال قال الذی لا اھل لہ، ولا ولد لہ۔" آخر زمانے میں بہترین لوگ وہ ہونگے جو خفیف الحال ہونگے آپ سے پوچھا گیا "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ خفیف الحال کون ہوگا؟ تو آپ نے فرمایا" وہ جس کی نہ اہلیہ ہو گی نہ اولاد" نیز آپ نے فرمایا "سیروا سبق المفردون" (تم سیاحت کرو کہ تنہا رہنے والے سبقت لے گئے)

مشائخ طریقت کا اس پر اجماع ہے کہ بہترین اور افضل لوگ وہ ہیں جو مجرد رہ کر زندگی گزاریں بشرطیکہ ان کا دل آفات سے خالی ہو اور اُن کی طبیعت گناہوں کے ارتکاب کے ارادے اور شہوتوں سے اعراض کرتی ہو۔ عام لوگ نکاح کرنے کے لیے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کو حجت بناتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "حُبِّبَت اِلَیَّ مِنْ دنیاکم ثلاثٌ" "الطیب والنساءُ وجعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ" (تمہاری دنیا کی چیزوں میں سے تین چیزیں میرے لیے محبوب بنائی گئی ہیں۔ خوشبو، عورتیں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے) اور کہتے ہیں کہ جب عورتیں حضور علیہ السلام کو محبوب تھیں تو پھر نکاح ہی تجرد سے افضل ہے) میں کہتا ہوں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "لِی حرفتان الفقر و الجہاد" (مجھے دو پیشے پسند ہیں۔ فقر اور جہاد) پس وہ ان پیشوں سے کیوں دست بردار ہو جاتے ہیں کہ اگر عورتیں آپ کو پسند تھیں تو فقر اور جہاد بھی تو آپ کو پسند تھا۔ پس ان خواہش پرستوں کو چونکہ عورتوں کی طرف رغبت زیادہ ہوتی ہے اس لیے اپنی خواہش کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی پسند کا نام دے دیتے ہیں، اگر کوئی شخص پچاس سال تک بھی اپنی خواہشات کا تابع ہوتے ہوئے یہ سمجھتا رہے کہ میں سنت کا متبع ہوں تو بڑی سخت غلطی میں مبتلا ہے۔ خلاصہ یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام کے لیے جو پہلا فتنہ مقدر ہوا وہ ایک عورت کا فتنہ ہی تھا اور ہابیل و قابیل کے جھگڑے کی صورت میں جو پہلا فساد دنیا میں نمودار ہوا وہ بھی ایک عورت کی وجہ سے ہی تھا اور جب دو فرشتوں ہاروت و ماروت کو اللہ تعالے نے سزا دینا چاہی تو اس کا سبب بھی ایک عورت ہی تھی اور ہمارے زمانے تک دینی اور دنیاوی تمام فتنے عورتوں کے ہی ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "ما ترکت بعدی فتنۃ اضر علی الرجال من النساء" (میں نے اپنے بعد مردوں کے لیے عورتوں سے زیادہ ضرر رساں کوئی فتنہ نہیں چھوڑا) پس عورتوں کا فتنہ جب ظاہر میں اتنا بڑا ہے تو باطن میں یہ کتنا بڑا ہوگا۔ اور میں علی بن عثمان ہجویری رح کو خود گیارہ سال تک خداوند تعالےٰ نے نکاح کی آزمائش سے بچائے رکھا۔ اور پھر یہی مقدر تھا کہ میرے اندر فتنہ پیدا کر دیا اور میرا ظاہر و باطن ایک پری کی صفت کا اس کے دیکھے بغیر

اسیر ہو گیا اور میں ایک سال تک اس میں ایسا مستغرق رہا کہ قریب تھا کہ میرا دین مجھ پر تباہ ہو جائے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے کمال الطاف اور اپنے پورے فضل سے میرے دل کو ہلاک ہونے سے بچا لیا اور مجھے اپنی رحمت کے ذریعہ اس سے نجات نصیب فرما دی۔ اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت پر میں اُس کا شکر ادا کرتا ہوں۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ طریقت کی بنیاد مجرد رہنے پر رکھی گئی ہے۔ انسان جب نکاح کر کے صاحبِ عیال بن جاتا ہے تو اُس کا حال متغیر ہو جاتا ہے، پھر نفسانی خواہشات کے لشکروں میں سے کسی لشکر کی آگ کو بھی بجھایا نہیں جا سکتا کیوں جو خرابی خود تیرے اندر سے پیدا ہوئی ہے اس کے دور کرنے کا سامان بھی تو خود تجھ پر ہی موقوف ہے کسی دوسرے کو کیا ضرورت ہے کہ تیری اس آفت کو تجھ سے دور کرے۔ اور شہوت کا ازالہ دو چیزوں سے ہو سکتا ہے ایک یہ کہ جو انسان کے تکلف اور کوشش سے زیر ہو سکے اور دوسرے یہ کہ وہ انسان کے مجاہدہ اور کسب سے باہر ہو۔ جو چیز انسانی تکلف و کوشش کے تحت ہے وہ تو بھوک ہے کہ اس سے بھی شہوت زائل ہوتی ہے اور جو چیز انسان کے مجاہدہ سے باہر ہے وہ ہو بیقرار کرنے والا خوفِ خدا ہے یا پھر حق تعالیٰ کی سچی محبت ہے جو ہمتوں کو کام میں لانے سے مجتمع ہوتی ہے اور محبت کا غلبہ خود بخود جسم کے اعضاء میں اس شہوت کو پراگندہ کر دیتا ہے اور تمام حواس کو ان کے شہوانی اوصاف سے معزول کر دیتا ہے۔ اور انسان کو مکمل طور پر شہوت سے دور کر کے تمام بیہودگیاں ان سے فانی کر دیتا ہے۔ حضرت احمد سرخسی جو ماوراء النہر میں میرے دوست تھے اور بڑے صاحبِ حشمت بزرگ تھے، اُن سے لوگوں نے کہا کہ کیا آپ نکاح کی ضرورت محسوس کرتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا "نہیں" لوگوں نے دریافت کیا اس کی کیا وجہ ہے؟ تو فرمایا اس لیے کہ میں اپنے معاملے میں کبھی تو حاضر ہوں اور کبھی غائب! جب میں غائب ہوتا ہوں تو مجھے کونین میں سے کسی چیز کی یاد نہیں آتی اور جب میں حاضر ہوتا تو اپنے نفس کو اس طرح رکھتا ہوں کہ جب اس کو ایک روٹی مل جائے تو وہ سمجھتا ہے کہ مجھے ہزاروں حوریں مل گئی ہیں پس دل کی مشغولیت بہت بڑا کام ہے جو چیز تمہیں پسند ہے اُسے اختیار کر لو! اور ایک اور گروہ کہتا کہ ہم نکاح اور مجرد رہنے والوں حالتوں میں اپنا اختیار منقطع کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ہمارے لیے تقدیر سے اور پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے اگر مجرد رہنا ہمارے حصّہ میں آتا ہے تو

ہم اس حالت میں پاکدامن رہنے کی کوشش کریں گے اور اگر تقدیر الٰہی سے ہمارے حصہ میں نکاح کرنا آتا ہے ہم سنت کا اتباع کریں گے اور دل کو فارغ رکھنے کی کوشش کریں گے کیونکہ جب بندہ کے لیے حق تعالےٰ کی حفاظت شاملِ حال ہو تو بندہ کا مجرد رہنا بھی حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح ہوتا ہے کہ زلیخا کی آزمائش کے وقت اپنی مراد پر قادر ہونے کے باوجود آپ نے اس سے روگردانی کی اور جب زلیخا نے آپ کے ساتھ خلوت کی تو آپ اپنے نفس کی خواہشات کو مغلوب کرنے اور نفس کے عیوب کو دیکھنے میں مشغول ہو گئے۔ اس طرح اگر انسان کو حق تعالیٰ کی حفاظت حاصل ہو تو نکاح کی حالت میں اُس کا نکاح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نکاح کی طرح ہوگا کہ حق تعالےٰ سے آپ کو جو کامل درجے کا اعتماد حاصل تھا اس کی وجہ سے انہوں نے اپنے اہل وعیال میں مشغول ہو کر خدا تعالیٰ کو فراموش نہیں کیا یہاں تک کہ جب حضرت سارہؓ کو رشک ہوا اور اپنی غیرت کا مسئلہ بنا لیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام سیدہ ہاجرہؓ اور اپنے بیٹے اسماعیلؑ کو لے گئے اور ایک بے آب وگیاہ وادی (مکہ معظمہ) میں لے جا کر چھوڑ آئے اور خدا کے سپرد کر کے اپنا منہ ان سے موڑ لیا حتیٰ کہ حق تعالےٰ نے اپنی حفاظت میں لے کر اُن کی خود اپنی مرضی کے مطابق پرورش کی۔ پس انسان کی ہلاکت نہ تو نکاح کرنے میں ہے نہ مجرد رہنے میں بلکہ اپنا اختیار ثابت کرنے اور اپنی خواہشات کا اتباع کرنے میں اس کی مصیبت وہلاکت ہے

پس عیال دار ہونے کے آداب کی شرط یہ ہے کہ نکاح کے بعد روزانہ کے وظائف میں سے کوئی وظیفہ فوت نہ ہونے پائے، سلوک کے احوال ضائع نہ ہوں، اوقاتِ کار میں بدنظمی پیدا نہ ہونے پائے۔ اپنے اہل وعیال سے شفقت کا برتاؤ کرے، اُن کے لیے حلال روزی کا اہتمام کرے اور نان ونفقہ ادا کرنے کے لیے ظالموں اور بادشاہوں سے امداد نہ لے تاکہ اس طرح جب اس کو کوئی فرزند نصیب ہو تو وہ بھی انہی شرائط کا پابند ہو اور پاک باز و نیک کردار ہو۔ حکایات میں معروف ہے کہ حضرت احمد بن حرب نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ ایک دن سادات اور رؤساء کی ایک جماعت کے ساتھ تشریف فرما تھے جو آپ کو سلام کرنے حاضر ہوئے تھے کہ آپ کا شراب خور بیٹا

نشے میں دُھت، ساز بجاتا اور راگ گاتا ہوا اندر داخل ہوا اور بے حرمتی کرتا ہوا بے دھڑک وہاں سے گزر گیا اور کسی کی اُس نے پرواہ نہ کی۔ جس سے وہ سب رنجیدہ خاطر ہو گئے۔ حضرت احمدؒ نے جب ان کو اس حالت میں دیکھا تو پوچھا کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم سب کی حالت متغیر ہو گئی ہے؟ انہوں نے عرض کی کہ آپ کے اس صاحبزادے کے اس حالت میں آپ کے پاس سے گزرنے پر ہم تشویش زدہ ہو گئے ہیں کہ اس نے آپ کی کوئی پرواہ ہی نہیں کی۔" حضرت احمدؒ نے فرمایا "وہ اس معاملے میں معذور ہے کیونکہ ایک رات ہمارے کھانے کے لیے ہمارے ہمسایہ سے کھانا آیا جسے ہم نے اور میری اہلیہ نے کھا لیا پھر اُسی رات ہم نے آپس میں صحبت کی جس سے یہ لڑکا رحمِ مادر میں قرار پایا۔ پھر ہم پر نیند کا اسقدر غلبہ ہو گیا کہ اُس رات کے تمام اوراد و ظائف ہم سے ضائع ہو گئے۔ جب صبح ہوئی تو ہم نے اپنی اس حالت کی حقیقت معلوم کرنا شروع کی اور اُس ہمسایہ سے رجوع کیا کہ جو کھانا اُس نے بھیجا تھا وہ کہاں سے آیا تھا، اس نے بتایا کہ وہ ایک شادی والے گھر سے آیا تھا، چنانچہ جب ہم نے مزید تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ شادی والوں کے ہاں وہ کھانا بادشاہ کے گھر سے آیا تھا۔ اور مجرد رہنے کے آداب کی شرط یہ ہے کہ آنکھ کو ناشائستہ امور کو دیکھنے سے بچائے اور نہ دیکھنے کے قابل چیزوں کو ہرگز نہ دیکھے اور نہ سننے کے قابل باتوں کو نہ سنے اور جن باتوں کو سوچنا مناسب نہیں ان کو ہرگز نہ سوچے۔ اور شہوت کی آگ کو بھوک سے بجھائے اور دل کو دنیا اور حوادث میں مشغول کرنے سے بچائے اور اپنے نفس کی خواہشات کو علم اور الہام کا نام نہ دے اور شیطان کی شعبدہ بازیوں کی تاویل نہ کرے تاکہ طریقت کے نزدیک اُسے قبولیت کا شرف حاصل ہو جائے صحبت اور معاملہ کے یہ مختصر طور پر آداب تھے۔

"واللہ اعلم بالصواب"

دسواں کشف حجاب

صوفیہ کے کلام، اُن کی اصطلاحات اور حقائق کا بیان

اللہ تعالےٰ تمہیں سعادت مند کرے جان لو کہ ہر فن والوں اور ہر معاملہ والوں کے آپس میں اسرار بیان کرنے کے لئے کچھ مخصوص عبارتیں اور اصطلاحیں ہوتی ہیں جن کے معنی اُن کے علاوہ دوسرے لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ ان اصطلاحوں کو وضع کرنے میں اُن کے دو مقصد ہوتے ہیں۔ ایک تو اچھی طرح سمجھانا اور مشکل باتوں کو آسان کرنا مقصود ہوتا ہے تاکہ مرید کو سمجھانا آسان ہو۔ اور دوسرا اُن لوگوں سے اسرار و رموز کو چھپانا مقصود ہوتا ہے جو اس علم کے اہل نہیں ہوتے اور اس کے دلائل بڑے واضح ہیں۔ جیسا کہ اہل لغت اپنی وضع کردہ اصطلاحات میں مخصوص ہیں۔ مثلاً فعل ماضی و فعل مستقبل، صحیح و معتل و اجوف اور لفیف و ناقص وغیرہ اور علم نحو والے اپنی وضع کردہ عبارات میں مخصوص ہیں۔ مثلاً رفع، ضمہ، نصب، فتح، خفض، کسر، جزم، منصرف اور غیر منصرف وغیرہ۔ اور علم عروض اپنی وضع کردہ اصطلاحوں سے مخصوص ہیں جیسا کہ فرد و زوج، ضرب و تقسیم، کعب و جذر، رضافت و تضعیف و تنصیف اور جمع و تفریق وغیرہ۔ اور فقہا اپنی وضع کردہ اصطلاحات سے مخصوص ہیں" مثلاً علت و معلول قیاس و اجتہاد اور دفع و التزام وغیرہ۔ اور محدثین اپنی بنائی ہوئی عبارات سے مخصوص ہیں مثلاً مسند و مرسل، احاد و متواتر اور جرح و تعدیل وغیرہ اور متکلمین اپنی بنائی ہوئی اصطلاحوں کے ساتھ مخصوص ہیں مثلاً عرض و جوھر، کل و جزو، جسم و حدوث، جبر و تخیر اور ھیولیٰ وغیرہ پس اس گروہِ صوفیہ کے بھی اپنے گفتگو کو ظاہر کرنے اور چھپانے کے لئے الفاظ مخصوص ہیں تاکہ اُن کے ساتھ وہ طریقت میں تصرف کریں اور جس کو چاہیں اپنے مقصود سے آگاہ کریں اور جس کو چاہیں اس سے اپنے مقصود کو مخفی رکھیں —— پس میں انشاء اللہ اُن کلمات کا تشریح کے ساتھ بیان کروں گا اور فرق کروں گا کہ ایک کلمہ اور دوسرے کلمہ سے صوفیہ کی مراد کیا ہوتی

ہے تاکہ تجھ کو اور اس کتاب کو پڑھنے والے دوسرے لوگوں کو پورا پورا فائدہ ہو اور مجھے نیک دعائیں حاصل ہوں ——— پس ان اصطلاحوں میں سے "حال اور وقت" بھی ہیں اور ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ وقت اس طائفہ کے درمیان ایک مشہور اصطلاح ہے اور اس کے متعلق مشائخ کا بہت سا کلام ہے البتہ میرا مقصد اس کی تحقیق کرنا ہے نہ کہ بیان کو طول دینا۔ پس وقت وہ حالت ہوتی ہے کہ بندہ اس کی وجہ سے ماضی اور مستقبل سے بالکل فارغ ہو جائے چنانچہ حق تعالےٰ کی طرف سے اُس کے دل پر ایسی حالت وارد ہو اور اس کا باطن یوں مجتمع ہو جائے جیسا کہ مکاشفہ کی صورت میں ہوتا ہے کہ نہ اُس کو گزشتہ زمانے کی یاد آتی ہے اور نہ آئندہ کی کوئی سوچ! پس اس معاملہ میں تمام لوگوں کو دسترس حاصل نہیں ہوتی اور وہ نہیں جانتے کہ ہمارا گزرا ہوا وقت کس حالت پر گزرا اور ہماری آئندہ عاقبت کیا ہوگی۔ سوائے اُن لوگوں کے جو صاحب وقت ہوتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا علم سابقہ حالت اور انجام کار کا ادراک نہیں کر سکتا اور ہم کو وقت کی حالت میں حق تعالےٰ کے ساتھ ایک اچھی کیفیت حاصل ہے کیوں کہ اگر ہم آئندہ کل میں مشغول ہو جائیں یا آئندہ کے اندیشے ہمارے دل پر گزرنے لگیں تو ہم وقت سے محجوب ہو جائیں گے اور حجاب ایک بہت بڑی پریشان حالی ہے پس جس کسی کو وہاں تک دسترس حاصل نہیں ہوتی اُس کے لئے اس کو سمجھنا محال ہے۔ جیسا کہ حضرت ابو سعید خراز رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اپنا وقتِ عزیز کسی عزیز ترین چیز کے سوا کسی میں مشغول نہ کرو اور بندہ کی عزیز ترین چیز ماضی اور مستقبل کے درمیان اپنے وقت کو خدا تعالیٰ کی یاد میں مشغول رکھنا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے لِی مَعَ اللّٰہِ وَقتٌ لَا یَسَعُنِی فِیہِ مَلَکٌ مُقَرَّبٌ وَّلَا نَبِیٌّ مُرسَلٌ "(میرے لئے اللہ کے ساتھ مشاہدہ کا ایک مخصوص وقت ہے کہ اُس میں میرے ساتھ نہ کسی مقرب فرشتے کی گنجائش ہوتی ہے نہ کسی نبیِ مرسل کی) یعنی مجھے حق تعالےٰ کے ساتھ ایسا وقت حاصل ہے کہ اس میں ہزارہا جہانوں میں سے کسی چیز کا میرے دل پر گزر نہیں ہوتا اور نہ ہی میری نگاہ میں اُن کی کوئی قیمت ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب معراج کی رات زمین و آسمان کی تمام خوبصورتیوں کو آپ کے سامنے پیش کیا گیا

تو آپ نے کسی چیز کی طرف نگاہ نہ کی یہاں تک کہ حق تعالے نے فرمایا "مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی" (آپ کی نگاہ تجلیات الٰہی سے نہ ہٹی نہ آگے بڑھی) کیوں کہ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم عزیز تھے اور عزیز کو عزیز کے علاوہ کسی چیز میں مشغول نہیں کرتے۔ پس موحد کے دو وقت ہوتے ہیں ایک حالتِ فقد کا وقت اور دوسرا حالتِ وجد کا وقت۔ پہلا تو ان میں حق تعالےٰ سے فراق کے محل میں ہے جب کہ دوسرا وصال کے محل میں۔ اور درویش ان دونوں اوقات میں مجبور رہتا ہے کیوں کہ وصل کی حالت میں اس کا وصل حق تعالےٰ کے ساتھ ہوتا ہے اور فصل کی صورت میں بھی یہ فصل حق تعالے سے ہی ہوتا ہے اور ان معاملات میں اختیار اور اپنا اکتساب ہرگز ثابت نہیں ہوا کرتا کہ اُس کو درویش کی صفت قرار دے سکیں چنانچہ جب بندہ کا اپنا اختیار اُس کے معاملہ میں ختم ہو جاتا ہے تو وہ جو کچھ بھی کرتا ہے وقت اور مشاہدہ حق کی وجہ سے کرتا ہے ——— حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ سے متعلق آتا ہے کہ انہوں نے فرمایا "میں نے ایک درویش کو جنگل میں ایک کیکر کے درخت کے نیچے سخت جگہ پر بڑی مشقت اور ریاضت کرتے ہوئے دیکھا تو میں نے پوچھا "اے بھائی! اس مشکل ترین مقام پر اور اس حالت میں تجھے کس چیز نے یہاں بٹھا رکھا ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ "میں اس لئے یہ تکلیف یہاں برداشت کر رہا ہوں کہ مجھے مقام وقت حاصل تھا جو اس جگہ مجھ سے ضائع ہو گیا ہے اب میں یہاں افسوسناک حالت میں بیٹھا ہوں" میں نے پوچھا "کتنے عرصہ سے تم یہاں بیٹھے ہو؟ اُس نے جواب دیا "شیخ! بارہ سال ہو چکے ہیں اب آپ بھی میرے لئے دعا کریں کہ مجھے میری مراد حاصل ہو جائے!۔ حضرت جنید کہتے ہیں کہ میں وہاں سے حج کے لئے چلا گیا اور مکہ مکرمہ میں اس کے لئے دعا کی جو قبول ہو گئی اور وہ درویش اپنی مراد کو پہنچ گیا اور میں جب واپس آیا تو پھر بھی اُس کو اُسی جگہ بیٹھا ہوا پایا" میں نے پوچھا "اے جوانمرد! جب تمہیں تمہارا کھویا ہوا وقت حاصل ہو گیا ہے تو تم یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے؟ اس نے جواب دیا" اے شیخ میں نے اس جگہ کو اب لازم پکڑ لیا ہے کہ جو میرے لئے محل وحشت تھی کہ میں نے اپنا سرمایہ یہاں گم کیا تھا اب کیا میرے لئے یہ مناسب ہے کہ جس جگہ پر میں نے اپنا کھویا ہوا سرمایہ دوبارہ حاصل کیا ہے اور وہ میرے لئے محل اُنس

بن گیا ہے اس کو چھوڑ دوں" شیخ! آپ سلامتی کے ساتھ تشریف لے جائیے۔ میں تو اپنی خاک کو اس جگہ کی مٹی کے ساتھ ملا دوں گا تاکہ قیامت کے دن یہاں سے ہی سر اٹھاؤں کہ یہ جگہ میری محبت کا مقام اور میری خوشیوں کا محل ہے۔

شعر فَکُلُّ امرِیءٍ یُوْتِی الجمیل محببٌ
وَکُلّ مکانٍ ینبتُ العزّ طیبٌ ؂

(پس جس شخص کے ذریعہ کوئی حسین تحفہ بھیجتا ہے وہ بھی پیارا ہوتا ہے اور جو مکان عزت پیدا کرے وہ بھی پسندیدہ ہوتا ہے)

پس جو آدمی کے اپنے کسب و اختیار میں نہ ہو کر اُسے تکلف کے ساتھ حاصل کر سکیں تو وہ اگر مل جائے تو اُس کے بدلے میں جان دینی پڑے پھر بھی دے دینی چاہیئے کیونکہ اس کو اپنے اندر پیدا کرنا اور اپنے سے دور کرنا اپنے ارادے اور اختیار میں نہیں ہوتا اور اس معاملے میں دونوں طرف برابر ہوتے ہیں اور بندے کا اپنا اختیار اُس کی تحقیق میں باطل ہوتا ہے۔ اور مشائخ نے کہا ہے کہ "الوقت سیف قاطعٌ۔" (وقت ایک کاٹنے والی تلوار ہے) کیوں کہ تلوار کی صفت بھی کاٹنا ہے۔ جب کہ وقت کی صفت بھی کاٹنا ہی ہے کہ وقت ماضی اور مستقبل کے درمیان ہوتا ہے اور گزشتہ کل اور آئندہ کل کا غم دل سے محو کر دیتا ہے پس تلوار کی صحبت پُرخطر ہی ہوتی ہے کہ "امّا ھلاکٌ وَامّا ملکٌ" (یا تو تلوار سے ہلاکت ہوتی ہے یا پھر بادشاہت ملتی ہے) یعنی تلوار یا تو بادشاہ بنا دیتی ہے یا پھر ہلاک کر دیتی ہے اگر کوئی شخص ہزار سال تک بھی شمشیر کی خدمت کرے اور اپنے عزیز کندھے میں اُسے حمائل کئے رکھے تو بھی کاٹنے کے وقت وہ اپنے مالک اور اُس کے دشمن کی گردن میں کوئی تمیز نہیں کرتی کیوں کہ اُس کی صفت قہر ہے اور کسی کے اُس کو اپنا لینے سے اُس کی صفت قہر زائل نہیں ہو جاتی۔

اور درویش کا حال اُس کی طرف سے وقت پر وہ حالت ہوتی ہے جو اُس کو مزین کرتی ہے جس طرح کہ روح جسم کو مزین کرتی ہے اور لامحالہ وقت، حال کا محتاج ہو گا کیونکہ وقت کی صفائی حال کی وجہ سے ہے اور اُس کا قیام بھی اُسی کے ساتھ ہے، پس

جب صاحبِ وقت، صاحبِ حال ہو جاتا ہے تو اُس سے تغیر منقطع ہو جاتا ہے اور وہ اپنے معاملہ میں صاحبِ استقامت ہو جاتا ہے کیوں کہ جب تک وقت حال کے بغیر ہو اُس کیلئے زوال ممکن ہوتا ہے لیکن جب حال اُس کے ساتھ پیوست ہو جائے تو اُس کے تمام حالات وقت ہی ہو جاتے ہیں اور پھر اس پر زوال ممکن نہیں رہتا۔ اور تجلیاتِ الٰہی کی جو آمد ہوتی ہے وہ خفا اور ظہور کی وجہ سے ہوتی ہے جیسا کہ اس سے پہلے صاحب وقت کے لئے نازل ہونے والا وقت ہوتا ہے اور متمکنِ وقت کے لئے غفلت جائز ہوتی ہے اور جب صاحب غفلت پر نازل ہونے والا حال ہو اور متمکن وقت تو اُس پر غفلت طاری نہیں ہوتی کیوں کہ صاحبِ وقت پر تو غفلت ممکن اور جائز ہے لیکن صاحب حال کے لئے غفلت ہرگز جائز نہیں ——— اور مشائخ نے یہ بھی کہا ہے کہ " الحالُ سکوتُ اللسانِ فی فنونِ البیان "۔ (حال یہ ہے کہ صاحبِ حال کی زبان بیان کے تمام فنون میں خاموش ہو جائے) یعنی صاحب حال اپنی حالت بیان کرنے سے خاموش ہو جائے اور اُس کا معاملہ خود اُس کے حال کو بیان کرے، یہی وجہ ہے کہ اُس بزرگ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا تھا کہ " السوال عنِ الحالِ محال "۔ حال کے بارے میں سوال کرنا ہی محال ہے) کیوں کہ حال کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں اس لئے کہ حال نام ہی فنائے مقال کا ہے) ———

اور اُستاد ابو علی دقاق رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اگر دنیا یا آخرت میں تجھے خوشی یا رنج حاصل ہے تو تیری اسی کیفیت کا نام وقت ہے کیوں کہ یہ سب کچھ وقت کا ہی حصہ ہے جب کہ حال اس طرح نہیں ہوتا، کیوں کہ وہ تو حق تعالےٰ کی طرف سے بندے پر وارد ہونے والی ایک واردات ہے کہ جب وہ طاری ہوتی ہے تو ہر چیز کو دل سے نفی کر دیتی ہے جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام چونکہ صاحبِ وقت تھے اس لئے کبھی تو حضرت یوسف علیہ السلام کے فراق میں آپ نے اپنی آنکھیں سفید کر لی تھیں اور ایک وقت آیا کہ وصال کی حالت میں وصال کے ذریعہ آپ بینا ہو گئے کبھی تو آپ فراق سے بال کی طرح اور کبھی گریہ سے ریشۂ قلم کی طرح اور کبھی روح کے بغیر محض جسم کی طرح اور کبھی خوشی سے سراپا مسرت بن جاتے تھے، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ صاحبِ حال تھے اس لئے نہ اُنہوں نے فراق کی

کوئی پرواہ نہ کی اور نہ غمگین ہوتے نہ وصال کو کوئی اہمیت دی کہ کوئی خوشی محسوس کرتے۔ ستارے، چاند اور سورج سب اُن کے حال کی مدد کرتے تھے اور آپ ہر چیز کے دیکھنے سے فارغ ہو چکے تھے حتیٰ کہ آپ جس چیز کو بھی دیکھتے اسی میں حق تعالٰے آپ کو نظر آتا اور آپ کہتے لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ "میں چھپ جانے والوں سے محبت نہیں کرتا" پس صاحب وقت کے لئے یہ جہان کبھی تو ایک جہنم بن جاتا ہے کیوں کہ وہ مشاہدہ سے غیبت میں ہوتا ہے اور محبوب کو نہ پانے کی وجہ سے اُس کا دل وحشت کدہ بن جاتا ہے اور کبھی حق تعالٰے کی طرف سے ہر وقت اُس کو ملنے والی نعمت کی خوشی میں اس کا دل جنت کی طرح ہو جاتا ہے پھر صاحب حال کو حجاب حاصل ہو یا مشاہدہ کی نعمت یا کوئی آزمائش تمام حالتیں اُس پر یکساں ہوتی ہیں، کیوں کہ وہ مقام حال سے وابستہ ہوتا ہے۔ پس حال حق تعالٰے کے مطلوب کی صفت ہے جب کہ وقت مرید کا درجہ ہے۔ ایک تو وقت کی راحت میں اپنے آپ میں باہوش ہوتا ہے اور دوسرا حال کی خوشی میں حق تعالٰے کے ساتھ مدہوش! پس ان دونوں مرتبوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

مقام اور تمکین

صوفیہ کے درمیان رائج اصطلاحات میں سے مقام اور تمکین بھی ہیں۔ ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ "مقام" طالب حق کے اپنے مطلوب کے حقوق کو پوری کوشش اور نیک نیتی کے ساتھ پورے کرنے سے عبارت ہے اور مریدانِ حق میں سے ہر ایک کے لئے ایک مخصوص مقام ہے کہ ابتداء میں طلب حق کے لئے وہی ان کا سبب ہوتا ہے اور باوجودیکہ طالب ان مقامات میں سے ہر مقام سے واقف ہوتا ہے اور اُن سے ہر ایک پر اس کا گزر ہوتا ہے لیکن اس کا قرار ایک پر ہی جا کر ہوتا ہے کیوں کہ وہ مقام اور اس کا ارادہ اُس کی فطرت اور ترکیب بدنی سے متعلق ہوتا ہے نہ کہ اُس کی روش اور معاملہ سے جیسا کہ اللہ عزوجل نے اپنے کلام مقدس میں ہمیں خبر دی ہے۔ وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَہٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ" (اور ہماری طرف سے ہر ایک کے لئے ایک متعین مقام ہوتا ہے) پس حضرت

آدم علیہ السلام کا مقام "توبہ" تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام کا مقام "زہد تھا" حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام "تسلیم" تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقام "انابت" تھا حضرت داؤد علیہ السلام کا مقام "غم" تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقام "امید" تھا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا مقام "خوف" تھا اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ السلام کا مقام "ذکر" تھا۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک کو تمام مقامات میں سیر حاصل تھی لیکن بالآخر ہر ایک کا رجوع اُس کے اپنے اصلی مقام کی طرف ہی تھا۔ میں نے محاسبی حضرات کا مذہب بیان کرتے ہوئے مقامات سے متعلق کچھ بیان کر دیا تھا۔ اور حال و مقام کے درمیان فرق بیان کیا تھا۔ تاہم اس جگہ بھی اتنا بیان کئے بغیر چارہ نہیں۔ لہٰذا جان لو کہ حق تعالےٰ کا راستہ تین قسم پر ہے۔ ایک۔ مقام۔ دوسرا۔ حال اور تیسرا تمکین — حق تعالےٰ اپنے تمام انبیاء کرام کو اپنا راستہ بیان کرنے کے لئے ہی مبعوث فرمایا تھا تاکہ وہ مقامات کا حکم بیان کریں۔ اور اس طرح ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام اتنی تعداد میں ہی مقامات کو جانتے ہوئے دنیا میں تشریف لائے تھے اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے ہر مقام والے کے لئے ایک حال ظاہر ہوا اور وہ اس درجہ پر پہنچ گیا کہ لوگوں کا کسب اُن سے منقطع ہو گیا یہاں تک کہ لوگوں پر دین مکمل ہو گیا۔ اور نعمت خداوندی آخری حد تک پہنچ گئی حتیٰ کہ حق تعالےٰ نے فرمایا کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ ط آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا۔ اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو دین کے طور پر پسند کر لیا' تو حضور علیہ السلام کے تشریف لانے اور دین مکمل جانے پر متمکنوں کے لئے تمکین ظاہر ہو گئی —— اور اگر اُن تمام کے احوال شمار کرنا چاہوں اور تمام مقامات کی شرح کرنا چاہوں تو اصلی مقصد سے باز رہ جاؤں گا۔ تاہم تمکین محققین کے محل کمال میں اور درجہ اعلیٰ میں اقامت پذیر ہونے سے عبارت ہے۔ بس اہل مقامات کا مقامات سے تو آگے گزرنا ممکن ہے لیکن درجۂ

تمکین سے آگے گزرنا محال ہے کیوں کہ مقام تو مبتدی حضرات کا درجہ ہے جب کہ تمکین منتہی حضرات کی قرارگاہ ہے۔ ابتداء سے انتہا کی طرف گزر تو ہوتا ہے لیکن انتہائی مقام سے آگے گزر جانے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی اس لئے مقامات راستے کی منزلیں ہیں جب کہ تمکین بارگاہِ خداوندی میں قرار کا نام ہے، دوستانِ الٰہی راستے میں غائب اور منازل میں بیگانہ ہوتے ہیں اُن کا باطن بارگاہ الٰہی میں ہوتا ہے اور حق تعالیٰ کے حضور اسباب و آلات ایک آفت اور سامانِ غیبت ہوتے ہیں ـــ جاھلیت کے دور میں شعراء اپنے ممدوحین کی مدح میں یہ معاملہ کرتے تھے کہ جب تک کچھ عرصہ نہ گزر جاتا شعر ادا نہیں کرتے تھے چنانچہ کوئی شاعر جب اپنے ممدوح کے سامنے پہنچتا تو اپنی تلوار کھینچ لیتا اور اپنی سواری کے پاؤں کاٹ ڈالتا اور پھر وہ تلوار بھی توڑ ڈالتا۔ اور اس سے یہ ظاہر کرنا مراد ہوتا تھا کہ مجھے سواری کی صرف اس لئے ضرورت تھی کہ آپ کے حضور پہنچنے کی مسافت طے کر سکوں اور تلوار کی ضرورت اس لئے تھی کہ میں اپنے ان حاسدوں کا مقابلہ کر کے ان کی کوششوں کو ناکام بنا سکوں جو مجھے آپ کی خدمت میں حاضری سے روکنے والے تھے اب جب میں آپ کے حضور پہنچ چکا ہوں تو مسافت طے کرنے والے آلہ کی مجھے کیا ضرورت رہ گئی ہے اس لئے سواری کو قتل کر دیا ہے تیرے دربار سے لوٹ کر جانا میں جائز نہیں سمجھتا اور تلوار کو اس لئے توڑ ڈالا ہے تاکہ آپ کی بارگاہ سے تعلق ختم کرنے کا میرے دل میں خیال بھی نہ گزرے یوں جب چند روز گزر جاتے تو پھر وہ اپنا قصیدہ پڑھ کر سناتا ـــــــ اور حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ صلوات اللہ علیہ کو بھی اسی طرح فرمایا یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام جب منازل کو طے کر کے اور مقامات سے گزر کر تمکین کے محل تک پہنچ گئے اور تغیر کے اسباب آپ سے ساقط ہو گئے تو حق تعالیٰ نے آپ کو فرمایا فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ. وَاَلْقِ عَصَاكَ (جوتیاں اپنے پاؤں سے نکال دیجئے اور اپنی لاٹھی پھینک دیجئے) کیوں کہ یہ آلہ مسافت ہے اور حضورِ حق میں وصال کے بعد آلاتِ مسافرت کی وحشت کو برداشت کرنا محال ہے پس دوستی کی ابتداء حق تعالیٰ کی طلب ہے اور اس کی انتہا بارگاہِ خداوندی میں قرار پکڑنا ہے۔ پانی جب تک ندی میں ہوتا ہے جاری رہتا ہے اور سمندر میں پہنچ جاتا ہے۔

تو قرار پکڑ لیتا ہے اور جب قرار پکڑ لیتا ہے تو اپنا مزہ تبدیل کر لیتا ہے تاکہ جس کسی کو پانی کی ضرورت ہے وہ اس کی صحبت کی طرف رجحان نہ کرے بلکہ اُس کی صحبت کی طرف میلان صرف وہ شخص کرے جس کو جواہر کی ضرورت ہو تاکہ وہ جان کی بازی لگائے اور طلب کا بوجھ پاؤں میں باندھ کر سر کو جھکائے ہوئے سمندر میں غوطہ زن ہو پھر یا تو پسندیدہ جواہر اور چھپے ہوئے قیمتی موتی حاصل کرے یا پھر اپنی جان عزیز کو اُن کی جستجو میں فنا کر دے اور مشائخ میں سے ایک بزرگ کہتے ہیں کہ "التمکین رفع التلوین" (تمکین تلوین کو دور کرنے کا نام ہے) اور یہ تلوین بھی صوفیہ کی اصطلاحات میں سے حال اور مقام کی طرح کی ایک اصطلاح ہے جو معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں، اور تلوین سے مراد تغیر پذیر ہونا اور ایک حال سے دوسرے حال کی طرف جانا ہے اور مراد اس بزرگ کے مذکورہ کلمہ سے یہ ہے کہ متمکن متردد نہیں ہوتا اور اپنا تمام سامان بارگاہِ خداوندی میں لے جا چکا ہوتا ہے اور غیر اللہ کا خیال اپنے دل سے اس طرح نکال چکا ہوتا ہے کہ نہ تو کوئی ایسا معاملہ درپیش آئے جو اس کے ظاہر میں تبدیلی پیدا کرے اور نہ کوئی حال اُس پر ایسا طاری ہو جو اُس کے باطن کو متغیر کر دے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مقام تلوین میں تھے تو حق تعالیٰ نے طور پر ایک نظر سے تجلی ڈالی تو آپ کے ہوش جاتے رہے جیسا کہ اللہ عزوجل کہتے ہیں " وَخَرَّ مُوسٰى صَعِقًا " (اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑے) ان کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقام تمکین میں تھے اس لئے مکہ مکرمہ سے "قاب قوسین" تک عین تجلی الٰہی کے درمیان سفر کیا لیکن آپ کے حال پر کوئی تغیر واقع نہ ہوا۔ اور یہ درجہ سب درجات سے اعلیٰ ہے ۔ واللہ اعلم

پس تمکین دو طرح کی ہوتی ہے ایک یہ کہ اُس کی نسبت حق تعالیٰ کے شاہد کے ساتھ ہو اور دوسری یہ کہ اس کی اضافت اپنے ہی شاہد کی طرف ہو جس شخص کے لئے تمکین کی نسبت اُس کے اپنے وجود کی طرف ہو وہ باقی الصفۃ ہوتا ہے اور جو شخص شاہدِ حق سے متعلق ہو وہ فانی الصفت ہوتا ہے اور فانی الصفت کے لئے مستی و ہوشیاری ۔ اتصال و انفصال، فنا و بقا اور وجود و عدم درست نہیں ہوتے کیوں کہ ان اوصاف کے قائم ہوئے

کے لئے ایک موصوف ضروری ہے اور جب موصوف ہی حق تعالےٰ کے مشاہدہ میں مستغرق ہو چکا ہے تو اقامت اور صفا اور صفت کا حکم بھی اس سے ساقط ہے ——— اور اس معاملے میں کلام تو بہت ہے لیکن میں اسی پر اختصار کرتا ہوں۔ وباللہ التوفیق۔

محاضرہ اور مکاشفہ

اور انہی اصطلاحات میں سے محاضرہ اور مکاشفہ بھی ہے اور فرق ان دونوں میں یہ ہے کہ محاضرہ لطائف کے بیان میں دل کے حاضر ہونے پر واقع ہوتا ہے اور مکاشفہ حق تعالےٰ کے مشاہدہ میں باطن کے حاضر ہونے پر بولا جاتا ہے، پس محاضرہ حق تعالیٰ کی نشانیوں کے مشاہدہ میں ہوتا ہے اور مکاشفہ مشاہداتِ الٰہیہ کے دیکھنے میں ہوتا ہے اور آیاتِ الٰہی کی رویت میں ہمیشہ متفکر رہنا محاضرہ کی علامت ہے جب کہ مکاشفہ کی علامت حق تعالیٰ کی عظمت کی حقیقت میں ہمیشہ متحیر رہنا ہے پھر جو آدمی افعالِ خداوندی میں متفکر رہتا ہے اور جو آدمی جلال الوھیت میں متحیر رہتا ہے ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ایک جو متفکر ہے وہ تو مقامِ خلّت کا ردیف ہے اور جو متحیر ہے وہ محبت کا ہم نشین ہے۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جب حضرت ابراہیم خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آسمانوں کے ملکوتی نظام میں نگاہ کی اور اُس کے وجود کی حقیقت میں تأمل اور تفکر کیا تو آپ کا دل اس کے ساتھ حاضر ہوا اور فضلِ خداوندی کو دیکھنے سے فاعلِ حقیقی کا طالب ہو گیا حتیٰ کہ دل کے اس حضور نے فعل کو ہی فاعل کے لئے دلیل دیا یہاں تک کہ آپ نے کمالِ معرفت میں فرمایا۔ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا ۔" (میں نے اپنے چہرے کو اُس ذات کی طرف متوجہ کر لیا جس نے آسمانوں اور زمینوں کو صحیح پیدا کیا) اور اللہ تعالےٰ جب اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو عالمِ ملکوت میں لے گئے تو انہوں نے تمام چیزوں کو دیکھنے سے اپنی آنکھیں بند کر لیں چنانچہ آپ نے نہ کسی فعل کو دیکھا نہ مخلوق کو دیکھا اور نہ ہی اپنے آپ کو دیکھا اس طرح آپ فاعلِ حقیقی کا مشاہدہ کرنے والے ہو گئے پس حق تعالےٰ کے کشف میں آپ کا شوق بڑھتا ہی چلا گیا۔

اور ایک بے قراری پر دوسری بیقراری کا اضافہ ہوتا چلا گیا حتیٰ کہ آپ نے دیدارِ الٰہی کی خواہش کی۔ دیدار اور رویت حاصل نہ ہوئی تو آپ نے قرب کا ارادہ کیا۔ جب قرب بھی ممکن نہ ہوا تو وصل کا قصد کیا اور جب وصل کی بھی صورت پیدا نہ ہوئی تو ہر چند کہ دل پر دوستِ حقیقی یعنی حق تعالیٰ کی پاکیزگی زیادہ ظاہر ہوتی جا رہی تھی لیکن شوق پر شوق بڑھ رہا تھا نہ تو روگردانی کی کوئی صورت تھی اور نہ آگے بڑھنے کا امکان۔ آپ متحیر ہو گئے۔ جس جگہ مقامِ خلت تھا وہاں حیرانی کفر نظر آئی اور جہاں مقامِ محبت تھا وہاں وصل شرک بن گیا اور حیرانی سرمایہ بن گئی۔ اس لئے کہ وہاں مقامِ خُلت میں حیرانی وجودِ باری تعالیٰ میں تھی اور یہ شرک ہے اور مقامِ محبت میں حیرانی حق تعالیٰ کی کیفیت میں تھی اور یہ عین توحید ہے۔ اور اسی معنی میں حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کہا کرتے تھے کہ "یا دلیل المتحیرین زدنی تحیراً" (اے حیرانی میں مبتلا لوگوں کے رہنما میری حیرانی میں اضافہ کر) کیوں کہ مشاہدہ میں حیرانی کی زیادتی درجہ میں زیادتی اور اضافہ کا موجب ہوتی ہے ——— اور حکایات میں مشہور ہے کہ حضرت ابوسعید خراز رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابراہیم سعد علوی رحمۃ اللہ کے ہمراہ دریا کے کنارے حق تعالےٰ کے اُس دوست کی زیارت کی تو اُس سے دریافت کیا کہ "حق تعالیٰ کی طرف کونسا راستہ جاتا ہے؟" اُس نے جواب دیا "حق تعالےٰ کی طرف جانے کے راستے دو ہیں، ایک عوام کا راستہ، اور دوسرا خواص کا راستہ!" انہوں نے عرض کیا "اس کی تشریح فرمائیے!" تو اُس نے کہا "عوام کا راستہ تو یہ ہے کہ تو اس بات پر ہو کہ کسی علّت کی وجہ سے تو اُسے قبول کرے اور کسی دوسری علّت کی وجہ سے اُسے رَد کر دے اور خواص وہ ہیں کہ نہ تو وہ معلّل کو دیکھتے ہیں اور نہ ہی علّت کو ——— ان حکایات کی حقیقت تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے میری مراد اُس کے سوا کچھ نہیں۔ وباللہ التوفیق

قبض و بسط

ان اصطلاحات میں سے قبَض اور بسَط بھی ہیں۔ جان لو کہ قبض اور بسط اُن احوال میں سے دو حالتیں ہیں جن سے بندے کی تکلیف اور اختیار ساقط ہوتا ہے چنانچہ نہ اُن کا

آنا اختیاری ہوتا ہے اور نہ اُن کا جانا انسانی کوشش کا نتیجہ! اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔
وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَ يَبْسُطُ (اور اللہ ہی قبض کرتا اور کھولتا ہے) پس حق تعالیٰ سے حجاب کی
صورت میں دل کے بند ہو جانے کا نام قبض ہے اور بسط عبارت ہے حالتِ کشف و
مشاہدہ میں دل کی کشادگی سے۔ اور یہ دونوں صورتیں حق تعالےٰ کی طرف سے بندے
کے عمل۔ دخل کے بغیر ہوتی ہیں، اور عارفانِ الٰہی کے حال میں قبض بالکل اسی طرح
ہوتا ہے جس طرح مریدوں کے احوال میں خوف ہوتا ہے اور بسط اہل معرفت کے احوال
میں بالکل اُسی طرح ہے جس طرح مریدوں کے احوال میں امید ہوتی ہے لیکن یہ صورت
اُن صوفیہ کے قول کے مطابق ہے جو قبض اور بسط کو مندرجہ بالا معنی پر محمول کرتے ہیں جب
کہ مشائخ کا ایک طبقہ اس بات پر ہے کہ قبض کا رتبہ بسط کے رتبہ سے کہیں زیادہ بلند ہے
اور اس کی دو وجہیں ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں قبض کا ذکر مقدم ہے اور دوسری
یہ کہ قبض میں نفس کو پگھلانا اور اُس کو مغلوب کرنا ہے جب کہ بسط میں حق تعالیٰ کی نوازش
اور مہربانی ہوتی ہے تو لامحالہ صفاتِ بشریت کو پگھلانا اور نفس کو مغلوب کرنا زیادہ افضل
ہے اُس کی پرورش اور اُس پر مہربانیوں سے۔ اس لئے کہ وہ بہت بڑا حجاب ہے۔
اور ایک دوسرا گروہ اس طرف گیا ہے کہ بسط کا مرتبہ قبض کے مرتبے سے زیادہ بلند ہے
کیوں کہ قرآن مجید میں قبض کے ذکر کو مقدم کرنا اس بات کی علامت ہے کہ بسط فضیلت
کے اعتبار سے مقدم ہے کیوں کہ عربوں کا عرفِ عام اور عادت یہ ہے کہ جو چیز فضیلت
کے اعتبار سے مؤخر ہو اُس کو ذکر میں مقدم کرتے ہیں جیسا کہ حق عزوجل نے فرمایا ہے
فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ
(پس لوگوں میں سے بعض اپنے آپ پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض درمیانہ رو ہیں اور
بعض اللہ کے اذن سے نیکیوں میں سبقت لے جانے والے ہیں) اور نیز فرمایا"
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ (بے شک اللہ تعالےٰ توبہ کرنے
والوں اور پاک وصاف رہنے والوں کے ساتھ محبت کرتا ہے) اور نیز فرمایا" يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ
لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ" (اے مریم اپنے پروردگار کی فرمانبردار ہو جا

اور سجدہ کر اور رکوع کر رکوع کرنے والوں کے ساتھ) ——— نیز وہ حضرات کہتے ہیں کہ بسط میں سرور ہوتا اور قبض میں ہلاکت ہوتی ہے اور عارفوں کی خوشی تو معرفت کے حاصل ہونے کے سوا کسی حالت میں نہیں ہوتی اور اُن کی ہلاکت مقصود و مطلوب سے جدائی کے علاوہ کسی اور صورت میں نہیں ہوتی۔ پس محلِ وصل میں قرار حاصل کرنا محلِ فراق میں ٹھہرنے سے بہتر ہے ——— اور میرے شیخؒ فرماتے تھے کہ قبض اور بسط دونوں ایک ہی معنی میں ہیں جو حق تعالےٰ کی طرف سے بندہ کو حاصل ہوتے ہیں کہ جب وہ معنی دل پر ظاہر ہوتے ہیں تو یا تو باطن اُن سے مسرور ہوتا ہے اور نفس مغلوب اور یا پھر نفس مسرور ہوتا ہے۔ کسی انسان کے لئے تو دل کے قبض ہونے میں نفس کی کشادگی ہوتی ہے اور کسی کے لئے دل کے کشادہ ہونے میں اُس کے نفس کا قبض ہوتا ہے جو شخص اِن معنی کے علاوہ اس کی کوئی تعبیر کرتا ہے وہ اپنا وقت ضائع کرتا ہے ——— اور یہی وجہ ہے کہ حضرت بایزیدؒ کہتے ہیں کہ "قبض القلوب فی بسطِ النفوس وَبسط القلوب فِی قبض النفوس"۔ دلوں کا قبض ہونا نفسوں کی کشادگی میں ہے اور دلوں کی کشادگی نفسوں کے قبض ہونے میں ہے) پس قبض ہونے والا نفس ہر قسم کے خلل سے محفوظ ہوتا ہے اور مبسوط دل، ذلت اور خطاء سے محفوظ ہوتا ہے اس لئے کہ محبت میں غیرت قابلِ مذمت چیز ہے اور قبض حق تعالیٰ کی غیرت کی علامت ہے اور محبوب کا محب کے ساتھ عتاب کرنا دوستی کی شرط ہے اور بسط اسی عتاب کرنے کی علامت ہے ——— اور آثار میں مشہور ہے کہ حضرت یحییٰؑ جب تک زندہ رہے روتے ہی رہے اور حضرت عیسیٰؑ جب تک دنیا میں رہے ہنستے ہی رہے اس لئے کہ حضرت یحییٰؑ حالتِ قبض میں تھے اور حضرت عیسیٰؑ حالتِ بسط میں۔ جب ان دونوں کی آپس میں ملاقات ہوتی تو حضرت یحییٰؑ کہتے "اے عیسیٰؑ! آپ جدائی سے بے خوف ہو گئے ہیں"؟ تو حضرت عیسیٰؑ جواب میں کہتے "اے یحییٰؑ! کیا آپ حق تعالیٰ کی رحمت سے نااُمید ہو چکے ہیں؟ پس نہ تو تمہارا رونا حق تعالےٰ کے حکمِ ازلی کو پھیر سکتا ہے اور نہ ہی میرا ہنسنا فیصلہ شدہ معاملات کو لوٹا سکتا ہے" لَاقبض وَلَابَسطَ وَلَا حَمسَ وَلَاانسَ وَلَامَحوُ وَلَاصَحوُ وَلَا لحق

وَلَا عَجْزَ وَلَا جَهْلَ اِلَّا مِنَ اللّٰہِ تعالیٰ" (بندے کا قبض اور بسط، مٹنا اور محبت کرنا، مدہوش ہونا اور ہوشمند ہونا۔ وصال حاصل کرنا اور عاجز رہنا ـــــ اور جاھل ہونا نہیں ہے مگر صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے) ان میں سے کچھ بھی نہیں ہوتا مگر وہی جو اللہ کی طرف سے مقرر کیا جا چکا ہے۔

انس و ہیبت

جان لو اللہ تعالیٰ تمہیں سعادت مند بنائے کہ انس اور ہیبت بھی صوفیہ کی اصطلاحوں میں سے ہیں۔ اور ہیبت اور اُنس راہِ حق میں چلنے والوں کے احوال میں سے دو حالتیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب اللہ تعالےٰ بندے کے دل پر جلالی شہود کے ساتھ تجلی کرتے ہیں تو اُسے اس حالت میں ہیبت نصیب ہوتی ہے اور جب بندے کے دل پر اپنے جمالی شہود کے ساتھ تجلی کرتے ہیں تو اُسے اُنس حاصل ہوتا ہے حتیٰ کہ اہل ہیبت جلالِ خداوندی سے مشقت میں ہوتے ہیں اور اہل اُنس جمالِ الٰہی سے خوشی اور مسرت میں ہوتے ہیں۔ پس اُس دل میں جو جلالِ خداوندی سے محبت کی آگ میں جل رہا ہو اور اُس دل میں جو جمالِ الٰہی سے مشاہدہ کے نور میں روشن ہو چکا ہو بڑا ہی فرق ہے ـــ پس مشائخ کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ ہیبت عارفانِ الٰہی کا درجہ ہے جب کہ اُنس مریدانِ حق کا۔ کیوں کہ جس شخص کو بھی بارگاہِ الٰہی میں اور حق تعالےٰ کے اوصاف کی پاکی بیان کرنے میں جتنا زیادہ وصول حاصل ہوگا اُس کے دل پر ہیبت کا غلبہ بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا اور اُنس سے اُس کی طبیعت اتنی ہی نفرت کرنے والی ہوگی اس لئے کہ اُنس تو ہم جنس دل سے ہوتا ہے اور جب حق تعالےٰ کے ساتھ ہم جنس اور ہم شکل ہونا بندے کے لئے محال ہے تو حق تعالےٰ کے ساتھ اُنس کی صورت بھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ پھر حق تعالےٰ کی طرف سے بھی مخلوق کے ساتھ اُنس محال ہوگا۔ اور اگر اُنس ہوا بھی تو وہ اس کے ذکر کے ساتھ ہی ممکن ہو سکتا ہے اور یہ بات بڑی واضح ہے کہ ذکرِ حق۔ ذاتِ حق کا غیر ہے کیوں کہ یہ بندے کی صفات میں سے ہے اور محبت میں ذاتِ محبوب کے غیر کے ساتھ آرام گیر

ہونا جھوٹ محض دعویٰ اور غرور باطل ہے۔ اور پھر ہیبت حق تعالیٰ کی عظمت کے مشاہدہ سے ہوتی ہے اور عظمت حق تعالیٰ کی صفت ہے ـــــ اور اُس بندے میں جس کا کام اپنی طرف سے اور اپنے ہی ساتھ ہو۔ اور اُس بندے میں جس کا کام حق تعالیٰ کی بقا کے ساتھ اپنی فنا سے ہو۔ بڑا ہی واضح فرق ہے ـــــ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے حکایت بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا "میں اتنا عرصہ یہی سمجھتا رہا ہوں کہ کہ میں حق تعالےٰ کی محبت میں خوشی حاصل کر رہا ہوں اور اس کے مشاہدہ سے اُنس حاصل کئے ہوئے ہوں لیکن اب مجھے علم ہوا کہ اُنس تو ہم جنس کے علاوہ کسی سے ہو ہی نہیں سکتا ـــــ پھر ایک اور گروہ کا کہنا ہے کہ" ہیبت، فراق اور سزا کا قرینہ ہے جب کہ اُنس، وصل اور رحمت کا نتیجہ ہوتا ہے تو دوستوں کو ہیبت جیسی حالتوں سے محفوظ ہی رہنا اور اُنس کے ساتھ ہم نشین رہنا چاہیے کیوں کہ لا محالہ اُنس۔ محبت کا تقاضہ کرتا ہے اور جس طرح محبت کے لئے ہم جنس ہونا محال ہے اسی طرح اُنس کے لئے بھی محال ہی ہے ـــــ

میرے شیخ رحمۃ اللہ کہتے تھے کہ مجھے اُس شخص پر تعجب ہوتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ حق تعالےٰ کے ساتھ اُنس ممکن نہیں ہوتا۔ باوجودیکہ حق تعالےٰ نے فرمایا ہے" اِنَّ عبادی" (بے شک میرے بندے) قُلْ لِّعِبَادِیَ (میرے بندوں سے کہہ دیجئے!) وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ" (اور جب آپ سے میرے بندے سوال کرتے ہیں) "یَا عِبَادِیْ لَا خَوْفٌ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ" (اے میرے بندو! آج کے دن تم پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ تم غمگین ہو گے) لا محالہ جب بندہ اپنے اوپر حق تعالےٰ کی اتنی مہربانیوں کو دیکھتا ہے تو اُس سے محبت کر لیتا ہے اور جب اُس کو دوست بنا لیتا ہے تو اُس سے اُنس کر لیتا ہے اور اس لئے بھی کہ دوست سے ہیبت محسوس کرنا بیگانگی کی دلیل ہے اور اُنس یگانگی و اپنائیت کی علامت! اور انسان کی صفت یہ ہے کہ وہ اپنے اوپر انعام کرنے والے کے ساتھ اُنس کرتا ہے اور جب حق تعالیٰ کی طرف سے ہمیں اس قدر نعمتیں اور ہمیں اُس کی معرفت حاصل ہے تو محال ہے

کہ ہم اُس سے ہیبت کی بات کریں ——— اور میں علی بن عثمان ہجویری کہتا ہوں کہ اس اختلاف کے باوجود یہ دونوں گروہ راستی اور صحت پر ہیں کیوں کہ ہیبت کا غلبہ نفس اور اس کی خواہشات اور اس سے اوصافِ بشریت کو فنا کرنے کے ساتھ ہوتا ہے جب کہ اُنس کا غلبہ دل کے ساتھ اور دل میں معرفت کی پرورش کے ساتھ ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ اپنے جلال کی تجلی سے دوستوں کے نفس کو فنا کرتے ہیں اور اپنے جمال کی تجلی سے اُن کے دل اور باطن کو باقی کر دیتے ہیں۔ پس جو لوگ اہل فنا میں سے ہیں وہ ہیبت کو مقدم سمجھتے ہیں اور جو حضرات اہل بقاء ہیں وہ اُنس کو فضیلت دیتے ہیں۔ اس کی شرح اس سے قبل فنا اور بقا کے باب میں بھی گزر چکی ہے۔

قہر و لطف

انہی اصطلاحات میں سے قہر اور لطف بھی ہیں اور فرق اِن دونوں میں یہ ہے کہ یہ دونوں اصطلاحیں وہ ہیں کہ جن سے یہ لوگ اپنے احوال کی تعبیر کیا کرتے ہیں اور اُن کے نزدیک قہر سے مراد تمام خواہشات کو فنا کرنے اور نفس کو اپنی تمام آرزوؤں سے باز رکھنے میں ہیں حق تعالےٰ کی تائید ہے۔ کیوں کہ ان کی مراد اسی چیز میں ہے۔ اور لطف سے اُن کی مراد باطن کی بقاء مشاہدے کے دوام اور درجۂ استقامت میں حال کے قرار میں حق تعالیٰ کی تائید ہے۔ حتیٰ کہ صوفیہ کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے مراد کا حاصل ہو جانا کرامت ہے۔ اور یہ اہل لطف حضرات تھے جب کہ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ کرامت یہ ہے کہ حق تعالےٰ بندے کو اپنی مراد اور مرضی کے ساتھ اُس کی اپنی مراد سے روک دے اور بندے کو اُس کی نامرادی میں مقہور و مغلوب کر دے۔ چنانچہ اگر وہ تشنگی کی حالت میں دریا پر جائے تو وہ بھی خشک ہو جائے ——— کہتے ہیں کہ بغداد میں بڑے رتبے کے فقراء میں سے دو درویش تھے ایک ان میں سے صاحب قہر تھا اور دوسرا صاحب لطف۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہمیشہ جھگڑتے ہی رہتے تھے اور ہر ایک اپنے حال کو دوسرے کے حال پر ترجیح دیتا تھا۔ ایک اُن میں سے کہتا کہ بندے پر

حق تعالےٰ کا لطف تمام چیزوں سے اشرف ہے اس لئے کہ اللہ تعالےٰ نے خود فرمایا ہے۔ اَللّٰہُ لَطِیْفٌ بِعِبَادِہٖ ۔" (اللہ اپنے بندوں پر بڑا لطف کرنے والا ہے) اور دوسرا کہا کرتا تھا کہ بندے پر حق تعالےٰ کا قہر تمام چیزوں سے زیادہ کامل ہے اس لئے کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے" وَھُوَ الْقَاھِرُ فَوْقَ عِبَادِہٖ ۔" (اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے) اُن کے درمیان یہ بحث طویل ہو گئی یہاں تک کہ اس صاحب لطف درویش نے مکہ مکرمہ جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن مکّہ مکرّمہ نہ پہنچا بلکہ ایک جنگل میں بیٹھ کر ریاضت میں مشغول ہو گیا کئی سال تک کسی کو اُس کی کوئی خبر نہ ہوئی حتیٰ کہ ایک دفعہ ایک شخص مکّہ مکرّمہ سے واپسی پر یہاں سے گزرا تو اُس درویش کو سرِ راہ دیکھا اس درویش نے کہا" اے بھائی! جب تم عراق پہنچو! تو بغداد کے محلہ کرخ میں میرے اُس دوست سے کہنا کہ" اگر تم جنگل کو اس کی مشقتوں کے باوجود کرخِ بغداد کی طرح اُس کے عجائب کے ساتھ دیکھنا چاہتے ہو تو یہاں آجاؤ! کہ یہ جنگل بھی میرے لئے کرخ بغداد کی طرح ہی ہے"۔ ـــــ اُس درویش نے جب کرخِ بغداد میں پہنچ کر اُس درویش کے اُس دوست کو تلاش کر کے اُس کا پیغام دیا تو اس رفیق نے کہا" جب تم واپس جاؤ تو اُسے کہہ دینا کہ" اس چیز میں کوئی شرف اور عزت نہیں کہ حق تعالےٰ نے تمہارے لئے پُر مشقت جنگل کو کرخِ بغداد کی طرح کر دیا ہے تاکہ تم (جنگل کی تکلیفوں سے تنگ آکر) درگاہِ خداوندی سے بھاگ ہی نہ جاؤ! بلکہ شرف تو اس میں ہے کہ حق تعالےٰ نے کرخِ بغداد کو ہی اپنی تمام تر نعمتوں اور عجائب کے باوجود ہمارے لئے پُر مشقت جنگل کی طرح کر دیا ہے اور ہم اسی میں خوش و خرم ہیں"۔ ـــــ اور حضرت شبلیؒ کے بارے میں آتا ہے کہ" آپ اپنی مناجات میں کہا کرتے تھے" بارِ خدایا! اگر آپ آسمان کو میری گردن کا طوق، زمین کو میرے پاؤں کی زنجیر اور تمام جہان کو میرے خون کا پیاسا بنا دیں تب بھی میں آپ سے منہ نہ موڑوں گا"۔ ـــــ اور میرے شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا تھا کہ ایک سال اولیاء اللہ کا اجتماع ایک جنگل میں ہوا تھا اور میرے شیخ حضرت حصری رحمۃ اللہ مجھے اپنے ہمراہ لے گئے تھے میں نے اولیاء کے ایک گروہ کو دیکھا کہ اُن میں سے ہر بزرگ۔ ایک تخت پر آ رہا تھا اور کسی گروہ کو تخت پر بٹھا کر لایا جا رہا تھا اور کوئی گروہ اُڑتا ہوا

چلا آرہا تھا ان میں سے جو کوئی بھی آتا حضرت حضریؒ اُن کی طرف قطعاً کوئی التفات نہ فرماتے یہاں تک کہ میں نے ایک جوان کو دیکھا جس کی جوتیاں پھٹی ہوئی اور لاٹھی ٹوٹی ہوئی تھی پاؤں بیکار ہو چکے تھے سر برہنہ تھا۔ اعضاء جلے ہوئے اور جسم نحیف و کمزور ہو چکا تھا۔ وہ جب سامنے نمودار ہوا تو حضرت حضریؒ بڑی تیزی سے اُٹھے اور اُس کا استقبال کیا اور اُس کو بلند مقام پر لا کر بٹھایا۔" میرے شیخ کہتے ہیں کہ" میں بڑا حیران ہوا اور اس اجتماع کے ختم ہو جانے کے بعد اپنے شیخ سے دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ "وہ اللہ تعالٰے کے اولیاء میں سے ایسا ولی تھا جو ولایت کے تابع نہ تھا بلکہ ولایت اس کے تابع ہے اور وہ کرامات کی طرف بالکل کوئی توجہ نہیں دیتا"——

بہر حال جو کچھ ہم اپنے لئے خود اختیار کرتے ہیں وہ ہمارے لئے مصیبت ہوتا ہے۔ اور میں صرف اُسی چیز کی خواہش کرتا ہوں جو اللہ تعالٰے میرے لئے چاہتے ہیں۔ تا کہ حق تعالٰی خود ہی اس چیز میں میری حفاظت کریں اور میرے نفس کے شر سے مجھے بچائے رکھیں، اگر اللہ تعالٰے مجھے اپنے قہر میں رکھیں تو میں لطف کی تمنا نہ کروں گا اور اگر اپنے لطف میں رکھیں تو میں قہر کا ہرگز ارادہ نہ کروں گا کیوں کہ ہمیں حق تعالٰے کے اختیار پر کوئی اختیار حاصل نہیں۔

نفی و اثبات

ان اصطلاحات میں سے نفی اور اثبات بھی ہیں اور ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ مشائخ طریقت رحمہم اللہ تائیدِ الٰہی کے اثبات اور صفاتِ بشریت کے محو ہو جانے کو نفی و اثبات کہتے ہیں، یعنی نفی سے صفاتِ بشریت کی نفی مراد لیتے ہیں اور اثبات سے حق تعالٰے کے اوصافِ حقیقی اور اُن کے غلبے کا اثبات مراد لیتے ہیں کیوں کہ کل کا مٹ جانا محو کہلاتا ہے اور کل کی نفی صفات پر ہی بولی جاتی ہے کیوں کہ صفاتِ بشریت کے موجود ہوتے ہوئے ذات پر نفی متصور نہیں ہوتی۔ پس بُری صفات کی نفی اور قابلِ تعریف صفات کا اثبات ہونا چاہیئے، یعنی حق تعالٰی کی محبت میں معنی کو ثابت کرتے ہوئے

دعویٰ کی نفی کی جائے کیوں کہ دعویٰ نفس کی رعونتوں میں سے ہے۔ اور صوفیا کی عادت کے مطابق جب اُن کی بشری صفات حق تعالیٰ کی صحبت کے غلبہ سے مغلوب ہو جاتی ہیں تو وہ یوں کہا کرتے ہیں کہ "بقائے حق کے اثبات سے صفاتِ بشریت کی نفی ہو گئی"۔ اس بارے میں اس سے قبل باب فقر و صفوت اور بابِ فنا و بقاء میں گفتگو ہو چکی ہے لہٰذا اب اسی پر اختصار کرتا ہوں ——— نیز صوفیہ کہتے ہیں کہ "اس سے حق تعالیٰ کے اختیار کو ثابت کرنے اندر بندہ کے اختیار کو نفی کرنا مراد ہے اسی لئے تو اُس باتوفیق بزرگ نے کہا تھا" اختیار الحق بعبدہٖ مع علمہٖ بعبدہٖ خیرٌ من اختیار عبدہٖ لنفسہٖ مع جھلہٖ بربہٖ" (حق تعالےٰ کا اپنے بندے کو جانتے ہوئے اس کے لئے کسی چیز کو اختیار کرنا بہتر ہے اس بات سے کہ بندہ اپنے رب کی مرضی سے جاھل ہوتے ہوئے اپنے لئے کسی چیز کو اختیار کرے) کیوں کہ محبت نام ہے محبوب کے اختیار پر اپنے اختیار کو نفی کر دینے کا۔ اور یہ بات تو سب کے نزدیک قابلِ تسلیم ہے ——— میں نے حکایات میں پڑھا ہے کہ ایک درویش دریا میں ڈوب رہا تھا کہ کسی شخص نے کہا "بھائی کیا تم غرق ہونے سے بچنا چاہتے ہو؟ درویش نے جواب دیا "نہیں"! اُس نے پوچھا "تو کیا تم غرق ہو جانا چاہتے ہو؟" اُس نے جواب دیا "نہیں"! وہ شخص کہنے لگا "عجیب بات ہے کہ نہ ہلاکت کو اختیار کرتے ہو اور نہ نجات کو"! درویش نے کہا "مجھے نجات کو اختیار کرنے سے کیا سروکار ہے کہ میرا اختیار تو وہی ہے جو حق تعالےٰ میرے لئے اختیار کرے" ——— مشائخ نے کہا ہے کہ محبت میں کمترین درجہ یہ ہے کہ اپنے اختیار کو نفی کر دیا جائے" پس حق تعالیٰ کا اختیار تو ازلی ہے اُس کی نفی ممکن نہیں ہو سکتی جب کہ بندے کا اختیار عارضی ہے کہ اُس کی نفی ہو سکتی ہے، اس لئے اپنے عارضی اختیار کو پاؤں تلے کچل ڈالنا چاہیئے تاکہ ازلی اختیار بقا حاصل کرے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر حالتِ انبساط میں تھے کہ حق تعالیٰ سے دیدار کی تمنی کرتے ہوئے اپنے اختیار کو ثابت کرنے کی کوشش کی اور کہا "ربِّ ارنی" "اے میرے رب مجھے اپنا آپ دکھا) حق تعالےٰ نے کہا "لن ترانی"

اتم مجھے ہر گز نہیں دیکھ سکتے) حضرت موسیٰؑ نے عرض کی۔ "بار خدایا! تیرا دیدار حق ہے اور میں اس کا مستحق ہوں پھر رد کا کیوں جا رہا ہے؟" فرمان آیا کہ "ہاں دیدار تو حق ہے لیکن محبت میں اپنا اختیار باطل ہے" ——— اور اس بارے میں کلام تو بہت ہے لیکن اس سے زیادہ بیان کرنا میرا مقصد نہیں تھا تاکہ تمہیں علم ہو جائے کہ صوفیہ کے ہاں نفی اور اثبات سے مراد کیا ہے ——— وباللہ التوفیق"۔ ——— اس بارے میں جمع و تفرقہ، فنا و بقا اور غیبت و حضور کا پورا ذکر صوفیہ کے مذاہب کے بیان میں وہاں گزر چکا ہے جہاں میں نے صحو و سکر کا ذکر اور اس بارے میں اشکال وغیرہ بیان کئے تھے تفصیل کے لئے اُسی طرف رجوع کرنا چاہئے کیوں کہ ان سب کا بیان وہاں موجود ہے۔ تاہم ضروری مقدار میں نے یہاں بھی بیان کر دی ہے تاکہ ہر بزرگ کا مذہب شرح کے ساتھ بیان ہو جائے ——— واللہ اعلم۔

مسامرہ و محادثہ

انہی اصطلاحات میں سے مسامرہ و محادثہ بھی ہیں اور فرق ان دونوں میں یہ ہے کہ یہ دونوں اصطلاحیں طریقِ حق کے کاملوں کے احوال میں سے دو حالتوں سے عبارت ہیں۔ محادثہ کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک باطنی راز ہے جسے بیان کرنے سے زبان قاصر ہے اور مسامرہ کی حقیقت یہ ہے کہ وہ باطنی راز کو چھپانے کی خوشی کا نام ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ سامرہ بندے کو حق تعالےٰ کے ساتھ رات کو اور محادثہ دن کو حاصل ہونے والے ایک وقت کا نام ہے کہ اس وقت میں بندے کو حق تعالےٰ کے ساتھ ظاہری اور باطنی سوال و جواب کرنے کی سعادت نصیب ہوتی ہے، اسی لئے رات کی مناجات کو مسامرہ اور دن کی دعاؤں کو محادثہ کہتے ہیں۔ پس دن کی حالت تو ظاہر اور کشف پر مبنی ہوتی ہے اور رات کی کیفیت پوشیدہ ہوتی ہے اور محبتِ حق میں مسامرہ کی کیفیت محادثہ سے زیادہ کامل ہوتی ہے۔ اور مسامرہ کا تعلق تو ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حال سے تھا کہ جب حق تعالےٰ نے چاہا کہ آپ کو

رازو نیاز کا وقت حاصل ہو تو جبرئیل علیہ السلام کو براق دے کر آپ کی خدمت میں بھیجا تاکہ آپ کو رات کے وقت مکہ معظمہ سے "قاب قوسین" تک پہنچا دیں اس طرح آپ حق تعالٰی سے اپنا راز کہیں اور حق تعالٰے سے کلام سُنیں۔ چنانچہ جب آپ آخری منزل تک پہنچ گئے تو آپ کی زبان مبارک جلالِ خداوندی کے مشاہدے کی وجہ سے خاموش ہوگئی اور آپ کا دل عظمتِ الٰہی کی حقیقت میں حیران ہوگیا اور آپ کا علم ذاتِ حق تعالٰے کے ادراک سے عاجز آگیا اور آپ کی زبان اس کیفیت کو بیان کرنے سے درماندہ ہوگئی تو آپ نے اعترافاً کہا۔ لَا اُحْصِی ثَنَاءً عَلَیْكَ۔" (میں تیری حمدوثنا کو بیان نہیں کرسکتا) ـــــ جب کہ محادثہ کا تعلق حضرت موسٰی علیہ السلام کے حال سے تھا کہ جب انہوں نے خواہش کی کہ حق تعالٰے کے ساتھ انہیں سوال وجواب کا وقت حاصل ہو تو آپ چالیس روز کے وعدہ اور انتظار کے بعد دن کے وقت کوہِ طور پر حاضر ہوئے اور کلامِ الٰہی کو سنا حتٰی کہ خوش ہوگئے۔ پھر دیدار کا سوال کیا لیکن اس مراد سے عاجز رہے اور ہوش آپ کے جاتے رہے۔ پھر جب ہوش میں آئے تو کہا تُبْتُ اِلَیْكَ" (میں اپنے خیال سے تیری بارگاہ میں رجوع کرتا ہوں) یہ سب کچھ اس لئے ہوا تاکہ اُس ذات میں جسے لایا گیا تھا جیساکہ فرمایا۔ "سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلاً۔" (پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو رات کے وقت) اور اُس شخصیت میں جو خود اپنی خواہش سے آئے تھے جیساکہ فرمایا" وَلَمَّا جَاءَ مُوسٰی لِمِیقَاتِنَا۔" (اور جب موسٰی (علیہ السلام) ہمارے مقام وعدہ پر آئے) فرق ظاہر ہوجائے ـــــ

پس رات دوستوں کی خلوت کا وقت ہے جبکہ دن بندگانِ خدا کی خدمت کا وقت ہے۔ اور یہ ضروری امر ہے کہ جب بندہ مقررہ حد سے تجاوز کرجائے تو اسے ڈانٹ پلاتے ہیں لیکن دوست کے لئے کوئی حد ہی نہیں ہوتی کہ وہاں سے تجاوز کرنے پر وہ مستحق ملامت قرار پائے کیوں کہ دوست، جو کچھ بھی کرتا ہے وہ دوست کے لئے پسندیدہ ہی ہوتا ہے۔

علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین

ان اصطلاحات میں سے علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین بھی ہیں اور فرق ان میں یہ ہے کہ "جان لو کہ اصولی طور پر ان تمام اصطلاحات سے مراد یہ ہے کہ بندے کو اپنے معلوم کا علم حاصل ہو۔ اور اپنے معلوم کے بیان کی صحت پر یقین کے بغیر اُسے جاننا علم نہیں ہوتا۔ اور جب علم حاصل ہو جاتا ہے تو پوشیدہ چیز بھی اس کی وجہ سے ظاہر کی طرح ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ کل قیامت کے دن مومن لوگ جب حق تعالیٰ کی زیارت کریں گے تو اسی شکل و صورت میں دیکھیں گے جس میں آج اُس کو اپنے ذہن میں جانتے ہیں۔ اگر اس کے برخلاف دیکھیں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یا تو قیامت کے دن انہیں دیدار ہی صحیح حاصل نہیں ہوا یا پھر آج دنیا میں حق تعالےٰ کا صحیح علم انہیں حاصل نہیں ہوا۔ اور یہ دونوں صورتیں توحید کے خلاف ہیں۔ اس لئے کہ آج دنیا میں مخلوق کا علم حق تعالےٰ کے بارے میں درست ہے اور کل قیامت میں ان کا دیدار کرنا صحیح ہوگا۔ پس مومن لوگوں کا توحید الٰہی کے بارے میں علم الیقین، عین الیقین کی طرح ہوگا اور حق الیقین، علم الیقین کی طرح!

اور جو صوفیہ حق تعالیٰ کی رویت میں حق تعالیٰ کا پورا پورا علم حاصل ہونے کو عین الیقین کہتے ہیں یہ محال ہے اس لیے کہ رویت بھی سماع وغیرہ کی طرح حصولِ علم کا ایک آلہ اور سبب ہے جب پورا پورا علم سماع سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ تو رویت سے حاصل ہونا بھی محال ہے، پس اُن حضرات کی مراد اس علم الیقین سے حق تعالےٰ کے احکام اور اوامر کے ذریعہ دنیا کے معاملات کا علم ہے۔ اور عین الیقین سے مراد نزع کی کیفیت اور دنیا سے جانے کے وقت کا علم ہے اور عین الیقین سے جنت میں دیدار خداوندی کے ظاہر ہونے اور اس کے احوال کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا علم مراد ہے ـــ پس علم الیقین۔ علماء امت۔ کا مقام ہے کہ وہ ہی حق تعالےٰ کے احکام پر استقامت کے ساتھ جمے رہتے ہیں اور عین الیقین عارفانِ الٰہی کا مقام ہے کہ وہ ہر وقت موت کے لئے مستعد رہتے ہیں۔ اور حق الیقین دوستانِ الٰہی کی فنا گاہ ہے کہ وہی تمام موجودات سے اعراض کئے ہوئے ہوتے ہیں۔

عارفانِ الٰہی کا مقام ہے کہ وہ ہر وقت موت کے لئے مستعد رہتے ہیں اور حق الیقین دوستانِ الٰہی کی فنا گاہ ہے کہ وہی تمام موجودات سے اعراض کئے ہوئے ہیں۔ پس علم الیقین محنت ومجاہدہ سے حاصل ہوتا ہے اور عین الیقین محبتِ الٰہی سے حاصل ہوتا ہے اور حق الیقین مشاہدۂ حق سے حاصل ہوتا ہے اور اِن میں سے ایک (علم الیقین) عام ہے اور دوسرا (عین الیقین) خاص ہے اور تیسرا (حق الیقین) خاص الخاص ہے۔ واللہ اعلم۔

علم ومعرفت

انہی اصطلاحات میں سے علم اور معرفت بھی ہیں۔ علمائے اصول نے علم اور معرفت کے درمیان فرق نہیں کیا بلکہ اِن دونوں کو ایک ہی کہا ہے سوائے اس بات کے کہ انہوں نے کہا ہے کہ حق تعالیٰ کو عالم کہنا چاہئے لیکن عارف نہیں کہنا چاہئے کیونکہ نصِ قرآنی میں حق تعالیٰ کو کہیں بھی عارف نہیں کہا گیا۔ تاہم مشائخ طریقت اس علم کو جو عمل اور حال کے ساتھ ملا ہوا ہو اور عالم اپنے حال کو اُس سے تعبیر کرے تو اس کو معرفت کہتے ہیں اور اس کے عالم کو عارف کہتے ہیں، اور ہر اُس علم کو جو معنی سے مجرد ہو عمل سے خالی ہو اُس کو علم کہتے ہیں اور اس کے جاننے والے کو عالم کہتے ہیں، پس جو شخص کسی چیز کے معنی اور اس کی حقیقت کو جانتا ہو اُس کو عارف کہتے ہیں، اور جو شخص فقط عبارت کو اور اس کے معنی کے بغیر اس کے حفظ کو جاننے والا ہو اُس کو عالم کہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جب صوفی لوگ اپنے دوسرے ہمعصر صوفیوں کی تحقیر کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کو دانشمند کہتے ہیں عوام کو یہ بات بُری لگتی ہے حالانکہ اُن کا مقصد کسی کو عالم کہنے سے اُس کی بُرائی بیان کرنا نہیں ہوتا بلکہ اُن کی مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے علم پر عمل نہیں کرتا "اِنَّ العالِمَ قائِمٌ بنفسِہٖ وَالعارفُ قائِمٌ بربّہٖ" (اس لئے کہ عالم اپنی ذات کے ساتھ قائم ہوتا ہے اور عارف اپنے رب کے ساتھ قائم ہوتا ہے) اس بارے میں "کشفِ حجاب معرفت" میں کافی گفتگو ہو چکی ہے اور اس جگہ اتنا ہی کافی ہے۔

شریعت و حقیقت

انہی اصطلاحات میں سے شریعت اور حقیقت بھی ہیں اور صوفیہ کے ہاں یہ دونوں ایسی عبارات ہیں کہ ان میں سے ایک ظاہری حال کی درستی کو بیان کرتی ہے اور دوسری باطنی حال کی اقامت وصحت بیان کرتی ہے۔ اِن کے معنی میں دو گروہ غلطی پر ہیں ایک علمائے ظاہر کا جو کہتے ہیں کہ ہم ان دونوں میں کوئی فرق نہیں کرتے کیوں کہ شریعت بعینہٖ حقیقت ہے اور حقیقت بعینہٖ شریعت! اور دوسرا گروہ ملحدوں کا جو اِن میں سے ہر ایک کو دوسرے کے بغیر ہی درست سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب حقیقت کی حالت ظاہر ہو جائے تو شریعت اُٹھ جاتی ہے اور یہ قول مشتبہین، قرامطہ، شیعہ اور وسوسہ ڈالنے والوں کا ہے —— اور حکم میں شریعت کے حقیقت سے الگ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ تصدیق ایمان کے معاملہ میں قول سے جُدا ہے اور اصل میں تصدیق کے قول سے جُدا نہ ہونے پر دلیل یہ ہے کہ تصدیق بغیر زبانی قول کے ایمان نہیں ہوتی اسی طرح محض زبانی اقرار، تصدیق کے بغیر ایمان نہیں ہوتا۔ اور قول و تصدیق کے درمیان فرق بڑا واضح ہے —— پس حقیقت اس معنی سے عبارت ہے جس پر نسخ درست نہیں ہوتا اور حضرت آدم علیہ السلام کے عہد سے جہانوں کے فنا ہونے کے وقت تک اس کا حکم ایک طرح کا رہتا ہے مثلاً حق تعالیٰ کی معرفت اور اپنے معاملات کو خلوصِ نیت کے ساتھ درست رکھنا —— اور شریعت اس معنی سے عبارت ہے کہ جس پر نسخ اور تبدیلی روا ہو۔ جیسے کہ احکام اور اوامر خداوندی —— پس شریعت بندے کا اپنا فعل ہوگا اور حقیقت، حق تعالیٰ کی نگہبانی اور حفظ و امان کا نام ہوگا، پس حقیقت کے وجود کے بغیر شریعت کا قائم کرنا محال ہوتا ہے اور اسی طرح حقیقت کا قیام بھی شریعت کی حفاظت کے بغیر محال ہے، اس کی مثال یوں ہے کہ جیسے ایک شخص روح کی وجہ سے زندہ ہوتا ہے اور جب روح اُس سے جدا ہو جاتی ہے تو وہ مردار ہو جاتا ہے اور روح اس کے ساتھ اس طرح ہوتی ہے کہ جسم اور روح دونوں کی قدر و قیمت ایک دوسرے کے ساتھ ملے رہنے سے ہوتی ہے۔ اسی طرح شریعت، حقیقت کے بغیر ریاکاری ہوتی ہے اور

حقیقت، بغیر شریعت کے منافقت ہوتی ہے اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا" (جو لوگ ہمارے بارے میں محنت کرتے ہیں ہم اُن کو اپنے رستے کی رہنمائی کرتے ہیں) مجاہدہ شریعت ہے اور ہدایت اُس کی حقیقت ایک تو ان میں سے بندے کا اپنی ذات پر ظاہری احکام کی حفاظت کرنا ہے جب کہ دوسرا حق تعالےٰ کا بندے پر اُس کے باطنی احوال کی حفاظت کرنا ہے۔ پس شریعت بندے کے دائرہ کسب و محنت سے تعلق رکھتی ہے اور حقیقت کا تعلق عطیۂ خداوندی سے ہے۔ صوفیہ کے درمیان رائج اصطلاحات میں ایک دوسری قسم کی اصطلاحات بھی ہیں جو ان کے کلام میں استعارہ کے طور پر استعمال ہوتی ہیں اُن کی تفصیل اور شرح بہت مشکل ہے تاہم میں اس نوع کو بھی اختصار کے ساتھ بیان کر دیتا ہوں۔

اصطلاحات کی دوسری نوع

الحق:۔ حق سے صوفیائے کرام کی مراد خداوند تعالےٰ کی ذات ہوتی ہے کیوں کہ اللہ تعالےٰ کے اسمائے گرامی میں سے یہ بھی ایک نام ہے جیسا کہ حق تعالےٰ نے فرمایا ہے "ذَالِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ" (یہ بات اس لئے ہے کہ اللہ حق ہے)۔

الحقیقۃ:۔ اس لفظ سے صوفیہ کی مراد بندے کا وصلِ الٰہی کے محل میں اقامت پذیر ہونا اور اُس کے باطن کا حق تعالےٰ کے مقام تنزیہہ میں ٹھہرنا ہے۔

الخطرات ——— احکام تفرقہ میں سے جو کچھ دل پر گزرے۔

الوطنات ——— معارفِ الٰہیہ میں سے جو کچھ باطن میں جاگزیں ہو۔

الطمس ——— اپنی ذات کی اس طرح نفی کرنا کہ اس کا اثر باقی نہ رہے۔

الرمس ——— کسی چیز کی اصل کا دل سے نفی کرنا۔

العلائق ——— وہ اسباب جن کے ساتھ طالبانِ حق تعلق پیدا کریں اور اپنے مقصود سے قاصر ہو جائیں۔

الوسائط ——— وہ اسباب جن سے تعلق پیدا کر کے طالبانِ حق مراد کو پہنچتے ہیں۔

الزوائد ——— دِل میں انوار خداوندی کی کثرت۔

الفوائد ——— باطن کا اپنے لئے ضروری چیزوں کا ادراک کرلینا۔

الملجاء ——— دل کا اپنی مراد کو حاصل کرلینے کا اعتماد!

المنجاء ——— دل کا محل آفت سے خلاصی پانا۔

الکلیہ ——— اوصافِ بشریت کو مکمل طور پر پالینا۔

اللوائح ——— اوصافِ بشریت کی نفی سے مراد کا ثابت کرنا۔

اللوامع ——— دِل پر نور کا اپنے فوائد کو باقی رکھتے ہوئے ظاہر ہونا۔

الطوالع ——— دِل پر معارفِ الٰہیہ کے انوار کا طلوع ہونا۔

الطوارق ——— رات کی مناجات میں دل پر بشارت یا زجر کے ساتھ کیفیت کا وارد ہونا۔

اللطائف ——— حال کی باریکیوں سے دل میں لطیف اشارہ پیدا ہونا۔

السِرّ ——— محبت کے احوال کو مخفی رکھنا۔

النجویٰ ——— غیر کی اطلاع سے آفات کو مخفی رکھنا۔

الاشارہ ——— زبانی عبارت کے بغیر غیر کو مراد کی خبر دینا۔

الایماء ——— عبارت اور اشارہ کے بغیر تعریفاً خطاب کرنا۔

الوارد ——— معانی کا دل میں وارد ہونا۔

الانتباہ ——— دل سے غفلت کا زائل ہونا۔

الاشتباہ ——— حق اور باطل کے درمیان حال کا مشتبہ ہونا۔

القرار ——— حقیقت حال سے تردد کا زائل ہوجانا۔

الانزعاج ——— وحدانیت کے حال میں دل کا حرکت کرنا۔

صوفیہ کی بعض اصطلاحات کے یہ معنی تھے جو اختصار کے طور پر بیان ہوئے۔ واللہ اعلم

اصطلاحات کی تیسری نوع

تیسری قسم کی اصطلاحات وہ ہیں جنہیں یہ حضرات توحید الٰہی اور حقائق میں اپنے اعتماد کو

استعارے کے بغیر بیان کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔ اُن میں سے پہلی اصطلاح ہے۔

العالم ——— یہ اصطلاح حق تعالیٰ کی مخلوقات سے عبارت ہے اور صوفیہ کہتے ہیں کہ اٹھارہ ہزار عالم ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ پچاس ہزار عالم ہیں۔ جب کہ فلسفی لوگ کہتے ہیں کہ عالم صرف دو ہیں ایک عالم علوی اور دوسرا عالم سفلی۔ اور علمائے اصول کہتے ہیں کہ عرش سے لے کر زمین کے نیچے تک جو کچھ وہ تمام ایک ہی عالم ہے۔ غرضیکہ تمام عالم مختلف جنسوں کا مجموعہ ہے، اور اہل طریقت بھی عالم ارواح اور عالم نفوس میں عالم کو تقسیم کرتے ہیں لیکن ان کی مراد وہ نہیں جو فلاسفہ کی ہے کیوں کہ ان کی مراد ارواح اور نفوس کا اجتماع ہے۔

المحدث ——— وہ جو وجود میں متاخر ہو یعنی پہلے نہ تھا اور بعد میں پیدا ہوا۔

القدیم ——— جو اپنے وجود میں ہمیشہ سے ہے اور جس کی ذات تمام موجودات سے پہلے تھی۔ اور یہ خداوند تعالےٰ کے سوا کوئی نہیں ہے۔

الازل ——— وہ جس کی ابتداء نہ ہو۔

الابد ——— وہ جس کی کوئی انتہاء نہ ہو۔

الذات ——— کسی چیز کا وجود اور اس کی حقیقت۔

الصفۃ ——— جو موصوف نہ بن سکے کیوں کہ وہ خود قائم نہیں ہوتا بلکہ دوسرے کی صفت ہوتا ہے۔

الاسم ——— جو مسمّیٰ نہ ہو۔

التسمیہ ——— جو مسمّیٰ کی خبر (نام) ہو۔

النفی ——— جو ہر غیر موجود اور قابل نفی چیز کے عدم کا تقاضہ کرئے۔

الاثبات ——— جو ہر موجود اور قابل وجود چیز کا اثبات کرے۔

الشیئان ——— وہ دو چیزیں جن میں سے ایک کے ہوتے ہوئے دوسرے کا وجود جائز ہو

الضدان ——— وہ دو چیزیں جن میں سے ایک کا وجود دوسرے کے ہوتے ہوئے ایک ہی حال میں درست نہ ہو۔

الغیران ——— وہ دو چیزیں جن میں سے ایک کا وجود دوسرے کے فناء کے ساتھ جائز ہو۔

الجوہر ـــــ کسی چیز کا اصل جو بذاتِ خود قائم ہو۔

العرض ـــــ جو کسی جوہر کے ساتھ قائم ہو۔

الجسم ـــــ جو پراگندہ اجزاء سے مرکب ہو۔

السوال ـــــ کسی حقیقت کا طلب کرنا۔

الجواب ـــــ مضمونِ سوال کی خبر دینا۔

الحسن ـــــ جو حکم کے مطابق ہو۔

القبیح ـــــ جو حکم کے مخالف ہو۔

السفہ ـــــ حکم کا ترک کرنا۔

الظلم ـــــ کسی چیز کو اُس کے محل کے علاوہ جگہ پر رکھنا۔

العدل ـــــ ہر چیز کو اُس کے اپنے مقام و محل میں رکھنا۔

الملک ـــــ وہ جس کے کسی کام پر اعتراض نہ کرسکیں۔

مختصراً یہ وہ اصطلاحیں ہیں کہ جن کے بغیر طالب حق کے لئے کوئی چارہ نہیں۔

اصطلاحات کی چوتھی نوع

چوتھی قسم کی وہ اصطلاحیں ہیں جن کی شرح کرنے کی ضرورت ہے اور وہ صوفیائے کرام میں رائج ہیں، اور اُن سے صوفیہ کا مقصد وہ ہوتا ہے جو اہل لغت کو معلوم ہوتا ہے۔

الخاطر ـــــ خاطر کے ظاہری لفظ سے اُس معنی کا حصول مراد لیتے ہیں جو دل میں تیزی سے پیدا ہوتا ہے لیکن پھر دوسرے خیال کے آتے ہی زائل ہو جاتا ہے اور صاحب خیال کو دل سے اُسے زائل کرنے کی قدرت حاصل ہوتی ہے، تاہم اہل خاطر امور میں پہلے خیال کا ہی اتباع کرتے ہیں کیوں کہ وہ حق تعالیٰ کی طرف سے بندے کے دل میں بغیر کسی علت کے پیدا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت خیر نساجؒ کے دل میں خیال نمودار ہوا کہ حضرت جنیدؒ دروازے پر کھڑے ہیں۔ آپ نے اس خیال کو دل سے دور کرنا چاہا لیکن اس خواہش کی تردید میں ایک اور خیال آگیا اور آپ اس کو دور کرنے میں مشغول ہو گئے لیکن تیسری دفعہ بھی وہی خیال پیدا ہونے پر

آپ باہر آئے تو حضرت جنیدؒ کو دروازے پر کھڑے دیکھا، حضرت جنیدؒ نے فرمایا اے خیر! اگر مشائخ کی سیرت اپناتے ہوئے پہلے خیال کی ہی اتباع کر لیتے تو مجھے اتنی دیر دروازے پر کھڑا نہ رہنا پڑتا ـــــــ مشائخ نے کہا ہے کہ اگر خاطر وہی تھا جو حضرت خیرؒ کے دل پر واقع ہوا تو پھر جو حضرت جنیدؒ کے دل میں خیال پیدا ہوا تھا اُس کا کیا مقام ہے۔ کہتے ہیں کہ چوں کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ، حضرت خیر کے پیر تھے اس لئے لامحالہ پیر اپنے مرید کے باطنی احوال پر مطلع ہوتا ہے۔

الواقع ـــــــ واقع سے وہ معنی مراد لیتے ہیں جو دل میں پیدا ہوا اور دل میں باقی رہے بخلاف خاطر کے ـ اور طالب کو کسی حالت میں بھی اُس کو دور کرنے کی قدرت حاصل نہ ہو۔ چنانچہ کہتے ہیں "خطر علیٰ قلبی وَ وَقَعَ فی قلبی"۔ (میرے دل پر ایک خیال گزرا اور ایک بات میرے دل میں واقع ہوئی) پس تمام دل خاطر کا محل تو ہوتے ہیں لیکن واقع صرف اسی دل میں صورت پذیر ہوتا ہے جس میں سب کچھ حق تعالےٰ کی بات ہی ہو یہی وجہ ہے کہ جب مرید کو حق تعالیٰ کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے تو اس کو قید کہتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اُس کو ایک واقعہ یعنی مشکل پیش آگئی۔ اہل لسان تو واقعہ سے سائل میں اشکال مراد لیتے ہیں اور جب کوئی اس اشکال کا جواب دے دے اور اشکال رفع ہو جائے تو کہتے ہیں کہ واقعہ حل ہو گیا۔ لیکن اہل تحقیق کہتے ہیں کہ واقعہ وہ ہوتا ہے جس کا حل ہونا ممکن نہ ہوا اور جو حل ہو جائے وہ خاطر ہوتا ہے واقعہ نہیں ہوتا کیونکہ اہل تحقیق کی بندش اور رکاوٹ کسی حقیر چیز میں نہیں ہوتی کہ ہر وقت اُس کا حکم بدل جائے اور حال تبدیل ہو جائے۔ واللہ اعلم بالصواب

الاختیار ـــــــ اختیار سے یہ حضرات یہ مراد لیتے ہیں کہ انسان اپنے اختیار پر حق تعالیٰ کے اختیار کو ترجیح دے۔ یعنی حق تعالےٰ نے اُن کے لئے خیر اور شر میں سے جو کچھ بھی اختیار کیا ہے اُسی کو کافی سمجھیں اور بندے کا حق تعالےٰ کے اختیار کو ترجیح دینا بھی حق تعالےٰ کے اختیار سے ہی ہے۔ کیوں کہ اگر حق تعالےٰ نے ہی اس کو بے اختیار نہ کیا ہوتا تو یہ خود ہرگز اپنے اختیار کو نہ چھوڑ سکتا۔ حضرت بایزیدؒ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ "امین کون

ہوتا ہے؟ آپ نے جواب دیا" امین وہ ہوتا ہے جس کا اپنا اختیار باقی نہ رہا ہو اور حق تعالےٰ کا اختیار ہی اُس کا اختیار بن گیا ہو —— اور حضرت جنیدؒ کے متعلق آتا ہے کہ ایک دفعہ آپ کو بخار ہو گیا تو آپ نے دعا کی" بارِ خدایا مجھے صحت عطا فرما!" آپ کے باطن سے ندا آئی کہ" تو کون ہوتا ہے ہماری مِلک میں گفتگو کرنے والا! ہم اپنی ملکیت میں تم سے بہتر طور پر تدبیر کرنا جانتے ہیں۔ تم ہمارے اختیار کو ہی اختیار کرو اور اپنے آپ کو خود مختار ظاہر نہ کرو ——

الامتحان —— صوفیائے کرام اس لفظ سے اولیاء اللہ کے دل کا امتحان مراد لیتے ہیں جو حق تعالےٰ کی طرف سے اُن کے دل پر خوف، حزن، قبض اور ہیبت جیسی طرح طرح کی مصیبتوں اور آزمائشوں سے، ہوتا ہے جیساکہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے" اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ" (یہ وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ تعالےٰ نے تقوےٰ کے لئے آزمایا، ان کیلئے مغفرت اور بڑا اجر ہے) اور یہ درجہ بڑا ہی اعلیٰ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

اَلبَلاء —— بلاء سے اولیاء اللہ کے جسموں کی تکلیف، بیماری اور غم وغیرہ مراد لیتے ہیں۔ اور بندہ پر مصیبت جتنی قوی ہوتی ہے اتنا ہی حق تعالےٰ کے ساتھ اُس بندے کا قرب زیادہ ہوتا ہے کیوں کہ آزمائش و مصیبت اولیاء اللہ کا لباس۔ برگزیدہ لوگوں کا گہوارہ اور انبیاء کرام کی غذا ہوتی ہے کیا تو نے دیکھا نہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نحن معاشر الانبیاء اشد الناسِ بلاءً (ہم انبیاء کا گروہ لوگوں میں سب سے زیادہ تکلیف برداشت کرتے ہیں) نیز آپ نے فرمایا" اشد الناسِ بلاءً الانبیاء ثمّ الاولیاء ثمّ الامثل فالامثل"۔ (لوگوں میں سب سے زیادہ تکلیف انبیاء کو پہنچتی ہے پھر اولیاء کو پھر اُن جیسوں کو اور پھر اُن جیسوں کو) بہر حال بلاء نام ہے اُس رنج کا جو مومن بندہ کے دل اور جسم پر پیدا ہوتی ہے کیوں کہ اس کی حقیقت ایک نعمت ہے اور اس لئے کہ اس کا راز بندے پر پوشیدہ رہتا ہے اور اُس کو برداشت کرنے سے اُسے ثواب ملتا ہے۔ پھر جو مصیبت کافروں پر ہوتی ہے وہ بلاء نہیں ہوتی بلکہ شقاوت و بدبختی ہوتی ہے اور کافر لوگ اس

شقاوت سے ہرگز شفایاب نہیں ہو سکتے۔ پس بلآء کا مرتبہ امتحان کے مرتبہ سے زیادہ اعلیٰ ہے کیوں کہ امتحان کا اثر جسم پر ہوتا ہے جب کہ اس بلاء کا اثر دل اور جسم دونوں پر ہوتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

التحلی۔ کسی قابلِ تعریف گروہ کے ساتھ عمل کے بغیر صرف قول میں مشابہت اختیار کرنے کو تحلی کہتے ہیں۔ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "لیس الایمان بالتحلی والتمنی لکن ما وقر فی القلوب و صدق العمل" (کسی قوم کی مشابہت اور اُس جیسا بننے کی آرزو کا نام ایمان نہیں ہے بلکہ ایمان نام ہے اسی بات کا کہ حق تعالےٰ کے متعلق دل میں یقین جم جائے اور عمل سے اس کی تصدیق کی جائے) پس حقیقی عمل کے بغیر اپنے آپ کو کسی قوم کی مانند کرنے کا نام تحلی ہے اور جو لوگ اپنے اچھا ہونے کی نمائش کرتے ہیں لیکن حقیقت میں اچھے نہیں ہوتے وہ بہت جلد رسوا ہو جاتے ہیں اور اُن کی حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے حالانکہ اہل تحقیق کے نزدیک وہ پہلے ہی رسوا ہوتے ہیں اور اُن کی حقیقت آشکارا ہوتی ہے۔

التجلی۔ حق تعالےٰ کی طرف ہمہ تن متوجہ ہونے کی وجہ سے بارگاہ خداوندی کے مقبول حضرات کے دل پر انوارِ حق کی جو تاثیر پیدا ہوتی ہے اس کو تجلی کہتے ہیں۔ کیوں کہ وہ حضرات اس بات کے مستحق ہوتے ہیں کہ دل کے ساتھ حق تعالیٰ کو دیکھ لیں، اس دلی رویت اور ظاہری رویت میں فرق واضح ہے کہ صاحب تجلی دیکھنا چاہے تو دیکھ لے اور دیکھنا نہ چاہے تو نہ دیکھے یا کسی وقت دیکھ لے اور کسی وقت نہ دیکھے لیکن ظاہری آنکھوں سے دیکھنے والے جنت میں اگر حق تعالےٰ کو دیکھنا نہ چاہیں گے تو بھی ایسا نہ کر سکیں گے کہ وہ نہ دیکھیں کیوں کہ تجلی یعنی دل کی رویت پر تو وہ جائز ہے لیکن ظاہری آنکھ سے دیکھنے پر حجاب روا نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم

التخلی۔ جو اشغال بندے کو قرب حق حاصل کرنے سے مانع ہوتے ہیں اُن سے اعراض کرنے کا نام تخلی ہے اُن میں سے ایک تو دنیا ہے کہ ہاتھ اس سے خالی کرے۔ دوسرا عقبیٰ کا خیال ہے کہ دل کو اس سے خالی کر لے تیسرا خواہشات کا اتباع ہے کہ باطن کو اس سے خالی کر لے اور چوتھا لوگوں کی صحبت ہے کہ اپنے آپ کو اس سے خالی کر لے اور دل کو

اُن کے خیال سے خالی کرے۔

الشرود ـــــ طلب حق میں تمام آفات اور حجابوں سے خلاصی پانے اور اس میں بیقراری محسوس کرنے کو شرود کہتے ہیں کیوں کہ طالب حق کو حجاب کی صورت میں ہی تمام مصیبتیں محسوس ہوتی ہیں۔ پس طالبانِ حق کے گروہ کو حجاب کے کشف کرتے ہیں جو سفر درپیش ہوتے ہیں اور اس مقصد کے لئے جس چیز کے ساتھ بھی تعلق پیدا ہوتا ہے اس کو شرود کہتے ہیں۔ کیوں کہ طالب حق اپنی طلب کی ابتداء میں بہت زیادہ بیقرار ہوتا ہے اور انتہاء میں وصل حاصل ہو جانے کی وجہ سے بہت زیادہ مطمئن ہو جاتا ہے۔

القصود ـــــ قصود سے صوفیہ کے نزدیک مقصود حقیقی کی تلاش میں صحیح ارادہ مراد ہوتا ہے اور ان حضرات کا قصود حرکت و سکون سے وابستہ نہیں ہوتا کیوں کہ دوست اپنی دوستی اور محبت میں اگرچہ بظاہر ساکن ہی ہو لیکن درحقیقت وہ قاصد ہوتا ہے اور یہ چیز عام عادت کے خلاف ہے کیوں کہ یا تو ارادہ کرنے والوں کے ظاہر پر اس ارادے کا کوئی اثر ہوتا ہے یا پھر اُن کے باطن پر اس کی کوئی علامت ضرور ہوتی ہے سوائے دوستانِ حق کے کہ وہ بغیر کسی علت کے حق تعالیٰ کی طلب کرتے ہیں اور اپنی حرکات کے بغیر بھی قاصد ہوتے ہیں اور اُن کی تمام صفات بذاتِ خود ایک قصد ہوتی ہیں کیوں کہ وہ انتہائی درجے کا قصد کرتے ہیں جو محبت حاصل ہو جاتی ہے وہ گویا تمام کی تمام قصد ہی ہوتی ہے۔

الاصطناع ـــــ اس اصطلاع سے صوفیہ وہ کیفیت مراد لیتے ہیں کہ حق تعالےٰ کسی بندے کو اس کے تمام نفیبوں کو فناء کر کے اور اُس کی تمام نفسانی لذات کو زائل کر کے مہذب کر دیں، اور اُس کے نفس کے تمام اوصاف اُس میں اس طرح تبدیل کر دیں کہ وہ لذتوں کے زوال اور نفسانی اوصاف کی تبدیلی سے اپنے آپ سے بیخود ہو جائے ـــ اور یہ درجہ انبیاء کے لئے مخصوص ہے اولیاء کو حاصل نہیں ہوتا اور مشائخ کا ایک گروہ اولیاء کے لئے بھی اس درجے کے جواز کا قائل ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الاصطفاء ـــــ اصطفاء یہ ہوتا ہے کہ حق تعالےٰ بندہ کے دل کو اپنی معرفت کے لئے دوسری تمام چیزوں سے فارغ کر دیں تاکہ اپنی صفائی کی معرفت اس کے دل میں پیدا

کردیں۔ اور اس درجہ میں خاص اور عام۔ گنہگار اور اطاعت شعار اور ولی و نبی تمام مومن یکساں ہیں چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں" ثُمَّ اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادِنا فمنھم ظالمٌ لنفسہٖ و منھم مقتصدٌ و منھم سابقٌ بالخیرات" (پھر ہم نے اُن لوگوں کو اپنی کتاب کی وراثت دی جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے چن لیا۔ پھر بعض اُن میں سے اپنے آپ پر ظلم کرنے والے ہیں، بعض میانہ روہیں اور بعض نیکیوں میں سبقت کرنے والے ہیں)

الاِصطلام —— اصطلام وہ تجلیاتِ حق ہیں جو بندے کے اپنے ارادے کو نفی کر کے اور نرم آزمائش کے ذریعہ اُس کو مکمل طور پر مغلوب کر دیں۔ اور قلب ممتحن (آزمایا ہوا دل) اور قلب مصطلم (مغلوب شدہ دل) دونوں ایک ہی معنی میں آتے ہیں البتہ اصطلام امتحان سے زیادہ خاص اور نرم ہے اہل طریقت کی مروجہ اصطلاحات ہیں۔

—— واللّٰہ اعلم بالصواب ——

الرَّیْن —— رَین، دل پر ایک ایسا حجاب ہوتا ہے جس کا کشف ایمان کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اور یہ کفر اور گمراہی کا حجاب ہوتا ہے چنانچہ خدائے عزوجل نے اپنے ارشاد میں کفار کے دل کو اس کے ساتھ موصوف کیا ہے" کلّا بل رانَ علیٰ قلوبھم ما کانوا یکسبون" (ہر گز ایسا نہیں بلکہ اُن کے اپنے کسب (شرک و کفر) کی وجہ سے اُن کے دلوں پر پردہ ہے) اور ایک گروہ کہتا ہے کہ رَین وہ ہوتا ہے جس کو خود زائل کرنا ہرگز ممکن نہیں ہوتا کیوں کہ کافروں کا دل تو اسلام قبول ہی نہیں کرتا باقی کافروں میں جو لوگ اسلام قبول کر لیتے ہیں وہ حق تعالیٰ کے علم میں پہلے سے ہی مومن ہوتے ہیں۔

الغَین —— دل پر پڑ جانے والے اس پردے کو غین کہتے ہیں جو استغفار کرنے سے اُٹھ جاتا ہے اور یہ دو طرح کا ہوتا ہے ایک خفیف اور دوسرا غلیظ۔ غلیظ پردہ تو اہل غفلت اور کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کے لئے ہوتا ہے جب کہ خفیف پردہ سب کے لئے ہوتا ہے خواہ کوئی ولی ہو یا نبی۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ" انّہٗ لیغانُ علیٰ قلبی و انّی لاستغفرُ اللّٰہ فی کلّ یوم مائۃ مرۃ"

(میرے دل پر ہلکا سا پردہ آ جاتا ہے اور بے شک میں ہر روز ایک سو مرتبہ اپنے اللہ سے استغفار کرتا ہوں) پس غلیظ پردے کے لئے تو توبہ ضروری شرط ہے جب کہ خفیف پردے کے لئے حق تعالےٰ کی طرف سچا رجوع ضروری ہے ۔ گناہ سے اطاعت کی طرف لوٹنے کا نام توبہ ہے جب کہ اپنی ذات سے حق تعالےٰ کی طرف لوٹنے کا نام رجوع ہے پس توبہ جرم سے کرتے ہیں اور حق تعالےٰ کے حکم کی نافرمانی بندوں کا جرم ہے جب کہ دوستانِ حق کا جرم ارادتِ حق کی مخالفت ہو گا ۔ پس بندوں کا جرم معصیت کہلائے گا اور دوستانِ حق کا جرم اپنے وجود کو دیکھنا ہے ۔ اگر کوئی شخص غلطی سے حق بات کی طرف رجوع کرے تو اسے توبہ کرنے والا کہتے ہیں اور کوئی شخص صحیح کام سے زیادہ صحیح کی طرف رجوع کرے تو اُسے راجع کہتے ہیں ـــــــ میں نے یہ سب باتیں توبہ کے باب میں بیان کر دی ہیں ـــ واللہ اعلم۔

التلبیس ؛ ـــــــ کسی چیز کو لوگوں کے سامنے اس کی حقیقت کے خلاف ظاہر کرنے کو تلبیس کہتے ہیں ۔ جیسا کہ حق تعالےٰ کا ارشاد ہے وَ لَلَبسنا علیھم ما یلبسون " (اور ہم نے اُن پر ملتبس کر دیں جو وہ حق کو باطل کے ساتھ ملاتے ہیں) اور یہ صفت حق تعالےٰ کے علاوہ کسی کے لئے محال ہے کیوں کہ حق تعالےٰ ہی کافر کو مومن کی صفت میں اور مومن کو کافر کی صفت میں ظاہر کرتے ہیں ، حتیٰ کہ ہر شخص میں اس کے حکم اور حقیقت کے اظہار کا ایک خاص وقت ہوتا ہے ، اور جب اس گروہ میں سے کوئی شخص اپنی قابلِ تعریف خصلتوں کو مذموم باتوں سے چھپاتا ہے تو کہتے ہیں کہ وہ تلبیس کرتا ہے ، اور اس صورت کے علاوہ کہیں بھی اس اصطلاح کو استعمال نہیں کرتے اور منافقت اور ریاکاری کو تلبیس نہیں کہتے ہیں اگرچہ بنیادی طور پر یہ تلبیس ہی ہے کیونکہ تلبیس کی اصطلاح حق تعالےٰ کے فضل کو قائم کرنے کے سوا کسی جگہ استعمال نہیں ہوتی ـــ

الشرب ـــــ بندگی کی مٹھاس ، بزرگی کی لذت اور محبت کی راحت کو یہ لوگ شرب کہتے ہیں ۔ اور کوئی شخص لذتِ شرب کے بغیر کوئی بھی کام نہیں کر سکتا ۔ جس طرح جسم کا شرب پانی سے ہوتا ہے اسی طرح دل کا شرب بندگی کی راحتوں اور مٹھاس سے حاصل ہوتا ہے ـــ

میرے شیخ رحمۃ اللہ علیہ کہا کرتے تھے کہ "بے شرب مرید اور بے شرب عارف، ارادت اور معرفت سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ مرید کو اپنے کردار سے ایسا شرب حاصل ہونا چاہئیے کہ وہ ارادت میں طلب کا حق ادا کر دے۔ البتہ عارف کو حق تعالٰے کے بغیر شرب حاصل نہیں ہونا چاہئیے یا ایسا شرب نہ ہونا چاہئیے کہ وہ اس کے اپنے نفس کی طرف لوٹتا ہو کیوں کہ اس طرح اس کو آرام حاصل نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الذوق ——— ذوق بھی شرب کی طرح ہی ہوتا ہے تاہم شرب صرف راحتوں میں مستعمل ہوتا ہے جب کہ ذوق۔ رنج اور راحت دونوں کا متحمل ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک بزرگ کہتے ہیں "ذُقتُ اطلاوۃ وَذُقتُ البلآءَ وَذُقتُ الراحۃ (میں نے بندگی کی صورت کو چکھا اور میں نے رنج و راحت کو چکھا) یہ سب درست ہے۔ پھر شرب کو کہتے ہیں" شربت بکاسِ الوصل اَوْبکاسِ الوُدّ" (میں نے وصل یا محبت کا پیالہ پیا) کیوں کہ حق تعالٰے نے جب شرب کی بات بیان کی تو فرمایا "کلوا واشربُوا ھنیأً" (خوشگوار حالت میں کھاؤ اور پیو) اور جب ذوق کا تذکرہ کیا تو فرمایا "ذُق اِنکَ انت العزیز الکریم" (عذاب کو چکھو کہ تم بڑے عزت و بزرگی والے ہو) اور دوسری جگہ پر فرمایا "ذوقو مَسَّ سقرَ" (دوزخ کا چھونا، چکھو!) ——— یہ تھے صوفیہ کے درمیان مروج اصطلاحات کے معانی جو میں نے بیان کر دئے۔ اگر میں ان سب کو لکھتا تو کتاب بڑی طویل ہو جاتی۔ واللہ اعلم بالصواب

گیارھواں کشف حجاب

سماع کا بیان

جان لو کہ حصولِ علم کے اسباب پانچ ہیں، پہلا سُننا، دوسرا دیکھنا، تیسرا چکھنا، چوتھا سونگھنا اور پانچواں چھونا ——— اور اللہ تعالٰے نے دل کے لئے یہ پانچ دروازے

پیدا کر دئے ہیں اور علم کی ہر قسم کو ان میں سے ایک کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے، جیسے کہ سننے کے لئے آوازوں اور خبروں کا علم، دیکھنے کے لئے رنگوں اور جسموں کا علم، چکھنے کے لئے مٹھاس اور کڑواہٹ کا علم، سونگھنے کے لئے بدبو اور خوشبو کا علم اور چھونے کے لئے سختی اور نرمی کا علم۔ اور اللہ تعالےٰ نے ان پانچ حواس میں سے چار کو مخصوص محل میں رکھا ہے اور ایک کو جسم کے تمام اعضاء میں پھیلا دیا ہے، یعنی سننے کا محل کان کو بنا دیا ہے۔ دیکھنے کا محل آنکھ کو، چکھنے کا زبان کو اور سونگھنے کا محل ناک کو بنا دیا ہے جب کہ چھونے کو تمام اعضاء میں جاری کر دیا ہے اس لئے کہ آنکھ کے بغیر دیکھ نہیں سکتے۔ کان کے بغیر سُن نہیں سکتے، ناک کے بغیر سونگھ نہیں سکتے اور زبان کے بغیر چکھ نہیں سکتے لیکن پورا جسم کسی چیز کو چھونے سے نرم سخت اور گرم و سرد جان لیتا ہے۔ تاہم جائز کے طور پر تو یہ بھی جائز ہے کہ ان میں سے ہر ایک تمام اعضاء میں شائع ہو جائے جس طرح کہ لمس تمام اعضا میں شائع ہے ——— معتزلہ کے نزدیک ان میں سے ہر ایک اپنے مخصوص محل کے بغیر ممکن نہیں کیوں کہ ہر ایک کے لئے ایک محل مخصوص ہے لیکن ان کا یہ قول حاسۂ لمس کی وجہ سے باطل ہے کیوں کہ اُس کے لئے تو کوئی محل مخصوص نہیں اور جب ان پانچ میں سے ایک کے لئے محل مخصوص نہیں اور اس ایک میں یہ صفت جائز ہے کہ تمام اعضاء میں یہ جاری ہو تو دوسروں کے لئے بھی یہ جائز ہے کہ وہ اس صفت سے موصوف ہوں، تاہم اس جگہ یہ ماجرا بیان کرنا میرا مقصد نہیں لیکن معنی کی تحقیق کو بیان کرنے کے لئے مذکورہ مقدار کے بغیر بھی چارہ نہ تھا ——— پس ایک حاسے یعنی سمع کے علاوہ باقی چاروں حواس جن کا ذکر گزر چکا ہے کہ ایک ان میں سے دیکھتی ہے دوسری سونگھتی ہے، تیسری چکھتی ہے اور چوتھی چھوتی ہے اور اُن میں جائز ہے کہ اس عجیب و غریب دنیا کو دیکھنا، اچھی چیزوں کو سونگھنا بہترین نعمتوں کا چکھنا، نرم چیزوں کو چھونا اور آوازوں کو سننا، عقل کے لئے دلیل بن جائے اور اپنے خدا تعالےٰ کو پہچاننے کی طرف رہنمائی کرے اس لئے کہ ان حواس کے ذریعہ عقل جان لیتی ہے کہ عالم حادث اور محل تغیر ہے اور جو چیز تغیر پذیر ہو وہ حادث ہی ہوتی ہے اور عقل یہ بھی جان لیتی ہے کہ اس حادث جہان کا کوئی پیدا کرنے والا بھی ہے جو اس

کی جنس سے نہیں کیوں کہ یہ عالم مکوَّن (پیدا کیا ہوا ہے) اور اس کو پیدا کرنے والا مکوِّن (پیدا کرنے والا) ہے یہ مجسَّم (جسم والا) ہے اور اس کو پیدا کرنے والا مجسِّم (جسم عطا کرنے والا) ہے۔ اس کا خالق لامتناہی ہے اور یہ عالم متناہی ہے اور وہ خالق تمام چیزوں پر قادر اور تمام کاموں پر طاقت والا ہے اور وہ تمام معلومات کا عالم ہے اور تمام ملک میں اُسی کا تصرف درست ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور اس نے اپنے رسولوں کو سچی بُرھان دے کر بھیجا ہے لیکن اس کے رسولوں پر ایمان لانا اس وقت تک ضروری نہیں ہوتا جب تک حق تعالیٰ کی معرفت اور جو چیزیں دین اور شریعت میں واجب ہیں رسول سے سُنکر انہیں معلوم نہ کرے یہی وجہ ہے کہ اہل سنت اس تکلیف کے گھر (دنیا) میں سننے کو دیکھنے پر فضیلت دیتے ہیں۔ اگر کوئی خطا کار یہ کہے کہ سننا خبر کا محل ہے اور دیکھنا نظر کا محل ہے تو جب حق تعالیٰ کا دیدار اس کا کلام سننے سے زیادہ افضل ہوگا تو ہونا یہ چاہئیے کہ نظر کو سمع پر زیادہ افضل سمجھا جائے۔ میں کہتا ہوں کہ ہم نے تو سُن کر یہ علم حاصل کیا ہے کہ جنت میں مومنوں کو حق تعالیٰ کا دیدار حاصل ہوگا کیوں کہ رویت باری تعالیٰ کے عقلی طور پر جائز ہونے کا حجاب تو اُس کے کشف سے زیادہ بہتر نہیں ہے اس لئے کہ ہم نے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر سے ہی معلوم کیا ہے کہ مومنوں کو اللہ تعالیٰ کا دیدار حاصل ہوگا اور اُن کی آنکھوں کے سامنے سے حجاب اُٹھ جائے گا تاکہ وہ اللہ عزوجل کو دیکھ سکیں۔ پس سننا زیادہ افضل ہوا دیکھنے سے ــــ نیز شریعت کے تمام احکام کا سننے پر ہی دارومدار ہے کہ اگر سننا نہ ہوتا تو اُن کا ثبوت ہی محال ہوتا ـــــ نیز جتنے انبیاء کرام بھی تشریف لائے ہیں پہلے انہوں نے حق تعالےٰ کی توحید اور اپنی نبوت کو زبان سے بیان کیا ہے یہاں تک جنہوں نے اُن کے پیغام کو غور سے سنا وہ اُن کے گرویدہ ہوگئے اب انبیاء کرام سے معجزے ظاہر ہوئے اور معجزہ دیکھنے میں بھی تاکید سننے سے ہی ہوئی ـــ ان دلائل کے باوجود جو شخص سننے کی افضلیت کا انکار کرے وہ گویا پوری شریعت کا انکار کرتا ہے اور احکام شریعت اپنے اوپر پوشیدہ کرتا ہے ـــــــ اب میں انشاء اللہ اس کا پورا حکم ظاہر کروں گا۔

قرآن کا سماع

سُننے جانے کے قابل چیزوں میں سے دل کے لئے فوائد۔ باطن کے لئے ترقیوں اور کانوں کے لئے لذتوں کے اعتبار سے سب سے بہترین سماع اللہ تعالیٰ کے کلام کا سماع ہے۔ اُس کے سُننے کا تمام مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے اور انسانوں اور جنوں میں سے تمام کافر بھی اُس کو سننے کے مکلف ہیں ـــــ قرآن مجید کے معجزات میں سے ایک یہ ہے کہ کوئی انسان اُس کو بکثرت پڑھنے اور سننے سے اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا کیوں کہ اس میں بڑی رقت ہے حتیٰ کہ کفار قریش رات کے وقت چھپ چھپ کر آتے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی حالت میں قرآن مجید کی جو تلاوت کرتے اسے آکر سنتے تھے اور اس (کی فصاحت وبلاغت اور اعجاز) پر حیران ہوتے تھے مثلاً نضر بن حارث جو اُن میں سب سے زیادہ فصیح تھا اور عتبہ بن ربیعہ جس کی بلاغت میں جادو تھا اور ابوجہل بن ہشام جو خطابت اور دلائل میں ید بیضا رکھتا تھا اور اس کی گفتگو میں بڑا نظم ہوا کرتا تھا اسی طرح کے دوسرے لوگ بھی خفیہ طور پر قرآن مجید سننے کے لئے آتے تھے یہاں تک کہ ایک رات حضور علیہ السلام ایک سورہ کی تلاوت کر رہے تھے کہ عتبہ کے ہوش جاتے رہے اور وہ ابوجہل سے کہنے لگا "مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ یہ کسی مخلوق کا کلام نہیں ہے"۔ اور اللہ تعالےٰ نے جنات کو (قرآن مجید کا سماع کرنے کے لئے) بھیجا تھا حتیٰ کہ وہ جوق در جوق آئے اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اللہ تعالیٰ کا کلام سننے لگے جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے بیان کیا ہے کہ "فَقَالُوْا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا" (پس وہ (جنات) کہنے لگے ہم نے عجیب قرآن سُنا ہے) اس جگہ اللہ تعالےٰ نے ہمیں جنات کے اس قول کی خبر دی کہ یہ قرآن بیمار دلوں کے لئے سیدھے راستے کی رہنمائی کرنے والا ہے اور کہا کہ "یَهْدِیْۤ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَاۤ اَحَدًا" (وہ قرآن بھلائی کی طرف رہنمائی کرتا ہے پس ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں اور اپنے رب کے ساتھ کسی کو ہرگز شریک نہ بنائیں گے) پس قرآن کی نصیحت تمام نصیحتوں سے زیادہ اچھی۔ اس کے الفاظ تمام الفاظ سے زیادہ

بلیغ، اس کے احکام تمام احکام سے زیادہ لطیف، اس کی نہی تمام مناہی سے زیادہ ڈرانے والی۔ اس کا وعدہ تمام وعدوں سے زیادہ دلربا اس کی وعید تمام وعیدوں سے زیادہ جانگداز، اس کے واقعات تمام واقعات سے زیادہ پُرتاثیر اور اس کی مثالیں تمام مثالوں سے زیادہ فصیح ہیں، اس کے سماع نے ہزاروں دلوں کو شکار کیا ہے اس کے لطائف نے ہزاروں جانوں کو مصیبت میں مبتلا کیا ہے تو اس نے دنیوی عزت والوں کو ذلیل اور دنیا کے اعتبار سے ذلیل لوگوں کو صاحب عزت بنا دیا ہے ——— حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے جب سُنا کہ بہن اور بہنوئی مسلمان ہو گئے ہیں تو آپ نے اُن کو قتل کرنے کا قصد کر لیا۔ شمشیر کھینچے ہوئے ان کے قتل کے لئے تیاری کی اور اپنے دل کو اُن کی محبت سے خالی کر لیا۔ لیکن حق تعالےٰ نے اپنے لطف کا لشکر سورۃ طٰہٰ کی کمین گاہوں میں گھات میں بٹھا دیا چنانچہ جب بہن کے گھر کے دروازے پر آئے تو ہمشیرہ تلاوت کر رہی تھی۔ طٰهٰ ﴿ مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى اِلَّا تَذۡكِرَةً لِّمَنۡ يَّخۡشٰى ﴾" (اے میرے رسولؐ! ہم نے آپ پر قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں بلکہ یہ یاد دہانی ہے اس کے لئے جو ڈرتا ہے) یہ سن کر آپ کی جان قرآن کی باریکیوں کا شکار ہو گئی اور آپ کا جدائی میں بندھا ہوا دل اس کے لطائف سے کھُل گیا۔ آپ نے صلح کا راستہ اختیار کیا اور جنگ کا لباس اتار پھینکا اور مخالفت سے موافقت کی طرف آ گئے ——— اور معروف ہے کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ آیت پڑھی کہ "اِنَّ لَدَيۡنَاۤ اَنۡكَالًا وَّجَحِيۡمًا ۙ وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِيۡمًا" (بے شک ہمارے ہاں بیڑیاں، جہنم کی آگ، گلے میں پھنس جانے والا کھانا اور دردناک عذاب ہے) تو اسے سُنکر حضور علیہ السلام بیہوش ہو کر گر پڑے ——— اور کہتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ آیت پڑھی "اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۙ مَّا لَهٗ مِنۡ دَافِعٍ" (بے شک آپ کے رب کا عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے کوئی اس کو ٹالنے والا نہیں) حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سُنکر ایک چیخ ماری اور بیہوش ہو کر گر پڑے۔ لوگ آپ کو اُٹھا کر آپ کے گھر لے گئے اور آپ اللہ تعالےٰ کے خوف

اور ڈر سے ایک مہینہ تک بیمار پڑے رہے ـــــ اور کہتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہما کے سامنے یہ آیت "لَهُم مِّن جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَمِن فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ" (کفار کے لئے آتش) دوزخ کے بچھونے اور اُن کے اُوپر اسی کے چھت ہوں گے) پڑھی تو اُن پر گریہ طاری ہوگیا یہاں تک کہ راوی کہتا ہے کہ میں نے سمجھ لیا کہ ان کی روح ان سے پرواز کر جائے گی۔ اُس وقت آپ اُٹھے تو لوگوں نے کہا اے استاد! تشریف رکھئے! آپ نے فرمایا" اس آیت کریمہ کی ہیبت مجھے بیٹھنے سے روک رہی ہے ـــــ اور کہتے ہیں کہ بعض حضرات نے حضرت جنید رحمۃ اللہ کے سامنے یہ آیت کریمہ "یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ" (اے ایمان والو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں) پڑھی تو حضرت جنیدؒ نے کہا "بار خدایا" اِن قلنا، قلنا بک وان فعلنا، فعلنا بتوفیقک فاین لنا القول والفعل"۔ اگر ہم نے کچھ کہا ہے یا اگر کچھ کام کیا ہے تو صرف تیری توفیق سے ہی کہا اور کیا ہے پھر قول اور فعل ہمارا کہاں ہوا؟) ـــــ اور حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق آتا ہے کہ لوگوں نے آپ کے سامنے "وَاذْكُر رَّبَّكَ إِذَا نَسِيتَ" (اور یاد کر اپنے رب کو جب تو بھول جائے) پڑھا تو آپ نے کہا ذکر کی شرط بھول جانے میں ہے اور سارا جہان اس کے ذکر میں لگا ہوا ہے یہ کہہ کر آپ نے ایک چیخ ماری اور آپ کے ہوش جاتے رہے جب ہوش میں آئے تو فرمایا، میں اُس جان پر حیران ہوں جس نے حق تعالےٰ کا کلام سنا ہے اور پھر روح جسم سے نکل نہیں گئی ـــــ مشائخ میں سے ایک بزرگ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں اللہ تعالےٰ کے کلام کی تلاوت کر رہا تھا" وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ (اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ تعالےٰ کی طرف لوٹائے جاؤ گے) کہ ایک غیبی ہاتف نے آواز دی "بہت آہستہ آواز سے پڑھو کہ اس آیت کی ہیبت سے چار جن مر گئے ہیں ـــــ ایک درویش کہتے ہیں کہ مجھے دس سال ہو گئے ہیں کہ میں نے نماز میں صرف اتنی مقدار میں قرآن پڑھا ہے جس سے نماز جائز ہو جائے اس سے زیادہ میں نے نہ پڑھا ہے اور نہ ہی سنا ہے، لوگوں نے پوچھا "کیوں؟" تو جواب دیا اس ڈر سے کہ وہ

مجھ پر حجت ہو جائے گا ——— ایک دن میں حضرت شیخ ابوالعباس شقانی کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ کو یہ آیت کریمہ تلاوت کرتے ہوئے پایا" ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ " (اللہ تعالےٰ نے ایک ایسے غلام کی مثال بیان کی ہے جو دوسرے کا مملوک ہو اور کسی چیز پر قادر نہ ہو) یہ پڑھ کر آپ رونے لگے اور چیخ مار کر بیہوش ہو گئے۔ میں نے سمجھا کہ دنیا سے کوچ کر گئے ہیں، میں نے کہا "اے شیخ! یہ کیا حالت ہے؟ آپ نے جواب دیا" گیارہ سال سے میرا ورد ابھی تک یہاں پہنچا ہے اور اس جگہ سے آگے گزرنے کی مجھ میں طاقت نہیں ——— حضرت ابوالعباس عطاؒ سے لوگوں نے پوچھا کہ شیخ آپ ہر روز کتنا قرآن مجید پڑھ لیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا" اس سے پہلے تو رات دن میں دو دفعہ قرآن مکمل پڑھ لیتا تھا لیکن اب چودہ سال ہو گئے ہیں کہ ابھی سورہ انفال تک آج پہنچا ہوں" ——— کہتے ہیں کہ حضرت ابوالعباسؒ نے ایک قاری سے کہا کہ پڑھو! اس نے پڑھا" يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ " (اے عزیز مصر! ہمیں اور ہمارے خاندان والوں کو سخت تکلیف نے چھوا ہے اور ہم حقیر سی پونجی غلہ لینے کے لئے لائے ہیں) آپ نے پھر فرمایا" پڑھو! اس نے پڑھا" قَالُوْۤا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ "۔ (کہنے لگے اگر اس نے چوری کی ہے تو بے شک اس کا بھائی بھی اس سے قبل چوری کر چکا ہے) آپ نے پھر فرمایا" اور پڑھو"! اس نے پڑھا " لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ " (آج تم پر کوئی ملامت نہیں اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت کر دے) اب آپ نے دعا کی" بار خدایا میں جفا میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں سے بڑھ کر ہوں اور آپ کرم کے لحاظ سے حضرت یوسف علیہ السلام سے بڑھ کر ہیں۔ میرے ساتھ وہ معاملہ کیجئے گا جو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے ظالم بھائیوں سے کہا تھا" ـــ اور اس سب کچھ کے باوجود تمام اہل اسلام خواہ فرمانبردار ہوں یا نافرمان قرآن مجید کو غور سے سننے کا انہیں حکم دیا گیا ہے کہ حق تعالےٰ نے فرمایا ہے" وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ " (اور جب قرآن پڑھا جائے تو خوب غور سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے) یعنی جب کوئی قرآن مجید کی

تلاوت کر رہا ہو تو اُس کو خاموشی کے ساتھ غور سے سننے کا حکم دیا ہے اور نیز فرمایا ہے "فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ"۔ (پس خوشخبری دیجئے اُن کو جو ہمارا کلام توجہ سے سنتے ہیں پھر اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں) یعنی اُس کے احکام پر عمل کرتے ہیں اور اُس کو تعظیم کے ساتھ سُنتے ہیں۔ نیز فرمایا ہے "اَلَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ"۔ (وہ لوگ کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے تو اُن کے دل خوف زدہ ہو جاتے ہیں) یعنی قرآن کو توجہ سے سننے والوں کے دل پر حق تعالیٰ کا خوف طاری ہو جاتا ہے نیز فرمایا ہے "اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ"۔ (جو لوگ ایمان لائے اور اُن کے دل اللہ کے ذکر کے ساتھ مطمئن ہوتے ہیں آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے اور اس جیسی اور بہت سی آیات ہیں جو اس بات کے حکم کی تاکید کرتی ہیں۔ اور پھر اس کے برعکس اُن لوگوں کے لئے ملامت آئی ہے جو کلام الٰہی کو اس طرح نہیں سنتے جیسے اس کو سننے کا حق ہے اور کانوں سے دل کی طرف اُسے راہ نہیں دیتے اور اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ"۔ (اللہ تعالےٰ نے اُن کے دلوں پر اور اُن کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ہے) یعنی اُن کے سننے والے عضو پر مہر لگا دی ہے۔ نیز حق تعالےٰ نے بیان کیا ہے کہ دوزخ والے قیامت کے دن کہیں گے "لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ"۔ (اگر ہم حق کے ساتھ قرآن کو سنتے اور سمجھتے تو ہم جہنم والوں میں نہ ہوتے) اور اللہ تعالےٰ نے بیان فرمایا ہے کہ "وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا" (اور ان میں سے بعض آپ کی طرف توجہ سے سنتے ہیں اور ہم نے ان کے دلوں پر پردہ ڈال رکھا ہے کہ وہ اُسے سمجھ سکیں اور اُن کے کانوں میں بوجھ ہے) یعنی ایک گروہ ایسا بھی ہے کہ آپ سے قرآن سنتے ہیں لیکن اُن کے دلوں پر حجاب ہوتا ہے اُن کے کانوں میں بہرہ پن ہوتا ہے گویا وہ اس طرح ہوتے ہیں جیسے اُنہوں نے سُنا ہی نہیں، اور نیز اللہ تعالےٰ

کا ارشاد گرامی ہے " وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ " (اور تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو کہتے ہیں کہ ہم نے سنا حالانکہ وہ نہیں سنتے) یعنی شکایت کے طور پر کہتے ہیں کہ اس گروہ کی طرح نہ ہو جاؤ جو کہتا ہے کہ ہم نے اس قرآن مجید کو سُنا ہے لیکن وہ نہیں سنتے۔ یعنی سنتے تو ہیں لیکن دل سے نہیں صرف کانوں سے سنتے ہیں۔ اور اس طرح کی بہت سی آیتیں اللہ تعالےٰ کی کتاب میں موجود ہیں۔ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق احادیث میں آتا ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا " اِقْرَأْ عَلَيَّ فَقَالَ أَنَا أَقْرَأُهُ عَلَيْكَ وَعَلَيْكَ أُنْزِلَ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم إِنِّي أُحِبُّ أَنْ أَسْمَعَهُ مِنْ غَيْرِي " (مجھے قرآن کی تلاوت سناؤ! تو انہوں نے عرض کی " کیا میں آپ کے سامنے قرآن پڑھوں گا حالانکہ آپ پر وہ نازل کیا گیا ہے ؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " ہاں " میں اس چیز کو پسند کرتا ہوں کہ میں قرآن کا اپنے علاوہ دوسرے سے سماع کروں) یہ اس بات کی بڑی واضح دلیل ہے کہ قرآن سننے والے کا حال پڑھنے والے سے زیادہ کامل ہوتا ہے کہ آپ نے فرمایا " میں اس بات کو زیادہ محبوب رکھتا ہوں کہ اپنے علاوہ کسی سے اس کی تلاوت سنوں "۔ اس لئے کہ قاری یا تو حال سے پڑھے گا یا بغیر حال کے لیکن سننے والا حال کے بغیر نہیں سنتا کیوں کہ پڑھنے میں ایک طرح کا تکبر ہوتا ہے جب کہ سننے میں ایک طرح کی تواضع ہوتی ہے —— نیز پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ " شَيَّبَتْنِي سُورَةُ هُودٍ " (سورہ ھود کی سماعت نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے) علماء کہتے ہیں کہ یہ اس لئے تھا کہ سورۂ ھود کے آخر میں یہ آیت کریمہ موجود ہے کہ " فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ " (پس آپ اس طرح استقامت پر رہئے جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے) اور انسان حق تعالےٰ کے حکم کے مطابق استقامت کا حق ادا کرنے سے عاجز ہے، کیونکہ انسان اللہ تعالےٰ کی توفیق کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا پس جب آپ نے " فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ " کا حکم سنا تو آپ سخت حیران ہو گئے اور فرمایا " یہ کس طرح ہو سکے گا کہ میں اس حکم کے مطابق عمل کر سکوں " چنانچہ اسی رنج کی وجہ سے آپ کی قوت جاتی رہی اور دن بدن یہ غم بڑھتا ہی گیا یہاں تک کہ ایک دن اپنے گھر اُٹھ کر کھڑے ہونے لگے تو دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر زور لگا کر کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ حضرت

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کیا حال ہے، آپ تو ابھی جوان اور تندرست ہیں" آپ نے فرمایا "سورہ ہود نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔ یعنی اس کے سماع نے میرے دل پر اس قدر زور پڑا ہے کہ میری قوت ساقط ہوگئی ہے۔

صحابہ کرام میں سے ایک بزرگ صحابی حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ وعنہم روایت کرتے ہیں کہ "کنت فی عصابۃ فیھا ضعفاء المھاجرین وان بعضھم لیستتر بعضاً من العری وقاری یقرا علینا ونحن نستمع القراۃ قال فجاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی قام علینا فلما راٰہ القاری سکت۔ قال فسلم فقال ماذا تصنعون قلنا کان قاری یقرأ علینا ونحن نستمع بقرأتہ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم الحمد للہ الذی جعل فی امتہ من امرت ان اصبر نفسی معھم قال ثم جلس وسطنا لیعدل نفسہ فینا ثم قال نکانوا ضعفاء المھاجرین فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ابشروا صعالیک المھاجرین بالفوز التام یوم القیمۃ تدخلون الجنۃ قبل المنیاء کم بنصف یوم کان مقدارہ خمس مائۃ عام" (میں ایک جماعت میں بیٹھا تھا جس میں کمزور مہاجرین تھے اور برہنگی کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو پردہ کئے ہوئے تھے اور ایک قاری ہم پر تلاوت قرآن مجید کر رہا تھا اور ہم سن رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لے آئے اور ہمارے سروں پر کھڑے ہوگئے جب قاری نے آپ کو دیکھا تو وہ خاموش ہوگیا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سلام کہا اور پوچھا "تم لوگ کس کام میں مصروف تھے؟" میں نے عرض کی "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، قاری، تلاوت کر رہا تھا اور ہم اُس کی قرأت کا سماع کر رہے تھے" اب حضور علیہ السلام نے فرمایا "اُس ذاتِ باری تعالیٰ کا شکر ہے جس نے میری اُمت میں ایسے لوگ پیدا کئے ہیں جن کی صحبت میں بیٹھنے اور اُن کے ساتھ صبر کرنے کا مجھے حکم دیا گیا ہے، پھر آپ ہمارے بالکل درمیان میں اس طرح بیٹھ گئے کہ اپنے آپ کو ہم میں سے ہر ایک کے برابر کر لیا پھر ہمیں اپنے ہاتھ سے یوں اشارہ کیا تو سب نے آپ کے

اردگرد حلقہ بنالیا کہ اس وقت کوئی شخص ہم میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان نہ سکتا تھا گویا کہ یہ سب کمزور مہاجر ہی تھے، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے درویش مہاجرو! تمہیں قیامت کے دن پوری پوری کامیابی کی بشارت ہو کہ تم مالداروں سے نصف دن پہلے جنت میں داخل ہو گے۔ جس دن کی مقدار پانچ سو سال جتنی ہو گی) اس حدیث کو چند طریقوں سے مختلف الفاظ میں روایت کیا گیا ہے تاہم یہ اختلاف صرف الفاظ میں ہے معنی تمام طرقِ روایت کا ایک ہی ہے اور بالکل درست ہے ــــــــ

فصل

حضرت زرارۃ بن ابی اوفیٰ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابہ رضوان اللہ علیہم میں سے تھے۔ ایک دفعہ آپ نماز میں لوگوں کی امامت کرا رہے تھے کہ ایک آیت کریمہ پڑھی اور اس کی ہیبت و جلال کی وجہ سے ایک نعرہ بلند کیا اور جان دے دی ــــــ حضرت ابوجعفر رحمۃ اللہ علیہ بزرگ تابعین رحمہم اللہ اجمعین میں سے ایک تھے۔ ایک دفعہ حضرت صالح مری رحمۃ اللہ نے ان کے سامنے ایک آیت تلاوت کی تو اُن کے اندر سے ایک آواز بلند ہوئی اور وہ دنیا سے رخصت ہو گئے ــــــ حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ روایت بیان کرتے ہیں کہ میں کوفہ کے دیہاتوں میں سے ایک گاؤں میں گیا تو وہاں ایک بزرگ عورت کو دیکھا جو نماز میں کھڑی تھی اور اس پر نیکی کے آثار ظاہر تھے۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئی تو میں نے تبرک کے طور پر اُسے سلام کیا وہ مجھے کہنے لگی"

کیا تم قرآن جانتے ہو؟ میں نے کہا "ہاں"! کہنے لگی "تو پھر کوئی آیت پڑھو"! میں نے ایک آیت کی تلاوت کی تو سن کر اس نے ایک چیخ لگائی اور جان حق تعالےٰ کے حضور پیش کر دی۔

اور حضرت احمد بن ابی الحواری رحمۃ اللہ علیہ روایت بیان کرتے ہیں کہ میں نے جنگل میں ایک نوجوان کھردری گدڑی پہنے ہوئے دیکھا جو ایک کنوئیں کے کنارے کھڑا تھا۔ مجھے (دیکھ کر) کہنے لگا "اے احمد! بڑے وقت پر آئے ہو کہ مجھے سماع کی طلب ہو رہی ہے تاکہ میں جان دے دوں۔ کسی آیت کریمہ کی تلاوت تو کرو"! حضرت احمدؒ کہتے ہیں کہ حق تعالےٰ نے

مجھے الہام کیا اور میں نے یہ آیت کریمہ تلاوت کی۔" اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر ڈٹے رہے) آیت کریمہ سُنکر وہ جوان کہنے لگا " اے احمد! رب کعبہ کی قسم! تم نے وہی آیت پڑھی ہے جو اسی وقت مجھ پر ایک فرشتے نے پڑھی ہے اور اسی حال میں جان دے دی —— اگر اس معنی اور مضمون سے وابستہ تمام حکایات کو بیان کروں تو میرا مقصد فوت ہو جائے گا۔ وباللہ التوفیق۔

شعر کا سماع

شعر کا سننا مباح ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اشعار سُنے ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہے بھی ہیں اور سُنے بھی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا " اِنَّ من الشعرِ لحکمۃً "۔ (بے شک بعض شعر حکمت ہیں) نیز فرمایا ہے الحکمۃ ضالّۃُ المؤمنِ حَیْثُ وَجَدَھَا فَھُوَ احقُّ بِھَا " (دانائی، مومن کی گم شدہ میراث ہے جہاں اُسے پائے وہی اس کا زیادہ حقدار ہے) شعر سے مراد وہ شعر ہے جس میں دانائی ہو اور حکمت مومن کی کھوئی ہوئی چیز ہے جو اس سے غائب ہے جہاں بھی اُس کو پائے وہی اس کا زیادہ مستحق ہے نیز پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ " اصدق کلمۃٍ قالتھا العرب قولُ لبیدٍ "۔ (سب سے سچا کلمہ جو کسی عرب نے کہا ہے وہ لبید شاعر کا شعر ہے :۔

اَلَا کُلُّ شیءٍ مَا خَلَا اللّٰہُ بَاطِلٌ
وَکُلُّ نعیمٍ لَا محالۃَ زائلٌ

(آگاہ رہو کہ اللہ تعالےٰ کے علاوہ ہر شئی باطل ہے اور اس کے سوا ہر ایک نعمت بہر حال زائل ہونے والی ہے)

اور حضرت عمرو بن الشرید رضی اللہ عنہما اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ " قال اُسْتُنْشِدَ فِی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ھَلْ تروی مِنْ شعرِ امیۃ ابن ابی

الصلت شیئاً فانشدته مائۃ قافیۃ فجعلت کلما مررت علی بیت قال هیہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یسلم فی شعرہ"

کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے شعر پڑھنے کا کہتے ہوئے کہا کیا تم امیہ بن ابی صلت کے اشعار میں سے کچھ سنا سکتے ہو؟ پس میں نے سو اشعار پڑھے ہر شعر کے اختتام پر آپ فرماتے "اور پڑھو" پھر آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ امیہ شعروں کی حد تک تو مسلمان تھا) اس طرح کی حضور علیہ السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بہت سی روایات آتی ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ شعر کہتے بھی تھے ۔ لیکن لوگوں نے اس معاملے میں غلط روش اختیار کی ہے کہ کچھ لوگ تو ہر قسم کے اشعار سننے کو حرام کہتے ہیں اور دن رات مسلمانوں کی غیبت کرتے رہتے ہیں اور کچھ لوگ ہر قسم کے اشعار کو حلال کہتے ہیں اور دن، رات غزلوں میں محبوب کے حسن کی تقریب اور زلف و خال کی باتیں سنتے رہتے ہیں اور اس معاملے میں ایک دوسرے کے خلاف دلائل بیان کرتے رہتے ہیں، میری مراد اُن کے اقوال کی تائید یا تردید یا اُن کے سماع کی حمایت و مخالفت نہیں ـــــــ لیکن مشائخ تصوف رحمہم اللہ کا اس بارے میں انداز وہ ہے جو کہ صحابہؓ کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اشعار کے بارے استفسار پر حضور علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ "کلام حسنہ حسنٌ و قبیحہ قبیحٌ" (شعر ایک ایسا کلام ہے جس کا اچھا اچھا ہے اور برا، برا ـــ) یعنی جو کچھ نثر میں سننا حلال ہے مثلاً دانائی، وعظ و نصیحت، حق تعالیٰ کی نشانیوں میں استدلال اور مظاہر قدرت میں غور و فکر، تو یہ نظم میں بھی حلال ہے، خلاصہ کلام یہ کہ جس طرح اُس حُسن و جمال کو دیکھنا جو آفت میں ڈال دے، حرام اور ممنوع ہے اس کو نظم اور نثر میں سننا حرام و ممنوع ہے اور اسی طرح اس کی صفت کو اس انداز میں سننا بھی حرام و ممنوع ہے۔ اور جو شخص اس چیز کو مطلقاً حلال کہتا ہے۔ دیکھنے اور سننے کو بھی حلال کہنا چاہتا ہے تو یہ کفر اور بے دینی ہے اور جو کوئی یہ کہتا ہے کہ "میں تو محبوب کی آنکھ، خد و خال اور زلف وغیرہ تمام چیزوں میں حق کو ہی سنتا ہوں اور حق کو ہی طلب کرتا ہوں تو اس سے تو لازم آتا ہے کہ یہ دوسر

آدمی سے کہے کہ میں اس لئے ایک آدمی کو دیکھنا جائز سمجھتا ہوں کہ کوئی دوسرا اس کی صفات سننے کو جائز سمجھتا ہے اور دوسرا محض اس بنیاد پر اس کو دیکھنا روا سمجھتا ہو اور کہتا ہو کہ میں تو اس میں حق کو ہی تلاش کرتا ہوں۔ اور کہے کہ کسی معنی کے ادراک کے لئے ایک طرح چاہنا۔ دوسری طرح چاہنے سے زیادہ بہتر تو نہیں ہوتا۔ یوں تو تمام کی تمام شریعت باطل ہو جائے گی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کہ "العینان تزنیان" (آنکھیں زنا کرتی ہیں) کا حکم بھی اٹھ جائے گا۔ اور نامحرم کے کسی غیر محرم کو چھونے کی ملامت بھی ختم ہو جائے گی اور شرعی حدود بھی تمام کی تمام ساقط ہو جائیں گی اور یہ بڑی واضح گمراہی ہے — جب جاہل اور نام نہاد صوفیوں نے حال میں مستغرق سماع کرنے والوں صوفیوں کو دیکھا کہ وہ سماع کر رہے ہیں تو انہوں نے ان کے حال سے یہ سمجھا کہ وہ نفسانی خواہش سے سماع کر رہے ہیں، چنانچہ جب اُن کو اس حالت میں دیکھا تو کہنے لگے کہ سماع حلال ہے کہ اگر حلال نہ ہوتا تو یہ حضرات بھی نہ کرتے، اس طرح ان جاہل صوفیوں نے اُن کی تقلید کی اور ظاہر کو اختیار کر کے باطن کو چھوڑ دیا حتیٰ کہ خود بھی ہلاک ہوئے اور ایک پوری قوم کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اور یہ اس زمانہ کی آفات میں سے ایک ہے۔ اور میں انشاء اللہ اس کی شرح اپنی جگہ پر پوری طرح بیان کروں گا وباللہ التوفیق

اچھی آواز کا سماع

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ زینوا اصواتکم بالقرآن (اپنی آوازوں کی تلاوتِ قرآن سے آرائش کرو) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یزید فی الخلق ما یشاء" (اللہ تعالیٰ خلقت میں جو چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے) مفسرین کرام کہتے ہیں کہ اس سے مراد آواز کا حُسن ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ مَنْ اراد ان یسمع صوت داؤد فلیسمع صوت ابی موسیٰ الاشعری (جو آدمی حضرت داؤد علیہ السلام کی آواز سننا چاہتا ہو وہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی کی آواز سُن لے) اور احادیث میں مشہور ہے کہ جنت میں جنتیوں کو سماع حاصل ہوگا اور وہ اس طرح ہوگا کہ ہر درخت سے

ایک مختلف نوعیت کی خوبصورت آواز آئے گی اور جب مختلف قسم کی آوازیں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مل جاتی ہیں تو طبیعت کو اُن سے بڑی لذت اور نشاط حاصل ہوتا اور سماع کی یہ قسم انسانوں اور دوسری جاندار مخلوقات میں عام ہے کیوں کہ روح ایک لطیف چیز ہے اور خوش الحانی میں بھی ایک ایسی لطافت ہے کہ جب روحیں اس کو سنتی ہیں تو جنس اپنی جنس کی طرف مائل ہوتی ہے میں نے جو بیان کیا یہ تو اطباء کے ایک گروہ کا قول ہے لیکن اہل علم میں سے جو لوگ تحقیق کے مدعی ہیں اس بارے میں ان کا کلام بھی بہت ہے انہوں نے تو خوش آوازی کی تالیف و ترکیب سے متعلق کتابیں لکھی ہیں اور اس علم کو بڑی عظمت دی ہے اور اُن کے اس فن کے اثرات تو آلاتِ موسیقی میں ظاہر ہیں جو انہوں نے نفسانی خواہشات کی تقویت اور لہو و لعب کے لئے شیطان کی موافقت و پیروی میں بنائے ہیں حتیٰ کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اسحاق موصلی ایک باغ میں راگ گا رہے تھے اور ایک بُلبل بھی نغمہ سرا تھی۔ بُلبل اسحاق موصلی کے راگ کی لذت سے خاموش ہو گئی اور سماع کرتی رہی یہاں تک اس میں مست ہو کر درخت سے گری اور وہیں مر گئی ——— میں نے ان لوگوں کی بیان کردہ حکایتیں تو بہت سنی ہی ہیں لیکن میری مراد اُن کے اقوال سے بالکل مختلف ہے کہ طبیعتوں کی ترکیب کی تمام راحتیں۔ آوازوں اور خوش الحانی کی ترکیب سے ہیں ——— حضرت ابراہیم خواصؒ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں عرب کے قبائل میں سے ایک قبیلہ میں پہنچا اور ایک امیر کے مہمان خانے پر نزول کیا۔ میں نے وہاں ایک حبشی غلام کو دیکھا جو طوق اور زنجیروں میں جکڑا ہوا خیمے کے دروازے پر دھوپ میں پڑا ہوا ہے۔ میرے دل میں اس کے لئے بڑی شفقت پیدا ہوئی اور میں نے ارادہ کر لیا کہ اُس کو امیر سے سفارش کر کے لے لوں گا۔ چنانچہ جب وہ کھانا میرے سامنے لائے تو مہمان کی تکریم کے طور پر امیر بھی ساتھ آیا تا کہ کھانے میں میرے ساتھ موافقت کرے۔ جب اُس امیر نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں نے کھانے سے انکار کر دیا۔ اور عربوں پر اس سے زیادہ سخت کوئی بات نہیں ہوتی کہ کوئی اُن کے کھانے سے انکار کر دے۔ امیر کہنے لگا۔ اے جوانمرد!

میرا کھانا کھانے سے کونسی چیز تمہیں روک رہی ہے؟ میں نے کہا" میں آپ کے ایک احسان کی آپ سے امید رکھتا ہوں"۔ اُس نے کہا، میری تمام املاک تمہارے لئے حاضر ہیں بس تم میرا کھانا کھاؤ! میں نے کہا" مجھے آپ کی املاک کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس غلام کو میرے کام کے لئے مقرر کر دیجئے! اُس نے کہا" تم پہلے اس کا جرم تو مجھ سے پوچھ لو پھر بے شک اس کو چھڑا لینا کہ تمہیں میری تمام املاک پر مہمان ہونے کی وجہ سے تصرف حاصل ہے" میں نے کہا" تو پھر بتائیے اس کا جرم کیا ہے؟ اس نے بیان کیا کہ "تمہیں معلوم ہو کہ یہ غلام بڑا اچھا حدی خوان اور خوش آواز ہے، میں نے اس کو چند اونٹ دے کر اپنی جاگیر پر بھیجا تاکہ یہ وہاں سے غلّہ لادلائے، اس نے ہر اونٹ پر دو دو اونٹوں کا بوجھ لاد دیا اور راستے میں حدی خوانی کرتا رہا اور اونٹ تیزی سے دوڑتے رہے یہاں تک کہ تھوڑے سے وقت میں میرے کہے ہوئے بوجھ سے دوگنا غلّہ لے کر یہاں پہنچ گیا۔ اور جب اونٹوں سے بوجھ اتارا گیا تو سب اونٹ ایک ایک کر کے ہلاک ہو گئے!" حضرت ابراہیم خواصؒ کہتے ہیں کہ مجھے یہ سُن کر بڑا تعجب ہوا۔ میں نے کہا" اے امیر! آپ کی شرافت آپ کو غلط بیانی کی ہرگز اجازت نہیں دیتی تاہم مجھے اس بیان پر کوئی دلیل چاہیئے! ہم ابھی اسی گفتگو میں ہی مصروف تھے کہ چند اونٹ جنگل سے کنوئیں پر پانی پلانے کے لئے لائے گئے۔ امیر نے اُن شتربانوں سے پوچھا کہ تمہارے ان اونٹوں نے کتنے دن سے پانی نہیں پیا ہے؟ انہوں نے کہا" تین روز سے" امیر نے اُس غلام کو حکم دیا تو اُس نے حدی خوانی کی آواز نکالنی شروع کی۔ اونٹ اُس کی حدی خوانی اور خوش آوازی میں اس طرح مست ہو گئے کہ کسی نے بھی پانی کی طرف منہ تک نہ کیا۔ حتیٰ کہ ایک ایک کر کے اچانک بھاگ اُٹھے اور جنگل میں جا کر منتشر ہو گئے پھر امیر نے اُس غلام کو کھول کر مجھے بخش دیا ___ اور ہم نے بعض اوقات خود مشاہدہ کیا ہے کہ دورانِ سفر جب شتربان اور گدھوں والا ترنم سے آوازیں لگاتا ہے تو اونٹ اور گدھے سرور میں آجاتے ہیں۔ خراسان اور عراق کے علاقوں میں عادت ہے کہ شکاری لوگ رات کے وقت ہرن پکڑتے ہیں اور وہ اس طرح کہ وہ ایک طشت بجاتے

ہیں کہ جب تک ہرن اُس کی آواز سنتے رہتے ہیں اپنی جگہ پر کھڑے رہتے ہیں۔ اور شکاری اُن کو پکڑ لیتے ہیں ــــ اور مشہور ہے کہ ہندوستان میں ایک گروہ ہے وہ لوگ جنگل میں جاتے ہیں اور سُریلی آوازوں میں ان گیتوں کی لذت سے ہرن اپنی آنکھیں بند کر لیتے اور پھر سو جاتے ہیں اور یہ لوگ اُن کو پکڑ لیتے ہیں۔ چھوٹے بچوں میں بھی یہ بات ظاہر ہے کہ جب وہ جھولے میں رونے لگتے ہیں تو کوئی شخص انہیں لوری دیتا ہے اور وہ خاموش ہو جاتے اور وہ سُریلی آواز سننے لگتے ہیں۔ طبیب لوگ ان بچوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کی حس بالکل درست ہے اور یہ بڑے ہی ذیرک اور دانشمند ثابت ہوں گے ــــــ یہی وجہ ہے کہ ملک عجم کا ایک بادشاہ فوت ہو گیا اور اس کا ایک ہی بچہ تھا جس کی عمر دو سال تھی وزراء نے اُس کو تخت پر بٹھانے کا فیصلہ کیا اور اس سلسلے میں حکیم بوذر جمہر سے مشورہ کیا اس نے کہا یہ فیصلہ تو درست ہے لیکن یہ تو دیکھنا چاہیے کہ اس کی حس بھی درست ہے تاکہ اس سے کوئی امید وابستہ کی جائے یا نہیں انہوں نے پوچھا کہ اس کی تدبیر کیا ہو؟ اس نے حکم دیا اور چند گانے والوں نے اُس کے سرہانے گیت گانا شروع کر دئیے تو وہ بچہ گیت سُن کر سرور میں آ گیا اور ہاتھ پاؤں ہلانے شروع کر دئیے۔ بوذر جمہر نے کہا ہاں اس سے بادشاہ بننے پر ملک کو صحیح چلانے کی امید کی جا سکتی ہے ــــ اور اچھی آوازوں کی تاثیر عقلاء کے نزدیک اس قدر ظاہر ہے کہ اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں اور جو شخص یہ کہے کہ مجھے سرود، سُریلی آواز اور مزاحیہ اچھے نہیں لگتے تو وہ یا تو جھوٹ اور منافقت کی بنیاد پر کہتا ہے یا پھر وہ حس نہیں رکھتا اور انسانوں کے تمام طبقات اور صوفیوں سے باہر ہے۔ جو گروہ اس چیز سے منع کرتا ہے وہ اللہ تعالےٰ کے حکم کی رعایت کرتے ہوئے اس سے منع کرتا ہے تاہم تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ جب لہو و لعب کے آلات نہ ہوں اور اُس خوش الحانی کو سننے سے دل میں بدکاری اور گناہ کا کوئی جذبہ پیدا نہ ہو تو اُس کا سُننا مباح ہے اور اس اباحت پر وہ بہت سی روایات اور احادیث بیان کرتے ہیں چنانچہ وہ سیدہ عائشہ صدیقہ سلام اللہ علیہا سے روایت لاتے ہیں کہ قالت کانت

عندی جاریۃ تغنی فاستاذن عمر فلما احستہ و سمعت حسہ فرت فلما دخل عمر تبسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال لہ عمر ما اضحکک یا رسول اللہ قال کانت عندنا جاریۃ تغنی فلما سمعت حسک فرت فقال عمر لا ابرح حتی اسمع ما کان سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فدعا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و سمع ' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میرے پاس ایک لونڈی گیت گا رہی تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اندر آنے کی اجازت طلب کی، جب اُس لونڈی کو اُن کے آنے کا احساس ہوا اور اُن کی آہٹ سُنی تو وہ بھاگ گئی۔ پس جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اندر داخل ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو کس چیز نے ہنسایا ہے ؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا؟ ہمارے پاس ایک لونڈی تھی جو کچھ گا رہی تھی لیکن جب اُس نے تمہاری آہٹ سنی تو وہ بھاگ گئی ہے. تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی " میں تو اس وقت تک یہاں سے نہ جاؤں گا جب تک وہ کچھ سُن نہ لوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سُن رہے تھے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس لونڈی کو بلایا اور اُنہوں نے اس سے گیت سُنا) اور بہت سے صحابہؓ سے بھی اس طرح کی روایات بیان کی ہیں۔ اور شیخ ابو عبدالرحمٰن السلمیؒ نے ان سب روایات کو اپنی تصنیف " کتاب السماع " میں جمع کر دیا ہے اور اس کی اباحت کو قطعی بنا دیا ہے۔ لیکن مشائخ تصوف کے ہاں سماع سے مراد اس مباح سماع کے علاوہ وہ سماع ہے جس سے اعمال میں فائدہ حاصل ہو کیوں کہ محض اباحت کو تلاش کرنا تو عوام کا کام ہے۔ عقلمند اور مکلّف بندوں کو تو ایسے کاموں کے درپے ہونا چاہیئے جن سے کوئی فائدہ حاصل ہو ——— ایک دفعہ میں مرو میں تھا کہ ائمہ اہلحدیث میں سے ایک نے جو اُن میں سے بہت مشہور تھا۔ مجھ سے کہا کہ " میں نے سماع کی اباحت میں ایک کتاب تصنیف کی ہے " میں نے کہا " پھر تو دین میں ایک بہت بڑی مصیبت پیدا ہو گئی کہ جناب امام نے ایک ایسے لہو کو حلال کر دیا ہے جو تمام بدکاریوں اور گناہوں کی بنیاد ہے " اُس نے کہا پھر اگر

آپ حلال نہیں سمجھتے تو سماع کرتے کیوں ہیں؟ میں نے جواب دیا" اس کا حکم کئی وجوہ پر ہے کہ کسی ایک چیز پر قطعی فیصلہ نہیں دیا جا سکتا۔ اگر دل میں حلال کام کی تاثیر پیدا ہو تو سماع حلال ہے اور اگر تاثیر حرام ہے تو سماع بھی حرام ہے اور اگر تاثیر مباح ہے تو سماع بھی مباح ہے جس چیز کا ظاہری حکم فسق پر ہو لیکن باطن میں اُس کا حال روشن ہو اُس کی کتنی وجوہ ہیں کہ اس کا اطلاق ایک چیز پر کرنا محال ہوتا ہے۔

سماع کے احکام

جان لو کہ جس طرح دلوں میں ارادے مختلف ہوتے ہیں اسی طرح طبیعتوں میں اختلاف کی وجہ سے سماع کے احکام بھی مختلف ہیں اور یہ ظلم ہو گا کہ کوئی اس کا ایک ہی قطعی حکم بیان کرے ــــــ بہر حال سماع کرنے والے دو طرح کے ہیں ایک وہ جو معنی کو سنتے ہیں اور دوسرے وہ جو صرف الفاظ کا سماع کرتے ہیں اور ان دونوں میں کچھ فائدے بھی ہیں اور کچھ نقصان بھی، اس لئے کہ سُریلی آوازوں کے سننے میں غلبہ اُس چیز کا ہوتا ہے جو اس آدمی کی طبیعت میں ودیعت کیا گیا ہے اگر وہ طبعی جذبہ حق ہے تو سماع حق ہو گا اور اگر وہ باطل ہے تو یہ بھی باطل ہو گا اگر کسی شخص کی طبیعت میں سرمایہ ہی فساد کا ہے تو وہ جو کچھ بھی سُن لے سب فساد ہی ہو گا۔ اور یہ تمام معانی حضرت داؤد علیہ السلام کی حکایات میں آتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے جب اُن کو اپنا خلیفہ بنایا تو اُن کو بڑی خوبصورت آواز دی اور اُن کے گلے کو مزامیر (ساز) بنا دیا۔ پہاڑوں کو آپ کے ترنم کو بکھیرنے کا ذریعہ بنا دیا حتیٰ کہ وحشی جانور اور پرندے، پہاڑوں اور صحراؤں سے آپ کی آواز سننے کے لئے دوڑتے چلے آتے بہتا ہوا پانی رُک جاتا اور پرندے فضاء میں بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑتے تھے روایات میں آتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام جب جنگل میں اپنی خوش الحانی کا جادو جگاتے اس صحرا میں رہنے والے جانور ایک ماہ تک کچھ نہ کھاتے۔ بچے نہ روتے نہ دودھ مانگتے اور جب لوگ اُس جگہ سے واپس لوٹتے تو بہت سے آدمی آپ کے کلام خوش الحانی اور سُریلی آواز کی لذت سے مر چکے ہوتے یہاں تک کہ کہتے ہیں۔ ایک دفعہ سات سو

لڑکیاں شمار کی گئیں جو مر چکی تھیں اور بارہ ہزار بوڑھے بھی مر چکے تھے ——— پھر جب حق تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ محض اچھی آوازوں کا سماع اور خواہش طبیعت کا اتباع کرنے والوں کو اہل حق اور معانی و حقیقت کا سماع کرنے والوں سے جُدا کر دیں تو ابلیس کا طبعی اضطراب قوت پکڑ گیا اور انسان کے دل میں وسوسہ ڈالنے کا ارادہ اُس کے دل میں پیدا ہو گیا اور اُس نے لوگوں کے ساتھ اپنے حیلے ظاہر کرنے کی درخواست کی جو منظور ہو گئی چنانچہ اُس نے ایک بنسری اور ایک طنبور بنا لیا اور حضرت داؤد علیہ السلام کی مجلس سماع کے بالکل سامنے اس نے ایک مجلس جمالی۔ اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام کی مترنم آواز سننے والے دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروہ بدبخت لوگوں کا اور دوسرا سعادت مند لوگوں کا! بدبخت لوگوں کا ٹولہ تو ابلیس کے آلاتِ موسیقی کی طرف مائل ہو گیا اور سعادت مند لوگوں کی جماعت حضرت داؤد علیہ السلام کی خوبصورت آواز کے ساتھ موجود رہی۔ پھر اُن میں سے جو لوگ اہل معنی تھے اُن کے پیش نظر حضرت داؤد علیہ السلام کی آواز نہ تھی بلکہ وہ تو سب کچھ حق کو ہی دیکھتے تھے کہ اگر وہ ابلیس کے مزامیر سنتے تو ان میں انہیں حق سے ایک آزمائش نظر آئی اور اگر حضرت داؤد علیہ السلام کی خوبصورت آواز سنتے تو اس میں حق تعالیٰ کی طرف سے ہدایت جانتے یہاں تک کہ وہ تمام سے کنارہ کش اور اس کے متعلقات سے روگردان ہو گئے اور ان میں سے ہر ایک کی حقیقت یعنی صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط دیکھ لیا۔ پس جس شخص کا سماع اس طرح کا ہو وہ جو کچھ بھی سُنے سب حلال ہے ——— تصوف کے مدعی لوگوں میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ ہمارے لئے تو سماع اُس کے برخلاف واقع ہوتا ہے جیسا کہ وہ حقیقت میں ہے لیکن یہ محال ہے کیوں کہ ولایت کا کمال یہ ہے کہ ہر چیز کو بالکل اُسی طرح دیکھو جس طرح حقیقت میں وہ ہے تاکہ دیکھنا درست ہو اگر اُس کی حقیقت کے برخلاف دیکھتے ہو تو تمہارا دیکھنا ہی درست نہیں ——— کیا تم نے نہیں دیکھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللّٰھُمَّ اَرِنَا حَقَائِقَ الْاَشْیَاءِ کَمَا ھِیَ" (اے اللہ! تو ہمیں تمام چیزوں کی حقیقت اس طرح دکھا جس طرح کی وہ ہیں) جب چیزوں کو صحیح دیکھنا ہے کہ تم اُن کو اُسی صفت پر دیکھو جس پر وہ حقیقت میں ہیں تو پھر سماع بھی صرف وہی درست

اُن کے مرید کہیں مصیبت اور گمراہی میں مبتلا نہ ہو جائیں، اور اُن کی تقلید کرتے ہوئے کہیں توبہ کا خیال چھوڑ کر معصیت کے مرتکب نہ ہونے لگیں، اور نفسانی خواہش اُن کے اندر قوت نہ پکڑلے اور کہیں ہوس رانی کا ارادہ اُن کی اصلاح اور نیکی کو فسخ نہ کر دے کیوں کہ یہ سماع مصیبتوں میں مبتلا ہونے کا محل اور فتنے کا سرمایہ ہے —— اور حضرت جنیدؒ کے متعلق آیا ہے کہ آپ نے اپنے ایک مرید کو اُس کی توبہ کے ابتدائی حال میں فرمایا "اگر تم اپنے دین کی سلامتی چاہتے ہو اور اپنی توبہ کے تقاضے پورے کرنا چاہتے ہو تو صوفی لوگ جو سماع کرتے ہیں اُس سے نفرت کرو اور جب تک تو جوان ہے اپنے آپ کو سماع کا اہل نہ سمجھ اور جب تو بوڑھا ہو جائے تو سماع کرکے جوانوں کے لئے گناہ میں واقع ہو جانے کا سبب نہ بن —

ایک اور گروہ کا کہنا ہے کہ سماع کرنے والے دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو لاہی (لہو ولعب کرنے والے) ہیں اور دوسرے وہ جو الٰہی (اللہ والے) ہیں۔ لاہی تو عین فتنہ میں ہوتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں جب کہ الٰہی۔ مجاہدات، ریاضات مخلوقات سے دل کو منقطع کرنے اور باطن کو مخفی چیزوں سے بچانے کی بنا پر اپنے آپ کو فتنہ سے دور کئے ہوئے ہیں اور سماع کے نقصانات سے محفوظ ہو چکے ہوتے ہیں، ہم چونکہ نہ اس گروہ سے ہیں نہ اس گروہ سے اس لئے اس کو ترک کرنا ہمارے لئے بہتر اور کسی ایسی چیز میں مشغول ہونا جو ہمارے وقت کے موافق ہو تو بہت زیادہ بہتر ہے —— اور ایک اور گروہ کے حضرات کہتے ہیں کہ جب سماع کرتے ہیں عوام کے لئے فتنہ ہے اور ہمارے سماع کرنے سے لوگوں کے اعتقاد خراب ہوتے ہیں اور ہمارا درجہ بھی لوگوں سے حجاب میں ہے اس لئے وہ ہماری وجہ سے گناہ گار ہو سکتے ہیں تو ہم عوام پر مشقت کرتے ہوئے اور خواص کو نصیحت کرنے کے لئے اور لوگوں کی رعایت کرتے ہوئے سماع سے دست بردار ہوتے ہیں — یہ طریقہ بھی بڑا ہی پسندیدہ ہے — اور ایک اور گروہ کہتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَا لَا یَعْنِیْہِ" آدمی کے اسلام کا حسن یہ ہے

کہ وہ بے فائدہ کاموں کو چھوڑ دے، یعنی جن کاموں سے گریز کیا جا سکتا ہے ہم اُن سے دست بردار ہو جائیں۔ کیوں لایعنی کاموں میں مشغول ہونا وقت کو ضائع کرتا ہے اور دوست اپنے پیارے دوستوں کے ساتھ وقت ضائع نہیں کیا کرتے اور خواص میں سے ایک اور گروہ نے کہا ہے کہ سماع ایک خبر ہے اور مراد کو پا لینا اس کی لذت ہے جب کہ یہ بچوں کا کام ہے کیوں مشاہدہ میں خبر کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ پس مشاہدہ سے غرض ہونی چاہیئے نہ کہ خبر سے ـــــ سماع کے یہ احکام تھے جنہیں میں نے اختصار کے طور یہاں بیان کر دیا ہے۔ اب میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے صوفیہ کے وجد۔ وجود اور تواجد کے بارے میں ایک باب مرتب کرتا ہوں ـــــ

باب

وجد، وجود، تواجد اور اس کے مراتب

جان لو کہ وجد اور وجود دونوں مصدر ہیں ایک غم کے معنی ہیں اور دوسرا کسی چیز کو پا لینے کے معنی ہیں۔ اور ان دونوں کا فاعل ایک جیسا ہوتا ہے فاعل ہیں "وَجَدَ یجد وجوداً" اور وجداناً جب کوئی شخص کسی چیز کو پا لینے والا ہو اور "وَجَدَ یجِدُ وجداً" جب کوئی شخص غمگین ہو، ان دونوں کے درمیان مصدر کے سوا فرق نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح "وَجَدَ یجدُ جدۃً" جب کوئی شخص غنی ہو جائے اور "وَجَدَ یجدُ موجَدۃً" "جب وہ غصے میں ہو" ان سب میں فرق مصدروں کی وجہ سے ہے نہ کہ افعال کی وجہ سے۔ اور وجد اور وجود سے صوفیہ کی مراد وہ دو حال ثابت کرنا ہوتا ہے جو اُن کو سماع کرتے ہوئے ظاہر ہوتے ہیں کہ ایک اِن میں سے غم کے قریب ہوتا ہے اور دوسرا پا لینے سے متعلق ہوتا ہے غم کی حقیقت تو محبوب کا کھو بیٹھنا اور مراد سے محروم ہو جانا ہے۔ جب کہ پا لینے کی حقیقت مراد کا حصول ہے اور حزن الم اور وجد بمعنی غم کے درمیان فرق یہ ہے کہ حزن اس غم و اندوہ کا نام ہے جو اپنے نصیب میں ہو جب کہ وجد اُس غم و اندوہ کا نام ہے جو غیر کے نصیب میں ہو اور یہ محبت کے طور پر ہو۔ اور یہ تمام تبدیلیاں طالب کی صفات ہیں اور "الحق لا یتغیر" (حق بدلنے والی چیز نہیں ہے)۔ اور وجد کی کیفیت الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی اس لئے کہ وہ دیکھنے میں ایک اُلم ہے اور غم و الم کو احاطہ قلم میں نہیں لایا جا سکتا۔ بس وجد طالب اور مطلوب کے درمیان ایک راز ہے کہ کشف کی حالت میں اس کی مقدار تو بیان ہو سکتی ہے لیکن کیفیت کے اعتبار سے اس کو نشان زد اور اس کی طرف اشارہ کرنا درست نہیں اس لئے کہ مشاہدہ کی حالت میں یہ ایک خوشی ہے اور کوئی خوشی طلب کے ذریعہ نہیں پائی جاتی۔ پس وجود

محبوب کی طرف سے محب کے ساتھ ایک فضل ہوتا ہے کہ اس کی حقیقت سے اشارہ زائل ہوتا ہے ۔ اور میرے نزدیک وجد فرحت یا رنج اور تھکاوٹ یا خوشی کی وجہ سے دل کو پہنچنے والے الم کا نام ہے جب کہ وجود دل میں کسی آلے یا ذریعے کی وجہ سے پیدا نہیں ہوتا اور اس کا صادق آنا ہی طالب کی مراد ہوتا ہے اور واجد کی صفت یا حالتِ حجاب میں واقع ہونے والے غلبۂ شوق میں حرکت ہوگی یا پھر کشف کی حالت میں حاصل ہونے والے مشاہدہ کی صورت میں سکون! اِمّا زفیرٌ وَاِمّا نفیرٌ واِمّا حنینٌ واما انینٌ وَامّا عیشٌ وَامّا طیشٌ واما کوبٌ واِمّا طربٌ (یعنی واجد کی صفت یا قرار ہوگا یا بیقراری۔ نالہ ہوگا یا مسکراہٹ۔ عیش ہوگا یا طیش اور کرب ہوگا یا مسرت)۔ مشائخ کا اس معاملے میں اختلاف ہے کہ وجد زیادہ کامل ہے یا وجود! چنانچہ ایک گروہ کہتا ہے کہ وجود مرید کی صفت ہے اور وجد عارفوں کی صفت ہے۔ جب عارفوں کا درجہ مریدوں کے درجہ سے زیادہ بلند ہے تو ہونا یہی چاہیئے کہ عارفوں کا وصف بھی مریدوں کے وصف سے زیادہ بلند تر اور کامل تر ہو۔ اس لئے کہ جو چیز بھی حصول کے تحت آتی ہے وہ مدرک ہوتی ہے۔ اور یہ جنس کی صفت ہے کیوں کہ ادراک کسی نہ کسی حد کا تقاضہ کرتا ہے جب کہ حق تعالیٰ لامحدود ہیں، پس بندے نے جو کچھ بھی حاصل کیا ہو وہ ایک شرب کے سوا کچھ نہیں اور جو کچھ نہیں پایا اُس سے اُس کا طالب بلاتعلق ہوگیا اور اس کی طلب سے عاجز اور حق تعالیٰ کی حقیقت سے محروم ہوگا ۔ اور ایک دوسرا گروہ کہتا ہے کہ وجد مریدوں کا سوز ہے اور وجود محبوں کا تحفہ ہے اور محبوں کا درجہ مریدوں سے بلند ہوتا ہے کیوں کہ طلب میں جلنے کے مقابلے میں تحفے کے ساتھ آرام زیادہ کامل ہوتا ہے۔ اور یہ معنی ایک حکایت کے بغیر واضح نہ ہو سکیں گے اور وہ حکایت یہ ہے کہ ایک دن حضرت شبلی رحمۃ اللہ اپنے حال کے جوش میں حضرت جنید رحمۃ اللہ کے ہاں آئے اور آپ کو اندوہناک حالت میں دیکھا اور پوچھا "اے شیخ! آپ کو کیا ہوا ہے؟" حضرت جنیدؒ نے فرمایا "مَنْ طَلَبَ وَجَدَ" (جس نے طلب کی اس نے پالیا) حضرت شبلی نے فرمایا "لَا بَلْ مَنْ وَجَدَ طَلَبَ (نہیں بلکہ جو غمگین

سوانح قاسمی

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد جب انگریز نے اس خطۂ ارض میں اسلام کے نام لیواؤں کو اپنی سوچ کے مطابق بُری طرح کچل ڈالا۔ تو جن شخصیتوں نے اس روندی ہوئی قوم کو پھر سے اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی جدوجہد کی۔ ان میں مولانا محمد قاسم نانوتوی کی شخصیت سب سے زیادہ اہم ہے انھوں نے ایک ایسی تحریک کو جنم دیا جس نے نہ صرف مذہبی اعتبار سے مسلمانوں کو اسلام کی صحیح تعلیمات سے روشناس کرایا۔ ان تعلیمات سے ہندو معاشرے کی ڈالی ہوئی گرد کو صاف کیا اور انہیں انگریزوں، ہندوؤں اور پارسیوں کی ان مذہبی سازشوں سے محفوظ کیا۔ جو انہیں سراسر اسلام سے دور لے جانے والی تھیں۔ بلکہ سیاسی طور پر ان میں وہ روح پھونک دی جس نے اُن کو اپنے وطن کی آزادی کے لیے خون دینے والے مجاہدین بنا دیا۔

معروف سیرت نگار اور اردو زبان کے منفرد اور نامور مصنف مولانا مناظر احسن گیلانی کی لکھی ہوئی یہ کتاب اسی ہمہ گیر انقلابی شخصیت کے انقلابی کارناموں پر مشتمل ہے ہمیں یقین ہے کہ اس انقلابی اور ہمہ صفت موصوف انسان کی زندگی میں ہمارے دور کے مسلمانوں کے لیے بہت سے اسباق ہیں۔ اسی لیے اس کتاب کو پاکستان میں پہلی دفعہ اور حتی الوسع بہتر انداز میں آپ کی خدمت میں پیش کرنے پر ہمارا دل فخر محسوس کر رہا ہے۔

قیمت ۱۸۰/- روپے